

منظور شدہ محکمہ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش — ماہنامہ

مجلس مشاورت

حبیب الرحمن
فضل الرحمن
ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم
رائے جانکی پرشاد
ڈاکٹر حفیظ قتیل
عالم خوندمیری
دلاور علی خاں
رضیہ بیگم
سعید بن محمد (آرٹسٹ)

جلد ۔۔۔۔۔۔ ۱۰
شمارہ ۔۔۔۔۔۔ ۲
ماہ ۔۔۔۔ فروری
سنہ ۔۔۔۔ ۱۹۶۴ء
قیمت ۔۔۔۔ ایک روپیہ

ایڈیٹر:- سلیمان اریب
فون (۴۲۴۰۲)

کتابت: محمد مظہر

صبا

حیدرآباد دکن

زر سالانہ ہند و پاک سے ۱۰ روپے
ششماہی ۶ ״
بیرون ہند سے ۲۰ شلنگ

دہلی آفس:- ۱۹۵۷ ترکمان گیٹ دہلی ۶
پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:-
ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۲۰۲/۳) کراچی

پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب، ۷ اجودیگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن، مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان

صب



مَیں تو اِنکم ٹیکس ادا کرتا ہوں

میں اجتماعی میعادی ڈیپازٹ کھاتا کیوں کھولوں ؟

۱ - اِس لئے کہ آپ کو جمع کرائی گئی رقموں پر اِنکم ٹیکس کی چھوٹ ملتی ہے ۔

مان لیجئے کہ آپ کی کمائی ہوئی آمدنی ۲۰۰۰۰ روپے سالانہ ہے ۔ اب اگر آپ اپنے ' اپنی بیوی ' بچّوں اور دوسرے متعلقین کے نام سے اجتماعی میعادی ڈیپازٹ کے ۱۰ یا ۱۵ سالہ کھاتوں میں ۳۰۰ روپے ماہانہ جمع کرائیں تو آپ کو ۵۹۸ روپے سالانہ کم انکم ٹیکس ادا کرنا پڑے گا ۔

۲ - اِس لئے کہ جمع کرائی گئی رقموں پر ٹیکس سے بَری سُود ملتا ہے ۔

دس سالہ کھاتے کی صُورت میں آپ کو ٹیکس سے بَری ۳،۸ فی صد سالانہ سُود مرکّب ملتا ہے جو ٹیکس کی موجودہ شرحوں کے مطابق ' قابلِ ٹیکس ۵،۴ فی صد سالانہ سُود مرکّب کے برابر ہے ۔ اِسی طرح پندرہ سالہ کھاتے میں جمع کرائی گئی رقموں پر ٹیکس سے بَری ۴،۳ فی صد سالانہ سُود مرکّب ملتا ہے جو قابلِ ٹیکس ۶،۱ فی صد کے مساوی ہے ۔

تفصیل کسی بھی ڈاک گھر سے معلوم کریں

قومی بچت آرگنائزیشن

DA63/453


بھرپور خوشبو والی
کافی
کافی بورڈ کے
فلٹر
سے حاصل کیجئے
سنٹرل فوڈ ٹکنالوجیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے خاص ڈیزائن کے مطابق
بنائے ہوئے اور کافی بورڈ کی جانب سے بیچے جانے والے فلٹر کا مقصد
ہی یہ ہے کہ آپ کے لئے کافی بنانا بہت آسان ہو جائے۔
تاکہ آپ ہر مرتبہ بھرپور خوشبو والی اور اچھی کافی بنا سکیں۔
جگ کی شکل والے یکساں قسم کے برتن حسب ذیل تبدیلیوں
کے ساتھ ملتے ہیں ؛
جگ
ڈھکن
چھلنی
فلٹر جو جگ کے اوپر کے
حصہ میں ٹھیک ٹھیک
بیٹھ جاتا ہے
۴ پیالیوں کی گنجائش۔
پیتل کا (قلعی کیا ہوا)
شفاف فولاد کا
قیمت ۲۵ء۵ روپے
۶ پیالیوں کی گنجائش۔
پیتل کا (قلعی کیا ہوا)
شفاف فولاد کا
قیمت ۵۰ء۶ روپے
قیمت ۷۵ء۳۱ روپے
مقامی ٹیکس علاوہ
فلٹر استعمال کرنے کا طریقہ
فلٹر ملنے کے مقامات ؛
ہندوستان بھر کے
تمام انڈیا کافی ڈپو
کافی ہاؤسز
COFFEE BOARD
کافی بورڈ
بنگلور

کمیٹی سٹی میونسپلٹی پربھنی نے اپنی عام میٹنگ میں ایک قرارداد کے ذریعہ پربھنی شہر کے جو جدید نام تجویز کیے ہیں

وہ درج ذیل ہیں

۱	مہاتما گاندھی روڈ	ریلوے اسٹیشن سے گاندھی پارک تک
۲	چھتر پتی شیواجی روڈ	گاندھی پارک تا شیواجی پارک۔ صدر چوک کو شیواجی چوک نام دیا جاتا ہے
۳	جواہر لال نہرو روڈ	اسٹیشن تا باغبان گلی میدان (اعظم علی خاں کے سابقہ مکان تک)
۴	مولانا آزاد روڈ	باغبان گلی میدان سے سابقہ آبکاری دفتر
۵	رابندر ناتھ ٹیگور روڈ	سابقہ آبکاری دفتر تا مالیہ ہوم گارڈ آفس (جی رگھوناتھ ہال)
۶	گوبند راؤ نائل روڈ	ہوم گارڈ آفس تا پربھنی جیل (جنتور روڈ)
۷	ڈاکٹر امبیڈکر روڈ	گوشت مارکٹ سے شیواجی چوک تک
۸	نیتاجی سبھاش روڈ	شیواجی چوک تا پاور ہاوس
۹	مہاتما پھلے روڈ	رنگ راؤ سونتے کر کے مکان سے ہریجن واڑی تک
۱۰	بھگت سنگھ روڈ	گاندھی پارک سے نہرو آزاد کراس روڈ (براہ گڑھی باغبانی گلی)
۱۱	لالہ لجپت رائے روڈ	رنگ راؤ سونتے کر صاحب کے مکان سے گاندھی پارک (براہ کومٹی گلی)
۱۲	جیجا ماتا روڈ	ٹھوبریس مسجد تا کھنڈوبا
۱۳	لوک مانیہ تلک روڈ	سنٹرل چنگی ناکہ تا گنپت راؤ پٹیر گاؤنکر کا مکان
۱۴	سردار پٹیل روڈ	بھکولال پٹرول پمپ سے گرلس ہائی اسکول (براہ کچی بازار)
۱۵	سنبھاجی روڈ	ملا مسجد تا مالی بیس
۱۶	اناجی راؤ گوہانے روڈ	سرکاری ہائی اسکول تا نیا مونڈھا (براہ نارائن چال ونئی روڈ)
۱۷	ڈاکٹر رادھا کرشنن روڈ	ڈی۔ ایس۔ پی۔ آفس سے شیواجی کالج۔ بسمت روڈ چنگی ناکہ تا زرعی کالج
۱۸	ڈاکٹر راجندر پرشاد روڈ	ریلوے اسٹیشن تا پربھنی جیل (جنتور روڈ)

۱۹	مہارانی لکشمی بائی روڈ	رحمٰن خاں صاحب کے مکان سے (ڈگی کے پاس سے) کتا جیننگ فیکٹری تک
۲۰	سردار آدم سنگھ روڈ	عطار گلی سے کرانتی چوک، کرانتی چوک سے سرکاری ہائی اسکول (براہ گوپال راؤ دیشمکھ و مصطفیٰ خاں صاحب وکیل کے مکان تک
۲۱	بالوگیانو روڈ	پیلی حویلی سے دواخانہ حیوانات تک
۲۲	سروجنی نائیڈو روڈ	میر لاوت علی صاحب کے مکان سے اسے کر کے مکان تک
۲۳	بہادر شاہ ظفر روڈ	ایکزیکٹیو انجینیر، تعمیرات کے مکان سے پولیس ہیڈ کوارٹر تک
۲۴	ٹیپو سلطان روڈ	رگھوبر ٹاکیز تا سجوتی گلی (براہ قدیم مونڈھا)
۲۵	ڈاکٹر ذاکر حسین روڈ	فیروز محل ٹاکیز تا سردار پٹیل روڈ (براہ قدیم مونڈھا)
۲۶	مرزا غالب روڈ	پاور ہاؤس سے درگاہ حضرت شاہ تراب الحق صاحب

(جاری کردہ:- ایکزیکٹیو آفیسر سٹی میونسپلٹی پربھنی)

اس شمارے میں

سرورق:- "گپ شپ" - عکس:- این، ایس، بیندرے

کیفے میں بیٹھے ہوئے تھے چائے پینے کے دوران اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور میرے سوالات کے لیے ماحول ساز گار ہوتا گیا اور میں نے سوالات کا آغاز کیا۔

امیر عارفی:۔ مخدوم صاحب آپ نے کب اور کس ماحول میں شاعری کا آغاز کیا؟

مخدوم محی الدین:۔ میری شاعری کا آغاز ۱۹۳۳ء سے ہوا جب کہ میں کالج کا طالب علم تھا میری ابتدائی تعلیم عربی، فارسی اور تلگو میں ہوئی۔ ۱۵ سال کی عمر میں میں نے سکندر نامہ، دیوانِ حافظ، دیوان صائب، اخلاق محسنی، مثنوی مولانا روم کا کچھ حصہ اور سعدی کی گلستاں، بوستاں ختم کر لی تھی۔ یہ بہت بڑا IMPACT تھا۔ ادب سے دلچسپی ۱۹۲۸ء میں پیدا ہو چکی تھی اس دور کے مشہور رسالے "نگار" اور "ایوان" میں دلچسپی سے پڑھتا تھا۔ کالج کے ابتدائی دور ہی میں مجھے کلاسیکل ادب پڑھنے کا موقعہ ملا لیکن کبھی شعر کہنے کی خواہش نہیں ہوئی حالانکہ میرے دو چچا زاد بھائی ایک صبا اور دوسرے ادیب شاعر ہو چکے تھے اور خود میرے دادا شاعر تھے جو فطرت تخلص کرتے تھے، وہ عشق میں پاگل ہو کر مر گئے۔ میرا گھریلو ماحول مذہبی تھا اور ہمارا خاندان درس و تدریس کے لیے مشہور تھا۔ ہمارے خاندان میں بیراگی، قرات اور خطاطی کے ماہرین گزرے ہیں۔ تجوید میں نے نہیں پڑھی لیکن گھر میں لوگ قرآن شریف تجوید سے پڑھتے تھے، البتہ ہم سے خطاطی ضرور کرائی گئی۔ میری ابتدائی تعلیم گھر پر عربی فارسی میں ہوئی اور تلگو گاؤں کے مکتب میں پڑھی۔ مجھے وہ مندر اور پیپل کا درخت اب تک یاد ہے جس کے نیچے بیٹھ کر ہم "سرسوتی" لکھا کرتے تھے۔

میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ میرا گھریلو ماحول بڑا مذہبی تھا میں نے مولسری کے پھولوں پر ختم خواجگان، مولود شریف، پڑھنے سے لے کر مسجد کی جاروب کشی اور اذان تک دی ہے۔ مسجد میں نمازیوں کے لیے کنوئیں سے پانی نکالنا، ہر جمعہ کو سر منڈوانا، سخت گرم پانی سے نہانا اور روزانہ کے معمول میں فرض سنت اور نوافل کے علاوہ اشراق اور چاشت کی نمازیں پڑھنا اس قسم کے مذہبی ڈسپلن سے میری طبیعت اکتا جاتی تھی۔ لیکن گاؤں میں میں نے گھر والوں کی چوری سے شرر کے ناولوں کا پورا سٹ پڑھ لیا تھا۔ کالج کے ابتدائی سالوں میں جب کہ میں شعر نہیں کہتا تھا میری آواز بہت اچھی تھی اور اچھا خاصا گا لیتا تھا، کھیل کود اور شکار کا زیادہ شوق تھا میں سو گز کی دوڑ، ہائی جمپ، لانگ جمپ اور فٹبال میں کئی انعامات لے چکا ہوں۔ فٹ بال میرا پسندیدہ کھیل رہا ہے۔
۱۹۳۳ء میں میں نے اتفاقیہ طور پر جو نظم کہی وہ "پیلا دوشالہ" تھی جو مزاحیہ ہے۔ "انھیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی"، "تلنگن" اور "ساگر کے کنارے" بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔

امیر عارفی:۔ مخدوم صاحب ابھی تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاست کا آپ کی زندگی میں کوئی دخل نہیں تھا تو پھر آپ سیاست میں کیسے آ گئے؟

مخدوم محی الدین:۔ میرا گھریلو ماحول مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ قوم پرستانہ بھی تھا اور میں گھر پر گاندھی جی

مولانا محمد علی اور بی اماں" کے قصے سنتا تھا گھر میں جو فرما یا جاتا تھا، چچا کھادی کی بڑی تعریف فرماتے خود بھی کھادی پہنتے اور مجھے بھی پہناتے لیکن مجھے وہ کلف سے اکڑی ہوئی کھادی مطلق پسند نہ تھی۔

خلافت تحریک کے زمانے میں میری عمر ۱۱، ۱۲ سال کی تھی میرے چچا خلافت تحریک کے سرگرم موید تھے۔ وہ مجھے سمجھایا کرتے تھے کہ دنیا میں ایک ملک روس ہے جہاں بادشاہ کو ہٹا کر غریبوں نے حکومت قائم کر لی ہے اب وہاں امیر غریب سب ایک دسترخوان پر ساتھ ساتھ کھانا کھاتے ہیں اور پھر نیاز کی تحریروں نے مجھے متاثر کیا۔ مارکسٹ ادب سے میں ۱۹۳۲ء میں واقف ہوا اور کمیونسٹ پارٹی کا ۱۹۴۰ء میں ممبر ہوا، گو میرا تعلق ۱۹۳۴ء سے کمیونسٹ پارٹی سے رہا ہے لیکن ۱۹۴۰ء سے ممبر اس لیے ہوا کہ حیدرآباد میں پارٹی ۱۹۴۰ء میں قائم ہوئی۔ اس وقت پارٹی غیر قانونی تھی جواہر لال نہرو کی قیادت میں ۱۹۳۴ء میں فاشزم کے خلاف ہندوستانی قومی تحریک زوروں پر تھی ہم لوگ جنگ اسپین سے بہت متاثر تھے میری پہلی سیاسی نظم "جنگ" ہے۔

حیدرآباد میں سبط حسن، اختر رائے پوری، ڈاکٹر جے سوریا نائیڈو، ایم نرسنگ راؤ (سابق مدیر رعیت) اور چند لوگوں نے مل کر جن میں میں بھی تھا انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ ہمارے جلسے سروجنی نائیڈو کے مکان پر ہوا کرتے تھے اسی دور میں ہماری مقبولیت اور مخالفت . . . . . شروع ہو گئی تھی، مقبولیت کی بنیاد یہ تھی کہ ہماری شاعری زندگی اور عوام کے قریب تھی اور غزل کے روایتی انداز سے ہٹی ہوئی تھی اور ہماری مخالفت محض سیاسی مفادات اور رجعت پسندی کی بنا پر ہوئی تھی۔

ابیر عارفی۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے حیدرآباد کے ادبی ماحول کو متاثر کیا ہے؟

مخدوم محی الدین۔ میں نے پہلے ہی کہا ہے کہ ہم نے روایت کی دیواریں توڑ دی تھیں اور ادب کو زندگی کا رفیق بنا چکے تھے۔ ادب میں ہمارا نقطہ نظر ہی بدلا ہوا تھا اس طرح نئی نسل کا اس ادب سے متاثر ہونا ضروری تھا چنانچہ نظر حیدرآبادی سلیمان اریب، میکش، دہقانی، ظہیر بابر، لطیف ساجد، تحسین سروری، عزیز قیسی وغیرہ بھی اس سے متاثر ہوئے۔

ابیر عارفی:۔ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر تو آپ نے انقلابی شاعری کی آجکل کس "انسپریشن" کی بنا پر شعر کہہ رہے ہیں۔

مخدوم محی الدین:۔ شروع سے میں ترقی پسندی کے "انسپریشن" کے تحت شعر کہہ رہا ہوں۔ اس دور میں جب کہ سامراج کے خلاف آزادی کی جدوجہد، طبقاتی جدوجہد، ہماری نجی زندگی، عشق، عشق کی محرومیاں سب کچھ شامل ہیں۔ ترقی پسندی کے مفہوم میں آفاقیت آگئی تھی، جنگ اور امن کو موضوع بنایا، اردو شعر کو تنگنائے غزل سے نکال کر دھرتی پر کھڑا کر دیا۔ غزل سے بندھے ٹکے الفاظ نکال کر اس کو نئی تلمیحیں، تشبیہیں اور استعارے دیئے نیا جمال و جلال دیا۔

موجودہ شاعری میں ہماری زندگی ہی انسپریشن ہے۔ آج کی دنیا وہ دنیا نہیں ہے جو ۱۹۴۵ء سے پہلے تھی، آج امن عالم کے تحت قومی آزادی کی تحریک اور سوشلسٹ نظام کا دنیا میں فیصلہ کن مقام حاصل کرنا سامراج کا کمزور ہونا امن اور جمہوریت پسند طاقتوں کا وسیع ہونا غلام ملکوں کا آزاد ہونا، فکر، احساس اور عمل کا بلندیوں پر پہنچنا یہ ماحول دوسری جنگ سے

پہلے نہ تھا۔ پہلے تاریخ سوشلزم بناتی تھی اب سوشلزم تاریخ بنا رہی ہے۔" اس زمین موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا" قسم کی شاعری اب ہم دوسرے ڈھنگ سے کرتے ہیں کیوں کہ آج ایک نئی دنیا اور نیا آدم پیدا ہو چکا ہے۔ آج ہم ایک غلام ملک کی نہیں بلکہ صدیوں کی دبی ہوی امنگوں لذتوں اور لطافتوں کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

امیر عارفی:۔ مخدوم صاحب آپ کے پہلے مجموعے "سرخ سویرا" میں SEX کا دور دور تک پتہ نہیں لیکن آج کل آپ کے پاس اس کا شدت سے احساس ہوتا ہے اس کی کوئی وجہ آپ بتا سکتے ہیں؟

مخدوم محی الدین:۔ دراصل آج ہم اپنے احساسات کا بقایا چکا رہے ہیں، پہلے ترقی پسندی کا مضمون محدود تھا لیکن آج دنیا بدلی ہوی ہے آج ہمیں داخلی مسائل بھی متاثر کرتے ہیں SEX انسانی فطرت کا ایک اہم جزء ہے۔ دنیا کے شعر و ادب کا ۹۰ فیصد حصہ SEX پر مبنی ہے لیکن اس میں نکتہ یہ ہے کہ آپ کس زاویہ سے اس کو محسوس کرتے اور پیش کرتے ہیں کیوں کہ شعر کا کام انسانی جبلتوں کو تہذیب عطا کرنا ہے، نظموں میں SEX صاف اس لیے نظر آ جاتا ہے کہ نظم کی زبان غزل کی زبان نہیں ہے، غزل میں تو SEX عریانی کی حد تک پہنچ گیا ہے لیکن غزل پر دالزام اس لیے نہیں ٹھیرتی کہ اس میں SEX ڈھکے چھپے انداز میں آتا ہے۔

امیر عارفی:۔ سرخ سویرے کے بعد آپ کی طویل خاموشی "قید"، چارہ گر، اور "جانِ تاروں کا بن" جیسی خوبصورت نظموں کے ذریعہ ٹوٹی۔ پھر آپ آج کل غزل کیوں کہہ رہے ہیں، اس کی کوئی خاص وجہ تو نہیں ہے؟

مخدوم:۔ غزل کہنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ داخلی محرکات جمع ہوتے ہوتے ایک دن غزل کی صورت میں بہہ نکلے:

"ٹوٹ کٹ جاتا ہے زنجیر در میخانہ   کوئی دیوانہ کوئی آبلہ پا آخر شب"

اس غزل کی تمام علامتیں سیاسی ہیں، اس کی ساری فضا کیر الالیکشن کی ہے۔ دراصل انقلابی شاعری میں بھی میرے پاس جمالیاتی عنصر زیادہ ہے مثلاً "گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے" والی نظم میں گو انقلاب کو دعوت دی جا رہی ہے لیکن اس میں رومانیت اور جمالیاتی عنصر پیدا ہو گیا ہے جس کو آپ LYRICAL بھی کہہ سکتے ہیں۔

"سرخ سویرا"، کی اور نظموں مثلاً موت کا گیت، انتظار، طور اور آتشکدہ میں بھی آپ کو جلال اور جمال یعنی انقلاب اور حسن دونوں کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ اس دور میں میں نے ایک نظم حویلی لکھی لیکن اس سے کچھ تسکین نہیں ہوی تو دوسری نظم:

وہ خمِ گردن وہ دستِ ناز وہ ان کا سلام
ابروؤں کا وہ تکلم وہ نگاہوں کا پیام

لکھی اور اب حالیہ نظموں میں "چارہ گر" "رقص" وغیرہ کو دیکھئے کہ کہاں سے شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں آج عشق اور انقلاب ایک دوسرے میں سموے ہوے ہیں۔

امیر عارفی :- آپ نے طویل خاموشی کیوں اختیار کی، کیا شاعری کے لیے وقفہ ضروری ہے؟

مخدوم :- میں نہیں جانتا کہ میری شاعری بری ہے یا نہیں لیکن اس وقت تحریک کے سامنے جو مسائل درپیش تھے اس کی وجہ سے میرے نزدیک شاعری اہم نہیں تھی، ایک آرٹسٹ کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ تحریک کے تقاضے اور آئندہ آنے والے زمانے کے مسائل کیا ہیں۔ جو شخص کسی تحریک میں عملی طور پر شامل نہیں ہے اس پر بھی ایسا دور آتا ہے۔ اقبال بھی فکری کشمکش میں برسوں مبتلا رہے۔

امیر عارفی :- مخدوم صاحب کیا کسی ادیب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی سیاسی پارٹی کا ممبر ہو، کیا بغیر ممبر بنے وہ اچھا ادب پیش نہیں کر سکتا۔

مخدوم :- کسی ادیب کی تخلیقات میں آفاقیت، ہمہ گیری، انسانی دل کی تہہ در تہہ جانکاری اور زندگی کا جتنا وسیع تجربہ اور مطالعہ ہوگا۔ وہ اتنا ہی اچھا ادب پیش کر سکتا ہے اس کے لیے کسی سیاسی پارٹی کا ممبر ہونا ضروری نہیں یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کسی سیاسی پارٹی کی ممبری قبول کر لے۔

امیر عارفی :- آپ کی نظم، وصال کیا ان مصرعوں کے بغیر

"دولت خاں کی ڈیوڑھی کے کھنڈروں میں

ڈبڈباتا اگ کھڑا روتا ہے" مکمل نہیں ہو سکتی۔

مخدوم :- ہاں ٹھیک ہے میری نظم "وصال" ان دو مصرعوں کے بغیر بھی مکمل ہے لیکن سوچیے کہ ان دو مصرعوں کی وجہ سے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ایک مرد اور عورت کے وصال میں آج بھی کتنی سماجی رکاوٹیں ہیں — آخر کیوں؟ یہ سوال بہت اہم ہے؟ — اور یہ رکاوٹیں روپیہ، جائداد، طبقہ، ذات پات، مذہب، رنگ و نسل کی ہیں۔ ایک نیگرو کسی گوری عورت سے شادی نہیں کر سکتا خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی محبت کیوں نہ کرتے ہوں۔ یہاں اگر ادیب باشعور ہوگا تو بات ڈھنگ کی کرے گا ورنہ گوری چمڑی والوں کے خلاف نسلی منافرت کا اظہار کر کے حساب برابر کر دے گا نظم وصال میں "دولت خاں کی ڈیوڑھی" وہ مردہ روایتیں ہیں جو جوان روحوں کے آپس میں ملنے پر آج ڈس نہیں سکتیں بلکہ صرف آنسو بہا سکتی ہیں کیوں کہ زمانے نے ان کی قوتِ جبر کو روند دیا ہے۔

امیر عارفی :- شاعری میں نئے تجربوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ میرے نزدیک شاعری اور نظم دو علیحدہ چیزیں ہیں اور ضروری نہیں کہ ہم نثر ہی میں شاعری کریں۔

مخدوم :- میں نئے تجربوں کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ بشرطیکہ اس میں شعریت اور شعور کی کارفرمائی موجود ہو، جی ہاں نظم میں نثر ضروری نہیں صرف وزن ہوتا ہے چنانچہ آزاد نظم کے متعلق لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ شاعری نہیں ہے لیکن آج یہی نظمیں مقبول ہیں۔ آپ نے کبھی سوچا کہ ان نظموں کی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں مثلاً "چارہ گر" اور "چاند تاروں کا بن" آزاد نظمیں ہوتے ہوئے بھی گائی جاتی ہیں۔ دراصل اس کی وجہ جو میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ

صب

آزاد نظم کو زیادہ سے زیادہ مترنم ہونا چاہیئے۔ آج کی نظم اپنا مرکزی خیال، اپنے الفاظ، اپنی موسیقی، اپنا پیکر اپنا پیرہن اور اپنی لنک لے کر پیدا ہوتی ہے اس لیے اس کا حلقۂ اثر بڑھتا جا رہا ہے

امیر عارفی :۔ پچھلے دنوں غالباً "سویرا" اور "سوغات" میں بغیر وزن کی کچھ نظمیں شائع ہوئی تھیں اور ادھر تنے بھائی بھی بغیر وزن کی یعنی SPEACH RHYTHM میں نظمیں لکھ رہے ہیں۔ اس نئے تجربے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

مخدوم محی الدین :۔ میں نے "سویرا" اور "سوغات" میں شائع ہونے والی وہ نظمیں تو نہیں پڑھیں لیکن انگریزی میں ایسی شاعری کا رواج ہے تلگو کا جیا کوی سری سری بھی بلا میٹر اور بلا وزن کی نظمیں لکھتا ہے لیکن میں بلا وزن کی نظمیں نہیں کہہ سکتا کیوں کہ میرے شعروں کی تخلیق موسیقی سے ہوتی ہے اور دل کی دھڑکن ہی میرے میٹر کا وزن بن جاتی ہے۔

میں نے تنے بھائی کی نظمیں سنی اور پڑھی ہیں، میں ان سے لطف لیتا ہوں لیکن ہمیں نیا تجربہ کرتے وقت اس بات کی احتیاط برتنی چاہیئے کہ ماضی کے گھسے پٹے پیمانوں کو ترک کرتے ہوئے ان کی جگہ کون سے نئے پیمانے پیش کریں تاکہ ہمارے سننے اور پڑھنے والے عوام "نئی چیز" کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔

امیر عارفی :۔ دکنی زبان کی عوامی شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

مخدوم محی الدین :۔ عوامی دکنی شاعری کی زندہ مثال سرور ڈنڈا کی شاعری ہے۔ ڈنڈا کی شاعری کے دو پہلو ہیں ایک اس کی زبان اور فارم، دوسرے اس کی نظموں کا خیال۔ جہاں تک اس کی زبان اور فارم کا سوال ہے وہ قدیم دکنی کے ساتھ آج کی مروجہ زبان اور لوک گیتوں کی بحروں کے ساتھ دکنی اور تلگو گیتوں کی بحریں بھی آزادی کے ساتھ استعمال کرتا ہے، اور جہاں تک اس کی نظموں کے خیال کا یعنی اس کے سیاسی اور سماجی شعور کا تعلق ہے وہ معاشرہ میں بنیادی تبدیلی ضرور چاہتا ہے لیکن اس تبدیلی کو نظر انداز کر دیتا ہے جو آج تیزی سے رونما ہو رہی ہے۔ ڈنڈا کے پاس ظلم و جبر کے خلاف ایک شدید جذبہ ملتا ہے۔ وہ سامراج اور مطلق العنانیت کا دشمن ہے وہ عوام کی سیاسی لڑائیوں میں بھی شریک ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ "انقلاب" کا اس کا اپنا ایک تصور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جمہوریت کا قائل بھی ہے اور اس سے ناخوش بھی اور یہیں وہ تنگ نظری کا شکار ہو جاتا ہے۔ دراصل ڈنڈا جہاں سیاسی حیثیت سے باشعور ہے وہاں سماجی حیثیت سے کچھ قدامت پرست بھی ہے چنانچہ لڑکیوں کی وضع قطع میں ذرا سی تبدیلی کو بھی وہ برا سمجھتا ہے اور یہاں تک کہ عورتوں کی آزادی کا مخالف بن جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ڈنڈا سوشلزم میں یقین رکھتا ہے اور اس کی زبان اور شاعری کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ــــ دکنی شاعری کے ساتھ البتہ یہ ظلم ضرور ہے کہ یہ صرف سننے تک محدود ہے جب یہ لکھی جائے تو پڑھنے میں تکلف ہوتا ہے۔

امیر عارفی :۔ مخدوم صاحب ہمارے ادب میں FRUSTRATION کیوں بار بار ہا ہے جب کہ ہمارا

ملک ترقی کر رہا ہے۔ اس کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟

مخدوم محی الدین:۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب شاعر کا نقطۂ نظر زندگی کے متعلق سائینٹفک ـــــ نہ ہوگا تو وہ FRUSTRATION کا شکار ہو جائے گا۔

ہمارے شاعروں کا ایک گروہ ایسا ہے جس نے داخلی طور پر انقلاب کا ایک تصور قائم کر لیا تھا اور چونکہ ان کے لیے وہ لمحہ نہیں آیا جس کا انھیں انتظار ہے اور وہ صبح نہیں آئی جس کی انھوں نے تمنا کی تھی اس لیے وہ جس فضا میں سانس لے رہے ہیں اور جس صبح سے گزر رہے ہیں اس سے مایوس ہیں۔ اس قسم کے شاعر یا تو ۱۹۴۷ء کے زمانے کی شاعری کر رہے ہیں یا پھر کسی خیالی وادی میں گم ہو گئے ہیں۔

شاعروں کا دوسرا گروہ ہے جو عالمی تغیرات کے اثرات اور زندگی کا کوئی شعور نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ سے ان کی نجی زندگی میں سخت گھٹن آگئی ہے اور ان کے اعصاب میں اتنی سکت نہیں کہ وہ اس ذہنی گھٹن کے خول کو توڑ کر باہر آسکیں لہٰذا ایسے شاعروں کی فکر میں قنوطیت اور تشکیک راہ پا جاتی ہے یا پھر وہ SEX کے دلدل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔

ہمارے شاعروں اور ادیبوں کو چاہیئے کہ وہ عوام کے قریب رہیں ان کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ ان کے دکھ درد اور ان کی خوشیوں کا پاس کریں۔ بالفاظ دیگر وہ زندگی کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ زندگی کیا ہے تو پھر ان کا غم آگ اور خوشی شبنم بن جاتی ہے ؎

زندگی موتیوں کی ڈھلکتی لڑی زندگی رنگِ گل کا بیاں دوستو
گاہ ہنستی ہوئی گاہ روتی ہوئی میری آنکھیں ہیں افسانہ خواں دوستو

مکتبۂ صبا

۷، مجرد گاہ حیدرآباد دکن سے حاصل کیجئے

انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی مطبوعات

گوتم بدھ	(طویل نظم)	فضل الرحمٰن	۱/۰
چنگیز	(ڈراما)	"	۲/-
سقراط	"	"	۱/۲۵
چراغ منزل	(مجموعۂ کلام)	شاہد صدیقی	۲/-
پاس گریباں	"	سلیمان اریب	۲/۵۰
زبان اور علم زبان	.	پروفیسر سروری	۷/-
یادگار فرحت	.	غلام یزدانی	۲/-
تلگو ادب کی تاریخ		راما نج راؤ	
		زینت ساجدہ	۳/-
تلگو اردو لغت	-	گوپال کرشنا راؤ	۳/۰
اردو تلگو لغت	(زیر طبع)	ڈاکٹر راما راؤ	
بچوں کی کتابیں	(مکمل سٹ)		۲/۰
کلپنا	(مجموعۂ کلام)	اختر عادل	۱/-
غزل اور مسائل	(تنقید)	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۲/-
اصلی پرچھائیاں	(افسانے)	اقبال متین	۴/۵۰
نظامی گنجوی	(تحقیق)	رضیہ اکبر حسن	۳/۵۰

مکتبۂ صبا کی مطبوعات

گلِ تر	(مجموعۂ کلام)	مخدوم محی الدین	۱/۵۰
نیا انسان	(منظوم ڈراما)	فضل الرحمن	۱/۰

ان کے علاوہ

کاروانِ وطن	(مجموعۂ کلام)	تلوک چند محروم	۷/۵۰
بہارِ طفلی	(بچوں کی نظمیں)	"	۳/۵۰
بیکراں	(مجموعۂ کلام)	جگن ناتھ آزاد	۴/۵۰
اردو	-	"	/۵۰
آب و تاب	(مجموعۂ کلام)	سعادت نظیر	۱/۵۰
نویدِ گل	"	"	/۶۰
پھول کلیاں	"	"	/۶۰
نیرنگِ نظر	"	روحی علی اصغر	۲/-
جامِ صبا	"	ابوالخیر صبا	۲/-

نصیرالدین ہاشمی

حیدرآباد کے خوش نویسوں پر ایک نظر

دکن کی ایک ممتاز حکومت سلطنت قطب شاہی تھی۔ اس کے بیدار مغز اور رعایا پرور بادشاہوں نے نہ صرف حیدرآباد کو آباد کیا بلکہ وہ دکنی کلچر کے بھی بانی ہیں۔ ان کے دور میں جہاں علم و فن کے کئی شاخوں میں ترقی ہوئی وہاں فنون لطیفہ پر بھی خاص توجہ کی گئی تھی۔ فنون لطیفہ کے کئی شعبوں یعنی شاعری، موسیقی، مصوری، نقاشی سنگ تراشی کے قطع نظر ہم صرف خطاطی کا مختصر حال قلمبند کرتے ہیں۔

دورِ قطب شاہی۔ قطب شاہی عہد کی قلمی کتابوں، کتبوں، اور فرامین کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں فن خطاطی کو خاص ترقی ہوئی تھی۔ خطوط کی کئی اقسام مثلاً نسخ، ثلث، نستعلیق، شکستہ وغیرہ میں قطب شاہی خوش نویسوں نے نام آوری حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے جو نقش چھوڑے ہیں وہ ہر آئینہ لائق تحسین ہیں اور بہترین یادگار ثابت ہوئے ہیں۔

قطب شاہی دور کے کئی خوش نویس اور خطاط مشہور رہے جن میں سے بعض یہ ہیں۔ اسمعیل بن عرب شیرازی، محمد اصفہانی، تقی الدین محمد صالح، لطیف الدین حسینی شیرازی، حسین بن محمود شیرازی، کلب علی بن محمد صادق، محمد مومن، عرب جی شرف الدین حسین شیرازی۔

قطب شاہی عمارات، مقابر، مساجد کے بیشتر کتبات اسمعیل بن عرب۔ محمد اصفہانی۔ تقی الدین صالح کے کندہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کاتبوں کے خطوط نسخ، ثلث، نستعلیق، طرز توقیع، طغرا کے بے نظیر نمونے حیدرآباد میں اب بھی ان کی یادگار کے طور پر باقی ہیں۔

ملا عرب شیرازی شاہی کتب خانہ عامرہ کا خوش نویس تھا اور زود نویس اس قدر تھا کہ (۱۵۰۰) ابیات روز لکھ لیتا تھا۔ اس کو قطعہ نویسی اور کتاب نویسی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔[۱]

مولانا حسین شیرازی اس دور کے نہ صرف ایک ماہر فن خطاط تھے بلکہ علمی فضیلت کے لحاظ سے بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے انھوں نے میر محمد مومن کی مسجد کا کتبہ لکھا ہے۔ میر صاحب کی دوسری مسجدوں کے کتبات، کے کاتب بھی یہی ہیں۔ مولانا حسین شیرازی کے باپ کا نام محمود شیرازی تھا۔ مولانا حسین سنہ ۹۵۰ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۰۳۵ھ میں انتی

---

[۱] حدیقۃ السلاطین۔ ناظر دکن

سال کی عمر میں حیدرآباد میں انتقال فرمایا وہ اپنی ۵۴ سال کی عمر میں حیدرآباد آئے اور سید میر محمد مومن کی توسط سے دوسرے ایرانی اصحاب علم کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں باریاب ہوئے قطب شاہ نے ان کو اپنے دارالانشاء اور کتب خانہ میں مامور کیا۔ مولانا حسین ایک متقی پرہیزگار نیک خصلت بزرگ تھے۔ محمد قلی کے انتقال کے بعد حج کے لیے گئے اور ۱۰۳۰ھ کے قریب وہاں سے واپس آئے واپسی پر میر مومن نے ان کو شہزادہ عبداللہ کی تعلیم اور اتالیقی پہ مامور کر دیا۔ مولانا نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کو قرآن مجید اور مذہبی تعلیم دی تھی۔

مولانا حسین شیرازی کا سلطان عبداللہ قطب شاہ کے تخت نشینی سے دو ماہ پہلے ۱۰۳۵ھ میں انتقال ہو گیا۔[1] قطب شاہی دور کے اور بھی کئی خوش نویس تھے جن کا تذکرہ یہاں متروک کیا جاتا ہے۔

دورِ آصفی ۔ دورِ آصفی پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوتا ہے کہ گزشتہ ڈھائی سو سال کے عرصہ میں کئی ایک خوش نویس مشہور ہوئے جنھوں نے نسخ، نستعلیق، ثلث وغیرہ خطوط میں اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان سے ان کی فنی مہارت کا بخوبی ثبوت ملتا ہے۔

آصف جاہ اول کے زمانے میں امام الدین اور محمد یحییٰ اور شاہ رقم مشہور رہتے تھے مگر افسوس ہے کہ ان کے حالات دستیاب نہیں ہوئے۔

آصف جاہ اول کے بعد جن خوش نویسوں کا حال ملتا ہے ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے مگر اولاً خود آصفی شاہی خاندان کا تعارف ضروری ہے۔

خاندان آصفی کے کئی افراد خوش نویسی کے لحاظ سے مشہور ہیں ان میں حیدر الدولہ، رفیع الدولہ، آخر میں مظفر جنگ خصوصیت سے ممتاز ہیں۔ نسلاً بعد نسل یہ فن منتقل ہوتا رہا ہے۔ مظفر جنگ نے امیر باور جنگ کی شاگردی کی تھی۔

خاندان پائیگاہ کے ایک فرد بدر الدین خاں معظم الملک نے بھی سسرالی نسبت سے فن خطاطی میں امتیاز حاصل کر لیا تھا آپ حضرت فیض کے شاگرد تھے۔ اس دور کے جن خوش نویسوں سے ہم واقف ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

شاہ تجلی علی تجلی ۔ شاہ تجلی علی تجلی متوفی ۱۲۱۵ھ کا نام ایک خوش نویس کی حیثیت سے پیش کرنا ضروری ہے شاہ صاحب مورخ بھی تھے اور شاعر بھی۔ مصور بھی تھے اور خوش نویس بھی۔ اپنی کتاب "تزک آصفیہ" کو انھوں نے اپنے قلم سے لکھا اور مصور کیا تھا۔ آصفی دور کے خوش نویسوں میں شاہ صاحب کا نام سرفہرست آتا ہے۔ آپ کو نسخ، ثلث، نستعلیق اور شکستہ میں پورا کمال حاصل تھا۔ ناخن سے بھی لکھا کرتے تھے۔ آپ کے کئی شاگرد تھے۔

عزلت ۔ عبدالولی عزلت جو سورت سے آ کر حیدرآباد میں بس گئے تھے اس دور کے ایک دوسرے بلند پایہ شاعر، مصور، موسیقی داں، اور خطاط تھے ہر ایک شعبہ کے لیے ایک ایک اسکول قائم کیا تھا۔ اور شائقین کو ان فنون کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

---

[1] صب، محمد مومن

جس طرح وہ بہترین شاعر، ماہرِ فنِ موسیقی اور ریاب دست مصوّر تھے اسی طرح خطاطی میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ کئی قسم کے خط لکھا کرتے تھے۔ نسخ، نستعلیق، ثلث، شکستہ وغیرہ کے ماہر تسلیم کیے جاتے تھے ۱۱۹۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

اکبر یار جنگ ۔ محمد قمر الدین خاں المخاطب بہ اکبر یار جنگ کو آصف جاہ اول نے اپنے فرزندوں کی خوش نویسی کی تعلیم پر مامور فرمایا تھا۔ آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں اکبر یار جنگ کا خطاب ملا۔ جاگیر اور منصب سے سرفراز کیے گئے۔ بقول مؤلف گلزار آصفی نستعلیق خط میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ اپنی خطاطی کی وجہ سے وہ نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان اور ایران میں بھی شہرت رکھتے تھے۔ بیسیوں اصحاب نے ان سے فنِ خطاطی میں استفادہ کیا۔ ۱۲۳۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

امام الدین ثانی ۔ اکبر یار جنگ کے فرزند محمد امام الدین خان نے باپ کے بعد خطاطی کے آبائی فن میں امتیاز حاصل کیا۔ اور شہرت پائی امام الدین کے بعد ان کے فرزند محمد فخر الدین نے اس فن میں خاندان کے نام کو روشن کیا اور مشہور ہوئے۔

جواہر رقم خاں ۔ آصف جاہ ثانی کے فرزندوں عالی جاہ، سکندر جاہ، فریدون جاہ اور جہاندار جاہ یہ سب خطاطی کے استاد تھے بقول مؤلف گلزار آصفی خط نسخ اور نستعلیق میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔

نادر قلم خاں ۔ ان کا نام محمد باقر تھا اور محمد دلیر کے شاگرد تھے۔ محمد دلیر کے والد محمد علی عالمگیری عہد کے ممتاز نستعلیق نویس تھے۔ محمد دلیر کی خوش نویسی کی ایسی شہرت تھی کہ ایک حرف ایک روپیہ میں فروخت ہوتا تھا، اور اس ایک حرف کے مل جانے پر لوگ خوش خوش جاتے تھے۔ وہ روزانہ پچیس حرف لکھ کر ان کو خیرات کر دیتے تھے ان کو خریدنے کے لیے ان کے دروازہ پر لوگوں کا ہجوم رہتا تھا۔

نادر قلم محمد باقر نستعلیق خط کو بہتر طرز پر لکھا کرتے تھے۔ حکومت آصفیہ سے دو سو روپے ماہوار ملتی تھی آصفجاہ ثانی ان کو اپنے فرزند سلیمان جاہ کی استادی پر مامور فرمایا تھا۔ محمد باقر کے قطعات سالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

ارسطو جاہ بھی محمد باقر کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ایران سے کئی اصحاب آکر ان کی شاگرد. . . . ہوئے تھے۔ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ خطاطی میں انھوں نے کس درجہ کمال حاصل کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ایک ہزار حرف وہ لکھتے تھے تو ایک حرف سے دوسرے میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔ محمد باقر کوفی خط میں بھی مہارت رکھتے تھے اور ناخن سے بھی لکھا کرتے تھے ۱۲۳۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔[1]

تجمل رقم خاں ۔ ان کا نام محمد کاظم تھا اور محمد باقر نادر رقم کے بھائی تھے۔ نستعلیق خط لکھنے میں کمال حاصل تھا۔ راجہ ناک بخش ان کے مشہور شاگرد تھے۔ مہاراجہ چندو لال نے دو روپیہ یومیہ منصب جاری کیا تھا۔[2]

غلام محی الدین خاں ۔ میر عالم کے متوسل تھے اکبر یار جنگ کی شاگردی کی تھی۔ سات قسم کی خطاطی میں کمال پیدا کیا تھا۔ نسخ، شفعہ، شکستہ، رقاع، ثلث میں بڑی اچھی دستگاہ تھی۔ جلی اور خفی دونوں قسم کے خط لکھا

۱؎ ۲؎ گلزار آصفی

کرتے تھے۔ بقول مولف گلزار آصفیہ غلام محی الدین خاں نے قرآن شریف کو ایسے دل آویز خط نسخ میں مطلا منقش و مثبت طور پر لکھا تھا کہ اب تک کسی نے اس طرز کا قرآن شریف نہیں لکھا انھوں نے بیسیوں قرآن خالص سونے سے لکھے تھے، اور کئی قرآن شگرف سے لکھے تھے۔

تاریخ گلزار آصفی کی تصنیف کے وقت یعنی ۱۲۵۵ھ میں زندہ تھے۔

مرزا طاہر ۔ آصف جاہ ثالث کے زمانہ میں ایران سے آئے تھے۔ مہاراجہ چندولال نے دوسو روپیہ ماہوار مقرر کردی تھی۔ خط نسخ میں کمال حاصل تھا۔ بچاس ہزار روپے جمع ہونے پر حیدرآباد سے ایران چلے گئے۔

حسین علی خاں ۔ شمالی ہند سے آئے تھے اور دوسو روپے ماہوار منصب مقرر ہوا، قلعہ داری اوسہ پر بھی مامور ہوئے بقول مولف گلزار آصفیہ خط نستعلیق میں یکتائے عصر تھے۔ ان کے بعد کوئی شخص ان کے مماثل پیدا نہیں ہوا۔

میر قاسم علی، خواجہ ولی اللہ، خواجہ محب اللہ وغیرہ دوسرے خوش نویس تھے جو سرکاری ملازمت میں شامل اور فن خطاطی کی خدمت کرتے رہے[1]

محمد شمس الدین فیض ۔ حضرت فیض کا نام بھی خوش نویسوں کے زمرہ میں شامل کرنا چاہیئے آپ اپنی دوسری صفات کے ساتھ خوش نویسی میں کمال رکھتے تھے، ناخن سے لکھنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

محمد مظفر الدین امیر یاور جنگ ۔ محمد مظفر الدین المخاطب امیر یاور جنگ اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خاں کے خطاطی میں استاد تھے۔ آپ کے والد امیر الدولہ آصف جاہ اول کے ہمراہ دہلی سے آئے تھے۔ نواب میر محبوب علی خاں آصفجاہ کے دور میں صرف خاص کے سر رشتے توشہ خانہ، میر خانہ، تنبول خانہ، مشعل خانہ وغیرہ آپ کی نگرانی میں تھے۔ جاگیر بھی سرفراز ہوئی تھی خوش نویسی میں اپنے عہد کے ممتاز شخص تسلیم کیے جاتے تھے۔ حیدرآباد کے خطاطوں کی ایک بڑی تعداد آپ کی شاگردی میں منسلک تھی ۱۳۱۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا[2]

وحید الدین خاں ۔ امیر یاور جنگ کے فرزند وحید الدین خاں تے باپ کے بعد خطاطی میں نام آوری حاصل کی اور باپ کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔ ان سے حیدرآباد میں ایک ہزار شخصیتوں نے فن خطاطی کی مشق کی تھی۔

نواب خان خاناں ۔ نواب خان خاناں بہادر میر اسد علی خاں نام نظام یار جنگ نظام یار الدولہ حسام الملک خان خاناں آپ کا خطاب تھا۔ آپ کے اجداد آصفی دور میں صاحب جاگیر او رمناصب رہے امرا بلند مرتبہ میں آپ کا شمار تھا لاکھوں کی جاگیر تھی عرصہ تک صدر المہام فوج رہے۔

نواب خان خاناں صاحب علم و فن تھے۔ عربی، فارسی میں مہارت حاصل تھی۔ خطاطی کا خاص شوق تھا مظفر الدین خاں امیر یاور جنگ کے خاص شاگردوں میں شامل تھے آپ کے خطوط کے نمونہ دیکھنے سے آپ کی خوش نویسی کا کمال واضح ہوتا ہے

---

[1] تزک محبوبیہ جلد دوم ۔ [2] گلزار آصفیہ

میر عماد کی طرز میں آپ کے خطوط خصوصیت سے قابل دید ہیں۔ آپ کا قلمی ذخیرہ نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد ۔ مہاراجہ کشن پرشاد کو بھی ایک بہترین خوش نویس کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے بھی مظفر الدین خاں امیر یاور جنگ سے اس فن کو حاصل کیا تھا۔ نستعلیق اور شکستہ خطوط میں آپ کو بڑی اچھی مہارت حاصل تھی۔ آپ کے کئی قطعات نواب سالار جنگ کے کتب خانے میں موجود ہیں۔

نواب لطف الدولہ ۔ نواب خورشید جاہ کے پوتے عثمانی دور کے صدر المہام اور امیر پائیگاہ خوش نویس بھی تھے۔ مظفر الدین خاں امیر یاور جنگ کے شاگرد تھے۔

محمد علی ۔ حیدرآباد کے ایک مشہور خوش نویس تھے نواب سالار جنگ کے کتب خانہ میں عماد کا لکھا ہوا "کیمیائے سعادت" ہے۔ اس کا ایک صفحہ نہ تھا۔ جسے محمد علی نے لکھا ہے اور اپنے کمال فن کی داد لی ہے۔ یہ ایک صفحہ نواب سالار جنگ نے بارہ ہزار میں خرید فرمایا تھا۔ نادر قلم باقر صاحب، محمد مظفر الدین، امیر نواز جنگ کے علاوہ میر خیرات علی، امام الدین، فضل علی بیگ میر ہدایت، حافظ محمد باقر، سلامت اللہ رامپوری اور ان کے فرزند احمد اللہ سب کے سب اچھے خوش نویس تھے ان میں سے بعض ۱۳۲۴ھ میں بقید حیات تھے۔ ان کے علاوہ گزشتہ پچاس سال میں کئی خوش نویس ہوئے ہیں۔ جن کا تذکرہ طویل ہوگا اس لیے نظر انداز کیا جاتا ہے۔

اب تک مرد خوش نویسوں کا کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے یہ نہ خیال کر لیا جائے کہ کسی خاتون نے اس فن لطیف کی طرف توجہ نہیں کی مگر افسوس ہے کہ ہم کو قطب شاہی دور کی کسی خاتون خوش نویس کا نام دستیاب نہیں ہوا۔

آصفی دور کے ابتدائی زمانہ کے خواتین سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ صرف ماہ لقا بائی چندا کے متعلق معلوم ہوا ہے وہ خوش نویس بھی تھی۔ سنہ ۱۳۰۰ھ کے مابعد کی جن خواتین سے ہم واقف ہیں ان میں شمس النساء بیگم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ آپ مظفر الدین خاں امیر یاور جنگ کی شاگرد تھیں۔ آپ کے ہاتھ کے قطعات موجود ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ خط نستعلیق میں آپ کو اچھی مہارت حاصل تھی۔ حضرت امجد کی مرحومہ بی بی جمال النساء بیگم بھی خوش نویس تھیں آپ کے ہاتھ کا ایک قطعہ "جمال امجد" میں شامل ہے جس سے ظاہر ہے کہ آپ کو خط نستعلیق میں کافی دستگاہ تھی۔

حیدرآباد کی مشہور شاعرہ بشیر النساء بیگم بھی خوش خطی میں کافی مہارت رکھتی ہیں اور گویا اپنی والدہ شمس النساء بیگم سے ورثہ میں ان کو یہ فن ملا ہے۔

سکینہ بیگم بلگرامی کا نام بھی خوش نویسوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مصوری کے ساتھ آپ کو خطاطی میں ملکہ حاصل ہے۔ قیصری بیگم صاحبہ یعنی مولانا تدبر احمد کی نواسی اور آپ کی دختر مہری بیگم بی اے بھی فن خطاطی میں مہارت رکھتی ہیں۔ یہ تذکرہ نامکمل رہے گا اگر سعید جہاں بیگم کا نام نہ لیا جائے جن کو نمائش خطاطی میں انعام بھی ملا ہے۔

طاہر صدیقی

اسلامی تہذیب پر از سر نو ریسرچ کرنے کی ضرورت

ماہرین مشرقیات کی حالیہ ۲۶ ویں بین الاقوامی کانگریس کے موقع پر نئی دہلی میں اسلامی تہذیب اور ثقافت پر ریسرچ کے لیے سوسائیٹیز ایکٹ کے تحت ایک نیا ادارہ قائم کیا گیا ہے جس کا نام ہے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز۔ اس ادارہ نے پنچکوئیاں روڈ (نئی دہلی) پر کرایہ کی ایک وسیع عمارت میں کام شروع کر دیا ہے لیکن اس کی مستقل عمارت راجد ھانی سے تیرہ میل دور تغلق آباد میں چالیس ایکڑ زمین پر تعمیر کرنے کی تجویز ہے۔ زمین حاصل کرنے کے لیے دہلی ایڈمنسٹریشن سے بات چیت ہو رہی ہے۔ دہلی کے ماسٹر پلان کا یہ وہ علاقہ ہے جہاں وزیراعظم پنڈت نہرو نے ۱۹۶۲ء میں انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ (ادارۂ تاریخ و تحقیق طب) کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔

بلڈنگ کا ماڈل

ادارۂ اسلامیات کی بلڈنگ کا ماڈل بین الاقوامی شہرت کے مالک ہندوستانی آرکٹیکٹ مسٹر فیاض الدین نے تیار کیا ہے۔ ادارہ سے متعلق تفصیلی اسکیم میں آرکٹیکٹ نے بتایا ہے کہ مجوزہ عمارات کی تعمیر پر تقریباً پون لاکھ روپیہ خرچ ہوگا۔ بلڈنگ چار منزلہ ہوگی اس میں دفاتر، کتب خانہ اور میوزیم کے علاوہ ایک بہت بڑا آڈیٹوریم بھی ہوگا جس میں گراؤنڈ فلور پر تقریباً ساڑھے سات سو اور بالکنی میں چار سو اشخاص کی نشست کا انتظام ہوگا۔

اس ادارے کے بانی حکیم عبدالحمید صاحب چیرمن، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن ہیں، لیکن ہمدرد یا اس کے کسی شعبہ اور ان کے مالیات سے انسٹی ٹیوٹ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حکیم صاحب نے اپنی غیر منقولہ جائداد جس کی قیمت پانچ لاکھ روپے سے زیادہ ہے، ادارۂ اسلامیات کے لیے وقف کردی ہے۔ اس جائداد کی سالانہ آمدنی پچیس ہزار تین سو اسی روپے ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے اسلامیات پر آٹھ ہزار کتابیں اور اخبارات و رسائل کے تراشوں کی ایک ہزار فائلیں بھی ادارہ کو دی ہیں۔ ایک خاص بات جو اس انسٹی ٹیوٹ کے دستور العمل سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بانی نے اس عظیم تحقیقاتی مرکز کو دوسرے صاحب مال لوگوں کی طرح اسے اپنی خاندانی ملکیت بنانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ حکیم صاحب کے بعد بورڈ آف ٹرسٹیز میں سے کوئی بھی ممبر اس ادارہ کا صدر منتخب کیا جا سکے گا۔ یہ بورڈ فی الحال مندرجہ ذیل

شخاص پر مشتمل ہے۔

۱	حکیم عبدالحمید صاحب	صدر	دہلی
۲	مسٹر عبدالمجید خاں	خزانچی	دہلی
۳	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	ممبر	علی گڑھ
۴	پروفیسر محمد مجیب	"	نئی دہلی
۵	مفتی عتیق الرحمٰن صاحب	"	دہلی
۶	مسٹر شام ناتھ	"	نئی دہلی

ادارۂ اسلامیات کی طرف سے انگریزی میں ایک سہ ماہی رسالہ "اسٹڈیز ان اسلام" بھی جاری کیا گیا ہے جو اس لحاظ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ شاید پوری دنیا میں اپنی نوعیت کا پہلا مجلہ ہے جس کا مقصد بین الاقوامی سطح پر نہ صرف اسلامیات کا مطالعہ کرنا بلکہ اسلامی تعلیمات پر دنیا میں از سر نو تبادلۂ خیال کرنا بھی ہوگا۔ اس رسالہ کی مجلس مشاورت میں مندرجۂ ذیل شہرہ آفاق اسکالر ہیں۔ (۱) ڈاکٹر تاراچند (۲) پروفیسر محمد مجیب (۳) ڈاکٹر یوسف حسین خاں (۴) ڈاکٹر سید عبداللطیف (۵) پروفیسر خلیق احمد نظامی (۶) ڈاکٹر خورشید احمد فاروق (۷) ڈاکٹر میر ولی الدین (۸) مفتی عتیق الرحمٰن۔

اس رسالہ کے پہلے شمارہ میں سات مقالے شائع ہوئے ہیں۔ ایک جرمن اور تین امریکی اسکالروں کے ہیں، باقی تین پروفیسر ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی (کلکتہ)، ڈاکٹر سید عبداللطیف (حیدرآباد۔ اے، پی) اور ڈاکٹر ایس اے معین الحق (کراچی) کے ہیں۔

تین بنیادی مقاصد ادارہ کے دستور العمل میں اس کے تین بنیادی مقاصد بتائے گئے ہیں۔

(۱) اسلامی ثقافت اور تہذیب کے مطالعہ کو فروغ دینا۔

(۲) مختلف ملکوں میں اسلامی مطالعات میں مصروف اسکالروں اور اداروں کے درمیان ربط بڑھانا۔

(۳) ہندوستان پر اسلام کے اثرات اور اسلامک اسٹڈیز میں ہندوستان کے حصہ کی خود ریسرچ کرنا اور دوسروں کے لیے ریسرچ کی سہولتیں مہیا کرنا۔

سرپرست، دوامی ممبر، معاون ممبر، اعزازی ممبر وغیرہ کے علاوہ ادارۂ اسلامیات کے عام ممبر بنانے کا بھی اعلان کیا گیا ہے۔ سالانہ پچیس روپے دینے والا عام ممبر ہوگا۔ رکنیت کے دوران اسے ادارہ کی تمام مطبوعات ملیں گی اور ضابطہ کے مطابق وہ انسٹی ٹیوٹ کی تمام کارروائیوں میں حصہ لے سکے گا۔ ووٹنگ کے موقعوں پر ہر ممبر کا ایک ووٹ ہوگا۔

ماہرین مشرقیات کی سات روزہ کانگریس کے دوران ادارۂ اسلامیات کی جانب سے وگیان بھون میں تاریخی، مذہبی، طبی اور ادبی نوعیت کے پچاس نادر مخطوطات کی نمائش بھی منعقد کی گئی۔ یہ قدیم نسخے کئی ماہروں کی توجہ کا مرکز

بنے رہے۔ اکثر اسکالروں نے انسٹی ٹیوٹ کی اس کوشش کو بہت سراہا۔ مخطوطات کی تفصیلات دو فہرستوں میں شائع کی گئی ہیں۔

ادارہ کی تفصیلی اسکیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دو خاص شعبے کتب خانہ اور میوزیم ہوں گے۔ لائبریری میں اسلام، مسیحیت، ہندو مذہب اور فلسفہ، بدھ مذہب، کنفیوشسزم، جین مذہب، سکھ مذہب، برہمو سماج، آریہ سماج، دیوسماج، اسلامی سائنس، طب، تاریخ، معاشیات، سیاسیات، ادبیات وغیرہ پر پانچ لاکھ کتابیں فراہم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ میوزیم میں اسلامی اہمیت کی چیزیں جمع کی جائیں گی۔

حکیم عبدالحمید صاحب اس اسکیم میں اپنے تمہیدی نوٹ میں لکھتے ہیں کہ "مسلمانوں میں تحقیق و جستجو کا مثالی جوش و خروش کیوں سرد پڑ گیا، خود ریسرچ کا موضوع بن سکتا ہے۔" اسی نوٹ میں حکیم صاحب آگے لکھتے ہیں کہ "گزشتہ کئی صدیوں کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ایسی کوئی تحقیق نہیں کی جو ان کے یا دنیا کے لیے مفید ہوتی ...... کیا ان حقائق سے یہ واضح نہیں ہوجاتا کہ مسلمانوں میں تحقیق کا جذبہ دوبارہ بیدار کرنے کے لیے کتنی شدت کے ساتھ کوشش کرنے کی ضرورت ہے؟"

ادارۂ اسلامیات سے یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا کہ یہاں ہندوستان کے سیکولر ماحول میں اسلامی ثقافت اور تہذیب پر غیر متعصبانہ ریسرچ کی جائے گی جس سے نہ صرف اس ملک کو بلکہ پوری دنیا کو فائدہ پہنچے گا۔

مولانا شبلی نعمانی کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی خوشگوار فضا میں ہر بیرونی چیز آکر یہاں نئے رنگ روپ کے ساتھ ایسی ابھری کہ اسی سرزمین کی ہوکر رہ گئی۔ اس سلسلہ میں مولانا طب، تاج محل اور اردو زبان کی مثالیں دیتے تھے اور کہتے تھے تاج محل سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک کے ماحول میں بھی تعمیر کے بیرونی تصورات بھی ایک نئی شکل اختیار کرسکتے ہیں کون جانے ادارہ اسلامیات بھی مستقبل میں تحقیق و تفتیش کا ایک بے نظیر مرکز بن جائے۔

ادارہ سے متعلق ضروری معلومات اس پتہ سے حاصل کی جاسکتی ہیں: سکریٹری انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، پنچکوئیاں روڈ، دہلی۔

جی خوش ہوا ہے مسجد ویراں کو دیکھ کر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے

گور کن کے بھوک سے بچے مرے ہیں بھوک سے
کوئی مرجائے تو جی جائیں اے پروردگار

سلام مچھلی شہری

تہذیب کے خداؤں سے!

کھڑے ہو آج جس تہذیب کے اونچے منارے پر
سجایا ہے اسے شاید ہمیں بدنام لوگوں نے
جدھر سے چل کے تم پہنچے ہو ان زریں منازل تک
دکھائی ہے تمھیں وہ راہ ہم ناکام لوگوں نے
تمھاری بزم ذہن و فکر کی آرائشیں کی ہیں
ہم ایسے ہی اسیر گل — اسیر جام لوگوں نے
تمھارے جادۂ گل رنگ کی یہ احمریں شمعیں
جلائی ہیں ہم ایسے ہی اسیر دام لوگوں نے
کسی انداز سے لیکن تمھیں پہنچا دیا ہوگا
نئی دنیا، نئے انساں کا یہ پیغام لوگوں نے
کہ اکثر اپنے ہی تخئیل کے خوش رنگ پھولوں کو
مسل کر پھینک ڈالا ہے بوقت شام لوگوں نے
بٹھا کر معبد زریں میں خود لوریں خداؤں کو
کیا ہے کس طرح خود ہی انھیں ناکام لوگوں نے
حسیں تعبیر دو یا تم ہمارے خواب لوٹا دو
ہماری معرفت بھیجا ہے یہ پیغام لوگوں نے

قمر ساحری

سرجن

عظیم سرجن
تمھاری جرّاحیوں کے قرباں
ہزاروں انساں
تمھارے شرمندۂ کرم ہیں
تمھاری نشتر زنی سے کتنے اجل گرفتہ نجات پائے
اجل رسیدہ حیات پائے

وہ ایک بیمار جس کے زخموں کی آگ
چیخوں کی آنچ
سارے پڑوسیوں کے لیے قیامت بنی ہوئی تھی
پڑوسیوں کے حسین خوابوں کی کھیتیوں پر
لہو کی برسات ہو رہی تھی
سکون راتوں کا مر رہا تھا

تمھاری نشتر زنی کے صدقے
اب اس کے ناسور کٹ چکے ہیں
اب اس کو آرام مل چکا ہے
اب اس کے چہرے پہ موت کی چھائیوں کے بدلے
حیات تازہ کی روشنی رقص کر رہی ہے
پڑوسیوں کی اداس آنکھیں چمک رہی ہیں
دلوں میں کلیاں چٹک رہی ہیں

عظیم سرجن
شفیق سرجن
تمھیں خبر ہے کہ اس زمیں کا بھی ایک حصّہ
ہزاروں برسوں سے سڑ رہا ہے
زمیں کا چہرہ بگڑ رہا ہے
بتاؤ سرجن!
علاج اس کا بھی ہو سکے گا۔؟

شورینائی

چاند کی کرنیں۔ ہوا کے جھونکے

میں نے چاہا تھا، مقیّد کر لوں
چاند کی کرنیں، ہوا کے جھونکے
میں نے چاہا تھا کہ الفاظ کے پیرائے میں
نغمہ و نقش میں شرمندۂ اظہار کروں
وہ خیالات جو اک ہلکی سی دستک دے کر
ذہن کے بند کواڑوں سے پلٹ جاتے ہیں
وہ تذبذب جو ترے چہرے پر
لحظہ بھر آ کے چلا جاتا ہے
میں نے چاہا تھا مقیّد کر لوں
چاند کی کرنیں، ہوا کے جھونکے

لفظ آئینہ نہیں چلمن ہے
جس کے پردے میں چھپے رہتے ہیں
"صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں"
وہ خیالات جو اک ہلکی سی دستک دے کر
ذہن کے بند کواڑوں سے پلٹ جاتے ہیں
پھر بھی چاہا تھا مقیّد کر لوں
چاند کی کرنیں، ہوا کے جھونکے

دل کے داغوں کی تجلّی موہوم
عرصۂ دہر میں انساں کا تخیّل محدود
فکر مجروح۔ تصوّر مسدود

نغمہ و نقش بھی صحرا ہیں۔ تکلّم صحرا
کوئی سایہ نہیں کچھ دیر جہاں دم لے لیں
وہ خیالات جو اک ہلکی سی دستک دے کر
ذہن کے بند کواڑوں سے پلٹ جاتے ہیں
سر پٹکنے کو بھی دیوار نہیں
میں نے چاہا تھا مگر سب بھی مقیّد نہ ہوئے
چاند کی کرنیں۔ ہوا کے جھونکے

صب

کمار پاشی

راستے کی کہانی

دیر تک مجھ کو محسوس ہوتا رہا
میری آوارگی
ایک لغزش ہے گویا ۔ مگر ہر تھکن
میرا احساس بن کر مجھے ہر گھڑی
ان خلاؤں کی بے چین وسعت کے جادو
کا نشہ مسلسل چکھاتی رہی
زہر کی ایک ایک بوند سے
مجھ کو تحریک ملتی رہی
اور میں
ہر مسافر سے رستے کی روداد سنتا رہا
اور اب
منزلوں کے جواں گرم آغوش میں
پہنچ کر سوچتا ہوں. تو خود پر ہنسی آ رہی ہے مجھے
راہ میں مجھ کو جو بھی ملا تھا ۔
وہ میں
صرف میں تھا، یا میرا ہی سایہ تھا، جس سے
میں رستے کی روداد سنتا رہا ہوں

پُرانے انسان کا المیہ

وہ پہچانتی ہے
مجھے، میری رگ رگ کو پہچانتی ہے
میں لاکھوں برس تک
اسے اپنا قصہ سُناتا رہا ہوں
میری خواہشوں کے اندھیروں سے وہ
آشنا ہے ازل سے

مگر آج بھی
بے کراں وسعتوں میں
خلاء میں
وہی تشنگی بے اماں گھومتی ہے
یہ مٹی کے بادل کہاں جا رہے ہیں ؟
کوئی ان سے کہہ دو
کہ پربت کو ٹھوکر لگانے سے پہلے
کسی جھیل میں اپنے پاؤں بھگو لیں

مظفر حنفی ہسوی

وصیت

(شاد عارفی کی وفات پر)

گڈّو بیٹے روتے کیوں ہو ؟
قصّہ سننے کی خواہش ہے !
اچھا اپنے آنسو پونچھو ، لو ہم اک قصہ کہتے ہیں

اکسٹھ سال گزرنے ہیں جب افغانوں کی بستی میں
لڈن خاں نے جنم لیا تھا
داروغہ کے بیٹے تھے وہ ، نانا ان کے مولانا تھے ، کھاتا پیتا گھر تھا ان کا
لڈن خاں اچھے بچے تھے (بالکل ویسے جیسے تم ہو)
ان کے گھر والے بھی ان سے اتنی ہی الفت کرتے تھے
جتنی ہم تم سے کرتے ہیں
جب وہ تھوڑا بڑے ہوئے تو نانا ان کو مکتب میں داخل کر آئے
لڈن خاں نے پڑھنا سیکھا
لکھنا سیکھا ، لڑنا سیکھا (آخر وہ بھی افغانی تھے)
چودہ پندرہ برسوں میں ہی لڈن خاں کو بےفکری راس نہ آئی ، نانا اور اَبّو دونوں نے

لڈن خاں سے کٹّی کرلی (مرنا جینا تم کیا سمجھو)
تب مجبوراً لڈن نے مکتب چھوڑا، اپنے گھر سے ناطہ جوڑا
ٹیوشن کرتے، جیسے تیسے، لشٹم پشٹم اپنے گھر کا خرچ چلاتے
ان کی امّی کو راجہ سے تھوڑی سی پنشن مل جاتی
کام کسی صورت چل جاتا
لیکن بیٹا!
ہونی ہو کر ہی رہتی ہے
مکتب میں رہ کر لڈن خاں غزلیں کہنا سیکھ چکے تھے
افغانی ہونے کے ناطے، لوگوں سے ڈرتے بھی کم تھے
اپنی غزلوں میں، نظموں میں، تیکھی تیکھی باتیں کہنے
لوگوں پر پھبتی کستے تھے
اپنے ہوں یا غیر سبھی پر
سچ کہنے میں، سچ لکھنے میں باک نہ کرتے
(یہ تو ایک نشہ ہوتا ہے)
بس، پھر کیا تھا
اپنے غیر سبھی ان کے دشمن بن بیٹھے
ٹیوشن چھوٹے، "دے مینی" کی دے مینی سے منشی گیری
در در بھٹکے، باز نہ آئے
غزلیں، نظمیں، کڑوی تیکھی لکھ لکھ کر انبار لگایا
جو فرمایا، سچ فرمایا
اتنے سے بھی چل سکتا تھا
لیکن وہ تو راجہ جی پر پھبتی کس کر امّی کی پنشن لے ڈوبے
(بولو! ان کی کیا اٹکی تھی؟ راجہ جو کچھ بھی کرتا تھا، لڈن خاں سے کیا مطلب تھا؟!)
امّی بیچاری اس غم میں کڑھ کڑھ کر پرلوک سدھاریں

صب

(یوں سمجھو بس روٹھ گئیں وہ لڈن خاں سے)
لیکن بیٹا! مرنے میں پیسے لگتے ہیں،
لڈن خاں نے گھر بھی بیچا
آگے پیچھے کوئی نہیں تھا، اب تو لڈن خاں کھل کھیلے
سچی سچی باتیں کہہ کر، کڑوی تیکھی غزلیں لکھ کر، زہر آلودہ نظمیں پڑھ کر اپنے سارے سب لوگوں کو دشمن در دشمن کر بیٹھے
ساری دنیا دشمن ہو تو لڈن خاں پھر بچتے کیسے
سب نے مل کر گھیرا ڈالا
آگے دشمن پیچھے دشمن، دائیں دشمن بائیں دشمن، اوپر دشمن نیچے دشمن
لڈن خاں میں عقل نہیں تھی ورنہ چکنی چپڑی باتیں کر کے چپکے سے بچ لیتے
لڈن خاں نے اپنی غزلیں اپنی نظمیں ساری چیزیں چھوڑ چھاڑ کر چپکے سے مرجانے کو ہی بہتر سمجھا

گڈو میرے پیارے بیٹے، میرے راج دلارے بیٹے
دیکھو تم غزلیں مت کہنا، بیٹے! تم نظمیں مت لکھنا
لکھنا ہی پڑ جائے تو پھر سچ مت لکھنا
دیکھو بیٹا! سچ مت لکھنا!
سچ مت لکھنا!!

شارب ردولوی

دھندلکے

یہ بھی سوچا کہ نئی فکر کریں — :
پھر کوئی تازہ غزل عشق کا قصہ کوئی
ذکر پھر گیسو و ابروئی کماں داری کا
پھر کسی زلفِ گرہ گیر کا قصہ چھیڑیں
پھر چلیں لے کے نیا عزم گرفتاری کا

گیت پھر گائیں کہ سازوں سے تڑپ کر نغمے
یوں بکھر جائیں کہ جوں رات کی رانی مہکے
پھر کسی چشم فسوں ساز کے جادو کا بیاں
پھر کوئی راہ میں بے جام پیے ہی بہکے

پھر فسانہ کہیں گل پیرہنی کا اس کی
پھر کسی شوخ کی شعلہ بدنی کا قصہ
ملکِ خسرو کے گرفتار ہوں فرہاد کے ساتھ
تیشہ زن پھر ہوں نئے عہد کی شیریں کے لیے
پھر کسی جلوہ گہہ ناز میں با ہوش و خرد
لے کے جائیں بصد ارمان امیدوں کی برات

پھر چلے لے کے صبا دوش پہ کالے بادل
پھر کسی زہرہ وش ناز کا لہرائے ملہار
پھر کسی غیرت ناہید کا دیپک لپکے
جل اٹھیں جس سے گل و لالہ کے رنگین عذار

جب بھی سوچا کہ نئی فکر کریں ــــ !

چھا گئے ہیں افقِ ذہن پہ دھندلے سایے
اور ماضی کے دھندلکے سے کوئی پیکرِ ناز
سامنے آئی ہے یوں بن کے سوالی پیکر
اپنی خاموش نگاہوں میں لیے کتنے ہی راز

اور کہتی ہے تمھارا تھا یہی عہدِ وفا
کہ مجھے بھول گئے تم کہ میں اب وہ نہ رہی
تم تو کہتے تھے کہ اک پل بھی مرے بن نہیں جیں
زندگی مجھ سے الگ رہ کے یہ کیوں کر بیتی

کیا نہیں اب مری آنکھوں میں وہ بجلی سی کشش
کیا تمھیں اب نہیں بھاتی مرے جوڑے کی مہک
مجھ کو دیکھو تو کہ میں کون ہوں پہچانا بھی !
یاد ہے تم کو وہ برسات وہ بجلی کی چمک

تم تو کہتے تھے مجھے رشکِ نگارانِ ختن
تم تو کہتے تھے مجھے انجم و پرویں سے حسیں
کیا یقیں کر لوں کہ تھیں خواب کی وہ سب باتیں
صرف تھا نام ہی الفت کا ! نہیں جھوٹ نہیں

میں سمجھتی ہوں کہ خود میری محبت تھی فریب
میں ہی خود عہدِ وفا کو نہ نبھانے پائی
تم تو پابند رہے شکوہ ہے میرا ہی غلط
میں ہی خوابوں کو حقیقت نہ بنانے پائی

پھیلتے جاتے ہیں ماضی کے یہ دھندلے سائے
اور میں یوں ہی گرفتارِ غم و رنج و الم
بیٹھا رہتا ہوں تصور میں لیے اک دنیا
یاس و محرومی و اربابِ محبت کے ستم
ان دھندلکوں سے نکل پاتا تو اک دن میں بھی
غنچہ و گل سی لچکتی ہوئی کہتا غزلیں
شعلہ و گل سے جلا دیتا ہر اک یاس کا خار
کاش ! ہوتا یہ مرے دوستو میرے بس میں

ذکاء الدین شایاں

تعاقب

افق کے زینے سے نیچے اُتر چلا سورج
تمام صحنِ زمیں پر ہے دھوپ کی چادر
طویل ہوتے ہوئے رینگتے ہوئے سائے
نہ جانے کونسی منزل کو بڑھتے جاتے ہیں
بلندیوں سے نشیبوں میں اُترے جاتے ہیں
وہ بام و در ۔ وہ درختوں کے پھیلتے ہوئے جسم
عمارتوں کے وہ خاکے وہ نقشِ در دیوار
ہر ایک عکس ہے جیسے کسی تعاقب میں
ہر ایک سایہ ہے جیسے کسی کے پیچھے رواں

زمیں پہ بھاگتی پرچھائیوں کے پہلو میں
لرزتی کانپتی پرچھائیں ایک اور بھی ہے
جو میرے سامنے آ آ کے لوٹ جاتی ہے
مری نگہ اسی پرچھائیں سے الجھتی ہوئی
کسی تلاش میں کچھ دور دیکھ آتی ہے
مگر یہ سایہ جو ہے اپنے جسم و شکل سے دور

سنہری خاک پہ تصویر کھینچ دیتا ہے
وہ اک حسین سا چہرہ وہ دلفریب خطوط
ادا سے ہلتے ہوئے بار بار نازک ہاتھ
فضا کے دوش پہ اڑتا ہوا سا اک آنچل!

بہت دنوں سے یہ سایہ یونہی پریشاں ہے
کہ جیسے یہ بھی تعاقب میں ہو تلاش میں ہو
بہت دنوں سے یہ قدموں پہ میرے سر رکھ کر
مرے حضور کوئی بات کہنے آتا ہے
مجھے بھی اس سے تعلق سا ہو چلا ہے کچھ
میں سوچتا ہوں کہ اک روز اس کو ٹھہرا لوں
میں سوچتا ہوں کہ اک روز اس سے بات کروں

یہ عکس وہ ہے جو ہے میری دسترس سے دور
یہ عکس اب بھی کسی جسم میں نہیں ڈھلتا
سیاہ شام اسے، مجھ سے چھین لیتی ہے

اعظم ذوالفقار

مصلوبِ محبت

تجھ کو الفت نہ سہی مجھ سے مروت ہی سہی
میرے ہر رنج کا باعث تری قربت ہی سہی
مجھ کو اس دل کی پرستش کا یقیں کیا ہوگا
ایسے پوجا ہے خدا کو بھی نہ پوجا ہوگا
سحر و شام نگاہوں نے عبادت کی ہے
بھول کر بھی نہ ترے پیار کی حسرت کی ہے
لطف مانگا نہ کوئی عہد وفا مانگا ہے
تجھ سے کب اپنی محبت کا صلا مانگا ہے
درد پایا ہے تو کب کی ہے دوا کی امید
نہ محبت کی توقع نہ وفا کی امید
درد کو دل کے دھڑکنے کی ادا بخشی ہے
زخم کو میں نے چمکنے کی ادا بخشی ہے
اپنی آہوں کو ترنم کا کفن پہنایا
ایک اک غم کو تبسم کا کفن پہنایا
اپنا خوں اپنے ہی ہاتھوں سے پیا ہے میں نے
کوئی بتلاؤ کہ کیا جرم کیا ہے میں نے

میں کہ اک شاعرِ افسردہ و آشفتہ مزاج
خود پرستی میں مگن خود نگری کا محتاج
کیا ترے وعدۂ فردا کا سزاوار نہیں
میری تقدیر میں کیا صبح کا دیدار نہیں
کوئی پرسش کوئی پیماں کوئی اقرار نہیں
ہوں گنہگار پر اتنا بھی گنہگار نہیں

اف وہ آنکھیں جو زمرد کی تراشیدہ ہیں
کب سمجھتی ہیں کہ آنکھیں میری غم دیدہ ہیں
میں اور ان آنکھوں سے ارمانوں کے لاشے دیکھوں
کس طرح اپنی امیدوں کے جنازے دیکھوں
ضبط کرنا ہے مگر ضبط کا یارا بھی نہیں
آنسوؤں کو ترے دامن کا سہارا بھی نہیں
ہائے کس طرح ستم سہہ کے سنبھالوں دل کو
کوئی بتلاؤ کہ کیا کہہ کے سنبھالوں دل کو
ایسے انداز سے خونِ دلِ معصوم ہوا
زیست سے دور ہوا موت سے محروم ہوا

ایسے عالم سے بھی گزرا ہوں بعد حسرت و یاس
سانس لیتا تھا تو ہوتا تھا گنہ کا احساس
اتنا زسحر و شام سے بیگانہ تھا
اس طرح گردش ایام سے بیگانہ تھا
زخم شرمندہ و نم دیدہ و غم آزردہ
دل شکستہ نظر افسردہ ستم آزردہ
کیا کہوں کتنا پشیمان تھا ارمانوں سے
منہ چھپائے ہوئے پھرتا تھا تمناؤں سے
ناگہاں حوصلۂ موت نے آکر تھاما
دل کو تسکین دی سینے سے لگا کر تھاما
خواب دکھلائے مجھے راحت لافانی کے
داغ سب دھو دیئے زخموں کی فراوانی کے
تھا مئے موت کے دامن کو ابھی اٹھا تھا
یک بیک زیست کی وادی سے سندیسہ آیا

تیرے بس میں ہے ابھی شمس و قمر کا انداز
تیرے قابو میں ہے فردا کی سحر کا انداز
سونپ دے فصل خزاں کو بھی بہاروں کا لہو
بخش دے ذرۂ خاکی کو ستاروں کا لہو
دولت عزم امیدوں پہ نچھاور کر دے
ایک اک مطلع امکاں کو منور کر دے
خار زار غم ہستی کو بھی گلشن کر دے
تو اگر چاہے تو ہر راہ کو روشن کر دے

تیرگی زیست کی گرمی سے پگھل سکتی ہے
موت کب وقت کے دھارے کو بدل سکتی ہے

اعجاز حسین کھٹا

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے حیدرآباد میں دکھنی شاعری کا نکون عبارت تھا دہقانی، علی صاب اور کھٹا سے ملک تقسیم ہوا تو شاعر اور ادیب بھی تقسیم ہوگئے لہذا کھٹا حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر کراچی چلے گئے اور اپنے ساتھ اپنی شاعری بھی لے گئے جو افسوس کہ کراچی کی اجنبی ہواؤں میں پھل پھول نہ سکی لیکن ہمارے دلوں میں اب تک اس کی کھٹاس باقی ہے جسے "صبا" کے ذریعہ ہم آپ سب تک پہنچا رہے ہیں۔ (ادیب)

سائیں کی صدا

جاگ رے بابا جاگ رے بابا	گھر کو لگی ہے آگ رے بابا
لخت جگر سب تک رہے منہ کو	دودھ کو پی رہیں[1] ناگ رے بابا
گو کھرو پائے بو کر جو کو	پھوٹیں تیرے بھاگ رے بابا
اپنیچ[2] ندیا آپ ہی پیاسے	جینا ہے دیناگ[3] رے بابا
کھپاچ[4] دینگے سائیں[5] ادھمڑے[6]	چھین لے ان سے باگ رے بابا

بھیک نہیں آزادی حق ہے
سجنائیں بیراگ رے بابا

نکوچ نکو

الی کے جھاڑ کی مجھے بس بس ہے چھاؤں یہ	فیراں کے اونچے معیشل[7] یہ چھتر نکوچ نکو[8]
صغرا ہوا تو دمڑی کی ادرک مجھے ہے بس	نکو میاں فرنگی کا خنجر نکوچ نکو

---

۱ پی رہے ہیں ۲ اپنی ہی ۳ مصیبت ۴ کھپا ہی ۵ سائیں سے ۶ نا اہل
۷ محل ۸ نہیں چاہیئے

میٹھے کو جی منگے[1] تو ذرا گڑ کتر کو کھا — کڑوی رہتی پڑوسی کی شکر نکوچ نکو
دکھتے بھلے ہیں سیخ گھڑو اور رام جی — اپنے کو اونچی ذات کا قمبر نکوچ نکو
ڈنڈے کو لے کو ہاتھ میں مرداں کے ناد چل — ٹبوہ پکڑ کو ہلتی سو کمر نکوچ نکو
ٹٹوچ[3] اپنا ٹھیک ہے چلتا ہے آستے[4] — واپس کرو یہ بھاڑ سے کا گھر نکوچ نکو
کتے کی لاش کھڈے[5] میں ننگیچ[6] گاڑ دیو
اس کے کفن کو غیر کی چدر[7] نکوچ نکو

گناہ

دلاں سے قفس کو بھلا ناگنا[8] ہے — رہائی کا مالک دھیان لانا گنا ہے
ہے بستی بھی اپنیچ[9] لالاں[10] بھی اپنے — یہ سب کچھ ہے پن[11] حق جتانا گنا ہے
گھراں سو سب[12] ستر ولا[13] ہو گئے تو ہوئے — چھتاں پو سے باندر[14] ہکانا گنا ہے
خدا کے دیئے ہاتھ سو کیں[15] ہرج نئیں — مگر ان کو حرکت میں لانا گنا ہے
انوکھی ہے یاں پیت کی ریت لوگو — دکھیا دل تو پلکاں بھگانا گنا ہے
تو سب جانتا ہے خدایا میں کیا کوں[16] — زباں پر ترا نام لانا گنا ہے
چلے ہم تو دنیا تری توہیچ[17] رکھ لے۔
ارے یاں تو جگنا جگانا گنا ہے

نکو

اپن لوگاں کا رنگ ایکیچ[18] تو پھر یہ چھیڑ خانیاں کیوں — بنینے کے کرو چالاں بھلا کیچڑ کرو نکو[19]
وہ آئے اجلے رکا ساں بدل کو روپ دیوتا کا — یہ پھر کھڈے میں دھکلیں[20] گے انوں کی پچ کرو نکو
آپس کی بات پو[21] تکرار کیا ہے مل کو طے کر لیو — ہڑپ کر جائینگا باندرا سے منصف کرو نکو
غضب ہے دونوں باز و لڑ کو کٹ جانا تیا مت ہے — وقت ہے مل کو لڑنے کا ارے لڑ کو مرو نکو
کوئی دیکھے بچارے کا کلیجہ ہائے جلتی ہے
سنو ٹک بوم[22] کہتے کی ارے تھا کرو نکو

---

۱ جا ہے ۲ مانند، طرح ۳ ٹٹو ہی ۴ آہستہ، سلامت روی ۵ قبر ۶ ننگی ہی ۷ چادر ۸ گناہ ۹ اپنی ہی ۱۰ لال کی جمع مراد عوام ۱۱ مگر ۱۲ سب ۱۳ نباہ ۱۴ بندر ۱۵ سو کھیں ۱۶ کہوں ۱۷ تو ہی ۱۸ ایک ہی ۱۹ قضیہ ۲۰ راکشس ۲۱ دھکیلیں گے ۲۲ پر ۲۳ پکارہ

صبا

مولانا ہندی

(نذیر درد)

ذروں میں عکسِ مہر کی کیوں جستجو کریں — اہلِ نظر مشاہدۂ دو بدو کریں

جو اہلِ دل ہیں ان کی زباں بے زبانِ شمع — روشن کریں چراغ اگر ہائے و ہو کریں

زلفِ شبِ دراز کی کھلتی نہیں گرہ — آؤ اب اس کو غرقِ مئے مشکبو کریں

دامانِ چشم دامنِ گل دامنِ بہار — کس کس کو اپنے خون سے ہم سرخرو کریں

مضمون ہے دردِ ہجر کا زیر و زبر ہے نطق — ہم گفتگو کریں بھی تو کیا گفتگو کریں

دنیائے آرزو میں گزاری تمام عمر — اب یہ ہے آرزو نہ کوئی آرزو کریں

مینا ہے سر بریدہ تو ساقی پریدہ رنگ — ایسے میں کس سے ذکرِ شراب و سبو کریں

ہم ہیں برہنہ تن ہمیں دامن کہاں نصیب — دامن ہوں جن کے پاس امیدِ رفو کریں

وقتِ نماز تنگ ہے اے شیخِ میکدہ — ارشاد ہو تو آبِ عنب سے وضو کریں

ہندی کے آبِ چشم سے بنتے ہیں وہ نگیں
موتی کی آب کو بھی جو بے آبرو کریں

صب

ذوقی (علیگ)

غمِ فراق کا یہ اولیں مقام آیا
جنونِ خام گیا سوزِ ناتمام آیا

یہ چاند تارے، یہ رنگِ شفق، یہ نورِ سحر
کہاں کہاں سے ترے حسن کا پیام آیا

جو تشنہ کام تھے آتے ہی خم پہ ٹوٹ پڑے
نہ جانے کب تری محفل میں دورِ جام آیا

عطا ہوا ہے محبت کو ذوقِ تشنہ لبی
اس انجمن سے غمِ عشق شاد کام آیا

نہ آرزو ہے نہ ذوقِ طلب نہ لذتِ غم
رہِ حیات میں یہ کونسا مقام آیا

کھپا ہے خونِ جگر کچھ تو فکرِ دوراں میں
جو بچ رہا وہ غمِ عاشقی کے کام آیا

خزاں سے کہدو کہ باندھے چمن سے رختِ سفر
نئی بہار نئے گل نیا نظام آیا

نور محمد نور

آزادیٔ خیال کی بات اور وہم ابھی
زیبِ گلو ہے حلقۂ دیر و حرم ابھی

قسمت میں کارواں کی ہیں پامال منزلیں
ہیں رہنما کے ذہن میں نقشِ قدم ابھی

رہبر نے عزمِ ترکِ سفر کس طرح کیا
ہیں راہ روانِ شوق مگر تازہ دم ابھی

اس میکدہ پہ پیرِ مغاں کو عبث ہے ناز
شامل شراب میں ہے غمِ کیف و کم ابھی

نزدیک اس قدر تو نہیں منزلِ وصال
سر کتنے ہوں گے راہِ وفا میں قلم ابھی

ہے دار ایک مرحلۂ رہ گزارِ شوق
ہوں گے بلند اہلِ وفا کے علم ابھی

ہے ضبط ذہن قصۂ ہجراں کا حرف حرف
رہنے دو اُن کے ہاتھ میں لوح و قلم ابھی

ملنے کا نورؔ رنج و الم سے نہیں فراغ
شامل ہے حال میں جو کسی کا کرم ابھی

نیاز حیدر

ہر انتظار کی رات اپنی صبح لاتی ہے
کہ ہر کلی ترے ہونٹوں سے مسکراتی ہے

نہ جانے کتنے ہی خوابوں سے روٹھ جاتی ہے
نگاہ جو تجھے اک بار دیکھ پاتی ہے

یہ سہما سہما سا معصوم صندلیں ماتھا
اور اس پہ سرخئ رخسار تھرتھراتی ہے

سمن بری پہ دلوں کو نثار ہونے دے
یہی زمانہ ہے یونہی بہار آتی ہے

وہی تو ہے ترا پہلو جسے کہیں فردوس
وہ جس کی آگ رقیبوں کے دل جلاتی ہے

نیاز عشق میں شرط وفا سے کیا حاصل
اگر وفا ہی محبت پہ ظلم ڈھاتی ہے

اس کے تو ہر اک لمحہ کی یاد ایک غضب ہے
باور نہیں آتا کہ یہ گزری ہوئی شب ہے

محروم طرب دل ہے مرا جس کے جہاں میں
واں میری غزل باعث تسکین و طرب ہے

اے شیخ جو پینا ہے مرے ساتھ ابھی چل
پینے کا مزہ آج ہے اس وقت ہے اب ہے

مہندی سے رچے ہاتھوں میں بل کھاتے ہیں گیسو
واعظ مری توبہ شکنی کا یہ سبب ہے

جلتے ہوئے پروانے کی آواز نہ آئی
مجبوری اظہار نہیں پاس ادب ہے

گل دست نگر ہے تری بے باک ہنسی کا
کلیوں کی حیا میں بھی یہی حسن طلب ہے

دشمن کے مقابل تو نیاز اپنی طبیعت
گل ریز و گہر بار نہیں شعلہ بہ لب ہے

نیاز حیدر

کیا کیا تری آغوش میں گُل میں نے کھلائے
آکاش کے سینے پہ ستارے ابھر آئے

وہ مدہوشیٔ جام و رُخِ یار وہ گیسو
پھر لوٹ کے اک بار وہ شام و سحر آئے

کاجل کی کشش اور فسوں کاریٔ ابرو
رخسار کا تِل جو غمِ دل بن کے ستائے

دامانِ صبا حسرتیٔ خونِ بہاراں
دیکھے یہ نظارہ جو نظر کو نظر آئے

اس رنگ پہ ہو رقص حسینانِ گُل اندام
اور کوئی خیالِ مے گلفام نہ لائے

کیا کیجئے عشرت کدۂ اہلِ ہوس کو
کس طرح جہنم میں کوئی آگ لگائے

کچھ تو پاسِ دلِ غارت شدۂ ناز کرو
زندگی تلخ ہے یارو غزل آغاز کرو

ہو کے رسوائے جنوں دیکھ لیا ہے میں نے
ہو سکے تم سے اگر ہمتِ پرواز کرو

یا تو مالوکرے غمّازِ بتِ ہرجائی
یا بہر رنگ یقینِ بتِ غمّاز کرو

آفتِ جان بنے گا یہ زمانہ اک دن
یہ جوانی ہے نہ اپنے کو بھی ہمراز کرو

کیا اُسی سازِ شکستہ پہ غزل چھیڑی ہے
محفلِ نو کو عطا کوئی نیا ساز کرو

حسن نعیم

پیکرِ ناز پہ جب موجِ حیا چلتی تھی
قریۂ جاں میں محبت کی ہوا چلتی تھی

پردۂ فکر پہ ہر آن چمکتے تھے نجوم
فرش تا عرش کوئی ماہ لقا چلتی تھی

ان کے کوچے سے گزرتا تھا اٹھائے ہوئے سر
جذبۂ عشق کے ہمراہ انا چلتی تھی

اک زمانہ بھی چلا ساتھ تو آگے آگے
گرد اڑاتی ہوئی اک موجِ بلا چلتی تھی

دل میں جو یاد رہا کرتی ہے صورت بن کر
کل وہی یاد بہ اندازِ ندا چلتی تھی

یاد ایام کہ طوفانِ جنوں تھا برپا
خاک رقصاں تھی لبِ نے پہ صبا چلتی تھی

میں ہی تنہا نہ خرابوں سے گزرتا تھا نعیم
شام تا صبح ستاروں کی ضیا چلتی تھی

جاوید کمال

ہم جو تم سے نہ آشنا ہوتے
سوچتے ہیں کہ جانے کیا ہوتے

لطف آتا تری جفاؤں میں
کاش کچھ ہم بھی بے وفا ہوتے

پھر سے ملنے کا ہے یقین مگر
جانے ڈرتے ہیں کیوں جدا ہوتے

میرے پینے سے لوگ خوش ہیں بہت
تم جو ہوتے بہت خفا ہوتے

تم کو پوجا یہی گناہ کیا
ورنہ ہم بھی کوئی خدا ہوتے

آپ اپنی شکست سے ہوں دوچار
کاش تم میرے ہمنوا ہوتے

ریورنڈ ہنیسن ریحانی

درد سے مانوس جب اپنی خودی ہو جائے گی
عالمِ امکاں کی رونق زندگی ہو جائے گی

کچھ بھی اس اندھیر نگری میں نہ آئے گا نظر
کیا خبر تھی تیز اتنی روشنی ہو جائے گا

یونہی میری تشنگی ساقی اگر بڑھتی رہی
بے پیے ہی ایک دن آسودگی ہو جائے گی

اور جو چاہے سمجھ لیکن نہ کم خود کو سمجھ
جنسِ ہستی ورنہ داغِ نیستی ہو جائے گی

ہم کو اس ظلمت کے عالم میں بھی ہے اتنا یقیں
آپ گزریں گے جدھر سے روشنی ہو جائے گی

یہ گماں کس نے کیا تھا آدمی کو ایک دن
آدمی سے اس قدر بیگانگی ہو جائے گی

گر نہیں نغمہ سرائی نوحہ خوانی ہی سہی
یہ زباں اک روز وقفِ خامشی ہو جائے گی

وہ بھی دن آئے گا ریحانی کہ رندوں کے لیے
ساغر اس گلشن میں کھل کے ہر کلی ہو جائے گی

باغِ آزادی کے دامن سے داغِ خزاں کا جا نہ سکا
دے دے کے لہو بدنام ہوئے اور رنگِ بہاراں آ نہ سکا

چلتے ہی چلتے وقت گیا، بڑھتے ہی بڑھتے عمر گئی
یارب یہ کیسی منزل ہے میں ایک گھڑی سستا نہ سکا

امید پہ قائم ہے دنیا، ہم بھی مرمر کے جیتے ہیں
وہ خواب جو دیکھا تھا اس کی تعبیر کا لمحہ آ نہ سکا

یہ اپنا اپنا ظرف رہے، اس کو کیا کہیے اور کیا کہیے
میں تو کاغذ کے پھولوں سے چشمِ بینا بہلا نہ سکا

ساقی تیرے میخانے میں اب اُمیدِ انصاف نہیں
کم ظرف ہوئے پی کر مدہوش اور رندوں تک جام آ نہ سکا

یہ جادہ ایسا جادہ ہے، یہ منزل ایسی منزل ہے
اس جا گیا ان کا دیوانہ جس جا فرزانہ جا نہ سکا

سمجھا نہ کسی نے بھی مجبورِ محبت کی خاموشی کو
ہے زیست تو آخر زیست ہی لیکن موت پہ بھی حرف آ نہ سکا

اک دن وہ بنے گا گل بھی اور پھر گل سے بنے گا گلشن بھی
ریحانی گرم ہوا سے جب دل کا غنچہ کھلا نہ سکا

علی احمد جلیلی

درد کی ہر خلش چارہ گر ہو گئی
بات اتنی بڑھی مختصر ہو گئی

دل کی ہر بات نامعتبر ہی سہی
آپ نے مان لی معتبر ہو گئی

رخ سے آنچل سرکنے کی بس دیر تھی
رات سمٹی سمٹ کر سحر ہو گئی

چار تنکے جٹائے گئے جب کبھی
بجلیوں کو کہیں سے خبر ہو گئی

دل نے جل کر کچھ ایسا اُجالا کیا
ہم یہ سمجھے شبِ غم بسر ہو گئی

ہوں وہ راہی کہ تنہا ہوا جب کبھی
بڑھ کے منزل ہی خود ہم سفر ہو گئی

جھانکتا ہے افق سے سویرا علیؔ
غم کے ماروں سے کہہ دو سحر ہو گئی

شمس الدین تاباںؔ

مل چکی ترکِ محبت کی سزا آجاؤ
میں جفا پر بھی ہوں راضی بہ رضا آجاؤ

پھر مبادا کوئی سجدوں کا سہارا نہ رہے
مٹ چکے کتنے ہی نقشِ کفِ پا آجاؤ

چھوٹ جائے نہ کہیں ہاتھوں سے دامانِ امید
شل نہ ہو جائیں مرے دستِ دعا آجاؤ

سر بسجدہ ہوں دل و جاں سے مری دنیا میں
میری دنیائے محبت کے خدا آجاؤ

جب سے تم چھوٹے ہو روٹھے ہو دل و جاں بخدا
سانس ہے سلسلۂ جرم و سزا آجاؤ

چل کے دیکھیں تو ذرا وہ کہیں تاباںؔ تو نہیں
جو شب و روز یہ دیتا ہے صدا آجاؤ

صب

فضیل جعفری

شمس ہیں ہم نہ قمر رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط
صورتِ دیدۂ تر، رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط

موجِ غم سیلِ بلا، تیز سہی ہم نفسو!
زرد پتے بھی مگر رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط

روحیں آوارہ بھٹکنے نہیں پائیں گھر گھر
سرد و سنسان کھنڈر رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط

روشنی کم ہی سہی پھر بھی اجالا ہے فضیل
داغِ دل زخمِ جگر، رکھتے ہیں تھوڑی سی بساط

انوار ظہوری

انوار نے غزلوں میں نئی بات کہی تھی
اک عمر سے درد کی توفیق رہی تھی

جس نے مجھے زلفوں میں گرفتار کیا تھا
حالات بتاتے ہیں تری کم نگہی تھی

جب تو نے ملاقات پہ اصرار کیا تھا
اس وقت کسی غم کی مجھے سُدھ نہ رہی تھی

دنیا مجھے کہتی تھی کہ بُت پوج رہا ہوں
تصویر مرے دل میں فقط آپ کی ہی تھی

اس وقت ظہوری کا بڑا نام ہے لیکن
ہم سے بھی کئی روز ملاقات رہی تھی

س، ا، عشرت

اگر انھیں مری الفت کو آزمانا تھا
تو بے حجاب سرِ بزمِ شوق آنا تھا

سُنا تھا آپ نے جس کو بڑے تجاہل سے
وہ میرے غم کا نہیں آپ کا فسانہ تھا

تمھاری بزم سے اٹھا تو پھر کہاں جاتا
یہ میکدہ ہی مرا آخری ٹھکانا تھا

چلا تھا بیعت واعظ کے ہی ارادے سے
حرم کی راہ میں لیکن شراب خانہ تھا

قدم قدم پہ تری یاد آ گئی مجھ کو
یہ ترکِ عشق بھی جیسے کوئی بہانا تھا

غمِ حیات نے یہ بھی بُھلا دیا دل سے
تمھاری بزم میں پھر مجھ کو لوٹ آنا تھا

کبھی تو آپ بھی تھے مرکزِ نگاہِ جمال
عجیب دور تھا عشرت عجب زمانا تھا

کیف رضوانی

دردِ دل کو زوال کیا ہوگا
دل مگر پائمال کیا ہوگا

روشنی کا مآل مت پوچھو
روشنی کا مآل کیا ہوگا

تیرا لطف و کرم جب ایسا ہے
تیرا جاہ و جلال کیا ہوگا

آپ حبیبوں کے ہوش جب گم ہیں
ہم دوانوں کا حال کیا ہوگا

آگ پر صبح و شام چلتے ہیں
اور ہمارا کمال کیا ہوگا

جب خوشی سے خوشی نہیں ہوتی
غم سے ہم کو ملال کیا ہوگا

تیرا سایہ جب اتنا پیارا ہے
تیرا حسن و جمال کیا ہوگا

اس ترقی کے دور میں اے کیف
زندگی کا خیال کیا ہوگا

اقبال متین

گنجا مسیح

اس کو جدا ہوئے تین برس بیت گئے ہیں ـــ آج اس کی تیسری برسی ہے۔ اگر آج وہ ہوتا تو سولہ سترہ سالہ نوجوان ہوتا۔

میں جانتا ہوں گنجا مسیح الدین اس کا دیوانہ رہا ہے۔ مسیح الدین میرا گہرا دوست ہے ـــ وہ گنجا ہے ـــ میں محبت سے اس کو چھیڑنے کے لیے گنجا مسیح پکارتا ہوں ـــ اس بے تکلفی کے لیے آپ مجھے معاف کردیں ـــ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ گنجا مسیح اپنے اس مرحوم بیٹے کا دیوانہ رہا ہے۔ میں نے باپ بیٹے بہت سے دیکھے ہیں لیکن ایسے باپ بیٹے نہیں دیکھے ـــ گنجے مسیح کی اپنے اس بیٹے سے محبت کچھ دیوانگی کی حد تک تھی ـــ مجھے تو کئی بار گنجے مسیح پر شبہ ہوا کہ یہ شخص پاگل تو نہیں ـــ اب آپ ہی بتائیے کہ راستے سے گزر رہے ہوں اور اسکول سے لوٹتے ہوئے بچوں کے غول میں اگر اس کو اپنا تیرہ سالہ فیرو نظر نہ آتا تو اس کی بے قراری کا عالم دیدنی ہوتا وہ کچھ نہ کچھ بہانہ تراش کر اپنے گھر کو لوٹتا جو اسکول سے قریب ہی تھا ـــ اور فیرو کو دیکھ آتا۔ اس سے مل کر اوٹ پٹانگ باتیں کرتا۔

"بھئی تم نظر نہیں آئے ـــ کس راستے سے آئے ہو ـــ کب آئے ہو ـــ اچھے ہو نا؟"

میں گنجے مسیح کو ستانے کے لیے اضافہ کرتا۔

"کیوں آئے ہو، نام کیا ہے ـــ مجھے پہچانتے ہو نا میں کون ہوں؟" ـــ اور وہ دونوں ہنس پڑتے، پھر فیرو کی فرمائشیں شروع ہوتیں ـــ مجھے پتنگ، چار قسم کے مانجے، پانچ کینیاں یعنی دھاگے کی کنگھیاں۔ مانجے میں گدھک کے مانجے کے لیے بطور خاص ہدایت کی جاتی۔

اس سے اس طرح ملاقات کے بعد گنجا مسیح نارمل آدمی بن جاتا۔ ایسے میں اس کو دیکھ کر لگتا کہ دنیا بھر کا سکون، دنیا بھر کی راحتیں اسی ایک آدمی کے حصے میں آگئی ہیں ـــ جب اجازت دیتی تو فیرو کی فرمائشوں کو پورا کرنے میں جو خوشی اسے محسوس ہوتی وہ شاید اس کی ایسی خوشی ہوتی تھی جسے ہم دولت سے حاصل کرسکتے ہیں ـــ اور اگر وہ ان چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کو پورا نہ کرسکتا تو اس کے ذہنی کرب کا عالم بھی احساسات کے لیے ایک تازیانہ ہوتا۔

گنجے مسیح کی اس دیوانگی کی داستانیں بڑی طویل ہیں۔ کوئی وجود کسی وجود کے لیے آنکھوں کی بینائی بن جائے، قوتِ سماعت بن جائے، نفس کی آمد و شد بن جائے۔ احساس و شعور نہیں بلکہ خود ذہن بن جائے تو ایک دوسرے سے جدائی بہتر ہے ___ تاکہ کسی ایک وجود کی تکمیل ہو سکے۔

شاید کچھ یہی سوچ کر تیرہ سالہ دوستی کے بعد فیرو نے گنجے مسیح کو تنہا چھوڑ دیا ___ میں تو بس حیران رہ گیا۔ یہ گنجا مسیح آخر زندہ کس طرح ہے۔ مر کیوں نہیں گیا ___ مجھے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب اس کی زندگی بے مقصد ہے۔

مجھے یاد ہے ___ جب فیرو اس دنیا کو چھوڑ رہا تھا تو گنجے مسیح کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ نکلی ___ وہ اضطراب، وہ بے قراری جو اسکول کی راہ میں فیرو کو نہ پاکر اس پر طاری ہو جاتی تھی آج تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا ___ بس ایک چپ تھی اور وہ تھا۔

جب فیرو کی ماں، دادا، دادی اور دوسرے رشتہ دار بین کرکے اور چلّا کر رونے لگے تو وہ بے کل ہوا تھا ___ انگلی ہونٹوں تک لا کر اس نے شوشو کی آوازیں نکالیں اور سب کو منع کرتے ہوئے بولا ___

"چیخو نہیں وہ گھبرا جائے گا"

میں سمجھ گیا کہ گنجا مسیح اب گیا ہاتھوں سے۔ وہ تو اب بھی اپنے فیرو کی زندگی کو منوانے پر مُصر ہے۔

اس کی چپ کو دیکھ کر سب چپ ہو گئے ___ کسی نے اس کی بیوی سے کہا اس کو رُلاؤ۔ بیوی بیچاری خود اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی ___ وہ اٹھی ___ اس نے کہنے سننے پر عمل کرکے گنجے مسیح کو جھنجھوڑ لگا ___ "تم روؤ ___ روتے کیوں نہیں ہو" وہ خود رو رو کر چیخ رہی تھی ___ لیکن گنجے مسیح نے صرف اتنا کہا ___

"میں اچھا ہوں، بالکل ٹھیک ___ ہوں"

پھر وہ اٹھ کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں اس نے اپنے فیرو کے پتنگ اونچی الماری پر چھپا رکھے تھے۔ اس نے ایک پتنگ نکال کر آنکھوں سے لگا لیا اور چاہا کہ اس کے سہارے رو پڑے۔ لیکن وہ رو نہ سکا۔ پتنگ کا کچا رنگ اس کی آنکھوں اور گالوں پر ابھر آیا۔ لیکن آنسو دور دور تک نہیں تھے۔ شاید اس لیے کہ آنسو اس بات کا اعتراف تھے کہ فیرو زندہ نہیں ہے اور اس بات کو تسلیم کر لینا گنجے مسیح کے لیے ممکن ہی نہ تھا

پھر وہ چپکے سے اس کمرے سے نکل آیا اور اپنے فیرو کے پاس جا کر چپ چاپ بیٹھ رہا جو گہری نیند سو رہا تھا جس کو مسیح مان لینے کے لیے تیار نہ تھا۔

دن گزرتے گئے ___ اور اپنی چپ کے سہارے گنجا مسیح زندگی کی ہماہمی کے ساتھ شانہ بشانہ چلنے لگا۔ لیکن اس کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کے وجود کی دھجیاں بکھر گئی ہیں ___ اس کے گھر والوں نے مجھے بتایا کہ وہ راتوں کو نیند میں سسک سسک کر روتا ہے۔

آہستہ آہستہ وقت کا مرہم اس کے زخموں کو مندمل کرنے لگا تو اس نے بھی یادوں کی ایک انجمن سجالی ___

ایک دن وہ ایک خوبصورت سا شوکیس بنا لایا۔ اپنی کتابوں کے شلف کے برابر رکھ کر اس نے اپنے فیرو کی ایک ایک نشانی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی اور شوکیس میں اس احتیاط سے رکھتا گیا جیسے ہرے ہرے زخموں پر سے ململ اتار رہا ہو۔ اس کی پنسل اس کی نوٹ بکس اس کی کتابیں اس کی کانچ اور کانسے کی گولیاں، اس کے پتنگ دھاگے کی گنگھیاں، چرخی اس کے کپڑے اس کے شوز، اس کی تصویریں غرض کہ اس کی ایک ایک چیز گنجے مسیح نے اس شوکیس میں سجادی۔

اب ان چیزوں کو جھاڑ پونچھ کر رکھنے میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی نوٹ بکس کھول کر اس کی تحریریں پڑھنے میں اس کی تصویریں دیکھنے میں اسے جو سکون ملتا تھا اس کی لذت سے تو وہی واقف ہوگا ـــــ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گنجا مسیح اپنے زخموں کی کھیتی ہری کر رہا ہے اور یہ عمل وہ دانستہ کرتا ہے تاکہ چیزوں پر جمی ہوی گرد کے ساتھ ساتھ یادوں پر جمی ہوی وقت کی دھول بھی صاف ہوجائے۔

ایک دن وہ اپنے فیرو کی قبر کی تصویر اتار لایا اور اس کی فریم میں لگی ہوی تصویر کے برابر دوسرے فریم میں جڑ کر اس نے اس کو شوکیس میں رکھ دیا۔

ہر سال فیرو کی قبر پر جو چادر گل چڑھائی جاتی تھی گنجا مسیح برسی کے چوتھے پانچویں دن سوکھے ہوے پھولوں کو قبر پر سے اٹھا لاتا اور اپنے کپڑوں کے بکس میں احتیاط سے رکھ چھوڑتا ـــــ لیکن وقتاً فوقتاً کپڑے نکالنے اور رکھنے میں جب سوکھے پھول چادر کے تاگوں سے الگ ہونے لگے تو اس نے انھیں بھی احتیاط سے شوکیس میں منتقل کر دیا ـــــ لیکن اس کے کپڑوں کے تانے بانے میں بسی ہوی سوکھے پھولوں کی بو سے جب وہ اس طرح محروم ہوگیا تو کچھ دنوں تک وہ پھر اداس اداس رہا۔

ایک دن اس کے دوسرے بچے ندو نے کھیلنے کے لیے کانچ اور کانسے کی چند گولیاں شوکیس سے نکال لیں ـــــ گنجے مسیح نے جب دیکھا تو وہ بہت بگڑا ـــــ ساری گولیاں ندو سے چھین لیں، اس کو ڈانٹ پلائی اور گولیاں پھر سے شوکیس میں محفوظ کر دیں۔

اس کے بعد پھر کسی نے شوکیس کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہ کی ـــــ آنے جانے والوں میں کوئی فیرو کی تصویروں کا البم بھی اس کے غیاب میں دیکھتا تو نہایت احتیاط سے وہیں رکھ دیتا جہاں سے اٹھایا تھا۔

آج صبح ہی سے گھر کا ماحول کچھ اداس سا تھا۔ بچے بالکل رہتے تھے لیکن اس کی بیوی اور وہ آپس میں کچھ کہے بغیر اپنے اپنے دلوں میں کوئی نشتر چھپائے ہوے خاموش تھے۔

فیرو کو جدا ہوے تین برس بیت گئے تھے۔ آج اس کی تیسری برسی تھی۔ اگر آج وہ ہوتا تو سولہ سترہ سالہ نوجوان ہوتا۔

گنجے مسیح کی چپ لوٹ آئی تھی۔ اپنے فیرو کے سامان کو جھاڑ پونچھ کر صاف کرنے کے لیے اس نے شوکیس کھولا تو فیرو کا کوٹ اور جوتا غائب تھا ـــــ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اپنی بیوی کو پکار کر اس نے پوچھا۔

بیوی نے بھیگی پلکیں اٹھا کر کہا ـــــ میں نے ندو کو پہنا دیا ہے۔ اس کے پاس گرم کوٹ نہیں ہے اور جوتا بھی پھٹ گیا ہے ـــــ آپ آج فیروز کی قبر پر جاتے ہوئے ندو کو اس کے اسکول پر چھوڑ دیجیے۔

ماں کے پیچھے سے نکل کر ندو نے گنجے مسیح کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ لباس اس پر سج رہا تھا۔

کچھ جواب دیے بغیر ندو کا ہاتھ تھام کر جب گنجا مسیح گھر سے باہر نکل گیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنے ایک ہاتھ کے سہارے کندھے پر ایک جنازہ اٹھا رکھا ہے اور اس کا دوسرا ہاتھ تھامے زندگی اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں ـــــ

موت اور زندگی کی اس کشاکش میں
گنجے مسیح اور یسوع مسیح میں کیا فرق ہے؟
میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا!

جوگندر پال

سَراپا

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج ساحرہ کی تصویر مکمل کر کے ہی دم لوں گا۔
وہ میرے سامنے قالین پر بیٹھی تھی، اس قدر زندہ، جیسے اس کے بدن میں سانسوں کا ذخیرہ ابد تک ختم نہ ہوگا اور یکسر ساکن، گویا ایک جامع تصویر۔ اور میں اس کی پینٹنگ تیار کر رہا تھا، اپنے محسوسات کو برش میں اٹکا کر انھیں کئی رنگوں میں بھگو بھگو کر کینوس میں بھر رہا تھا۔
ساحرہ ذرا سی ہلی تو میری پیٹھ پر بے شمار ایستادہ آنکھوں کی بینائی میں بیٹھی ہوئی اس کی شبیہہ بھی ہل ہل گئی، میرے برش کے ملائم بالوں میں بھیگا بھیگا رنگ دا تصور فرش پر گر کر ضائع ہو گا۔
اور میں منہ موڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔
اور وہ ہنسنے لگی۔
اور میری جھلاہٹ بے چاری بھی اس کی ہنسی سے رام ہو کر ہنس پڑی۔
اور میں سوچنے لگا۔ اے کاش تخلیق کے کسی انجانے معجزے سے میں یہ من موہن ہنسی بلا سوچے سمجھے چھٹ پٹ کینوس پر اتار سکوں، جھٹ پٹ، جیسے ساحرہ بلا سوچے سمجھے اتنے بھلے انداز میں ہنس پڑی ہے۔ یہ کیسے؟ مجھے تو ہر رنگ کو تیار کرنے سے پہلے، برش کی ہر جنبش سے پہلے گھنٹوں سوچنا پڑتا ہے، ہر تاثر کی تکمیل کے لیے پسینہ بہانا پڑتا ہے ——
ساحرہ پھر اپنے پوز میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کی گاڑھی ہنسی نے مسکان میں سمٹ کر اب ایک ہلکے پھلکے بے نام سے رنگ کا دوپٹہ اوڑھ لیا تھا، کچھ گلابی، کچھ سفید، کچھ پیلا، اور کچھ —— نہ جانے اس رنگ کا کیا نام تھا۔
پل پل بدلتے ہوئے رنگوں کے یہ امرلمن، کسی سوچے سمجھے فنی پلان کے بغیر یہ بھرپور تاثر، ہر لمحہ کسی نئے رنگ کا یہ زندہ سحر، یہ میری محبوب ساحرہ، یہ شبیہہ! یا اللہ تو کتنا عظیم فنکار ہے! تیری ہر تصویر کو ہر لحظہ ہر رنگ کے

پوری قدرت ہے۔ اے لافانی تخلیق کار، توصرف اس لیے خاموش ہے کہ تو نے اپنا سارا زورِ بیان اپنی تخلیق کو سونپ دیا ہے، کچھ اس طرح سونپ دیا ہے کہ وہ از خود بولتی ہے۔ اے خالق، اے فنکار، میرا سلام!—

"رک کیوں گئے؟" مجھے ساحرہ کی آواز سنائی دی۔

اور میں نے اس کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ لی۔

"میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" مسکان گاڑھی ہو رہی تھی۔ "اُدھر اپنی تصویر کی طرف دیکھو"۔

لیکن میں اس کی جانب تکتا رہا۔

ساحرہ مجھے انتہائی عزیز تھی۔ میری خواہش تھی کہ اپنی تصویر میں شگفتہ گل کا یہ سماں دائمی کر لوں اور کئی برس بعد میرے اس جواں سال تصور کی بدولت پیرِ سال نظریں بھی شباب کا تماشہ کرتی رہیں اور فنا کے بعد میری روح جہاں بھی جائے یہ بہار تصور اپنے ساتھ لے جائے۔

ساحرہ مجھے محبوب ترین تھی اور اس تصویر میں میں اپنی ساری محبت، سارا شعور جذب کر دینا چاہتا تھا—

"پھر رک گئے؟"

میں نے اپنا برش اٹھا کر تصویر کی طرف نگاہ کی اور اس کا جائزہ لے کر مجھے اطمینان نہ ہوا۔ ساحرہ کے چہرے کی شباہت تو نمایاں تھی مگر ساحرہ کا باطن، اس کا نمایاں حُسن دروں، میری ساحرہ ابھی تک تصویر میں ظاہر نہ ہو پائی تھی میں نے ساحرہ کی آنکھوں کا تصور کر کے تصویر کی آنکھوں میں جھانکا اور بے بسی سے تا دیر انگلیوں میں برش لیے رکا رہا، رک رک کر اس کی نظر کے نواح کے خوابناک نم آلود، چمکدار جالے بنتا رہا۔

"لطیف؟"

میں اپنے کام میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ جس وجود کے نقوش بنا رہا تھا، اُسی کی موجودگی سے غافل تھا۔

"او بابا۔ لطیف؟"

"ہاں — ں!؟"

"چھوڑو یہ تصویر" وہ سٹپٹائی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ "اور میری طرف دیکھو"

"ساری عمر تمھارا یہی روپ دیکھنے کے لیے تو یہ تصویر بنا رہا ہوں۔ اب بھی —— بوڑھا ہو کر —— مر کر بھی"

"نہیں" وہ اپنے پوز سے نکل آئی تو اس کا بنایا پوز اور دلربا معلوم ہونے لگا۔ "بڑھاپے میں میرا بوڑھا چہرہ تمھیں زیادہ اچھا لگے گا، اور جب ہم مر جائیں گے تو ہماری روحیں بے نام ہو کر بے شکل ہو کر ہمیں زیادہ اچھی لگیں گی —"

"بہت اچھا، میری خوب رو فلسفی" میں نے تصویر کی طرف متوجہ ہونا چاہا— "اب تم پھر اپنے پوز میں

فٹ ہو جاؤ۔"

"نہیں پہلے میری بات سنو۔"

"سناؤ۔" میں نے سوچا کہ ایک ہی طرح بیٹھی بیٹھی بے چاری تھک گئی ہوگی۔

"تم کھڑے کھڑے پہاڑوں کی، آسمانوں کی۔ صرف جامد نظاروں کی تصویریں بنایا کرو۔ انسان بھی کوئی تصویر بنانے کی شئے ہے؟ جو شئے تغیر پذیر ہو اس کی تصویر کا کیا بنانا۔؟"

"نہیں۔ ساحرہ" میں نے اسے بتایا۔ "جامد شئے تو خود ہمیشہ ایک ہی حالت میں کھڑی رہتی ہے، اس کے بنانے، نہ بنانے سے کیا ہوتا ہے؟ میرے نزدیک آرٹ کا یہی کمال ہے کہ زندگی کی ہر ہیئت کو اس کے بدل جانے سے پہلے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لے، لمحوں کو جاوداں کر دے۔ کھڑے کھڑے پہاڑ اور آسمان، ٹھہرا ٹھہرا سمندر۔ یہ سب مجھے بے جان لگتے ہیں۔ میں اپنا ماڈل ہمیشہ فانی مخلوق میں ڈھونڈتا ہوں، میری ہر پینٹنگ اس خوف سے برآمد ہوتی ہے کہ یہ جاندار مر جائے گا اور اسی خوف سے میرا فن دل و جان سے اُسے لافانی بنانے میں جٹ جاتا ہے۔ — اچھا اب تم ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ جاؤ۔" میں نے اپنا منہ تصویر کی طرف موڑ کر پھر برش اٹھا لیا لیکن یکدم اس کی جانب مڑ گیا۔ "مجھے تسلیم ہے ساحرہ، کہ زندگی کی ہر تحریک صرف ساکن حالت میں ہی تصویر کے خطوط۔ . . میں مفید ہوتی ہے، پر مصوری میں رواں زندگی کا قیام بھی نقل و حرکت کا ہم معنی ہے بلکہ اس عمل سے نقل و حرکت کا تاثر شدید ہو جاتا ہے — نہیں ساحرہ۔" میں نے اسے بولنے سے روک لیا۔ "مجھے جامد نظاروں سے قطعی دلچسپی نہیں، مجھے اپنے دل پسند موضوعات صرف جاندار چہروں میں ہی چھپا ہوتے ہیں۔ میری تصویروں میں غیر متحرک خاموش چہرے جی اٹھیں، یہی میرا آدرش ہے۔"

مگر ساحرہ کی تصویر کی طرف سر اٹھا کر مجھے اپنے آدرش کی توانائی کے باوجود کلا کے انحطاط کا احساس ہونے لگا یہ ساحرہ یقیناً وہ ساحرہ نہ تھی جو میرے دل و دماغ میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"خوبصورت تصویریں اتنی چپ کیوں ہوتی ہیں لطیف؟" ساحرہ نے اپنی تصویر کی طرف بغور دیکھتے ہوئے اچانک سوال کیا۔

"سب تصویریں خاموش نہیں ہوتیں ساحرہ۔" میں نے کہا۔ "صرف وہی تصاویر چپ چاپ لگتی ہیں جن کے مصور زیادہ بولنے کے عادی ہوں۔" میں نے گویا اپنے آپ کو کوسنے کے انداز میں اسے بتایا

"نہیں، تم غلط کہہ رہے ہو۔" اس نے بدستور اپنی تصویر پر نظر جمائے رکھی۔ "خوبصورت تصویریں اس لیے خاموش رہتی ہیں کہ انھیں اپنی خوبصورتی کی خبر نہیں ہوتی۔" اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آ جانا چاہا لیکن میں نے اسے وہیں بیٹھی رہنے کا اشارہ کیا۔ "میں اپنا مقابلہ تمھاری اس تصویر سے کر رہی تھی۔ یہ مجھ سے بدرجہا حسین ہے کیوں کہ اپنے آپ کو بھول کر اپنے محبوب سے متعلق سوچ رہی ہے، مگر مجھے ہمیشہ یہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ تم میرے متعلق کیا سوچتے ہو۔ بھلا بتاؤ کہیں یہ تصویر تمھاری شکایت کا اظہار تو نہیں لطیف؟"

"فنِ لطیف کسی شکایت کے اظہار کا متحمل نہیں ہوتا، بلکہ فنکار کی سپردگی سے وجود پذیر ہوتا ہے۔" لیکن مجھے شبہ ہونے لگا کہ ساحرہ کا انداز درست ہے، شاید اسی لیے میری یہ تصویر ساحرہ کی تصویر نہیں بن رہی کہ میں نے ابھی تک اپنے آپ کو کلی طور پر اس کے سپرد نہیں کیا۔ میں آنکھیں کینوس پر گاڑ کر تصویر کی تہوں میں غوطے کھانے لگا ـــــ اور میرا برش اس کی پلکوں کے نیچے چھاؤں کی پُرحدت خنکی آباد کرنے لگا۔

"اور یہاں ـــــ جہاں اس کی ٹھوڑی، ہونٹوں کے دونوں کناروں کی طرف آرہی ہے ـــــ یہ ٹھوڑی ساحرہ کی نہیں، اس کی ٹھوڑی تو گویا کسی ایرانی رقاصہ کی طرح اپنے لچکدار بازو اوپر ہونٹوں کے کناروں کی طرف پھیلا کر مسکرا رہی ہوتی ہے اور لب ہلتے ہی ناچنا شروع کر دیتی ہے۔" میرا برش اس کی ٹھوڑی اور لب چھونے لگا۔

کچھ دیر بعد میں نے ساری تصویر کا جائزہ لیا۔

"نہیں!"

"نہیں کیا؟" ساحرہ بول اٹھی۔ "اچھی بھلی تو ہے، بالکل میری طرح۔"

"ہاں تمھاری طرح، لیکن تم آپ نہیں۔" وہ بے چاری گزشتہ دو ماہ سے میرا ماڈل بنی، ہر دم سیدھی بیٹھ بیٹھ کر صرف اکڑ ہی نہ رہی تھی بلکہ اسے میرے آرٹ کے نظریے سن سن کر بور ہونے کے باوجود ان میں دلچسپی ظاہر کرنا پڑتی تھی

"تم خود بھی بالکل اپنی طرح ہی ہو ساحرہ لیکن تم میں اور اس تصویر میں یہ فرق ہے کہ تصویر صرف تمھاری مشابہت کی حامل ہے اور تم خود آپ ہو۔ میری یہ تصویر محض تمھارے جسم کا بوجھ اٹھائے ہوئے معلوم ہوتی ہے۔"

"اپنے جسم کا بوجھ تو مجھے بھی اٹھانا پڑتا ہے۔"

"نہیں زندہ تصویر کا بدن اس کا بوجھ نہیں ہوتا، اس کی ذات ہوتا ہے۔ جب تم اٹھتی بیٹھتی یا چلتی پھرتی ہو تو تمھاری اپنی ذات یہ سب کچھ کرتی ہے مگر میری یہ تصویر اپنی ذات اور صفات کی حامل نہیں صرف تمھارے وجود کے بوجھ سے لدی ہوئی ہے۔ لیکن میں اسے مکمل کر کے، زندہ کر کے ہی دم لوں گا ـــ آج ہی ـــ ابھی ـــ تھوڑا اور صبر کرو۔"

اور میرا برش اس کے وجود کے آس پاس حیات آگیں فضا کے خطوط کو گہرا کرنے لگا، اس کے نتھنوں کے سامنے ایسا ماحول پیدا کرنے لگا جیسے وہ واقعی سانس لے رہی ہو۔

"بہت خوب!" کچھ توقف کے بعد اس کی پُرتحسین آواز سن کر میرا انہماک ٹوٹ گیا۔

"مجھے اب یوں لگ رہا ہے کہ میں یہاں نہیں ہوں، وہاں ہوں، تمھاری تصویر میں ـــــ سچ، میں اب ایک نہیں رہی، دو ہو گئی ہوں۔"

میں مسکرانے لگا۔

"ہر لمحہ واحد ہوتا ہے ساحرہ۔ گھبراؤ نہیں۔ میری تصویر زندہ ہو گئی تو پھر بھی تم ایک ہی رہو گی۔ میرے فن کی تکمیل کے بعد تم میں اور اس میں کوئی امتیاز نہیں رہے گا۔"

میں اس کی طرف جی بھر کے دیکھنے لگا "لیکن ابھی تک تمہارا نقش میرے احساس سے ویسے کا ویسا ہی باہر نہیں آیا، نہ معلوم کیوں؟"

"کیوں کہ میں وہیں رہنا چاہتی ہوں۔"

"نہیں میرے برش کے نرم و نازک بال تمہاری سالمیت کو ضرور سمیٹ لیں گے —— اور میں نے اپنی سبھی حسّیں یکجا کر کے کینوس پر چھوڑ دیں۔

اس کی ناک اب واقعی سانس لے رہی تھی میں نے برش کی جنبش سے سینے کی گولائیوں کو بھی ہلا کر کچھ اس طرح ٹھہرا دیا کہ سانس کے تناسب سے ذرا ذرا ہلتی نظر آئیں —— پھر اس کی آنکھوں کی تاب کو اور بڑھا کر دیا اور پھر پیشانی کی جلد میں ادراک کے تاثر کو کیلا کر کے اس میں نسوانی خوف اور خوشی کا ہلکا ہلکا سماں سمو دیا، جیسے تاریکی اور اجالے کا نکاح پڑھا جا رہا ہو۔

اور اب میرا برش اندھے اندھے راستوں سے باہر آ پہنچا تھا، سیدھی راہ پر آ کر اُسے معلوم ہونے لگا تھا کہ منزل تو یہیں دو چار ہاتھ پر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ تیز گام ہو گیا۔

"ساحرہ، بس چند ساعت اور!"

میرے چھپے چھپے رنگ اب آڑ سے باہر نکل آئے تھے، آپس میں گلے مل کر ابدی رفاقت کے پیمان باندھ رہے تھے، ان کا ملاپ نہایت فطری معلوم ہوتا تھا، جیسے محبت کرنے والے نفوس آپس میں جھجک برت کر یک قالب ہو جائیں تو انھیں تعجب ہو کہ فوراً ہی کیوں نہ گھل مل گئے۔

ساحرہ کی تصویر نے آخر اپنی ذات کا سراغ پا لیا تھا، وہی قد و خال، وہی روح، سراپا وہی گویا ابھی ابھی وہ حسب عادت تھوڑی دیر چپ رہ کر منہ کھول دے گی۔ اس کی رگوں میں خون دوڑ رہا تھا، بالوں سے خوشبو آ رہی تھی قطعی ساکن ہونے کے باوجود اس کے بدن میں لبالب زندگی بھر گئی تھی، روح اور قالب ایک ہو گئے تھے۔

اور میں نے برش اٹھا کر نقش آخر کے لیے اس کا ایک جائزہ لیا، لیکن اب اس زندہ جاوید شبیہ میں کسی مبہم ترین نقش کی بھی گنجائش نہ تھی۔

"ار —— ر —— رر! برش پرے کرو بابا!"

"او —— و!!"

میں دراصل اپنی تصویر سے منہ موڑے محویت کے عالم میں یہاں ساحرہ کے سامنے کھڑا تھا!

(بشکریہ ریڈیو پاکستان)

رفعت صدیقی

ہیرے کا جگر

وہ شام بھی گرمیوں کی کسی اور شام کی طرح تھی جب کہ نواب عاصم جنگ خلافِ معمول پیدل اپنے گھر کی طرف محوِ خرام تھے۔ بگھی، انھوں نے گلی کے نکڑ سے گھر کی طرف روانہ کر دی تھی۔ پیدل چلنے کا موڈ تھا اور موڈ جب ان جیسے کسی نواب کا ہو تو پھر وہی ہوتا ہے جو موڈ کا تقاضہ ہو۔ بگھی گئی اور ساتھ ہی دو پیادے اور ایک مصاحب بھی بادلِ ناخواستہ گئے۔ اور اب نواب عاصم بڑی تمکنت کے ساتھ نپے تلے قدم ڈالتے جا رہے تھے۔ شبنمی ململ کے کلیدار کرتے سے جس کے کاجوں میں ہیرے کنیاں جڑی ہوئی سونے کے بٹن تھے ان کا گٹھا ہوا سرخ و سپید جسم، ریشمی بنیان سے جھانک رہا تھا۔ بڑی گھیردار چوڑیوں والا پاجامہ ان کی سڈول پنڈلیوں پر چپت تھا اور دونوں پائنچوں کے بیچ ریشمی ازار بند لٹک رہا تھا۔ سر پر لگی ہوئی رام پور کی دو پلّی ٹوپی پر سنہری کام کیا ہوا تھا۔

چلتے چلتے انھوں نے اپنی چمکدار کھچڑی داڑھی پر ہاتھ پھیرا تو انھیں یاد آیا کہ بہت دنوں سے انھوں نے مہندی کا خضاب نہیں لگایا۔ وہ گورکھپوری عطّار اس خضاب کی پڑیاں دے کر اور روپوں کی کھنک اپنی جیب میں لے کر تو چلا گیا لیکن انھوں نے ابھی اسے آزمایا نہیں ـــــ خیر اب سہی۔

جھٹ پٹے کو دم توڑے کافی دیر ہو چکی تھی اور رات نے اپنے قدم اچھی طرح جما لیے تھے۔ دکانوں اور راستے پر گیس کے ہنڈے، فانوس اور بجلی کی روشنیاں، باتوں کی پھلجھڑیاں اور قہقہوں کے انار ماحول کو منور کیے ہوئے تھے۔ وہ جس دکان یا مکان کے سامنے سے گزرتے لوگ چونک کر سیدھے ہو جاتے اور سلاموں کا تانتا بندھ جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ آدمی نہیں سلام کرنے کی مشینیں ہیں جنھیں سرکارِ عالی نے برطانیہ سے منگوایا ہے۔

جب وہ گزر جاتے تو کوئی اجنبی پوچھتا "یہ کون ہیں؟" اور جواب ملتا "بیوی والے نواب ہیں۔" اور سننے والا مطمئن ہو جاتا۔ یہ نام حیدرآباد دکن کی تاریخ میں خاصا مشہور تھا۔ نواب عاصم اپنے اصلی نام عاصم علی خاں یا خطاب نواب عاصم جنگ بہادر سے اتنے معروف نہ تھے جتنے اس بے ڈھنگے نام سے۔ یہ بات نہ تھی کہ نوابوں کے بیویاں نہ تھیں یا یہ کہ وہ کنوارے ہی تھے۔ بھلا اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی کے امرا اپنے حضور پُرنور کی قائم کردہ روایت سے انحراف کیسے کرتے؟ ہر ایک کے

پاس ماشاءاللہ بیویوں کی ٹیم موجود تھی۔ لیکن، نہ جانے کس منچلے نے نواب خانم جنگ کی چوتھی شادی پر یہ پھبتی اڑا دی اور لوگوں کو دل سے یہ نام پسند آ گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسی نام سے مشہور بھی ہو گئے۔ حتیٰ کہ یہ بھی سنا گیا کہ خود ایک بار حضور پرنور نے یہ نام سماعت کیا تو تبسم فرمایا اور ارشاد کیا کہ چاہے نام تصنیف کرنے والا کتنا ہی ناقابلِ اعتنا کیوں نہ ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ لکھنؤ کے جگت بازوں سے کسی طرح کم نہیں۔ اور ڈیوڑھی کے جوان اس خبر کو لے اڑے اور دوسرے دن سارے شہر میں یہ بات پھیل گئی۔

تو یہ تھی چوتھی شادی جس نے انھیں یہ مقبولِ عام نام دیا۔ اس شادی کا معاملہ بھی کچھ عجیب لطیفہ سا رہا۔ خانم نواب شمس الدولہ معتمل شہزادگان کے ہاں ان کے سب سے چھوٹے لڑکے کی رسمِ ختنہ میں شریک تھے۔ عشائیہ تناول کرنے کے بعد نصف شب تک حقے، شطرنج اور قہوے کا دور چلتا رہا۔ ایک ایک کرکے سارے امرا سدھارے۔ سب سے آخر میں قہوے کی چوتھی پیالی پی کر انھوں نے چاندی کا ورق لگا ہوا، بادام کی ہوائی ملا ہوا پان نوش جان کیا اور اپنی نقروی موٹھ والی چھڑی سنبھال کر، کمخواب کی اچکن کے سیپ کے بٹن لگائے اور چلنے کو تیار ہوئے۔ میزبان سے معانقہ کرنے کے بعد انھوں نے نوکر کو بھیجا کہ جا کر کوچوان سے جو شاید سو رہا تھا کہے کہ بگھی پھاٹک پر لے آئے۔ میزبان انھیں دروازے تک چھوڑنے آئے اور دوبارہ معانقہ کرکے رخصت کیا۔ وہ بنگلے کے دروازے سے نکل کر پھاٹک کی طرف روانہ ہوئے۔ آدھی رات چاندنی میں ڈوبی ہوئی تھی اور بنگلے کی سرسبز و شاداب روشوں پر ہار سنگھار کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ رات کی رانی کی مہک رگِ جاں میں کسک پیدا کر رہی تھی کہ اچانک کوئی ان سے آ ٹکرایا۔ یہ ایک لڑکی تھی۔ سیدھے سادے کپڑوں میں ملبوس، سرخ و سپید گدرائے ہوئے متناسب جسم اور شہابی رخساروں والی ہانپتی ہوئی لڑکی جس کی سانسوں میں شبنم کے قطروں سے دھلے ہوئے غنچوں کی مہک تھی اور جس کی گھنی زلفوں میں صنوبر کے درختوں کی ساری رعنائی سمٹ آئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے انھیں یوں محسوس ہوا جیسے رات کی خنکی میں جان پڑ گئی ہو ــــ انھوں نے کسی قدر ہکلاتے ہوئے پوچھا ــــ "تت ــــ تم کون ہو؟"

"میں نواب بیگم کی ــــ کنیز ہوں، سوسن۔" ہانپتی ہوئی آواز میں ساغر کی کھنک تھی۔

"ادھر کیسے آئی؟" انھوں نے کچھ سوچ کر اور رک رک کر پوچھا۔

"میں ــ میں" وہ گھبرا گئی "آنکھ ــ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے ہم لوگ۔"

"ہوں ــ" انھوں نے اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا۔ لڑکی ان کی نگاہوں کی حدت سے سرخ ہو اٹھی اور جانے کے لیے مڑی۔ وہ مبہوت سے کھڑے اس کو اپنی سہیلیوں تک جو کسی قدر دور سہمی ہوئی کھڑی تھیں جاتا ہوا دیکھتے رہے پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر چلنے لگے۔ انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر قدم بجائے روش پر پڑنے کے ان کے دل کو روندر رہا ہو۔

اور دوسرے ہی دن جب انھوں نے اپنا شادی کا پیغام نواب شمس الدولہ کی حسین ترین کنیز سوسن کے لیے

بیچ دیا تو کھلبلی مچ گئی۔ شمس الدولہ نے کہا "بھئی اگر ایسی ہی سوسن اچھی لگی تھی تو اسے مانگ لیتے۔ اس میں دھرا ہی کیا تھا۔؟
لیکن شادی؟ یہ بھی خوب رہی!"
لیکن عاصم جنگ مصر تھے کہ کروں گا تو نکاح ہی ورنہ پھر میری آپ کی دوستی ختم۔ مجبوراً شمس الدولہ نے مان لیا
پشت ہا پشت کے تعلقات تھے جو ایک ادنیٰ کنیز کی خاطر وہ کیسے توڑے جاتے؟ بیاہ ہوا اور بڑے چاؤ سے عاصم جاہ نے
کنیز سوسن کو اپنی چوتھی اور سب سے چہیتی بیگم ہیرا فروز بننے کا شرف بخشا۔
ان کی ڈیوڑھی کے تمام آداب و مراتب ہیرا فروز بیگم نے جلد ہی سیکھنے شروع کر دیئے۔ شمس الدولہ آدمی تو خاندانی
تھے مگر ان کی ڈیوڑھی کے طور طریق سے عاصم جنگ مطمئن نہ تھے۔ اس لیے سوسن کی باقاعدہ تربیت ہونے لگی اور محل کی دوسری
بیگمات جلن اور حسد کے مارے اپنی خوراک دگنی کر دینے پر مجبور ہو گئیں اور اس طرح روز بروز فربہ اندام ہونے لگیں۔
ہاں تو بات اس شام سے چلی تھی جب کہ عاصم جنگ پیدل اپنے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے۔ جب وہ احمد شیر فروش
کی دکان کے سامنے سے گزرے تو ایک ایسی بات ہوئی جس نے ان کی بعد کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔ دکان کے اندر کے
حصے میں زور و شور سے بحث ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نواب عاصم کی چوتھی بیوی اور اس مولوی
میں جو آج کل اسے قرآن مجید پڑھا رہا ہے ناجائز تعلقات ہیں۔ یہ میں نے نواب کے محل کی آیا سے سنا ہے۔"
پگھلا ہوا سیسہ نواب عاصم کے کانوں میں اتر گیا۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور مٹھیاں بھنچ گئیں۔ تو انھوں نے
چھوٹی بیگم کے تعلق سے جو افواہیں سنی تھیں وہ باہر بھی پہنچ گئیں۔ پہلے پہل تو انھوں نے اسے یہ کہہ کر اہمیت نہ دی تھی کہ
بیگمات کی لگائی ہوئی آگ ہو گی۔ بھلا وہ مولوی جو اس میں شک نہیں کہ نوجوان تھا اپنی بدحو شکل و صورت سے سوسن کو
اپنی طرف کیسے متوجہ کر سکتا ہے؟ اور پھر انھیں سوسن پر پورا اعتبار تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے پیسے کو تاج میں جگمگانے
کا موقع ملنے پر تاجور کا ممنون ہونا ہی چاہیے۔ کیا سوسن اتنی گئی گزری ہے کہ اس دو ٹکے کے مولوی کی خاطر جو محض ان
کی آواز سن کر کانپنے لگتا ہے محل کے آرام و آسائش پر لات مار دے گی؟ لیکن پھر یہ چہ میگوئیاں —— یہ سرگوشیاں
—— یہ افواہیں —— جانے کتنی صداقت ہے ان میں؟
ڈیوڑھی میں جب وہ داخل ہوئے تو ان کا دماغ کسی تپتے ہوئے توے کی طرح گرم ہو چکا تھا۔ وہ سیدھے اپنی
خواب گاہ میں گھس گئے اور بستر پر گر پڑے۔ خادم نے خاصہ تیار ہونے کی اطلاع دی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ خاصہ بڑھا دو" انھوں نے کہا۔

سوسن لچکتے ہوئے آئی "اللہ کیسی طبیعت ہے حضور کی؟ کہیں بخار تو نہیں ہو گیا —— صدقے ہو جاؤں"
اس نے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

انگارے دہک اٹھے "بیگم تم کھا لو مجھے بھوک نہیں۔" انھوں نے کروٹ بدلی۔

"پھر ہم بھی نہیں کھائیں گے" وہ ٹھنک کر بولی۔

"تنگ نہ کرو ۔ جاؤ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"ہائے" اس نے ناک پر انگلی رکھ لی" شربت انار بھجواؤں؟"

"نہیں کچھ نہیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں سوائے تنہائی کے۔"

سوسن بجھ گئی اور مردہ قدموں سے واپس چلی گئی۔

رات بھر مخمل کے نرم گدے برف کی طرح سرد اور پتھر سے زیادہ سخت اور کھردرے لگتے رہے۔ رات بھروہ بھوبل میں دبے ہوئے آلو کی طرح سیکتے رہے، پھنکتے رہے جانے کب سویرے آنکھ لگ گئی۔ صبح دیر گئے آنکھ کھلی تو ان کا چہرہ دمک رہا تھا وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئے تھے۔

اس دن خلاف معمول جب وہ دوپہر ہی سے گھر آ گئے تو سبھوں کو بڑا تعجب ہوا۔ یہ ایک عجیب اتفاق تھا۔ اس سے پہلے شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو۔ عاصم جنگ کی اصول پرستی کا چرچا ساری ریاست میں تھا۔ دفتر کے واقعات میں چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے لیکن ان کا گھر چلا آنا ناممکن تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ اصول پرستی انھوں نے انگریزوں سے سیکھی ہے۔ بہرحال سیکھی انھوں نے کسی سے بھی ہو گی لیکن نوابوں کے لیے وہ قابل مثال ہی تھے۔

بگھی سے وہ خاموشی سے اترے۔ دیوان اور ریگلوس ہی میں وہ اپنی چھوٹی بیگم کے مکان کی طرف بڑھے۔ یہ مکان جو کسی چھوٹی سی ڈیوڑھی ہی کی طرح تھا۔ انھوں نے سوسن کے لیے علاحدہ کر دیا تھا۔ یہاں ان کی دوسری بیگمات کا داخلہ قطعی ممنوع تھا۔ نواب سلطان مرزا کا واقعہ ابھی تک انھیں نہیں بھولا تھا۔ بےچاری نواب سلطان کی دوسری بیوی کا نے بڑے اہتمام سے اپنی بڑی سوکن کے لیے اقساط میں زہر کے ذریعہ موت کا انتظام کیا تھا۔

ایک نوکر کو بلا کر انھوں نے پوچھا "بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟"

"وہ اندر کمرے میں مولوی صاحب سے قرآن شریف پڑھ رہی ہیں" ادب سے جواب دیا گیا۔

اندر کمروں میں چاروں طرف سناٹا تھا۔ یہ کمبخت مغلانی کہاں گئی؟ وہ جھنجلا اٹھے۔ وہ آہستگی لیکن بڑے کروفر کے ساتھ چلتے ہوئے ایک کمرے کے قریب پہنچے جس میں سے کچھ آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ دروازہ اندر سے بند تھا ان کے جبڑے بھنچ گئے اور پیشانی کی رگیں تن گئیں۔ انھوں نے اچانک زور سے دروازہ کھول دیا اور پھر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سوسن کا ہاتھ نوجوان مولوی کے ہاتھوں میں تھا۔

"آپ!" اس کے منہ سے تھرتھراتے ہوئے نکلا۔ دونوں لرز گئے۔ نواب عاصم شدت غیظ سے دانت پیسنے لگے ــــ

"تو تم یوں پڑھایا کرتے ہو قرآن مجید موذی" ان کی گرجدار آواز گونجی۔ مولوی کانپتا رہا۔

"تم ــــ تم نے یہی کچھ سیکھا اپنی مقدس درسگاہوں سے؟ مقدس کتابوں نے تمھیں یہی درس دیا ہے کہ تم دوسروں کی آبرو خاک میں ملاتے رہو" ان کی آواز کپکپا گئی۔

"رم — میں — معافی چاہتا ہوں جناب" مولوی دوزانو ہوگیا۔
"معافی کے بچے" ان کی آواز سے ڈیوڑھی کے درودیوار لرز گئے اور باہر مہرتی گوش نوکروں کا گرد مجانے لگا۔ اب معافی مانگتا ہے میری عزت پر ڈاکہ ڈال کر؟" وہ غصے کی شدت سے بے بس ہو گئے۔
"تو — تو شادی کرنے کے لیے تیار ہے اس سے — اس دغاباز بد باطن عورت سے؟"
"جی!!" مولوی پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ آنکھیں حلقوں سے باہر آگئیں۔
"میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔ تم اس سے نکاح کرنے تیار ہو یا یہ کہ محض دل لگی کر رہے تھے۔ وقت گزار رہے تھے؟"
مولوی خاموش لرز تا رہا۔
"بولو! جواب دو بدمعاش!!" وہ پھر چیخے "جواب دو۔ ورنہ میں آج تمھاری کھال کھینچ لوں گا۔ ہاں یا نہیں؟ کیا کہتے ہو؟ ان کے منہ سے کف اڑ رہا تھا اور آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔
مولوی نے سوسن کی طرف دیکھا۔ ایک بجلی کا کوندا لپکا۔ مولوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور سوسن بے اختیار روتی ہوئی ان کے پیروں سے لپٹ گئی۔
"رحم — رحم میرے آقا" اس کے گلے سے گھٹی ہوئی آواز نکلی — انھوں نے سوسن کو پاؤں کی ٹھوکر سے دور کر دیا اور دھاڑے۔
"غلام علی!"
"جی حضور!" ان کا پرانا دربان حواس باختہ آکھڑا ہوا۔ "جاؤ اور فوراً قاضی صاحب کو بلا لاؤ۔"
قاضی صاحب کے آنے تک وہ بڑی بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے رہے۔ سوسن اور مولوی ایسے کھڑے تھے جیسے ابھی پھانسی کا فیصلہ انھیں سنایا جانے والا ہو۔
قاضی صاحب آ گئے۔ نواب عاصم نے فوراً سوسن کو طلاق دے دی — پھر اس کا نکاح مولوی سے پڑھوا یا گیا۔ دو نوکر گواہ بنے۔ اس عجیب و غریب نکاح کے بعد نواب عاصم نے سوسن سے کہا "یہ مہر کے تین ہزار اور مزید ایک ہزار تمھارے سپرد ہیں۔ اب تم یہاں سے فوراً چلی جاؤ۔" اور پھر وہ کمرے سے اس تیزی سے باہر نکل گئے جیسے اس کمرے میں مزید سانس لینا ان کے لیے دوبھر ہو۔

البرٹو موراویا
نصر اللہ کیپلانہ

محافظ

(اطالوی کہانی)

میں تنہا رہنا پسند کرتا ہوں کیوں کہ لوگ میرے چشموں اور میری زنانہ آواز کے باعث مجھے تنگ کرتے ہیں اور میں ان کی اس حرکت پر برانگیختہ ہو کر ہکلانا شروع کر دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کمپنی نے مجھے اپنے ایک ڈپو پر محافظ کی آسامی کے لیے پیش کش کی جو یہاں سے پندرہ میل دور سالاریا کے قریب تھا تو میں نے یہ نوکری بغیر کسی پس و پیش کے قبول کر لی۔ یہ ڈپو ایک کھلی وادی میں تھا جس کے ارد گرد سبزی مائل پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ چار کونوں والی وادی کی زمین بنجر تھی اور اس پر ہر وقت غبار سا چھایا رہتا تھا۔ اس کے ایک طرف اینٹوں کی ایک دیوار تھی اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کی قطار چلی گئی تھی۔ یہ جھونپڑیاں ساخت کے اعتبار سے لمبی اور نیچی چھت والی تھیں۔ ہر جھونپڑی کے وسط میں نوکیلے پرنالے کے نیچے ایک ٹوٹا ڈرم رکھا ہوا تھا۔ جھونپڑیوں میں ہر قسم کی چیزیں تھیں۔ سمنٹ کی بوریاں، پائپوں کی لمبی لکڑیاں، ٹائلیں، گندے پٹرول کے ڈرم، شہتیروں کے ڈھیر، اینٹیں غرض اس طرح کی سب چیزیں ان جھونپڑیوں میں سے ایک میں میری رہائش تھی۔ اس کے دونوں کمرے بغیر چھت کے تھے۔ ایک سونے کا کمرہ تھا۔ استعمال کے لیے ایک میز اور چند کرسیاں تھیں۔ اس جگہ آ کر یہی احساس ہوتا تھا کہ ہم دنیا سے دور ایک کھلے خطۂ ارض پر ہیں۔ سالاریا کو دیکھنے کے لیے جو یہاں سے قریب ہی تھا نزدیک کی ایک پہاڑی پر چڑھنا پڑتا۔ نیچے سالاریا ایک طرف سیدھ میں چنار قسم کے سفید دھاریوں والے درختوں کی دو رویہ قطاروں میں پھیلتا چلا گیا تھا۔ اور ذرا اور نیچے جا کر "ادسٹریاڈ کا کیا ٹوری" کا سائن بورڈ لگا ہوا تھا جہاں میں کھانے کے لیے جایا کرتا تھا۔ مجھے کمپنی کی طرف سے ایک پستول اور گولہ بارود کی اچھی خاصی مقدار دی گئی تھی اس کے علاوہ ایک شاٹ گن بھی تھی جس سے میں بعض اوقات پہاڑیوں میں جا کر شکار کیا کرتا تھا۔ یہاں انسان کی شکل شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی۔ یہاں پر رات کو ارد گرد چکر لگا کر پہرہ دینے کے سوا میرا اور کوئی کام نہ تھا۔

مجھے یہاں آئے چار ماہ کا عرصہ گزر گیا اور اس دوران میں کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ پھر ایک شام میرے دروازے پر دستک ہوئی میں نے خیال کیا کمپنی کا کوئی آدمی ہوگا اور دروازہ کھولنے کے لیے اٹھا۔ مگر میرے سامنے دو مرد اور ایک عورت کھڑی تھی۔ مردوں میں سے ایک کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا نام "رینالڈی" تھا، اور وہ لاری ڈرائیور تھا

ں سے پہلے جب میں گماؤں کے گودام میں کام کرتا تھا میں ایک شخص ایسا تھا جس نے کبھی بھی میری آواز اور چشموں کا مذاق نہ اڑایا تھا۔ شکل وصورت میں وہ مجھ سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ میں چہرے بشرے سے گنوار معلوم ہوتا تھا اور وہ ایک شریف انسان۔ وہ لمبے قد اور مضبوط اعضا کا ایک خوبرو جوان جب کہ میں ایک بدصورت سا آدمی ہوں۔ اپنی شکل وصورت کے لحاظ سے میں عورتوں کے لیے ذرہ بھر کشش نہیں رکھتا۔ دوسری طرف وہ ایک ایسی شخصیت کا مالک تھا کہ وہ جتنی عورتیں چاہتا پھنسا سکتا تھا، وہ مجھ سے قطعاً مختلف تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں اسے پسند کرتا تھا کہ میں اس کا دلدادہ ہو گیا تھا اس کے ساتھ جو عورت تھی اس کا نام "ایمیلیا" تھا۔ وہ مختصر قد و قامت کی گول مول سی عورت تھی۔ اس کا بیضوی چہرہ، زرد رنگ کا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں اور منہ ہر وقت کھلا رہتا تھا جس سے یہی معلوم ہوتا کہ وہ ہر وقت مسکراتی رہتی ہے۔

جہاں تک دوسرے آدمی کا تعلق تھا وہ "مونٹرو لونڈو" کا رہنے والا تھا اور اس کا نام "تھوڈورو" تھا۔ اس کے بال سرخ اور گھنگریالے تھے۔ آنکھیں بلی کی آنکھوں کی مانند زرد اور ناک بڑی نوکیلی تھی۔ اس کے رخساروں کا رنگ ارغوانی تھا جیسے کہ شمال مشرقی ہوائیں متواتر اس کے چہرے پر چل رہی ہوں۔

"رینالڈی" نے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں اسے جھونپڑی کے اندر لایا۔

"فلینزو" اس نے مجھے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا "محافظ کے عہدے پر رہتے ہوئے اور بغیر کسی تکلیف کے تمہارے لیے رقم پیدا کرنے کا یہ سنہری موقع ہے۔" میں نے اپنی آنکھوں کو گھمایا اور خاموش رہا۔ اس نے میری خاموشی سے حوصلہ پاکر جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ ان لوگوں نے اسباب کی ایک بھاری کھیپ چرائی تھی۔ شاید شہر کے کسی گودام سے۔ ان کی یہ تجویز تھی کہ چوری کا یہ سامان یہاں سے اٹھالیں گے اور اس کے معاوضہ میں وہ مجھے ایک معقول رقم دینے کے لیے تیار تھے۔

میں یہ سن کر اندر ہی اندر جل بھن گیا۔ مگر انکار کا لفظ زبان پر نہ لا سکا کیوں کہ "رینالڈی" کو میں بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا "سنو رینالڈی! میں یہاں محافظ کا کام کرتا ہوں۔ ہے یا نہیں؟"

"یقیناً تم محافظ ہو"

"ٹھیک ہے۔ میں محافظ ہوں اور محافظ ہی رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میرا مطلب ہے تم جو چاہو کر سکتے ہو۔ تم اپنا سامان جھونپڑی میں رکھ سکتے ہو۔ جب چاہو آجا سکتے ہو۔ مگر ظاہر یہ کیا جائے کہ میں اس سامان سے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میں نے اسے دیکھا تک نہیں، اور نہ ہی تمہیں جانتا ہوں اور اگر وہ کسی موقع پر تم سے پوچھ بیٹھیں تو تم بھی یہی کہو کہ تم مجھے نہیں جانتے . . . . . میرا مطلب ہے کہ تم نے یہ سامان بغیر میرے علم کے یہاں ڈالا ہے۔ سمجھے!"

انھوں نے بڑی حیرانی سے سروں کو جھٹکا دیا اور "تھوڈورو" نے قریب قریب دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ "مگر تمہیں سامان پر نظر رکھنی پڑے گی۔ کیا تم اس کے لیے بھی تیار نہیں ہو؟ یہ تو انصاف کی بات ہے اگرچہ تم ہمیں نہ جانو . . .!"

مگر رینالڈی نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے کہا: "تم فکر کیوں کرتے ہو ونسینزو! تمھیں اس معاملے میں پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔"

"میں یہاں کا محافظ ہوں۔ چلو اسی طرح سہی میں تمھارے سامان کا بھی محافظ رہوں گا" مگر ٹیوڈرو نے دوبارہ گرجتے ہوئے کہا۔ "تمھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں! تمھیں تمھارا حصہ مل جائے گا۔"

"فکرمند تو تمھیں نہیں ہونا چاہیئے۔ تمھارا ستیاناس ہو" میں نے غصے میں آکر کہا۔

"میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتا سمجھے!"

خیر معاہدہ طے ہوگیا۔ رینالڈی باہر نکل گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد لاری لے کر آگیا۔ انھوں نے سامان کھولا اور ایک جھونپڑی میں ڈرموں کے پیچھے رکھ دیا۔ مگر میں نے اس طرف دیکھا تک نہیں۔ انھوں نے ہی مجھے بتایا کہ یہ ٹیکسٹائل کا سامان تھا۔ جب وہ جانے لگے تو جاتی دفعہ ایمیلیا نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا جو مجھے محبت بھری معلوم ہوئیں اور میرے لیے سارا انعام یہی کچھ تھا۔

اس دن کے بعد وہ تین چار مرتبہ آئے اور اس دوران میں ایمیلیا ان کے ساتھ ہوتی تھی وہ باہر سے اشارہ کے طور پر لاری کا ہارن دیتے اور میں جلدی جلدی دروازہ کھول دیتا اور وہ مزید سامان اتار کر چلے جاتے۔ میں انھیں یہاں پر رکنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ جب وہ سامان اتار کر رکھ رہے ہوتے میں اپنی جھونپڑی میں چپ چاپ کھڑا رہتا اس دوران میں بدمزاج "ٹیوڈرو" سے کئی بار میری جھڑپ ہوچکی تھی۔ وہ دراصل ہر مرتبہ جھگڑے کا مظاہرہ کرنا چاہتا اور اس موقع پر میں بھی برداشت سے کام نہیں لے سکتا تھا۔ ایسے موقع پر ایمیلیا ہمیشہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی اور میری طرفداری کرتے ہوئے چند پیار بھرے الفاظ بھی کہہ دیتی ایک بار وہ مجھ سے کہنے لگی۔

"تم روز روز کی اس تنہائی سے تنگ نہیں آجاتے۔"

"میں دراصل تنہا رہنے کا عادی ہوچکا ہوں" میں نے جواب دیا۔

ایک دن جب میں نے اخبار کھولا تو ٹیوڈورو، رینالڈی اور بہت سے دیگر لوگوں کی گرفتاری کی خبر نظر سے گزری۔ اخبار نے انھیں "نقب زنوں کا گروہ" کا نام دیا تھا کیوں کہ دکانوں میں ڈاکہ ڈالنے کا ان کا طریقہ عجیب ہوتا تھا۔ وہ جس دکان کو لوٹنا چاہتے اس سے ملحقہ عمارت میں سے اس دکان میں نقب ڈالتے۔ بعض اوقات چھت پھاند کر بھی یہ کام کرتے تھے مگر سوراخ چھت میں بھی ضرور ڈالتے۔ اخبار میں رینالڈی اور ٹیوڈورو کے علاوہ ایک اور شخص کا بھی فوٹو تھا جو میرے لیے انجانا تھا اس کی تھوڑی اونچی اور آنکھیں بڑی کھلی ہوئی تھیں۔ اخبار کی سرخی تھی "مجرموں کا خطرناک گروہ انصاف کے دروازے پر" رینالڈی شاید ڈرائیور ہونے کی وجہ سے دوسروں کی بہ نسبت کم زیرعتاب معلوم ہوتا تھا اور ایمیلیا کے متعلق تو ایک حرف تک نہ تھا۔

اب سردیاں آگئی تھیں۔ ایک رات جب زبردست بارش ہورہی تھی، بڑی تیز ہوا چل رہی تھی اور باہر

ن جیل کی شکل اختیار کرچکا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اٹھا دروازہ کھولا تو سامنے ایمیلیا کھڑی تھی۔ اس وقت۔ بے چاری کی کیا حالت تھی! اس کا پیٹ کافی بڑھ چکا تھا اور چہرہ یوں لٹکا ہوا تھا جیسے اسے بھی نیچے یٹ کی سمت کھینچ دیا گیا ہو۔ وہ بارش میں بری طرح بھیگ چکی تھی اور اس وقت اس کے بدن پر چیتھڑے سے تھے ن کے سکے بال اس کے چہرے سے چپک گئے تھے۔ وہ خاموشی سے اندر داخل ہوئی اور کچھ بولے بغیر رینالڈی کا ایک بتو مجھے تھما دیا۔ رینالڈی نے لکھا تھا کہ وہ ایک سال کے اندر ہی جیل سے رہا ہو جائے گا۔ اس نے درخواست کی تھی را نامہ میں ایمیلیا کو اپنے ہاں پناہ دوں اور یہ کہ اسے اس بارے میں صرف مجھ پر ہی مکمل بھروسہ تھا۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ میں ساتھ ہی ساتھ اس کے مال کی بھی حفاظت کروں جو سارے کا سارا صرف اسی کا تھا کیوں کہ دوسرے اپنا اپنا حصہ لے چکے تھے۔ رقعہ پڑھنے کے بعد مجھے معاً خیال آیا کہ رینالڈی میرے رویہ سے اس حد تک متاثر تھا کہ مجھ پر ہر طرح کا اعتماد ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ اس معاملے میں حق بجانب ہے کیوں کہ میں بھی اس کے لیے ہر کام کرنے کو تیار تھا۔ چنانچہ میں نے ایمیلیا سے کہا کہ یہ رات تم میرے بستر میں سو جاؤ اور میں دوسرے کمرے میں فرش پر چوکٹے بچھا کر سو رہوں گا۔۔۔ اس طرح ہماری اکٹھی زندگی کا آغاز ہوا۔

چند مہینوں کے بعد یہ صورت حال تھی کہ جو کوئی ڈلو پر آتا یہی خیال کرتا کہ میں نے شادی کر لی ہے اور ایک خوشحال شوہر اور باپ کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔

اکتوبر کے سورج کی روشنی صحن میں پڑ رہی تھی صحن کے درمیان میں ایمیلیا اپنی گول اور خوبصورت باہنوں کی آستین اوپر چڑھائے ڈرم کے پانی میں میرے قمیض ڈبو ڈبو کر دھو رہی تھی جو کپڑے دھل چکے تھے وہ سوکھنے کے لیے دھوپ میں رسی پر لٹک رہے تھے۔ میں جھونپڑی سے باہر ایک کرسی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا اور میرے بازوؤں میں ایمیلیا کا بچہ جھول رہا تھا جو میری طرح ولینسنزو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس جھونپڑی کے قریب ہی میں نے باورچی خانے کے طور پر ایک چھوٹی جھونپڑی بنائی تھی۔ اس کے اندر سے اب "میکرونی سویوں" کے لیے یخنی کی خوشبو آ رہی تھی یعنی اب ایمیلیا میرے لیے کھانا تیار کر رہی تھی۔ میں جلد ہی جھونپڑی کے اندر چلا گیا۔ جب کبھی میں بچے کے ساتھ کھیل رہا ہوتا اور ایمیلیا ڈرم میں کپڑے دھوتے وقت مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ مجھ سے باتیں کر رہی ہوتی تو جو کوئی ہمیں اس وقت دیکھتا یہی دھوکا کھاتا کہ ہم ایک آسودہ حال کنبہ تھے۔ حالانکہ اس میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہیں تھی۔ بچہ رینالڈی کا تھا۔۔۔ . . .
. . ایمیلیا رینالڈی کی تھی۔ جھونپڑی میں چھپایا ہوا مال رینالڈی کا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پہلے میں اس کمپنی کی پراپرٹی کا محافظ تھا اور اب میں رینالڈی کی پراپرٹی اور اس کے ساتھ ایمیلیا اور اس کے بچے کا بھی محافظ تھا۔ ورنہ باقی ہر لحاظ سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ میں حقیقت میں شادی شدہ ہوں۔

ایمیلیا مجھ پر بہت مہربان تھی اور کسی کمی کا احساس نہ ہونے دیتی تھی۔ اس کا بچہ خوبصورت اور خوش اطوار تھا۔ اگر کوئی تکلیف دہ بات تھی تو صرف یہ کہ میرے اور ایمیلیا کے درمیان ہر وقت رینالڈی کے متعلق گفتگو ہوتی رہتی۔ ایمیلیا

اس کی رہائی کے مہینے اور دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ وجہ صرف یہ نہ تھی کہ وہ رینالڈی کے متعلق گفتگو کو محسوس کرتا کیوں کہ ایک مرد کی معشوقہ ہونا اور بات ہے جس طرح کہ ایمیلیا تھی ——— دوسری طرف اس کا دوست ہونا اور بات جس طرح کہ میں تھا۔ ساتھ ہی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ دنیا بھر میں وہی ایک مرد ہے اور میرا کوئی وجود نہ تھا۔ چنانچہ ایک شام میں نے یہ سب کچھ ایمیلیا سے کہہ دیا، اور گویا اس دن سے اس پر . . . . . یہ انکشاف ہوا ہو کہ میں بھی ایک مرد ہوں۔ مجھے محبت کے موضوع پر نکلیف دہ اور طنز آمیز انداز میں لیکچر دینا شروع کر دیا۔ وہ صرف مذاق کر رہی تھی مگر مجھے اس سے بڑی کوفت محسوس ہوئی اور اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے کتنی دلکش لگتی تھی ——— بالآخر ایک دن میں نے موقع پا کر اس سے کہا۔

"تم رینالڈی کی ہو۔ لہٰذا تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ میرا اتنا خیال نہ رکھا کرو۔"

"کیوں نہیں۔ میں رینالڈی ہی کی ہوں۔ مگر تم بھی تو ایک سچے دوست ہو، اور تمہیں حسد سے کام نہیں لینا چاہیے۔" اور یہ ہوئی اس طرح کی گفتگو کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ تھا۔

ایک رات مجھے باہر کھٹکا سنائی دیا۔ میں نے اپنا ریوالور سنبھالا اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ پورے چاند کی رات تھی یوں دکھائی دیتا تھا کہ چاند ڈرم کے پانی میں لوٹ پوٹ ہو رہا ہے اور ڈرم چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ صحن میں ہر پتھر اور ٹھیکرا اپنے بڑے یا چھوٹے سائے کی وجہ سے پہچانا جا سکتا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور ارد گرد کی سیاہ پہاڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں ——— دراصل رات دن کی طرح روشن تھی۔ لہٰذا میں نے آنے والے کا کھوج نکال لیا۔ میں نے اسے پکار کر خبردار کیا کہ ٹھہر جاؤ۔ وہ اس وقت جھونپڑیوں کے درمیان میں ایک جھونپڑی سے دوسری جھونپڑی کو پھلانگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری آواز سن کر وہ اس وقت باہر روشنی میں نکل آیا اور کہنے لگا "پستول نیچے کر لو۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں؟"

یہ ٹیوڈورو تھا۔ ہونسرو ٹوٹو والا ٹیوڈورو۔ مگر وہ حیران کن حد تک تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے جسم پر چیتھڑے تھے، اس کے سرخ سرخ گال پچک گئے تھے اور اس کی زرد آنکھیں بھیڑیے کی طرح دہک رہی تھیں۔

"میں سامان اٹھانے کے لیے آیا ہوں۔" وہ کہنے لگا "باہر لاری کھڑی ہے اور میرے کچھ دوست انتظار کر رہے ہیں۔"

"یہ سامان رینالڈی کی ملکیت ہے۔" میں نے جواب دیا۔ پھر ہم نے دلائل دینے شروع کر دیے۔ پہلے پہل اس نے مجھے دھمکانے کی کوشش کی اور پھر آدھا سامان لے جانے کی تجویز پیش کی۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ ہم پانی والے ڈرم کے ساتھ کھڑے تھے، اور ایمیلیا کی جھونپڑی کی چھوٹی کھڑکی سے روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ وہ اس کھڑکی میں کھڑی ہمیں غور سے دیکھ رہی تھی۔ آخر کار میں نے کہا۔

"بہتر یہی ہے کہ تم چلے جاؤ۔"

"میں جا رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ پھاٹک کی سمت چل پڑا مگر میں اس پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس ٹائپ کا آدمی ہے جو چاقو استعمال کرتے ہیں، اور ہوا بھی اسی طرح۔ وہ پھاٹک کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ اچانک پلٹا اور چھلانگ مار کر مجھ پر آ رہا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور گولی چلا دی۔ کیا تم یقین کرو گے؟ وہ اب بھی میری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بڑا خوفناک ہو گیا تھا، چیتے جیسی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ چھاتی پر رکھا تھا جہاں اسے گولی لگی تھی اور دوسرے ہاتھ میں چاقو پکڑے ہوئے تھا۔ میں نے دوبارہ گولی چلائی اور وہ زمین پر گر پڑا۔

اگلے روز پولیس انکوائری کرنے آگئی۔ انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ وہ پرانا مجرم تھا جو کئی جرائم کر چکا تھا۔ اور اب بھی جیل سے فرار ہو کر آیا تھا۔ کمپنی والوں نے میرے اس اقدام پر خوش ہو کر مجھے انعام دیا کہ میں کس طرح ان کے مال کی حفاظت کرتا تھا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے ایمیلیا سے کہا "پہلے رینالڈی نے مجھے چور میں تبدیل کیا اور اب ایک قاتل بنا دیا۔"

مگر وہ کہنے لگی: "تم نے حفاظتی طور پر سب کچھ کیا، لہٰذا اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔"

میں تو صرف یونہی بات بنا رہا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا "میں محافظ ہوں اور میں گولی چلانے کا حق رکھتا ہوں۔"

یہ اسی دن کا واقعہ ہے جس دن رینالڈی رہا ہو کر ایمیلیا، بچے اور اسباب کے لیے آیا۔ کمپنی والوں نے مجھے اطلاع دی کہ ڈپو کو ختم کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا وہاں پر ہر قسم کا کام بند ہو رہا تھا اور جلد ہی میں بھی محافظ کی حیثیت سے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو رہا تھا۔ اب میں کسی کا محافظ نہ تھا، نہ ہی کمپنی کا اور نہ ہی رینالڈی کا۔ رینالڈی اس روز آدھی رات کو لاری لے کر آیا۔ لاری کے آگے "ونڈ سکرین" پر اس نے بڑے موٹے اور نمایاں الفاظ میں EMILIA لکھا تھا۔

"رینالڈی یہ ہے ایمیلیا۔ اسی حالت میں ہے جس میں تم نے بھیجی تھی ...... یہ تمہارا بیٹا ہے ..... اور اندر تمہارا مال اسباب ہے۔ سب کچھ اسی طرح ٹھیک ٹھاک ہے تم دیکھ سکتے ہو۔"

وہ مسکرایا۔ وہ ایمیلیا اور بچے کو قریب پا کر بڑا خوش تھا۔ کہنے لگا "ٹھیک ہے۔ وینسینزو میں جانتا تھا کہ تم ہی بھروسہ کے قابل ہو۔"

مگر میں اس وقت غصے اور اداسی کے ملے جلے جذبات سے اپنے آپ کو گھٹا گھٹا محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے پھر اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

"رینالڈی! تم دیکھ سکتے ہو کہ جو چیز تم نے میرے سپرد کی تھی میں تمہیں بالکل اسی صورت میں واپس لوٹا رہا ہوں۔"

وہ مجھے کچھ رقم دینے پر مصر تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ میں کم از کم ایک گھڑی بطور تحفہ لے لوں۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ روم لے جانے کی تجویز بھی پیش کی مگر میں نے اس سے بھی انکار کر دیا اور کہا "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ـــ میں محافظ ہی ہوں ـــ کیوں؟ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" مجھے اس وقت اندازہ ہوا کہ میں ایمیلیا

محبت میں گرفتار ہو چکا تھا اور اب بیک وقت افسوس کر رہا تھا اور خوش بھی ہو رہا تھا کہ میں نے اس کی اتنی عزت بولی کی۔ میں نے ۔۔۔ ان کا مال اسباب لاری میں لادنا شروع کیا۔ اس کے بعد رینالڈی ایمیلیا کے ساتھ لاری میں سوار ہو گیا ایمیلیا اس وقت مسکرا رہی تھی۔ رینالڈی نے مجھے نزدیک بلایا اور واضح الفاظ میں کہا "انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب پھر ملاقات ہوگی مسٹر محافظ!" اور لاری چل پڑی۔

چند دنوں بعد کمپنی کی لاریاں بھی آ گئیں۔ انہوں نے اینٹیں، سمنٹ کی بوریاں، پائپ گندے پیروزے کے ڈرم لادنا شروع کیے۔ اس کے بعد ارد گرد کی دیواریں بھی گرادی گئیں اور ان کی اینٹیں بھی لادلی گئیں۔ آخر میں وہ لوگ جھونپڑوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے تختے اکھیڑ لیے۔ کئی دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ سارا دن لاریاں آتی اور جاتی رہیں۔ گرد و غبار کے بڑے بڑے بادلوں میں سامان لانے اور لے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر انھوں نے ایک میرے رہنے کی جھونپڑی بھی گرادی اور اسے بھی لاد لیا۔ میں یہاں پر آخری شے رہ گیا تھا۔ اب یہاں پر سوائے زمین کی ہموار سطح جس پر گھاس اُگ آئی تھی اِدھر اُدھر ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں، پانی کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں اور ارد گرد پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے یہاں کم و بیش دو سال گزارے تھے اور اب یہ مدت ختم ہو چکی تھی۔ میں نے اپنا سارا سامان ریشے کے بنے ہوئے سوٹ کیس میں ڈالا اور اسے اپنی بائیسکل کی کاٹھی کے ساتھ باندھ دیا۔ بائیکل کو باہر نکالا اور سالاریا کی طرف چل پڑا۔ میں روڈ پر پہنچ کر میں سائیکل پر سوار ہوا اور اسے آہستگی سے روم جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔

تبصرے

(تبصرہ کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

نئے افسانے

آواز تو پہچانو
مصنف :- رام لعل
قیمت :- تین روپے
مکتبۂ کہانی کار ۔ وزیر حسن روڈ ۔ لکھنو ۱

بوند بوند ساگر
مصنف :- ستیش بترا
قیمت :- تین روپے
آلوک ۔ وزیر حسن روڈ ۔ لکھنو ۱

ادھر چند برسوں سے ایک یہ فیشن چلا ہے کہ افسانوں کو دھکیل دھکیل کر پیچھے ڈالا جا رہا ہے اور ناولوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر سامنے کیا جا رہا ہے۔

اس کشمکش کا نتیجہ وہی ہے جو ایسی اپا دھاپی میں ہوتا ہے۔ یعنی بہت سی ادھ کچی لنگڑی لولی اور نیم جان قسم کی ناولیں بڑے دھوم دھڑکے سے اس ریلے میں آگئی ہیں۔ اور چند نہایت خوبصورت اور جاندار افسانوں کے مجموعے دھکے کھا کے پیچھے جا پڑے ہیں۔

یہ ناول کا دور ہے افسانے کا دور ہے اور غزل کے دور والے نعرے میری سمجھ میں آج تک نہ آئے۔ اچھے افسانے لکھتے لکھتے اور پسند کرتے کرتے اگر کوئی "آگ کا دریا" جیسی ناول لکھے تو پڑھنے والے اسے کونسے دور سے تعبیر کریں گے یا پھر دور سے مراد یہ ہے کہ جناب اس برس صرف ناول لکھنے کے احکامات ادب کے حکام بالا نے صادر کیے ہیں لہذا جو افسانہ نگار خلاف ورزی کرے گا اس کے خلاف نوٹس جاری کیا جائے گا (یعنی اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا جائے گا) کیونکہ یہ تو ناول کا دور ہے افسانوں کا ذکر کیسے چھڑے!

آج اردو ادب سے نقاد تو غائب ہو ہی چکے ہیں جو کسی بات کی روک ٹوک ہو۔ کبھی کبھی کوئی تنقید کی مسند پر آ بیٹھا تو اپنے کسی دوست ادیب کو نہایت کٹے انداز میں یوں میٹھا ٹھیرا دیا کہ لوگ ان کی کھری رائے کے قائل ہو جائیں ورنہ کوئی ایسا چونکا دینے والا چٹکلا چھوڑ بیٹھے کہ لوگ سٹپٹا اٹھیں۔

"اس طے شدہ ناول کے دور" میں یہ دو مجموعے اچھے افسانوں کے وجود کو منوا لیتے ہیں۔

آواز تو پہچانو رام لعل کے افسانوں کا نیا مجموعہ ہے۔ رام لعل تقسیم سے پہلے والے دور سے لکھ رہے ہیں اس لیے ان کے فن میں وہ پختگی آ گئی ہے جو پندرہ بیس برس سے مسلسل لکھنے والوں کے ہاں ہوتی ہے۔ وہ افسانے کے فن پر پوری مہارت رکھتے ہیں۔ یہ بات رام لعل کی کہانیاں تسلسل کے ساتھ پڑھ کر بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ لیکن تقسیم کے بعد ان کے افسانوں میں زیادہ خوبصورتی آ گئی ہے۔ کسی افسانہ نگار کا مسلسل لکھتے رہنا ہی بڑی بات ہے لیکن وہ نئی طور پر ترقی بھی کرتا رہے تو یہ اور زیادہ اچھی بات ہے۔

میں اس مجموعے کی ہر کہانی کے بارے میں علیحدہ رائے نہیں دوں گی (کیوں کہ اس انتخاب کا حق خود پڑھنے والوں کو کرنا ہے) لیکن مجموعی طور پر یہ بات کہوں گی کہ "آواز تو پہچانو" کے افسانے رام لعل کے بڑھتے ہوئے فن کی ایک بہت اچھی مثال ہیں۔ اس مجموعے کے کچھ افسانے اردو کے بہترین افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن چند افسانے ایسے بھی ہیں جو ایک تیز رفتار افسانہ نگار کے قلم سے نکل جاتے ہیں۔

رام لعل کے افسانوں میں ان کا دیکھا بھالا ماحول اور قریب سے نظر آنے والے چہرے نمایاں ہیں۔ اسی لیے شاید ان کے افسانوں میں کوئی بڑا مسئلہ یا غیر معمولی کردار نہیں ملتے۔

کیا غیر معمولی کردار یا بڑے مسئلے افسانوں کا عیب ہیں؟ کم سے کم میں تو اس بات سے اتفاق نہیں کروں گی بلکہ مجھے تو سارے افسانہ نگاروں سے (اور کسی حد تک خود اپنے آپ سے بھی) یہ شکایت ہے کہ ہم نئے موضوع اور نئے مسائل پر غور کیوں نہیں کرتے! اردو افسانے پر بھی اردو غزل کی گہری چھاپ پڑی ہے یعنی ایک ہی مصرعہ طرح پر چالیس پچاس افسانے ہر سال لکھے جاتے ہیں۔ انھیں آپ مسلسل غزل بھی کہہ لیجئے۔

رام لعل کے ہاں بھی کہیں کہیں ماحول اور موضوع کی تکرار کا احساس ہوتا ہے۔ دوسری بات ان کے افسانوں میں انفرادی اسلوب کی کمی ہے۔ رام لعل کی افسانہ نگاری کی عمر دیکھتے ہوئے ان سے یہ مطالبہ کرنا . . . . . ہے کہ انھیں اپنے ایک انفرادی اسلوب کی جانب بھی توجہ دینا چاہیئے۔ تاکہ ان کی آواز واضح طور پر پہچانی جا سکے۔

بوند بوند ساگر کے مصنف ستیش بترا آج کے مقبول افسانہ نگار ہیں ۱۹۴۲ سے ۱۹۶۳ تک کے طویل عرصے میں ستیش بترا کے فن نے بڑی آہستگی سے لیکن بڑی نمایاں ترقی کی ہے۔ چنانچہ اب کہیں اچھے افسانوں کی بات ہوگی تو اس مجموعے کا ذکر ضرور آئے گا۔ "بوند بوند ساگر" میں کئی بڑے خوبصورت کامیاب افسانے ہیں۔ کئی افسانے ایسے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

ستیش بترا کے افسانوں میں تنوع ہے وہ، لیتے ہوئے معاشرے کے تقاضوں اور موجودہ انسان کی ذہنی الجھنوں کا

گہرا مطالعہ کر چکے ہیں اور انھیں خوبصورت پیرائے میں بیان کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں. لیکن کہیں کہیں ان کی زبان کی ناہمواری محسوس ہوتی ہے اس کی وجہ خود مصنف نے ہی بتا دی ہے کہ وہ انگریزی میں سوچتے ہیں اور اردو میں لکھتے ہیں. اس کے علاوہ ان کے افسانوں کا اختتام عموماً ڈرامائی انداز میں ہوتا ہے جس سے کہانی کا مجموعی تاثر بڑھ جاتا ہے. سٹیفن سپنڈر لکھتے ہیں کہ ان کا مقصد تفریح اور دل بہلانا، راہ راست پر لگانا، نصیحت کرنا اور روحانی تسکین پہنچانا ہے۔ اس میں سے بعض شرائط کو انھوں نے پورا بھی کیا ہے. خصوصاً نصیحت کرنے اور راہ راست پر لگانے کا کام انھوں نے اپنے ان افسانوں میں کر ڈالا ہے "بجھ گئے تنکے"، "دو چنگاری"، "ایکسپرٹ" اور "دوسرا جنیا"۔

اپنے فن کے بارے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے افسانوں کو سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے۔ بلکہ کہیں کہیں مصنف کے ان دعوؤں کی گونج زیادہ اونچی ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ افسانہ نگار نے اپنے فن اور اس کی بلندی کے بارے میں جتنی بڑائی کا دعویٰ کیا ہے وہ سب غلط ہے یا ان کے افسانوں پر یہ سارے دعوے پورے نہیں اترتے. لیکن پھر بھی مصنف یہ تعریف دوسروں کے منہ سے سنتا تو زیادہ اچھا لگتا۔

مجموعی طور پر یہ دونوں مجموعے خوبصورتی اور سلیقے کے ساتھ شائع ہوئے ہیں اور اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ صرف ناولوں ہی کا دور نہیں بلکہ اچھے افسانوں کا دور بھی ہے۔ (جیلانی بانو)

خالی مکان

(نئی شاعری)

محمد علوی

یہ جو کتاب "خالی مکان" تم نے بھیجی ہے اس کا ٹائٹل مجھے پسند آیا پھر جو سرورق الٹ کر دیکھا تو یہ الفاظ ملے۔ "برادرم ظ انصاری صاحب کے لیے پیار کے ساتھ"

یہ طرز تخاطب ہماری تہذیب میں بڑوں کی طرف سے ہوتا ہے، اپنے چھوٹوں کے لیے۔ ہمارے چچا ہم کو اس طرح لکھا کرتے تھے اور تم، میرے دوست، عمر میں مجھ سے پانچ سات برس تو چھوٹے ہو گے ہی؛

کتاب سلیقے سے ترتیب دی گئی ہے، سلیقے سے چھپی ہے (سوغات والے) محمود ایاز کا دیباچہ بھی اس میں زیب دیتا ہے۔ اب سنو میرا تاثر، بے تکلفی کا برا نہ ماننا۔

ہم نے سنا تھا کہ "خانۂ خالی را دیو می گیرد" (گھر خالی ہو تو اس میں بھوت بس جاتا ہے) تمھارے اس "خالی مکان" میں جو بھوت بسا ہوا ہے وہ بڑا خوش مذاق، بذلہ سنج، بھولا بھالا مگر کچھ اکتایا ہوا سا لگتا ہے، میری اس سے اتنی آشنا ہو گئی کہ کبھی ملے گا تو بغیر لفظوں کے ہم دونوں گفتگو کر سکیں گے۔ شاعری شہر آشوب کی ہو یا رزمیہ کارناموں کی، مرثیہ ہو یا قصائد کی، رباعی کی ہو یا ڈھول مجیرے کی مگر اس میں اپنا پن پیدا ہو جاتا ہے اگر وہ اس انداز کی ہو گویا شاعر ہمیں سے مخاطب ہے۔

تم اپنے اس ٹیڑھے آنگن والے خالی مکان میں پڑھنے والے کو یوں لیے پھرتے ہو گویا وہ تمھارا لنگوٹیا یار ہے جیسے اپنے آسیب زدہ مکان کا ایک ایک گوشہ دکھاتے جا رہے ہو اور دبی زبان سے اشاروں میں چٹکلوں میں، ناک

ھاکر کچھ بڑبڑاتے جاتے ہو، مجھے یہ انداز تو اچھا لگا۔ بلکہ کئی نظموں سے وہ شعر غالب کے یاد آ گئے۔

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا۔ ایک ایسی فضا ہے تمہارے بیان کی گویا ہم کسی ایسے مکین سے ملے ہیں جس کا عظیم الشان اونچے اونچے دالانوں والا مکان ڈھے رہا ہے اور وہ کھڑا اسے ایک تماشہ کی طرح دیکھ رہا ہے۔ سارے معاملے ہی اس نے تاریخی جبریت (HISTORICAL DETERMINISM) کے فلسفہ میں دیکھ لیا ہے۔ سب کچھ اس کی بلا سے اور جب آنسو ٹپکانے والی بدلی سینے میں امنڈتی ہے تو وہ ٹوٹکوں سے نہیں چٹکلوں سے اسے اڑا دینا چاہتا ہے۔

سچ کہنا، یہ تمہارے شاعرانہ مجموعے پر کسی کی پھبتی تھی یا تمھیں خود سوجھا؟ میں جانوں خود ہی سوجھا ہوگا۔ مگر یہ نظم بھی اپنے اسٹائل اور تاثر کے باوجود یوں ہی سی ہے جسے تم نے اتنی اہمیت دی۔

جالے تنے ہوئے ہیں گھر میں کوئی نہیں — "کوئی نہیں" اک اک کونا چلاتا ہے
دیواریں اٹھ کر کہتی ہیں "کوئی نہیں" — "کوئی نہیں" دروازہ شور مچاتا ہے
کوئی نہیں اس گھر میں کوئی نہیں لیکن — کوئی مجھے اس گھر میں روز بلاتا ہے
روز یہاں میں آتا ہوں ہر روز کوئی — میرے کان میں چپکے سے کہہ جاتا ہے
کوئی نہیں اس گھر میں کوئی نہیں پگلے — کس سے ملنے روز یہاں تو آتا ہے!

"خالی مکان"

ادھر ادھر سے چند ورق الٹ کر آدمی رائے قائم کرنا چاہے تو سوچے گا کہ ہاں سادگی ہے، تازگی بھی ہے۔ کہیں کہیں ندرت بیان بھی ہے، جدت طبع بھی نظر آتی ہے۔ شاعری میں رنگ اور رسا کے بھی پھیل رہے ہیں۔ لیکن یہ کیا۔ یہ تو یونہی سی شاعری ہے "خون جگر کے بغیر" مگر غور کیجئے تو بس یونہی سی شاعری نہیں ہے، اور جو بھی ہو۔

میں یہ تمہارا ایک سو بیس صفحے اور چار روپے کا مجموعہ اول سے آخر تک ایک ہی تسلسل پڑھ گیا۔ میں اس میں ایک زندہ آدمی سے ملا۔ اس کے ماحول سے، اس کے تصورات اور تاثرات سے، اس کی زندگی کی تفصیلات سے ملا۔ اس کے ایسے رازوں سے جن کی بدولت "مغز استخوان سوزد" ایسے درد اور کسک سے جو شعر کے پردے میں بھری محفل میں آپ سے آپ بیان ہو جاتی ہے، لیکن خلوت میں محبوب یا بیوی کے کان میں کوئی نہیں کہہ پاتا۔ اف وہ، کیسا کاہل آدمی ہے یہ، منہ پھلائے بغیر قورمہ کھاتا ہے، چارپائی بنے بغیر پڑے پڑے ادوان توڑتا ہے! بھرے بازار میں تنہا پڑا پھرتا ہے اور راتوں کو جاگ کر آسمان کے تارے گن کرتا ہے اور زہرخند کے ساتھ سوچا کرتا ہے۔ کیا سوچا کرتا ہے؟

ہائے یہ رات تو افسردہ کیے دیتی ہے

نیند آتی ہے کھلی آنکھ سے ڈر جاتی ہے   سہمی سہمی ہوئی چپ چاپ گزر جاتی ہے
خامشی گھومتی رہتی ہے کھلی محفل میں   نیم کا پیڑ اکیلا ہی کھڑا رہتا ہے
چیخ اٹھتا ہی پرندہ کوئی سوتے سوتے   صبح کر دیتی ہے شبنم یونہی روتے روتے

(رات)

بے خوابی کی ایسی ہولناک کیفیت ہے تمھارے کلام میں جو برسوں سے تنہا راتیں بسر کرتا ہوں۔ کبھی تمھارے کلام کو صبح کی روشنی میں نہیں پڑھ سکتا۔ غضب کرتے ہو۔

چاروں اور ہے بے کل   آوازوں کا جنگل
اونچی اونچی لمبی لمبی   ہیبت ناک آوازیں
چاروں اور کھڑی ہیں   اور میں اس جنگل میں
ایک اکیلا تنہا   خوف زدہ طائر ہوں

(آوازیں)

اجلی اجلی دھوپ آنگن میں در آئی
ہلکے ہلکے قدموں سے دہلیز چڑھی
ڈرتے ڈرتے دروازے میں پاؤں دھرا
گھر میں گھور اندھیرے کو بیٹھے دیکھا
شرمائی، جھجکی، گھبرائی لوٹ گئی

(دھوپ)

راتوں کو اٹھ کر رونے لگتی ہے   دن میں بیٹھے بیٹھے سونے لگتی ہے
میلے کپڑے تہہ کر کے رکھ دیتی ہے   دھلے دھلائے کپڑے دھونے لگتی ہے
اپنے آپ سے باتیں کرتی جاتی ہے   لوگوں کے سائے سے ڈرتی رہتی ہے

(پاگل لڑکی)

تلاش، دستک، تھکن، شکست، پگڈنڈی، ایک شام مسجد میں، رستے میں ایک گاؤں، ایک اور بڑا دن، آگے مت سوچو گی، شام کا منظر، نیند کا شہر، بوڑھا آدمی، اسٹیشن پر، اتفاق، نوحہ، گھر، جدائی کا غم، پاگل لڑکی، تنہائی، اور "وہ" یہ نظمیں نظمیں نہیں، ننھی منی تصویریں ہیں۔ امپریشن ازم کے طرز کے دردناک نمونے، کلر اسکیم بھی ان کی ایک ہی ہے۔ اگر کسی مصور نے یہ تصویریں کنوس پر بنائی ہوتیں تو ہم اسے ایک خاص اسٹائل کا نمائندہ کہتے۔ تم بھلا (PAINTING) کیوں نہ سیکھ لو احمد آباد نے تو کئی اچھے مصور ملک کو دیے ہیں۔ میں نے روس کے شاعر اعظم پشکن کی نظموں کے مسودے دیکھے ہیں۔

وہ نظمیں لکھتے وقت سوچنے کی مہلت میں ان ہی کاغذوں پر آڑھی ترچھی لکیروں سے تصویریں بناتا جاتا تھا۔ اب چاہے، وہ ادھر کھچری تصویر دیکھ لو۔ چاہے نظم پڑھ لو، منظر ایک ہی ابھرتا ہے تو میاں یہ کام بھی سیکھ ڈالو تو کیسے ہاتھوں تمھیں محنت کرنی لگے گی۔

قسم لے لو بعض نظمیں، ننھی منی نظمیں اس مجموعے میں ایسی ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو میں تمھیں خط لکھنے کی زحمت ہرگز مول نہ لیتا اور اب کہ وہ میری نظر میں چڑھ گئیں، ان کی دمک تمہاری شاعری میں ایسی لگتی ہے جیسے سرمئی کسوٹی پر سونے کی ہلکی سی درخشاں لکیر۔ کہ یہ بھی ایک حقیقت اور وہ بھی رحق۔

اک پرانے تجربے
ادھ کھلے کواڑوں سے
جھانکتی ہے اک لڑکی
ایک زنگ آلودہ تو سپے دہانے میں
ننھی منی چڑیا نے
گھونسلا بنایا ہے

(تخلیق)

مری جاں اس قدر اندھے کنوئیں میں — بھلا یوں جھانکنے سے کیا دکھے گا
کوئی پتھر اٹھاؤ اور پھینکو — اگر پانی ہوا تو چیخ اٹھے گا

(مشورہ)

"ایک بچہ" نظم جس میں گھر کے سناٹے اور اداسی کا ذکر یوں ہوتا ہے:۔

آج مگر اک نو وارد — بچے کا رونا سن کر
جاگ اٹھا ہے میرا گھر — چونک پڑے دیوار و در

"میرا آنگنا" اس سے بھی زیادہ خوبصورت نظم ہے۔ بچوں کی معصومیت، چڑیا کا گھونسلا اور بوڑھوں کا شرابخانہ تمہاری شاعری کی فضا میں سلامت ہے۔ بہت ہی اچھا ہوا بال بال بچے تم اس گدھ سے جو ریگستان کے مسافروں پر منڈلایا کرتا ہے۔

تم نے لگارین سے کہا ہے کہ جانے زمیں سے کتنی ہی دور اڑ جاؤ، مگر یہ کیا ہے؟ کون ہے؟ کیسے ہے؟ کی آوازیں آس پاس منڈلاتی رہیں گی۔ اگر لگارین تمہاری اس نظم کو تمہارے منہ پر دہرا دے تو سوچو، تم کیا جواب دوگے! تم جو تاثیر کے بجائے تصویر کے اور جدت کے بجائے ندرت کے شاعر ہو!

مجھے ایک خاص بات جو تمہاری نظموں اور غزلوں میں نمایاں محسوس ہوئی یہ ہے کہ بات بڑے سے دھڑکے سے کہتے ہو جیسے اپنے دل پر بہت بوجھ ہے، مگر سننے والے کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتے۔ یہ بڑی انسانیت کی بات ہے، لیکن محض

کوئی اعلیٰ درجے کی شاعری نہیں بنی۔ شاید تم اس کے آرزومند بھی نہیں ہو۔ تمھاری آرزو تو بس اتنی ہے کہ سب سے الگ پہچانی جائے ہیں۔ ؟ اچھا صاحب تو پہچانی گئی، سمجھو۔ مگر الفاظ کو اتنا دھرایا مت کرو۔ اپنی آواز الگ نے کے لیے کوئی ضروری نہیں کہ فریادی ناموروں سے مختلف اور ہکلاتے لب و لہجہ میں بات کرے۔ اس میں جبر کو نہیں ے اختیار کو دخل معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ کی بے ضرورت تکرار اور مصرعوں کو یوں توڑنا کر اپنی موسیقی کو مجروح لیں کر پوری کی پوری تمہارے رنگ کی ہیں۔ چند اشعار میں ان ہی خامیوں کی وجہ سے بے مزہ ہو جاتی ہیں۔

میں نے جو غزلچیوں کے خلاف تھانے میں رپٹ لکھوانے کا فیصلہ چار و ناچار کیا تھا فی الحال اسے تمھاری وں کے طفیل میں ملتوی کیے دیتا ہوں اور جن ... بعض شعر یہ ہیں۔

سنکی ہوئی ہواؤں میں خوشبو آ رہی ہے
ہوں میں کوئی پھول دکھتا نہ ہو کہیں
یہ کون جھانکتا ہے کواڑوں کی اوٹ سے
نئی صبح کے دیکھو سویرا نہ ہو کہیں

سچ ہے کہ وہ برا تھا ہر اک سے لڑا کیا — لیکن اسے ذلیل کیا یہ برا کیا
گلدان میں گلاب کی کلیاں مہک اٹھیں — کرسی نے اس کو دیکھ کے آغوش وا کیا
گھر سے چلا تو چاند مرے ساتھ ہو لیا — پھر صبح تک وہ میرے برابر چلا کیا
کوٹھوں پہ منہ اندھیرے ستارے اتر پڑے — بن کے پتنگ میں بھی ہوا میں اڑا کیا

اس سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا
یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا — (اظہر انصاری)

شب گزیدہ (ایک ناولٹ، عوض سعید کے فن کا ارتقا)

وقت کی طرح خاموش مگر متحرک ہے اس کے افسانوں کی خاک کا خمیر آسمانی نہیں زمینی ہے۔ اس نے مٹی میں ستارے بوئے اور ماہتاب کاشت کیے ہیں اس نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ انسانی اعصاب کو ہی جگایا احساسات و شعور کی رگوں کو چھیڑا ہے شب گزیدہ ایک سطحی قسم کا ناولٹ نہیں بلکہ مصنف کی تہذیبی کا تحریری ثبوت ہے

ناولٹ **مشورہ بک ڈپو دہلی** آپ کی خدمت میں پیش کرے گا۔

بازگشت

جنوری کے شمارہ میں صرف دو افسانے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ "دردکارشتہ" اور "دیوانے دو"۔ آمنہ ابوالحسن کا افسانہ دردکارشتہ پڑھ کر حیرت رہوی ۔ افسوس ہے کہ آمنہ صاحبہ نے ایک خاتون ہوتے ہوئے اس قدر بیباکی اور بے حجابی سے جنسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ افسانے کے تمام کردار مسیح، ثریا، مسیح کے ماموں، مانی، پٹروس کی خالہ ملازمہ دولت، ثریا کی بہن عطیہ، فہیم وغیرہ سب جنسی گھٹن میں مبتلا بتلائے گئے ہیں جس سے جذبات میں الجھن ہی پیدا ہوتی ہے کوئی سبق نہیں ملتا پوری کہانی غیر مقصدی ہے۔ نہ جانے آپ نے یہ کہانی کیسے پسند کرلی کسی کو میری رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن کسی خاتون کو اس انداز کی کہانیاں لکھنا زیب نہیں دیتا کہ شریف خاندانوں کے ایسے حالات پیش کرنے کی بجائے زندگی کے دوسرے پہلوؤں اصلاحی اور مقصدی موضوع اپنائے جاسکتے ہیں۔ اس افسانے کے برعکس نعیم زبیری کا افسانہ "دیوانے دو" بے حد پسند آیا۔ نہایت رواں دواں پُراثر کیفیات رکھنے والا افسانہ ہے جس میں قدم قدم پر زندگی ہی زندگی نظر آتی ہے ایسے افسانے کے لیے آفریں ہی آفریں۔

جاوید لطیفی۔ حیدرآباد دکن

یہ محض حسنِ ظن ہے یا غلط فہمی کہ میں پروفیسر ہوں، میں پروفیسر نہیں، ادب کا ایک طالب علم ہوں منتہی نہیں مبتدی ہوں اور ایک مبتدی سے غلطی ہونا خلافِ عقل نہیں ہے مجھے دعویٰ نہیں کہ میں ایک باکمال شاعر ہوں اور میرے کلام میں نقص نہیں۔

میں نے "صبا" کے لیے جو غزل بھیجی تھی، وہ رواروی میں مسودے سے جوں کی توں نقل کر کے بھیج دی تھی بعد میں اس غزل پر جب تنقیدی نظر ڈالی تو اپنی نظری فروگزاشت کا احساس ہوا، چنانچہ پیش نظر شعر،

وہ خوش نصیب دو عالم سے بے نیاز ہوا　　جو تیرے جلوۂ رنگیں کو اک نظر دیکھا

میں اب میں نے یہ تبدیلی کرلی ہے ؎

زہے نصیب دو عالم سے بے نیاز ہوا
وہ جس نے جلوۂ رنگیں کو اک نظر دیکھا

سعادت نظیر۔ حیدرآباد دکن

N. 346157 REGD. NO. A. 2
SASA MONTHLY

ماہنامہ

Re. 1/-



منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

مجلس مشاورت

حبیب الرحمٰن

فضل الرحمٰن

ڈاکٹر طاہر علی خاں سلیم

رائے جانکی پرشاد

ڈاکٹر حفیظ قتیل

عالم خوندمیری

دلاور علی خاں

رضیہ بیگم

سعید بن محمد (آرٹسٹ)

کتابت:- محمد مظہر

زر سالانہ ہند و پاک سے ۱۰ روپے

ششماہی ۶ "

بیرون ہند سے ۲۰ شلنگ

جلد	۱۰
شمارہ	۳
ماہ	مارچ
سنہ	۱۹۶۴ء
قیمت	ایک روپیہ

ایڈیٹر:- سلیمان اریب

فون: (۴۴۴۰۲)

صبا

حیدرآباد دکن

دہلی آفس:- ۱۹۵۷ ترکمان گیٹ دہلی ۶

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:- ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۳۷۰۲) کراچی ۳

پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب، ۱۷ احجر درگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن، مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس - چار کمان

دفاع اور



ترقی کا کام



ساتھ ساتھ چلتا ہے

دفاعی کوششوں میں بھرپور امداد کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ہر گاؤں کے لئے زرعی پیداوار کا ایک الگ منصوبہ بنایا جائے۔
ایک اعلیٰ اختیارات والا مرکزی بورڈ بنایا گیا ہے جو پالیسی کو مربوط بنانے اور زرعی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں خدمات انجام دے گا۔
ہنگامی حالات کے مقابلے کے لئے زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے، درآمدات گھٹانے اور غیر ملکی زرمبادلہ کو دفاعی ضرورتوں کے لئے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔

زرعی پیداوار بڑھانے کی اس مہم میں ہر ممکن تعاون دیجئے۔ اسے کامیاب بنانے کے لئے جی جان سے ہاتھ بٹائیے۔



پلان کو کامیاب بنائیے

بھارت کے دفاع کو مضبوط کیجئے

اس شمارے میں

سرِ ورق :- معذرت عمل :- کے۔ سشیلنگر راؤ

فارم ۴ تحت دفعہ ۸ بیان بابت ملکیت و دیگر تفصیلات صبا حیدرآباد

۱	مقام اشاعت	حیدرآباد (اے پی)
۲	نوعیت اشاعت	ماہانہ
۳	پرنٹر	سلیمان اریب
۴	پبلشر	سلیمان اریب
۵	ایڈیٹر	سلیمان اریب
۶	قومیت	ہندوستانی
۷	پتہ	RT ۳/۲۷۳ وجے نگر کالونی۔ حیدرآباد
۸	ملکیت	سلیمان اریب

میں سلیمان اریب تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں

دستخط سلیمان اریب

۳ر مارچ ۱۹۶۸ء

پہلی بات

صبا کا یہ شمارہ از اول تا آخر نثر پر مشتمل ہے اور اس میں بھی کہانی صرف ایک ہی ہے کہانیوں کی کمی بڑی حد تک ڈرامے اور رپورتاژ سے پوری ہو جائے گی لیکن شعر کی کمی ـــــ جی ہاں وہ تو رہے گی۔

آج کل عام طور پر لوگ جاسوسی اور فحش لٹریچر کے بعد کہانیاں ـــ وہ بھی ہلکی پھلکی اور مزیدار اور شاعری ـــ وہ بھی سطحی اور فلمی انداز کی بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ پھر کہیں سنجیدہ اور فکر انگیز ادب کی باری آتی ہے۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ اس بحث سے ہٹ کر جس کا یہاں موقع نہیں ـ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک اچھے ادبی ماہنامہ کو معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ متنوع بھی ہونا چاہیے لیکن اگر کبھی ایسا نہ ہو تو نہ سہی!

اس شمارے میں کوثر چاندپوری کا جو رپورتاژ شامل ہے وہ ان کی قابل اعتماد یادداشت اور قوی مشاہدہ کا ایک تحریری ثبوت ہے جسے ان کے قلم نے ایک خاموش لیکن متحرک قلم کی طرح پیش کیا ہے۔

---

۳ مارچ کو جناب تبسم نظامی (جو ساغر نظامی کے ماموں تھے) کا حیدرآباد میں حرکت قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہو گیا۔ مرحوم حضرت جگر مرادآبادی کی "منازل حیات" کے نام سے ان کی سوانح عمری مرتب کرنے کے لیے مواد جمع کرنے کی غرض سے حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور اپنا کام تقریباً مکمل کر چکے تھے لیکن افسوس کہ موت نے انھیں مہلت نہ دی کہ وہ اپنے گھر (لکھنؤ) پہنچ کر مرتے حالانکہ انھوں نے ۱۰ مارچ کو ٹرین میں اپنی سیٹ بک کرالی تھی ـــ سچ ہے کہ جس کی قسمت میں جہاں کی مٹی ہوتی ہے وہ وہیں مرتا ہے کس کا وطن اور کہاں کا وطن۔

شمس الرحمٰن فاروقی

فلسفۂ ادب پر چند بنیادی سوالات

اس عنوان کے تحت شمس الرحمٰن فاروقی کے دو اور مضامین یا اس مضمون کی دو اور قسطیں "صبا" کے پچھلے شماروں میں شائع ہو چکی اور پسند کی جا چکی ہیں اب تیسری قسط پیش کی جا رہی ہے۔ (ادیب)

آلڈس ہکسلی کے ناول BRAVE NEW WORLD میں ایک ایسے نظام کا تذکرہ ہے جہاں انسان کی تخلیق مصنوعی بیضہ کاری کے ذریعہ اور اس کی ترویج خواب تعلیمی کے اصول پر کی جاتی ہے۔ پیدا ہوتے ہی بچوں کے ذہن کی تشریط (CONDITIONING) اس طرح کی جاتی ہے کہ وہ سوائے چند گنے چنے اور رٹے بندھے احساسات کے کسی اور جذبہ یا جواب (RESPONSE) سے واقف ہی نہ ہو سکیں۔ اس طرح ان کے ذہنوں سے محبت، خوف، خاندان، مذہب، اخلاق اور تخیلی تجربہ وغیرہ کی قسم کے خیالات اور جبلتوں کا قطعی اخراج کر دیا جاتا ہے۔ افلاطون کی خیالی جمہوریہ کی طرح یہاں بھی شعر و ادب کی کوئی جگہ نہیں۔ شاعری اگر ہے بھی تو اس کو جذباتی انجینئرنگ کی ایک شاخ کہہ کر اس سے پروپیگنڈا اور تشہیر خیالات کا کام لیا جاتا ہے۔ ایسے نظام کا پروردہ ایک شخص جو ہر طرح اس نظام کا تربیت شدہ ہے اور جس کو عورت، کھانا، کپڑا، مکان سب حسب خواہش میسر ہیں اپنی تمام ترتیب و ترویج کے باوجود اپنے ذہن اور شخصیت میں ایک انوکھا خلا، ایک عجیب بے سمتی سی محسوس کرتا ہے۔ اس کو رہ رہ کر احساس ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں کوئی اور چیز کلبلا رہی ہے جو اس کی تمام نہاد و جذباتی انجینئرنگ سے ارفع و بہتر ہے لیکن وہ کیا ہے یہ اسے نہیں معلوم اور کس طرح وہ اس بے نام مگر بار بار در تخیل پر دستک دینے والے جذبہ کو الفاظ میں لائے اور کن الفاظ میں لائے؟ یہ بھی اسے نہیں معلوم۔

غور سے دیکھیں تو ادب کا مقصد بھی یہی ہے۔ ادیب اپنے ذہن میں دوڑتی ہوئی بجلی کی لہروں کی چمک اور چبھن سے بے چین ہو کر ان کو ظاہر کر دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ تجربات اور محسوسات جو ذہن میں واضح یا غیر واضح طریقے سے ہر وقت مرتب ہوتے رہتے ہیں اور جو آہستہ آہستہ تخیل اور فکر کی آنچ میں پکتے رہتے ہیں کسی نہ کسی وقت

باہر اُمڈ آنے کے لیے بے قرار ہوا ٹھتے ہیں۔ ادب کا پہلا مقصد ابلاغ ہے۔ ادیب سب سے پہلے خود سے گفتگو کرتا ہے اور پھر کسی اور سے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ بائرن کے الفاظ میں "شعر تخیل کی جلتی ہوئی آگ کا لاوا ہے جس کے پھٹ پڑنے سے زلزلہ آتے آتے رک جاتا ہے" اور نہ ورڈز ورتھ کے الفاظ میں "شعر ان جذبات کا نام ہے جو سکون و اطمینان کے عالم میں حافظ کے پردے پر واپس آتے ہیں۔" شعر و ادب کے فلسفہ کو ان اور ان ہی کی طرح کے اور جذباتی نظریات سے بہت نقصان پہنچا ہے اور رومانی شاعری کی قدر و قیمت کم کرنے اور اس کو طفلانہ اور نیم پختہ ثابت کرنے کے لیے بائرن اور ورڈز ورتھ وغیرہم کے انھیں خیالات کا سہارا لیا گیا۔ شعر اگر تخیل کی جلتی ہوئی آگ کا لاوا ہے جس کے پھٹ پڑنے سے زلزلے کی روک تھام ہوتی ہے تو ڈراما اور دوسری ارفع شاعری کا کیا مقام ہوگا جس میں تخیل کا استعمال ذاتی اور داخلی نہیں بلکہ غیر ذاتی اور خارجی سطح پر ہوتا ہے اور وہ کون سا زلزلہ ہے جس کی روک تھام اس دھماکے اور ابال سے ہو جاتی ہے؟ کیا وہ زلزلہ شاعر کی شخصیت میں رونما ہوتا ہے یا اس کے شعر میں؟ اور بہر صورت اس زلزلہ کی نوعیت اور ہیئت کیا ہوتی ہے؟ اگر تخیل اور جلتی ہوئی آگ ایک ہی شے ہیں تو تخیل کی تعریف کیا ہوئی؟ اگر تخیل ظرف ہے اور آگ مظروف تو یہ آگ کہاں سے اور کیوں پیدا ہوتی ہے؟ اگر شعر صرف حافظہ میں باقی دھندلے نقوش کا نام ہے جو عالم سکون و اطمینان میں پھر سے سمٹے جاتے ہیں تو رزمیہ شاعری کا کیا درجہ ہے؟ وہ کون سے جذبات ہیں جن کے دھندلے نقوش سمٹے جائیں تو شعر بن جائیں گے؟ کیا یہ حکم ہر جذبہ پر مطلق ہے؟ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ عالم سکون و اطمینان سے کیا مراد ہے؟ کیا ذہنی تلاطم اور جوش و خروش کے عالم میں شاعری نہیں ہو سکتی؟

ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا جواب ممکن نہیں کیوں کہ وہ کلیہ جن سے یہ سوال برآمد ہوئے ہیں ان مسائل سے متعارف ہی نہیں تھا۔ اور نہ وہ کلیہ کسی نفسیاتی یا منطقی حقیقت پر مبنی تھا۔ (اگرچہ فلسفہ شعر میں منطقی حقیقت کا ہمیشہ سہارا لینا پڑا تا ہ کہ ن ہی ثابت ہو سکتا ہے) میں نے پہلے کہیں لکھا ہے کہ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں صحیح سوالات کیے جائیں۔ اگر سوال صحیح اور دور رس ہیں تو مسئلہ کی نوعیت پچاس فیصدی واضح ہو جاتی ہے بائرن اور ورڈز ورتھ کے کلیات سے جو سوال مرتب کیے گئے ہیں وہ فی نفسہ غلط ہیں کیوں کہ ان کلیات میں بہت سی نفسیاتی حقیقتوں کی اصلیت بلا تحقیق و تجربہ فرض کر لی گئی ہے یا بہت سے افسانوں اور مفروضات کو حقیقت کا درجہ دے دیا گیا ہے (مثلاً تخیل کی آگ، پھٹ پڑنا، زلزلہ، جذبات، عالم سکون و اطمینان وغیرہ وغیرہ۔)

لہٰذا جب ہم یہ کلیہ بنائیں کہ "تجربات اور محسوسات جو ذہن میں واضح اور غیر واضح طریقہ سے ہر وقت مرتب ہوتے رہتے ہیں اور جو تخیل اور نغمہ کی آنچ میں پکتے رہتے ہیں کسی نہ کسی وقت باہر اُمڈ آنے کے لیے بے قرار ہو اٹھتے ہیں۔" تو ہمیں غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لیے چند اہم احتیاطی تدابیر سے کام لینا ہوگا۔ بہتر ہے کہ پہلے ان سے الجھ لیا جائے۔

۱۔ ادب کی بنیاد تجربہ اور احساس پر ہوتی ہے۔ تجربہ سے مراد ہر وہ حادثہ ہے جس سے ذہن دوچار ہوتا ہے

ے وہ بظاہر اہم ہو یا غیر اہم۔ اس طرح محبت سے لے کر مطالعہ اور لباس پہننے سے لے کر ناخن تراشنا سب تجربہ
ں داخل ہے۔ احساس سے مراد ہر وہ ردعمل ہے جو ان تجربات کی وجہ سے ذہن کے پردہ پر رونما ہوتا ہے۔

۲۔ واضح یا غیر واضح کی شرط بہت اہم ہے۔ انسان کا ذہن ہر وقت تجربات اور احساسات کو قبول کرتا رہتا ہے
ر نہ صرف ان کو قبول کرتا ہے بلکہ ان کو گرفتار بھی کرتا ہے۔ یہ عمل شعوری اور غیر شعوری دونوں ہوتا ہے کسی وقت
شعوری، کسی وقت غیر شعوری اور کسی وقت دونوں ایک ساتھ۔

۳۔ تخیل سے مراد وہ قوت ہے جو مختلف اسباب و اذکار کو ایک رشتے میں پرو سکتی ہے۔ یعنی انسانی ذہن کی وہ
صلاحیت جو غیر متعلق چیزوں کو منسلک اور مضبوط کر سکتی ہے۔ کولرج کے الفاظ میں "پرانی اور مانوس اشیا کے ساتھ
نئے پن اور تازگی کا احساس، عام سے زیادہ بڑھ کر جذبہ کی کیفیت، جس میں عام سے زیادہ اور بڑھ کر ارتباط
ور نظم ہوتا ہے، محاکمہ جو ہمہ وقت بیدار رہتا ہے اور استقلال کے ساتھ خود اختیاری کا جذبہ ..." اور پھر
موسیقیت کی مسرت کا احساس ... اور تصورات کے ایک سلسلہ کو کسی ایک بے پناہ جذبہ یا تصور کے زیر نگیں کرنے کی قوت
کو تخیل کہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ کولرج کے الفاظ میں وہ احتیاط اور قانونی سختی نہیں ہے جو اس نظریہ کو فضول اور
شاعرانہ انداز بیان سے محفوظ رکھے، لیکن مفہوم بالکل صاف ہے۔

۴۔ نغمہ اور تخیل کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ اوپر کولرج نے بھی "موسیقیت کی مسرت" کا ذکر کیا ہے۔ میں صرف
اس احتیاط کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ نغمہ ہی ہمیشہ واضح اور معروف حیثیت سے تجربہ کو پکانے میں مدد نہیں
دیتا۔ کوئی ایک دھن، کسی ایک فقرہ یا لفظ یا آواز کی موسیقی ذہن میں آہستہ آہستہ تیل کے قطرے کی طرح پھیلتی جاتی ہے اور
جب نغمہ اور تجربہ مل کر ایک ہو جاتے ہیں تو وہ ذہن سے باہر نکلنے کو تیار ہوتے ہیں۔

● بے قراری کا مفہوم وہ نہیں ہے جو بائرن کا ہے۔ "بے قراری ماں کے پیٹ سے بچے کے نکلنے کی نہیں ہے، بلکہ بیج
کے آہستہ آہستہ زمین توڑ کر سر نکالنے کی ہے۔ اگر زمین سخت ہو یا بیج کمزور یا حالات نامساعد تو بیج جہاں کا وہیں رہ جاتا ہے۔

اس طرح ادب جب پیدا کیا جاتا ہے تو اس کے خالق کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ اسے کہنا ہے وہ کہہ دیا جائے۔
دوسرے الفاظ میں ادب ان تجربات کا ابلاغ کرتا ہے اور کسی خاص ذہن کی ان کیفیات کو عام کرتا ہے جن تک دوسرے ذہن نہیں
پہنچ سکتے اور اگر وہ کیفیات عام نہ کیے جاتے تو ان تک سب کی رسائی ممکن نہ تھی۔ ساتھ ہی ساتھ، اور ہمارے موجودہ
بحث کے لیے زیادہ اہم، یہ بھی ہے کہ ادب اس ذریعہ کا نام ہے جس کے توسط سے "وہ تجربات (بقول رچرڈز) ادیب کے
ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو کسی اور ذریعہ سے ظہور میں نہ آتے۔" اس نکتہ پر بہت تفصیلی بحث ممکن ہے۔ کیوں کہ ابھی میں
نے یہ کہا کہ فن کار کے ذہن میں تجربات کا ردعمل محفوظ ہوتا رہتا ہے اور پھر کسی نہ کسی وقت ان کی ترسیل ہوتی ہے اگر ایسا ہے تو
یہ کیوں کر کہا جاسکتا ہے کہ ادب وہ ذریعہ ہے جس کے توسط سے فن کار کے ذہن میں تجربات شکل پاتے ہیں اور ظہور پذیر
ہوتے ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لیے یہ ملحوظ خاطر رکھیے کہ اگرچہ تجربات اور احساسات فن کار کے ذہن میں خارجی دنیا سے

داخل ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بجنسہ اس کے ذہن میں نہیں رہ پاتے۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فن کار کا ذہن عام انسانوں کے ذہن سے بہتر اور موثر طریقے سے اپنے تجربات پر ہاتھ ڈال سکتا ہے تو ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تجربات پورے پورے اور اپنی اصلی شکل و صورت میں فن کار کی چشم تصور کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ ادیب زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتا ہے کہ وہ ان ہی ذہنی کیفیات کو اپنے اوپر سے طاری کرلے جو اس تجزیے کے ردعمل کے طور پر اس پر طاری ہوئی تھیں یہ عمل سراسر تخلیق کا ہے، مشینی تشکیل کا نہیں۔ اس کے علاوہ ان کیفیات کو اپنے اوپر طاری کرنے میں کچھ اور نازک عمل اور قوتیں بروئے کار آتی ہیں مثلاً انتخاب، تشدید اور توضیح کی قوتیں، جن کے بغیر کوئی بھی تجربہ بذات خود بہت زیادہ کام کا نہیں ہوتا۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کوئی ایک تجربہ اکیلا فن نہیں بن سکتا۔ اس کو مکمل تر اور موثر تر کرنے کے لیے دوسرے تجربات کی ضرورت ہوتی ہے یہاں تخیل کی قوت میدان عمل میں آتی ہے کیوں کہ جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، تخیل نہ صرف خیالات اور احساسات کے ایک سلسلہ کو کسی ایک توانا احساس یا خیال کا زیر نگیں بناتا ہے بلکہ بہت سے منتشر خیالات کو ایک سلسلہ میں پرو بھی سکتا ہے۔

اس طرح ادب جس کا مقصد ابلاغ و ترسیل تجربہ ہے ایک دوشکلی عمل کا حکم رکھتا ہے ایک طرف تو ادب کے ذریعہ فن کار اپنے ان تجربات کو ہم تک پہنچاتا ہے جو بصورت دیگر ہم تک نہ پہنچتے اور دوسری طرف خود فن کار کے ان تجربات کو اجاگر کرتا ہے، ادب کے بغیر مردہ اور جامد رہتے ہیں۔

یہاں میں ڈرتا ہوں کہ اگر اس مسئلہ پر پوری توجہ نہ دی گئی تو میں کروچے کی خیالی اظہاریت کے بہت پاس جا پڑوں گا، یا آپ اس غلط فہمی میں پڑ جائیں گے کہ ادب اظہاریت (EXPRESSIONISM) کے علاوہ کچھ نہیں۔ خاص کر میرے بیان کیے ہوئے کلیہ کا دوسرا حصہ اظہاریت کے بہت قریب ہے لیکن ایک نازک فرق کے ساتھ۔ اور وہ فرق یہ ہے کہ ادب کے ہر دو مقاصد کو الگ الگ نہیں رکھا جا سکتا۔ نہ تو صرف یہی کہہ کر گلو خلاصی ممکن ہے کہ ادب تجربات کے اظہار اور ترسیل کا نام ہے اور نہ صرف یہ کہنا جاں بخشی کا سبب ہوگا کہ ادب کا مقصد فن کار کے ذہن میں تجربات کی تخلیق کرنا ہے۔ اس کے علاوہ کلیہ کے دوسرے حصے کی نوعیت محض فروعی ہے کیوں کہ فن کار کے ذہن میں کیا کیا صورتیں جنم لیتی ہیں (ہائے کیا صورتیں پردے میں بناتا ہے میاں) ان کا ہم آپ سے جو فن کے پرکھنے والے یا پرستار ہیں کوئی تعلق نہیں جب تک کہ وہ صورتیں ہم تک کسی نہ کسی شکل میں پہنچ نہ جائیں۔

یہاں ایک سوال بہت اہم اور ضروری نظر آتا ہے۔ اور اس کا تصفیہ بھی کرتے چلیں۔ ابھی ابھی ہم نے یہ طے کیا کہ ادب تجربات اور احساس کی ترسیل و ابلاغ کا نام ہے۔ لازم ہے کہ تجربات اور احساسات کی نوعیت اور قیمت بھی متعین کی جائے کیا ہر طرح کے جذبہ یا ہر طرح کے احساس کو ادب کا درجہ دیا جاسکتا ہے؟ یا دوسرے الفاظ میں ادب کا مقصد جان لینے کے بعد یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ جن چیزوں کو بازار میں لانے کے لیے ادب پیدا کیا گیا ان میں کھرے کھوٹے کی پہچان کیا ہے؟

فرض کیجیے کہ ادیب نے جس ذریعہ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا وہ ذریعہ (۱) اپنے خیالات کے لیے ناکافی ہے

یا (۲) ادیب اس ذریعہ کو پوری طرح استعمال نہیں کر سکا یا (۳) وہ ذریعہ سرے سے اظہارِ خیال کے لیے ناموزوں تھا۔ کیا ان میں سے کسی ایک یا تینوں صورتوں میں آپ ادب کے مقصد کو پورا سمجھیں گے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اس لیے ادب کے مقصد میں اظہار کے ساتھ ساتھ ایک شرط یہ بھی لگانی ہوگی کہ جس طرح اظہار کیا گیا وہ موضوع کے لیے کافی تھا اور جن کیفیات و تجربات کا ذکر کیا گیا وہ قاری کے ذہن پر بھی مرتب ہوئے۔ یہ صحیح ہے کہ شاید اگر خود فن کار سے پوچھا جائے تو وہ اس مسئلہ پر کوئی تفصیلی گفتگو کرنے پر تیار نہ ہوگا، شاید اس کے خیال میں اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو کہ جس ذریعہ کو اظہارِ خیال کے لیے استعمال کیا گیا ہے وہ کافی یا موزوں تھا یا نہیں۔ حالانکہ یہ رویہ غلط فہمی پر مبنی ہے اسی طرح جس طرح یہ رویہ غلط فہمی پر مبنی ہے کہ شاعر کا فرض ہے کہ اس کا فن سب کی سمجھ کی دسترس کے اندر ہو۔ ان دونوں نظریات میں بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ فن پارہ کی پہلی قدر یہ ہوتی ہے کہ اس میں بیان کردہ تجربات اس طرح بیان کیے جائیں کہ ان تک سمجھدار پڑھنے والوں کی رسائی ہو سکے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو تجربہ کی اہمیت مسلّم ہوتے ہوئے بھی فن کار کم زور اور ناکام ہے۔ دوسری طرف پڑھنے والے جب "آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش" تو وہ فن کے ساتھ اس زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں کہ وہ مشکل اور ناکافی کا فرق نہیں سمجھ پاتے۔ ترسیلِ خیال کا ذریعہ اگر مشکل ہے تو کوئی ہرج نہیں کیوں کہ رچرڈز کے الفاظ میں "شاعر اپنے قاری کے ذہن سے لامحدود زور لگانے کا اصرار کر سکتا ہے بشرطیکہ قاری کے ذہن کی تگ و تاز شاعر کے ذہن کی تگ و تاز سے متناسب ہو"۔ نقاد اور قاری کی حیثیت سے ہمیں شکایت اس وقت ہوگی جب ذریعہ ناکافی، کم زور یا بے کار ہوگا۔

یہ معلوم کرنے کے بعد کہ جس ذریعہ کو استعمال کیا گیا ہے وہ مناسب ہے یا نہیں یہ سوال بھی کیا جانا چاہیے کہ ذریعہ جس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہے وہ کیسا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس تجربہ کو لے کر فن کار اٹھا ہے وہ کم زور یا بے قیمت یا کم قیمت ہے اگرچہ اس کی ترسیل اچھی طرح ہوئی ہے۔ اردو شاعری کا زیادہ تر حصہ اس مہلک کم زوری کی اچھی مثال ہے۔ خاص کر جدید شاعری کا معتدبہ حصہ صرف زورِ بیان اور الفاظ کے حسن پر زندہ ہے (میں مثال دے کر آپ کا وقت نہیں خراب کروں گا) اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تجربہ توانا ہے لیکن ذریعہ اظہار کافی نہیں۔ اس صورت سے ہم بحث کر چکے ہیں۔ اور اگرچہ فلسفیانہ حیثیت سے ادب کا مقصد ترسیلِ خیال کے بعد پورا ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی ہمارا فرض ہے کہ تجربہ کی قیمت کے بارے میں کچھ سوچ لیں اور سمجھ لیں۔

یہ اس لیے کہ اکثر و بیشتر ادب کا مقصد حسن کی تخلیق، حق کی معرفت اور اس قسم کے خالی اور صوفیانہ خیالات میں بیان کیا جاتا رہا ہے۔ جب ہم نے یہ ثابت کیا کہ ادب کا مقصد حسن اور حق کی تخلیق کی معرفت نہیں ہے (میں ان تمام نقادانِ سخن سے معذرت خواہ ہوں جو اس پوری بحث پر مجھ سے خفا ہوں گے اور کبھی غالب کا دیوان اٹھائیں گے کبھی میر کا . . . کبھی شکسپیئر کا سہارا لیں گے اور کبھی فردوسی کا۔ ان کی خدمت میں میں کچھ معروضات بعد میں پیش کروں گا۔) میں یہ کہہ رہا تھا کہ ادب کا مقصد اگر تجربہ کا اظہار ہے تو ضروری ہے کہ ہم تجربہ کو پرکھیں کہ حسن اور

حقیقت اور اس طرح کے دوسرے مفروضہ مقاصد ادب کی بھی حقیقت کھل جائے
یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہر تجربہ ادب نہیں بن سکتا۔ ادب بننے کے لیے تجربہ میں قدر و قیمت ہونا لازمی ہے۔ سوال یہ ہے کہ تجربہ کی قدر و قیمت کس طرح پرکی جائے تجربہ کی قدر اس کے حسن اور حقیقت (BEAUTY OR TRUTH) میں نہیں ہوتی۔ حسن اور حقیقت اس عمل کا نتیجہ ہو سکتے ہیں جو تجربہ کو مناسب الفاظ میں ڈھالتا ہے، یا اس نتیجہ کا اثر ہو سکتے ہیں جو تجربہ کو مناسب الفاظ میں ڈھالنے کے بعد پیدا ہوتا ہے قدر کی تعریف یوں ہو سکتی ہے "ہر وہ چیز جو کسی خواہش کی تکمیل دوسری خواہشات کی ناآسودگی کے بغیر کر سکے قدر رکھتی ہے۔ یا ہر وہ چیز جو کسی خواہش کو بغیر کسی دوسری اتنی ہی یا زیادہ اہم خواہشات کو ناآسودہ کیے بغیر آسودہ کر سکے، قدر رکھتی ہے۔" (میں نے رچرڈز کے الفاظ کو اپنا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔) اگر اس نظریہ کو ذرا سی وسعت دی جائے تو خود رچرڈز کے الفاظ میں یہ مادیت کے دیو استبداد کی پائے کوبی کی تعریف ہو جائے گی۔ لہٰذا اگر اس خیال کی تھوڑی سی اصلاح کر دی جائے اور یوں کہا جائے کہ "ہر وہ چیز جو جذبہ تکمیل کو کسی نہ کسی حد تک آسودہ کر سکے، قدر رکھتی ہے اور اس کی قدر کا تناسب اسی حد سے ہوگا جس تک وہ آسودگی پیدا کر سکے تو بہتر ہوگا۔" اگرچہ رچرڈز نے خود بچاسے خواہش کے ایک اور لفظ استعمال کیا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ مادیت کے چھینٹوں سے اپنے نظریہ کو بچا نہیں سکا ہے۔ جو تعریف ہم نے کی ہے وہ چاہے اس حد تک باریک نہ ہو لیکن ہمارے مقصد کے لیے کافی ہے۔

جذبہ تکمیل کو پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ تجربہ اپنی تازگی، گہرائی، نزاکت یا انوکھے پن کی وجہ سے ہماری کسی جذباتی کمی کو پورا کر سکے یا ہمیں اس کمی کا احساس دلاتے ہوئے اس کو تجربہ کی مدد سے پورا کرنے پر آمادہ کر سکے۔ ہمیں ہر فن کی تعلیمی اصلاحی اور فلسفیانہ اقدار کی حیثیت معلوم ہوتی ہے۔

پہلے لوگوں کا خیال کہ ادب کا مقصد حسن کی تخلیق یا حقیقت کی تلاش یا مسرت پیدا کرنا ہے یا معاشرہ کی اصلاح کرنا ہے اگرچہ بالکل غلط اور کم بینی پر مبنی تھا لیکن ایک طرح سے حقیقت کے نزدیک بھی تھا۔ کیوں کہ اگرچہ ادب کا مقصد کچھ اور ہے لیکن اس کا عمل یہی ہے۔ ان دونوں بیانات میں جو باریک فرق ہے اسے ہر وقت ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہونے کی وجہ سے تنقید بہت سی گمراہیوں اور الجھنوں کا شکار ہوتی رہی ہے اور ادب کو زبردستی معطون کیا جاتا رہا ہے تجربہ کی قدر اگر اس نکتہ میں مخفی ہے کہ وہ ہمارے جذبہ تکمیل کو پورا کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ایسا ہونے کے ساتھ ہی ہمیں کسی حسن یا حقیقت سے دوچار ہونے کا احساس لازمی ہے۔ گوئٹے کا خیال کہ "حسن فطرت کے ان پراسرار قوانین کے اظہار کا نام ہے جو اس (ادب) کے ذریعہ انکشاف کے بغیر ہم پر مخفی رہتے،" اگرچہ شاعرانہ خیال آرائی سے بوجھل ہے لیکن ہے حقیقت کے آس پاس۔ کیوں کہ ادب بہرحال ہم پر حسن اور حقائق کا انکشاف کرتا ہے۔ و یسے ہی ادب کی مسرت اس میں نہیں ہے کہ ہم اس کا مطالعہ کر کے خوش ہوں۔ بلکہ جس طرح سے ادب

تخلیق کیا گیا ہے اور جس ذریعہ کو اپنا کر تجربہ کا اظہار کیا گیا ہے اگر وہ مناسب اور دوررس ہے تو ہم کو اس میں ایک حسن اور اس حسن سے مسرت کا احساس ہونا لازمی ہے، صرف یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جس طرح کا حسن اور حقیقت اور مسرت ادب ہم کو بخشتا ہے وہ ادب کا خاصہ ہے، مقصد نہیں۔ ممکن ہے کہ ادب سے آپ کو کوئی ایسی حقیقت ذل گ جس کی طرف گوئٹے نے اشارہ کیا ہے، اور یہ تو یقینی ہے کہ ادب سے ریاضیاتی اور علمی حقیقت کی امید رکھنا بالکل فضول ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اکثر ادب میں منطقی حقیقت کا بھی فقدان ہوتا ہے، اور اکثر تجربہ کا اظہار ہمارے ذہن پر صرف ایک جذباتی اختلاط (EMOTIONAL SYNTHICSIS) پیدا کرتا ہے جو حقیقت حسن اور مسرت تینوں کی جگہ لے لیتا ہے۔

پس فن کے لیے ضروری نہیں کہ وہ مستقل معنوں میں خوب صورت ہو یا خوب صورتی پیدا کرے زیادہ مستقل معنوں میں حق یا حقیقت پر مبنی ہو۔ ویسے ہی تعلیمی اور اصلاحی اقدار جو فن میں پائے جاتے ہیں۔ وہ تجربہ کی تکمیلی قدر کا جزو لاینفک ہو کر آتے ہیں اور بذات خود اپنی کوئی جگہ نہیں رکھتے۔ یہ سب اقدار ادب میں اتفاقیہ ظہور پذیر ہوتی ہیں لہذا کسی ہم فن کار سے ان کا مطالبہ کرنا یا کسی بھی فن کار کی تخلیقات میں سے ان کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنا (فلسفہ کلام غالب، میر کا نظریۂ حیات، وغیرہ وغیرہ) فن کے ساتھ زیادتی ہے اور جب بھی کوئی فنکار اپنی تخلیقات پر الگ سے حسن یا حقیقت یا معلیت کا بار رکھنے کی کوشش کرتا ہے (مثلاً فیض احمد فیض) تو وہ اپنے تجربات سے مطمئن نہیں ہے یا پھر اپنے فن کے ساتھ ریاکاری اور زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے، یا شاید اس کے تجربات اعلیٰ قدر کے حامل نہیں ہیں۔

چرنی کوواسونیا

حال، ماضی اور مستقبل کے موقوف صورت کے صیغے

روسی اسکالر مس چرنی کوواسونیا کا یہ تحقیقی مضمون ہم "صبا" میں پیش کرتے ہوئے مسرت محسوس کر رہے ہیں۔ یہ مضمون انھوں نے اپنے قیام حیدرآباد کے زمانے میں بطور خاص "صبا" میں اشاعت کی غرض سے دیا ہے۔ مس سونیا (صوفیہ) نے تاشقند یونیورسٹی سے اردو میں ام۔ اے کیا ہے اور اب اردو گرامر (افعال) پر پی ایچ ڈی کے لیے ریسرچ کر رہی ہیں۔ مس سونیا کلچرل ایکسچینج کے پروگرام کے تحت پچھلے چھ ماہ سے ہندوستان میں ہیں۔

(ادیب)

"صورت" وہ اصطلاح ہے جو کام کے تسلسل کے طریقوں میں ان چھوٹے یا بڑے اختلافات کے لیے استعمال
جاتی ہے جو کچھ زبانوں میں قواعد کے صیغوں کے ذریعہ متعین کی جاتی ہے۔

اردو اور ہندی میں حال کے خبریہ صورت کے معروف طور پر صرف کام دکھانے والے افعال کے سات صیغے ہیں۔ یہ زنا
ل میں اتنے صیغوں کا ہونا اس بات سے سمجھا یا جا سکتا ہے کہ ان صیغوں میں سے بہت سوں میں اوپر سے کوئی نہ کوئی مطلب
ال ہوتا ہے۔ مثلاً ترقی پذیر صورت کے صیغوں کی خصوصیت کام میں اضافہ ہوتے رہنا ہے۔ موقوف صورت کے صیغے
ام کو وقفے کے ساتھ ہوتے دکھاتے ہیں۔

صورت زمانے سے قطع نظر کام کی خصوصیت بتاتی ہے یعنی زمانہ افعال کے ان صیغوں کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے جن کا
ٰنی نہ کوئی صورت ہے۔ اردو اور ہندی میں افعال امدادی کا ایک گروہ ہے جن کے اپنے معنی ہیں اور جو فعل کے طور پر اپنے
پ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ اصل فعل کو صورت کے معنی دیئے جاتے ہیں۔ مندرجہ ذیل مصدروں کا مقابلہ دیکھیے۔

پڑھتے رہنا — طویل صورت
پڑھتے جانا — ترقی پذیر صورت
پڑھا کرنا — موقوف صورت
پڑھ رہا ہونا — استمراری صورت

مگر افعال کے سب صیغوں کی بناوٹ زمانے کو دیکھ کر کی جاتی ہے۔ مثلاً طویل صورت خود صیغہ نہیں ہے صرف

ل، ماضی، مستقبل کی طویل صورت کے صیغے ہیں۔
اس مقالے کا مقصد جملوں کو دیکھ کر موقوف صورت کے صیغوں کی خصوصیتیں متعین کرنا ہے۔ یہ اردو اور ہندی کے افعال کی صورت کا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا ابھی تک تفصیل سے مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔

حال کی موقوف صورت

صیغے کی ساخت :- اصل فعل کے حالیہ تمام اور "کرنا" کے حال مطلق کے صیغے کو ملا کر حال کی موقوف صورت بنائی جاتی ہے۔ جیسے دیکھا کرتا ہے۔

حال کی موقوف صورت کے استعمال :-

(۱) کام کا جاری رہنا مسلسل نہیں ہوتا بلکہ بیچ بیچ میں وقفہ آتا رہتا ہے ؎

خوف سے لیتے نہیں نام کہ سن لے نہ کوئی   چپکے چپکے تمھیں ہم یاد کیا کرتے ہیں
(سرشار ۔ کامنی صـ۳۱۶)

میں دو خاتونوں کو زبان کی تعلیم دینے جایا کرتی ہوں .... (پریم چند ۔ سہاگ کا جنازہ صـ۲۷۵)
... کا کا! بہن ہم کو چڑھایا کرتی ہے .... (پریم چند ۔ گودان صـ۲۵)

کام کی کثرت یا کمیت ظاہر کرنے کے لیے جملے میں "کبھی کبھی" "اکثر" "بار بار" "اکثر و بیشتر" جیسے الفاظ موجود ہوتے ہیں۔ جیسے :

.... تو تو آئے دن فرمائش کیا کرتی ہے .... (مرزا رسوا ۔ امراؤ جان ادا صـ۸)
.... پہاڑ برابر سہٹا کرتے ہیں .... (سرشار ۔ سیر کہسار ۔ جلد دوم صـ۸)
مہراج ۔ یہ شعر ہمارا دادا (علیہ الرحمۃ) اکثر پڑھا کرتا ہے (سیر کہسار ۔ جلد دوم صـ۶۵)
عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں (منٹو ۔ عصمت چغتائی صـ۲۲)

(۲) کام عام صداقت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس بات کا واضح احساس ہوتا ہے کہ کام بکثرت ہونے کی وجہ سے معمول بن گیا ہے ۔ جیسے

.... دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بالکل اسی طرح باتیں کر رہے تھے جیسے عاشق و معشوق کیا کرتے ہیں۔ (پریم چند ۔ تر سول صـ۹۴)

.... یہ کنجوس ہے جیسے بوڑھی عورتیں ہوا کرتی ہیں .... (سرشار ۔ فسانۂ آزاد، جلد دوم صـ۴۰)
.... اس سن میں سب کی نظر پڑتی ہے اور لڑکیاں اکثر بگڑ بھی جایا کرتی ہیں (سرشار ۔ فسانۂ آزاد، جلد دوم صـ۵)

(۳) بعض اوقات عمومیت کے ساتھ ہونے والے کام سے فاعل کی عادت ظاہر ہوتی ہے ۔ جیسے

... نہیں میں تو باہر ہوا میں بھی نہیں بیٹھتی دالان کے اندر بیٹھا کرتی ہوں۔ جہاں ہوا کا گزر نہیں۔
(نذیر احمد ۔ بنات النعش صـ۹۵)

میں نے استانی جی سے پوچھا کہ آپ اس قدر سویرے اٹھ کر کیوں ٹہلا کرتی ہیں . . . .
(نذیر احمد ـ بنات النعش ص۱۳۰)
کیا ہر روز آپ پہروں چڑھے اٹھا کرتی ہیں (نذیر احمد ـ بنات النعش ص۷۵)
(۴) بظاہر مسلسل کام کے لیے بھی موقوف صورت کا استعمال ہو سکتا ہے ۔
الف ۔ تسلسل کا احساس جملے میں استعمال شدہ لفظوں سے پیدا ہوتا ہے۔ موقوف صورت کے استعمال سے اس تسلسل کا انقطاع ظاہر ہوتا ہے ۔
رنبیر سنگھ رن کے میدان میں ہیں اور وہاں ہر دم و ہر لحظہ اپنی جیتی بی بی کو دل سے یاد کیا کرتے ہیں ۔
(سرشار ـ کامنی ص۲۳۹)
اس قسم کے جملوں میں موقوف صورت کے استعمال سے غالب احساس یہ ہوتا ہے کہ کام عام طور پر ہر وقت جاری نہیں رہتا ہے ۔ فاعل کو اور بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں ۔ جیسے
حسن آرا ۔ لوگ تو بات بات میں واللہ باللہ کہا کرتے ہیں (نذیر احمد ۔ بنات النعش ص۱۰)
جب اس موقع پر طویل صورت کا صیغہ استعمال ہوتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کام کے بار بار دہرانے میں وقفہ اتنا کم ہوتا ہے کہ کام کو ہوتے ہوئے کسی بھی وقت دیکھا جا سکتا ہے ۔ جیسے
. . . . سلیا بہن نہ جانے کیوں ہر دم روتی رہتی ہے (پریم چند ـ گودان ص۵۶۵)
موقوف صورت میں وقفہ زیادہ بڑا ہوتا ہے ۔
ب ـ اسی طرح جب موقوف صورت کے ساتھ "ہر روز" جیسے لفظ استعمال ہوتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ کام سچ مچ روزانہ ہوتا ہو ۔ موقوف صورت کے استعمال سے کام کے کبھی کبھی نہ ہونے کا امکان باقی رہتا ہے جیسے
ہمارے محلے میں ایک آیا رہتی ہے وہ ہر سال اپنے صاحب کے ہمراہ پہاڑ پر جایا کرتی ہے . . . .
(سرشار ـ سیر کہسار ، جلد اول ص۱۵)
. . دونوں وقت مفت میں چھ سات گھروں کا سودا لادیا کرتی ہوں ۔ (نذیر احمد ۔ بنات النعش ص۹۲)
"ہر روز" جیسے لفظ ہونے پر بھی موقوف صورت کے استعمال سے عمومیت کا احساس جملے میں باقی رہتا ہے ۔
جب جملے میں "ہر روز" "ہر سال" وغیرہ لفظ فعل کی طویل صورت کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں تو یہ احساس کہ کام عمومیت کے ساتھ جاری رہتا ہے ختم ہو کر کام کے جاری رہنے کا اظہار شدید ہو جاتا ہے ۔ جیسے
. . . . تم ہر روز کل کل کرتے رہتے ہو (پریم چند ۔ منتر ص۲۹)
اس کی عجیب زندگی کا معمہ اب بھی بحث و نظر کا ایک دلچسپ موضوع ہے ہر دوسرے تیسرے سال کوئی نہ کوئی نئی کتاب نکلتی رہتی ہے (ابوالکلام آزاد ـ غبار خاطر ص۲۰۹)

ج ۔ حال کی موقوف صورت سے ظاہر کیا ہوا کام بعض خاص حالتوں کے تابع ہوتا ہے، اور اسی حالت کے بار بار پیدا ہونے پر بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس صورت میں بھی کام کے بار بار دہرائے جانے کی وجہ سے عمومیت عادت کا اظہار ہوتا ہے۔ جیسے

میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتنی شے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے (منٹو ۔ عصمت چغتائی ص۱۲)

میں نے تو اپنا یہی قاعدہ رکھا ہے کہ لکھنے پڑھنے سے جتنا وقت بچتا ہے کچھ نہ کچھ کام کیا کرتی ہوں۔
(نذیر احمد ۔ بنات النعش ص۵۳)

برسات میں جو ایک رنگین کمان آسمان میں نکلا کرتی ہے اس کی حقیقت بھی یہی ہے کہ . . . . .
(نذیر احمد ۔ بنات النعش ص۱۲۹)

ہمسائی ۔ کیا کہوں کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے جس دن پیسنا نہیں ملتا تمام بدن دکھا کرتا ہے۔ . .
(نذیر احمد ۔ بنات النعش ص۴۵)

(۵) کام ایک خاص عرصہ میں محدود ہوتا ہے۔ جملے میں "دن بھر" "رات بھر" وغیرہ لفظ موجود ہوتے ہیں۔ اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہاں موقوف صورت کام کے وقفے کے ساتھ ہونے کو ظاہر نہیں کرتی بلکہ کام کا تسلسل دکھاتی ہے لیکن دراصل ایسا نہیں بلکہ ان لفظوں کا مفہوم صرف یہ ہوتا ہے کہ کام اکثر حصے میں ہوا یعنی "دن بھر" کا مطلب محض یہ ہوگا کہ دن کے اکثر حصے میں کام ہوتا ہے۔ جیسے

. . . . اور میں تو حضور دن رات انہیں کی صورت دیکھا کرتی ہوں . . . (سرشار ۔ سیر کہسار، جلد اول ص۱)

ان لوگوں سے ہندوستان کو ترقی کی امید نہ رکھنی چاہیے جو دنیا کو ترک کر کے پہاڑوں کی کھوہ میں جا کے بیٹھے ہیں یا جو رام رام کی گولیاں دن دن بھر لکھا کرتے ہیں تاکہ مچھلیوں کو نفع پہنچے (سرشار ۔ سیر کہسار ۔ جلد دوم ص۱۶۵)

دن بھر غل مچایا کرتے ہیں (سرشار ۔ سیر کہسار ۔ جلد دوم ص۱۸)

وقفے کی نوعیت کے معنی اس وقت زیادہ واضح ہوں گے جب کہ ہم اس صیغے کا حال کے طویل صورت کے صیغے سے موازنہ کریں گے جو اسی مناسب حالت کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ جیسے

. . دن بھر تمہاری اماں کچو کے دیتی رہتی ہیں . . . . (احمد عباس ۔ کچی کچی ۔ ص۸)

موقوف صورت کا صیغہ کام کے تسلسل کے ساتھ ہونے کو ظاہر نہیں کرتا جب کہ طویل صورت کا استعمال کام کے جاری رہنے پر زور دیتا ہے۔

ماضی کا موقوف صورت کا صیغہ

صیغے کے استعمال: (۱) اس بات کے اظہار کے لیے کہ کام وقفے کے ساتھ عمل میں آتا ہے۔ جیسے

لکھنو کا میں نام گھر میں سنا کرتی تھی (مرزا رسوا ۔ امراؤ جان ادا صـ۳۰)
بوٹ کھسوٹ کے ڈر سے کھیتی کم ہوتی تھی اور بہت زمین پڑی رہا کرتی تھی ۔
(نذیر احمد ۔ بنات النعش صـ۱۸۹)
قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے ۔ طاق اب چراغ سے خالی ہے مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی ایک دیا جلا کرتا تھا ۔ (ابوالکلام آزاد ۔ غبار خاطر صـ۵۲)
وقفے کے ساتھ ہونے والا کام کتنے مرتبہ ہوتا ہے یہ ظاہر کرنے کے لیے جملے میں کبھی کبھی "اکثر" "بار بار" جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں ۔ جیسے
اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس گھر میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں ۔
(مرزا رسوا ۔ امراؤ جان ادا صـ۳)
اور اسی وجہ سے سدا اداس رہا کرتی تھی (نذیر احمد ۔ بنات النعش صـ۲۰۵)
یوں تو میں اکثر آپ کی آواز سنا کرتی تھی مگر کبھی بلانے کی جرأت نہ ہوئی (مرزا رسوا ۔ امراؤ جان ادا صـ)
(۲) فاعل کی عادت کے اظہار کے لیے :
وہ گھر سے ایک حسرتناک وحشت کے عالم میں نکل جاتا ۔ اور گھنٹوں کھیتوں کے منڈیر پر بیٹھا ہوا رویا کرتا ۔
(پریم چند ۔ قربانی صـ۳۳۲، ۳۳۱)
حالانکہ اس کی بیوی منہ اندھیرے اٹھا کرتی تھی پر آج دروازوں کو کھلا ہوا دیکھ کر اس کا کلیجہ سن سے ہو گیا ۔
پریم چند ۔ دفتری ۔ صـ۳۵۱، ۳۵۰

(۳) بظاہر مسلسل کام کے لیے :
یہ استعمال اس لیے دلچسپ ہے کہ لفظوں اور فعل میں جو مفہوم پوشیدہ ہے وہ جدا جدا ہے ۔ فعل یہ ظاہر کرتا ہے کہ کام مسلسل جاری نہیں ہوتا بیچ بیچ میں وقفہ آتا رہتا ہے ۔ جملے میں "ہر لمحہ" "روزانہ" جیسے لفظوں کا استعمال یہ تقاضا کرتا ہے کہ کام پابندی کے ساتھ ہوتا ہو ۔ یہ کہنا کہ اس صورت میں "تقریباً" لفظ محذوف ہوتا ہے غلط نہیں ہوگا ۔
اپنے عملوں اور لشکر والوں کی زبان سے کنور صاحب کی سرکشی اور غرور اور ہیکڑی کی داستانیں روز سنا کرتا ۔
(پریم چند ۔ سرپر غرور صـ۱۲)
اب مجھے معلوم ہوا کہ تارا کیوں روز ڈاکیہ کی راہ دیکھا کرتی تھی ۔ (پریم چند ۔ خانہ برباد صـ۶۳)
جب کام بعض حالتوں کے تابع ہوتا ہے تو اس سے یہ مراد ہے کہ ماضی کی موقوف صورت سے ظاہر کیا ہوا کام موافق معمول کے ہوتا ہے ۔ مناسب حالت کے ساتھ اس کا ہر بار عمل میں آنا ضروری نہیں ۔ جیسے
اسی لیے اسے جب کپڑوں کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے پڑوس کے ایک لالہ صاحب سے منگوایا کرتی تھی ۔
(پریم چند ۔ سوت صـ۲۶۵)

کبھی کیشو کے آنے میں ایک آدھ مہینہ لگ جاتا تھا تو وہ بے چین ہو جایا کرتی تھی۔
(پریم چند۔ سہاگ کا جنازہ ص ۲۷)
اگر انہیں باہر سے آنے میں ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تھی تو وہ پر مزہ شکوے کیا کرتی تھی۔ (پریم چند۔ دھوکا ص ۱۳۵)
(۴) کام کسی مخصوص عرصے میں وقفے وقفے کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔
راجکمار سارا دن وحشت کے عالم میں کوچہ و بازار میں گھوما کرتا (پریم چند۔ راجپوت کی بیٹی ص ۵۲)
اپنی کھاٹ پر پڑے پڑے وہ گھنٹوں دیوتاؤں کو یاد کیا کرتا اور مہا بیر اور دیو کے گن گاتا۔
(پریم چند۔ تیبی کا دھن ص ۱۱۲)
جہاں رات بھر کولھو چلا کرتے۔ گڑ کی سگندھ اڑا کرتی تھی۔ بھٹیاں جلتی رہتیں اور لوگ بھٹیوں کے سامنے بیٹھے حقہ پیا کرتے تھے وہاں سناٹا چھایا رہتا تھا (پریم چند۔ راہ نجات ص ۱۵)
قدیم زبان میں مفہوم ظاہر کرنے کے لیے بھی کہ کام ایک محدود عرصہ میں وقفہ وقفے کے ساتھ ہوتا رہا ایک خاص صیغہ تھا جو اب کم استعمال ہوتا ہے۔ جیسے
رات بھر گاڑی چلا کی (مرزا رسوا۔ امراؤ جان ادا ص ۲۸)
اس روز تمام دن مینہ برسا کیا (سرشار۔ سیر کہسار جلد دوم ص ۱)
ایک ہفتہ تک بس یہی کہا کی (سرشار۔ سیر کہسار۔ کامنی ص ۴۷)
آغا راستے بھر رویا کیے (سرشار۔ سیر کہسار۔ جلد دوم ص ۴۵۲)
مدت دکھانے والے لفظوں کا جملے میں ہونا ضروری نہیں۔ جیسے
حسن آرا اُس کو دیکھ کر حیران رہ گئی اور بار بار آئینہ کو ہاتھ میں اٹھا اٹھا غور سے دیکھا کی۔
(نذیر احمد۔ بنات النعش ص ۱۲)
محمودہ اور حسن آرا میں یہ باتیں بھی ہوا کیں اور کام بھی ہوتا رہا (نذیر احمد۔ بنات النعش ص ۱۲)
خدا جانے کیا کیا کہا اور ہم بھی چپ چاپ سنتے رہے۔ (سرشار۔ سیر کہسار جلد دوم ص ۱۵۱)

مستقبل کا موقوف صورت کا صیغہ

مستقبل کی موقوف صورت یہ ظاہر کرتی ہے کہ کام وقفے کے ساتھ ہوتا رہے گا۔ جیسے
دو گھڑی بات چیت کر لیا کریں گے (سرشار۔ فسانۂ آزاد جلد دوم ص ۱۴۶)
قمرن۔ اچھا۔ نہ چلیں۔ اس میں اصرار کیوں کرتی ہو یہیں بیٹھے مکھیاں مارا کریں گے۔
(سرشار۔ سیر کہسار، جلد دوم ص ۲۱۵)
محمودہ۔ بہت خوب میں آپ کو کوٹھے پر لے جا کر اس طرح چپکے سے پڑھا دیا کروں کہ کسی کو خبر بھی نہ ہو۔
(نذیر احمد۔ بنات النعش ص ۷۴)

آخر کچھ کھوگی بھی یا بڑبڑایا کروگی (سرشار - فسانۂ آزاد جلد دوم ص ۳۴)
کام کی کثرت یا کیفیت دکھانے کے لیے جملے میں مناسب الفاظ موجود ہو سکتے ہیں۔ جیسے
یہ کبھی یہاں آیا کریں گے مگر جو آپ کا حرج نہ ہو۔ (سرشار - کامنی ص ۲۹۴)
ہم لوگ اکثر کیا معنی روز آیا کریں گے (سرشار - کامنی ص ۴۴)
اور دونوں نے متفق ہو کر کہا کہ ہر مہینے میں نوچندی جمعرات کا میلا دیکھا کریں گے۔
(سرشار - کامنی ص ۴۲۵)

موقوف صورت

کام کا وقفے کے ساتھ ہونا

۱	۲	۳	۴
کام عمومیت یا عام صداقت کے تاثر کیا جاتا ہے	عادت	بظاہر مسلسل کام کے لیے	کام ایک خاص عرصے میں محدود ہو تاکہ جملے میں مناسب الفاظ موجود ہوتے ہیں
۱۔ وہ (اکثر کبھی کبھی) آیا کرتا ہے۔ ۲۔ دونوں اسی طرح باتیں کر رہے تھے جیسے عاشق و معشوق کیا کرتے ہیں۔	نہاتے وقت تم بہت دور تیر جایا کرتے ہو۔	۱۔ میں ہر وقت تجھے یاد کیا کرتا ہوں ۲۔ وہ ہر روز آیا کرتا ہے ۳۔ لکھنے پڑھنے سے جتنا وقت بچتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ کام کیا کرتی ہوں۔	۱۔ رات بھر کروٹیں بدلا کرتا ہوں

اُن کتابوں کی فہرست جن سے مثالیں لے کر اس مقالے میں پیش کی گئی ہیں۔

۱۔ مرزا رسوا۔ امراؤ جان ادا (ادارہ فروغ اردو۔ لاہور)
۲۔ سرشار۔ سیر کہسار (جلد اول، جلد دوم) مطبع نامی منشی نول کشور۔ لکھنو ۱۹۳۴ء
۳۔ سرشار۔ فسانۂ آزاد (جلد دوم) مطبع منشی تیج کمار۔ لکھنو ۱۹۵۲ء
۴۔ سرشار۔ کامنی۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنو
۵۔ نذیر احمد۔ بنات النعش۔ مطبع منشی نول کشور لکھنو
۶۔ پریم چند۔ گئودان۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ۔ دہلی ۱۹۵۰ء

۷۔ پریم چند ۔ پریم چالیسی، حصہ اول (سہاگ کا جنازہ، منتر، خانہ برباد، ترسول)
ادارہ فروغ اردو۔ دلی

۸۔ پریم چند ۔ پریم بتیسی (سر پر غرور، راجپوت کی بیٹی، بیٹی کا دھن، دھوکا، سوت
قربانی، دفتری) دارالاشاعت۔ لاہور ۱۹۴۳ء

۹۔ پریم چند ۔ میرے بہترین افسانے (راہ نجات) کتاب منزل۔ لاہور ۱۹۳۳ء

۱۰۔ ابوالکلام آزاد۔ غبار خاطر انارکلی کتاب گھر لاہور سنہ

۱۱۔ منٹو ۔ عصمت چغتائی۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ۔ بمبئی ۱۹۴۸ء

۱۲۔ عباس ۔ دیا جلے ساری رات (کچی کچی) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی ۱۹۵۹ء



صادق چوبک

رضیہ اکبر حسین

آخر بات کیا ہے؟

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

رضیہ بیگم جو "نظامی گنجوی" کی مصنفہ اور "صبا" کی مستقل قلمی معاون کی حیثیت سے کسی تعارف کی محتاج نہیں آج کل (دو سال کے لیے) تہران میں مقیم ہیں۔ رضیہ ویمنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں ریڈر ہیں اور انھیں ایرانی سفارت خانے کی جانب سے ڈاکٹریٹ کے لیے تہران یونیورسٹی نے فیلوشپ دیا ہے۔ ہم رضیہ بیگم کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے وطن سے دور رہ کر بھی ہمیں فراموش نہیں کیا اور تہران سے صادق چوبک کی یہ تمثیل ترجمہ کر کے "صبا" کے لیے روانہ کی ہے۔ (ادیب)

افرادِ ڈرامہ

میرزا محمد خاں۔ (دالکی)	وزیر مملکت	جناب	دالکی کی دوسری بیوی
ہستی خاں (سپہ سالار)	دالکی کا داماد	پوران اور پروانہ	پہلی بیوی سے دالکی کی لڑکیاں
فرادمیرا پچکی وزیرِ صنعت و حرفت	پوران کا شوہر	اسد اللہ خاں سوسو (کوتوال)	جناب کا بھائی
خسرو۔ قانون کا طالب علم	پہلی بیوی سے دالکی کا لڑکا	شنہ	ملازمہ
اکبرہ	خادم	حمزہ	سپاہی (پولیس مین)

مقام :۔ میرزا محمد خاں دالکی وزیر مملکت کا مکان۔ وقت دس بجے صبح

ایک بہت بڑا کمرہ جس میں اعلیٰ قسم کے کرمانی قالین کا فرش ہے جس کی دیواریں اور چھت ہلکے سبز رنگ کی ہے اور اس کے گرد سنہری حاشیہ ہے۔ کانچ کا ایک بہت بڑا جھاڑ برقی قمقموں کے ساتھ چھت کے درمیان آویزاں ہے۔ بائیں طرف دیوار

ں ایک کھڑکی ہے جو باغ کی طرف کھلتی ہے اس کے نیچے کمرے میں ایک میز ہے اس پر ریڈیو اور ٹیلیفون رکھا ہے دوسری طرف یوار میں بائیں جانب ایک دروازہ جو خوابگاہ میں کھلتا ہے اور دائیں طرف دوسرا دروازہ جو کھانے کے کمرے میں ملتا ہے دونوں دروازوں کے درمیان بخاری ہے جس کے تختہ پر ایک خوش رنگ کپڑا بچھا ہے اور اس پر ایک بہت ڑا آئینہ رکھا ہے اس کے مقابل کی دیوار میں ایک اور دروازہ ہے جو باہر کھلتا ہے۔ دروازوں پر ریشمی پردے ڑے ہیں۔ کمرے کے درمیان میں ایک گول میز اور کچھ کرسیاں پڑی ہیں اور بخاری کے قریب ایک پرانی وضع کی رام کرسی۔ باہر کے دروازے پر ایک بڑی سی تصویر لگی ہے۔

پردہ اٹھتا ہے تو دالکی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے نہایت پریشان آرام کرسی پر تنہا بیٹھا نظر آتا ہے ہ بار بار سر کو ایسے جنبش دے رہا ہے جیسے شدید دانت کے درد میں مبتلا ہے۔ وہ ایک ۵۰ سالہ کوتاہ قد مگر وجیہہ نسان ہے۔ سرخ و سفید بھرا بھرا چہرہ، گول مٹول سی ٹھوڑی، تخم کدو جیسی آنکھیں، عقاب جیسی ناک اور توند باہر کو کلی ہوئی۔ اونی ڈریسنگ گون پہن رکھا ہے اور گلے میں سرخ رنگ کا مفلر لپٹا ہے چند لمحہ بعد یکایک کرسی سے یوں اچھل کر ٹھتا ہے جیسے کسی نے ہزار سوئیاں چبھو دیں۔ خوفزدہ نظروں سے دروازے پر لگی تصویر کو دیکھتا ہے اور غیر معمولی پھرتی سے جو اس کی عمر کے لحاظ سے ناموزوں ہے دوڑ کر کھڑکی کا پردہ کھینچ دیتا ہے اور پھر اسی تیزی سے پلٹ کر دونوں ہاتھ سینہ پر باندھ مودب تصویر کے نیچے جا کھڑا ہوتا ہے۔

دالکی :۔ (تصویر کے نیچے دست بستہ) آپ کی مقدس خاک پا کے قربان! قسم خدائے برتر کی اس غلام خانہ زاد سے اب تک کوئی خطا، کوئی تقصیر نہیں ہوئی ہے۔ میری اولاد کے سر پر خاک اگر اس ۱۲ سال کے عرصہ میں ایک لمحہ کے لیے بھی چاکری اور غلامی سے منحرف ہوا ہوں۔ اس فقیر و ناچیز بندہ نے ہمیشہ حضور والا کی نیت و ارادہ کو اپنا مقصود بنایا ہے ور کبھی ذات مبارک کے احکام کی تعمیل میں کوتاہی نہیں کی۔ انبیا اور اولیا کی قسم دشت کربلا کے ۷۲ شہیدوں کی قسم اس بندۂ حقیر کو کسی ایسے کام میں جس سے وجود اقدس کو صدمہ پہنچے ذرا برابر بھی دخل نہیں دیا ہے۔ للہ اس غلام کی بیوی بچوں ر رحم فرمایئے۔

سرکار! (عاجزانہ) میرا سر حضور کے آگے خم ہے جو آپ فرمائیں اطاعت سے گریز نہیں۔

ہتاب اندر کے دروازے سے آتی ہے اور جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو چاروں طرف دیکھتی ہے۔ وہ ایک ۳۲ سالہ وش رنگ نازک اندام خاتون ہے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو اب بھی بہتوں کو شکار کر سکتی ہیں۔ نہایت حسین لباس پہنے ہے۔ بالوں اور چہرے کی آرائش میں بھی غیر معمولی نفاست برتی گئی ہے۔ دالکی جلدی سے ہاتھ نیچے چھوڑ دیتا ہے اور ہتاب کی طرف مڑ کر یاس بھرے لہجہ میں۔

دالکی :۔ کچھ پتہ چلا؟

ہتاب :۔ (گھبرائی ہوئی آواز میں) نہیں، نہ جانے کہاں جا کر مرا ہے۔ اپنے گھر میں بھی نہیں۔ اس کی بیوی

نا ہے کل رات سے گیا ہوا ہے کہ گل واسبہ سے بابا کے لیے دوا لانا ہے ۔ نہیں معلوم سچ کہ جھوٹ ۔
دالکی :۔ (اداس لہجہ میں) میں جانتا تھا آج نہیں کل یہ بدسوختہ ضرور کچھ گل کھلائے گا ۔ تم نے دیکھا نہیں کچھ
زسے کیسا ڈرا ڈرا سا گھبرایا ہوا تھا (بیچارگی سے ہاتھ جتاب کی طرف بڑھا کر) جان من جتاب اب کیا ہوگا ؟ تم ہی
و بتاؤ میں تو جیسے دیوانہ ہوا جا رہا ہوں ۔
جتاب :۔ میں کیا بتاؤں ، میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ پولیس کا آدمی اب تک دروازے پر کھڑا ہے ، بار بار سر اٹھا کر
غ میں دیکھتا ہے ، میں نے ننہ کو بھیجا کر جا کر پوچھے کچھ کام ہے تو خانم سے کہے تو کہنے لگا خانم سے کچھ مطلب نہیں اور پھر کئی بار
کو پوچھا ، سرکار گھر پر تو ہیں ۔۔۔ ابھی آرام فرما رہے ہیں کہ بیدار ہو چکے ؟
دالکی :۔ (کانپتی آواز میں) کل رات کب تک یہاں تھا ؟
جتاب :۔ شام تو میں نے خود دیکھا نہیں تھا ۔ اس کے بعد نہیں معلوم ۔ ننہ کہتی ہے دس بجے رات تک
ہی ادھر ہی تھا شاید رات بھر یہیں رہا ہو ۔
دالکی :۔ تم نے کل ہی رات کیوں نہ مجھے خبر کی کہ کچھ کرتا ۔
جتاب :۔ میں نے سوچا کیوں بلا وجہ تم کو پریشان کروں اور فرض کرو رات ہی تم سے کہتی تو کیا کرتے ۔
ہیں بھاگ نکلتے فرار ہو جاتے ؟
دالکی :۔ (وحشت زدہ) آہستہ بات کرو جان ! بھاگنے فرار ہونے کا کیا سوال ۔ میرا مطلب تھا اگر رات ہی
علوم ہوتا تو کچھ کرتا آخر ٹیلیفون بھی تو کوئی چیز ہے ۔
جتاب :۔ مجھے کیا پتہ تھا ، میں نے سمجھا سچ مچ اگر واسبہ سے کچھ کام ہوگا ، اپنے آپ چلا جائے گا ۔ مگر صبح سویرے دیکھو
ب بھی موجود ! آہ ! ایسی زندگی سے آدمی کا دل کتنا پریشان رہتا ہے ۔
دالکی :۔ (پست آواز میں) اب اور کون ہے یہاں ؟
جتاب :۔ (بے توجہی سے) کوئی نہیں ، ننہ ہے ، باورچی ہے دوپہر کے لیے پلو کباب بنا رہے ہیں ۔
دالکی :۔ کاش آج یہاں نہ آتے ہوتے ۔ کتنی بے عزتی کی بات ہے (سستی اور مظلومیت سے خود کو کرسی پر گرا دیتا ہے)
جتاب :۔ (قریب کی کرسی پر بیٹھ کر) خدایا ! اگر تم کو لے گئے تو میرا کیا ہوگا ؟ اور یہ بچے ! کتنا تم سے ہمیشہ کہا
احتیاط سے کام کرو ، مگر میری کون سنتا ہے ۔
دالکی :۔ قرآن پاک قسم ! اگر میرے دل میں ذرہ برابر بھی کبھی خیانت کا خیال آیا ہو ۔ تمہیں کیا پتہ میں ایک ایک
دستخط کتنی احتیاط سے کرتا ہوں ۔ آخر کون ایسا بد ذات حرام زادہ ہوگا جو اپنے آقا اپنے ولی نعمت کے ساتھ خیانت کا
خیال بھی دل میں لائے ۔
جتاب :۔ کیا پتہ ، کبھی ہم چاہتے نہیں مگر کوئی بات ہو جاتی ہے ۔ ذرا سوچو اس ہفتہ تم کہاں کہاں گئے ،

ن کے ساتھ رہے؟ کیا باتیں کیں؟

والکی :۔ (تھوڑی دیر سوچنے کے بعد) نہیں خدا گواہ ہے ہرگز مجھ سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی، لاکھ سوچتا ہوں کوئی بات نظر نہیں آتی، خدا میرے بچوں کو موت دے اگر کوئی برا کام کیا ہو، بالکل کسی نامناسب جگہ نہیں گیا، کوئی غلط بات نہیں کی۔

ہتاب :۔ (جیسے کچھ یاد دلاتے ہوئے) اس رات سفارت خانہ کے جشن میں تو کوئی ایسا ویسا آدمی ساتھ نہ تھا۔ وہاں سے لوٹے تو تم خاصے مدہوش تھے میرا مطلب ہے کہ معلوم نشہ کی حالت میں کوئی بات منہ سے نکل گئی ہو۔

والکی :۔ (وحشت سے آنکھیں پھاڑ کر) کیا کہہ رہی ہو؟ نہیں مجھے خوب یاد ہے ہرگز میرے ساتھ کوئی غلط آدمی نہ تھا میں نے کوئی بات نہیں کی مسلسل ملک کی روز افزوں ترقی کی ہی باتیں کرتا رہا (دفعتاً بات پلٹ کر) مطلب یہ ہے کہ ہماری مملکت میں کوئی برائی وجود ہی نہیں رکھتی کہ آدمی اس کا ذکر کرے۔ کیا تم سمجھتی ہو آج تمام روئے زمین پر کوئی ایسی سرزمین ہے جو فراوانی دولت، نعمت، امن وامان اور حسن رخوں میں ایران جیسی ہو، یورپ میں سوائے ریلوے لائن، پختہ سڑکوں سر بہ فلک عمارتوں اور مشینوں کے اور کیا رکھا ہے۔ جانتی ہو یورپی ملکوں کے گوشہ گوشہ میں چور، ڈاکو اور مردم خوار چھپے بیٹھے ہیں (قصیدہ خوانی کے انداز میں) چشم بد دور ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ اپنے عظیم المرتبت قائد کے زیر سایہ ہم کو کیا کچھ حاصل نہیں۔ اندھا ہے وہ جو یہ سب نہیں دیکھتا۔

ہتاب :۔ مثلاً دیکھو اس قسم کی باتیں، چاہے تو آدمی ان کو اور بھی معنی دے سکتا ہے۔ کیا نہیں؟ اس لیے تو کہتے ہیں عاقل ایسا کام ہی کیوں کرے کہ بعد میں پشیمانی اٹھائے۔

والکی :۔ (نادم ہو کر خوشامد سے) جان من! یہ تو میں تمھارے سامنے کہہ رہا ہوں۔ باہر جاتا ہوں تو گھر لوٹنے تک کسی سے دس حرف بھی نہیں کہتا ــــ اور فرصت کسے کہ فضول باتوں میں وقت گنوائے۔

ہتاب :۔ میں سمجھتی ہوں مگر آدمی اپنے ہوش میں نہ ہو تو بات زبان سے نکل ہی جاتی ہے، اچھا برا اس وقت کہاں سوجھتا ہے۔

والکی :۔ (دفعتاً جیسے کوئی انکشاف ہو، پُر معنی انداز سے ہتاب کی طرف دیکھ کر پیار سے) ہتاب جان! تجھ سے ایک بات پوچھوں، تو جانتی ہے میں تجھے کتنا پیار کرتا ہوں۔ یہ روپیہ پیسہ جائیداد سب تیرا ہے تم ہی نے تو میرا گھر روشن کیا ہے میں نے خسرو کی اس نحوس ماں کو تیری ہی خاطر طلاق دی ــــ شاید مجھے آج ہی لے جائیں ــــ ہو سکتا ہے مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو مگر قرآن پاک کی قسم مجھے پتہ نہیں کیا؟ تیرے سر کی قسم مجھے نہیں معلوم ــ تو تجھ سے ایک بات پوچھتا ہوں ــ تمھیں کچھ پتہ ہے؟ مطلب یہ کہ شاید تم کو کچھ معلوم ہو اور تم مجھ سے کہنا نہ چاہتی ہو۔ مگر دیکھو میری جان! میں تمھارا شوہر ہوں، مجھ سے چھپاؤ مت۔

ہتاب :۔ (تلخ و اداس لہجہ میں) مجھے؟ کیا معلوم ہو سکتا ہے؟ میں بھلا کیا جان سکتی ہوں؟ اوہ تو تم کو مجھ پر شک ہے!

دالکی :۔ (گھبرا کر) نہیں میری جان! مگر تم ہی نے کہا تھا کہ اُس رات جب میں جشن سے لوٹا تو ـــــ تو شاید اس وقت تم نے کوئی ایسی بات سنی ہو، یا نیند میں کچھ بڑبڑایا ہو یہی پوچھتا تھا۔

ہتاب :۔ (رنج و غصے سے) فرض کیا تم نے کچھ کہا بھی ہو تو کیا میں کسی سے کہنے جاؤں گی۔ جواب ہو تو خدا مجھ نمک حرام کو ابھی موت دے۔ یہ ہے صلہ خدمت کا۔

دالکی :۔ تم ناحق خفا ہوتی ہو، میں نے کیا کہا، یہی نا کہ ہو سکتا ہے بے خیالی میں کوئی بات میری زبان سے نکل گئی ہو اور تم کو پتہ ہے دیوار ہم گوش دارد وہی پوچھتا تھا۔

ہتاب :۔ (طنزاً) آفریں! قربان جاؤں اس لب و دہن کے۔ یہی میرے پیار کا صلہ ہے۔ چھ سال سے میں تمہارے ساتھ ہوں، ہر بُرے بھلے میں تمہارا ساتھ دیا، دو بچوں کا بار اٹھایا اور اب مجھ سے ایسی بات کرتے ہو۔ جب تم وزیر نہ تھے تب ہی اچھے تھے اس وقت کم از کم تمہارے سینہ میں دل تو تھا اب تو کبھی لطف و مہربانی کا ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے نہیں نکلتا۔ اور تم ہی سوچو مجھے تمہارے معاملات سے سروکار ہی کیا ہے ہر بات تو تم مجھ سے ایسے چھپاتے ہو جیسے میں تمہاری دشمن ہوں۔ سارے سرکاری کاغذات مجھ سے پوشیدہ رکھتے ہو۔ چھ سال سے تمہاری رفیق حیات ہوں آج تک ایک جملہ تمہاری زبان سے ایسا نہ سنا کہ کچھ سمجھ سکوں، اپنی یادداشت کی نوٹ بک تک تو میرے ڈر سے جیب میں نہیں رکھتے کبھی کچھ لکھنے بھی ہو تو سگریٹ کی ڈبیا پر عجیب پُراسرار لفظوں میں تو تم ہی کہو میں کسی سے کہوں گی بھی کیا ـــــ میرے بچوں کے سر کی خاک اگر میں نے کبھی زبان سے ایک حرف بھی نکالا ہو (دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر روتی ہے)

دالکی :۔ (گھبرا کر دھیمی آواز میں) ڈارلنگ! میں نے یہ کب کہا کہ تم دوسروں سے میری باتیں کہتی ہو۔ بھلا کسی کی اپنی بیوی ایسا کر سکتی ہے! میرا مطلب تھا اسد اللہ خاں یہاں آتے ہیں یا تم ان کے پاس جاتی ہو تو شاید باتوں باتوں میں کبھی کچھ ذکر نکل آیا ہو ـــــ ہو سکتا ہے نا؟ اسد اللہ خاں اچھے آدمی ہیں اور تم تو جانتی ہو میں نے ان کی کتنی مدد کی۔ پھر بھی زمانہ نازک ہے آدمی کو احتیاط کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دینا چاہیے خواہ وہ اپنے بھائی سے ہی کیوں نہ بات کر رہا ہو۔

ہتاب :۔ (دفعتاً غصہ ہو کر) آخر مثلاً کیا؟ صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم کو مجھ پر شک ہے۔ تو گویا تم مجھے جاسوس سمجھتے ہو، اور اپنے اُس خسرو کو کچھ نہیں کہتے۔ جانے کیسی کیسی کتابیں پڑھتا رہتا ہے اور نہ جانے کیسے کیسے نامناسب لوگوں سے ملتا ہے میں کچھ نہیں کہتی مگر ابھی چند روز پہلے فرہاد میرزا کہہ رہے تھے، خسرو خاں بہت بداحتیاطی کرتے ہیں۔

دالکی :۔ (پریشان ہو کر) کیا کہتے تھے فرہاد میرزا، خسرو کیا کرتا ہے۔ کہاں ہے وہ خسرو کا بچہ ـــــ

ہتاب :۔ مجھے کیا خبر۔ کیا مجھ سے کہہ کر جاتا ہے وہ کہیں۔ صبح سویرے اٹھا الٹا سیدھا لباس پہنا اور چل دیا اس سے بات ہی کون کر سکتا ہے۔ آخر دوسرے کی اولاد ہے کوئی اپنی جان فدا کر دے تو بھی کچھ نہیں۔ کوئی اتنا کہنے والا نہیں کہ بابا کیا اتنی فیس ان ہی فضول کتابوں کے لیے بھری ہے۔

دالکی :۔ کیسی کتابیں؟ کیا کہہ رہی ہو تم۔

مہتاب :۔ (طنزاً) میں نے کہا نا، مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ جو میں نے کہا تھا وہ بھی تمہاری لڑکی پودان سے کہہ رہا تھا میں نے بھی بات سن لی۔ خود سے جاکر تو پوچھا نہیں۔ کہتا تھا خسرو خاں روسی پڑھتے ہیں۔ نہیں معلوم ان کو کہاں سے پتہ لگا۔ سچ کہ جھوٹ میں کیا جانوں۔

دالکی ۔ (ملتجی لہجہ میں) تم کو قسم خدائے پاک کی مہتاب! خسرو پر رحم کرو، مجھ سے ایسی بات نہ کہو اگر مجھے معلوم ہو جائے خسرو روسی پڑھتا ہے تو اپنے ہاتھوں سے اس کی دونوں آنکھیں نکال لوں (دفعتاً موضوع بدل کر) آج دوپہر کے کھانے پر فرہاد میرزا بھی آرہے ہیں نا؟

مہتاب (دل گرفتہ: تعریف تھکائے) ہاں۔

دالکی ۔ اور کون؟

مہتاب ۔ کیا پتہ، شاید وہی جو ہمیشہ آتے ہیں

دالکی ۔ ([illegible]) دیکھو جان من! تم پھر بدمزاجی کر رہی ہو ــ خدا کے لیے ــ چلا جاؤں گا تب میری قدر ہوگی (آہ بھر کر) جانے کیا ہونے والا ہے۔

مہتاب ۔ (جیسے چونک کر) اچھا اچھا بس رہنے دو ایسی باتیں نہ کرو۔ بھلا پولیس کے آدمی کو تم سے کیا کام ہو سکتا ہے! شاید سچ ہی کہتا ہو اکبرہ سے کام ہے میری سمجھ میں نہیں آتا یہ خیال تمہارے ذہن میں سما گیا ہے۔

دالکی ۔ مجھ سے نہیں تو اور کس سے کام ہو سکتا ہے خود تم نے نہیں کہا تھا کہ [illegible] میرے بارے میں پوچھتا تھا تم ہی بتاؤ ایک سپاہی کل [illegible] سے اب تک [illegible] گھر پر پہرہ دے رہا ہو تو اس کا مطلب کیا؟ کس کتے میں اتنی ہمت ہو سکتی ہے کہ اپنے آپ ایسا کام کرے ضرور اس کو حکم دیا گیا ہے کہ میری نگرانی کرے سمجھیں؟ (حواس باختہ) وائے نصیب!

مہتاب :۔ (تعجب سے) کیا مطلب؟ کیا بلدیہ تمہارے تحت نہیں؟

دالکی ۔ ہے کیوں نہیں مگر ــــ

مہتاب :۔ مگر کیا، تمہارے حکم کے بغیر ــ

دالکی ۔ (بات کاٹ کر) کیوں نہیں۔ یہاں سب کچھ ممکن ہے۔

مہتاب ۔ تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔ بلدیہ وزارت ملکت کے تحت ہے تو ابھی صدر بلدیہ کو فون کر کے پوچھ کیوں نہیں لیتے کہ معاملہ کیا ہے؟

دالکی ۔ (گھبرا کر) بابا کیسی تم بچوں کی سی باتیں کرتی ہو (منہ مہتاب کے قریب لاکر) میں اب تم کو کیسے بتاؤں۔ مانا کہ تم میری بیوی ہو، چھ سال سے میری ہمدم ہو مگر افسوس کہ میں اپنا دل تمہارے سامنے بھی نہیں کھول سکتا۔ (دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ کر) آدمی خود اپنی بیوی سے بھی بات نہیں کر سکتا ــ وائے بر من و تو!

مہتاب ۔ (متفکر ہو کر) آخر بات کیا ہے؟ کہتے کیوں نہیں مجھ سے کہنے میں کیا برائی ہے۔ خدا پرویز کو موت دے اگر میں

کسی سے کہوں۔ تم اتنے بدگمان کیوں ہو؟ ہمیشہ مجھ سے بات چھپاتے ہو۔

دالکی:۔ بدگمانی کی بات نہیں میری جان! مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے مگر کہنے سے فائدہ کیا (بات کا رخ پھیر کر) ا
تم نے بتایا نہیں آج لنچ پر کون کون آرہا ہے؟

جتاب:۔ (بے دلی سے) کہا تو سپالار، پروانہ، فرہاد، پوران بس یہی ہیں جو ہمیشہ آتے ہیں اور تمہارے سالے اسلا
اور ان کی بیگم، ممکن ہے خسرو خانم بھی ہوں۔

دالکی:۔ یہ اچھا ہے کہ سب ہی اپنے عزیز قریب ہیں پھر بھی کتنی شرم و رسوائی کی بات ہے۔

جتاب:۔ میں کہتی ہوں تم صدر بلدیہ کو فون کرنا نہیں چاہتے تو مستی خان سے ہی پوچھو شاید انھیں کچھ پتہ ہو وہ کچھ بتا سکیں

دالکی:۔ کوئی فائدہ نہیں، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر انھیں کچھ معلوم ہے تو یہ اور بھی برا ہے۔

جتاب:۔ آدمی کو اتنا بھی بدظن نہ ہونا چاہئے آخر وہ تمہاری پروانہ کے شوہر ہیں ان کو فون کر کے پوچھنے میں نقصا
کیا ہے ___!

دالکی:۔ (بادل نخواستہ) اچھی بات ہے۔ ہر چہ بادا باد، تمہاری مرضی (اٹھ کر ٹیلیفون ملاتا ہے مگر گھبراہٹ میں غلط
نمبر مل جاتا ہے) معاف کیجئے گا خانم (ٹیلیفون رکھ کر عاجزانہ جتاب سے) جتاب تم ہی آکر ذرا نمبر ملانا میرا تو سارا جسم کانپ
رہا ہے جانے کیا ہونے والا ہے۔

جتاب:۔ (ٹیلیفون ملا کر) ہلو! الحمد للہ، تم ہو؟ تیمسار گھر پر ہیں؟ کہنا خود ان سے بات کرنی ہے (ٹیلیفون دالکی کو
دے دیتی ہے)

دالکی:۔ (فون پر) ہلو! کون ہستی؟ تم ہی ہو نا؟ تم خود بات کر رہے ہو؟ ایں! قربان! سلام، (زبردستی ہنسو
نہیں کوئی بات نہیں یوں ہی بس ابھی آجاؤ، نہیں ابھی کوئی اور نہیں آیا ہے۔ ایک چھوٹا سا کام ہے ___ کیا ہوا..
یہیں بتا لینا آکر۔ پروانہ او۔ بچے بعد میں آجائیں گے، تم آجاؤ۔ قربان (ٹیلیفون رکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتا ہے)

جتاب:۔ (جھلا کر) فون پر ہی پوچھا کیوں نہیں ان سے؟

دالکی:۔ جانِ من! بھلا ٹیلیفون پر کوئی ایسی بات پوچھتا ہے اب وہ خود ہی یہاں آتے ہوں گے (بے حال ہو
کرسی پر گر پڑتا ہے)

جتاب:۔ (سامنے آکر) تمہاری باتیں میری تو سمجھ میں آتی نہیں۔

دالکی:۔ ضرور ان کے کان میں کچھ بھنک پڑ گئی ہے پوچھتے تھے کوئی واقعہ ہوگیا؟ ضرور ان کو کچھ پتہ ہے،

جتاب:۔ تم اتنا اصرار کر رہے تھے کہ فوراً چلے آؤ اسی لیے پوچھا ہوگا کیا بات ہے، مگر تم کو تو ہر بات میں وہم
عادت پڑ گئی ہے (بیزاری سے بیٹھ جاتی ہے)

دالکی:۔ (تھکی آواز میں) ہو سکتا ہے (دفعتاً چونک کر) تم نے خود بھی دیکھا اس کو؟

مہتاب :۔ کیسے ؟ پولیس مین کو، ہاں ننھ نے کہا وہ اب تک وہیں ہے تو میں باغ میں گئی اور کواج کے ایک بڑے درخت کے پیچھے چھپ کر دیکھا وہ مسلسل گیٹ کے سامنے ٹہل رہا تھا اور بار بار گردن اٹھا کر باغ میں دیکھتا تھا. جانے کیا چاہتا ہے ؟

دالکی :۔ (دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر) خدایا تیری پناہ ! میرے بچوں پر رحم فرما !

مہتاب :۔ مگر میں کہتی ہوں تم ناحق اتنے پریشان ہو رہے ہو، خدا بزرگ و رحیم ہے، بے گناہ کا سر کبھی دار پہ نہیں چڑھتا، سچ کا ہمیشہ بول بالا ہوتا ہے، تم نے کسی کو آزار نہیں پہنچایا تو پھر ڈر کس بات کا۔

دالکی :۔ (ایک دم جوش میں آ کر) جھوٹ ہے سب جھوٹ ہے، یہ سب احمقوں کا دل خوش کرنے کی باتیں ہیں. نہ جانے اب تک کتنے بے گناہ دار پر چڑھ چکے ہیں. خود میں نے کتنوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مگر افسوس کہ نہیں سکتا۔ آدمی کو بات کرنے کی آزادی نہ ہو تو زبان سے فائدہ ۔ انسان اور حیوان میں فرق ہی کیا رہا. گدھا بھی زبان رکھتا ہے مگر نطق سے محروم ہے۔ لعنت ایسی زندگی پر کبھی ایک لمحہ سکون کا نصیب نہ ہوا.

مہتاب :۔ دیکھو یہی تو بری عادت ہے تم میں یکایک جوش میں آ جاتے ہو۔ کیا پتہ کبھی کچھ ایسی ہی باتیں کر بیٹھے ہو اچھی خاصی تو زندگی ہے ناحق اس پر لعنت بھیجتے ہو.

دالکی :۔ (سنبھل کر) سچ کہتی ہو. اچھی خاصی زندگی ہے ۔ لیکن کیا کروں اس خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ میں نہ رہا تو تمھاری خبر گیری کون کرے گا ؟ خسرو کو اپنے کام سے فرصت نہیں، تم خود کچھ کر نہیں سکتیں (پھر جوش میں آ کر) اور ان بھیڑیوں کے بیچ میرے معصوم بچوں کا کیا ہوگا ؟

مہتاب :۔ کیا کہتے ہو ؟ کون بھیڑیے ؟

دالکی :۔ یہی سب، جو اپنی آسائشوں کے لیے نہ جانے کتنوں کا خون کرتے ہیں، تم سمجھتی ہو یہ زر و جواہر سب یوں ہی مل جاتے ہیں ؟ یہ ریشمی پردے یہ قیمتی ساز و سامان۔ یہ ابریشم جو ہمارے زیب تن ہے جانے کتنوں نے پتہ پانی کر کے بنا ہوگا اور ہم ——— (دفعتاً جیسے کچھ یاد آ گیا) اوہ ! وہ جواہر تو تم نے بینک میں رکھوا دیئے نا ؟ تلاشی ہو تو کوئی ایسی ویسی چیز نہ نکل آئے !

مہتاب :۔ وہ تو تم نے تب ہی رکھوا دیئے تھے.

دالکی :۔ (مطمئن ہو کر) دیکھو وہ تمھاری لڑکی کا جہیز ہے۔ انھیں ہاتھ نہ لگانا زمانہ کا کیا اعتبار (آواز میں رقت آ جاتی ہے) انھیں میری یادگار سمجھنا (یکایک کرسی پر سیدھا ہو بیٹھتا ہے) اوہ ! کہیں اس مناقصہ والی بات نہ ہو ؟

مہتاب :۔ کون سا مناقصہ ؟

دالکی :۔ (اپنے آپ سے) وہی وہی مناقصہ۔

مہتاب :۔ آخر کچھ کہو تو سہی، کہتی نہ تھی ضرور کچھ بات ہوگی۔

دالکی :۔ (جیسے خواب میں بول رہا ہو) مگر اسے تو اتنا زمانہ گزر گیا اور پھر میرے حصہ میں تو بہت کم آیا تھا ۔۔۔ اور میں ہی بدنصیب دلال مظلوم بنا۔ مصیبت ٹوٹی تو مجھ غریب پر!

حتاب :۔ تو یہ بات ہے ۔ میں پہلے ہی ۔۔۔ باہر قدموں کی آواز سن کر دونوں چپ ہو جاتے ہیں، سپہ سالار مستی خاں فرعونی انداز میں سر اونچا کیے داخل ہوتا ہے۔ میاں بیوی کی وحشت زدہ صورتیں دیکھ کر حیران ہوتا ہے مگر اپنے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیتا۔ دالکی جلدی سے کھڑا ہو جاتا ہے سپہ سالار آگے بڑھ کر ایک ہاتھ دالکی کی طرف اور دوسرا حتاب کی طرف بڑھا کر۔)

مستی :۔ سلام محمد، اچھے تو ہو؟ اور تم حتاب کیا حال ہے؟ بچے تو اچھے ہیں؟

حتاب :۔ کیا پوچھتے ہو حال احوال ۔۔۔ میاں ۔

دالکی :۔ (حتاب کی بات کاٹ کر) الحمدللہ، سب ٹھیک ہے، تمہارے بچے تو اچھے ہیں؟ پروانہ کیسی ہے؟ بیٹھو۔

مستی خاں :۔ بیٹھتے ہوئے حتاب کی طرف اشارہ کر کے) بھئی محمد تمہاری حتاب تو روز بروز کھلتی جا رہی ہے۔ خدا کی قسم بالکل کاشی ۔ قالیچہ کے مانند کہ جتنا اس پر چلو رنگ اور نکھرتا جاتا ہے۔

حتاب :۔ (خوش ہو کر ناز سے) کیوں مذاق کرتے ہو، تمہاری پروانہ کیا کم ہے! مگر تم مرد لوگ! نظریں ہمیشہ دوسروں پر ہی ڈالتے ہو۔

مستی خاں :۔ ہنس کر خوش مزاجی سے) کسی کا حسن ہی ایسا مائل ہو تو کوئی کیا کرے، کیوں محمد ٹھیک کہتا ہوں؟

دالکی :۔ (زبردستی مسکرا کر حتاب کو اشارہ کرتے ہوئے (حتاب، ان کو کچھ کھلاؤ پلاؤ گی نہیں، کچھ پھل، مٹھائی، نہیں تازہ چائے ہی بنوا لو کر ان کے طفیل ہم کو بھی مل جائے گی (حتاب سمجھ جاتی ہے اور با دل ناخواستہ اٹھ کر جاتی ہے)

مستی خاں :۔ (حتاب کو آواز دے کر) خانم! ذرا اپنے خانساماں کو یہ ہدایت بھی کرتی آنا کہ ہمیشہ کی طرح چلو کباب پہلے سے نکال کر میز پر نہ رکھ دے کہ جب تک آدمی کھانے بیٹھے کباب تو سفید چمڑا بن جائیں اور چاول یخ (حتاب کے جانے کے بعد دالکی سے مخاطب ہو کر) کہئے کیا کام ہے؟

دالکی :۔ (مایوسانہ) لگتا ہے میرا کام تمام ہو گیا۔

مستی خاں :۔ (حیرت سے) یعنی کیا؟

دالکی :۔ پتہ نہیں مگر کل شام میرے گھر پر سپاہی کو متعین کر دیا گیا ہے۔ اب تک کئی بار میرے بارے میں پوچھ چکا ہے اگرچہ بظاہر کہتا ہے اکبرہ سے کام ہے۔

مستی خاں :۔ تو اکبرہ نے جا کر پوچھا نہیں کیا کام ہے؟

دالکی :۔ وہ ہے کہاں وہ بھی تو کل رات سے چھٹی لے کر غائب ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے اسے خاص طور سے یہاں سے نکالا گیا ہے ورنہ وہ پہلے کبھی چھٹی لے کر نہیں گیا۔

مستی خاں :۔ (تعجب سے) آخر بات کیا ہے۔ اگر خدانخواستہ تم سے کچھ مطلب ہے تو تمھارے نوکر کو غائب کرنے کی ضرورت؟

دالکی :۔ (اپنے اوپر لعنت بھیج کر) میرے تو حواس ٹھکانے نہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا؟ اور راکبرہ بی کا کیا بھروسہ؟

مستی خاں :۔ میں سمجھا نہیں، آخر بات کیا ہے؟

دالکی :۔ واللہ مجھے خود نہیں معلوم۔

مستی خاں :۔ پھر بھی کوئی بات تو ہوگی۔

دالکی :۔ میں تو سوچ سوچ کر تھک گیا کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔

مستی خاں :۔ مگر بلا وجہ تو کچھ نہیں ہوتا کوئی وجہ ہوگی ضرور۔

دالکی :۔ تمھاری جان کی قسم، مجھے پتہ نہیں، تم خود جانتے ہو میں کتنی احتیاط برتتا ہوں، مجھ سے کیا خطا ہو سکتی ہے۔

مستی خاں :۔ جلدی نہ کرو خوب سوچو شاید کچھ یاد آجائے کوئی سبب ہوگا تب ہی تو۔ . . . .

دالکی :۔ (آہ بھر کر) داریوش اعظم کی قسم ہرگز کوئی بات نہیں ـــــ مستی واقعی تم نے کچھ نہیں سنا۔

مستی خاں :۔ (گھبرا کر) میں نے؟ نہیں تو میں نے کچھ نہیں سنا ـــ آپ خود ہی سوچیں شاید کبھی کسی کو کچھ لکھا ہو۔

دالکی :۔ برسوں سے میں نے کسی کو ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

مستی خاں :۔ شاید گھر میں کبھی کچھ۔ میرا مطلب ہے زبان سے کچھ نکل گیا ہو۔

دالکی :۔ (یقین کے ساتھ) ہرگز نہیں۔

مستی خاں :۔ (ناصحانہ انداز میں) دیکھئے محمد خاں میرا مطلب ہے ـــ آپ نے جان کر تو کچھ نہیں کیا ہوگا مگر بے خیالی میں شاید کبھی کچھ۔ . . کیوں کہ آپ خود جانتے ہیں بے خطا کسی کی توقیف کا حکم جاری نہیں ہوتا۔ اور سنو جیسے شاید کچھ یاد آجائے

دالکی :۔ ہر طرح سوچ چکا مجھے تو کچھ یاد آتا نہیں۔

مستی خاں :۔ (فکر مند ہو کر) پولیس کے آدمی کو گیٹ پر میں نے بھی دیکھا، اس نے مجھے تعظیم دی۔ مجھے کیا پتہ تھا یہ معاملہ ہے (کچھ سوچ کر) آپ رئیس بلدیہ کو فون کر کے کیوں نہیں پوچھتے۔ وہ آپ کے دوست بھی ہیں اور رشتہ دار بھی۔

دالکی :۔ (گھبرا کر) نہیں نہیں فون کرنا ٹھیک نہیں۔ . . . مشکل تو یہ ہے کہ میں خود گھر سے باہر نہیں جا سکتا (تھوڑا رک کر) اگر تم تکلیف کر کے چلے جاؤ اور میری طرف سے۔

مستی خاں :۔ (بات کاٹ کر) استغفر اللہ، آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ اس سے کیا ہوگا؟ الٹا میں بھی پھنس جاؤں گا میں اس معاملہ سے جتنا دور رہوں اتنا ہی اچھا ہے میرے لیے بھی اور آپ کے لیے بھی (جانے کے ارادے سے اٹھتا ہے)

دالکی :۔ ارے تم جا رہے ہو ـ تم سے کسی کو مطلب نہیں۔ خدا کے لیے مجھے ایسے وقت میں تنہا نہ چھوڑو، رسول پاک کی قسم میری بالکل خطا نہیں، ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

ہستی خاں ۔ آپ اس فدوی کے ارادوں سے تو واقف ہیں لیکن دراصل آج میرا مزاج بہت ناساز ہے۔ یہ
ت گھٹیا سمجھا مجھیں چھوڑ تی میں تو فون پر ہی معذرت کرنا چاہتا تھا مگر آپ نے حاضر ہونے کا حکم دیا تو کیسے ٹالتا۔ خدا
یا تو جیسا آپ کہتے ہیں کوئی بات نہ ہوگی، آپ اتنے نیک اور محتاط آدمی ہیں۔

دالکی ۔ (لاچاری سے) اگر ممکن ہو تو پروانہ کو جلدی بھیج دو جانے پھر اسے دیکھ سکوں یا نہ دیکھ سکوں۔

ہستی خاں ۔ آپ کی پروانہ، آپ تو جانتے ہیں کتنی حساس ہے۔ ذرا سی بات پر تو اس کا دل دہل جاتا ہے، ایسے میں تو بہتر ہوگا اسے کچھ پتہ نہ چلے۔ بعد میں دھیرے سے اسے سمجھا دوں گا۔ آپ بھی فکر نہ کریں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دالکی ۔ ڈرتا ہوں ملاقات بھی ممنوع کر دی جائے اور پھر میں اپنے بچوں کو بھی نہ دیکھ سکوں۔

ہستی خاں ۔ خدا نہ کرے، آپ ایسی بات سوچتے ہی کیوں ہیں، خدا پر بھروسہ رکھیں بندہ کو کیا اختیار رہے اب اجازت دیجئے جا کر پروانہ اور بچوں کو روک دوں کہ آج آپ کو زحمت نہ دیں (دالکی سے ہاتھ ملا کر جانے لیے مڑتا ہے)

دالکی ۔ (فریاد کے انداز میں) ہستی خاں! تم کو اور بچوں کو خدا کے حوالے کیا۔ ان پر مہربان رہنا۔

ہستی خاں ۔ (پلٹ کر) اطمینان رکھیے خدمت میں کوتاہی نہ ہوگی لیکن ایک استدعا ہے پرسش کے دوران میں بھولے سے بھی اس بندہ کا نام آپ نہ لیں۔ اس ملاقات کا بھی ذکر نہ آئے تو بہتر ہوگا (مہتاب میوے کی تھالی لیے آتی ہے اور ہستی خاں کو جاتا دیکھ کر)

مہتاب ۔ کہاں چلے ہستی خاں؟

ہستی خاں ۔ معاف کرنا مہتاب خانم! مزاج ٹھیک نہیں۔ انشاء اللہ جلد کبھی پھر کسی دن فرصت سے آکر ملوں گا۔ خدا حافظ (جاتا ہے)

مہتاب ۔ (پریشان ہو کر) کیوں چلے گئے؟

دالکی ۔ (غصہ سے دانت پیس کر) بے ایمان! نمک حرام! بھاگ گیا کتے کی طرح ڈر کر۔ میں نے ہی اس کا نصیب بنایا، عہدہ دلایا، سب بھول گیا۔ غدار کتا۔

مہتاب ۔ (پھلوں کی تھالی میز پر رکھ کر بے بسی سے بیٹھ جاتی ہے) سب کو اپنی پڑی ہے۔ مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔

دالکی ۔ (بیچارگی سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے) میں نے تم سے کہا نہیں کبھی ان پر بھروسہ نہ کرنا۔ سب کا یہی حال ہے؟ مگر یہ ہستی کا بچہ اتنا طوطا چشم نکلے گا میں نہیں سمجھا تھا۔

مہتاب ۔ اب اپنا دل کیوں دکھاتے ہو۔ خدا خود سمجھ لے گا ان سے۔ تم نے تو کبھی کسی کی برائی نہیں کی۔

دالکی ۔ (بے اختیار ہو کر) سچ کہتی ہو مہتاب! جان من! مگر آدمی چاہتا ہے کبھی تو اپنا درد دل کسی سے کہے۔

مگر یہاں تو حسن کو دیکھو ایک دوسرے سے خار کھائے بیٹھا ہے میں اپنی ذہانت اور کوشش سے کلرک سے وزارت عہدے تک پہنچا۔ کسی سے کہتا نہیں مگر جہاں تک ممکن ہوا اپنے عزیزوں، دوستوں اور ہم قوموں کی ہمیشہ مدد کی۔ د کا حق دار کرایا کا کام بنایا۔ اب اسی ہستی کو دیکھو کیا کچھ نہیں کیا میں نے اس کے لیے اور اب وقت پڑے کیسے آنکھیں پھیر ہرگز آئندہ کبھی تم اس پر اعتماد نہ کرنا ۔ تم نہیں جانتیں وہ ان لوگوں میں سے ہے جو ایک رومال کی خاطر ایک محل میں آگ لگا سکتے ہیں اور دیکھنا اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو کہ ہمارے پاس یاقوت یمنی ہیں کبھی ذکر آجائے تو کہہ دینا وہ کب کے فروخت کر دیئے۔

باہر سے کچھ آوازیں ــــ فرہاد، پوران اور اسد اللہ سوسو کوتوال شہر داخل ہوتے ہیں۔ پوران ایک ۱۹ سالہ لڑکی ہے بڑی بڑی بے غرور روئے پروا آنکھیں، کھلتا ہوا رنگ ــ اور ڈیل ڈول میں فرہاد سے کتنی گنا زیادہ، فرہاد ایک نحیف ولاغر ۴۰ سالہ مرد ہے، آنکھوں میں سنہری کمانی کی عینک چڑھی ہے جس کے نیچے سے وہ ہر وقت مشکوک و مشتبہ نظر سے دیکھتا ہے۔ ان لوگوں میں سے ہے جو سانس بھی لیتے ہیں تو سوچ کر۔ کوتوال شہر پتلی گردن کا عجیب سا بے ہنگم انسان اور چہرے سے بالکل احمق لگتا ہے۔ سب دروازے پر رک کر تعظیم دیتے ہیں پھر پوران بڑھ کر باپ سے بغل گیر ہو اور بے اختیار رونا شروع کر دیتی ہے فرہاد ساکت و صامت ایک طرف کھڑا رہتا ہے۔

پوران:۔ (روتے ہوئے) ہائے اللہ یہ کیسی رسوائی ہم پر نازل ہوئی، اب ہم لوگوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ آخر آپ نے کیا کیا؟

دالکی:۔ (بیٹی کی پیشانی چوم کر) میری جان! رونے کی کوئی بات نہیں، خدا کے لیے چپ ہو جاؤ (اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے فرہاد میرزا سے تعجب کے لہجہ میں) تم لوگوں کو کیسے پتہ چلا؟

فرہاد:۔ (کوتوال کی طرف اشارہ کر کے) ہم کو تو کچھ پتہ نہیں تھا ابھی جناب کوتوال نے بتایا۔

دالکی:۔ (اسد اللہ کی طرف مڑ کر) آپ کو کس سے معلوم ہوا؟

کوتوال:۔ (مودبانہ) آپ کے قربان سرکار، جناب تیمساد نے مجھ سے فرمایا اور یہاں آکر میں نے ادارۂ سیاسی کے سپاہی حمزہ کو دروازے پر کھڑا دیکھا۔

دالکی:۔ تو کیا یقین ہے وہ ادارۂ سیاسی کا آدمی ہے؟ (آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر) خدا اب تو ہی فرما (پوران پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہے اور اس کے ساتھ جناب بھی۔ کوتوال اسی طرح مودب زمین پر گڑا ہوا سے کھڑا رہا ہے)

فرہاد:۔ (پوران کے قریب جا کر) دیکھو پوران، تمہارے رونے سے سب کا دل اللہ دکھتا ہے۔ صبر سے

دالکی:۔ (خشک گلے سے) یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میں نے ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کیا۔

کوتوال:۔ جناب والا! بندہ کی عرض یہ ہے کہ ـــ حضور والا خود جانتے ہیں آپ جیسی محترم شخصیت

ے ایک افسرِ اعلیٰ کو ہی اس فریضہ کی تکمیل کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ جناب عالی کوئی چوڑا کو توہیں کہ اس
بس عمل کیا جائے — تو آپ —
دالکی :۔ (جیسے دفعتاً کچھ انکشاف ہو بے اختیار ہنس کر) واللہ! قربان جاؤں اسداللہ خاں آپ کے۔
ں سمجھا، آفریں، میں کس منہ سے شکر ادا کروں اس خدائے پاک کا جس نے لیے موقع پر آپ جیسے مہربان
ے اور میری بیوی کے بھائی کو یہاں بھیجا۔ (تمام حاضرین مبہوت و حیران کوتوال کی طرف دیکھتے ہیں اور خود کوتوال
ی نظریں کیے سب کو حیرت سے دیکھتا ہے) اس سے بڑھ کر مہربانی نہیں ہو سکتی۔ آقا دی ہے جسے اپنے خدمت گار
ہ (دفعتاً پھر سنجیدہ ہو کر) بجائے اس کے اجنبی افسر اپنے قدموں سے میرے غریب خانے کو نوازتے خود کوتوال
یرے برادرِ نسبتی کو بھیجا گیا ہے۔ خوب!
کوتوال :۔ (کچھ نہ سمجھ کر) قربان! جو حکم حضور کا۔ بندہ آپ کا غلام ہے۔
دالکی :۔ آپ کی مہربانی کا ممنون ہوں۔ شرافت کا اقتضا بھی یہی ہے۔ میرے لیے واقعی یہ بڑی تسلی کی بات ہے
جیسی ہستی کو اس کام پر مامور کیا گیا — میں حاضر ہوں، بس ابھی ذرا لباس تبدیل کر لوں (جلدی سے خواب گاہ
ف دوڑتا ہے جہاں بیگم کو آواز دیتے ہوئے) جہاں جان، جلدی کرو، ذرا کپڑے تو نکال دینا (جہاں ب
جاتی ہے)
کوتوال سوالیہ نظروں سے فرہاد اور پوران کو دیکھتا ہے مگر کچھ کہتا نہیں، اسی وقت خسرو باہر سے آتا ہے
۲۲ سالہ دبلا پتلا خوب رو نوجوان ہاتھ میں کچھ کتابیں ہیں جن پر اخبار کا کاغذ چڑھا ہے۔ سیٹی بجاتا اپنے میں گم اندر
ہے اور سیدھا ریڈیو کے پاس جا کر تھوڑی دیر اس کا پیچ گھماتا ہے پھر بند کر دیتا ہے۔ اور اس وقت اس کی
پوران کی سرخ آنکھوں پر پڑتی ہے۔
خسرو :۔ (بہن کے قریب آ کر طنز سے) پھر کوئی زمین جائیداد کا جھگڑا کھڑا ہوا؟ پوران تجھ سے کہتا ہوں
م کی زندگی چاہتی ہے تو یہ ساری زمین جائیداد تقسیم کر دے۔ کیا کرنا ہے تجھے یہ سب کھڑاک لے کر کبھی تو ان کی زندگی پر
ڈالی جو دن رات تیرے لیے محنت کرتے ہیں پھر بھی پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی۔ ان کو بھی روٹی کپڑا ملے، ان کے
بھی مدرسہ جائیں خوش و خرم رہیں تو کیا تیرا دل خوش نہ ہوگا۔ میرا ذمہ جو پھر کبھی ان خوبصورت آنکھوں میں آنسو آئیں۔
سیکڑوں حیوانوں جیسی زندگی بسر کریں اور تم اپنی عیش و عشرت میں پڑی رہو کیسے تمہارا دل گوارا کرتا ہے اس بات کو۔
رہاد میرزا ناراضگی سے خسرو کو دیکھتا ہے اور سگار جلا کر پینے لگتا ہے)
پوران :۔ (روتی آواز میں) لے جائیں کمبخت میری ساری جائیداد، مگر ہائے وہ، تو بابا کو لے جانے آئے ہیں۔
خسرو :۔ (تعجب سے) یعنی کیا؟ کون لے جانا چاہتا ہے بابا جان کو؟ آخر کس لیے؟
پوران :۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) کل رات سے ایک سپاہی بابا کے گھر پر پہرہ دے رہا ہے کہ کہیں وہ نکل نہ جائیں

دیکھو یہ ماموں جان اب ان کو لے جانے آئے ہیں (سسکیاں بھرتے ہوئے کوتوال کے قریب جاکر) ماموجان، آپ
ں ہم کو اتنی اذیت دے رہے ہیں، آخر کچھ تو کہیے بات کیا ہے ؟

کوتوال ۔ (گھبراکر) میری بیٹی! میرا اس میں کیا قصور ہے، تمھارا باپ میرا ولی نعمت ہے، مجھے خود پتہ نہیں بات
ہے تو کیا کہوں اور تم لوگ مجھے کچھ کہنے بھی تو نہیں دیتے ـــــ

پوران :۔ (بات کاٹ کر) اب کیوں بات پلٹ رہے ہیں آپ، کیا ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے خود نہیں کہا باباجا
یسی شخصیت کے لیے ایک افسر ارشد کو آنا چاہیے۔ (کوتوال بے بسی سے سر ہلاتا ہے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر خسرو بیچ میں بول
اٹھتا ہے)

خسرو ۔ مگر باباجان ہیں کہاں ؟

خسرو ۔ لعنت ایسی زندگی پر (دفعتاً کوتوال کی طرف مڑکر) شرم نہیں آتی آپ کو، آپ نے ایسا کام قبول کیوں کیا
پ کی رگوں میں بھی وہی خون نہیں کیا آپ ہمارے عزیز نہیں ؟

کوتوال :۔ (برہم ہوکر) میں اس توہین کو برداشت نہیں کرسکتا، کوئی نہ میری سنتا ہے نہ کچھ بتاتا ہے۔ خداحافظ،
مارے باباجانیں ان کا کام جانے۔ اگر پھر کبھی اس گھر میں قدم رکھوں تو لعنت مجھ پر (تیزی سے باہر جاتا ہے)

خسرو :۔ کیا مشکل ہے۔ آدمی بات زبان سے نہیں نکال سکتا، اور پھر اپنے کو آزاد، طاقتور، جانے کیا کچھ کہتے ہیں۔
ن کو دیکھو سورما بنا ہوا ہے۔ یہ میرے باباجان ہیں زندگی بھر اپنے سایہ سے ڈرتے رہے۔ بیوی کے ساتھ پانی بھی پینا
ہیں تو پہلے آدھا گھنٹہ سوچیں گے آخر ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ دولت، ثروت، حیثیت آدمی کو اس لیے تو نہیں
ی جاتی کہ وہ اندھا اور بے گور نگا بن جائے۔

فرہاد ۔ (اپنے آپ سے) لڑکا دیوانہ ہے کیسی واہیات باتیں کرتا ہے۔ میرا لڑکا ہوتا تو ابھی زنجیر پہنا دیتا، بداطوار
لائق کہیں کا!

خسرو ۔ (تمسخرانہ ہنسی کے ساتھ) آقائے محترم، کیا میں جھوٹ کہتا ہوں، آپ بھی تو ہر دم ہر کسی سے خوف کھاتے
ہتے ہیں . . . ڈر، خوف ایسا لگتا ہے زندگی میں اس کے سوا اور کچھ نہ ہو، بیوی شوہر سے، بچہ باپ سے، بہن بھائی سے
ں ایک ڈر ہے کہ ہر وقت طاری ہے۔ کالج میں تمام لڑکے مجھے جاسوس سمجھتے ہیں کوئی میرے سامنے زبان نہیں کھولتا
ہوں؟ اس لیے کہ میرا باپ وزیر ہے، استاد صاحب بھی کلاس میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ڈرتے ہیں کہ کہیں بات وزیر
ے کان تک نہ پہنچ جائے اس سے تو اچھا تھا سب بت پرست ہوتے اور صبح سے شام تک مورتی کے سامنے سینہ پر ہاتھ باندھے
ھڑے رہتے، پتھر کی مورتی کم از کم کسی کو آزار تو نہیں پہنچا سکتی اور دھوکے سے لوگوں کی جان نہیں لے سکتی۔

فرہاد :۔ (کانپتی آواز سے پوران کی طرف جھک کر) پوران میں تو جاتا ہوں اب میرا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ یہ تیرے بھائی کا
روسدا غ چل گیا ہے میں سپہ گاڑی بھیج دوں گا تم بعد میں آجانا لیکن خبردار اس دیوانہ کی کسی بات کا ہرگز جواب مت دینا اور

کس کا ذکر بھی زبان پر نہ لانا ورنہ نہ تم رہو گی نہ میں
پوران:۔ (شکایت کرتے ہوئے) ابا جان کو اس حال میں چھوڑ کر جانا آپ کو اچھا لگتا ہے؟
فرہاد:۔ تو کیا تم چاہتی ہو کل میں بھی ۔۔۔ (بات ادھوری چھوڑ کر) تم ابھی نہیں سمجھو گی، میں نے کہا نا سب نہیں بعد میں تم کو سب بتاؤں گا۔ سنا نہیں تم نے یہ لڑکا کیسی مزخرافات بکتا ہے (تیزی سے چلا جاتا ہے)
پوران:۔ خسرو میرے بھائی، خدا کے لیے ایسی باتیں مت کیا کرو اگر ابا سن لیں تو بہت پریشان ہوں گے کیوں آپ اپنے دشمن بنتے ہو، خدا کی قسم فرہاد میرزا سچ کہتے ہیں تمہارے دماغ میں ضرور کچھ خلل ہے۔
خسرو کچھ کہنا چاہتا ہے کہ اسی وقت دالکی اور جہتاب خواب گاہ کے دروازے سے آتے ہیں، دالکی نہایت صاف ستھرا لباس پہنے ہے اور پہلے سے زیادہ باوقار نظر آرہا ہے۔ جہتاب دستی آنکھوں سے لگائے آہستہ آہستہ رو رہی ہے۔
دالکی:۔ (تعجب سے) فرہاد اور کوتوال کہاں ہیں؟ (خسرو کو دیکھ کر) اچھا ہوا بیٹا تم آ گئے، آخری وقت دیکھ لیا ۔۔۔ مگر کوتوال . . . . . .
خسرو:۔ (طنزیہ) وہ چلے گئے . . . ڈر گئے کہیں ان پر بھی کچھ آفت نہ آئے، یہ ہیں ہمارے ہم قوم اور رشتہ دار!
(ننہ آتی ہے سر سے پاؤں تک ایک چادر لپیٹی ہوئی)
ننہ:۔ (ڈرتے ڈرتے) خانم آپ کے قربان جاؤں، سپاہی اندر آنا چاہتا ہے کہتا ہے جناب آقا کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا ہوں
(سب خوف زدہ ہو جاتے ہیں، خسرو بے پروائی انداز سے ریڈیو کے پاس جا کر اس کا پیچ گھماتا ہوں)
جہتاب:۔ (ننہ سے) تو تو نے کیا کہا؟
ننہ:۔ کیا کہتی، یہی کہ میں جا کر ان کی خدمت میں عرض کرتی ہوں
جہتاب:۔ خدایا! اب کیا ہوگا؟
دالکی:۔ سپاہی یہاں آنا چاہتا ہے ۔ رحم فرما میرے معبود! اسداللہ خاں کہاں گئے (خسرو سے) خدا کے لیے یہ ریڈیو بند کرو۔
پوران:۔ ماموں جان یہ کہہ کر چلے گئے کہ اب مجھ سے کچھ واسطہ نہیں۔
خسرو:۔ (قریب آکر) الینوئی آدمی سے آپ اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔
جہتاب:۔ (روتے ہوئے دالکی سے) میں نے کہا نہیں تھا تم سے۔ اسداللہ خاں ہرگز اس کام کو قبول نہیں کریں گے میں اپنے بھائی کو اچھی طرح جانتی ہوں یہ خسرو خاں کیا سمجھیں گے۔
دالکی:۔ (آہ بھر کر آہستہ) تو گویا میرے ساتھ چوروں اور قاتلوں جیسا برتاؤ کیا جائے گا کہ ایک معمولی سپاہی مجھے گرفتار کرکے لے جائے ۔۔۔
(پوران اور جہتاب زور زور سے رونے لگتی ہیں۔ دالکی کی آنکھیں بھی نم ہیں۔ خسرو حیرت زدہ ان کو دیکھ رہا ہے

مجبوری جانا ہی ہوگا، کیوں نہ میں ہی خود چلا جاؤں۔ سپاہی کو اندر کیوں بلاؤں۔

بابا اسے یہاں آنے دیجیے معلوم تو ہو وہ کیا چاہتا ہے؟

کا یہاں کمرہ میں آنا برا نہیں؟

اس میں کیا عیب ہے! آپ نے کچھ کیا نہیں تو آخر ڈر کس لیے؟

رحم صورت بنا کر) اچھی بات ہے بابا، جیسا تم کہو، نہ جاؤ اسے کہو تشریف لائے۔ خدایا تیری پناہ
ہے) خسرو اب تم ہی اس گھر کے بڑے ہو۔ جناب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا وہ تیری ماں کے برابر ہے (جناب
رو میری جان، دیکھو اگر تم لوگوں سے کچھ پرسش ہو تو کوئی بے تکی بات نہ کہنا۔ یہی کہنا ہمیں کچھ معلوم نہیں
نہیں — خسرو بٹیا تو بھی ذرا احتیاط کرنا، تیرے بارے میں میں نے کچھ باتیں سنی ہیں مگر خیر یہ وقت ان
ن یہ یاد رہے وہ نوجوانوں پر بالکل رحم نہیں کرتے اگر کہیں تو ان کے پنجہ میں پھنس گیا تو پھر حساب پاک ہے
ر رکھنا۔

فرمانی کے انداز میں) خدا نے زبان بات کرنے کے لیے دی ہے۔ میں حق کہنے سے روک نہیں سکتا چاہے۔
ران اور زور زور سے روتی ہیں خسرو منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہے۔ اسی وقت دروازہ کھلتا ہے
آتا ہے، پورے ڈریس میں۔ دبلا پتلا کمر میں تپنچہ، آنکھوں پر سیاہ عینک کمرے میں داخل ہوتے ہی
ے کھڑے ہو کر فوجی سلام کرتا ہے پھر سر سے ٹوپی اتار کر بغل کے نیچے دبا لیتا ہے۔ نیچی نظریں کیے ایک
ایک قصوروار انسان کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑا رہتا ہے)

م آواز میں) خوب میں حاضر ہوں، کیا چاہتے ہو۔

اسی طرح سر جھکائے) قربان جاؤں حضور! کیا عرض کروں، آپ کا یہ غلام خانہ زاد کتنا نادم و شرمندہ ہے
ں، کیسے جرأت کروں؟

بیچارگی سے ہنس کر) کوئی بات نہیں تمہارا اس میں کیا قصور آخر ہر شخص کا اپنا فرض ہوتا ہے۔

کسی قدر مطمئن ہو کر) حضور کے لب و دہن کے قربان جاؤں۔ خدا شاہد ہے میری اس میں ذرا برابر بھی
ہ کچھ ایسا ہو گیا (آہ بھر کر معذرت کے انداز میں) اے کاش میری جان آپ پر نثار ہو گئی ہوتی اور مجھ سے
تی (سر اور جھکا لیتا ہے)

سے کسی کو شکایت نہیں، فرض بہر حال فرض ہے اور بالخصوص ہماری مملکت میں وہ ایک مقدس فعل
رنا ہوگا؟

(متاثر ہو کر) قربان آقا! بعض وقت انسان کو ایسی باتیں پیش آجاتی ہیں کہ وہ ان کا بالکل متوقع
ما نے حضور والا! اگر ایسی ہی مجبوری نہ ہوتی تو یہ بندہ ہرگز مزاحم نہ ہوتا۔ خدا کرے میرے پاؤں

قلم ہو جائیں (پھر آہ بھر کر چپ ہو جاتا ہے)

والکی ۔ (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) بیٹھ جاؤ، ذرا آرام لے لو۔

سپاہی ۔ (اپنی جگہ سے ہلے بغیر) نوازش سرکار کی! بندہ اتنا بھی بے ادب نہیں کہ اپنے ولی نعمت کے ساتھ جسارت کرے۔

والکی ۔ (اصرار سے) کوئی بات نہیں، انسان انسان سب برابر ہیں، بیٹھ جاؤ ۔ یہ لو کچھ پھل کھاؤ ۔ بہ پریشان اور تھکے ہوئے نظر آتے ہو ۔ (خسرو طنز اور حقارت کی نظروں سے باپ کو دیکھتا ہے) جلدی کیا ہے؟ میں کہیں جانے والا نہیں ۔ یہیں ہوں (آگے بڑھ کر خود سپاہی کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی کی طرف کھینچ لاتا ہے اور زبردستی بٹھا دیتا ہے)

تھوڑی دیر دونوں خاموش رہتے ہیں۔ سپاہی کی نظریں زمین پر جھکی ہوئی ہیں سب چپ ہیں)

سپاہی ۔ (گومگو کی حالت میں) قربان جاؤں حضور! میری دونوں آنکھیں پھوٹ جائیں اگر خلاف عرض کروں۔ کل شام آیا کئی بار ارادہ کیا کہ حضور والا کی خدمت میں حاضر ہوں مگر ہمت نہ ہوئی ۔ یہی سوچا میں ایک بندۂ حقیر وزیر مملکت کے خانۂ اقدس میں داخل ہوں تو لوگ کیا کہیں گے ۔ پھر صبح آیا تب بھی مارے ڈر کے ہمت نہ ہوئی لیکن اب مجبور ہوں کہ عرض کروں ۔

والکی ۔ (خوف اور بے بسی سے سب کی طرف دیکھ کر) ٹھیک ہے! کہو کیا کہنا ہے؟ تم فرض شناس معلوم ہوتے ہو میں اور خانم تمہارے ممنون ہیں۔ انشاء اللہ اس کی تلافی کر دی جائے گی میں حاضر ہوں۔

سپاہی ۔ نوازش! سرکار عالی، آپ تو جانتے ہیں، آپ کی کنیز دس سال سے بلند مقام سرکار سپہ سالار کے گھر میں ملازم ہے۔ بے چون و چرا گھر کا سارا کام کرتی ہے کسی بات میں عذر نہیں اور میری ایک نو سال کی بچی ہے وہ اس کا ہاتھ بٹاتی ہے ۔ کل وہ بدنصیب آنگن میں کھیل رہی تھی کہ ایک لاٹینی کی توپ اسے وہاں پڑی دکھائی دی۔ بچہ تو اسی سے کھیلنے لگی اور جانے پہلے سے ٹوٹی تھی کہ اس کے ہاتھ سے ٹوٹ گئی ۔ اس وقت حضرت اشرف وخانم تشریف لائے ۔ اب کیا عرض کروں حضور والا کہ کل سے اب تک ظالم جناب سپہ سالار نے اس فدوی اولاد سیدہ پر کیا آفت ڈھائی ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک اتنی چھوٹی سی چیز کے لیے جتنی گالیاں ہو سکتی تھیں سیدہ کو دیں اور اتنی جوتیاں ماریں کہ الامان اور کہا ابھی اس گھر سے نکل جاؤ نہیں ویسی ہی توپ لاؤ میں پریشان یہاں آیا کہ اکبر سے کہوں شاید وہ کچھ مدد کر سکے اس نے وعدہ کیا کہ کہیں سے ویسی ہی تلاش کر کے لا دے گا۔ لیکن پھر اکبر بھی نہ جانے کہاں چلا گیا۔ ننہ نے کہا کئی دن کی چھٹی پر گیا ہے تو مجبور ہو کر میں نے سوچا کہ خود حضور والا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرضداشت کروں۔ خدا شاہد ہے خانم نے اس بندہ اور سیدہ کی آبرو ریزی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ مگر بندگی و بے چارگی، روٹی روزگار کا سوال ہے مگر حضور والا . . . .

مالکن:۔ (دفعتاً چلاّ کر) بس کر منحوس، نمک حرام، کمبخت! (بے حال سا ہو کر کرسی پر گر پڑتا ہے)
جھک کر اس کے دل پر ہاتھ رکھتی ہے، پوران دیوانہ وار باپ کی طرف دوڑ کر خود کو اس کے قدموں میں
یتا ہے۔ سپاہی خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ڈرا سہما دروازہ کی طرف ہٹنے لگتا ہے۔
خسرو:۔ (سپاہی کے کندھے پر مہربانی سے ہاتھ رکھ کر) آؤ میرے ساتھ چلو، میں تمھیں توپ
ؤں۔ کیسی تھی وہ توپ؟ (جاتے ہوئے باپ کی طرف نظر ڈال کر) آخر آپ سب کب تک یوں ہی توہم
مبتلا رہیں گے — ہر وقت ایک ڈر، خوف، حد ہو گئی — یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ موت اس سے ہزار درجہ
تر ہے۔ (دونوں باہر نکل جاتے ہیں)

(پردہ)

جواب طلب امور کے لیے ٹکٹ روانہ کیے جائیں

صالحہ عابد حسین

ماں یا ڈائن؟

اسٹیچر ایک جھٹکے سے آگے بڑھا، نرس نے ساتھ آنے والوں کو ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور سب رک گئے مگر پروین کا باپ سمیع اسٹریچر کے ساتھ ساتھ یوں بندھا ہوا جا رہا تھا جیسے وہ مقناطیس کا بنا ہے اور سمیع لوہے کا۔ پروین کی دادی کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا، ہاتھ کی تسبیح کی گردش تیز ہو گئی تھی اور بوڑھی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو تسبیح کے ہر دانے کے ساتھ ٹپ ٹپ گر کر ملگجے ڈوپٹے پر جذب ہو رہے تھے۔ اس کی بے قراری سے مانگی دعاؤں نے ڈاکٹروں اور نرسوں تک کے دل ہلا دیے تھے دو دن اور تین رات کی ہر ممکن کوشش کے بعد اب ایک آخری کوشش پروین کو بچانے کے لیے کی جا رہی تھی — آپریشن! — امید کا ایک باریک سا تار ابھی تک چاہنے والوں کو سنبھالے ہوئے تھا۔

انوری دو دن سے اسپتال کے کمرے کے ایک کونے میں بے حس و حرکت دیوار سے ٹیک لگائے یوں بیٹھی تھی جیسے وہ انسان نہ ہو پتھر کی مورتی ہو نہ وہ روئی پیٹی نہ بچی کے پاس آئی نہ ڈاکٹروں اور نرسوں سے سوالات کیے — یکساں ٹکٹکی لگائے وہ زمین یا چھت کو تکے جاتی۔ چہرہ پر وہ وحشت، آنکھوں میں وہ بے حسی کہ دیکھنے والا ڈر جائے۔ ماں، بہن سسر نندوئی، نند، میاں ہر ایک باری باری یہ کوشش کر چکا تھا کہ وہ کچھ کھا پی لے یا ذرا آرام کر لے مگر ہر ایک ناکام واپس آیا۔ وہ ایسی خونخوار نظروں سے انھیں دیکھتی جیسے کچا ہی تو کھا جائے گی۔ بھلا اس کے منہ کون لگے — جو ڈائن اپنی بچی کا خون کر سکتی ہے اس سے ہر کسی کو ڈرنا چاہیے۔

"ماں ہے یا ڈائن؟" "ماں ہے یا ڈائن؟" دبی زبان سے کانا پھوسی میں اشاروں کنایوں میں کہنے والے، محلے والے کہنے لگے "یہ جملہ بولنا فرض سمجھتے جو منہ سے نہ کہتا اس کے چہرے اور نظروں میں لفظ ڈائن جلی عبارت میں لکھا نظر آ رہا تھا۔
سمیع نے البتہ کچھ بھی نہ کہا۔ بے قراری میں خون میں لت پت بے ہوش بچی کو اٹھا کر ایک بار اس نے ملامت آمیز نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا ضرور تھا اور پھر سختی سے ہونٹ بند کر لیے تھے۔ پھر بچی کو اپنی ماں کی گود میں ڈال کر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے بھاگتا ہوا گھر سے نکل گیا تھا، اور دادی جو پوتی کو جان سے زیادہ چاہتی تھی اسے گود میں لیے پلو سے اس کے سر کا خون پونچھتی جاتی اور بلک بلک کر دعا مانگتی جاتی۔ بہو کی طرف اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

اسٹریچر جیسے ہی کمرے کے دروازے سے نکلا الوری کے شل ہاتھ و پیر میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا، آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل کر اسٹریچر کی طرف لپکی۔ پیچھے سے ایک نرس نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا
"بی بی آہستہ آہستہ ——— بچی کو چھونا نہیں۔"

الوری ٹھٹک گئی ——— وہ اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہی تھی جیسے ان میں خون بھرا ہو۔

اسٹریچر اب تیزی سے آپریشن تھیٹر کی طرف جا رہا تھا۔ الوری کے لڑکھڑاتے قدم ساتھ نہیں دے رہے تھے اس کی نظریں اسٹریچر کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ننھی پروین کا جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا بس اس کا گلاب کے پھول کا سا چہرہ جو اس وقت ٹیسو کے پھول کی طرح زرد تھا، کھلا ہوا تھا آنکھیں بند، ہونٹ نیم وا، اور ناک اور منہ میں دو پتلی پتلی ربڑ کی نلکیاں لگی ہوئی۔ "ننھی جا رہی ہے ——— اب کبھی نہیں آئے گی ——— کبھی نہیں ——— کبھی نہیں۔"

آپریشن تھیٹر کا بڑا دروازہ کھلا ——— اندر سفید لباسوں میں ملبوس منہ پر سفید ماسک چڑھائے ڈاکٹروں اور نرسوں کے جمگھٹ کی ایک جھلک الوری کو نظر آئی "موت کے فرشتے ——— جم موت ———" کسی نے اس کے دل کے اندر سے کہا۔ تھیٹر کا دروازہ بند ہو گیا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے الوری اپنی بچی کو جم موت سے چھیننے کے لیے دروازے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔ اس کی آنکھوں میں اس شیرنی کی سی خونخواری تھی جس کا بچہ شکاری چھین لے گیا ہو ——— اور پھر ——— وہ دھم سے زمین پر بیٹھ گئی۔ بند دروازے سے ٹیک لگا لی آنکھیں بند کر لیں۔ دو دن سے جو دماغ سن تھا اب اس نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

"اب میں پرو کو کبھی نہ دیکھوں گی ——— وہ مر جائے گی ——— اچھا ہے مر جائے ——— نہیں تو رو رو کر اُسے بھی زندگی بتانی پڑتی ——— پر ——— پر میں نے تو اسے نہیں مارا ——— وہ تو گر پڑی ——— وہ تو مجھے رونے سے چپ کرانے آئی تھی ——— پھر ——— پھر میں نے اسے دھکا کیوں دیا؟ ہاں وہ مجھ سے روٹھ گئی ——— کیوں نہ روٹھتی ——— کبھی میں نے اسے ماں کا پیار نہیں دیا، محبت سے منہ نہیں چوما، اس کے توتلے بولوں پر میرے دل کے اندر مسرت کے سوتے نہیں پھوٹے ——— میں ہر کسی کا غصہ اور جھنجلاہٹ اس پر اتارتی رہی ——— میں اسے کوستی مارتی ——— اپنے پاس سے دھتکارتی رہی ——— کیوں؟ آخر؟ کیا میں ماں نہیں؟ کیا میں سچ مچ ڈائن ہوں؟ کسی ڈائن نے میرے روپ میں جنم لیا ہے؟ ہاں میں ڈائن ہوں ——— جس کو نو مہینے خون جلا کر، دکھ اٹھا کر، مر مر کر جنم دیا، راتوں کو جاگ جاگ کر پالا، ——— اسے کھا گئی ——— ڈائن ——— ڈائن ———"

آخری لفظ بھیانک چیخ کی طرح اس کے منہ سے نکلے اور سمیع نے جو اس کے پیچھے کھڑا تھا سرد ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھ کر نرم لہجے میں کہا "الوری ——— حوصلہ کرو ——— دعا کرو ——— پرو ابھی ٹھیک ہو جائے گی ———؟" اور کئی گرم گرم آنسو الوری کے الجھے بکھرے لمبے بالوں میں گر گر کر جذب ہو گئے۔ الوری کی ساس جو کچھ دور زینے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی آہستہ سے اس کے پاس آئی، اپنی تسبیح بہو کے سر پر رکھی اور یا غفور، یا رحیم و یا شافی کے ورود میں اور شدت

پیدا ہو گئی۔ الوری کے سلگتے دل، بھڑکتے دماغ اور تپتے ذہن پر کسی نے ٹھنڈے پانی کا پھاپا سا رکھ دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں — ساس اور میاں کے دکھ بھرے چہروں کو چند لمحے دیکھتی رہی — پھر آنکھیں بند کر لیں، سر دروازے سے جا لگا۔ سمیع اس کے برابر بیٹھ گیا اور اس کے گرتے جسم کو اپنی پیٹھ کا سہارا دے دیا۔ شاید وہ سو گئی ہے — یا شاید وہ بے ہوش ہے۔ مگر الوری نہ سوتی تھی نہ جاگتی، نہ ہوش میں تھی، نہ بے ہوش تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور سارے اعضا بے حس و حرکت تھے مگر دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا — مگر اس کی سوچ کا رخ حال کی طرف نہیں ماضی کی سمت تھا۔ گزرے زمانے کی دھندلی اور واضح تصویریں بڑی تیزی سے اس کی بند آنکھوں کے سامنے گزر رہی تھیں۔

اس کی پہلی یاد ہی اتنی روح فرسا تھی جس سے وہ آج تک دامن نہ چھڑا سکی تھی۔ ماں نے اس کے منہ سے دودھ چھین لیا ہے اسے زور سے پلنگ پر پٹخ کر کہتی ہے "منحوس باوا کو کھا گئی" — اور بس وہ ڈولتی ٹانگوں سے اس کے پیچھے پیچھے صحن میں آتی ہے تو اس کو اپنا باپ پلنگ پر پڑا دکھائی دیتا ہے جس کے سر سے لال رنگ بہہ رہا ہے — الوری سر سے پیر تک کانپنے لگتی ہے اس کی گھگھی بندھ جاتی ہے اس وقت ماں کا ایک دو ہتڑ اس کی پیٹھ پر پڑتا ہے مگر فوراً ہی کسی نے اسے گود میں اٹھا کر اپنے گرم و گداز سینے سے لگا لیا "بیچاری بچی" اور پھر اسے کچھ خبر نہ رہی — یہ تو برسوں بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کا باپ جب وہ دو برس کی تھی کسی حادثہ کا شکار ہو گیا تھا، اور اس کو چھاتی سے لگانے والی اس کی خالہ تھی۔

اس کے بعد کی تصویریں دھندلی اور گڈمڈ سی ذہن میں ابھر رہی تھیں۔ ماں کی مار پیٹ بڑی بہن کا کوسنا کاٹنا خالہ کی محبت، ماں کا ریشمی کپڑے اور زیور پہن کر اور ڈولی میں بیٹھ کر کہیں جانا خود اس کا لال لال جوڑے میں خوش خوش ماں کے ساتھ پھرنا، ایک لمبے تڑنگے مرد کا اسے گود میں اٹھا کر منہ چومنا — اس کے مونچھوں کے سخت بال الوری کو اپنے گالوں پر چبھتے محسوس ہونا — اس کا رو پڑنا — ماں کا اس مرد سے کہنا "چھوڑ دو بھی اسے — جنگلی بلی ہے بالکل" مرد کی خوفناک ہنسی — اس کا ڈر کر ماں کے پلنگ کی پائنتی دبک کر سو جانا — اور پھر جب آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کو اسی خوفناک مرد کی گود میں پایا۔ وہ ماں ماں چلاتی ہے اور وہ اسے کمرے سے باہر لے جانے لگتا ہے — وہ ٹانگیں چلاتی ہے چیختی ہے — روتی ہے مگر ایک مضبوط گرفت میں ہے — اور پھر ایک دم وہ اپنے دانت اس مرد کے کندھے میں گڑو دیتی ہے — ایک زناٹے کا چپت اس کے گال پر پڑتا ہے اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ . . .

الوری کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور گہرے ہو گئے تھے — سمیع غور سے اسے دیکھ رہا تھا کہیں اسے ہسٹریا کا دورہ نہ پڑ جائے یہاں — اس وقت!

تصویریں اب زیادہ نمایاں اور واضح ہو کر اس کے سامنے سے گزر رہی تھیں — وہ خاصی بڑی ہو گئی ہے، مگر ماں کی ڈانٹ مار میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سوتیلے باپ کو پہلے دن سے جو اسے نفرت ہوئی تھی وہ جوں کی توں رہی تھی۔ چھوٹے بہن بھائی پر ماں باپ کی محبت کی برکھا ہوتی، وہ ماں کے سینے سے لگ کر سوتے، اور یہ زمین کے سینے میں منہ چھپا کر روتی وہ دنیا بھر کی چیزیں

کھاتے اچھا سے اچھا پہنتے اور یہ بچا کھچا کھا کر، پھٹا پرانا پہن کر دن رات گھر بھر کی خدمت کرتی مگر بدلے میں اسے محبت کے دو بول، تعریف کا ایک جملہ، ہمدردی کی ایک نظر نہ ملی — رفتہ رفتہ اس کا مزاج بدلنے لگا۔ سب اسے بدزبان، بدمزاج، لڑاکا، بدتمیز کہتے — اور آج — آج پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ سچ مچ غصہ ور اور بدزبان تھی اور پھر اسے ہسٹیریا کے دورے پڑنے لگے۔ وہ اپنے بال خود نوچ ڈالتی، کپڑے پھاڑنے لگتی، ہاتھ پاؤں اینٹھ جاتے، منہ سے چیخیں نکلنے لگتیں۔ کچھ لوگوں نے کہا جوان لڑکی ہے بیاہ کر دو — ٹھیک ہو جائے گی، کچھ نے کہا بھوت پریت کا سایہ ہے جھاڑ پھونک کراؤ — مگر ماں کو اس کی فرصت کہاں تھی — وہ تو ہر دوسرے سال تخلیق میں مصروف رہتی تھی — اس کے دل کے اندر جو جوالا مکھی بھڑکتی رہتی تھی اس کو بجھانے کی فکر کسی کو بھی نہ تھی۔

اور پھر ایک اور تصویر اس کے ذہن پر ابھری۔ اس کی خالہ بڑے چاؤ سے اسے بیاہ کر اپنے گھر لائی ہیں اور اس پر واری نثار جا رہی ہیں۔ اس کی بنجر ویران زندگی میں صرف ان کی ذات تھی جن کو دیکھ کر جن سے مل کر اس کے دل میں محبت اور نرمی پیدا ہوتی تھی۔

انوری نے آنکھیں کھولیں۔ سمیع پریشان نظروں سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا اور خالہ اسی طرح تسبیح ہاتھوں میں لیے دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ پل بھر اس کی نظریں ان پر جمی رہیں — پھر آنکھیں بند ہو گئیں۔

آہ — وہ پہلی دلکش تصویر — وہ پہلی اور آخری حسین یاد — وہ جب سمیع سر پر پھولوں کا سہرا لٹکائے اس کے منہ پر سے لال دوپٹے کا گھونگھٹ اٹھا رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں کتنا اشتیاق ہے، چہرے پر محبت و خلوص کا کتنا گاڑھا رنگ تھا اس وقت۔

اس کے ہونٹوں پر ایسی دلکش مسکراہٹ ابھری جو سمیع نے پہلی رات اس کے منہ پر دیکھی تھی — پھر دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

مگر — مگر خالہ آخر ماں کی ہی بہن تو ہے — اور سمیع اس کا بیٹا — جانے یہ زہریلا خیال، کب، کیسے اس کے دل میں سانپ کی طرح رینگ گیا اور اب اسے خالہ کی ہر بات کا مطلب الٹا نظر آنے لگا۔ وہ پہلے بھی اس کو روکتی ٹوکتی تھی مگر اب جو بات وہ کہتی اسے کیوں زہر لگنے لگی تھی؟ ماں بیٹے پر اس قدر واری نثار کیوں جاتی ہے؟ ماؤں کے دلوں میں محبت ہوتی کیا اللہ ہے؟ سمیع اپنی ماں کو اس قدر کیوں چاہتا ہے؟ گھر کا سارا خرچ اس کے ہاتھ میں کیوں دیتا ہے؟ وہ اپنے گھر میں بھی دوسروں کی دست نگر رہے گی کیا؟ رفتہ رفتہ اس کے مزاج کا انداز اپنے پرانے ڈھرے پر آ گیا، لڑنا جھگڑنا، رونا چیخنا، ساس سے الجھنا، میاں سے بگڑنا — پھر ہسٹیریا کے دورے بھی پڑنے لگے۔ ساس بگڑ گئیں "اے لڑکی شریف بہو بیٹیوں کی طرح رہنا ہے تو رہو — یہ چالیں یہاں نہ چلیں گی میرے گھر میں بھوت پریت کا سایہ نہیں ہوتا۔" اور انوری کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی — اور ساس سے باقاعدہ ٹھن گئی۔ مگر جب پروین پیٹ میں آئی تو ساس کی محبت کی برکھا پھر ہونے لگی وہ اسے پان پھول کی طرح پھیرتی رہتیں، سمیع ہر طرح خاطر خوشامد کرتا۔ اب اس کا مزاج اور صحت ٹھیک ہو گئی — اور وہ سنہرے سپنے دیکھنے لگی . . . . اور جب اس نے پہلی بار پروین کا منہ دیکھا تو جیسے سارے جہان کی دولتیں اس کے قدموں پر نچھاور ہونے لگیں . . .

مگر پھر — جانے کیا ہوا — کیسے یہ ہو گیا کہ وہ پروین سے جلنے لگی — شاید اس لیے کہ ایک دو بار سمیع نے اسے بچی کی خاطر سختی سے ٹوکا تھا، یا اس لیے کہ ساس بچی پر جان دیتی تھیں اور اس کی ذرا سی تکلیف پر بہو کو ڈانٹتی ڈپٹتی تھیں —

صب

اللہ ہی جانے کیا بات ہوئی کہ وہ بچی سے چڑنے لگی — اس کے رونے پر، رات کو ضد کرنے پر وہ غصے سے بے تاب ہو جاتی۔ وہ پیار سے ماں کے گلے میں باہیں ڈالتی اور یہ جھٹک دیتی، کسی اور سے جھگڑا ہوتا یا غصہ آتا وہ سب اس معصوم پر نکالا جاتا اسے کوستی کاٹتی "تو مر کیوں نہیں جاتی" یہ تو اس کا تکیہ کلام سا بن گیا تھا — مارنا کوسنا ہر ماں کا حق ہے، کوئی اسے کیوں ٹوکتا کیا اس نے بچپن میں ماریں نہیں کھائیں؟ بچی جتنا اس سے ڈری سہمی رہتی، سمیع جتنا بے تعلق ہوتا جاتا، ساس کی ڈانٹ پھٹکار جتنی بڑھتی جاتی بچی سے اس کا سلوک سخت ہوتا جاتا تھا "میرا کوئی نہیں — کوئی نہیں — نہ ماں نہ میاں، نہ خالہ اور نہ یہ منحوس بچی — یہ بھی دشمنوں ہی کی لاڈلی ہے"

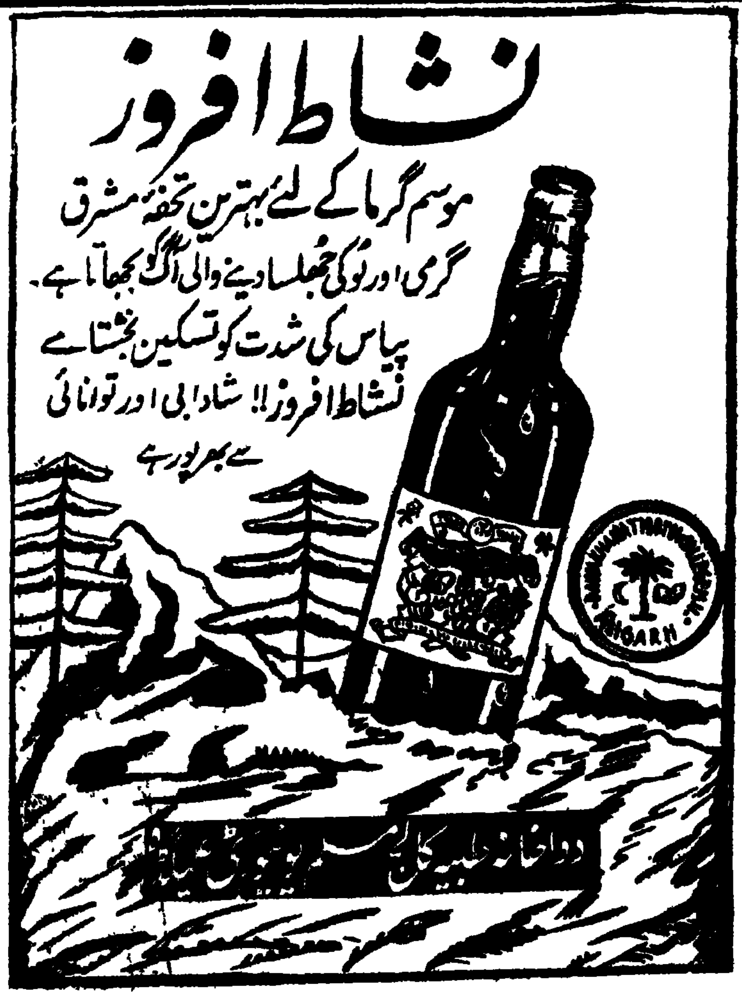
پرسوں کسی بات پر وہ میاں پر برسنے، ساس سے لڑنے اور سب کو کوسنے کے بعد بیٹھی رو رہی تھی کہ پروا اپنی ڈولتی ٹانگوں سے بھاگتی اس کے پاس آئی اور ماں کے منہ پر منہ رکھ کر بولی "ماں لوتی لوں — دادی نے مالا؟" اس نے ایک لمحہ بیٹی کو دیکھا — پروا انوری بن گئی — اسے بھی میری ہی طرح زندگی بھر رونا پڑے گا — تو پیدا ہی کیوں ہوئی تھی کمبخت مرتی کیوں نہیں" اس نے گرج کر کہا تھا اور جب بچی ڈر کر روتی ہوئی دادی دادی کہتی اونچے تخت سے اترنے کی کوشش کرنے لگی تو اسے اور غصہ آیا — "مر کمبخت وہیں جا کر" اس نے پیٹھ پر ایک دھکا دیا اور ڈھائی سال کی بچی چاروں شانے چت پکی زمین پر گر پڑی . . .

انوری کا سارا جسم کانپنے لگا — پروین کا خون آلود چہرہ، ساس کی بھیانک چیخیں، میاں کی بدحواسی، محلے والوں کا ہجوم اسپتال، ڈاکٹروں اور نرسوں کا جمگھٹ — اور اب — اب بچی کا آپریشن تھیٹر میں جانا "اف — وہ گئی — گئی — وہ مر گئی — میں ڈائن ہوں — ڈائن — ڈائن"

انوری کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا، ہاتھ پاؤں اینٹھ گئے تھے۔ سمیع نے اسے اپنے بازوؤں میں سنبھالا "انوری انوری ہوش میں آؤ — پروا زندہ ہے — وہ اچھی ہو جائے گی — سنبھلو انوری تماشا نہ بنو" اور خالہ تسبیح چھوڑ کر لپک کر اس کے پاس آئیں اور اس کا سر چھاتی سے لگا کر آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولیں "میری بچی دعا کر — دعا اس رحیم و کریم سے جو ہم سب کے گناہ بخشنے والا ہے — دعا کر — تیری ممتا ٹھنڈی رہے — تیری گود بھری رہے"
انوری ایک دم شانت ہو گئی — آج پھر وہی بیس برس پہلے کی نرم و گرم آغوش سے سکون دے رہی تھی — تین دن میں پہلی بار وہ رو پڑی — شاید زندگی میں پہلی بار اس کی آنکھیں محبت اور خلوص کے آنسوؤں سے لبریز ہوئی تھیں — وہ خالہ کے پیروں سے لپٹ کر بلک بلک کر رونے لگی۔

اور اسی وقت آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا — بڑا ڈاکٹر پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا باہر نکلا، اس کے ہونٹوں پر تھکی ہوئی مسکراہٹ تھی — "مبارک ہو مسٹر — آپ کی بچی بچ جائے گی —"
اور تین سر ایک ساتھ زمین پر سجدے میں جھک گئے۔

(بشکریہ اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی)



نشاط افروز
موسم گرما کے لئے بہترین تحفہ مشرق
گرمی اور لو کی جھلسا دینے والی آگ بجھاتا ہے۔
پیاس کی شدت کو تسکین بخشتا ہے
نشاط افروز!! شادابی اور توانائی
سے بھرپور ہے

صب

(رپورتاژ)

کوثر چاندپوری

سفرِ ارضِ غزل[1] کا!

آل انڈیا طبی کانفرنس کے دفتر سے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا ہے اور کانوں میں صدائے جرس گونجنے لگی ہے ایکبار اور رحیل کارواں کا زندگی خیز منظر آنکھوں میں گھوم گیا ہے۔ سہ روزہ سیمنار بھی ہو رہا ہے جس میں آندھرا پردیش کے طبی مسائل پر بحث ہونے والی ہے۔ سوچ رہا ہوں، جاؤں یا نہ جاؤں ایک طرف حیات اجتماعی کی کشش ہے، دوسری جانب انفرادی زندگی کا سوال۔ لیکن انسان تو ایک سماجی حیوان ہے وہ جماعت سے الگ ہو کر کیوں کر اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکتا ہے، جزو کل میں جذب ہو کر ہی کار آمد ہوا ہے، ذرہ آفتاب کی تابانی کے بغیر نہیں چمک سکتا، بہت دنوں سوچ چکا ہوں، بنارس نہیں جا سکا وہاں کی روایتی صبح کے حسن کا نظارہ نہیں کر سکا، شملہ کی حسین بلندیوں کی سیر سے محروم رہ گیا، زندگی حرکت اور جشن کا نام ہے جمود اور تعطل کا نہیں، یہ نیند، غفلت اور بے عملی آخر کب تک، پھر خیال آتا ہے کہ اس مرتبہ عزم وعمل کے سیلاب کا رخ حیدرآباد کی طرف ہے جو ریختہ اور غزل کی سرزمین ہے، جس کی رومانی فضاؤں میں "بھاگ متی" کی سیاہ اور طویل زلفیں لہرا رہی ہیں اور موسیٰ ندی طور وکلیم کا افسانہ دہرا رہی ہے حیدرآباد جس نے بلبل ہند سروجنی نائیڈو اور ڈاکٹر زور کو پیدا کیا، اور جہاں عہد حاضر کا عظیم مفکر اور دانشور ڈاکٹر ذاکر حسین عالم وجود میں آیا جہاں اردو یونیورسٹی بنی اور مٹ گئی، ارض دکن کی زیارت سے بہرہ ور نہ ہونا زندگی سے انحراف کرنا ہے، تاریخ، تہذیب اور ثقافت سے کھلی بغاوت ہے۔

چلنا ہی چاہیئے!

یہ فیصلہ کرتے ہی سلیپنگ برتھ ریزرو کرالی ہے، روانگی ۵ ر نومبر کی صبح کو جی ٹی سے ہو رہی ہے اسی گاڑی سے امیر قافلہ حکیم حاجی عبدالحمید صاحب بھوپال سے گزر رہے ہیں، نومبر شروع ہو چکا ہے، اس کا آغاز بڑا ہنگامہ خیز اور زلزلہ

---

[1] غزل ولی دکنی سے پہلے پیدا ہو چکی تھی اور حیدرآباد ہی کو اس کا اولین گہوارہ سمجھنا چاہیئے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ ثانی جس نے "چار مینار" بنوایا تھا شاعر بھی تھا، یہی حیدرآباد کا بانی ہے۔ اس نے دکنی، فارسی، اور تلگو میں غزلیں کہی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ ثانی کا سنہ وفات ۱۰۲۰ھ ہے۔ کوثر

آخر یہ ثابت ہوا ہے دوسری تاریخ کو علامہ عبید عسر کا اچانک انتقال ہوگیا ہے۔ ابھی فضا پر سوگواری کی دھند چھائی ہوئی ہے کہ آل انڈیا مشاعرے کا اعلان ہونے لگا ہے اور ۴ نومبر تک تالاب کی موجوں پر شکیل بدایونی کے نغمے بہتے رہے ہیں۔ شام ہی سے ایک اضطراب سا طاری ہوگیا ہے اور انتظار بُرا معلوم ہونے لگا ہے۔ وقت کی رفتار مدھم سی ہوگئی ہے ۵ نومبر کی رات بیداری کا پیغام لے کر آئی ہے۔ سونا چاہتا ہوں لیکن نیند کی دیوی کچھ برہم سی ہوگئی ہے بڑی مشکل سے ۱۱ بجے کے بعد آنکھ لگی ہے اور ۴ بجتے ہی جاگ گیا ہوں۔ ٹرین ۱۰-۵ پر آتی ہے۔ پون گھنٹہ تیاری میں صرف ہوگیا ہے۔ پونے پانچ پر گھر سے چل پڑا ہوں۔ گاڑی چند منٹ لیٹ ہے اور میں پلیٹ فارم پر ٹہل رہا ہوں، دفعتاً شمال کے اندھیرے میں روشنی کی شوخ اور چنچل کرنیں مچل اٹھی ہیں۔ ان کے اوپر دھواں گیسوؤں کی طرح بل کھا رہا ہے، گھنٹی بج رہی ہے اور دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی جا رہی ہیں۔ گاڑی سانپ کی مانند لہراتی، بل کھاتی پلیٹ فارم کے اندر آگئی ہے۔ قلی نے ٹو ٹائر (TWOTIRE) میں سامان رکھ کر بستر بچھا دیا ہے۔ خنک ہوائیں چل رہی ہیں، مسافر اپنے بستروں پر پڑے خراٹے لے رہے ہیں، میں ابھی بیٹھا بھی نہیں ہوں کہ دودھیا وردی میں ملبوس سفید مونچھوں والے کنڈکٹر نے قریب آکر کہا ہے۔

لائیے آپ کی رسید بنا دوں!

لاؤں کیا؟

سات روپے!

کس حساب سے؟

ساڑھے پانچ بج رہے ہیں ۶ بجے تک رات شمار ہوتی ہے۔ ساڑھے تین اس رات کے اور اتنے ہی اگلی رات کے۔

خوب! — گویا رات کو مختصر کرتے کرتے آپ آدھے گھنٹے پر لے آئے، کاش یہ میری "شب ہجر" ہوتی۔

جی کیا کروں قانون یہی ہے کہ چھ بجے سے پہلے بیٹھنے والوں سے پوری رات کا محصول لیا جائے۔

اور قانون احساس سے عاری ہوتا ہے اور اس پر عمل کرانے والوں کی حیثیت مشین کی سی ہوتی ہے ——

اطمینان رکھئے میں کوئی احتجاج نہیں کر رہا ہوں البتہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ آنے والی رات کو بھی اتنا ہی چھوٹا کر دیجئے۔

کنڈکٹر صاحب ہنس رہے ہیں ان کی مونچھیں یوں ہل رہی ہیں جیسے دودھ پر تیرتا ہوا بالائی کا ٹکڑا پھونک مار دینے سے جنبش میں آگیا ہو۔

گاڑی چل پڑی ہے، ہیوی الیکٹریکلس اور ٹی ٹی نگر میں جھل مل کرتے بجلی کے قمقمے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں میں لیٹ گیا ہوں، نیچے کی برتھ پر پڑے ہوئے ایک سردار جی نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا ہے

کون سا اسٹیشن تھا؟

بھوپال

بھوپال تال ؟

جی ہاں !

سردار جی حیدرآباد ہی جا رہے ہیں ٹرین پوری رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ سویرے کا اجالا پھیلتا جا رہا ہے مجھے اٹارسی کا انتظار ہے۔ جی ٹی پہاڑی فضاؤں کو جھنجھوڑ کر انھیں بیدار کرتا جاگتا ہی جا رہا ہے وہ لمحات کے آبشار کی سی تیزی سے دوڑ رہا ہے پہلے ہوشنگ آباد آیا ہے اور پھر اٹارسی کا اسٹیشن آگیا ہے۔ سورج طلوع ہو چکا ہے، میں پلیٹ فارم پر آگیا ہوں۔ حکیم عبدالحمید صاحب، حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی اور حکیم اقبال صاحب ململ کے باریک کرتے پہنے ننگے سر کھڑے ہیں میں ان کے سامنے کشمیر کا باشندہ لگ رہا ہوں، گلے میں انگیٹھی تو نہیں ہے گر سوئٹر پر سیاہ گرم شیروانی پہن رکھی ہے۔ سب نے مجھ سے ہاتھ ملایا ہے۔ شرما جی کہہ رہے ہیں۔

میں نے تو بھوپال پر آپ کو تلاش کیا تھا۔

حکیم خلیل احمد صاحب نازیبی نورانی ڈاڑھی کے ساتھ موجود ہیں۔ کندھے پر رومال، منہ میں پان اور لہجہ میں کرارا پن، ایک نیا چہرہ بھی نظر آ رہا ہے ـــــ سفید مونچھیں، سیاہ رنگ اور بنیاؤں والا لباس، آپ ہیں حکیم محمد ابراہیم صاحب جے پوری۔ باتیں کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ بالو میں بھونی ہوئی مونگ پھلیاں چھیل رہے ہیں جن میں سے گرمی غائب ہے۔ آدمی بڑے ہنس مکھ ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ جب سے کانفرنسوں میں شرکت فرما رہے ہیں اس وقت سے ایک "حکیم جی" سالانہ جنت کو سدھار جاتے ہیں۔

دیکھیے اس مرتبہ کون بھینٹ چڑھتا ہے ؟

اقبال صاحب کہہ رہے ہیں۔

وہیں طے ہو گیا کہ کھانا ساتھ کھائیں گے، آملہ جنکشن پر میں ناشتہ دان لے کر فرسٹ کلاس میں چلا گیا ہوں اقبال صاحب اپنا کھانا گرم کرا چکے ہیں حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی کی ساری دلچسپی پاندان سے وابستہ ہے مگر انھوں نے ناشتہ دان کھول لیا ہے عارضی میز پہلے ہی بنالی گئی ہے ہم سب لوگ اس کے گرد بیٹھ گئے ہیں۔ حکیم عبدالحمید صاحب صبح کو صرف دودھ اور انڈا استعمال فرماتے ہیں، وہ دسترخوان پر تشریف نہیں لائے ہیں، اقبال صاحب نے خوش رنگ اور خوش ذائقہ مٹھائیوں سے بھرا ہوا ڈبہ بھی کھول کر منظر عام پر رکھ دیا ہے، فلسفی صاحب فرما رہے ہیں۔

کوثر صاحب کا ناشتہ بڑا سائنٹفک ہے سسٹم کو جن چیزوں کی ضرورت ہے، سب اس میں شامل ہیں آلو، انڈا اور ٹماٹر ہاتھ دھونے کے بعد فلسفی صاحب نے خالص لکھنوی انداز سے پان بنائے ہیں ـــــ ایسا لگ رہا ہے کہ ناسخ اپنی مرصع کاری کی تمام قوتوں کو سمیٹ کر غزل کہہ رہے ہیں جگہ جگہ الفاظ کے نگینے دمک رہے ہیں، پہلے فلسفی صاحب نے ایک بیڑا منہ میں رکھ کر چمچی سے کتھا چاٹ لیا ہے، پھر پان میری طرف بڑھایا ہے، غزل کا شعر زبان پر کوئی اثر نہیں کرتا مگر پان کی تاثیریں شعور تک پہنچ رہی ہیں اور یہ راز کھلتا جا رہا ہے کہ لوگ پان کیوں کھاتے ہیں، کئی گھنٹے کے بعد اگلے اسٹیشن پر ٹرین

رکی ہے اور میں اپنی بوگی میں آگیا ہوں، مناظر تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں موسمی کیفیات بھی متغیر ہو رہی ہیں ہوا کی خنکی پر گرمی غالب آگئی ہے، لیجیے سنتروں کا دیس ناگپور آگیا ہے پلیٹ فارم پر سنترے ہی سنترے دکھائی دے رہے ہیں، میں نے نئی کالونی کی سمت معلوم کی ہے، اک ساتھی نے بتایا ہے۔

ادھر ہے، بالکل قریب!

بیرا چائے لے آیا ہے، چائے پینے کے بعد ہی میں نے کھانے کا آرڈر دے دیا ہے، اگلے اسٹیشن پر اقبال صاحب آئے ہیں وہ کہہ رہے ہیں۔

حکیم صاحب نے فرمایا ہے کہ کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔ ناگپور کے احباب تازہ کھانا لے آئے ہیں — ساڑھے آٹھ بجے جہاں گاڑی رکے آپ آجائیں۔

میں آرڈر دے چکا ہوں۔

اسے کینسل کر دیجئے۔

نو بجتے ہی دور بجلی کی ان گنت آنکھیں چمکنے لگی ہیں اور ٹرین کی رفتار دھیمی ہونے لگی ہے اور پھر گاڑی ٹھہر گئی ہے —— بلہارشاہ آگیا ہے میں کھانے میں شریک ہونے فرسٹ کلاس میں چلا گیا ہوں، دسترخوان پر بریانی مرغ و ماہی غرض سب کچھ موجود ہے، بہت سے ابلے ہوئے انڈے ہیں، اس وقت حکیم عبدالحمید صاحب نے بھی شرکت کی ہے کھانے کے بعد مجھے ناگپور کا بہت بڑا شریفہ دیتے ہوئے اقبال صاحب نے کہا ہے۔

یہ آپ کا حصہ ہے!

شریفہ اتنا اچھا ہے کہ میں کھاتے کھاتے سوچنے لگا ہوں کہ جس شہر میں اتنے اچھے شریفے ہوتے ہیں اسے ناگپور کیوں کہا جاتا ہے۔ "شریف نگر" کیوں نہیں کہا جاتا۔

جی ٹی پھر روانہ ہوگیا ہے اور اب مجھے قاضی پیٹھ تک یہیں رہنا ہے۔ باتھ روم میں ہاتھ دھو کر میں بی این شرما کے کیبن میں چلا گیا ہوں، نار صاحب کا بستر بھی اسی کیبن میں ہے، اس لحاظ سے ان کے ساتھیوں کو "اصحاب النار" کہا جا سکتا ہے، نار صاحب سے کلام سنانے کو کہا گیا ہے اور وہ تحت اللفظ پڑھنے لگے ہیں۔

آپ گوپی ناتھ صاحب امن کے شاگرد ہیں؟ میں نے سوال کیا۔

مجھے نواب سراج الدین صاحب سائل سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

میں نے ایک انٹرویو میں پڑھا تھا کہ نار صاحب امن صاحب سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔

نار صاحب مسکرانے لگے ہیں اور اسی مسکراہٹ سے "نفی" کی تراوش ہو رہی ہے۔

قاضی پیٹھ آنے میں کئی گھنٹے لگ گئے، گیارہ بجے ٹرین قاضی پیٹھ پر ٹھہری ہے میں اپنے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا ہوں، یہاں حیدرآباد کی بوگی نے جی ٹی سے اپنا ناتہ توڑ لیا ہے اب اسے حیدرآباد جانے والی

گاڑی میں منسلک کیا جائے گا، جو صبح کسی وقت یہاں سے روانہ ہوگی۔ میں لیٹ گیا ہوں رات کو جس وقت آنکھ کھلی ہے میں نے اپنی بوگی کو چکر کاٹتے ہی دیکھا ہے۔ اس لائن سے اس لائن پر اور یہاں سے وہاں، وہ برابر گھومتی ہی رہی ہے۔ جس طرح خون رگوں میں دورہ کرتا رہتا ہے اسی طرح ہماری بوگی لوہے کی پٹریوں پر رقص کرتی رہی ہے، اور پھر نہ جانے کس وقت وہاں سے چل دی ہے۔ سوتے سوتے میری آنکھ کھلی ہے، اور تاریکی میں دیوالی مسکراتی محسوس ہو رہی ہے۔ بے شمار قمقمے دمک رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا کہ آسمان زمین کے بہت قریب آگیا ہے اور ستاروں کی تابانی میں اضافہ ہو گیا ہے۔

یہ سکندرآباد ہے، مسافر جلدی جلدی اترنے لگے ہیں، میرے ساتھی سردار جی مسکرا کر کہہ رہے ہیں۔

سری کل جناب!

میں نے بھی اسی طرح مسکرا کر کہا ہے۔

ست سری اکال!

ڈبہ تقریباً خالی ہو گیا ہے۔

کیا آپ نہیں اتریں گے؟ سردار جی نے سوال کیا۔

اور میں نے قلی کو آواز دی ہے اور جلد ہی پتہ چل گیا ہے کہ میری منزل مقصود یہ نہیں ہے۔ مجھے نامپلی اسٹیشن پر اترنا ہے۔ ٹرین شٹل کی طرح چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر رکتی جا رہی ہے میں نامپلی آتے آتے سو گیا ہوں اترنے میں ذرا دیر ہو گئی ہے۔ مجلس استقبالیہ کے ممبران اور رضاکار میری جستجو کر رہے ہیں میں نے دانستہ کسی سے اپنا تعارف نہیں کرایا ہے، سوچ رہا ہوں منتظمین نے سیمینار کا دعوت نامہ نہیں بھیجا ہے، بہتر ہے ہوٹل میں ٹھہروں اور ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں شریک ہو جاؤں۔ سیمینار کا جلوہ دور ہی سے دیکھتا رہوں، باہر آگیا ہوں اور سامان ٹیکسی میں رکھوا دیا ہے۔

کہاں لے چلوں؟ ڈرائیور پوچھ رہا ہے۔

ہوٹل! ——— کار چلنے لگی ہے فوراً خیال آیا ہے کہ یہ قدم بھی انفرادی نوعیت کا ہے، اس فیصلہ میں اجتماعی شعور کی روشنی نہیں ہے، مجھے چارمینار ہی چلنا چاہیے، میں نے ڈرائیور سے کہا ہے۔

ہوٹل نہیں، نظامیہ طبیہ کالج کے ہاسٹل لے چلو، چارمینار کے قریب!

ڈرائیور نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا ہے زبان سے کچھ کہا نہیں ہے شاید وہ سوچ رہا ہے کہ اب میں کسی اور مقام کا نام بتاؤں گا، ٹیکسی شہر کی حسین مگر خاموش سڑکوں پر مچھلی کی مانند تیر رہی ہے، ابھی شہری ہنگامے اچھی طرح بیدار نہیں ہوئے ہیں گزرگاہیں جیسے سو رہی ہیں۔

کہاں لیے جا رہے ہو؟ میں سوال کر رہا ہوں۔

چارمینار، آپ کہیں اور چلنا چاہتے ہیں۔

صب

نہیں چارمینار ہی چلو!

دور ایک بلند اور پُرشکوہ کمان نظر آرہی ہے اس کے چاروں کونوں پر چار خوبصورت مینار سیدھے کھڑے ہیں میں ان
روں کی سادگی، پُرکاری اور جاہ و جلال سے متاثر ہوا ہوں، طرزِ تعمیر مغل آرٹ سے مختلف ہے یہ قطب شاہی
ٹ ہے، لیکن جمال، رعنائی اور خوبصورتی تقسیم ہونے والی چیز نہیں، وہ آرٹ اور اس کی صناعوں سے بالکل اس طرح
لک رہی ہے گلاب کی کلی سبز غلاف کو چیر کر اہرانا چاہتی ہو، ٹیکسی نظامیہ طبیہ کالج کی شاندار عمارت کے احاطہ میں داخل ہوگئی
ے میں نے ہاسٹل کا پتہ پوچھا ہے، اور ایک صاحب میرے ساتھ ہو گئے ہیں ان کے سینہ پر بیج آویزاں ہے، سانولا
نگ، بھاری جسم، آنکھوں میں شکر گزاری، احسان مندی اور خلوص و شرافت کی چمک، اندازِ گفتگو نہایت دھیما اور میٹھا
ب انھیں پہچان نہیں سکا ہوں لیکن ان سے متاثر ضرور ہوا ہوں۔

میں تو اسٹیشن ہی سے آرہا ہوں، آپ کہیں نظر نہیں آئے۔

ہاسٹل کے دروازے پر ٹیکسی رک گئی ہے، رضاکاروں نے جلدی جلدی کھڑکیاں کھول کر سامان اتار لیا ہے، جو
صاحب میرے ساتھ آئے ہیں انھوں نے مجھے کرایہ ادا کرنے سے روک دیا ہے اور میٹر دیکھ کر ڈھائی روپے ڈرائیور کو
ے دیئے ہیں، سامان ہاسٹل کی بالائی منزل کے ایک ہوادار، کشادہ اور روشن کمرے میں پہنچا دیا گیا ہے جس کے چاروں
کونوں میں لوہے کے چار پلنگ بچھے ہوئے ہیں قریب ہی سائیڈ ٹیبل رکھی ہوئی ہے، آس پاس کمرے اور بھی ہیں لیکن
یہ سب سے بڑا ہے ایک پلنگ پر میرا بستر بچھا دیا گیا ہے، اسی وقت حکیم انیس احمد صاحب سپرنٹنڈنٹ نظامیہ طبیہ ہاسپٹل
تشریف لے آئے ہیں۔ ٹھگنا قد، چوکور سفید داڑھی، اسلامی لباس، میں نے اپنے آنے کی اطلاع انھیں کو دی تھی وہ
فرما رہے ہیں۔

میں نے اسٹیشن پر آپ کو دیکھا تھا۔

اور میں نے بھی آپ کو دیکھ لیا تھا۔

میں لوگوں سے پوچھ رہا تھا کوثر چاندپوری صاحب بھی آنے والے تھے وہ کہاں ہیں، آپ کا خط مجھے
مل گیا تھا۔

اور آپ کا دعوت نامہ مجھے نہیں ملا۔

معاف کیجئے اور لوگوں کو بھی یہ شکایت ہے، شاید روانگی کے بعد پہنچا ہو، میں تو آپ سے بھوپال میں بھی مل چکا ہوں
قاضی اعظم صاحب کے چھوٹے بھائی کے یہاں میری بڑی آپ کے زیر علاج تھی۔

اب میں نے انیس احمد صاحب کو پہچان لیا ہے۔

ناشتہ یہیں کرایا جائے گا ذرا دیر بعد حکیم قادری مدراس سے آگئے ہیں چھوٹے قد و قامت اور دوہرے بدن کے
آدمی ہیں رنگ سانولا ... ہلکی اور سفاکی کلرقرار دیتا ہوں، قادری صاحب نیلا سوٹ زیب تن

کیجے میں انگریزی بڑی روانی سے اور اردو مدراسی لب ولہجہ میں بولتے ہیں ان سے دیر تک بات چیت ہوئی ہے اور انھوں نے میرے ہی کمرے میں ٹھہرنے پر اصرار کیا ہے ذرا دیر بعد حکیم منموہن سنگھ اور حکیم پرانکشن داس صاحب آگئے ہیں ان کے سینوں پر بھی بیج آویزاں ہیں۔ منموہن سنگھ صاحب نے قادری صاحب سے پوچھا ہے۔

آپ نے اطلاع نہیں دی؟

قادری صاحب کہہ رہے ہیں۔

میں نے تار دیا ہے حضرت!

قادری صاحب اس جواب طلبی پر ناگواری محسوس کر رہے ہیں۔ اور ذرا تلخ گفتگو ہوگئی ہے، وہ جانے پر آمادہ ہوگئے ہیں میں ان سے کہہ رہا ہوں۔

قادری صاحب آپ اپنے آپ کو مہمان نہ سمجھیے آپ کی حیثیت میزبان کی بھی ہے ہمارے سامنے جو مقصد ہے اس کا احترام ہم سب کو اسی طرح کرنا ہے۔

قادری صاحب بڑے سنجیدہ اور اصول پرست معلوم ہوتے ہیں وہ مطمئن ہوگئے ہیں اور میزبان حضرات نے بھی معذرت کرلی ہے۔ اب ناشتہ کی تیاری ہونے لگی ہے حکیم خلیفۃ اللہ اور حکیم محمود پاشاہ بھی مدراس ہی سے آئے دونوں نوجوان اسلامی وضع کے آدمی ہیں، خلیفۃ اللہ بڑے قد آور تندرست ہیں ان پر TALL AND HANDSOME کی تعریف قطعی صادق آتی ہے۔ ڈاڑھی رکھتے ہیں جو ان کے چہرے پر بہت کھلتی ہے میں سوچ رہا ہوں جس طرح پیش لفٹیننٹ حسین خاں کے لیے بنا تھا ڈاڑھی بطور خاص خلیفۃ اللہ کے لیے بنی ہے سوٹ پہنتے ہیں پھر بھی قرن اول کے مسلمان معلوم دیتے ہیں، حکیم محمود شاہ ان سے کم عمر ہیں لیکن ڈاڑھی ان کے بھی ہے، یہ لمبے اور پتلے دبلے آدمی ہیں۔ نچلی منزل میں شہ نشینوں پر چن دیا گیا ہے منتظمین بڑی سرگرمی سے کام کر رہے ہیں، جلیل صاحب بھی اس جماعت میں شامل ہیں، یہ ہم سید احمد صاحب مرحوم کے عزیز ہیں جو میرے بڑے اچھے ساتھی اور دوست تھے جلیل صاحب نے اسی رشتے سے تعارف کرایا ہے وہ بار بار مہمانوں کو لینے اسٹیشن جا رہے ہیں، میں نے انھیں ٹکٹ کے روپے دے کر برتھ ریزرو کرانے کو کہا ہے ساتھ ہی عمدہ قسم کی چائے مہیا کرنے کی فرمائش کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔

ناشتے سے مجھے زیادہ دلچسپی نہیں بس چائے اچھی مل جانی چاہیے۔

وہ کہہ رہے ہیں

چائے میں خود بنا کر لا رہا ہوں۔

قادری صاحب میرے ہم نوا ہیں، وہ بھی چائے کو "جوانان صالح" کی شراب سمجھتے ہیں، اسی عرصہ میں حکیم ہیم صاحب بھی اپنا بستر لے کر یہیں آگئے ہیں وہ کہہ رہے ہیں۔

حکیم عبدالحمید صاحب ادھر سینٹ ہوٹل میں ٹھہرے ہیں وہاں آپ کے لیے بھی ایک کمرہ تھا مگر آپ غائب ہوگئے۔

آپ کو ہاسٹل ہی میں ٹھیرنا چاہیئے ایک صاحب کہہ رہے ہیں کہ اخبارات میں آپ کی نیوز آچکی ہے پتہ ہاسٹل ہی کا لکھا ہوا ہے۔

افتتاحی اجلاس شام کو ہونا ہے، ظہرانہ کا وقت دو بجے ہے میں اس وقت کو کارآمد بنانا چاہتا ہوں اسی لیے ناشتہ کرتے ہی "صبا" اور "قلمکار" کے دفتر کو جانے کے لیے تیار ہوگیا ہوں۔ قادری صاحب، خلیفۃ اللہ صاحب اور ابراہیم صاحب بھی ساتھ ہیں قادری صاحب پہلے رہنمائے دکن کے دفتر میں لے گئے ہیں اور ایڈیٹر صاحب سے ملایا ہے جوان کے عزیز ہیں انھوں نے چائے پلائی ہے، گیارہ بج چکے ہیں اور اریب صاحب سے ملنے کا وقت ہوگیا ہے ہم لوگ ٹیکسی میں معظم جاہی مارکٹ جانے کے لیے چل پڑے ہیں اور ایک چوراستہ پر اتر گئے ہیں یہاں سے مجرد گاہ زیادہ دور نہیں ہے دس بیس قدم چلنے کے بعد ہی ایک شاندار عمارت نظر آئی ہے بتایا گیا ہے کہ یہی مجرد گاہ ہے، ہم زینہ طے کرکے اوپر گئے ہیں اور بورڈ پڑھ کر اندر چلے گئے ہیں اریب صاحب سامنے ہی بیٹھے ہیں بڑے تپاک سے مل رہے ہیں میں نے ابراہیم صاحب وغیرہ کا تعارف کرایا ہے خصوصیات بھی سب بیان کردی ہیں بہت سی باتیں ہوئی ہیں میں نے اریب صاحب کو حامد بھوپالی مرحوم کا انتخاب کلام دیا ہے یہ میرے مقالہ کے ساتھ چھپے گا اسی میں اختر سعید کی تازہ غزل ہے چاہتا ہوں یہ غزل اسی بزم میں چھپے تاکہ اندازہ ہو کہ بھوپال کے اس ادبی گھرانے کی روایت میں کتنا عصری شعور شامل ہوا ہے اور اس میں وقت اور سماج کا ساتھ دینے کی کس قدر توانائی پیدا ہوئی ہے۔ یہاں سے قلم کار کے آفس میں جانا ہے۔ ابراہیم صاحب اپنے کسی مشہور[1] دوست کا پتہ پوچھ کر کہہ رہے ہیں کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، اریب صاحب نے شاعرانہ اور دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا ہے۔

آپ ان سے نہیں مل سکتے!

کیوں ——؟

ان کا انتقال ہوچکا ہے!

میں نے اور خود ابراہیم صاحب نے قہقہہ لگایا ہے۔ اب ابراہیم صاحب کو بھی اپنی پوزیشن پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ چوراہے سے ٹیکسی لے کر ہم مہندی محبوب کے لیے چل پڑے ہیں ذرا دیر اسی نام پر گفتگو ہوئی ہے جس میں شعریت بھی ہے اور رومانیت بھی! سید غفار ٹیکسی ڈرائیور کہہ رہا ہے یہاں گانے بجانے والے لوگ رہتے ہیں، پھر وہ بڑے خاص انداز میں کہہ رہا ہے۔

سب پیسے کے کھیل ہیں!

ذرا آگے چل کر قلمکار کا پتہ پوچھا ہے ذرا سی تلاش کے بعد دفتر مل گیا ہے جہاں تیموری صاحب ایک ہندو نوجوان دوست کے ساتھ مصروف گفتگو ہیں، اپنے سامنے چند اجنبی آدمیوں کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے ہیں اور حیرت و استعجاب سے ہمیں دیکھ رہے ہیں میں کہہ رہا ہوں۔

---

[1] ڈاکٹر غلام یزدانی مرحوم

میں کوثر چاند پوری ہوں!
بڑی گرمجوشی سے ملے ہیں اور معذرت کرنے کے باوجود چائے منگالی ہے، بسکٹ اور کیک بھی ہیں ہم نے صرف چائے پی ہے۔ محترمہ احدی بیگم کسی سہیلی سے ملنے گئی ہیں۔ میں تیموری صاحب سے کہہ رہا ہوں۔
آئیں تو میرا سلام کہہ دیجیے۔

اسی ٹیکسی میں نظامیہ ہاسٹل آگئے ہیں اور حکیم سید شبلی صاحب ندوی کی رہنمائی میں ہاسٹل کے مختلف شعبے دیکھنے شروع کردیے ہیں۔ کالج اور ہاسٹل کی عمارت باہر سے جس قدر شاندار اور پرشکوہ معلوم ہوتی ہے اندر سے بھی اسی قدر حیرت انگیز ہے اور طب قدیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بعض ان تاریخی خصوصیات کی حامل ہے جو بغداد اور مصر کے شفاخانوں میں پائی جاتی تھیں ان دواخانوں کا ایک ہلکا سا عکس یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ بیماروں کے لیے آٹھ وارڈ ہیں۔ ان میں کل ۱۵۰ بستروں کی گنجائش ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱	مردانہ وارڈ	۱	۴۰	پلنگ	کا
۲	زنانہ وارڈ	۱	۳۰	″	″
۳	بچوں کا وارڈ	۱	۱۷	″	″
۴	زچگی وارڈ	۱	۴۰	″	″
۵	سرجیکل وارڈ	۱	۱۰	″	″
۶	ریسرچ وارڈ مردانہ	۱	۱۰	″	″
۷	ریسرچ وارڈ زنانہ	۱	۱۰	″	″

ہر وارڈ میں ایک گزیٹیڈ اور ایک نان گزیٹیڈ مددگار تعینات ہے ایک ہنگم شفاخانہ ہے ایک آر۔ ام۔ او ہے ایک ریسرچ آفیسر ہے جو اپنے تین مددگاروں کے ساتھ تحقیقاتی کاموں میں مصروف رہتا ہے، شعبۂ بیرونی میں امراض چشم، امراض دندان، امراض جراحت، دیسی طریقۂ جراحی اور فیملی پلاننگ کے شعبے قائم ہیں اس شعبہ میں ۴ گزیٹیڈ اور ۵ نان گزیٹیڈ طبیب متعین ہیں جو روزانہ آنے والے مریضوں کا علاج کرتے ہیں ہر وارڈ میں لوہے کے پلنگ نہایت قرینے سے بچھے ہوئے ہیں۔ ان پر سفید بستر ہیں، بستروں پر مختلف عمر اور رنگ کے بیمار لیٹے ہوئے ہیں کوئی کھانس رہا ہے، کوئی کراہ رہا ہے کسی کے چہرے پر افسردگی ہے، کسی کی آنکھوں میں مسرت اور بشاشت کی چمک ہے ہر پلنگ کے قریب سائیڈ ٹیبل ہے جس پر ضروری چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ مریضوں کو مقررہ اوقات پر معالج کی تجویز کی ہوئی دوائیں بڑی باقاعدگی سے پلائی جاتی ہیں غذا کا بھی انتظام ہے۔ بیماروں کے ساتھ متعلقہ اشخاص کا طرز عمل ہمدردانہ ہے وہ صرف کارگزاری کی مشین نہیں ہیں بلکہ انسانی احساس بھی رکھتے ہیں، دواؤں کے شعبہ میں ایک بڑی میز پر تانبہ کے صاف ستھرے پیالے برابر برابر رکھے ہیں ہر پیالے پر مریض کے نام کی چٹ ہے ان میں وہ دوائیں بھیگی ہوئی ہیں جو وقت آنے پر

مریضوں کو پلائی جائیں گی۔ میں سوچ رہا ہوں تغلق اور اکبر و جہانگیر کے عہد حکومت میں بھی دیسی دوا خانوں کا یہی نقشہ ہوگا اور ممکن ہے بغداد کے بیمارستان کی طرح یہاں بھی قیام و طعام کی سہولتوں کے پیش نظر کچھ مصنوعی بیمار داخل ہو جاتے ہوں کاش اپنی حکومت میں کوئی وقت ایسا بھی آئے جب ان کمزور اور غریب روگیوں کو جوزوں کا آب جوش اور پھلوں کا رس پینے کو دیا جائے، ہاسپٹل کا ایک حصہ ویدک برانچ کو دے دیا گیا ہے اور اس قطع و برید سے عوام کو بڑی زحمت ہوئی ہے فن کا نقشہ بھی بگڑ گیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ غلط اور بے ڈھنگا عمل جراحی کیوں کیا گیا ہے اور موجودہ دور میں جب پلاسٹک سرجری کے حیرت ناک کارناموں سے انسانی چہروں میں خوبصورتی اور کشش پیدا کی جا رہی ہے طب قدیم کی حسین زلفوں کو کاٹ کر اسے بدشکل کیوں بنا دیا گیا ہے کیا حکومت کے ذرائع اتنے محدود ہیں کہ ویدک کے لیے وہ اس سے بڑی اور بہتر عمارت نہیں دے سکتی موجودہ حالات میں اب لگتا ہے جیسے کسی خوبصورت مجسمے کا ایک ہاتھ توڑ دیا ہو حالانکہ سالار جنگ میوزیم میں مجسمے محفوظ کرنے کا تصور پیش کیا گیا ہے ویدک ملک کا بہت قدیم طریقۂ علاج ہے اس کا احترام اور تحفظ نہایت ضروری ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ایک دوسری سائنس کو نقصان پہنچا کر اس کے لیے زندگی کی نفی بنائی جائے، تقسیم کا یہ اصول کسی طرح قابل تعریف نہیں قرار دیا جا سکتا، اس سے سیکولر گورنمنٹ کا کردار مشتبہ ہوتا ہے اور دو طبی علوم میں رقابت کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔ میں حکومت کی فرزانگی اور دانشمندی سے توقع کرتا ہوں کہ وہ نظامیہ طبیہ کالج اور ہاسپٹل کی عمارت کو جلد سے جلد طب یونانی کے حق میں واگزاشت کر دے گی اور ویدک کے لیے کسی اور شاندار بلڈنگ کا انتظام کر دیا جائے گا یہ امید ویدک کی بداندیشی پر نہیں بلکہ اس کی اور طب یونانی کی خیر خواہی پر مبنی ہے اسی عمارت میں طبیہ کالج کا وہ حصہ ہے جہاں الگ الگ مختلف درجات (کلاسیز) میں طب قدیم کی تعلیم دی جاتی ہے پڑھنے والوں کی تعداد داخلے بند ہونے سے قبل ۱۵۰ تھی اور اب ۵۹ ہے جن میں ۴۰ لڑکیاں اور ۱۹ لڑکے ہیں پرنسپل حکیم محمد یوسف حسین خاں ہیں جو دہلی طبیہ کالج کے سند یافتہ ہیں اور جدید و قدیم سائنس میں عمدہ دستگاہ رکھتے ہیں وہ اپنے ہمدردانہ رویے اور انتظامی قابلیت نیز حسن اخلاق کی بنا پر کافی مقبول اور ہردلعزیز ہیں۔ پرنسپل کے علاوہ ۱۳ لیکچرر ہیں جن میں ۴ گزیٹیڈ ۳ پارٹ ٹائم اور باقی نان گزیٹیڈ ہیں ۔ شفاخانہ کے اطبا بھی تعلیم میں حصہ لیتے ہیں۔ ابھی ایک ہونہار اور نوجوان طبیب حکیم نذیر احمد بی۔ ایس۔ سی بحیثیت لکچرار باہر سے تبدیل ہو کر آئے ہیں یہ ایک مشہور طبی خاندان کے چشم و چراغ اور نہایت قابل حکیم کے فرزند ہیں۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا ہوں کہ حکومت نے داخلے بند کر کے کالج کے نظام تعلیم کو معطل کر دیا ہے بات صرف اتنی ہے کہ شدھ اور اشدھ کے نقطۂ نظر سے ابھی کوئی نظام تعلیم مرتب نہیں ہوا، کس قدر حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ آزادی کے اس دور میں بھی جب انگریزیت کا جنون سروں سے نکل گیا ہے یہ ناقص اور تخریبی طرز فکر کارفرما ہے، اتنی سی بات پر ایک ایسے علمی آبشار کو بند کر دیا گیا ہے جو پورے ملک کو سیراب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں اگر حیدرآباد کے واٹر ورکس میں کوئی ایسی خرابی آ جائے جس کی بنا پر پانی صاف نہ ہو سکے تو کیا آب رسانی کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے گا اور اس طرح شہر کی اتنی بڑی آبادی کو پیاس سے تڑپا کر حیدرآباد کو ریگ زار کربلا میں تبدیل کر دیا جائے گا

یقیناً یہ عمل حماقت کے مترادف ہوگا۔ ہندوستان میں اور کالج بھی نہیں وہاں جو نصاب تعلیم رائج ہے کیا وہ حیدرآباد میں نہیں پڑھایا جاسکتا، طبیہ کالج کا معطل ہوجانا حکومت آندھرا پردیش کے دامن عقل و خرد پر ایسا دھبہ ہے کہ جلد اسے صاف نہ کیا گیا تو اس کی سیاہی حکومت کے خوبصورت چہرے کو بھی بدنما کر دے گی۔ جراحی کا شعبہ نہایت مکمل ہے اس میں سرجری کے ضروری آلات فراہم کیے گئے ہیں سرجری جدید اصول پر ہوتی ہے نظامیہ ہاسپٹل اپنے مختلف شعبوں پر مشتمل ایک ایسا طلسم ہوشربا ہے جس میں داخل ہوتے ہی میں بالکل کھو گیا ہوں۔ ہندوستان میں اس کا کوئی اور نظیر نہیں۔ بھوپال کا محکمہ طبابت بھی کبھی بہت وسیع تھا مگر یہ انتظامات وہاں بھی نہ تھے اور اب تو یہ محکمہ ختم ہوتے ہوتے اتنا مختصر ہوگیا ہے کہ اسے دیکھنے کے لیے خوردبین کی ضرورت ہوتی ہے نظامیہ طبیہ کالج اور ہاسپٹل ملک کی وہ زندہ روایت ہے جس نے عصری کردار سے مطابقت پیدا کرلی ہے اور اس طرح وہ وقت اور سماج کے تقاضوں سے قطعی ہم آہنگ ہوچکی ہے اس کو زندہ رکھنا اور پوری آب و تاب، حسن و رعنائی، شان و شوکت اور جلال و جمال کے ساتھ زندہ رکھنا حکومت کا نہایت خوشگوار فرض ہے یہ ادارہ ملک کی تہذیب اور ثقافت کے رخسار کا وہ تل ہے جس پر سمرقند و بخارا کو نہ سہی تو تنگ نظری، کوتاہ بینی اور تنگ ظرفی کو ضرور نثار کر دینا چاہیے۔ حکیم شبلی صاحب بڑی سنجیدگی اور آہستہ کلامی کے ساتھ ہر شعبہ کے متعلق تفصیلات بتاتے جا رہے ہیں اور میں کہہ رہا ہوں کہ ابھی سیری نہیں ہوئی ایک مرتبہ اور علم و عمل اور عقل و دانش، دردمندی و فرض شناسی کی اس وسیع کائنات کی سیر کروں گا ضروری باتیں نوٹ کرتا جاؤں گا۔ اب گھڑی دیکھ کر شبلی صاحب فرما رہے ہیں۔

ظہرانہ کا وقت ہوگیا۔

منظر اتنا دلچسپ اور زندگی خیز ہے کہ "نظارگی"۔

شبلی صاحب کے اس جملہ کو اپنی محویت نظارہ پر ایک ضرب شدید خیال کر رہا ہے —— مگر حقیقت جذبات ہمیشہ اسی صدمہ کے ساتھ ٹکراتی رہی ہے۔ بہرحال وقت بہت تیز گام تھا ذرا سی دیر میں بہہ کر کہیں سے کہیں لیا۔ یہاں سے ہم لوگ سیدھے حکیم نظام الدین صاحب کے دولت خانے پر پہنچ گئے ہیں جو ہماری قیام گاہ کے بہت قریب۔ حکیم صاحب دروازے پر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں سب سے دو قدم آگے بڑھ کر ہاتھ ملا رہے ہیں اندر چلا گیا ہوں جہاں حکیم عبدالحمید صاحب اور ان کے تمام ساتھی موجود ہیں میں بڑے جذباتی انداز میں نظامیہ کالج کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں۔

شرما جی بڑی شاندار جگہ ہے ضرورت ہے کہ ایک شعبہ پر تعارفی نوٹ لکھ کر ملک کے عوام سے اس کو روشناس یا جائے۔ ساتھ ہی حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ کالج اور ہاسپٹل سے گہری دلچسپی لے۔

"ڈھائی ہزار مریض روزانہ آتے ہیں حکومت چاہے تو اسی ہاسپٹل کی طاقت سے رائے عامہ کو جیت سکتی ہے۔

شرما جی پگڑی باندھے بیٹھے ہیں اور مسکرا کر نہ جانے میری تائید کر رہے ہیں یا تردید، ظہرانہ بہت ہی پرتکلف ہے

نشست کا انتظام فرش پر ہے جگہ جگہ تختوں پر کھانے چُنے ہوئے ہیں اور مہمان ان کے گرد بیٹھ گئے ہیں کھانے کی متعدد اقسام نظام الدین صاحب ہی کی جدتِ طبع کا نتیجہ حسین ہیں جس کی لذت و حلاوت میں بڑا حکیمانہ تناسب ہے میٹھی چٹنی تو باقوتی پر طنز کر رہی ہے اور بریانی تو قطعی عہد مغلیہ کی چیز ہے، شرما جی الگ نباتی اشیائے سے شغل فرما رہے ہیں اور اس طرح میزبان کا گھر سیکولر اسٹیٹ کا نمونہ بن گیا ہے یہ روایت آئندہ دعوتوں میں بھی قائم رہی ہے میں ہاسٹل آ گیا ہوں اور گھنٹہ بھر کے بعد ہی حکیم پرانکش داس آ گئے ہیں ان کے ساتھ عصرانہ میں جانا ہے جس کا انتظام نظامیہ ہاسٹل ہی کے کسی حصہ میں ہے، پرانکش داس صاحب بھاری بھرکم شخصیت کے مالک ہیں ان کے سیاہ رنگ میں انسانیت اور خلوص کی چمک ہے، انھوں نے حکیم مہدی ممتاز صاحب کے تعاون سے مہمانوں کی اتنی تواضع اور دیکھ بھال کی ہے کہ اتنی ہی دیر میں ہم سب ان کی فرض شناسی اور فن کے ساتھ وفاداری کے قائل ہو گئے ہیں، ہر ناشتہ، ظہرانہ اور عشائیہ سے پندرہ منٹ پہلے وہ موٹر لیے موجود رہے ہیں اپنے اسکوٹر پر بھی جلد جلد چکر لگاتے ہیں، عصرانہ پر میں نے صرف چائے ہی پی ہے، پھر پنڈال کی طرف آیا ہوں، جو نظامیہ کالج کی عمارت کے صحن میں نہایت اہتمام کے ساتھ تیار کیا گیا ہے چاروں طرف جھنڈیاں لہرا رہی ہیں جگہ جگہ قمقمے آویزاں ہیں قریب ہی نباتات کا چھوٹا سا باغ ہے۔ پنڈال اور اس باغ کے درمیان کالج کی طالبات اور طبیبات کا ہجوم ہے معلوم ہوا ہے، سو طبیبات ہیں ان میں سے بعض بی اے ہیں اور میٹرک تو سب ہیں، خواتین کی اتنی بڑی جماعت کو اپنی جانب متوجہ کر لینا نظامیہ طبیہ کالج کا ایک تعلیمی اعجاز ہے۔ حکیم پرانکش داس اور حکیم مہدی ممتاز نے ان سب سے میرا تعارف کرایا ہے سید شبہہ حیدر صدر بزم طلبا بھی ساتھ ہیں اکثر نے میرا نام سنتے ہی کہا ہے۔

اچھا کرشن صاحب! آپ سے ہم واقف ہیں!

نیلی ساری میں ملبوس ایک خاتون سامنے آ کر کہہ رہی ہیں۔

میں آپ کے افسانے بہت شوق سے پڑھتی ہوں، اور یہ وہ اپنی ایک کشیدہ قامت سہیلی کی جانب اشارہ کر کے کہہ رہی ہیں آپ کی کہانیوں کے کٹنگس بڑی حفاظت سے رکھتی ہیں۔

آپ کی تعریف؟

مس سروج استھانہ، آپ بھی طبیبہ ہیں۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کو اردو سے اتنی دلچسپی ہے!

جی میں کائستھ ہوں۔

پھر آپ کی زبان دانی میں کسے کلام ہو سکتا ہے کائستھ حضرات تو فارسی میں بھی ہمارے استاد ہیں انھوں نے سکندر لودھی کے زمانہ میں فارسی سیکھی اور جلد ہی اس میں اہل زبان کی سی مہارت پیدا کر لی۔

مس سروج استھانہ رائے رامچندر استھانہ اسپیشل آفیسر انڈین میڈیسن ڈپارٹمنٹ کی صاحبزادی ہیں انھوں نے

نظامیہ طبیہ کالج کے علاوہ علیگڑھ طبیہ کالج میں بھی تعلیم پائی ہے، اور پھر نیلی ساری والی خاتون نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا ہے۔

میرا نام بلقیس جہاں نادری ہے۔ میں حکیم شبیہ احمد کی بیٹی ہوں وہ آپ کے دوست تھے نا!

بہت عزیز دوست" اور آپ کے شوہر کہاں ہیں وہ ابھی آپ سے ملیں گے، ان کا نام نذیر احمد ہے۔

میں شبیہ صاحب کے ساتھ برہان پور میں انھیں دیکھ چکا ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ حیدرآباد کے لوگ طب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں جب ہی وہ اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلا کر طبیہ کالج میں داخل کرتے ہیں۔

یہیں کچھ طالبات اور بعض نوجوانوں نے آٹوگراف لیے ہیں، میں شعر نہیں شعریت آمیز جملے لکھ رہا ہوں۔

افتتاحی اجلاس کا وقت قریب آرہا ہے، لیجیے اب فضیلت مآب جنرل شری نگیش گورنر آندھرا پردیش تشریف لا رہے ہیں۔ استقبالیہ صاحب نے ان کا استقبال کیا ہے، پھر سلامی ہوئی ہے، صدر آل انڈیا طبی کانفرنس کا گورنر صاحب سے تعارف ہوا ہے اور اب گلپوشی کی جا رہی ہے، گورنر صاحب کو جلوس کے ساتھ شہ نشین تک لایا گیا ہے حاضرین پہلے ہی سے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں ایک طرف مردوں کے لیے کرسیاں بچھائی گئی ہیں، دوسری جانب عورتوں کے لیے درمیان میں ایک پتلی سی گزرگاہ ہے نشستیں پُر ہو چکی ہیں۔ کارروائی کا آغاز وندے ماترم سے ہو رہا ہے۔ بلقیس جہاں نادری — کو پکارا گیا ہے اور انھوں نے نہایت عمدہ طرز میں وندے ماترم گایا ہے، سب کھڑے ہو کر نہایت خاموشی اور ادب سے سن رہے ہیں، پھر حکیم سید عبدالصمد صاحب آر۔ ایم۔ او نے نہایت خوش الحانی سے جس میں شعریت کم اور "مناجیت" زیادہ ہے ایک نظم پڑھ کر خیر مقدم کیا ہے۔ سپاس نامہ حکیم پرانکش داس صاحب صدر استقبالیہ پڑھ رہے ہیں۔ وہ جس خوبصورت انداز سے اردو الفاظ ادا کر رہے ہیں اس سے ثابت ہو رہا ہے کہ اردو کی جڑیں دلوں میں بہت گہری ہیں اس نے ایک عوامی اور جمہوری زبان کی حیثیت سے عوام میں اتنی مقبولیت حاصل کی ہے کہ مادری زبان کا درجہ پالیا ہے۔ پھر پیغامات سُنائے گئے ہیں، پنڈت جواہر لال نہرو کا پیغام بھی پڑھا گیا ہے اور اب ڈاکٹر ملکوٹے انگریزی زبان میں حاضرین سے خطاب کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر ملکوٹے قدیم اور جدید طبوں کے متعلق وسیع معلومات رکھتے ہیں، ان کے مائک سے ہٹتے ہی بی این شرما جنرل سکریٹری تقریر کرنے لگے ہیں۔ شرما جی طبی سیاسیات کی "مکمل انسائیکلوپیڈیا" ہیں انھوں نے نہایت موثر اور برجستہ تقریر کی ہے۔ آخر میں وہ پورے وثوق سے کہہ رہے ہیں کہ میں نظامیہ طبیہ کالج کا وہ حصہ واپس لوں گا جو چھین کر ویدک کے حوالے کر دیا گیا ہے، اس پر پُرزور چیئرز دیے جا رہے ہیں۔ اس خطاب کی گونج ابھی فضا میں باقی ہے کہ رپورٹ پڑھی جانے لگی ہے حکیم انیس احمد صاحب رپورٹ پڑھ رہے ہیں جو قیمتی معلومات پر مشتمل ہے اور اب گورنر صاحب مائک پر آگئے ہیں وہ انگریزی میں فرما رہے ہیں کہ دیسی معالجوں کو بیماریوں کی تشخیص کے لیے جدید سائنٹفک طریقے استعمال کرنے چاہئیں، گورنر صاحب جانے لگے ہیں ان کے پاس وقت کم ہے، حکیم حاجی عبدالحمید صاحب نہایت متوازن اور سنجیدہ لہجہ

میں خطبۂ صدارت ارشاد فرما رہے ہیں آواز بڑی میٹھی اور معتدل ہے ایک ہی اشتیاق کے ساتھ اسے جذب کرکے اتنی دور بیٹھے ہوئے سامعین تک پہنچا رہا ہے حکیم صاحب بڑی دانشوری سے مائک کا استعمال کر رہے ہیں خطبہ میں وقت کے اہم اور ضروری مسائل کا نہایت فنکاری اور چابکدستی سے احاطہ کیا گیا ہے اسے بڑے غور اور توجہ سے سنا جا رہا ہے۔ خطبہ ختم ہوتے ہی حکیم عزیز احمد مجددی شکریہ ادا کر رہے ہیں اور پھر مس سروج استھانہ اور بلقیس جہاں نادری نے قومی ترانہ گایا ہے اور ترانے کی روح پرور اور میٹھی تانوں پر پہلا اجلاس ختم ہو رہا ہے حاضرین برقی روشنی سے جگمگاتی فضائیں مسکراہٹیں بکھیرتے اور کارروائی پر تنقید کرتے ہوئے اپنی نشستیں چھوڑ چکے ہیں، انسانوں کا ہجوم سیلاب کی مانند دروازے کی سمت بڑھ رہا ہے اسی وقت حکیم تیموری ملے ہیں سید مہدی حسین بھی ہیں جو قلمکار کی مجلس مشاورت کے رکن ہیں لمبے تڑنگے خاموش انسان ہیں مہدی صاحب غزل بھی بہت اچھی کہتے ہیں ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ہر وقت لرزاں رہتی ہے — قادری صاحب، خلیفۃ اللہ صاحب اور ابراہیم صاحب بھی آگئے ہیں عشائیہ کا وقت ہو رہا ہے کارڈ حکیم دلاور علی جنرل سکریٹری یونانی طبی سمینار کی طرف سے پہلے ہی تقسیم ہو چکے ہیں وہ میزبان ہیں سمینار کے نمائندہ ہیں ہمیں دور نہیں جانا نظامیہ جنرل ہاسپٹل ہی میں کھانے کا بندوبست کیا گیا ہے عشائیہ نہایت شاندار ہے میں اس میدان کا باب نبرد نہیں ہوں، کھانے سے زیادہ کھانوں کی بھینی بھینی خوشبو سے لطف اندوز ہو رہا ہوں، کھانے سے فارغ ہوتے ہی شری استھانہ صاحب کے آفس میں چلے گئے ہیں، استھانہ صاحب سرو قامت انسان ہیں ان کے نقوش نہایت روشن ہیں انداز گفتگو میں سنجیدگی کے ساتھ دلکشی بھی ہے۔

شام کو حکیم محمد مختار صاحب اصلاحی ایڈیٹر مسیحا بمبئی سے آگئے ہیں اور میرے کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں ٹھہرے ہیں بڑے سرگرم اور مخلص ہیں طبی تحریکات میں مجاہدانہ حصہ لیتے ہیں۔

۷ نومبر کو جلد ہی بیدار ہوا ہوں ساتھی نماز پڑھ رہے ہیں میں نے بھی ان کی تقلید کی ہے، ناشتہ حکیم منموہن سنگھ کے یہاں کرنا ہے ۹½ بجے نمائش کا افتتاح ہوگا اوقات کی سختی سے پابندی ہو رہی ہے حکیم پرانکش داس اور حکیم مہدی ممتاز سات بجے سے قبل ہی آگئے ہیں دونوں کی آنکھوں سے بیداری کے آثار نمایاں ہیں ہم لوگ جلدی جلدی تیار ہو رہے ہیں موٹریں ہاسٹل کے بیرونی صحن میں کھڑی ہوئی ہیں منموہن سنگھ صاحب کا مکان ذرا فاصلے پر ہے صبح کی ہلکی اور خوشگوار خنکی میں میری گاڑی سڑکوں کے خوبصورت پیچ و خم طے کرتی تیزی سے دوڑ رہی ہے میں دو جانب کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا ہوں عابد روڈ سے بھی گزرا ہوں اور باغ عام کے قریب سے بھی، تقریباً بیس منٹ میں منزل مقصود پر پہنچا ہوں مکان بڑی پرفضا جگہ سڑک کے کنارے ہی واقع ہے کرسیاں بھری ہوئی ہیں اور ناشتہ میزوں پر چنا ہوا ہے ہر قسم کے پھل اور مختلف اقسام کی مٹھائیاں کثرت سے موجود ہیں، ایک جانب چائے کی پیالیاں ہیں حکیم صاحب کی صاحبزادیاں چائے بنا رہی ہیں اور جو حضرات ناشتہ سے زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے وہ چائے پینے لگے ہیں، ذرا عجلت سے کام لیا جا رہا ہے وہاں سے نظامیہ کالج آگئے ہیں، نمائش کا کمرہ بند ہے، شری استھانہ نے رسم افتتاح ادا کی ہے، اندر دیواروں پر تصاویر آویزاں

ہیں میزوں پر جڑی بوٹیاں اور سرجری سے متعلق بہت سی چیزیں رکھی ہوئی ہیں، ہر میز کے سامنے ایک ایسا ماہر طبیب ڈاکٹر یا طبیبہ موجود ہے جو نمائشی اشیا کے متعلق جملہ تفصیلات بیان کرتا جا رہا ہے میں نے تصاویر کی تاریخی اہمیت اور اسناد کے متعلق سوالات کیے ہیں ادبی ذوق رکھنے والے طلبا اور طالبات نے اپنی اپنی آٹوگراف بکس میری طرف بڑھانی شروع کر دی ہیں اور میں ایک ایک جملہ لکھ کر دستخط کرتا جا رہا ہوں۔ ایک خاتون نے شعر لکھنے کا مطالبہ کیا ہے میں نے غالب کا شعر لکھ دیا ہے، اسی وقت اطلاع ملی ہے کہ آپ کا فون آیا ہے میں فون پر پہنچا ہوں اور ریسیور ہاتھ میں لے کر کان سے لگا لیا ہوں۔

ہیلو! — کون صاحب ہیں ؟
میں متین سروش آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔
اچھا آپ یہاں ہیں، پہلے تو اورنگ آباد میں تھے۔
اب میں یہیں ہوں، آپ کی ایک کہانی ریکارڈ کرنی ہے آپ کب تک رہیں گے ؟
۱۰ ر کی شام کو جا رہا ہوں۔
میں کل یا آج ہی شام کو آپ سے ملوں گا، کہانی ۸ ر نومبر تک مل جائے تو اچھا ہے۔

میں نے ریسیور رکھ دیا ہے اور کہانی کے پلاٹ سوچتا "نمائش گاہ" میں آ گیا ہوں ۱۰ ½ بجے سے مجلس مقالات و مذاکرات کا آغاز ہوا ہے پہلی نشست کی صدارت جناب محمد علی عباسی سکریٹری مالیات کر رہے ہیں وہ نمائش دیکھ کر یہاں آئے ہیں عباسی صاحب بڑے اچھے نقوش کے مالک ہیں آنکھوں میں سنجیدہ سی چمک ہے اور چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار، نمائش میں انھوں نے بہت سے علمی سوالات کیے تھے خود بھی بہت کچھ کہا تھا اجلاس شروع ہو چکا ہے حکیم سمپت کمار صاحب اچاریہ "نیند" پر مقالہ پڑھ رہے ہیں جس کا بڑا حصہ موضوع سے ہٹا ہوا ہے آخر میں کچھ باتیں "نیند" پر بھی کہہ دی گئی ہیں۔ نیند کی تاریخ اور اس کا پس منظر نہایت دلچسپ ہے عباسی دور میں اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہو گئی تھی مگر مقالہ نگار نے نیند کا جائزہ لینے میں وسعت نگاہ کا ثبوت نہیں دیا، حکیم عبدالصمد صاحب اور حکیم خورشید حسن خضر نے معلوماتی مقالے پڑھے ہیں حکیم محی الدین احمد اور حکیم سید عبدالماجد نے "جدید دور میں طب یونانی کے فنی و عمومی مسائل" پر تقاریر کی ہیں۔ حکیم ڈاکٹر عبدالرحمٰن ماہر سل و دق مرض دق پر نہایت دلچسپ انداز سے معلومات آفریں اور بصیرت افروز تقریر فرما رہے ہیں۔ انھیں قدیم و جدید نظریات پر پورا عبور ہے انھوں نے بڑے سائنٹفک لب و لہجہ میں اظہار خیال کیا ہے۔ اب مقابلہ کا آغاز ہوا ہے، حکیم ہبۃ اللہ حکیم محمد شبلی اور حکیم میر فاروق علی جج کی حیثیت سے "ڈائس" پر آ چکے ہیں۔ سید احمد علی رضوی، فریدالنساء، سید شبیہ حیدر صدر بزم طلبا، سید صفی الدین اور ایم اے رؤف مقررین میں شامل ہیں ابھی چند حضرات ہی نے تقاریر کی ہیں کہ عباسی صاحب جانے لگے ہیں اور حکیم عبدالوہاب ظہوری نے تقریری مقابلہ کو روک کر اچانک میرا نام پکار لیا ہے اور ساتھ ہی صاحب صدر سے امنٹ اور بیٹھنے کی درخواست کی۔ ہے جس کو انھوں نے منظور کر لیا ہے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اتنے سے

وقت میں نہیں کہہ سکتا پھر بھی کچھ کہا ہے میرے بعد نار صاحب اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ عباسی صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد مقابلہ کی تقریریں پھر شروع ہو گئی ہیں ایم اے رؤف کے بولنے کا اسٹائل بہت اچھا ہے زبان ستھری ہے، میٹر بھی انھوں نے پیش کیا ہے اور جو کچھ کہہ رہے ہیں تسلسل کے ساتھ کہہ رہے ہیں، سید عبدالرحیم قادری کا قد بہت چھوٹا، بدن منحنی اور ڈاڑھی ذرا بڑی ہے، دیکھنے میں قد اور ڈاڑھی کا طول برابر ہی معلوم ہو رہا ہے وہ بولنوں کی دنیا کے باشندے لگ رہے ہیں انھوں نے تقریر اچھی اور پرجوش کی ہے، ایم اے رؤف کو پہلا اور قادری صاحب کو دوسرا انعام دے کر ججوں نے پورا انصاف کیا ہے۔ اجلاس ختم ہو رہا ہے ظہوری صاحب شکریہ ادا کر رہے ہیں ظہرانہ رٹز ہوٹل میں حکیم محمد اعظم صاحب صدیقی کی طرف سے دیا جانے والا ہے روانگی کاروں سے ہو رہی ہے۔ رٹز ہوٹل اس کوٹھی (ہل فورٹ) میں ہے جس میں پہلے پرنس معظم جاہ رہا کرتے تھے۔ نہایت خوبصورت، بلند اور پُرفضا مقام ہے کوٹھی بہت وسیع اور شاندار ہے، شمالی سمت حسین ساگر موجیں مار رہا ہے اور دور تک سفید عمارتیں یوں نظر آ رہی ہیں جیسے ریگستان میں بہت سے خیمے نصب ہوں، کھانا میز کرسی پر مغربی اصول سے کھایا جا رہا ہے یعنی چھری کانٹے سے، بعض حضرات اپنے ہی طرز پر کھا رہے ہیں حالانکہ یہ طریقہ بھی ہمارا ہی ہے اور اندلس کے مسلمانوں سے جرمن و فرانس کے باشندوں نے سیکھا ہے اس کا موجد ابوالرافع تھا۔ٹیبل پر مینو رکھا ہوا ہے اسی کے مطابق بیرے نہایت سلیقے سے کھانا سرو کر رہے ہیں آخر میں ایک کارڈ پر سب کے دستخط کرائے گئے ہیں پھر ہم لوگ حسین ساگر کا نظارہ کرنے کوٹھی کے شمالی رخ پر کرسیوں پر آ بیٹھے وہیں کافی آ گئی ہے تین بجے کے بعد ہل فورٹ سے واپسی ہوئی ہے ہاسٹل میں پہنچتے ہی حکیم تیموری صاحب ملے ہیں وہ ۹ رکی شام اپنے یہاں میرے اعزاز میں ایک ادبی نشست کر رہے ہیں ڈنر بھی دینا چاہتے ہیں لیکن ۹ ر کے عشائیہ کا دعوت نامہ پہلے ہی مل چکا ہے ان سے معذرت کر رہا ہوں ان کے بعد خیرات ندیم آ گئے ہیں ان سے قلمی تعارف مدت سے ہے "جادہ" میں باقاعدہ لکھتے رہے ہیں ملاقات اس وقت پہلی بار ہو رہی ہے درمیانہ قد کے نوجوان ہیں، مخلص اور جلد قریب آ جانے والی فطرت رکھتے ہیں ایک ایک لفظ سے اپنائیت ٹپک رہی ہے انھوں نے ۹ ر نومبر کو ۴½ بجے اردو مصنفین کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی ہے کھانے کے لیے بھی اصرار کر رہے ہیں لیکن کوئی وقت خالی نہیں ہے میں ندیم صاحب سے بھی معذرت کر رہا ہوں وہ اپنی رفیقۂ حیات قمر ندیم کی جانب سے بھی مدعو کر رہے ہیں اور اس انداز سے جیسے غزل ارشاد فرما رہے ہوں۔ جلیل صاحب نے کل شام کو جی ٹی سے ریزرویشن میں ناکامی کا اظہار کر کے جنتا سے کوشش کرنے کو کہا تھا آج وہ کہہ رہے ہیں کہ جنتا میں بھی جگہ ملنے کا کوئی امکان نہ تھا لیکن سپرنٹنڈنٹ نے آپ کا نام سن کر سیٹ دلا دی۔ ٹکٹ وغیرہ حکیم پرانکش داس صاحب کو دیا ہے جلیل صاحب حکیم محمد یوسف حسین خاں صاحب کے روم میں لے گئے ہیں میں آل انڈیا ریڈیو فون کر کے کہانی کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں یوسف حسین صاحب بڑے جوش اور خلوص سے ملے ہیں بظاہر ان کی شخصیت مختصر لیکن حقیقت میں طویل و عریض ہے مسکراتی آنکھیں اور چمکتا دمکتا چہرہ، دیر تک گفتگو رہی ہے، انھوں نے چائے منگا لی ہے اور خود ہی فون کیا ہے متین صاحب

بھی بول رہے ہیں وہ پارلیمنٹ کی کہانی چاہتے ہیں عصرانہ حکیم پرانکش داس نے دیا ہے اس کے بعد دوسری نشست ڈاکٹر چنا ریڈی وزیر منصوبہ بندی کی صدارت میں شروع ہوئی ہے، تقریروں کا موضوع ہے "موجودہ دور میں طب یونانی کے مسائل" ڈاکٹر ملکوٹے صاحب، حکیم عبداللطیف صاحب فلسفی، مولانا ابو یوسف ممبر کونسل ڈاکٹر یوسف الدین انصاری صدر شعبۂ طب عثمانیہ یونیورسٹی اور حکیم عبدالصمد خاں نے تقریریں کی ہیں آخر میں جناب صدر تقریر فرما رہے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ طب یونانی کے جن مسائل پر حکومت کو متوجہ کیا گیا ہے وہ سنجیدگی سے ان پر غور کرے گی حکیم عبدالستار صاحب کے شکریے پر یہ نشست برخاست ہوگئی ہے عشائیہ کے لیے جناب احمد علی خاں صاحب مالک احمد اینڈ کمپنی کے مکان پر گئے ہیں اور پھر قیام گاہ پر آگئے ہیں قریب والا کمرہ بھر گیا ہے حکیم حسن احمد صاحب چوپڑی اکولہ سے آئے ہیں ان کے ساتھ ایک نوجوان طبیب "خواجہ صاحب" ہیں خواجگی کی بنیاد قدیم نہیں جدید ہے۔

۸ رنومبر کو جمعہ ہے قادری صاحب اور خلیفۃ اللہ صاحب نے غسل کے لیے گرم پانی کی فرمائش کی ہے لگے ہاتھوں ابراہیم صاحب بھی نہا چکے ہیں میں نے سب کے بعد غسل کیا ہے حکیم مہدی ممتاز اور پرانکش داس صاحب اپنی سرخ اور نیند بھری آنکھوں سے ناشتہ کی یاد دہانی کر رہے ہیں انتظام سمینار کی طرف سے ہے ناشتہ کرتے ہی پنڈال میں چلے گئے ہیں آٹھ بجے سے تشخیصی بورڈ کا انعقاد ہو رہا ہے باہر سے آئے ہوئے اطباء مقامی حکیموں کے ساتھ مل کر بورڈ کی شکل میں بیماروں کا معائنہ کریں گے اس وقت پنڈال کی شکل ہی بدل گئی ہے الگ الگ میز کرسیاں لگی ہوئی ہیں، پاس ہی پردے لگا کر انسپکشن روم بنا دیئے گئے ہیں جہاں مریضوں کے لیے میز اور ہاتھ دھونے کا سامان موجود ہے، ہر بورڈ میں چار اطباء شریک ہیں عورتوں کے لیے جداگانہ بندوبست کیا گیا ہے میں اپنی جگہ آبیٹھا ہوں میرے ساتھ حیدرآباد کے فاضل اور تجربہ کار طبیب حکیم ہبۃ اللہ صاحب ہیں جو عربی کے بہت اچھے ادیب بھی ہیں، دو حکیم اور ہیں ذرا فاصلہ پر وہ مریض بیٹھے ہیں جن کو ہمارے بورڈ میں آنے کی ہدایت کی گئی ہے ہم نے معائنہ شروع کر دیا ہے ایک ایک مریض ایک مطبوعہ فارم لیے آ رہا ہے جس پر اس کا اور مرض کا نام درج ہے مختصر سی تاریخ بھی لکھی ہوئی ہے ہم لوگ نہایت غور اور توجہ سے بیماروں کو دیکھ کر اتفاق رائے سے دوائیں تجویز کر رہے ہیں نسخے میں لکھ رہا ہوں ضرورت کے مطابق ہم نے اس تشخیص سے اختلاف بھی کیا ہے جو فارم پر درج ہے۔ مریضوں کا تانتا بندھا ہوا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک بیماروں کو رجسٹرڈ کیا جا رہا ہے اعلان کے مطابق کل ہی مریضوں کے نام لکھنے کا سلسلہ ختم ہو جانا چاہئے تھا لیکن لوگ آج بھی مقررہ فیس پانچ روپے ادا کر کے اپنے فارم مکمل کرا رہے ہیں ساڑھے بارہ بجے یہ کام ختم ہوا ہے حالانکہ وقت ۸ سے ۱ ایک کا تھا۔ اسی دوران میں تیسرے اجلاس کی دوسری نشست یعنی مجلس تجربات حکیم محمد اعظم صاحب کی صدارت میں شروع ہو چکی ہے میں اس میں شریک نہیں ہو سکا ہوں اور حکیم ابراہیم صاحب کے ساتھ نظامیہ کالج کی عمارت میں ٹہل رہا ہوں، مرزا حسین یار بیگ صاحب سے ملاقات ہوئی ہے یہ طبیہ کالج میں پڑھتے ہیں ان کے قد کی درازی چار مینار کی بلندی پر طنز کرتی محسوس ہوتی ہے مرزا صاحب تاریخی مقامات کی سیر کرانے کو کہہ رہے ہیں اسی اثناء میں ایک ہندو نوجوان ملے ہیں جو

کسی اسٹور کے نگران ہیں کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا ذوق رکھتے ہیں مجھ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے یہ اپنے آفس میں لے گئے ہیں اور کافی منگالی ہے، کہانیوں پر ہی گفتگو ہو رہی ہے کہہ رہے ہیں پڑھتا بہت ہوں لکھتا کم ہوں جو لکھتا ہوں اس پر بار بار غور کرتا ہوں، چھپواتا نہیں، آپ میرے پسندیدہ فنکار ہیں، اس کاپی پر کہانی لکھنے کے متعلق کچھ ہدایات لکھ دیجئے، میں نے تقریباً دو صفحات لکھ دیئے ہیں جن میں پلاٹ کردار نگاری، مرکزی نقطۂ خیال، اسلوب، نقطۂ عروج اور ایسی ہی چند بنیادی باتیں ہیں، وضو ہم نے یہیں کیا ہے، اس نوجوان ہندو دوست نے ہر چیز مہیا کر دی ہے۔ نماز کے لیے مکہ مسجد[1] گیا ہوں حکیم عبدالحمید صاحب بھی یہیں نماز ادا کر رہے ہیں مسجد میں اندر سے باہر تک آدمی ہی آدمی ہیں مسجد نہایت عالیشان ہے ظہرانہ میں حکیم محمد اسحٰق صاحب مالک کارخانہ امرجیات کے یہاں بیرون علی آباد گیا ہوں مولوی سید صابر حسینی میونسپل کونسلر نے پہلے گل پوشی کی ہے پھر کھانا کھایا گیا ہے۔ واپسی پر ذرا دیر آرام کیا ہے پھر جلسہ گاہ میں آگیا ہوں۔ پہلے نواب میر احمد علی خاں وزیر تعمیرات کے ساتھ نمائش میں گیا ہوں، نواب صاحب تصاویر اور دوسری چیزوں کو غور سے دیکھ رہے ہیں، استھانہ صاحب بھی ہیں۔ روزنامہ رہنمائے دکن کے نمائندے نے مجھ سے انٹرویو کا وقت لیا ہے میں نے ۹ر نومبر کو ۱۲ بجے انھیں اسی جگہ بلایا ہے اب چند خواتین آٹو گراف لے رہی ہیں، میں مختصر جملے لکھ رہا ہوں عصرانہ کالج کی عمارت میں ایک جگہ دیا گیا ہے نواب میر احمد علی خاں نے بھی شرکت کی ہے میں نے چائے کی میز ہی پر ان سے چند مسائل پر گفتگو کی ہے۔ نواب صاحب نہایت سنجیدہ اور معاملہ فہم ہیں انھوں نے حوصلہ افزا جوابات دیئے ہیں، سب سے اہم سوال نظامیہ طبیہ کالج کے نظام تعلیم کا ہے۔ اس کے بعد ہاسپٹل اور ادارہ اس کے تمام شعبوں کو ترقی دینے کا ہے ۵ بجتے ہی تیسری نشست نواب صاحب کی صدارت میں شروع ہو گئی ہے ذرا دیر بعد حکیم یوسف صاحب نے اطلاع دی ہے کہ متین سروش صاحب آپ سے ملنے کے منتظر ہیں۔ اپنی نشست اٹھ کر گیا ہوں کہانی بیگ میں نہیں ہے متین صاحب کو ساتھ لے کر ہاسٹل گیا ہوں اور کہانی انھیں دے دی ہے۔ دیر تک دلچسپ باتیں رہی ہیں۔ شام کی گاڑی سے حکیم صلاح الدین خالق برہان پور سے آئے ہیں مغربی کمرے میں حکیم ناظر حسین شمیم سہارنپور سے اور ایک اور بزرگ دیوبند سے آکر ٹھہر گئے ہیں، عثمانیہ ہاسٹل میں حکیم محمود الرحمٰن صاحب کی طرف سے دیا جا رہا ہے نچلی منزل میں صبح ہی سے برتن وغیرہ جمع ہو رہے ہیں اور پھر کھانا پکایا جانے لگا ہے بیرونی صحن میں کرسیاں بچھائی جا رہی ہیں جنوب رویہ کمرے میں کھانا کھلانے کا انتظام بڑی خوبصورتی اور سلیقہ مندی سے کیا گیا ہے، لوگ جمع ہونے لگے ہیں، اور کرسیوں پر بیٹھے مصروف گفتگو ہیں۔ عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر سیاست سے تعارف ہوا ہے، نوجوان اور ذہین آدمی ہیں شخصیت میں کشش اور جاذبیت ہے، لہجہ بہت نرم اور دھیما ہے عینک لگاتے ہیں اور شیروانی پہنتے ہیں ۹ ½ بجے سے مشاعرہ ہو رہا ہے

---

[1] اس مسجد کی تعمیر قطب شاہ کے عہد سے جاری تھی جس کو ابوالحسن (تاناشاہ) نے اپنے دورِ حکومت میں آٹھ لاکھ کے صرفہ سے مکمل کیا پہلے اس کا نام بیت العتیق تھا ۱۰۹۰ھ میں مکہ مسجد سے موسوم کیا گیا۔ (کوثر)

داخلہ پاس کے ذریعہ ہوگا یوسف صاحب دن بھر پاس جاری کرتے رہے ہیں خواتین اور طلبہ کالج کے طلبا کو پاس سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ حیدرآباد کے تقریباً تمام اچھے شاعر حصہ لے رہے ہیں اریب صاحب اور مخدوم صاحب فضل الرحمٰن صاحب سے ملنے بنجارہ ہل گئے ہوئے ہیں، اریب صاحب نے یوسف صاحب کو پیام بھیجا ہے کہ وہ بنجارہ ہل ہی سے مشاعرے میں آجائیں گے دیر ہو جائے تو ٹیکسی بھیج دی جائے پیام میں نے ہی پہنچایا ہے۔ شاعر حضرات آئے گئے ہیں، ڈائس پر ان سے مل رہا ہوں علامہ نجم آفندی، ڈاکٹر اختر احمد، قمر ساحری، ابن احمد تاب، خیرات ندیم، سرور ڈنڈا، مسافر ملگنڈوی، خلیل احمد نار اور بہت سے دوسرے شاعر آچکے ہیں سراج اور حکیم اقبال صاحب بھی آتے ہیں قمر ساحری ان احباب میں ہیں جن کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں "جادہ" میں انھوں نے بڑی پابندی سے لکھا ہے، پولیس ایکشن کے بعد خاموش ہو گئے تھے میں سمجھ رہا تھا کہ پاکستان چلے گئے لیکن حیدرآباد ہی میں موجود ہیں ذرا خاموش اور سنجیدہ ان میں کبھی کبھی مسکراہٹ کی چمک سنجیدگی کے کہر کو چیر کر نمایاں ہو جاتی ہے، قد و قامت متوسط اور جسم بھاری ہے ابن احمد تاب اور قمر ساحری مشاعرہ شروع ہونے سے قبل ہی چلے گئے ہیں۔ حکیم یوسف حسین خاں مشاعرہ کنڈکٹ کریں گے وہ مائک کے سامنے بیٹھے اس انداز سے مسکرا رہے ہیں جیسے مائک نے کوئی مزاحیہ شعر سنا دیا ہو، حکیم عبداللطیف مسند صدارت پر تشریف لے آئے ہیں نواب میر احمد علی خاں صاحب نے رسم افتتاح ادا کی ہے ان کی تقریر نہایت برجستہ اور مختصر ہے۔ مشاعرہ کا آغاز ہو چکا ہے یوسف صاحب شاعروں کو پکار رہے ہیں ان کی آواز میں ترنم نہیں مگر سوز و حیثیت ہے یوسف صاحب نے اپیل کی ہے کہ شعرا حضرات کم سے کم اشعار پڑھیں، مجمع بہت کافی ہے پچھلی قناتیں ہٹا کر مزید نشستوں کا انتظام کیا گیا ہے، شاعر محو غزل سرائی ہیں، داد سلیقہ سے دی جا رہی ہے خیرات ندیم مائک پر آتے ہی سیماب وار بے چین ہو گئے ہیں، جلد جلد جگہ بدل رہے ہیں، اور راسی جنبش اور تھرتھراہٹ کے عالم میں انھوں نے بڑی عمدہ غزل سنائی ہے خوب داد ملی ہے یوسف صاحب بڑی دانشوری سے مشاعرہ چلا رہے ہیں اور اسی بزم سخن میں مختصر رومانی افسانے کی طرح نقطۂ عروج کا احساس پیدا کر رہے ہیں، یوسف صاحب کے برجستہ جملے سامعین میں تہذیب و شائستگی کی حس بیدار کر رہے ہیں ڈاکٹر اختر احمد نے بڑی عمدہ غزل سنائی ہے، ان کی فکر میں بلندی اور لب و لہجہ میں متانت ہے۔ اب حکیم یوسف حسین کی باری آگئی ہے انھوں نے نہایت خیال انگیز نظم سنائی ہے، نظم آزاد ہے، یوسف صاحب اپنی فکری توانائی کی بدولت بھرپور داد حاصل کر رہے ہیں۔ ایک دو شاعر اور مائک پر آئے ہیں اور پھر مسافر ملگنڈوی کو پکارا گیا ہے محفل شعر ہنگامۂ محشر بن گئی ہے ہر گوشہ سے تالیاں بجائی جا رہی ہیں، مسافر کا پرجوش خیر مقدم ہو رہا ہے، وہ دوہرے بدن کے آدمی ہیں خشخشی اور کھچڑی ڈاڑھی ہے انھیں پوری دلچسپی سے سنا جا رہا ہے ایک ایک شعر پر داد دی جا رہی ہے مسافر نے کئی چیزیں سنائی ہیں ان کے مزاح میں جان ہے کہیں کہیں سوقیت جھلک آئی ہے اگر وہ خود تنقیدی سے کام لیں تو ان کا مزاح فنی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے اور اب حضرت سرور ڈنڈا مائک پر کھڑے ہیں تالیاں بج رہی ہیں سننے والوں میں ایک عام بے چینی ہے وہ انتظار میں ایک لمحہ کا اضافہ کرنے کو تیار نہیں ڈنڈا صاحب

کشیدہ قامت اور بھرے بھرے بدن کے آدمی ہیں، بھورے بال ہیں چہرے کی ساخت میں فطری مزاح کا ایک نقش بھی نہیں مگر کلام میں ان کی شخصیت طنز و مزاح میں ڈوب کر ابھرتی ہے، پڑھنے کا اسلوب اتنا موزوں اور دلکش ہے کہ کلام کی تاثیر کو دو بالا کر دیتا ہے انھوں نے چند نظمیں سنائی ہیں جن میں بھرپور سماجی طنز ہیں لوگ تڑپ تڑپ گئے ہیں، اشعار بازاریت سے پاک ہیں، طنز میں انفرادیت نہیں اجتماعیت ہے۔ خلیل صاحب نار نے ایک رباعی بہت اچھی پڑھی ہے اس میں الفاظ کی الٹ پھیر سے چین کو "زیخ" بنایا گیا ہے ایک بجے یہ دلچسپ اور زندگی خیز شعری پروگرام ختم ہوا ہے، تہذیب و شائستگی آخر تک برقرار رہی ہے، حیدرآبادی حضرات نے متانت و سنجیدگی کی نہایت اعلیٰ مثال پیش کی ہے اگر بیچ میں کہیں ہلکی سی ہوٹنگ ہوئی بھی ہے تو قطعی تنقیدی رنگ میں۔

۹ر نومبر کو ناشتہ سمینار کی طرف سے کرایا گیا ہے، حکیم صلاح الدین صاحب کا اصرار ہے کہ ان کے ساتھ اوربینٹ ہوٹل جاؤں اور جناب حکیم عبدالحمید صاحب سے طبی کالج برہان پور کے بعض اہم مسائل پر گفتگو کروں، ٹیکسی آگئی ہے اور میں حکیم حسین احمد صاحب چوہدری کو ساتھ لے کر ٹیکسی کی سمت چل رہا ہوں اسی وقت ہمدرد کی دواؤں پر اظہار خیال ہونے لگا ہے۔ ایک ساتھی نے تنقید کی حدود سے گزر کر تخریبی لہجہ میں خمیرہ مروارید کے متعلق ایسی بات کہہ دی ہے جو حقائق اور میرے تجربات کے خلاف ہے میں تقریباً بتیس سال سے ہمدرد کی مختلف دوائیں پورے اعتماد کے ساتھ استعمال کر رہا ہوں اس طویل مدت میں میرا اعتماد کبھی مجروح نہیں ہوا میں کہہ رہا ہوں کہ ہمدرد پر رائے زنی کرتے وقت ہمیں بہت زیادہ حقیقت پسند اور ذاتی اغراض سے بالاتر ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمدرد ہی ایسا طبی ادارہ ہے جو کسی فرد واحد کی نہیں بلکہ قوم کی ملکیت ہے اور جس نے مشرق میں فن کے وقار کو بلند کیا ہے ہند و پاک میں ہمدرد کا وجود ہی طب قدیم کی بقاء کا ضامن ہے، ہمدرد وقف کی حیثیت "کعبۂ فن" کی ہے اور اس کے خلاف جو الفاظ کسی طبیب کی زبان سے ادا ہوتے ہیں وہ ان تیروں کی مانند ہیں جو حجاج بن یوسف کی طرف سے کعبہ کو نشانہ بنا کر چلائے گئے تھے جن سے حرم محترم میں آگ لگ گئی تھی لیکن تیر چلانے والے وہ ہاتھ ٹوٹ گئے اور "بیت العتیق" اپنی تمام دلکشی کے ساتھ باقی ہے — ہمدرد کعبۂ فن ہے اور حکیم عبدالحمید اس کے کلید بردار ہیں ہر طبیب کو ان دونوں کا احترام اپنے اخلاقی اور فنی فرائض میں داخل کر لینا چاہیے خالق صاحب اور حسن امجد صاحب میری تائید کر رہے ہیں تا قد بھی متاثر ہیں اوربینٹ ہوٹل ایک شاندار عمارت میں ہے، حکیم صاحب سے گفتگو ہوئی ہے، طبی کالج برہان پور کو حکیم صاحب ایک ہزار کا عطیہ دے چکے ہیں اور ہمدرد وقف کے سامنے بڑے بڑے کام ہیں وہ ایک ایسی منزل مقصود کی جانب گامزن ہے جہاں فن کی تاریخ ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ جائے گی۔ حکیم صاحب نے خالق صاحب سے باتیں کی ہیں اور ان معاملات کو "سیدنا"[1] تک پہنچانے کا مشورہ دیا ہے جن کی نگاہ التفات ہی ان تمام مسائل کا حل ہے، سب لوگ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہونے کی غرض سے روانہ ہو رہے ہیں میں بھی نظامیہ کالج آگیا ہوں، ایک وسیع اور شاندار لیکن بند کمرے میں کارروائی کا آغاز ہوا ہے حکیم عبدالحمید صاحب

---

[1] سیدنا ملا طاہر سیف الدین

صدارت فرما رہے ہیں، وقت کے تمام سوالات زیر بحث آئے ہیں خاص طور پر ڈرگس ایکٹ پر دیر تک تبادلۂ خیال ہوا ہے، یہ ایکٹ اس شمشیر برہنہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی ایک ہی جنبش میں نہ صرف اطبا کے سر قلم ہو جائیں گے بلکہ فن بھی دو پارہ ہو جائے گا، جب تک یہ تلوار سر پر لٹکی ہوئی ہے اطبا کا مستقبل، ان کی زندگی اور اقتصادی ماحول ان ستاروں سے مختلف نہیں ہے جن کی بہت بڑی تعداد خودکشی کرنے پر مجبور ہوئی ہے، اس سلسلہ میں میری ایک تجویز اتفاق رائے سے منظور ہو گئی ہے اجلاس ابھی چل رہا ہے، مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ کا فون آیا ہے، فون پر آیا ہوں، متین صاحب کہہ رہے ہیں، کہانی بہت اچھی ہے، اگرچہ آج تعطیل ہے لیکن ریکارڈنگ کے لیے مخصوص طور پر انتظام ہو چکا ہے بھوپال سے بھی منظوری کا ٹیلیگرام وصول ہو گیا ہے۔ آپ کس وقت ریڈیو اسٹیشن آسکتے ہیں؟

تین اور چار کے درمیان!

پھر آجائیے، میں انتظار کروں گا۔

دو بجے تک اجلاس چلتا رہا ڈاک سے جو خطوط آئے ہیں ان سے حکیم سید جمیل احمد صاحب کے انتقال کی اطلاع ملی ہے انھوں نے ۲ر نومبر کی رات کو داعی اجل کی دعوت قبول کر لی ہے وہ عرصہ سے رتلام میں مطب کرتے تھے دہلی طبیہ کالج سے سند حاصل کی تھی، نہایت حاذق اور تجربہ کار طبیب تھے، قلب پر بڑا اثر ہوا ہے۔ ظہرانہ کے لیے حکیم ہبۃ اللہ صاحب کے یہاں گیا ہوں اور شرما صاحب سے اس حادثہ کا ذکر کیا ہے وہ متاثر ہوئے ہیں اور اس اطلاع کو کارروائی میں شریک کرنے کا وعدہ کیا ہے حکیم جلیل احمد صاحب مل گئے ہیں جو حال ہی میں کانفرنس کے آرگنائزر مقرر ہوئے ہیں میں نے ان سے کہا ہے کہ آندھرا پردیش طبی کانفرنس کا اجلاس شام کو ہو رہا ہے آپ تعزیت کا رزلیوشن پیش کر دیں، انھوں نے بڑے کرخت اور تلخ لہجہ میں کہا ہے، میں نہیں جاؤں گا — آپ لکھ کر دیجیے! اس انداز کلام سے بڑی تکلیف ہوئی ہے میں نے کہا ہے۔

آپ زحمت نہ فرمائیے!

انھوں نے تلافی کے خیال سے کچھ کہا ہے لیکن میں اس طرح آبگینے جوڑنے کا قائل نہیں، میں نے حکیم صلاح الدین صاحب کو ایک نوٹ دے دیا ہے، میں اس اجلاس میں نہیں جا سکوں گا، نار صاحب آرگنائزر ہیں جن کا کام شعلوں پر شبنم چھڑکنے سے کم نازک نہیں ہے، انھیں خلیل اللہ کے کردار سے "نار" کو گلزار بنانے کا فن سیکھنا چاہیے میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا،

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی عظیم انسانی اور اخلاقی روایات کو سامنے رکھ کر ہی اپنی فنی عوامی اور جمہوری تحریک کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے اس سلسلے میں مجھے ایک حقیقت نگار کی حیثیت سے شرما جی کی بردباری، شیرینیٔ گفتار اور فروتنی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ٹھیک ۳ ۱/۲ بجے ٹیکسی لے کر ریڈیو اسٹیشن گیا ہوں اور کہانی کا پھر ایک بار ٹائمنگ کیا ہے

۱۲ منٹ کا وقت دیا گیا ہے۔ مسودہ تقریباً ۱۱ منٹ کا ہے، متین صاحب اپنے گانوں کے دو ریکارڈ سنائے ہیں، موضوع چین ہے، گانے قطعی ادبی رنگ کے ہیں۔ کہانی ریکارڈ کرلی گئی ہے ۱۲ نومبر کو چھ اور سات کے درمیان حیدرآباد ریڈیو سے براڈکاسٹ کی جائے گی۔ وقت گزرتا جا رہا ہے اور مجھے "اردو مصنفین" کی میٹنگ میں شریک ہونا ہے، بس کا انتظار نہیں کرسکتا ہوں، رکشا مل گئی ہے: متین صاحب بھی ساتھ ہیں، منزل مقصود پرانی حویلی یعنی ڈاکٹر اختر احمد صاحب کے دولت کدہ ۶ بجے پہنچا ہوں، جلسہ شروع ہوچکا ہے خیرات ندیم صاحب معتمد عمومی جلسہ کے اغراض و مقاصد اور پروگرام کی وضاحت کرچکے ہیں، سریواستو لاہوتی ادبی مسائل پر اظہار خیال کر رہے ہیں پریم چند ان کا محبوب موضوع ہے، انھوں نے پریم چند پر بھی بہت کچھ کہا ہے۔ صدارت مشہور شاعر حضرت خورشید احمد جامی کر رہے ہیں منحنی سے آدمی ہیں خط و خال خسرو صاحب سے ملتے جلتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیئے کیوں کہ خسرو صاحب ان کے چھوٹے بھائی ہیں اسی دوران میں اریب صاحب آئے ہیں وہ اپنی شاہکار تخلیق یعنی اریب زادہ کو بھی لائے ہیں، محترمہ صفیہ بیگم بھی آئی ہیں اور ایک خاتون کے قریب بیٹھ گئی ہیں جو پہلے سے جلسہ میں موجود ہیں۔ اب عاتق شاہ نے نئی کہانی کے عنوان پر بولنا شروع کردیا ہے وہ بہت اچھی اور مربوط تقریر کر رہے ہیں،

. . . .

آج کی کہانی کے مزاج اور اس کے فرائض کی خوب وضاحت کی ہے، انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ میں کہانی کے متعلق اپنے تجربات بیان کروں اس سے پہلے ندیم صاحب نے صرف افسانہ پڑھنے کو کہا تھا میں نے تخلیق اور اس کے کرب کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ افسانہ نگار کہانی تخلیق کرنے کے سلسلہ میں زچہ سے مشابہت رکھتا ہے وہ اپنے آس پاس پھیلی ہوئی زندگی سے خام مواد لیتا ہے اور اس کو داخلی بھٹی پر پکاتا ہے، یہ مواد کسی موضوع سے منسوب ہو کر اس کے ذہن و شعور میں دوڑتا رہتا ہے اور بالکل اسی طرح جیسے بچہ ماں کی کوکھ میں نشو و نما پاتا ہے، یہ بھی پلتا رہتا ہے پھر فن کار کو ایک خاص قسم کا کرب محسوس ہوتا ہے جو درد زہ سے زیادہ شدید ہوتا ہے۔ یہی کرب مجبور کرتا ہے کہ افسانہ نگار کہانی کو اپنی سوچ اور تکنیک کے ساتھ کاغذ پر منتقل کردے، اس طرح کہانی وجود میں آجاتی ہے اور بھی بہت سی باتیں کہی ہیں پھر ایک افسانہ "اللہ بخشے" سنایا ہے۔ افسانہ خوب پسند کیا جا رہا ہے۔ وقت کافی ہوگیا ہے اسی لیے غزل سرائی کا پروگرام ملتوی کردیا گیا ہے۔ جامی صاحب پڑھنے سے بالکل مجبور ہیں ان کی آواز بیٹھی ہوئی ہے بولنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔ محترمہ صفیہ سے تعارف ہوا ہے میں نے ان کے ناولوں کی تعریف کی ہے اور ان کی بیباک اور خطرناک حقیقت نگاری پر اریب صاحب کی ہمدردی میں احتجاج کر رہا ہوں وہ فرما رہی ہیں کل ہمارے ہاں آئیے۔ میں نے وعدہ کرلیا ہے صفیہ ایم اے کر رہی ہیں۔ اریب صاحب قریب ہی کھڑے ہیں میں حیران ہوں کہ ان کے اور صفیہ کے سنجوگ پر کس کو مبارکباد دوں اریب کو یا صفیہ بیگم کو۔ ڈاکٹر اختر احمد نے اپنی کتاب "اشرف المخلوقات" پیش کی ہے۔ اختر صاحب کامیاب ڈاکٹر ہیں پریکٹس بہت اچھی ہے۔ مریضوں کے ہجوم میں گھرے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود شاعری بھی کرتے ہیں اور تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔

طبیبوں کے حلقہ میں بڑے شگفتہ نگار ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں یورپ کے اکثر بڑے فنکار ڈاکٹر ہیں۔ طب فنونِ لطیفہ میں شامل نہیں لیکن اس کی بنیاد میں ذوقِ جمال کی چنگاری ضرور کہیں دبی رہتی ہے جو مزاج میں سوز و گداز پیدا کرتی ہے۔ میٹنگ میں پرانے شہر کے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے علاوہ اردو دوست بھی کافی تعداد میں شریک ہوئے ہیں۔ اکثر حضرات سے تعارف ہوا ہے۔ مشہور اور ابھرتے ہوئے کہانی کار اکرام جاوید ملے ہیں جو نئی نسل کے نہایت ہونہار نوجوان ہیں، وہ کہہ رہے ہیں۔

آپ نے رام لعل سے اپنی گفتگو (مطبوعہ شاعر بمبئی) میں غالباً وہی نام لکھے ہیں جن سے رام لعل نے اتفاق کیا ہے۔

میں کہہ رہا ہوں بات چیت بڑی آزادانہ فضا میں ہوئی ہے یوں بھی میں اپنی رائے کو پابند نہیں کیا کرتا رام لعل ایسے آدمی سے کبھی یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی کو ذہنی طور پر مرعوب کرنے کی کوشش کریں۔ دراصل بات چیت بالکل سرسری طور پر ہوئی ہے ناموں کی فہرست مکمل نہیں ہے کچھ اہم نام چھوٹ گئے ہیں۔ اقبال متین، عاتق شاہ، اکرام جاوید کا نام میں بھول ضرور رہا ہوں اس نسیان کی بنیاد عجلت ہی ہو سکتی ہے ورنہ تینوں ناموں میں بڑی فنی کشش ہے۔ اکرام جاوید خیرات ندیم اور متین سروش دور تک ساتھ آتے ہیں اور مجھے رکشا تک پہنچا کر۔۔۔ رخصت ہوئے ہیں۔ عصرانہ ظہوری صاحب کے یہاں تھا میں نہیں جا سکا ہوں، آندھرا پردیش طبی کانفرنس میں بھی شرکت نہیں ہو سکی ہے۔ اسپتال آگیا ہوں قادری صاحب کا پلنگ خالی ہو چکا ہے وہ شام کو مدراس چلے گئے ہیں میں کافی تھک چکا ہوں ۹ بجے قلمکار کے دفتر میں پہنچنا ہے۔ سوچ رہا ہوں عشائیہ میں نہ جاؤں ممکن ہے دیر ہو جائے اگرچہ عشائیہ حکیم مرزا محمود بیگ صاحب کے یہاں ہے جو مستقل فنی ادارہ ہیں اور بیدر میں بہت بڑا دواخانہ چلا رہے ہیں اضلاع میں اس کی چند شاخیں بھی ہیں یہ دواخانہ ان کا ذاتی ہے اور اس کی وسعت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک لاکھ سے زیادہ کے صرف سرجری کے آلات ہیں، میں لیٹ ہو گیا ہوں اور کھانا ناغہ کر دیا ہے، حیدرآباد کے حضرات نہایت متواضع اور مہمان نواز ہیں اب تک انھوں نے اپنی سرگرمی کے بڑے شاندار مظاہرے کیے ہیں۔ بیگ صاحب کا عشائیہ آخری ہے اس پر میزبانوں کی ذمہ داریاں ختم ہو رہی ہیں یقین ہے کہ بیگ صاحب نے بہت ہی اعلیٰ انتظامات کیے ہوں گے۔ میں یہ سب کچھ جاننے کے باوجود محرومی کی اذیت جو دائمی قسم کی ہے گوارا کر رہا ہوں۔ حالانکہ تیموری صاحب نے گاڑی وہیں بھیجنے کا وعدہ کیا تھا اسی وقت تیموری صاحب ایک ہمراہی کو لے کر آگئے ہیں وہ کہہ رہے ہیں آپ عشائیہ میں جائیں تو گاڑی وہیں بھیجوں ورنہ یہاں بھیج دوں جلسہ اس کے بعد شروع ہو سکے گا۔

عشائیہ میں نہیں جاؤں گا، گاڑی آپ یہیں بھیج دیں وہ اپنے ساتھی کو ضروری ہدایات دیتے چلے گئے ہیں وقت بہت آہستہ گزر رہا ہے ایسا لگ رہا ہے کہ لمحات تھک گئے ہیں اور ان کے بوجھل قدم دھیرے دھیرے اٹھ رہے ہیں، وقت کا راہی نہ جانے کب سے سرگرم سفر ہے اور کون کہہ سکتا ہے وہ کب اپنا سفر ختم کرے گا۔ شاید

کبھی نہیں، وہ اسی طرح چلتا رہا ہے اور یوں ہی چلتا رہے گا ـــــ بہار میں بھی اور خزاں میں بھی، دس بجے حکیم حسن احمد صاحب اور ان کے ساتھی خواجہ صاحب اور حکیم خالق صاحب آئے ہیں اسلامیہ طبیہ کالج کرنول کے دو نوجوان طالب علم بھی آ گئے ہیں۔ انھوں نے یونانی میڈیکل جرنل دیا ہے ۴۸ صفحات پر محیط ہے شروع میں پیغامات ہیں پھر متعدد معلوماتی اور تحقیقاتی مضامین ہیں۔ طبیہ کالج کرنول کے طلبا بڑے پُر جوش اور حوصلہ مند ہیں ان کے بلند عزائم کو سراہ رہا ہوں آج ہی خلیفۃ اللہ صاحب کے ساتھ طبیہ کالج کرنول کے مستند اطباء کو کلاس اے میں رجسٹرڈ کرنے کے سلسلے میں اسپیشل افسر صاحب سے باتیں کر چکا ہوں اس کالج کا الحاق مدراس یونیورسٹی سے ہو چکا ہے اور وہاں کے مستندین کو اے کلاس میں رجسٹرڈ کرنے کے متعلق وزارت صحت سے احکام بھی ہو چکے ہیں مگر بورڈ کے بعض اراکین کی جانب سے اختلاف کا اندیشہ تھا استھانہ صاحب نے وعدہ کر لیا ہے کہ پرنسپل کی تحریک پر حسب منشا کارروائی کر دی جائے گی ساڑھے دس پر کار آ گئی ہے اور تیموری صاحب کے یہاں جا رہا ہوں حکیم حسن احمد صاحب، خالق صاحب اور خواجہ صاحب ساتھ ہیں کرنولی صاحبان بھی اس ادبی میٹنگ میں شرکت کے مشتاق ہیں انھیں پتہ نوٹ کرا دیا گیا ہے وہ ذرا دیر بعد وہاں پہنچ جائیں گے تیموری صاحب نے بڑا اہتمام کیا ہے جلسہ گاہ ٹیوب لائٹ کی روشنی سے جگمگا رہی ہے بہت سے حضرات آ چکے ہیں سید حیدری حسین، راجہ جنگ راج فضل الرحمٰن، دلیشو شوراج کے علاوہ پروفیسر ابوالظفر عبدالواحد بھی تشریف رکھتے ہیں جن کو حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں امتیاز حاصل ہے۔ مختصر سے قد و قامت کے اس پیکر علم و فضل میں بڑا وزن ہے ان سے تعارف ہوا ہے بہت سادہ مزاج ہنس مکھ اور کم گو بزرگ ہیں گفتگو بڑے اعتماد سے کرتے ہیں پاکیزہ ظرافت ان کی تحریر میں بھی ہے اور بات چیت میں بھی۔ تیموری صاحب مسکراہٹیں لٹانے کے عادی ہیں وہ اپنے اسی تبسم آفریں انداز سے آئے ہیں۔ احمدی بیگم سے تعارف نہیں ہوا ہے وہ دوسرے کمرے میں انتظار کر رہی ہیں۔ میں تیموری صاحب کے ساتھ گیا ہوں۔ احمدی بیگم تعلیم یافتہ خاتون ہیں، مزاج میں مشرقیت ہے انداز گفتگو میں نسوانی وقار ہے جس میں شرمیلاپن بھی شامل ہے۔ رسالہ قلمکار کی ایڈیٹر ہیں۔ کمرے میں چند خواتین اور بھی ہیں ان میں سے ایک محترمہ احمدی بیگم کی چھوٹی بہن زینب فیض الدین ہیں اور دوسری اشرف رفیع صاحبہ ہیں۔ احمدی بیگم بڑے خلوص سے کہہ رہی ہیں چلئے وقت ہو آ رہا ہے گا۔

جلسہ شروع ہونے سے قبل گلپوشی ہو رہی ہے ابوالظفر صاحب صدر ہیں میں خصوصی مہمان ہوں، ہم دونوں کو ہار پہنائے گئے ہیں اور ہاتھوں میں گلدستے دیئے گئے ہیں، میں ہار اتار کر بیٹھنا ہی چاہتا ہوں کہ تیموری صاحب بول اٹھے ہیں۔

ابھی نہیں، تصویر لی جائے گی آپ کی۔

تصاویر کا سلسلہ شروع ہوا ہے کئی فوٹو لیے گئے ہیں۔ اب جلسہ کی کارروائی کا آغاز ہو رہا ہے، تیموری صاحب نے تحریک صدارت کی ہے اور ابوالظفر صاحب مسند صدارت پر تشریف لے آئے ہیں۔ تیموری صاحب اجازت لے کر تقریر کر رہے ہیں وہ فرما رہے ہیں کہ اس جلسہ میں کوثر چاندپوری کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے ساتھ ہی وہ میرا تعارف کرا رہے ہیں اور پھر مجھ سے تقریر کرنے کو کہا گیا ہے۔

صب

میں نے ادب اور زندگی کے باہمی روابط پر تقریر شروع کر دی ہے۔

ادب اور زندگی کا تعلق نہایت قدیم اور تاریخی ہے زندگی کے بغیر ادب کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ان دونوں میں داد و ستد کا رشتہ ہے ادب زندگی کو بہت کچھ دیتا ہے زندگی اس کے معاوضہ میں ادب کو روشنی اور موضوعات دیتی ہے یہ سلسلہ اسی دن سے شروع ہو گیا تھا جب پہلے انسان نے دنیا ئے آب و گل میں پہلا سانس لیا تھا؟

آگے چل کر میں نے کہا ہے،

اس اولین انسان کے دو لڑکے آپس میں لڑتے ہیں جن میں سے ایک مارا جاتا ہے یہ دنیا کا پہلا المیہ تھا۔ اسی ٹریجڈی سے خیر و شر کی ابتدا ہوتی ہے اور یہیں سے ادب اور زندگی میں لین دین کا آغاز ہوتا ہے باپ کے دل میں گداز پیدا ہوتا ہے اور اپنے جذبات رنج و غم کو ایک مرثیہ کی شکل میں ظاہر کرتا ہے، یہی مرثیہ مختلف زبانوں کے سانچوں سے ڈھلتا ہوا ہم تک پہنچا اسی سے پتہ چلتا ہے کہ ادب اور زندگی میں داد و ستد کا ناتہ بہت پرانا ہے۔

ادب کی خود سری اور سرکشی کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا ہے۔

ادب بڑی خود سر قسم کی طاقت ہے وہ کبھی زندگی کا رخ غلط سمت میں موڑ دیتی ہے اور دنیا گناہوں سے بھر جاتی ہے خونریزی اور بربیت کے جذبات غالب آجاتے ہیں مثال میں قدیم اسپارٹا کو پیش کیا جا سکتا ہے جہاں بچوں اور بوڑھوں کو خوشی سے قتل کر دیا جاتا تھا، اسی طرح ایران میں معصوم بچے موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے تھے اور خونریزی کا یہ تصور شاعروں نے سماج کو دیا تھا"

اسی سلسلہ میں کہا ہے کہ زندگی بھی ادب کو بھٹکا دیتی ہے، چنانچہ اسی کی غلط رہنمائی سے ادب میں جاسوسی . . . ناول نگاری کا شوق ابھرا اور فحاشی نیز عریانیات کا تصور پیدا ہوا۔

ادب اور اخلاق کا رابطہ بھی زیادہ مضبوط نہیں وہ اکثر ٹوٹ جاتا ہے اس کی مثال یونان کے صنمیاتی دور میں ملتی ہے جس میں جیوپٹر وغیرہ کی عشقیہ داستانیں نہایت فحش اور عریاں انداز میں تخلیق ہوئیں گئٹے جرمن کا مشہور شاعر تھا مگر اس کی اخلاقی حیثیت مشتبہ تھی اس کے متعلق کسی نے کارلائل سے پوچھا تھا تو اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا کہ گئٹے سے اخلاق کی توقع ویسی ہی ہے جیسے آپ اپنے پائپ میں تمباکو رکھ کر سورج سے یہ امید رکھیں کہ وہ اسے سلگا۔ ئے ادب نے ہر ملک میں اخلاق سے بغاوت کی ہے۔ عرب ایران اور ہندوستان میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

غرض ادب میں پیغام اور عصری شعور پر بولتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ ہر لمحہ اپنے اندر اہمیت رکھتا ہے ہم ایک لمحہ بھی ضائع کر دیں تو زندگی کے قافلہ سے بہت پیچھے رہ جائیں ہمیں بدلتے ہوئے سماج اور وقت پر کڑی نظر رکھنی چاہیئے در ادب و اخلاق کے رشتوں کو جوڑنے پر توجہ کرنی چاہیئے ادب وہی زندہ رہے گا جس میں خلوص اور صداقت کی روشنی ہوگی ۔ تقریر تقریباً نصف گھنٹہ جاری رہی پھر بھی تیموری صاحب کہہ رہے ہیں ابھی اور ، جلسہ میں تعلیم یافتہ لوگ بڑی تعداد میں شامل ہیں، سب غور اور توجہ سے سنتے رہے ہیں۔ میرے بعد پروفیسر ظفر صاحب سے درخواست

کی گئی ہے اور وہ آسکر وائلڈ کے ناول PICTURE OF DORIAN GRAY پر مقالہ پڑھ رہے ہیں مضمون شروع کرنے سے پہلے وہ فرما رہے ہیں کہ میں جو کچھ پڑھنے والا ہوں اس میں بھی ادب اور اخلاق کا یہی پہلو ہے جس کو آپ نے تقریر میں بیان کیا ہے ——— پروفیسر صاحب نے اپنا پرمغز مقالہ شروع کر دیا ہے وہ ناول کے کرداروں کو ہندوستانی بنا کر پیش کر رہے ہیں پروفیسر صاحب مقالہ ختم کر چکے ہیں تو نظم پڑھنے کا اصرار کیا گیا ہے وہ فرما رہے ہیں گلا سوکھ گیا اب نظم نہیں پڑھ سکتا۔

اب مشاعرہ کا آغاز ہو گیا ہے، روحی قادری، طالب رزاقی، طاہر عابدی، راشد آذر، نذیر بیتز اور حیدر علی صفا نے اپنا کلام سنا کر داد حاصل کی ہے اکثر بلند پایہ اشعار سننے میں آئے ہیں دو بجے کے قریب یہ محفل شعر و سخن نہایت خوشگوار اور پُرخلوص ماحول میں ختم ہوئی ہے ذہن و شعور پر نغمے برس رہے ہیں۔ چلتے وقت محترمہ احمد بیگم کی خدمت میں سپرد حاضر ہوا ہوں۔ اس قدر جلد حیدرآباد چھوڑنے پر افسوس کر رہی ہیں۔

صبح سویرے ہی مدینہ ہوٹل گیا ہوں، ابراہیم صاحب ساتھ ہیں یہاں ناشتہ کیا ہے نیم برشت انڈے صرف دو ہی ملے ہیں، چائے کا سیٹ بھی نہیں ملا ہے، وہی ابلی ہوئی چائے پی لی ہے جو عام طور پر ہوٹلوں میں پلائی جاتی ہے حکیم ابراہیم صاحب کو اپنے کسی دوست سے ملنا ہے اور مجھے محترمہ شفیقہ فرحت کے والد رستم خاں صاحب سے ملنا چاہتا ہوں جو اپنی صاحبزادی کے یہاں ودیا نگر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔۔ ابراہیم صاحب سے دس بجے چار مینار پر ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہوں، ٹیکسی نہیں ملی ہے رکشا بڑی آسانی سے مل گئی ہے ہوا میں اچھی خاصی خنکی ہے میں ٹھنڈے کپڑے پہنے ہوئے ہوں رکشا پست و بلند سڑکوں پر دوڑ رہی ہے، دونوں جانب کی شاندار عمارتوں میں زندگی جاگ چکی ہے، ان گنت چہرے باہر کی طرف جھانک رہے ہیں ان پر سیاہ اور دراز گھنی زلفوں کی رعنائی اور بیترگی بھی ہے، داڑھی اور چوٹیوں والے مذہب کا کھردرا پن بھی، میں زندگی کے ان ہنگاموں کا غور سے مشاہدہ کر رہا ہوں کام کی چیزیں احساس میں جذب ہو رہی ہیں، فاصلہ بہت کافی ہے رکشا والے کی ہمت پست نہیں ہوئی ہے وہ بڑے حوصلے سے رکشا چلا رہا ہے میں اکتا گیا ہوں بار بار گھڑی دیکھتا ہوں آج وقت کی رفتار طوفانی قسم کی ہے لمحات میں پہاڑی آبشاروں کی روانی ہے مگر نغمگی سے خالی، پروفیسر صغیر احمد کا مکان تھوڑی سی تلاش کے بعد مل گیا ہے یہ ودیا نگر کی مسجد کے قریب ہے جہاں خرابات کا دور تک پتہ نہیں رستم خاں صاحب اسی کے ایک حصہ میں رہتے ہیں۔۔

۹ بج چکے ہیں۔ رستم خاں صاحب غسل کر رہے ہیں، ان کی صاحبزادی نے انھیں اطلاع دے دی ہے اور مجھ سے باتیں ۔۔ کرنے لگی ہیں چند منٹ کے اندر ہی خاں صاحب آ گئے ہیں اور صغیر احمد صاحب سے بھی کہہ آئے ہیں میں زیادہ ٹھہر نہیں سکتا ہوں رکشا روک رکھی تھی وقت اور تیز گام ہو گیا ہے گھڑی کی دونوں سوئیاں جیسے آگے پیچھے بھاگ رہی ہوں معذرت کر کے چلنے لگا ہوں، شمیم صاحبہ کہہ رہی ہیں۔

یونیورسٹی دیکھو آئیے آپا کو ساتھ لے کر بہت قریب ہے!

رستم خاں صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس رہ چکے ہیں۔ برسوں تک یونیفارم پہننے سے ان کے بدن میں ایک مستقل چستی آگئی ہے اور جسم میں سرگرمی کی لہر دوڑتی رہتی ہے انداز سے ایسا لگتا ہے کہ وسل کی آواز پر کان لگائے ہیں جانتا ہوں وہ خوشی سے تیار ہو جائیں گے لیکن زحمت دیتے ہوئے کچھ شرم محسوس کر رہا ہوں خیال ہے کہ یونیورسٹی نہ دیکھوں، چنانچہ شمیم صاحبہ سے کہہ دیا ہے کہ خاں صاحب کو میں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔

چار مینار کے ارادے سے چلا ہوں سڑک پر آکر رکشا والا پوچھ رہا ہے۔

یونیورسٹی چلوں؟

نہیں وقت نہیں رہا۔

اس نے گھوم کر مجھے دیکھا ہے اور کہنے لگا ہے۔

وقت نکالیے، ہمارے شہر میں آنا اور یونیورسٹی نہ دیکھنا . . . .

اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر رکشا کا رخ یونیورسٹی کی جانب موڑ دیا ہے اور میں سوچتا ہی رہ گیا ہوں کہ حیدرآباد میں ایسے علم دوست بھی موجود ہیں جو پڑھے لکھے نہیں پھر بھی اپنی دانش گاہوں کا اتنا احترام کرتے ہیں اتوار کا دن ہے یونیورسٹی بند ہے میں نے اسی حالت میں علم و دانش کے اس مرکز کو دیکھ لیا ہے بالکل اسی طرح جیسے کسی حسین و جمیل دوشیزہ کو سونے کی حالت میں دیکھ لیا جاتا ہے اب اس کی جادو طرازی اور زیادہ ریز آنکھیں بند ہوتی ہیں، لیکن حسن ہر طرف بکھرا ہوتا ہے چار مینار پہنچنے پر رکشا والے نے صرف ساڑھے تین روپے لیے ہیں حالانکہ ان چند گھنٹوں میں اس نے بہت سا خون پسینہ کی شکل میں بہا دیا ہے ساڑھے دس ہو چکے ہیں نظامیہ ہاسٹل میں ابراہیم صاحب کو تلاش کیا وہ نہیں ملے، میں سالار جنگ میوزیم چلا گیا ہوں اور ٹکٹ لے کر اس دنیائے طلسم و حیرت کو دیکھنے لگا ہوں، ستر سے زیادہ کمرے ہیں سرسری طور پر ایک ایک کمرے کے عجائبات کو دیکھ رہا ہوں اور تین گھنٹے میں پورا میوزیم دیکھ لیا ہے حالانکہ مسلسل تین مہینے تک دیکھنے کی ضرورت تھی، اکثر نوادرات نے بے حد متاثر کیا ہے۔ یہ ایک ایسا "جام جم" ہے جس کے اندر دنیا بھر کے جلوے دیکھے جا سکتے ہیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص نے ذاتی سرمایہ سے کیونکر ایسی نایاب اور قیمتی چیزیں جمع کر لیں سالار جنگ یقیناً تاریخ کے بہت بڑے انسان تھے، یہاں سے مدینہ ہوٹل گیا ہوں کھانا کھایا ہے اور پھر ادیب صاحب سے ملنے مجرد گاہ چلا گیا ہوں ۱۱ بجے پہنچنے کا وعدہ تھا اور دو بجے کے بعد پہنچا ہوں ادیب صاحب انتظار کر کے گھر چلے گئے با پتہ بتا گئے ہیں اور اصرار کے ساتھ بلا گئے ہیں۔ میں یہاں کے فاصلوں سے ڈر رہا ہوں، ٹیکسی بمشکل ملتی نہیں اور رکشا کے ذریعہ اتنے لمبے فاصلوں کا طے کرنا زلف سر کرنے سے بھی زیادہ اہم ہے چار بجے اسٹیشن جانا ہے، مجبوراً معذرت نامہ لکھ کر میز پر رکھ دیا ہے اور پھر نظامیہ ہاسٹل آگیا ہوں ابراہیم صاحب استھانہ صاحب کے آفس میں مل گئے ہیں وہ ہاسپٹل جا چکے ہیں اور اب اورینٹ ہوٹل جا رہے ہیں ان کی روانگی جی ٹی سے ہو رہی ہے، حکیم عبدالحمید صاحب کل ہی ہوائی جہاز سے روانہ ہو چکے ہیں آج حکیم عبداللطیف صاحب کی قیادت میں طبی کانفرنس کا وفد چیف منسٹر سے مل رہا ہے میں ہاسپٹل آگیا

ہوں یہاں بالکل ہُو کا عالم ہے کمرے خالی پڑے ہوئے ہیں، بس کچھ نہ پوچھئے اس ویرانی کو دیکھ کر دل پر کیا گزر رہی ہے، مختصر یہ ہے کہ ع

بھری آتی ہیں آنکھیں دیکھ کر خالی مکاں میری

شدید وحشت ہو رہی ہے اکثر طویل سفر تنہا کئے ہیں کبھی گھبراہٹ محسوس نہیں ہوئی مگر تنہا سفر کرنا اور بات ہے اور قافلہ سے بچھڑ جانا اور بات ع

بازو کا درد اور ہے دردِ جگر ہے اور!

صبغۃ اللہ مل گئے ہیں جو سرزمین صندل یعنی میسور کے باشندے ہیں ہمراہ ان کے ساتھی عبدالقادر ملے ہیں دونوں طلبہ کالج میں پڑھتے ہیں اور ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں دونوں نے آٹوگراف لیے ہیں میں انھیں ساتھ لے کر یوسف حسین صاحب پرنسپل کے گھر گیا ہوں، سامان اوپر سے منگا کر چوکیدار کے حوالے کر دیا ہے، یوسف صاحب کا مکان زیادہ دور نہیں ہے مغل پورہ ہی میں رہتے ہیں وہ مل گئے ہیں — اپنے مختصر سے وجود میں باغ و بہار کو قید کیے جیسے کہہ رہے ہوں

قید ہے قید ہے جسم و جاں قید ہے — منزلیں قید ہیں کارواں قید ہے
ہر یقیں قید ہے ہر گماں قید ہے — ہائے کیا بے کراں بے زماں قید ہے

میں یوسف صاحب کا ادبی ذخیرہ دیکھنے لگا ہوں اور انھوں نے چائے منگائی ہے، صبغۃ اللہ اور عبدالقادر ٹیکسی لے آئے ہیں میں یوسف صاحب سے رخصت ہو رہا ہوں ان کے بنائے ہوئے نقوش دل و دماغ پر موجود ہیں سامان ٹیکسی پر رکھوا لیا گیا ہے اور میں اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گیا ہوں گاڑی چھ بجے جائے گی، ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا ہوں خیرات ندیم اور ابن احمد تاب آ گئے ہیں ان سے باتیں ہونے لگی ہیں خیرات ندیم قمر ندیم کی جانب سے کھانا نہ کھانے کا شکوہ کر رہے ہیں الفاظ میں ان کے اپنے جذبات کی گونج بھی ہے، انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اریب صاحب نے دوپہر کو کھانے کا انتظام کیا تھا دعوت میری بھی تھی لیکن میں نہیں جا سکا، آپ کا پرچہ اریب کی میز پر دیکھ آیا ہوں، مجھے محترمہ صفیہ بیگم کی تکلیف کا خیال کر کے تکلیف ہو رہی ہے ندیم ہی نے بتایا ہے کہ اریب کا مکان یہاں سے دور نہیں ہے اگر وہ ذرا دیر پہلے آ گئے ہوتے تو میں ٹیکسی لے کر چلا جاتا مگر اب اتنا وقت بھی نہیں رہا۔ ابن احمد تاب سے کھل کر باتیں ہو رہی ہیں ان کے اندر دلوں کو جذب کرنے کی کوئی مقناطیسی قوت ہے، جو ٹرین جنتا کی بوگی لے کر یہاں سے جاتی ہے وہ آ گئی ہے قلی نے سامان بوگی میں رکھ دیا ہے حکیم تیموری اور سید حیدری حسین بھی تشریف لے آئے ہیں۔ پلیٹ فارم پر ہی ڈاکٹر گیان چند جین صدر شعبۂ اردو حمیدیہ کالج بھوپال سے ملاقات ہوئی ہے وہ بمبئی، میسور، حیدرآباد وغیرہ کی سیاحت کو آئے تھے، چھٹیوں کا اس سے بہتر اور مصرف بھی کیا ہو سکتا ہے۔ سیاحت بھی ایک طرح کی ریسرچ ہے انھیں ٹکٹ نہیں مل رہا ہے بچے بھی ساتھ ہیں میں اپنی جگہ بیٹھ چکا ہوں حکیم یوسف صاحب بھی آ گئے ہیں ہم سب لوگ ٹرین میں بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں، وقت، اب ہوا کی طرح گزر رہا ہے، گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ رہی ہے میں نے سب سے

ہاتھ ملایا ہے احباب ہاتھوں کی جنبش سے اظہارِ خلوص کر رہے ہیں، سکندرآباد پر گاڑی ٹھہر گئی ہے اور ایک پتلے دبلے نوجوان کنڈکٹر ڈبے میں جھانک کر باہر ہی سے پوچھ رہے ہیں۔

کوثر صاحب کہاں ہیں ؟

فرمائیے میں حاضر ہوں۔

انھوں نے لسٹ دیکھ کر کہا ہے آپ کی سیٹ کا نمبر ۴ ہے اور آپ نمبر ۲ پر تشریف رکھے ہیں، میں پوچھتا ہوں آپ کو سونے کی جگہ مل گئی ہے ؟

جی ہاں مل گئی !

یہاں تکلیف ہو تو سامان دوسری جگہ رکھوا دوں، میں آگے نہیں جاؤں گا یہاں آپ کی جو خدمت کر سکتا ہوں اس کے لیے حاضر ہوں، دوسرے کنڈکٹر سے بھی کہہ دوں گا میں نے ان کا شکریہ ادا کیا ہے اور تعارف کرانے کی درخواست کی ہے وہ مسکرا کر کہہ رہے ہیں۔

میری کیا تعریف جی، تعریف آپ کی ہے آپ رائٹر ہیں، آپ کو بیسویں صدی میں پڑھتے رہتے ہیں، لسٹ میں آپ کا نام دیکھ کر سوچا زیارت کر لیں۔

وہ پنجابی ہیں اور پنجابیوں کو اردو سے جو محبت ہے اسے سب جانتے ہیں اس سفر کا تجربہ یہ ہے کہ اس طرف بیسویں صدی بہت پڑھا جاتا ہے اکثر دوستوں نے بیسویں صدی ہی کا ذکر کیا ہے دوسرے کنڈکٹر اتنے خوش ذوق تھے کہ بھوپال تک ایک مرتبہ بھی تشریف نہیں لائے، بوگی کا نصف حصہ ریزرو ہے حیدرآباد کے چند جاگیردار دہلی جا رہے ہیں پنڈت جی کے یومِ پیدائش پر ان سے مل کر اپنا میمورنڈم پیش کریں گے اس جماعت کے سکریٹری ہیوی الیکٹریکلس بھوپال میں ملازم ہیں وہ بھوپال سے ساتھ ہو جائیں گے ان کی موجودگی میں حیدرآباد چھوڑنے کا احساس ذرا کم ہو گیا ہے اسی لب و لہجہ میں نہایت خلوص اور اپنائیت کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں، ٹرین میں ڈائننگ کار نہیں ہے اچھا کھانا نہیں ملا ہے میں صرف چائے پی رہا ہوں شام کو گاڑی ناگپور پہنچی ہے اس وقت محسوس ہوا ہے کہ بھوپال قریب آ رہا ہے ناگپور سے اگلے اسٹیشن پر سنترے بیچنے والے ڈلیاں لیے ڈبے میں گھس آئے ہیں میں نے ایک ڈلیا خرید لی ہے جو لوگ سنترے کھا رہے ہیں وہ بے حد تعریف کر رہے ہیں آفتاب ڈوب چکا ہے تاریکی پھیلتی جا رہی ہے گاڑی شام کے دھندلکوں میں اپنے گاڑھے دھوئیں کو گھولتی تیزی سے دوڑ رہی ہے جب کوئی آبادی قریب آتی ہے زمین پر بجلی کے ستارے دمکنے لگتے ہیں میں اوپر کی برتھ پر لیٹ گیا ہوں، لیٹے لیٹے خیال آیا ہے "شبِ افسانہ" ہی دیکھ ڈالوں دراصل یہ "شبِ افسانہ" کی تصویر ہے جو حکیم یوسف صاحب نے چلتے وقت مجھے دے دی تھی، میں نے بیگ سے تصویر نکال لی ہے اس میں بہت سے جانے پہچانے لوگ ہیں بائیں جانب سے پہلے نمبر پر عاتق شاہ ہیں

جن کا ذکر کر چکا ہوں، پھر عوض سعید ہیں یہ نوجوان کہانی کار ہیں، میں انھیں پڑھتا رہا ہوں۔ ان کے پہلو میں اقبال متین ہیں چشمہ لگائے ہرے جاکٹ پہنے بغلوں میں ہاتھ دیئے بیٹھے ہیں وہ "اجلی پرچھائیاں"* کے خالق ہیں نہایت جاندار کہانیاں لکھ رہے ہیں ان کے بعد حکیم یوسف حسین ہیں، نثر میں تو نہیں نظم میں انسانی زندگی کی بولتی چالتی کہانیاں تصنیف کرتے ہیں جن میں افسانویت سے زیادہ حقیقت ہوتی ہے ان کے قریب نواب میر احمد علی خاں ہیں جو سمینار کے ایک اجلاس کی صدارت اور مشاعرہ کا افتتاح کر چکے ہیں چھٹے نمبر پر زینت ساجدہ ہیں پھر ابراہیم شفیق ہیں ان سے ملے ہوئے کوئی مولانا ہیں، تصویر کی پشت پر نام کی جگہ جو پارہ (×) بنا ہوا ہے وہ خود افسانہ نگار ہوں یا نہ ہوں کسی کہانی کار کے دالد ضرور رہوں گے ان کی شکل و شباہت سے "قصۂ چہار درویش" کا اولین ایڈیشن معلوم ہوتے ہیں سب سے آخر میں اکرام جاوید ہیں ان سے ملاقات ہو چکی ہے، تصویر بیگ میں رکھ کر پھر لیٹ گیا ہوں۔ حیدرآباد کی خوشگوار یادیں ذہن میں گھوم رہی ہیں اس ارض غزل کو پہلی بار دیکھ کر کچھ عجیب قسم کی مسرت ہوئی ہے مگر ساتھ ہی محرومیوں کے کچھ داغ بھی لایا ہوں، ادارۂ ادبیات اردو نہیں جا سکا یہ ڈاکٹر زور کی یادگار ہے زور صاحب سے برہان پور میں ملاقات ہوئی تھی ان کی صدارت میں ایک تقریر بھی کی تھی اور نصف گھنٹہ کے قریب صدارتی فرائض ادا ادا کرنے میں ان کی قائم مقامی بھی کرتا رہا۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر بھی نہیں جا سکا، حبیب الرحمٰن صاحب سے نہیں مل سکا، ڈاکٹر گوڑ، مخدوم محی الدین، اقبال متین، زینت ساجدہ، جاوید لطیفی، جیلانی بانو، .... نصیر الدین ہاشمی ڈاکٹر مسعود حسین خاں، اور پروفیسر سروری صاحب سے بھی نہیں مل سکا —— چار مینار کی زیارت کر لی مگر اتنے بہت سے مینار رہ گئے جو اپنی تعمیر میں کسی کے شرمندۂ احسان نہیں خود ہی تعمیر اور خود ہی معمار ہیں۔ حیدرآباد میں میرے کچھ اعزہ بھی ہیں علی مرتضیٰ صاحب جو نواب مہدی یار جنگ کے متوسلین میں تھے، ایک جعفر علی صاحب کے صاحبزادہ علیم الدین ہیں حیدر گوڑے میں رہتے ہیں ان میں سے کسی کو تلاش نہیں کر سکا، مل بھی جاتے تو ان کے سامنے شخصیت کی لمبی لائنس دہرا نا پڑتیں، حیدرآباد کے تہذیبی، تاریخی اور علمی و ادبی جاہ و جلال اور شوکت و رعنائی کا تصور کرتے کرتے سو گیا ہوں، بیچ میں آنکھ کھلتی رہی ہے، بھوپال کا اسٹیشن تین بجے آئے گا اور ابھی گیارہ ہی بجے ہیں، پھر بارہ اور دو بجے ہیں گاڑی اٹارسی اور ہوشنگ آباد کو پیچھے چھوڑ آئی ہے تالاب کی لہروں سے مس ہو کر آنے والی ہوائیں شعور سے یوں ٹکرا رہی ہیں جیسے گلاب کی پتیوں پر اوس کی بوندیں ٹپک رہی ہوں، میں نے بستر لپیٹ لیا ہے، بندھنی، برکھیڑہ، عبداللہ گنج، سرود، دیپ یکے بعد دیگرے گزر گئے ہیں اور اب ایک طرف بھوپال الیکٹریکلس کے قمقمے چمک رہے ہیں دوسری جانب ٹی ٹی نگر کے ستارے جھلملا رہے ہیں اور پھر ٹرین بھوپال کے پلیٹ فارم آ گئی ہے، سفر ختم ہو گیا ہے اور ذرا دیر بعد میں گھر آ گیا ہوں۔

بازگشت

آمنہ ابوالحسن کی ایک کہانی "درد کا رشتہ" پر جناب جاوید لطیفی صاحب نے فروری کے ماہنامہ "صبا" میں بڑا ملاکٹ تبصرہ فرمایا ہے اور کہانی کے فنی زاویوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے یہ فیصلہ صادر فرمادیا ہے کہ عورت کو جنسی موضوع پر قلم نہیں اٹھانا چاہیئے بلکہ سماج کے دوسرے "اخلاقی" موضوعات کو اپنانا چاہیئے۔ مطلب یہ کہ صنف نازک کا آج بھی ان کی نظر میں ریشمی کپڑے کی طرح مرد کے آغوش کو سجانے، گرمانے، شہوانی خواہشات کو پورا کرنے اور جنسی بھوک کو مٹانے کے سوا کوئی دوسرا مقصد حیات نہیں ہے۔ پھر اگر کوئی فنکار جرارت سے کام لے کر ان دبیز پردوں کو سماج کے چہرے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور اس فنکار کا تعلق صنف نازک سے ہوتا ہے تو "ذہنی پستی" اور "جنسی گھٹن" کا نام دے کر فوراً . . . . . . اس کا منہ بند کردیا جاتا ہے ورنہ شاید اندیشہ ہے کہ شکار کہیں چوکنا نہ ہوجائے اور یہ نرم و نازک ہستی افیون کی اس گولی کو اگل نہ دے جو اسے صدیوں سے کھلائی جاتی رہی ہے اور جو اس کڑوی اور زہریلی دوا کو بغیر منہ بنائے اپنا مقدر سمجھ کر حلق سے نیچے اتارتی رہی ہے۔

عصر حاضر میں یورپ کی لکھنے والی عورتوں نے اس موضوع پر بڑے فنکارانہ انداز سے قلم اٹھایا ہے اور معاشرے کی اس گندگی کو اس طرح برملا پیش کیا ہے کہ نقاب کا ایک تار تک باقی نہیں رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی گو دو چار لکھنے والی خواتین ہی نے اس موضوع پر لکھنے کی جرارت کی ہے لیکن اس پختگی اور سلیقہ کے ساتھ کہ ان کے ہم عصر ادیب منہ دیکھتے رہ گئے۔ ان میں سرفہرست عصمت چغتائی کا نام ہے۔ ان کی تحریروں پر ساتھیوں نے سخت تنقیدیں کیں، شور مچایا لیکن انہوں نے دکھتی رگ پر کچھ اس طرح ہاتھ رکھا کہ اسے ہٹائے نہ بن پڑا۔

آمنہ کی کہانی بے شک ایک جنسی کہانی ہے لیکن اس کا محور بھی عصمت کی کہانیوں کی طرح لذت اندوزی نہیں ہے بلکہ مرد کی جنسی بے راہ روی کو بے نقاب کرنا ہے۔ اس کی کہانی میں ایک اہم کردار مسیح کا ہے اور یہ ہماری موجودہ سوسائٹی پر ایک ایسا بدنما داغ ہے کہ اہل فن کی نظر اس پر پڑنی ہی چاہیئے اور ہر طرف سے اس کی بیخ کنی کی کوشش ہونی چاہیئے۔ اس پہلو پر آمنہ نے اپنی کہانی میں بڑی کاری ضرب لگائی ہے جو فریاد کی نہیں داد کی طالب ہے۔

دوسرا خاص کردار ثریا کا ہے۔ ثریا ایک باشعور اور سمجھ دار لڑکی ہوتے ہوئے بھی مسیح کی نفس پرستی کا شکار ہوجاتی ہے۔ مگر یہ لمحہ اس کی زندگی پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے کہ اس کی پوری زندگی اس لمحہ کی تابع ہوکر رہ جاتی ہے۔ خوف دہراس

لی ایک چنگاری اس کے اندر سلگ چکی ہے اور وہ اس کی سوزش اور کرب سے جا نبر نہیں ہو سکتی۔ بہ ظاہر وہ "سخت" ہے "جابر" ہے "پتھر" ہے لیکن دیکھنے والوں نے دیکھ لیا کہ وہ ایک موم بتی سے زیادہ نرم اور گداز ہے جو خود تو چپکے چپکے پگھلتی رہتی ہے لیکن ارادی طور پر اس کی کوشش یہی رہتی ہے کہ وہ دوسروں کے دامن کو اس آگ سے بچائے۔ اس اندرونی سوز کو دیکھنے اور محسوس کرنے والا شخص ایمن ہے۔ وہ ثریا کی نفسیاتی کشمکش سے بخوبی واقف ہے اور "ایک لمحہ" کی مجبوری کو اچھی طرح سمجھتا ہے اس لیے ثریا کے راز کو جانتے ہوئے بھی وہ اس کے ساتھ رہنے کی خواہش کرتا ہے لیکن ثریا کی نسوانی حمیت اسے گوارہ نہیں کرتی۔ ایمن کے کردار کو آمنہ نے بڑی نزاکت سے نبھایا ہے۔

اس کہانی کا شمار آمنہ کی بہترین کہانیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ادبی نقادوں کو چاہیئے کہ وہ کشادہ دلی سے کام لیں اور ماضی کے تاریک خول سے نکل کر کھلی فضا میں سماج کے تقاضوں کا جائزہ لینے کی طرف توجہ فرمائیں ورنہ ایسا نہ ہو کہ ان کا ذہن زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکے اور ان کے دلوں کا چور پکڑا جائے۔

ریاست خانم - حیدرآباد

میری کہانی کی پسندیدگی کے لیے جاوید لطیفی صاحب کا بے حد شکریہ، لیکن جیسا کہ انھیں خود بھی شبہ ہے — میں ان کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں جو انھوں نے آمنہ ابوالحسن کی کہانی کے سلسلے میں ظاہر کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ "جنسی نفسیات" غالباً ان تمام موضوعات میں سب سے زیادہ مشکل ہے جس پر قلم اٹھایا جاتا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس موضوع کو اپنا کر بیتے کی بات صرف اسی وقت کہی جا سکتی ہے جب کہ لکھنے والا اس موضوع پر پوری طرح قادر ہو ورنہ سطحی انداز میں جنسی موضوع پر کہی ہوئی بات "فحش" ہو جاتی ہے۔

لیکن — اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خواتین کو جنسی موضوع پر قلم نہیں اٹھانا چاہیئے — اگر ایسی پابندی لگادی جاتی — تو اردو کو عصمت جیسی اونچی ادیبہ نصیب نہ ہوتی۔

نعیم زبیری - حیدرآباد

"صبا" کے تازہ شمارے میں آمنہ ابوالحسن صاحبہ کی کہانی کے بارے میں جاوید لطیفی صاحب کا خط نظر سے گزرا نہیں معلوم جاوید لطیفی صاحب نے جنس کو کیا تصور کر لیا ہے جبھی تو وہ سب پر یہ حکم لگانا چاہتے ہیں کہ کوئی اس پر قلم نہ اٹھائے۔

معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ جاوید صاحب خود بری طرح جنسی گھٹن میں مبتلا ہیں شاید اسی لیے انھیں ایک اچھی خاصی کہانی میں سوائے جنس کے کوئی اور بات اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔ اصل میں مردہ پرستی کی طرح حیدرآباد کے لوگوں میں اب یہ رجحان بھی تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے کہ شہرت پانے والے مقامی لوگوں کو خواہ مخواہ CRUSH کیا جائے۔ غالباً جاوید صاحب اپنی ان گنی چنی کہانیوں کو بھول گئے جو خالص جنسی موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ آپ کو

صب

جاوید صاحب کی رائے سے اختلاف یا اتفاق ہو سکتا ہے لیکن چوں کر جاوید صاحب نصاری خواتین کو اپنے خیال کا پابند کرنا چاہا ہے اس لیے میں اس خط کی صدائیں اشاعت بے حد ضروری سمجھتی ہوں۔

آمنہ صاحبہ سے میری ملاقات نہیں لیکن میں ان کے بارے میں ایک لفظ بھی کہنا نہیں چاہتی کیوں کہ کم ازکم میری دانست میں اب وہ اہلِ حیدرآباد یا اہلِ ہندوستان کے لیے کسی مزید تعارف کی محتاج نہیں رہی ہیں۔ اگر ان کے ہم وطن لوگ ہی ان کی قدر کرنے کی بجائے انھیں اس طرح بلاوجہ نشانہ بنائیں تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔

عزیزہ اطہر۔ (اور بہت سی دوسری لڑکیاں) زنانہ کالج۔ حیدرآباد

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل

مخدوم محی الدین کا دوسرا مجموعۂ کلام

گلِ تر

قیمت:- ایک روپیہ ۵۰ نئے پیسے

ناشر:- مکتبۂ صبا ، امجرد گاہ

حیدر آباد

کہانی میری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے

اقبال متین

کا

پہلا افسانوی مجموعہ

اجلی پرچھائیاں

قیمت:- چار روپے ۵۰ نئے پیسے

ناشر: مکتبۂ صبا ، امجرد گاہ

حیدر آباد دکن

…واں سال شاعر

راشد آذر

کا

شعری مجموعہ

نقشِ آذر

قیمت:- دو روپے

ناشر:- مکتبۂ صبا

، امجرد گاہ حیدر آباد

…بیاباں ہی بھی

…جنوں جامہ دری

مجھ پہ لازم ہے

سلیمان اریب کا پہلا مجموعۂ کلام

پاسِ گریباں

قیمت:- دو روپے ۵۰ نئے پیسے

ناشر:- انجمن ترقی اردو حیدر آباد

…نسل کے

…ین شاعر

زبیر رضوی

…نظموں غزلوں اور گیتوں کا

انتخاب

لہر لہر ندیا گہری

(زیر طبع)

ناشر

مکتبۂ صبا ، امجرگاہ حیدر آباد

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

صبا

ماہنامہ

کتابت: محمد مظہر

جلد ۱۰

شمارہ ۴

ماہ	اپریل
سنہ	۱۹۶۴ء

قیمت ایک روپیہ

زر سالانہ ہند و پاک سے ۱۰ روپے

ششماہی ۶ روپے

بیرون ہند سے ۲۰ شلنگ

ایڈیٹر: سلیمان اریب

فون (۴۲۴۰۲)

حیدرآباد دکن

دہلی آفس:- ۱۵۰۷ ترکمان گیٹ دہلی ۶

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:- ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۳۲۰۲) کراچی ۳

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب، ۱۷ حجرہ درگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد، مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

صبا

بھارتی زبانوں میں تار

آپ بھارت کی
کسی بھی زبان
میں
تار بھیج سکتے ہیں
بشرطیکہ
پیغام
دیوناگری رسم الخط
میں ہو

انگریزی میں تار بھیجنے کے لئے جو سہولیات دستیاب ہیں، اب وہ دیوناگری رسم الخط میں تار بھیجنے کے لئے بھی حاصل ہیں۔ تہنیتی تار (مبارک باد کے جملے ہندی میں) ڈی لکس تار،

اخباری تار، بیماری و حادثے سے ترجیحی تار (پراشٹی ہیومن لائف ٹیلی گرام) ٹیلی فون پر تار (فونوگرام) اور تار کے مختصر پتوں کی رجسٹریشن۔

یہ سروس اب ۲۰۰۰
تار گھروں میں دستیاب ہے



محکمۂ ڈاک و تار

صبا

اس شمارے میں

سرورق :۔ اسٹل لائف
عمل :۔ ایم ۔ اے ۔ کریم

مکتبۂ صبا

۱۷ مجرد گاہ حیدرآباد دکن سے حاصل کیجئے

انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی مطبوعات

گوتم بدھ	(طویل نظم)	فضل الرحمن	۱/-
چنگیز	(ڈراما)	″	۲/-
سقراط	(ڈراما)	″	۱/۲۵
چراغ منزل	(مجموعہ کلام)	شاہد صدیقی	۲/-
پاس گریباں	″	سلیمان اریب	۲/۵۰
رخسار سحر	″	خورشید احمد جامی	۲/۷۵
زبان اور علم زبان		پروفیسر سروری	۷/-
یادگار فرحت	(مضامین)	غلام یزدانی	۲/-
تلگو ادب کی تاریخ		راما راج راؤ	
		زینت ساجدہ	۳/-
اردو تلگو لغت	زیر طبع	ڈاکٹر راما راؤ	
تلگو اردو لغت		گوپال کرشنا راؤ	۳/۵۰
بچوں کی کتابیں	(مکمل سٹ)		۲/-

نیا انسان	(منظوم ڈراما)	فضل الرحمن	۱/۰
کلپنا	(مجموعہ کلام)	اختر عادل	۱/۰
غزل اور مسائل	(تنقید)	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۲/
اجلی پرچھائیاں	(افسانے)	اقبال متین	۲/۵۰
نظامی گنجوی	(تحقیق)	رضیہ اکبر حسن	۳/۵۰

ان کے علاوہ

کاروانِ وطن	(مجموعہ کلام)	تلوک چند محروم	۷/۵۰
بہار طفلی	(بچوں کی نظمیں)	″	۳/۵۰
نوائے کفر	(مجموعہ کلام)	منور لکھنوی	۲/۵۰
بیکراں	(″)	جگن ناتھ آزاد	۴/۵۰
اردو		″	/۵۰
آب و تاب	(مجموعہ کلام)	سعادت نظیر	۱/۵۰
نوید گل	″	″	/۶۰
پھول کلیاں	″	″	/۶۰
نیرنگ نظر	″	روحی علی اصغر	۲/۰
جام صہبا	″	ابوالخیر صہبا	۲/۰
سلام صہبا	″	″	۱/۰

مکتبۂ صبا کی مطبوعات

گل تر	(مجموعہ کلام)	مخدوم محی الدین	۱/۵۰

پہلی باتیں

یہ بجا ہے کہ ادب کی نئی نسل اور پرانی نسل کے لیے چوڑے جھگڑوں میں الجھنے کی بجائے ہمیں اچھی نسل کو پہچان کا اہل ہونا چاہیے، تاہم نئی اور پرانی فہم کے امتیاز کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ نئی نسل بہر صورت نئی ہے، ہمارے نئے سماج کی نمائندہ ہے اور اس کا اپنا مخصوص کردار ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں بھی جھجک نہیں کہ ہمارے مصنفین کی نئی پود موجودہ دور کے قاری کے مانند اپنے پیش روؤں سے زیادہ پختہ سنّ اور ذہین ہے اور اگلے لوگوں سے کم عمر نہیں بلکہ نوع انساں کی طویل تر عمر کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہمیں اپنے ان بڑوں سے اتفاق نہیں جو نئی روشنی کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں اور ادب میں جمود اور انحطاط کا نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ ان کا اپنا مقام مسلّم ہے لیکن ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے یہ واجب التعظیم اساتذہ بظاہر دورِ حاضر میں زندہ رہ کر بھی دراصل اپنے ماضی میں سانس لے رہے ہیں، نئے تقاضوں کی پہچان سے قاصر ہیں اور حیاتِ نو سے متعارف ہوئے بغیر تخلیق کاروں پر بے جا فتوے صادر فرما رہے ہیں۔

نئی نئی تخلیقات ــــ خاص طور پر افسانوی ادب کی نمایاں ترقی ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے۔ ان میں صرف چند ادبی پارے تو نہ صرف ہمارے اپنے معاشرے بلکہ ہمہ گیر اقدار کا آئینہ ہیں، ہمارے بیشتر نئے ادبا کو بخوبی علم ہے کہ کل کی عالمگیر سوسائٹی میں ان سے کس رول کو اپنانے کی توقع کی جائے گی۔ یہ سب علامتیں بڑی صحت مند ہیں، فی الحقیقت ان سے چشم پوشی کر کے نیا تخلیق کار اپنے زمانے کا ساتھ دینے سے رہ جاتا۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ عصرِ نو کی تیز رفتاری کے باوجود ہمارے نئے لکھنے والے کا دم نہیں پھولا، اور اس میں ابھی مستقبل کی کئی منزلیں طے کرنے کے کس بل ہیں لیکن کسی بڑی ذمہ داری کو وقار سے سنبھالنا درکار ہو تو استعداد کے ساتھ ساتھ محنت سے کام لینا بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔

جہاں ہم نئے مصنفین کی فہم اور استعداد کے قائل ہیں، وہاں کئی بار ان کی سہل پسندی دیکھ کر ڈر سے جاتے ہیں کہ کہیں یہ بنا بنایا کھیل چوپٹ نہ ہو جائے۔ ادب میں ذہانت اور احساس کے بغیر تو بہر حال کوئی چارہ نہیں لیکن قلم سے لہو نہ ٹپکے تو ذہانت جلد ہی پیلی پڑ جاتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ حسن کا نام جامعیت بھی ہے تو نئے فنکار کو اپنی سائنسی صلاحیتیں بھی بروئے کار لانا ہوں گی، محبت کے اظہار کے لیے بڑی کڑی ریاضت کرنا ہو گی ــــ اور ہم صرف اس لیے ناامید نہیں کہ نئی نسل محنت سے کترانے کے باوجود محنت کی افادیت سے غافل نہیں، سہل پسندی کے باوجود اپنے ضمیر کے ہاتھوں نالاں ہے۔

علی احمد جلیلی

جلیل کی نجی زندگی کی ایک جھلک

جلیل کی زندگی کا زیادہ حصہ دکن میں بسر ہوا۔ وہ استادِ شاہ تھے اور معقول مشاہرہ پاتے تھے۔ شاعری کا ان پر بڑا احسان ہے جس نے انھیں وہ اعزاز بخشا اور ایسی فارغ البالی نصیب کی جو بہت کم شاعروں کے حصہ میں آتی ہے لیکن اس تمول و امارت کے باوجود ان کی زندگی بہت ہی سادہ اور لہو و لعب سے پاک رہی ہے۔ امیری میں بھی فقیری کی۔ جن لوگوں نے جلیل کو صرف ان کی شاعری کے ذریعہ جانا ہے شاید وہ یہی سمجھتے ہوں کہ جلیل شعر و نغمہ کی بزم آرائیوں میں مصروف اور عیش و عشرت کے دلدادہ ہوں گے اور ان کی زندگی ان کے کلام ہی کی طرح رنگین رہی ہوگی جیسے

وصال یار بھی ہے دور میں شراب بھی ہے ۔۔۔ قمر بھی ہے مرے پہلو میں آفتاب بھی ہے

پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیل ۔۔۔ بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی

لیکن صورت حال اس کے برعکس تھی۔ اس میں شک نہیں کہ حیات کی تلخیاں اور غم دوراں کی آنچ ان تک بہت کم پہنچی اور آسودگی و فراغت انھیں ضرور حاصل رہی پھر بھی نشاطِ حیات و آسائشِ نفس کی گرد بھی ان کے دامن تک نہ پہنچ سکی۔

زہد و عبادت

دنیاوی دلچسپیوں اور لذتوں سے دور، جلیل کا زیادہ وقت فرائض نماز کی ادائی تسبیح و تہلیل اور اوراد و وظائف میں صرف ہوتا۔ صبح کی نماز کے بعد پہلے تلاوت قرآن شریف فرماتے پھر وظیفہ شروع ہوتا جو دن چڑھے تک جاری رہتا۔ نماز ظہر اور نماز مغرب کے بعد کا وظیفہ مختصر ہوتا البتہ نماز عشاء کے بعد دیر تک ذکر میں مشغول رہتے شب کو بقدر ضرورت سوتے، رات کے کسی حصہ میں بیدار ہو کر تہجد و نوافل ادا کرتے۔ خالی اوقات میں بھی ہاتھ میں تسبیح ہوتی، ہر وقت باوضو رہتے اور باوجود اس کے ہر نماز کے لیے وضو تازہ کرتے۔ میں نے آپ کی کوئی نماز قضا ہوتے نہیں دیکھی۔

امیر مینائی اپنے ایک مکتوب میں جلیل کے بارے میں لکھتے ہیں ۔۔ "آدمی ایسے اچھے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پھیلیں"۔ اور مولانا سلیمان ندوی فرماتے ہیں ۔ "حضرت جلیل کو دنیا نے جانشین امیر کہہ کر پکارا۔ جانشینی حقیقت میں پوری تھی۔ ظاہری و باطنی ۔ دونوں اوصاف کے لحاظ سے وہ جانشین تھے۔ جو زہد و تقویٰ پابندی دینی اور

ذکر و فکر و مراقبہ اور مدارس استادی میں تھی وہی شاگرد کو ملی ۔ خواجہ حسن نظامی کہتے ہیں "وہ ہمیشہ پابندی کے ساتھ تہجد پڑھتے تھے، اور آخر وقت تک بھی ان کی عبادت کا سلسلہ جاری رہا۔ اللہ تعالی ان کی شاعری کا فیض شاعروں کو پہنچا اور ان کی عبادت کا فیضان سب کو نصیب کرے۔"

وضع قطع

وضع نہایت سادہ اور درویشانہ۔ گندمی رنگ، میانہ قد، اوسط داڑھی، آنکھوں میں سرمہ کی تحریر، سر پر لکھنؤ کی سیاہ مخملی ٹوپی، چھوٹی موری کا پاجامہ، ململ کا کرتا جو گھٹنوں تک پہنچتا تھا سیاہ رنگ کا پمپ شو یا بھورے رنگ کا سلیم شاہی جوتا، شیروانی جو عموماً بادامی رنگ یا کسی ہلکے رنگ کی ہوتی۔ ہاتھ میں رومال اور تسبیح، بیچ سے مانگ نکالتے اور پٹے رکھتے تھے۔

سیرت و اخلاق

سیرت و اخلاق کا بہترین نمونہ، پاکیزہ طبیعت اور فرشتہ صفت انسان تھے۔ طبیعت میں عاجزی و انکساری انتہا کی تھی۔ غرور، کم بینی اور خود ستائی نام کو نہ تھی۔ کبھی کسی سے معاصرانہ چشمک تک نہ ہوئی۔ نہایت خوش گو۔ طریق گفتار میں متانت، آہستگی اور نرمی، تیز آواز میں کبھی گفتگو نہیں کی۔ جو شخص ایک بار ان سے مل لیتا اس کے دل سے ان کی مروت و اخلاق کا نقش کبھی نہ مٹتا۔ ہر ایک کی قدر اس کے رتبے سے زیادہ کرتے۔ اتنے نفیس طبع کہ کسی کی برائی سننا گوارا نہ تھا۔ چھوٹا، بڑا جو بھی ان سے ملنے کو آتا اور وہ اندر ہوتے تو اطلاع ملتے ہی باہر بے تکلف چلے آتے۔ کبھی کسی کو زحمت انتظار نہیں دی۔ ہاں سرکاری کلام کی اصلاح میں مشغول ہوتے تو معذرت چاہ لیتے۔ دوسروں کی زبان سے اپنا کلام سنتے تو خاموش رہتے۔ اپنے اشعار خود کسی کو نہیں سناتے۔ البتہ فانی، جگر یا جوش جب کبھی آتے اور ان سے کلام سننے کی فرمائش کرتے تو مجبور ہو جاتے لیکن اس وقت تک انھیں اپنے اشعار نہ سناتے جب تک کہ پہلے خود ان سے ان کا کلام نہ سن لیتے۔ کوئی شاگرد ان کی تعریف میں کوئی شعر غزل میں لکھوا لاتا تو اسے قلم زد کر دیتے۔ جنھیں حضرت جلیل کی صحبت حاصل رہی ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ جلیل بہت ہی خوش مزاج تھے اور کسی اچھی بات کا لطف تالی بجا کر لیتے۔

روزمرہ کی مصروفیات

روزانہ کا معمول یہ تھا کہ صبح بعد ناشتہ ۹ بجے کے بعد باہر آ کر دیوان خانے میں بیٹھ جاتے۔ دیوان خانے کے دو حصے تھے۔ ایک جلیل منزل کا بڑا ہال دوسرا اس سے متصل ورانڈہ۔ جو قدیم وضع کے صوفوں اور کرسیوں سے آراستہ تھے۔ دیواروں سے فریم آویزاں تھے جن میں بیل بوٹوں کے درمیان نہایت خوبصورتی سے اشعار درج تھے۔ ایک فریم پر یہ شعر منقش تھا ؎

تم کو تو میں کہتا نہیں کچھ حضرت ناصح ۔۔۔ پر جس کو ہو ایسی وہ عاقل نہیں ہوتا

غالباً یہ شعر ان لوگوں کے لیے لکھوایا گیا تھا جو بلاضرورت باتوں سے آپ کا وقت ضائع کرتے۔ اندرونی ہال میں ایک صوفہ اور بیرونی ورانڈہ میں ایک آرام کرسی آپ کے لیے مخصوص تھی۔ سامنے تپائی پر خاصدان ان کے قریب ہی

صب

رکھا ہوتا۔ صوفہ کی سیدھی جانب ایک کرسی پر جناب انوار الدین عتیق دفتر اصلاح کے ساتھ تیار موجود رہتے۔ جناب عتیق شاگرد جلیل بھی تھے اور اصلاحی کام پر ملازم بھی۔ آخر دم تک خط و کتابت اور اصلاح کا کام انھیں کے ہاتھوں انجام پاتا۔ غرض ۸ بجے سے بارہ بجے تک جلیل کی نشست یہیں رہتی۔ شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے۔ ان کے خطوط و استفسارات کے جوابات لکھواتے۔ پہلے کلام شاہی دیکھا جاتا بعد ازاں دوسرے کام ہوتے۔ اسی درمیان ملنے والے آجاتے اور ملاقات کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔

بارہ ساڑھے بارہ تک یہی معروفیت رہتی۔ بعد ازاں کھانے کے لیے اٹھ جاتے۔ کھانے کے بعد دو بجے تک آرام فرماتے۔ بعد نماز ظہر پھر باہر آکر بیٹھ جاتے اور وہی کام کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ نماز عصر کے بعد کچھ دیر تک گھر کے اندر ہی افراد خاندان میں رہتے۔ پھر باہر آکر بیٹھتے۔ اس وقت سے لے کر رات تک ملاقاتیوں کا ہجوم رہتا۔ موسم گرما میں صحن میں پانی کا چھڑکاؤ ہوتا، اطراف سے کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ درمیان میں تپائی پر خاصدان رکھا ہوتا۔ یہیں ادبی مسائل اور شعر و شاعری کے نکات حل ہوتے۔ نماز عشاء ادا کر کے کھانا کھاتے تک دس بج جاتے اور سونے کا وقت ہو جاتا۔

شعر کہنے کا طریقہ

جلیل بسیار گو نہ تھے۔ بہت کم کہتے تھے۔ غزلیں طویل نہیں ہوتی تھیں۔ شعر کہنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ جس مصرع طرح پر غزل کہنا ہوتی اس کو ذہن میں رکھتے اور دیگر مشاغل کے دوران میں موزوں کرتے جاتے۔ قلم اور کاغذ لے کر کبھی میں نے انھیں فکر سخن کرتے نہیں دیکھا۔ عموماً رات میں فکر کرتے کیونکر کرتے یہ تو معلوم نہ ہو سکا لیکن اکثر ایسا ہوا ہے کہ صبح مجھ سے کہتے کہ کچھ شعر ہو گئے ہیں لکھ لو۔ میں کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور وہ مسلسل اشعار لکھواتے جاتے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی نشست میں غزل مکمل ہو جاتی۔ وہ اس طرح کہ پہلے تو طرح کا تعین ہوتا پھر قافیہ دریافت کرتے جاتے۔ جو قافیہ کہا جاتا اس پر کچھ دیر غور کر کے شعر لکھوا دیتے۔ ہر قافیے پر شعر نہیں کہتے تھے قافیے کے چناؤ کے معاملے میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ ردیف کے ساتھ بے تکلف میل کھانے والے قوافی کو ترجیح دیتے باقی چھوڑ دیتے غزل مکمل ہو جانے کے بعد کئی بار پڑھوا کر سنتے۔ بعض مصرعوں میں رد و بدل ہوتا۔ کچھ شعر خارج کر دیتے اور منتخب اشعار رکھ لیے جاتے۔

پان کا شوق

جلیل کو پان کا بہت شوق تھا پان کا بڑا اہتمام ہوتا تھا۔ لکھنوی روایات کے مطابق کتھا خاص طریقے پر تیار کیا جاتا تھا جس سے اس میں کڑواہٹ یا کسیلاپن باقی نہ رہتا۔ پکے ہوئے پان زیادہ مرغوب تھے۔ پان کے ساتھ تمباکو بھی کھاتے جس کی مقدار بہت کم ہوتی۔ یہ بتاں بیٹھے بٹوں سے بھرا خاصدان وہاں موجود رہتا جس قدر لوگ ساتھ بیٹھے ہوں پہلے ان کو کھلاتے پھر خود کھاتے۔

اس موقع پر ایک بات یاد آتی ہے۔ جلیل کے ایک شاگرد اسمٰعیل علی خاں عالی مہر جوری تھے۔ اکثر اپنا کلام برائے اصلاح سنانے آجاتے۔ یہ حضرت پان کے بڑے شائق تھے اور اپنی جیب میں ہمیشہ پان سے بھری ہوئی ڈبیہ رکھتے

آتے ہی ڈبیہ کھولی اور پان پیش کر دیا۔ جلیل کو ہر چند کہ دوسری جگہ کے بنے ہوئے پان پسند نہ تھے لیکن اخلاقاً قبول فرماتے لیکن مشکل یہ تھی کہ اس میں چونا اس قدر زیادہ ہوتا کہ وہ برداشت نہ کر پاتے پھر بھی انکار کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا بعض وقت ایسا بھی ہوا ہے کہ اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے وہ با اصرار کہتے کہ خان صاحب پان تو خاصدان میں موجود ہیں، میں نے ابھی ابھی پان کھایا ہے لیکن یہ خاں صاحب کہاں کے ماننے والے تھے جب تک اپنا پان کھلا نہ لیتے چین نہ پاتے۔

کھانا پینا

جلیل کے کھانے پینے کی چیزیں زیادہ تر سادہ اور کم مقدار میں ہوا کرتی تھیں۔ ناشتہ میں انڈا نیم برشت، ڈبل روٹی کے سینکے ہوئے توس، کچھ مسکہ، دودھ دودھ کا استعمال بڑے شوق سے کرتے تھے۔ نہ صرف پیتے تھے بلکہ ڈبل روٹی کے ساتھ کھاتے بھی تھے۔ چائے یا کافی انھوں نے کبھی نہیں پی۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں ہلکا پتلا شوربہ جس میں مرچ برائے نام ہوتی چپاتی کے ساتھ کھاتے۔ ترکاریوں میں بھنڈی، کدو اور سبزیاں مرغوب تھیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی ترکاری ان کے دسترخوان پر نہ ہوتی۔ چاول برائے نام لیکن دو لقمے آخر میں ضرور چکھ لیا کرتے۔ سبز پودینہ کی چٹنی بہت پسند تھی۔ دالوں میں صرف ماش کی ابلی ہوئی دال ہی کھاتے۔ موسم سرما میں یخنی کا استعمال کرتے۔ پھلوں میں موسمبی اور خربوزہ مرغوب طبع تھا۔ آم بہت کم کھاتے اور وہ بھی صرف تخمی آم۔ میٹھی چیزوں میں صرف کھیر پسند تھی، مشروبات سے بالکل رغبت نہ تھی۔

چند خاص مشاغل اور دلچسپیاں

خیرات کا بہت شوق تھا۔ جو آتا خالی ہاتھ نہ جاتا۔ بہتوں کی ماہوار مقرر تھی۔ دیگر حاجت مند بیواؤں اور مسافروں کی امداد اس طرح کرتے کہ کسی کو خبر نہ ہوتی۔ بعض صدا دینے والے فقرا آپ کی غزل کے اشعار گاتے اور خیرات لے جاتے۔ اوسط طبقے یا اعلیٰ طبقے کے جن لوگوں سے گہرے مراسم تھے ان کے ہاں کھانے پینے کی چیزیں بھجوا کر بہت خوش ہوتے۔ خود اپنے سامنے خوان بھرواتے اور اس بات کا بڑا خیال رکھتے کہ جو چیز بھی جائے با افراط بھیجی جائے۔ آم کے موسم میں لکھنؤ اور رام پور سے بطور خاص آم منگوا کر اپنے دوست احباب میں تقسیم کرواتے۔

ایک اور عجیب مشغلہ ان کا یہ تھا کہ ہر ماہ بازار سے چڑیاں خرید کر منگواتے۔ ان میں عموماً عام چڑیاں ہوتیں اور کبھی خاص پرندے۔ اس کے لیے ایک خاص پنجرا مخصوص تھا۔ جب پنجرا چڑیوں سے بھر کر آجاتا تو صحن میں بیٹھ کر اپنے سامنے رکھواتے اور پنجرے کا دروازہ کھول دیتے۔ چڑیاں پھر پھر کر کے چہچہاتی ہوئی اڑ کر در و دیوار یا درختوں پر جا بیٹھتیں۔ چڑیوں کی آزادی کا یہ منظر دیکھ کر بہت محظوظ ہوتے۔ ان میں اگر کوئی ایسی ہوتی جو اڑ نہیں پاتی تو اس کے لیے دانہ پانی کا انتظام ہوتا۔ اس موقع پر مجھے جلیل کا یہ شعر یاد آتا ہے:۔

اس گرفتار کی پوچھو نہ تڑپ جس کے لیے
در قفس کا ہو کھلا، طاقت پرواز نہ ہو

غلام ربانی

مرزا فرحت اللہ بیگ کا مزاح

لکھنا لکھنے سے آتا ہے۔ آدمی برسوں سے لکھتا ہے تب کہیں جا کر اسے لکھنے کا سلیقہ آتا ہے اور بعض تو پھر بھی کورے رہتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے چھپتے ہی میدانِ ادب میں ایسی ذقن لگائی کہ اس وقت کے مزاح نگار دیکھتے رہ گئے اور یہ بہت سوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئے۔ ظرافت ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ باتوں باتوں میں ایسی بات کہہ جاتے کہ سننے والے کو ہنسی آجاتی تھی۔ شروع میں کبھی کبھی کوئی مزاحیہ مضمون لکھتے تو یہ یہاں کے معمولی رسالہ "نمائش" میں مرزا الم نشرح کے نام سے چھپتا تھا۔ انہی دنوں آپ نے ایک مضمون مولوی نذیر احمد مرحوم پر لکھا اور حسبِ معمول عظمت اللہ خاں مرحوم کو سنایا۔ خاں صاحب بہت اچھا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ انہی کی طرف اشارہ کرکے مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ :۔

"۔ ۔ ۔ وہ مر گئے ہم کو مرنا ہے، لیکن اگر میرا کوئی مضمون زندہ رہ گیا تو اسے مرنے والے کا صدقہ سمجھیے۔"

غرض جب خاں صاحب نے مولوی نذیر احمد کی کہانی سنی تو پھڑک گئے اور کہا "آغا، یہ مضمون نمائش میں نہیں چھپے گا بلکہ رسالہ "اردو" میں چھپے گا اور فرحت اللہ بیگ کے نام سے چھپے گا۔" انھوں نے کسرِ نفسی کے طور پر پہلو تہی کی مگر آخرکار خاں صاحب نے انھیں پردہ سے نکالا اور یہ مضمون 'اردو' میں ان کے نام سے چھپا۔

اس مضمون کا چھپنا تھا کہ ہر طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کا شور بلند ہوا، اور مرزا صاحب کا نام جھنڈے پر چڑھ گیا۔ کہنے کو تو یہ ایک مضمون ہے مگر مولوی نذیر احمد کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ایک ضخیم سوانح عمری پر بھاری ہے۔ جن حضرات نے مولوی صاحب کو نہیں دیکھا ہے ان کی نظروں میں مرحوم کی چلتی پھرتی تصویر پھر جاتی ہے۔

اردو میں کردار نگاری کا ایسا مرقع اب تک کسی نے پیش نہیں کیا تھا اس میں وہ اپنے عہد کی عام سطح سے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ بعد کے مضمونوں میں اس معیار کو قائم رکھنا خود ان کے بس کی بات نہیں رہی۔ اس میں ایک نازک پہلو یہ آپڑا تھا کہ مرزا نے اپنے استاد پر قلم اٹھایا جن کا وہ بے حد احترام کرتے تھے مگر اپنے مزاج کی افتاد سے مجبور تھے جہاں ان کے علم و فضل اور دوسری خوبیوں کو سراہا ہے وہیں ان کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کر دیا ہے مگر یہ کمزوریاں اس پیرایہ میں بیان کی گئی ہیں کہ پڑھنے والے کو ان سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی مرزا صاحب کا کمال ہے اس خصوصیت

ہیں کوئی مزاح نگاران کا حریف نہیں۔ اس مضمون پر بعض حضرات نے ایک ہجو بھی چڑھائی کہ مرزا صاحب نے اپنی ظرافت دکھانے کے لیے سب سے پہلے اپنے استاد پر ہی ہاتھ صاف کیا مگر وہ پہلے ہی لکھ چکے تھے کہ:

"... میں اپنے طرز بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں میری شوخی بعض جگہ حد تجاوز سے بڑھ گئی ہے لیکن اپنے تمام قارئین کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے . . ."

پطرس کو چھوڑ کر ہمارے بعض مزاح نگار اپنے کچھ پسندیدہ موضوع لکھتے ہیں اور سہر پھر کر اسی میدان میں قدم رکھتے اور رکاوٹ سے کاٹتے رہتے ہیں چنانچہ بعض کے مضامین میں ایک اچھوتے انداز کا مقامی رنگ ہوتا ہے بعض الفاظ سے کھیلتے ہیں اور لفظوں اور جملوں کی ترکیب کو توڑ مروڑ کر لکھتے ہیں طرز خیال کے سانچوں کو بگاڑ کر ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں کہیں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے شریفانہ عشق کا ذکر ہوتا ہے۔ بعض حضرات جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کی وہ "ذہنی کھچڑی" (؟) بکھر جاتی ہیں۔ مرزا صاحب موضوع کے قید و بند سے آزاد ہیں۔ ان کے ہاں ادب، سماج، سیاست، تاریخ، سوانح، شاعری، مرتبہ نگاری، قانون غرض کہ موضوعات کی گوناگونی ہے اور لطف یہ ہے کہ ہر موضوع کو زعفران زار بنا دیا ہے بیان اس قدر شگفتہ ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھتے جائیے کہ جی نہیں اکتاتا۔

خوش مذاقی کی تعریف عظمت اللہ خاں نے یوں کی ہے کہ "پڑھنے والے یہ بھی مانتے جائیں کہ آپ نے ٹھیک لکھا ہے اور ہنستے بھی جائیں۔" آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "خوش مذاقی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رکاکت اور سوقیانہ پن بالکل نہ ہو۔" یہ کیفیت مرزا صاحب پر پوری اترتی ہے — وہ بڑے خوش طبع تھے اور شوخی ان کے مزاج میں بہت تھی مگر کسی پر ہنسنا، پھبتی کسنا یا اس کا مذاق اڑانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے مزاح کی بنیاد واقعیت پر ہوتی ہے اور کسی دلچسپ واقعہ کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے چنانچہ وہ اپنی تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "نمک مرچ لگانے کی ضرورت اس لیے نہیں ہوتی کہ واقعات چٹ پٹے ہوتے ہیں"۔

سماجی نمونوں میں حکیم جی، کم سنی کی شادی، صاحب بہادر، اور بہرہ وغیرہ ایسے نمونے ہیں جو براہ راست زندگی سے لیے گئے ہیں۔ مرزا صاحب کا مشاہدہ بہت گہرا ہے اور نظر اتنی تیز ہے کہ اس سے جزئیات بھی نہیں بچتیں، بہرے کے حال میں لکھتے ہیں:-

"ہم نے بڑے بڑے صاحب بہادروں کو دیکھ لیا۔ آدھی بوتل میں بلبل کی طرح چہکنے لگتے ہیں اور ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں اور ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے دہرائی جائیں تو اپنا گلا کاٹ دیں یا ہمارا گلا گھونٹ دیں۔ یہ ہماری عالی ظرفی ہے کہ سب کچھ سنتے ہیں اور زبان نہیں کھولتے اور بعض صاحب بہادر اسی ڈر سے کہ کہیں خانہ جنگی نہ ہو جائے، ہمارے ناز اٹھاتے ہیں اور بعض اس خیال سے کہ نشہ میں کوئی سرکاری راز منہ سے نہ نکل گیا ہو ہماری مٹھی میں رہتے ہیں اور ہمارا یہ نفع ہے کہ پہلا پگ خالص پلا دیا دوسرے میں پانی ملا دیا اور ہوتے ہوتے خالص پانی پر لا ڈالا اور ہم غریبوں کے پانچ سات روپے سیدھے ہو گئے . . ."

۱۲۶۱ھ میں دلی کا ایک مشاعرہ، مرزا صاحب کی ایک یادگار چیز ہے۔ اس مضمون کے لکھنے سے پہلے ان کو یقین تھا کہ یہ مشاعرہ اردو ادب میں جگہ پیدا کرے گا۔ چنانچہ شروع میں لکھ دیا تھا۔

"۔۔۔ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی مولوی محمد حسین آزاد کے نیرنگ خیال کی محفل کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کی بجائے صرف ان کی چلتی پھرتی تصویر دکھا۔۔۔"

جو کچھ انھوں نے لکھا تھا، اسے پورا کر دکھایا یہ مشاعرہ اتنا مقبول ہوا کہ جگہ جگہ اسٹیج کیا گیا اور اب اس کی حیثیت تاریخی ہو گئی ہے اس مشاعرہ کے بیان میں سنجیدگی اور مزاح گھل مل گئے ہیں اور یہ بتانا مشکل ہے کہ کیا یہ مشاعرہ کوئی سنجیدہ مضمون ہے یا مزاحیہ۔

اپنے وطن سے سب کو محبت ہوتی ہے مگر مرزا صاحب کو دعوی عشق تھا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اس کے بہت بڑے حصے کو کسی نہ کسی طرح دلی سے نسبت ہے۔ دلی کے لوگ، ان کا رہنا سہنا، چلنا پھرنا، وضع قطع، لباس، مکان، شہر کے بازار، گلی کوچے، پرانے آثار رسم و رواج، میلے ٹھیلے غرض وہاں کی ہر چیز کا نقشہ ایسا کھینچ دیا ہے کہ پڑھنے والا پرانی دلی کی سیر کرنے لگتا ہے۔

پھول والوں کی سیر بھی مرزا صاحب کا ایک شاہکار ہے اس میں کچھ تو اپنے مشاہدہ سے اور کچھ بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر لکھا ہے اور بتایا ہے کہ جب لال قلعہ کی آخری شمع جھلملا رہی تھی تو وہاں کا کیا نقشہ تھا بادشاہ کو دلی والوں سے اور دلی والوں کو بادشاہ سے کیسی محبت تھی ۔۔۔ پھول والوں کی سیر دلی کا سب سے بڑا میلہ ہی نہیں بلکہ ہندو مسلم یک جہتی، ملنساری اور رواداری کا ایک ادارہ تھا مرزا صاحب واقعہ نگاری اور منظر کشی کے مالک تھے چنانچہ یہ سیر اس طرح کرائی ہے کہ دلی سے مہرولی تک کی ایک ایک چیز کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس مضمون میں بعض چیزیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو سینہ بسینہ چلی آ رہی تھیں۔ بیان میں اکثر الفاظ، اصطلاحیں اور تلمیحیں ایسی ہیں جن کو شاید ہی کوئی جانتا ہو۔ اسی خیال سے انھوں نے الفاظ کی شرح حاشیہ میں کر دی ہے

مرزا صاحب کے طرز تحریر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں بول چال کی زبان کتاب کی زبان بن گئی ہے ورنہ عام طور سے کتابی زبان اور کلامی زبان میں فرق ہوتا ہے الفاظ کا ذخیرہ بھی ان کا بہت بڑا ہے زبان دانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ زبان دانی کی پرکھ زبان کے روزمرہ سے ہوتی ہے ان کے استعمال میں اچھے اچھے ادیب چوک جاتے ہیں۔ مرزا صاحب کے ہاں روزمرہ کی صفائی ان کے بیان کی جان ہے۔

ایک چیز جو مرزا صاحب کو دوسرے مزاح نگاروں سے الگ کرتی ہے یہ ہے کہ انھوں نے ہنسی ہنسی میں کچھ کام بھی کیا ہے۔ اردو کے بعض قدیم شاعروں اور انشا پردازوں کے متعلق اتنا مواد اکٹھا کر دیا ہے کہ آئندہ ان پر تحقیق کرنے والوں کو ان کے مضمونوں کی تلاش ہو گی۔

(بشکریہ ایم آئی، آر حیدرآباد)

رزاق فاروقی

ڈاکٹر زور بحیثیت استاد

ڈاکٹر زور نے، انشا پرداز اور محقق کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا۔ یہ کارنامہ ان کی شخصیت کا اتنا درخشاں پہلو ہے کہ ان کی زندگی کے دوسرے اہم گوشے مقابلتہً کم روشن ہوے۔ انھوں نے اردو کی بقا اور ترویج کے لیے نئے نئے راستے نکالے خاص کر دکن کی تہذیب اور تاریخ کے لیے وہ عمر بھر سرگرداں رہے ان دونوں اہم خدمات کے ساتھ ساتھ وہ بنیادی طور پر معلم تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے بھی اور فکری لحاظ سے بھی انھوں نے اپنے ایک وسیع دائرۂ اثر میں ذہنی تربیت کا گراں قدر فرض انجام دیا۔ انھوں نے یونیورسٹی کی روایتی درس و تدریس کے ساتھ ساتھ کئی نئے لکھنے والوں کو تیار کیا، پرانے لکھنے والوں اور تحقیقی کام کرنے والوں کے ساتھ تعاون کرکے ایک مکتب فکر کی تخلیق کی سعی کی جس میں دکھنی ادب پر توجہ خصوصیت سے دی جاتی تھی۔ زندگی کے بدلتے ہوے تقاضوں میں یہ بھی ایک تقاضہ ہے کہ ہم فکری اعتبار سے سوچنے کے الگ الگ سانچوں کو توڑ کر ایک ہی زاویہ نظر پیدا کریں اس لیے ڈاکٹر صاحب نے دکھنی ادب اور دکھنی کلچر کے لیے جو کام کیا وہ اردو کی کل ہند نوعیت کا ایک جز بن گیا اور خاص کر ان کی زندگی کے آخری دس پندرہ برسوں میں انھوں نے اپنے افکار اور عمل کا دائرہ اردو کی طرح دور دور پھیلا دیا تھا۔ یہ ایسی خدمت ہے جو میرے موضوع سے علاقہ نہیں رکھتی۔

جب ہم ڈاکٹر صاحب کا بحیثیت استاد جائزہ لیتے ہیں تو ان کی شخصیت اور نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس موضوع پر دراصل ان اصحاب کو بطور خاص توجہ کرنی چاہیے جنھوں نے ان سے اس دور میں استفادہ کیا تھا جب وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے ریڈر اور بعد میں پروفیسر کی حیثیت سے پڑھایا کرتے تھے۔ میں ان سے اس وقت واقف ہوا جب وہ چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ پرنسپل کی حیثیت سے انھیں پڑھانے کا کم موقع ملتا تھا۔ کالج میں کامرس، معاشیات اور دوسرے عمرانی علوم کے طلبا کی تعداد زیادہ تھی اس لیے اردو کے طالب علم بہت کم تھے خود میرا تعلق بھی اردو ادب سے نہیں تھا اس لیے ان سے استفادہ کا موقع نہیں ملتا تھا۔ البتہ کالج کے طلبا کی یونین کے انتخابات جیتنے کے بعد مجھے ان سے ملنے شرارتیں کرنے اور اپنے مطالبات منوانے کا موقع ملتا تھا۔ وہ ہمیشہ

ہماری باتوں کو اشتیاق سے سنتے تھے لیکن "انجان" ہونے کی عادت ایسی تھی کہ ہمیں سخت کوفت ہوتی تھی یونین کی میٹنگ میں وہ اکثر شرکت فرماتے تھے۔ طلبا کی زائد نصابی مصروفیتوں کے لیے جو فیس وصول کی جاتی تھی اس کو طلبا ہی کی مرضی سے خرچ کرنے کے لیے ہمارا اصرار ہوتا تھا۔ اور وہ فضول خرچی پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ تاہم ہماری جانب سے جو بھی مطالبہ ہوتا اس کی منظوری دے دیتے تھے۔ کاغذات پر اکثر تجاویز اردو ہی میں کرتے تھے حالانکہ ان دنوں یونیورسٹی اور اس سے ملحقہ کالجوں کا دفتر انگریزی میں کام کرتا تھا

ان کی نظر ہمیشہ ان طلبا پر رہتی تھی جن میں وہ "کام کرنے کی صلاحیتیں" دیکھتے تھے۔ انھیں وہ ادارۂ ادبیات اردو طلب کرتے یا کبھی اپنے اجلاس پر ہی بٹھائے رکھتے۔ ان کے والد بزرگوار حضرت شاہ ابوالبرکات زمرؔ کے عرس پر سالانہ طرحی مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ عرس کے مشاعرہ میں ہم چند طلبا کو کچھ کام سونپا گیا تھا کہ فلاں فلاں شاعر سے ملاقات کریں اور انھیں دعوت کے رقعے دیں وغیرہ۔ میں نے ذمہ داری قبول نہیں کی۔ مشاعرہ کے چند دن بعد مجھے توقع تھی کہ وہ اس بارے میں مجھ سے پوچھیں گے لیکن ہوا یہ کہ ان کی خاموشی اور "انجان" ہونے کی سزا بھگتنی پڑی۔ مشاعرے کے دو تین مہینے بعد انھوں نے مجھے طلب کیا دکھنی لہجے میں فرمانے لگے "تم مشاعرے میں کیوں نہیں آئے" میں نے عذر کے طور پر کوئی جھوٹ موٹ بات بنا دی، کہنے لگے اس پر سے ایک کتاب لے لو۔ یہ مشاعرہ کی منتخب غزلوں کا گلدستہ تھا جو . . . "گلدستۂ زمرؔ" کے نام سے طبع کروایا گیا تھا۔ اس مشاعرہ کے لیے جو طرح دی گئی تھی وہ یہ تھی۔

"حضرتِ زمرؔ کی کرامت ہے"

س میں بعض غزلیں محض تک بندی کے طور پر کہی گئی تھیں۔ میں نے یہ گلدستہ اپنے "حلقۂ احباب" میں پیش کر دیا۔ شاید ان دنوں ہم عبدالقیوم صاحب باقی مرحوم کا ڈرامہ "دیوانہ" کی ریہرسل کر رہے تھے۔ رات دیر گئے تک ڈرامہ کی ریہرسل جاری رہتی تھی۔ ٹیلو نامی چپراسی ڈاکٹر صاحب کی پیشی میں کام کرتا تھا ان کے اجلاس پر فائیلیں پیش کرنا، طلبا کو ان کے اجلاس پر جانے سے روکنا اور ان کو ڈانٹنا اس کے "فرائض منصبی" میں داخل تھا۔ وہ اتنا منہ چڑھا تھا کہ بعض وقت ہم لوگوں کو بھی نصیحت کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ خاص کر رات دیر گئے تک ریہرسل کے سلسلے کالج میں گپ ہانکنے پر ٹیلو کو سخت اعتراض تھا۔ چنانچہ ہم نے بھی اس طرح پر الٹی سیدھی طبع آزمائی کر کے جس میں ٹیلو کی خوب خوب خبر لی گئی تھی وہ پرچہ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب کے اجلاس پر ان کے تشریف لانے سے قبل رکھ دیا۔ توقع تھی کہ ضرور طلبی ہوگی لیکن اس مرتبہ بھی وہ انجان بن گئے اور ہماری شوخی ضائع گئی۔

یہ بھی ایک ستم ظریفی ہے کہ میں ایم اے اور ایم ایڈ کامیاب کرنے کے بعد ان کی خدمت میں استفادہ کے لیے نہ رہ سکا۔ اب وہ کالج سے وظیفہ لے کر مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور ساتھ ہی جموں و کشمیر یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے مجھے "ابوالکلام کی ادبی خدمات" پر کام کرنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ میں حیدرآباد میں اور وہ سری نگر میں اس لیے خط و کتابت سے

فیض اٹھانے کا موقع ملتا تھا۔ جب کبھی وہ حیدرآباد تشریف لاتے میرے کلام کی تعریف کرتے اس سے ان کا مقصد سوائے ہمت افزائی کے کچھ نہیں تھا۔

ایم اے کے امتحان کے لیے میں نے "ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات" پر ایک مقالہ لکھا تھا۔ اس مقالہ کی تیاری کے وقت بھی ڈاکٹر صاحب کی علمی اعانت میرے لیے نہایت مفید رہی کبھی میں ان کے گھر چلا جاتا یا کبھی خطوط سے ان کی رہنمائی حاصل کر لیتا۔ وہ علمی اعانت کے معاملے میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے۔ ان کا انداز یہ تھا کہ کسی موضوع پر اختلافی مباحث نہیں پیدا کرتے تھے۔ البتہ تیز کام کرنے کی ترغیب دیتے۔ خاص کر وہ علم و ادب کے کاموں میں "موڈ" کے قائل نہیں تھے اکثر فرماتے کہ اہل قلم بھی مزدوروں کی طرح ہیں جس طرح مزدور چھ گھنٹے یا آٹھ گھنٹے کام کرتے ہیں اسی طرح علمی و ادبی کام کرنے والے بھی مزدوروں کی طرح مسلسل کام کریں خاص کر تحقیقی کام کرنے والے جتنی محنت شاقہ کریں گے اتنا ہی اُن کا نام نکھرے گا۔ "موڈ" اور طبیعت کو وہ تن آسانی قرار دیتے تھے۔ خود گھنٹوں بلا تکان کام کرتے اور توقع رکھتے تھے کہ نئی پود بھی ریاض ہی سے علم و فن کو سنوارے گی۔ وہ اپنے طالب علموں کو چھوٹی چھوٹی ہدایات دینے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ ایم اے کی طالب علمی کے زمانے میں جب میں نے ابوالکلام کے تعلیمی تصورات پر کام کا آغاز کیا تھا تو انھوں نے مجھے ایک خط لکھ کر چند امور کی تاکید کی تھی۔ خط یہ ہے۔

رفعت منزل خیریت آباد

۱۰ — ۱۰ — ۱۹۵۸

محب مکرم

آپ کا خط ملا۔ آپ نے ٹھیک کتابیں پڑھی ہیں، آپ کو اصل میں محکمۂ ہندی کی تعلیمی رپورٹس اور مولانا کی تقریروں سے مواد ملے گا۔ خواجہ غلام السیدین صاحب (معتمد محکمۂ تعلیم حکومت ہند نئی دہلی) نے کشمیر کے آزاد سیمنار میں اس موضوع پر تقریر کی تھی ان کو لکھیے کہ مدد کریں یا تقریر کی نقل بھیجیں وہ ٹھیک راہ نمائی کریں گے۔ کاغذ عمدہ مواد ہاتھ سنبھال کر ان کو خط لکھیے۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

ایم اے کامیاب کرنے کے بعد میں نے "تذکرہ اساتذہ اردو جامعہ عثمانیہ" لکھنا شروع کیا اس میں خود ڈاکٹر صاحب کے ڈیڑھ سو زاید مضامین اور کتب کو جمع کیا تھا اور ان ہی سے چند مقامات سمجھنا چاہتا تھا میرے ایک عریضہ کا انھوں نے جو جواب دیا تھا اس کی نقل یہ ہے۔

ایوانِ اردو۔ خیریت آباد

۳ - ۴ - ۱۹۶۰

محب عزیز

آپ کا خط ملا شکریہ۔ میں آج کل بے حد مصروف ہوں۔ آپ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ پر ایک کتاب ضرور لکھیے میں ۱۰ اپریل تک چادر گھاٹ کالج ضرور آؤں گا آپ ۱۲ بجے کے اندر

وہاں مجھ سے ضرور مل سکتے ہیں۔ مخلص

سید محی الدین قادری زور

تحقیقی کام کرنے والوں کو وہ پوری دلچسپی سے مشورہ دیا کرتے تھے اور کبھی سرسری گفتگو کر کے نہیں ٹالتے تھے جب میں نے ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں ان کی نگرانی میں تحقیق شروع کی تو انھوں نے سری نگر سے میرے نام ایک خط لکھا تھا جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے تحت کام کرنے طلبا سے کتنا انہماک برتتے تھے۔ ان کے خط کی نقل یہ ہے۔

نمبر ۳۴۷

مورخہ ۲۵-۴-۶۲ عزیزی فاروقی صاحب

خط مورخہ ۱۸ اپریل ملا خوشی ہوی کہ آپ نے فیلوشپ کے لیے کام شروع کر دیا۔

حسب ذیل طریقے پر کام کیجیے۔

۱۔ مولانا آزاد کی جملہ اردو تصانیف مطبوعہ کی فہرست تیار کر کے بھیجیے۔

۲۔ مولوی اجمل خاں صاحب انڈین انسٹی ٹیوٹ آف کلچر نئی دہلی کو خط لکھ کر اور اپنے کام سے مطلع کر کے ممکنہ امداد کی خواہش کیجیے۔ ان سے بھی فہرست اور دوسری معلومات حاصل ہوں گی۔

۳۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب سے مل کر اپنے موضوع سے متعلق مدد دینے کی خواہش کیجیے اور ان سے مشورہ کرتے رہیے۔

۴۔ مولانا آزاد سے متعلق جو کتابیں چھپی ہیں سب کا مطالعہ کر کے اپنے کام کے نوٹ تیار رکھیے۔

۵۔ اپنے مقالہ کا ایک خاکہ جو آپ بنا سکتے ہیں بنا کر بھیجیے جو اس طرح کا ہو۔

ا۔ مولانا کی ادبی خدمات (پس منظر وغیرہ) ب۔ ابتدائی تحریریں۔ ج۔ کتابیں۔ د۔ مضامین

ہ۔ موضوع (مختلف قسمیں) و۔ اسلوب بیان۔ ز۔ اردو ادب پر ان کے اثرات وغیرہ۔

مخلص

سید محی الدین قادری زور

اس خط کے وصول ہوتے ہی میں نے جواب ٹائپ کر کے ان کے پاس پوسٹ کر دیا۔ میرے ٹائپ کردہ خط پر ہی انھوں نے چند ہدایات لکھ دیں اور اسی کو واپس کر دیا۔ ان کی ہدایات کو پیش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ میں پہلے اپنے خط کی نقل پیش کروں۔ میں نے ان کی خدمت میں یہ جواب لکھا تھا۔

رزاق فاروقی ریسرچ اسکالر ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ حیدرآباد مورخہ ۲۹ اپریل ۶۲ء

عالی قدر استاد محترم دام ظلکم۔ قدم بوسی۔ آپ کا خط نشان ۳۴۷ مورخہ ۲۵-۴-۶۲

مجھے اپنا قیصر بیگم صاحبہ کے توسط سے کل انسٹی ٹیوٹ کے دفتر میں ملا۔ آپ نے تفصیلی طور پر جو رہنمائی کی ہے اس کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

چند مہینوں قبل اپنے تئیں ایک فہرست کتب (مولانا ابوالکلام کی تصنیف کردہ) مرتب کی تھی۔ اس کی ایک نقل آپ کے ملاحظہ کے لیے منسلک ہے۔ میں نے چند اصحاب کے نام خطوط لکھے ہیں جن میں جناب اجمل خاں صاحب بھی ہیں لیکن اب تک جواب کا انتظار ہے آج پھر آپ کے حوالے سے جناب اجمل خاں صاحب کو ایک خط لکھ رہا ہوں جب جواب وصول ہوگا آپ کی خدمت میں نقل روانہ کر دوں گا۔ البتہ ڈاکٹر عبداللطیف صاحب سے میں نے اپنی ایم اے کی طالب علمی کے زمانے میں استفادہ کیا تھا ان سے مرتبا تعلق بھول گیا اب آپ کی یاددہانی کے بعد فوری ربط پیدا کر لوں گا۔

میں نے ایک خاکہ تیار کیا تھا جو آپ کے بنائے ہوئے سرسری خاکے ہی سے مشابہ ہے البتہ چند باتیں میں نے اور بڑھائی ہیں آپ کی رائے کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

(۱) مولانا کی طرز تحریر (اسٹائل) پر کن کن ادیبوں کے اثرات پڑے۔ بعض نقاد قرآن کے انداز بیان کا اثر مولانا کی تحریر پر ڈھونڈتے ہیں اس بارے میں مجھے آپ کی رائے کی ضرورت ہے۔

(۲) مولانا کے طرز تحریر میں موضوع کے تحت فرق ہے۔ مثلاً الہلال کا انداز تفہیم القرآن کے انداز سے بدلا ہوا ہے بہرحال ان کے یہاں فرق نمایاں ہے اس موضوع کو بھی میں اپنے مباحث میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔

(۳) میرا خیال ہے کہ موضوع اور ادیب کے افکار اور سوچنے کے انداز کا اثر بھی اس کے اسٹائل پر مرتب ہوتا ہے اس بحث کو بھی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔

فی الحال میں نے ان امور پر غور کیا ہے اور ان کی تحریروں کا اس تعلق سے مطالعہ کیا ہے۔ تفصیلی خاکہ آٹھ دس دن میں مرتب کر کے روانہ کروں گا۔

عقیدت کیش

رزاق فاروقی

میرے اس عریضہ پر انھوں نے یہ نوٹ درج کیے تھے:۔

(۱) "یہ بالکل صحیح ہے کہ ان کے اس قسم کے اسلوب اور اردو کے بارے میں ۲۵ سال قبل اس قسم کے اعتراضات کیے جاتے تھے۔ مگر آپ کو شاید ہی عربی آتی ہے۔ پھر کیوں کر آپ قرآن کی آیتوں کا مولانا کے فقروں سے مقابلہ کر سکیں گے؟ بہرحال عربی کے عالموں کی مدد سے کوشش کیجیے"

(۲) "اسلوب کے لحاظ سے ان کی تحریروں کی درجہ بندی کیجیے"

(۳) "مناسب ہے"

میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی لکھی ہوئی ۳۲ کتابوں پر تفصیلی نوٹ لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجے تھے اور ساتھ ہی ایک فہرست بھی منسلک کر دی تھی تاکہ سرسری طور پر ان کو جائزہ لینے میں آسانی ہو۔ انھوں نے اسی فہرست پر کچھ ہدایات

لکھیں اور کچھ اضافے کیے۔

فہرست میں انھوں نے یہ اضافے کیے تھے :-

(۱) انوارِ آزاد مرتبہ علی جواد زیدی۔

(۲) دہلی کے ناشروں کی فہرستوں میں مولانا پر اور بھی کتابیں ملیں گی وہ فہرستیں اکبرالدین صدیقی صاحب کے پاس ادارے کے کتب خانہ میں دیکھیئے۔

(۳) خواجہ غلام السیدین صاحب کی کتاب بھی ہے مولانا آزاد کے تعلیمی نظریے۔

اسی فہرست کے ایک حصہ پر یہ تفصیلی نوٹ علیحدہ لکھا ہے :

"مولانا کے بارے میں اور مولانا کی جملہ کتابیں انسٹی ٹیوٹ کے لیے خریدنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ کرانے کے لیے آرڈر دلایئے۔ پہلے یہ معلوم کیجئے کہ انسٹی ٹیوٹ اور ادارے کے کتب خانہ میں مولانا کی کون کونسی کتابیں موجود ہیں اور کونسی نہیں ہیں"

"ڈاکٹر لطیف صاحب سے ضرور ملیے۔ روز جایئے کبھی تو ملیں گے یہ بہت ضروری ہے"

"آپ کا دوسرا خط بلا تاریخ بھی ملا۔ نوٹ اپنے ابواب سے متعلق جمع کرتے جایئے۔ الگ الگ کاغذ پر باب کا عنوان لکھیئے اور جس کتاب سے اس باب سے متعلق علم ہو کتاب کا نام اور صفحے کے حوالے سے درج کرتے جایئے"

"اپنے ابواب کے عنوانات لکھ بھیجئے تو ان کے بارے میں طے کر کے رائے دوں گا۔ خط پر تاریخ ضرور لکھا کیجئے"

اس اثناء میں مجھے جناب اجمل خاں صاحب کا خط وصول ہوا تو میں نے ایک تفصیلی عریضہ ان کی خدمت میں ٹائپ کر کے بھیجا اس پر بھی انھوں نے نوٹ لکھ کر واپس کیے۔ میرا خط اور ڈاکٹر صاحب کے نوٹ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

حیدرآباد۔ مورخہ ۱۲ مئی ۶۲ء

عالی قدر استاد محترم دام ظلکم

قدم بوسی۔ آپ کا خط مورخہ ۹ ـــ ۵ ـــ ۶۲ء مجھے آج وصول ہوا۔ انسٹی ٹیوٹ اور ادارہ میں مولانا کی تمام اہم تصانیف موجود ہیں۔ البتہ الہلال اور البلاغ کے پرانے شماروں کی شدید ضرورت ہے۔ اس کے لیے ۱۰ مئی ۶۲ء کے مقامی اخبارات میں ایک اشتہار شائع کیا گیا تھا جس کی کٹنگ منسلک کرتا ہے۔

ترجمان القرآن کے لیے ڈاکٹر سکینہ صاحب سے عرض کیا ہے وہ ان دنوں حیدرآباد سے باہر گئے ہوئے ہیں، آتے ہی خرید لوں گا۔ آپ کے حسب الحکم میرے زیر تکمیل مقالہ کا ایک سرسری خاکہ پیش خدمت ہے۔

(۱) مولانا کی ادبی خدمات کا آغاز (پس منظر وغیرہ)

(۲) مولانا کی ابتدائی تحریریں

(۳) لسان الصدق

(۴) الہلال
(۵) البلاغ
(۶) ترجمان القرآن
(۷) تذکرہ
(۸) غبار خاطر
(۹) مولانا کی انشا پردازی کے محاسن (تنقیدی مطالعہ)
(۱۰) مولانا کی انشا پردازی کا اردو ادب پر اثر
(۱۱) مولانا کے ادبی نقاد

جناب اجمل خاں صاحب کا مجھے کل خط ملا۔ ان کے خط کا اقتباس ملاحظہ کے لیے پیش ہے:۔

"خوشی ہوئی کہ مولانا کی ادبی خدمات پر آپ کام کر رہے ہیں اور محترم پروفیسر زور صاحب کی نگرانی آپ کو میسر ہے میں جن معلومات کے لیے آپ فرمائیں حاضر ہوں۔ مولانا کی ادبی زندگی بچپن سے شروع ہو کر آخر وقت تک جاری رہی اس میں دین و سیاست کا بھی امتزاج رہا۔ لہٰذا اگر آپ خالص ادبی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو الہلال اور البلاغ سے پہلے انتخاب کیجئے اس کے بعد تذکرہ اور "غبار خاطر" سے مدد لیجیے۔ زیادہ نیازمند

محمد اجمل خاں

"ڈاکٹر عبداللطیف صاحب سے بھی پرسوں نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا تھا۔ انھوں نے مجھے ہدایت دی ہے کہ میں مولانا کے اسٹائل پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا خاص طور پر جائزہ لوں۔ علاوہ ازیں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مولانا کی تحریروں میں الفاظ کا جو عظیم ذخیرہ ہے اس پر بھی مجھے کام کرنا چاہیے۔ آپ کے تفصیلی عنایت نامہ کا منتظر۔

عقیدت کیش
رزاق فاروقی

میرے اس عریضہ پر ڈاکٹر صاحب نے حسب ذیل نوٹ درج کیے تھے۔

" مولانا کے خطوط بھی جمع کرنے کے لیے اعلان کیجیے اور نقلیں منگوائیے۔ سیدین صاحب کے یہاں بھی کئی خطوط ہیں۔ یہ اعلان "ہماری زبان" علیگڑھ میں کیجیے"۔

"ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کے خیال کو میں نے مندرجہ بالا خط میں بیا تھا کیا تو اس جملے کے نیچے جس میں ڈاکٹر لطیف صاحب نے مولانا ابوالکلام کے اسٹائل اور ذخیرۂ الفاظ پر رائے دی تھی۔ ڈاکٹر زور نے سرخی سے خط کھینچ کر حاشیہ پر یہ نوٹ درج کیا۔

" یہ بات بھی میں نے لکھی تھی، یہ بہت اہم ہے میں نے بھی لکھا ہے کہ مولانا کے خاص خاص الفاظ اور محاورے جو دوسرے اردو انشاپردازوں کے یہاں نہیں ملتے جمع کیے جائیں اس سے ان کی انفرادیت ظاہر ہوگی اور یہی ظاہر اور ثابت کرنا ہے

ایسے الفاظ اور محاورات کی فہرستیں ساتھ ساتھ بھیجتے رہیے۔"

مرحوم کا میرے نام یہ آخری خط ہے۔ اس کے بعد وہ خود جب کبھی حیدرآباد تشریف لاتے میں اپنا کام ان کو دکھاتا وہ کبھی عیوب نکالنے کی کوشش نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ مزید کام کرنے کے لیے حوصلہ افزا مشورے دیتے تھے۔ بحیثیت استاد ان کی یہ خواہش رہتی تھی کہ ان کے شاگرد معاشی اعتبار سے خوش حال رہیں۔ جب مجھے پی ایچ ڈی کے لیے عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ ملا تو خود انھوں نے فیلوشپ کے کام کو ختم کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ پی ایچ ڈی کرنا میرے لیے زیادہ مفید ہوگا۔ میں نے "ڈاکٹر رادھاکرشنن کے فلسفے میں تعلیمی رجحانات" پر انگریزی میں ایک کتابچہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے فرمایا "ڈاکٹر رادھاکرشنن کے کام کو انگریزی میں سبھی دیکھتے ہیں، اردو والوں کے لیے آپ نے کیا کیا؟ ——" پھر مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کا ترجمہ اردو میں کر ڈالوں جسے وہ ابوالکلام اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے شائع کروا دیں گے۔"

خطوط کئی لحاظ سے اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے مرتب کردہ خطوط اور اصلاحیں ان کی اپنے طالب علموں کے ساتھ شفقت اور علمی کاموں میں ان کے انہماک کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں موصوف کی شخصیت ایک استاد کی حیثیت سے پورے طور پر نمایاں ہے۔ ان کے علمی معتقدات کو سمجھنے کے لیے ضرورت ہے کہ ان کے دوسرے سینکڑوں خطوط کا جائزہ لیا جائے۔

صفی الدین صدیقی

البرٹو موراویا

(ایک اطالوی داستان گو)

ایسے سبھی باذوق حضرات جنھیں عالمی ادب کے مطالعہ کا شوق ہے البرٹو موراویا کے نام سے بخوبی واقف ہوں گے۔ انھوں نے ایک اطالوی ناول کا انگریزی ایڈیشن ضرور دیکھا ہوگا۔ اطالوی زبان میں تصنیف شدہ اس ناول کا نام "روم کی عورت" ہے چنانچہ اسی ایک ناول نے البرٹو موراویا کو دنیا کے عظیم ناول نگاروں کی صف اول میں لا کھڑا کیا ہے۔ البرٹو موراویا اپنے ملک کا عظیم ترین مصنف ہے اس کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی ناولوں کے انگریزی تراجم کی مارکٹ میں کافی سے زیادہ مانگ ہے۔ اردو زبان میں اس کے ناولوں کا ترجمہ تو نہیں البتہ بعض مختصر کہانیاں تراجم کی صورت میں ضرور شائع ہوئی ہیں ——— البرٹو موراویا کے اکثر ناولوں اور کہانیوں کو اردو میں من وعن پیش کرنے میں چند رکاوٹیں ہیں۔ اول تو یہ کہ ہماری اپنی سماجی اخلاقیات اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ جنسی علائق اور اس سے سروکار رکھنے والے دیگر تجربات کو بلا جھجک قاریوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے مترجم اس طرح کا قدم اٹھانے میں احتیاط برتنا چاہتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ رسالوں کے ایڈیٹر اور اردو کتابوں کے ناشر ممنوعہ لٹریچر چھاپنے سے گریز کرتے رہتے ہیں (یہ الگ بحث ہے کہ آیا البرٹو موراویا کی تصانیف کو PORNOGRAPHIC LITERATURE سے تعبیر کیا جا سکتا ہے) زیر نظر مضمون میں البرٹو موراویا کے فن اور شخصیت کا میں اجمالی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

البرٹو موراویا ۲۸ نومبر ۱۹۰۷ء کو روم میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اطالیہ کا ایک مشہور معمار تھا۔ ہمارا فن کار بچپن ہی سے نہایت ذہین واقع ہوا تھا۔ بہت ہی چھوٹی عمر میں اس نے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں مہارت حاصل کر لی۔ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک کمزور لڑکا بھی واقع ہوا تھا۔ چنانچہ ۹ سال کی عمر سے لے کر ۲۰ سال کی عمر تک وہ مسلسل بیمار رہا۔ تھا۔ دنیا کے بعض عظیم فنکاروں کی حیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ جسمانی حیثیت سے کمزور واقع ہوئے تھے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ ان کی ذہنی قوتیں غیر معمولی رہی ہیں۔ عالمی ادب کی تاریخ میں ایسی

کئی مثالیں ہم کو ڈھونڈنے سے مل جائیں گی۔ ہمارا خیال ہے کہ البرٹو موراویا کے دکھ بھرے بچپن ہی نے اس کو حد درجہ حساس بنایا تھا۔ اس کی یہ حساس شخصیت کہانیوں اور ناولوں میں جگہ جگہ پر نمایاں ہے۔

البرٹو موراویا کی شخصیت اور اس کے فن کو سمجھنے کے لیے اس اطالیہ کے بارے میں جاننا ضروری ہے جس کے اندر ہمارے فن کار نے اپنی زندگی کے اہم اور جدوجہد بھرپور شب و روز گزارے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے کا اطالیہ مسولینی جیسے مطلق العنان آمر کے زیر نگیں رہا ہے۔ مسولینی جو فاشزم کا نقیب تھا۔ جو قوت کو ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا سرچشمہ سمجھتا تھا۔ جس کی غلط روی نے دانتے اور لیونارڈو دنسی کے خوبصورت وطن کو تباہی کے غار میں ڈھکیل دیا تھا جس نے فرد کی آزادی کو چھین کر اسٹیٹ کے عفریت کے چرنوں میں بھینٹ کر دیا تھا۔ فاشزم کا سیلاب جھنجلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور یہ مہیب سیلاب آزادی، انسانیت اور کلچر جیسی اقدار کو اپنی رو میں بہالے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اطالیہ کے حریت پسندوں نے ڈٹ کر ان مرکز گریز طاقتوں کا مقابلہ کیا اور ان کے عزم نے فاشزم کو بالآخر شکست فاش دی آج دنیا مسولینی اور ہٹلر جیسے آمروں کا تذکرہ نفرت و حقارت سے کرتی ہے۔ تاریخ کے صفحات نے ان کو نیرو اور چنگیز خاں جیسے ظالموں اور کلچر دشمن آمروں کے زمرے میں شمار کر لیا ہے۔ اطالیہ کے عوام فاشزم کے حامی ہرگز نہیں ہو سکتے تھے وہاں کے دانشوروں، ادیبوں اور فن کاروں نے ڈٹ کر فاشی نظام کا مقابلہ کیا۔ لیکن مسولینی کے زوال کے ساتھ اطالیہ کی بدبختی کا افسانہ ختم نہیں ہو جاتا۔ یہاں کے عوام کو اور بھی برے دن دیکھنے تھے۔ جرمن فاشی بڑی تیزی سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ اپنے شیطانی نظام کے بل بوتے پر ترقی پسند طاقتوں کا قلع قمع کر دینا چاہتے تھے چنانچہ اس طوفان کی زد سے ہمارا فن کار البرٹو موراویا بھی نہ بچ سکا۔ اس کی تصانیف کو ضبط کر لیا گیا۔ لیکن وہ لندن اور پیرس میں بیٹھا اطالیہ کے حریت پسند رسالوں اور اخباروں میں برابر مضامین بھیجتا رہا۔ جب جرمنی کے گسٹاپو اس کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگے تو وہ روپوش ہو گیا اور فرضی نام سے انقلاب انگیز مضامین لکھتا رہا۔

مئی ۱۹۴۴ء میں امریکی فوجوں نے اطالیہ کو جرمنی کے چنگل سے آزاد کرا لیا۔ آزادی کے بعد البرٹو موراویا اپنے وطن کو واپس چلا آیا۔ آج کل وہ اٹلی کے خوبصورت جزیرے کیپری میں رہتا ہے۔ اپنی زندگی کے پچھلے پچاس برسوں میں وہ جن ناگفتہ بہ حالات سے گزرا ہے اب ایک فنکار کی حیثیت سے ان بیتے دنوں کا جائزہ لینا چاہتا ہے اپنے وطن اطالیہ کے عوام کی دھڑکنوں کو وہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں سمو دینا چاہتا ہے۔ اگر کہانیوں سے اس کی تشفی نہیں ہوتی تو پھر وہ کوئی ناول لے کر بیٹھ جاتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کو ختم ہوئے لگ بھگ بیس سال کا عرصہ ہوتا ہے مگر اٹلی کے سینے پر جو گھاؤ لگائے گئے تھے وہ ابھی تک مندمل نہیں ہونے پائے ہیں۔ تعمیر اور تخریب کے مظاہر میں یہی ایک تو فرق ہے کہ جہاں تعمیر کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے وہاں تخریب کی ایک ضرب کاری سے برسوں اور صدیوں کی محنت ٹھکانے لگ جاتی ہے۔ البرٹو موراویا کے افسانوں اور ناولوں میں آپ کو مابعد جنگ کا لٹا لٹایا اطالیہ سانس لیتا دکھائی دے گا۔

وہ نہ صرف معاشی حیثیت سے دیوالیہ ہو چکا ہے بلکہ اخلاقی اور روحانی حیثیت سے بھی نڈھال ہے۔ اسی پستی کو البرٹو موراویا کا قلم اس قدر مہارت کے ساتھ کہانی یا ناول کے فارم میں منتقل کر لیتا ہے کہ قاری پر ان داستانوں کا غیر معمولی اثر مترتب ہوتا ہے۔

سب سے پہلے میں البرٹو موراویا کی مختصر اور طویل کہانیوں کا ذکر کروں گا۔ ان کہانیوں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے مگر چند منتخب کہانیوں کے انگریزی تراجم ہی ہم تک پہنچ سکے ہیں۔

البرٹو موراویا کی کہانیوں کے مجموعوں میں "رومن ٹیلس" اور "تلخ ہنی مون و دیگر کہانیاں" قابلِ ذکر ہیں۔ "رومن ٹیلس" کا پہلا انگریزی ایڈیشن ۱۹۵۶ء میں لندن میں شائع ہوا تھا۔ لیکن اس وقت سے لے کر آج تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ رومن ٹیلس' سے قبل البرٹو موراویا نے جو کہانیاں لکھی تھیں ان کا تعلق زیادہ تر روم کے بورژوا طبقہ کے افراد سے تھا لیکن زیرِ نظر مجموعہ کی تمام کہانیاں روم کے ادنیٰ اور پس ماندہ طبقے کے افراد ہی سے تعلق رکھتی ہیں ان کہانیوں کے سبھی افراد غریب اور جفاکش ہیں۔ ان میں لاری ڈرائیور، دھوبی، حجام، ہوٹل کے ملازم، دلال پاکٹ مار بھک منگے ٹھکیائی رنڈیاں سبھی شامل ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا مصنف ان تمام افراد کے قالب میں داخل ہو کر خود ان ہی کی زبانی ان کی زندگی کی داستانیں بیان کر رہا ہے۔ البرٹو موراویا کو انسانی نفسیات پر مہارت تامہ حاصل ہے میں نے محسوس کیا ہے کہ البرٹو موراویا محض غیر شعوری طور پر نفسیاتی حقائق پر روشنی نہیں ڈالتا بلکہ یوں جان پڑتا ہے جیسے اس نے علم النفس کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس کے مسائل کو ادب میں مناسب و موزوں طریقے پر برتنے کا اس کو سلیقہ آتا ہے۔

دوسرے مجموعے یعنی 'تلخ ہنی مون اور دیگر کہانیاں' کو اصناف ادب کے لحاظ سے طویل مختصر افسانوں کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس میں کی اکثر کہانیاں ناموزوں زندگی کی عدم مطابقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب میں غلط جنسی نظریوں نے وہاں کی ازدواجی زندگی کو ناکام بنا دیا ہے اور پھر نفسیاتی اعتبار سے وہاں کی عصب مرضی (NEUROTIC) تہذیب نے افراد کو مختلف ذہنی الجھنوں سے دوچار کر دیا ہے۔

میں آئندہ سطور میں البرٹو موراویا کی سبھی تصنیفات پر روشنی نہیں ڈالوں گا بلکہ ان ناولوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کا شمار البرٹو موراویا کی نمائندہ تخلیقات میں ہوتا ہے۔ 'روم کی عورت' البرٹو موراویا کا شاہکار ناول ہے۔ چنانچہ وہ آج بھی 'روم کی عورت' کے مصنف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک حساس اور دل پذیر شخصیت رکھنے والی طوائف کی الم انگیز داستانِ حیات ہے۔ عالمی ادب میں یہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے۔ لیکن اپنے اس ناول میں البرٹو موراویا نے بیسویں صدی کے وسط کے اطالیہ کو پیش کیا ہے۔ وہ اطالیہ جو اخلاقی و روحانی حیثیت سے گر چکا ہے مگر ایک صحت مند مستقبل کے خواب ضرور دیکھ رہا ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا روم کی یہ عشوہ طراز حسینہ خود روحِ اطالیہ ہے جو حالات کے زنداں میں محبوس ہے جس کے پر کتر لیے گئے ہیں اور جسے طاقتِ پرواز سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اس ناول میں البرٹو موراویا نے اطالیہ کے نوکر شاہی کے کھوکھلے پن اور اس کی گراوٹ کا حقیقی نقشہ کھینچا ہے۔ نوجوان طالب علموں کے جوش و خروش کو دکھلایا ہے۔ ان کے دلوں میں

آزادی کی جو لگن چھپی ہوئی ہے اسے بڑے ہی موثر انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ موراویا بتلانا چاہتا ہے ماحول کا شکنجہ آدمی کی شخصیت کو کس حد تک کچل کر رکھ دیتا ہے۔ اس ناول کی ہیروئن ایک ذہین اور متوسط طبقہ کی فرد ہے جو ماڈل کے طور پر ایک اسٹوڈیو میں کام کرتی ہے۔ چوں کہ وہ غریب اور مفلس ہے اس لیے زندگی کی گاڑی کو آگے ڈھکیلنے کی خاطر دن رات محنت کرتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ انسان بھی ہے۔ مسرت سے بھرپور زندگی گزارنے کی تمنا رکھتی ہے۔ اسٹوڈیو کے کام سے فراغت پانے کے بعد جب وہ اپنے گھر کی طرف جانے لگتی ہے تو وہ شہر کے نفیس فلیٹ میں رہنے والے لوگوں کو اپنے خاندان کے درمیان ہنستے اور موج مناتے دیکھتی ہے۔ ننھے منے بچوں کی آوازیں اس کے کانوں میں آتی ہیں تب وہ آرزو کرنے لگتی ہے کہ اس کا ایک ایسا ہی خوشیوں سے معمور گھر ہو جس کی فضا میں معصوم بچوں کی آوازیں گونج رہی ہوں۔ گو اس کی ماں بھی اپنے زمانے کی مشہور ماڈل تھی وہ کافی حد تک حسین عورت بھی تھی لیکن بہت جلد وہ استحصال کا شکار ہو گئی اور ایک ننھی خوبصورت بچی کو جنم دیا۔ لیکن اس ناول کی ہیروئن اپنی ماں کا پیشہ اختیار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیوں کہ وہ جانتی ہے کہ ماڈل کا سوسائٹی میں کوئی مقام نہیں ہوتا۔ ناول کے آغاز میں البرٹو موراویا نے عورت کی اندرونی کشمکش کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ بڑا ہی موثر ہے اور اس میں بلا کا ہیومن ٹچ ہے۔

مگر اس سیدھی سادی عورت کے خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتے۔ اس کی زندگی میں پہلی بار ایک ایسا شخص داخل ہوتا ہے جو اسے ایک مطمئن اور گھریلو زندگی کا لالچ دیتا ہے۔ حالانکہ وہ خود شادی شدہ ہے۔ ہیروئن کی زندگی میں پیش آنے والا یہ پہلا دھوکا اس کی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ اس کے بعد وہ قدم قدم پر استحصال کا شکار ہو جاتی ہے اور حالات کی گردش اس کو بالآخر بازاروں میں گھومنے والی قحبہ بنا دیتی ہے۔ گناہوں سے بھرپور زندگی گزارنے پر وہ مجبور کر دی جاتی ہے۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اس کا ضمیر مردہ نہیں ہونے پاتا۔ زندگی کے روشن پہلو پر اب بھی وہ بھروسہ رکھتی ہے وہ اب بھی یہ تمنا کرتی ہے کہ اطالیہ کی آنے والی نسلیں اس کی طرح ناکام و نامراد زندگی نہ گزاریں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب سماج کی بناوٹ میں کوئی ناگہانی تبدیلی رونما ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شخصیت کا بہترین حصہ ہمیشہ ترقی پسند طاقتوں اور تحریکوں کا ساتھ دیتا ہے۔ بھوک بیماری اور افلاس کے خلاف جدوجہد میں وہ بھی دل و جان سے شریک ہے ویسے ایک قحبہ کی زندگی کو سامنے رکھ کر صدہا کہانیاں اور ناول لکھے گئے۔ دنیا کے ہر ادب نے اس موضوع کو اپنایا ہے، لیکن روم کی عورت، کا پلاٹ ان سب ناولوں اور کہانیوں سے مختلف ہے۔ روم کی عورت اصل میں ماڈرن اطالیہ کے بعد جنگ کی ایک ولولہ انگیز داستان ہے اور اس ناول کو بلاشک و شبہ عالمی ادب کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔

روم کی عورت کے بعد البرٹو موراویا کے اور بھی کئی ناول شائع ہوئے جو کئی لحاظ سے دلچسپ ہیں۔ اس کا ناول "فینسی ڈریس پارٹی" ایک ہوس پرست آمر کے کردار کے اطراف گھومتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ خود مسولینی کی حیات معاشقہ پر اس ناول کی بنیاد رکھی گئی ہو۔ ہر بڑے آمر کی زندگی میں کسی نہ کسی عشوہ طراز حسینہ کا عمل دخل ضرور ہوتا ہے۔ لاکھوں عوام پر حکومت کرنے والا یہ سنگدل آمر خود کسی عورت کی مرضی کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ موجودہ صدی کے اکثر

ڈکٹیٹروں کے عروج و زوال کی داستانیں ہم تک اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ پہنچ چکی ہیں۔ ہٹلر، مسولینی جیسے آمروں کی زندگیاں بھی ہوس پرستی سے ملوث ہیں۔ ارجنٹائن کے ڈکٹیٹر PERON کا بھی ویسا ہی دردناک انجام ہوا تھا کیوں کہ اس کی شخصیت کے عروج کے پس منظر میں بھی ایک اسٹیج اداکارہ ایوا کے حسن کا جادو پھیلا ہوا ہے — اپنے اس ناول میں البرٹو موراویا ایک سیاسی رہنما اور قائد کی جذباتی زندگی کے اتار چڑھاؤ کو بڑے موثر انداز میں پیش کرتا ہے۔

۲- کانجوگل لو CONJUGAL LOVE

اس ناول میں ازدواجی زندگی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل پر بڑی جسارت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ ناول کی ہیروئن کافی حد تک حسین ہے وہ اپنے نوجوان شوہر سے محبت بھی کرتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک معمولی اور بے ہیئت شخص کے دام ہوس میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ یہ دوسرا شخص پیشہ کے لحاظ سے حجام ہے اور روزانہ اس کے شوہر کی قیام گاہ پر پہنچ جاتا ہے۔ ہیروئن اس سے دور دور رہنا چاہتی ہے لیکن وہ کسی نہ کسی بہانے اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا ہے عام حالات میں تو وہ اس سے گریز کرتی ہے لیکن جوں ہی شام کا جھٹ پٹا طاری ہوتا ہے تو کسی نامعلوم قوت کے زیر اثر وہ کشاں کشاں اس کی طرف کھنچی چلی جاتی ہے۔ یہاں پر ڈی ایچ لارنس کے بدنام اور فحش ناول LADY CHATTERLYS LOVER سے بڑی مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ لارنس کی ہیروئن بھی سر کلفورڈ کے اسٹیٹ کی رکھوالی کرنے والے غیر تعلیم یافتہ مگر مضبوط شخص سے تعلقات استوار کرتی ہے۔ سر کلفورڈ اپاہج اور ایک نورمل شخص کے نورمل جذبات سے عاری ہے۔ اس کے برخلاف البرٹو موراویا کے ناول کانجوگل لو کا ہیرو اپاہج تو نہیں ہے لیکن وہ ایک خاص مقصد کے حصول میں (وہ غالباً دنیا کا زبردست کہانی نگار بننا چاہتا ہے) اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ ایک شوہر کی حیثیت میں اپنی نورمل ذمہ داریوں کو بھی فراموش کر جاتا ہے۔ اس ناول میں یہ بنیادی سوال اٹھایا گیا ہے کہ بیوی کی بے وفائی کا ذمہ دار کون ہے؟ لیکن اس کے شوہر کا غیر ضروری انہماک اور تغافل اس کی بے راہ روی کا باعث تو نہیں؟ اسی سوال کا جواب البرٹو موراویا اس ناول میں دینا چاہتا ہے۔

۳- دی ٹائم آف ان ڈفرنس (THE TIML OF IN DIFFERENCE)

اس ناول کے تین اہم کردار ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر کا شخص جو لگ بھگ اپنی عمر کی ایک اور پھر اس عورت کی اٹھارہ سالہ لڑکی سے بیک وقت دلچسپی لیتا ہے۔ معمر عورت اس کے لیے دراصل ایک ذریعہ ہے نوجوان بیٹی پر قابو حاصل کرنے کا۔ پلاٹ اسی کشمکش سے ابھرتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں وال ایمر نولوکوف کے حالیہ ناول "لولیتا" میں بھی اسی کشمکش کو ابھارا گیا

۴- اے گھوسٹ اٹ نون (A GHOST AT NOON)

یہ ایک فلم کار کی داستان حیات ہے جسے اپنی بیوی کی محبت پر یقین کامل ہے لیکن آگے چل کر اس پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا پروڈیوسر اور مالک اس کی بیوی میں دلچسپی لیتا ہے اور یہ دونوں ہوس سے بھرپور زندگی گزار رہے ہیں۔ ناول کا موضوع وہی عورت کی بے وفائی ہے جس پر قدیم سے لے کر آج تک بیشتر کہانیاں اور ڈرامے لکھے گئے ہیں۔

البرٹو موراویا کے دوسرے ناولوں میں THE CONFORMIST "دو عورتیں"، دونوں ناول قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان ناولوں کو پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ البرٹو موراویا ہر جگہ ان ہی موضوعات کو مختلف طریقے پر پیش کر رہا ہے۔ وہی جنسی بے راہ روی اور اس کے کرداروں کی وہی الجھنوں سے بھرپور زندگی۔۔۔ لہٰذا کہنا پڑتا ہے کہ البرٹو موراویا کے حالیہ ناولوں میں وہ نفسیاتی بصیرت نہیں ہے جس کا مظاہرہ وہ روم کی عورت اور [illegible] ناولوں میں کر چکا ہے۔ البرٹو موراویا کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کردار سازی کے لیے ایسے افراد چنتا ہے جن کی زندگیاں غیر متوازن ہیں یا جو ذہنی اعصابی الجھنوں میں گرفتار ہیں۔ البرٹو موراویا فرائیڈ کی تحلیل نفسی سے زیادہ متاثر معلوم ہوتا ہے یوں وہ اپنے کرداروں کو سمجھنے کے لیے فرائیڈی طریقوں کا استعمال کرتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا اس کی مختصر کہانیوں کا ایک اور مجموعہ "بے وفا بیوی اور دیگر کہانیاں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

یورپی زبانوں میں لکھنے والے مصنفوں میں غالباً البرٹو موراویا ہی ایک ایسا مصنف ہے کہ جس کی بیشتر کتابیں انگریزی میں منتقل ہو چکی ہیں اور جو انگریزی داں حلقوں میں غیر معمولی طور پر مقبول ہوئی ہیں۔

باقر مہدی

پردیسی

چلتے چلتے اک جھٹکے سے ریل رکی
میں یادوں کا بیگ لیے
ریل کے ڈبے سے اترا
اسٹیشن پہ
دھند میں ڈوبا سناٹا تھا
میرے پاس اک سایہ آیا
میں نے ٹکٹ دے کر پوچھا
"کیا یہ میرا وطن ہے بابو؟"
اس نے اپنے لیمپ کی مدھم لو میں میرا چہرہ دیکھا
"میں کیا جانوں، جو آتا ہے یہ کہتا ہے
مجھ کو بس اتنی ہے خبر
ٹوٹی پھوٹی دیواروں کے گھیرے جن کو گھر کہتے ہیں
ان میں کتنے بے کس دل اور تنہا روحیں
خاموشی کے لمبے دن اور حسرت کی کالی راتوں کو
اپنا سب کچھ سونپ چکے ہیں"

میں یہ سن کر کیا کہتا
اسٹیشن سے باہر نکلا
پگڈنڈی پہ چلتے چلتے گاؤں پہنچا
بوڑھے برگد کی شاخوں نے حیرت سے مجھ کو دیکھا
میرا بچپن اس کے سایے میں گزرا تھا

آخر پہنچا اپنی حویلی کے در پہ
وحشت نے
میرا سواگت بڑھ کے کیا
گھر کے اندر سایوں نے
سرگوشی میں جانے مجھ سے کیا پوچھا
میں گھبرا کر چیخ پڑا
"وقت نے سارے رشتے ناتے توڑ دیے
کوئی کسی کا اب نہ رہا
میرے بیگ میں برسوں پہلے کی یادیں ہیں
کھول کے دیکھو"
بیگ کو میں نے کھول کے الٹا
کچھ بھی نہ تھا
میں نے آہستہ سے کہا
جانے کس نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا!"
تب وحشت نے اتنا کہا
"پردیسی خالی بیگ لیے پھرتے ہو
کون ہو تم جانا ہے کہاں؟"

زبیر رضوی

برہن

وہ موسم پھر لوٹ آیا ہے
آم کے پیڑوں کی شاخوں میں
مول کے خوشے جھول رہے ہیں
بیری کے پیڑوں میں بالک
کنکر پتھر پھینک رہے ہیں
ہرے ہرے شہتوتوں کے لب
میٹھے پن میں ڈوبے چلے ہیں
دور رہٹ سے آتا پانی
کیاری کیاری دوڑ رہا ہے
جامن کے ایک پیڑ کے نیچے
ایک میورا ناچ رہا ہے
جھیل کنارے گھات لگائے
بے گنتی پنچھی بیٹھے ہیں
گاؤں کی دھوبن تیرے میرے
میلے کپڑے کوٹ رہی ہے
باغوں باغوں کچی پکی
پہرہ داری جاگ اٹھی ہے

وہ موسم پھر لوٹ آیا ہے
پکی ہوئی گیہوں کی کھیتی
کٹنے کو تیار کھڑی ہے

گربھ وتی کی کوکھ جنم
دینے کو جیسے تڑپ رہی ہے
ل ہاتھوں نے چھوڑ دیے ہیں
ہاتھوں میں سکائے درانتی
کھلیانوں کی تیاری میں
جٹے ہوئے ہیں گاؤں کے باسی
مٹی کے بے ڈول گھڑوں میں
پانی ٹھنڈک چوس رہا ہے
برگد کی چھایا میں بیٹھا
بوڑھا ماما اونگھ رہا ہے

وہ موسم پھر لوٹ آیا ہے
تم نے جس موسم میں مجھ سے
آنے کا اقرار کیا تھا
وہ موسم یہ پوچھ رہا ہے
میں تو تیری خاطر پگلی
آؤں گا ہر سال مگر وہ
من مندر کا شام منوہر
کب آئے گا کب لوٹے گا!

شور مینائی

ایک لمحہ - ایک نظر

آج اس آراستہ کیفے میں اکیلا ہوں میں
جھنجھناتے ہوئے سازوں سے لپک کر نغمہ
لرزشِ پا میں بدل جاتا ہے
اور مرے پائپ سے اٹھ کر یہ دھوئیں کے بادل
تھوڑی دور اڑ کے پریشان سے ہو جاتے ہیں
لیکن اس کیفے کی آراستہ رنگینی میں
ابنِ آدم کی طرح دنیا میں
میں اکیلا بھی ہوں محفل میں بھی ہوں
حسن اور حسنِ نظر بھی ہے یہاں
گو مرے ساتھ نہیں پھر بھی مرے پاس تو ہے

دور اک میز پہ زہرہ جلوہ نما ہیں جن کی
سرخ قالین کی جانب کبھی جھکتی ہے نظر
اور نگاہیں کبھی اٹھتی ہیں نقشِ چھت پر

پھر پلٹتے ہوئے ... جھکنے سے یہ کہہ جاتی ہے
"ہم کو تو آپ سے اک یونہی سی دلچسپی تھی
یہ کسی لمبی کہانی کا نہیں دیباچہ
آپ کی آنکھوں میں کچھ اور تجسس کیوں ہے
گر نہیں آپ کو منظور تو یہ بھی نہ سہی"
اور میں سوچتا رہتا ہوں کہ آج
قیس صحرا میں نہیں کوہ پہ فرہاد نہیں
کسی لیلیٰ کسی شیریں کو بھی کچھ یاد نہیں

جھنجھناتے ہوئے سازوں سے لپک کر نغمہ
لرزشِ پا میں بدل جاتا ہے
مضمحل سے یہ خیالات دھوئیں کے بادل
تھوڑی دور اڑ کے پریشاں سے ہو جاتے ہیں

محمد علوی

ایک منظر

اسی پیڑ کی چھاؤں میں
دوپہر کو
اسے میں نے دیکھا تھا
وہ اپنی بکری کے بچے کو
باہوں میں لے کر
اسے پیار سے چومتی تھی
مجھے دیکھ کر
اس نے مجھ سے کہا تھا
"مرے گھر میں سب سو رہے ہیں
مجھے نیند آتی نہیں
اس لیے میں یہاں آگئی ہوں
مگر تم ؟
تمھیں کیا ہوا ؟

کس لیے تم بھلا
چلچلاتی ہوئی دھوپ میں
پھر رہے ہو ؟"
تو میں نے اسے
یاد آتا نہیں کیا کہا تھا
جسے سن کر وہ ہنس پڑی تھی
اسی پیڑ کی آڑ میں
دوپہر جب کھڑی تھی
بہت سال پہلے کی یہ بات ہے پر
ابھی تک
مری آنکھ میں
قید ہے
سارا منظر !!

کمار پاشی

ایک دلچسپ کردار

اگرچہ وہ ہر ایک مذہب سے بیگانہ ہے ۔ لاتعلق
مگر اس کو طنزاً
میں 'پنڈت جی' کہہ کر بلاتا ہوں اکثر

وہ ٹھگنے سے قد، سرمئی رنگ کا
مسخرہ
جس کی رگ رگ میں اندھے دلوں کا لہو
جس کے چہرے پہ، اور بات کرنے کے انداز میں
دیوتاؤں کا مکارپن ۔ ہو بہو
(اپنی بیوی کی جائز کمائی پہ خوش ۔ مطمئن)

ایک دن
آئینہ لا کے جو سامنے، میں نے اس کے رکھا
تو وہ گھنٹوں تلک خود کو تکتا رہا
کرب میں مبتلا
ایک پیدائشی مسخرہ!

اور میں

گھنے جنگلوں، بے کراں پانیوں
دور تک مسکراتے ہوئے پربتوں میں
وہ جلوے ترستے ہیں اب بھی
جنھیں میری آہٹ کے نغموں کی خوشبو ملے
تو سبھی دیوتا
جن کی رو میں ازل سے
بدن کے پری دھان کی خواہشوں میں
سلگتی رہی ہیں
خلا سے نمودار ہو کر
مجھے ایسا وردان دیں
کہ میں دھرتی کی ساری اداسی کو پی کر
گھنے جنگلوں، بے کراں پانیوں
دور تک مسکراتے ہوئے پربتوں پر
پھسل کر گروں
اور نئی دیو مالا کی پہلی کہانی مکمل کروں

حکیم یوسف حسین خاں

چیخ

دوڑتے آئے فرشتے
کہ یہ کیا قصہ ہوا
آسمانوں پہ خدا چونک پڑا
جاگ گیا
اس نے نرمی سے کہا!
"تم نے کوئی چیخ سُنی؟

رات نے اپنے سیہ رخ سے
پسینہ پونچھا
اپنی بے نور نگاہوں سے زمیں کو دیکھا
سرد اک سانس لیا
خواب کے لہجے میں کہا
"اے دیارِ غم اندوہ و بتا
تو نے کوئی چیخ سنی؟"

کرۂ ارض نے دیوار سے در سے پوچھا
در و دیوار نے ایک ایک شجر سے پوچھا
اور درختوں کی کراہوں نے سحر سے پوچھا
صبح نے سوئے ہوئے ایک بشر سے پوچھا
"تو کہ احساس ہے
اک سوئی ہوئی شب کی طرح
کچھ تجھے علم ہے؟
کیا تو نے کوئی چیخ سنی؟"

اور انسان نے کہا؟
"چیخ میں کیسے سنتا؟
میں تھا سویا ہوا، کھویا ہوا، تنہا تنہا
اور تنہائی کہ اک خواہشِ بے نام بھی ہے
کہہ رہی تھی
کہ مجھے آکے جگائے کوئی
ایک لحظہ کے لیے
ایک پلک بھر کے لیے
میرے نزدیک دبے پاؤں ہی آجائے کوئی!
میں نے سوتے ہوئے
اک خواب تو دیکھا ہے ضرور
آگ کا نام نہیں سامنے ہیں طور ہی طور
اور تم پوچھتے ہو
میں نے کوئی چیخ سنی؟"

اور فرشتوں کا خدا
چونک پڑا، جاگ گیا
دوڑتے آئے فرشتے تو یہ ارشاد ہوا
"قید سے خواہشِ بے نام کو آزاد کرو
جاؤ، معمورۂ ویران کو آباد کرو"

ظفر گورکھپوری

چاند اور کھڑکی

چاند سے کہہ دو اب نہ آئے یہاں
بند کرلی ہے میں نے وہ کھڑکی
اور وہ ریشم کا دودھیا پردہ
نرم پُروا کی انگلیاں جس کو
گدگداتے ہوئے ہٹاتی تھیں
روشنی کی سبک سبک موجیں
گرم کمرے میں پھیل جاتی تھیں
رات اک جھیل تھی شعاعوں کی
زیست چاندی کی ایک کشتی تھی
پیار مانجھی تھا جس کے ہاتھوں میں
اجلی بانہوں کی تھی حسیں پتوار
اور اب کچھ نہیں ہے، کچھ بھی نہیں
کوئی پرچھائیں، کوئی سایہ تک
بیتی راتوں کا اب نہیں باقی
چاند سے کہہ دو اب نہ آئے یہاں

اب وہ کھڑکی سجی دھجی کھڑکی
اب وہ کھڑکی نہ کھل سکے گی کبھی
اب وہ ریشم کا دودھیا پردہ
ملگجی سلاخوں پہ ہے
جھول ہو کوئی کفن جیسے
نرم پروا کے شوخ ہلکورے
روح میں جیسے سوئیاں سی چبھیں
روشنی کی سبک سبک موجیں
گونجتے پھیلتے، دھوئیں کی طرح
گرم کمرہ ہو جیسے برف کا گھر
رات اک جھیل تھی شعاعوں کی
رات اب اک مہیب پگڈنڈی
پاشکستہ سے رینگتے لمحے
کچّے زخموں کا قافلہ جیسے
چاندنی جس طرح لہو کی پھوار
چاند سینے کا آبلہ جیسے
چاند سے کہہ دو اب نہ آئے یہاں
اجلی بانہوں نے ساتھ چھوڑ دیا
گر چکی چھوٹ کے ہاتھ سے پتوار
دل سے ہو کر گزر گیا طوفان
سو چکی لہر آرزوؤں کی
اب سمندر بہت ہی چپ چپ ہے

قمر ساحری

سچّائی

آؤ لوگو ہاتھ بٹاؤ
انگاروں کا فرش بچھاؤ
تلواروں کی پیاس بجھاؤ
نیزے برچھے خنجر لاؤ
کچھ نہ ملے تو پتھر لاؤ
آؤ لوگو آگ لگاؤ

شہر میں ہنگامہ برپا ہے
بڑے بڑوں کی دانائی پر
جنم جنم کی سچائی پر
اس پاگل نے تھوک دیا ہے
اس پاگل نے جھوٹ کہا ہے
چاندمیں کالے داغ پڑے ہیں

مصحف اقبال توصیفی

تخلیق

تمھارے عارض
تمھاری آنکھیں
تمھاری گردن
تمھاری بانہیں
گلوں کے جھرمٹ میں مسکراتا ہوا شہابی بدن تمھارا
تمھارے عارض — یہ لب تمھارے
تمھاری مہتاب سی جبیں کے چراغ لے کر
نہ جانے تحت الشعور کے گم کدے میں کب سے بھٹک رہا ہوں

میں سوچتا ہوں
کوئی نئی نظم کہہ ہی ڈالوں

عبدالعزیز خالد

لفظوں کو کہاں طاقتِ وصفِ مہِ دلجو؟ — چمکے یدِ بیضا تو زمیں بوس ہو جادو!
اے یافہ درا! عاشقی و قافیہ سنجی؟ — جب آگ لگے دل میں تو بہتے نہیں آنسو!
کیوں کشورِ خاطر نہ ہو پامال و پر آشوب — اک مجمعِ خوباں ہے کراچی میں ہر سو
کرتے ہیں سرِ راہ شکارِ دلِ گمراہ — مست و مشایل صنمِ عالیہ گیسو
آتش گہِ موبد کی طرح چہرہ فروزاں — دوشیزہ بدن میں شبِ تعریس کی خوشبو
آواز میں آہنگِ رباب و دف و سرنا — رفتار میں سرمستیٔ رود و رمِ آہو
تسخیرِ دلِ مست کے ساماں ہیں کیا کیا — حرفِ غزل و چشمِ غزال و قدِ تازہ رو
زنبورِ عسل ہے کہ کنول کنج کا بھونرا — خالِ سرِ پستانِ عروسانِ پری رو
کھلتا ہے سرِ بزم، سرِ شیشہ و نافہ — مینا کو سمجھتے ہیں چراغِ رہِ مینو
بالا سے پربت کی جنوں خیز ہوا نے — دوشیزۂ کہسار ہے یا لالۂ خود رو
سورج کی کرن برف کو شنگرف بنائے — سنتے ہیں کہ فردوس کا غرفہ ہے سکردو
آراستنِ حسن ہے یا کاستنِ حسن — کجلا دیئے پنسل سے حسیناؤں نے ابرو
ہم کو نہیں ذوقِ قدح و رطل و قنینہ — ہم تشنہ و سیراب ہیں مانندِ لبِ جو
وہ جام و چمانہ ہوں کہ یا چنگ و چغانہ — بدمستی و بیہوشی و آشوب و ہیاہو
ہم کیسۂ قاروں ہیں نہ ہم کاسۂ جمشید — سگ تیری گلی کے، ترے فتراک کے آہو!
عاشق کو کرے حرفِ وفا سرخوش و فربہ — بے تاب حیات الفتِ معشوقِ وفا خو
ہر درد کا درماں نہیں تریاقِ مساوات — لازم ہے ترقی کے لیے فرقِ من و تو
کیوں شوق لگد کوبِ حوادث سے ہو نالاں — لپکیں مہِ تاباں کی طرف راہو و کیتو
آموختنِ علم تو دشوار نہیں ہے — پانا موری کی طمعِ خام پہ قابو
ہے جرعہ کشی بادۂ خوشبوئے مروق — ہر درد ہے آلودہ نہ کر اپنے لبوں کو
شہرت کے خریدار ہیں دولت کے پرستار — ناپید ہیں مردانِ ہنرمند و ہنر جو
ہے تجھ کو اگر درکِ رموزِ ادب و فن — رکھ شعر میں تہ داری و تمثیل کے پہلو
شاعر کو دمِ فکرِ سخن، شعلۂ روشن — خلخال کی آواز ہے یا نالۂ کو کو
میں شام کا عاشق ہوں لبھاتی ہے مجھے شام — جب گیسوئے میکش سے مہک اٹھتے ہیں مشکو
فطرت نے مجھے بخشے مقاماتِ تبتل — تخئیل و تفکر بھی تو ہے عین تگاپو

کیوں کر نہ معطر ہو مشامِ دلِ خالد

اعجاز صدیقی

پودے اُٹھے ہیں سرو و سمن، دیکھ کر چلو
اہلِ چمن، ہوائے چمن دیکھ کر چلو
ساحل پہ اِک شور ہے، موجوں میں اضطراب
اے صاحبانِ گنگ و جمن، دیکھ کر چلو
ابھی نہیں ہیں آبلہ پائی کی زحمتیں
تپنے لگی ہے ارضِ وطن دیکھ کر چلو
صیاد خود ہی صید ہوں ایسا نہ ہو کہیں
پھیلا ہوا ہے دامِ کہن، دیکھ کر چلو
راہ داں میں ہیں ہم بھی، عدو دشمن بھی دوست بھی
کس کی طرف ہے روئے سخن، دیکھ کر چلو
دُشمن ادا [illegible] رکھو نہ آنکھوں کی مشعلیں
کچھ کہہ رہا ہے دورِ فتن، دیکھ کر چلو
اوروں کی سمت دیکھ کے چلنا ہے گمرہی
اپنی طرف رجالِ وطن، دیکھ کر چلو
چہروں کی برہمی کو ذرا آئینہ دکھاؤ
ماتھوں کی اپنی تازہ شکن دیکھ کر چلو
ہیں راہِ میکدہ میں مئے نو کی بارشیں
اے خوگرانِ جامِ کہن، دیکھ کر چلو
وابستگی تمہیں بھی کئی خرمنوں سے ہے
سینوں کی آگ، دل کی جلن، دیکھ کر چلو
اعجاز کچھ تو وقت کی سمجھو نزاکتیں
تم اور یہ بیانِ سخن، دیکھ کر چلو

اختر سعید

نظر نظر جستجو ہے جس کی نفس نفس جس کی آرزو ہے
میری نگاہوں سے چھپنے والے وہ اور کوئی نہیں ہے تو ہے

نہ دیکھئے میری آستیں کو خود اپنے دامن سے پوچھ لیجے
ہوا ہے جو اشک جذب اس میں وہ اشک پانی ہے یا لہو ہے

متاعِ ہستی لٹا رہا ہوں ہنوز اس تیرہ خاکداں میں
جہاں لہو قیمتِ جگر ہے نہ اشک آنکھوں کی آبرو ہے

مٹانے والے جو ہو سکے تو مٹا دے یہ داغِ ناتمامی
نہ موت ہے کامیاب میری نہ زندگی تیری سرخرو ہے

فضائے پرواز بیکراں ہے سمیٹتا کیا ہے بازوؤں کو
گلوں کے سائے میں رکنے والے بہارِ زندگی رنگ و بو ہے

مثالِ سبزہ چمن میں روندے گئے ہیں ہم بار بار لیکن
جو تھا وہی عزمِ زندگی ہے جو تھی وہی گرمیٔ نمو ہے

ملے جو اختر کہیں تو دیکھیں سنا ہے بالکل بدل گیا ہے
نہ اب وہ اگلا سا بانکپن ہے نہ اب وہ پہلی سی گفتگو ہے

نور محمد نور

قریبِ منزلِ مقصود کیا کر بیٹھ جاتے ہیں
صعوبت سے سفر کی جاں چھڑا کر بیٹھ جاتے ہیں
جو سودا زلفِ پیچاں کا لیے بیتاب نکلے تھے
سوادِ منزلِ جاناں میں آکر بیٹھ جاتے ہیں
نہ جانے آندھیوں سے کس طرح یہ لوگ کھیلیں گے
جو گردِ راہ سے دامن بچا کر بیٹھ جاتے ہیں
وہ جن کو تند شعلوں کی لپک آواز دیتی ہے
حریر و پرنیاں میں منہ چھپا کر بیٹھ جاتے ہیں
تھے جن کی گرم رفتاری کے آگے سرنگوں طوفاں
وہی ساونت اب دھونی رما کر بیٹھ جاتے ہیں
ہراس بُعدِ منزل تا نہ چہروں سے نمایاں ہو
شبِ تاریک میں مشعل بجھا کر بیٹھ جاتے ہیں
ہنرِ عشق پر اب اور کیا افتاد آئے گی
وہی جو سربکف تھے سر جھکا کر بیٹھ جاتے ہیں
نہیں واماندگیٔ شوق کے اقرار کی جراءت
بہانے ڈھونڈتے ہیں سر جھکا کر بیٹھ جاتے ہیں
زمیں مشکل نہیں لیکن سخن پاروں پہ بھاری ہے
کہو تو نورؔ ہم مقطع سنا کر بیٹھ جاتے ہیں

میر ہاشم

معیارِ غمِ دوست گرانے کے نہیں ہم
احسانِ مسیحا بھی اٹھانے کے نہیں ہم

وہ زخم کہ جو مرحمت پردہ نشیں ہے
وہ زخم سرِ بزم دکھانے کے نہیں ہم

آئے ہو تو دیکھو دلِ برباد میں کیا ہے
تم سے تو کوئی بات چھپانے کے نہیں ہم

ہم جرمِ صداقت کے خطاوار ہیں لوگو!
یہ سچ ہے کہ خود اپنے زمانے کے نہیں ہم

اب تم سے کریں اپنی تباہی کا گلہ کیا
دشمن کا بھی دل ہو تو دکھانے کے نہیں ہم

ہاشمؔ یہ بھی الزام جو آتا ہے تو آئے
سچ بات اگر ہے تو چھپانے کے نہیں ہم

بشیر بدر

وہ پیاسے جو کہ بہت پیاسے لوٹ جاتے ہیں
جو دور دور سے بادل اڑا کے لاتے ہیں

جو ہاتھ روتی ہوئی شب کا منہ دھلاتے ہیں
قبائے گل میں ستارے بھی ٹانک جاتے ہیں

کوئی لباس نہیں دل کی بے لباسی کا
اگرچہ روز نئی چادریں چڑھاتے ہیں

خلوص شبنم و نکہت، وفور آتش گل
وہ ہونٹ جو مری پلکوں پہ کپکپاتے ہیں

ضرور کوئی نکلتا ہے حجلۂ شب سے
جو صبح رنگ کے پردے گرائے جاتے ہیں

یہ بات کیوں کہی مجھ سے سکوت دریا نے
چراغ پانی میں اکثر بہائے جاتے ہیں

ستارے کھوئے ہوئے بچے ہیں جنھیں اکثر
وہ ساتھ کھیلے ہوئے دوست یاد آتے ہیں

پکار اٹھے مسافر کو جیسے چاند کا شہر
کہ خفتہ جسم کبھی یوں بھی جاگ جاتے ہیں

لرز رہے ہیں ستارے سحر کی آنکھوں میں
چمن کے شبنمی رخسار تھرتھراتے ہیں

ہمارے شعر گناہ زمیں کا وہ نغمہ
جسے فلک کے فرشتے بھی گنگناتے ہیں

قصیدہ حسن کا، اور حسن کو سناؤ گے
بتاؤ پھول کو خوشبو کہیں سنگھاتے ہیں

ستارہ جن کے بھٹکتے ہیں ساری ساری رات
جو وعدہ کر کے وفا کرنا بھول جاتے ہیں

ترا سکوت ہے اکثر تحیر نغمہ
خموش رہ کے بھی وہ ہونٹ گنگناتے ہیں

میں دن ہوں میری جبیں پر دکھوں کا سورج ہے
دیئے تو رات کی پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

جلا رہا ہے ستاروں کو انتظار مرا
مگر وہ اشک جو پلکوں پہ تھرتھراتے ہیں

انھیں کے پاس ملیں گے کئی نوادر غم
یہ قافلے جو رہ دل پہ آتے جاتے ہیں

خوشا یہ قدر تو ہے اس اداس نسل کے پاس
اداس بھی جو نہ ہوں گے وہ لوگ آتے ہیں

گلاب سا وہ بدن کیا ہوائے درد میں تو
گھنے درختوں کے جنگل بھی سوکھ جاتے ہیں

صب

ابوالخیر صہبا

چاندنی راتوں میں آنسو میری آنکھوں سے ڈھلے
یوں بھی نغمے درد کی آغوش میں پھولے پھلے

اہل گلشن بے خبر ہیں اپنے گرد و پیش سے
کون جانے کتنے دامن آتش گل سے جلے

روشنی اشکوں میں آئی یوں کسی کی یاد میں
جیسے روشن ہوں کسی محفل میں شمعیں دن ڈھلے

اُف وہی کانٹے لہو چوسیں گلوں کا عمر بھر
جن کے پہلو میں بڑھے اور جن کے سایہ میں پلے

عمر بھر مڑ کر نہ دیکھا جانب نام و نمود
پھر بھی صہبا آپ نظروں میں بہت سوں کی کھلے

آپ کا در ہے اور جبین نیاز
ہے یہی بندگی یہی ہے نماز

دے رہا ہے کوئی مجھے آواز
مل رہا ہے مجھے پر پرواز

امتزاج حقیقت اور مجاز
عشق محمود اور عشق ایاز

آپ ہر شے میں آ رہے ہیں نظر
پھر بھی ہٹتا نہیں ہے پردۂ راز

زندگی تجھ سے تجھ سے لطف حیات
اے غم عشق تیری عمر دراز

مری شام و سحر تمہارے لیے
چشم بر راہ گوش بر آواز

مری دنیائے حسرت و ارماں
آپ کی اک نگاہ خوش انداز

زندگی ان کے پیار کی صہبا
مستقل پیچ و خم نشیب و فراز

جوگندر پال

بچوں کی کہانیاں

(بڑوں کے لیے)

اپنا باپ

" تم کیا بننا چاہتے ہو ننھے میاں ؟"

" نباب بو کھان ، بڑا نباب ۔" غریب بچے نے جی ہی جی میں ' بڑا نواب ' بن کر جواب دیا ۔

" اور تم ؟ "

" مَیں ؟ ۔۔ کھان باور بڑے کھان ساب ۔" دوسرے ننھے منے ' خان صاحب ' نے اکڑ کر کہا ۔۔

" اور تم ؟ "

" میں ؟ ۔۔" تیسرا بچہ سوچنے کے لیے ذرا رک کر گویا ہوا ۔" مَیں اپنا باپ بننا چاہتا ہوں ۔"

" اپنا باپ ؟ وہ کیوں ؟ "

" میرا باپ بے مد گریب آدمی ہے جی ، سو مَیں ہمت کرکے کھد ہی اپنا باپ بن جانا چاہتا ہوں ! "

بوجھ انسانیت کا

رکشا والا بمشکل بارہ برس کا ہوگا ۔

ہم دونوں شراب کے نشے میں دھت رکشا میں بیٹھے تھے ، اور وہ ہانپ ہانپ کر ہمیں کھینچے جا رہا تھا اس پر ترس کھا رہے تھے اور ترس کھا کر بڑے محظوظ ہو رہے تھے ۔

" بابوجی ۔" ایکا ایکی لڑکے نے اپنا سر پیچھے گھما کر پوچھا ۔" وجن بڑھتا کیوں جا رہا ہے ؟ "

" بھئی ، ہم تو وہی دو ، بیٹھے ہیں ، وزن کیسے بڑھ گیا ؟ "

لیکن مجھے اچانک خیال آیا کہ یہ غریب شاید ہماری فرہ انسانیت کا بوجھ بھی محسوس کرنے لگا ہے۔

بوجھ علم کا

"تم پڑھتے ہو؟"
"ہاں، چوتھی جماعت میں۔"
"اور تم؟"
"یہ ہمارا نوکر ہے، میری کتابوں کا بستہ لے کر روز میرے ساتھ اسکول آتا ہے۔"
"تم یہ کتابیں بالکل نہیں پڑھ سکتے؟"
"نہیں مالک، ہم مورکھ سر پہ الم کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔"

گمشدہ

ندگندے گندے لڑکے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ایک خوش رو، معصوم بچہ لیے بازار میں گشت کرتے
رالگا رہے تھے۔
جس کا بچہ کھو گیا ہو، لے لو ــــ و"
بار گی ایک خوبصورت موٹر کار ان کے پہلو میں رکی، زرق برق ساڑی میں ملبوس درمیانی عمر کی ایک عورت نے
آگے بڑھ کر بچہ لے لیا اور اسے سینے سے لگا کر بے اختیار چومنے لگی۔
س کا بچہ کھو گیا ہو ــ ایک لڑکے کے منہ سے عادتاً نکل گیا۔
ب کون کھو گیا ہے بھئی؟" اس کے ایک ساتھی نے ہنس کر پوچھا۔
ب!" میلے کچیلے لڑکے کو کوئی جواب نہ سوجھا لیکن ان خوش نصیب ماں بیٹے کو بغور تکتے ہوئے اس کی خاموشی
مانند بول اٹھی۔

بھولے بھالے

لنے والے امیر بالک نے کام کرنے والے غریب بالک سے کہا "آؤ تم مجھے کام کرنا سکھا دو، میں تمھیں

کھیلنا سکھادوں گا۔"

غریب بالک پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا۔ "تمھارے لیے کام سیکھنا فضول ہے اور میرے لیے کھیل سیکھنا"۔

عمر

"چھوٹے چھوٹے بچوں کی ایسی پکّی باتیں سُن کر میرا دل ڈر جاتا ہے۔"

"پر یہ تو ان کی ہوشمندی کی علامت ہے۔"

"اور ان کی موت کی بھی۔"

"موت کی بھی؟"

"ہاں آدمی کا بچّہ در اصل جی جی کے بوڑھا نہیں ہوتا، سوچ سوچ کر بوڑھا ہوتا ہے۔ باور کرو، ہماری فکر تو تلی رہے تو بچے ہمیشہ جھریوں سے مبرا رہیں۔"

رام لعل

دودھ

وہ سفر سے لوٹا تو گلی کوچوں میں پانی گھوم رہا تھا اور بارش ابھی تک جاری تھی. موسلا دھار۔ وہ گھٹنے گھٹنے پانی میں ڈوبا ہوا اپنے گھر تک پہنچا. کندھے پر اٹھائی ہوئی گٹھڑی کو ٹٹولا اور مالک کا شکر بجا لایا کہ اس کی دولت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا جو وہ کما کر لا رہا تھا.

گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہی اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اپنی حسین و جمیل بیوی سے ملنے اور اپنے اس بچے کو دیکھنے کے تصور سے جسے وہ صرف چند روز کا چھوڑ کر چل دیا تھا. اب وہ پانچ سال کا ہو چکا ہوگا! اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا. اب تو خوب شرارتیں کرتا ہوگا! عجیب پیاری پیاری باتیں کرتا ہوگا! ماں نے اسے ابا، ابا کہنا سکھا دیا ہوگا! پدری محبت سے سرشار ہو کر اس نے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی، اور ذرا سے غصے کے ساتھ سوچا ۔ کیا اس کی بیوی سو گئی ہے؟

اسی لمحے اسے گھر کے آنگن میں بھرے ہوئے پانی میں کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی. یقیناً اس کی بیوی آ رہی ہے! اس نے بیوی کی چاپ پہچان لی۔ وہ کس قدر بے صبری سے بھاگتی چلی آ رہی ہے۔ اس نے اسی سے بیوی کی محبت کا اندازہ کیا اور دروازہ کھلنے سے پہلے اس کے بے مثال حسن کا تصور کر کے مسکرا دیا۔

دروازہ کھلا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا. وہ اسی طرح خوبصورت اور دلکش نظر آئی جس طرح وہ سوچتا ہوا آیا تھا. اوپر آسمان پر بجلی چمکی تو اس کی روشنی میں اس کے جسم کی ساری دلآویزی نمایاں ہو گئی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں محبت کی وہ چمک بھی دیکھ لی جس کا وہ ہمیشہ سے متمنی رہا کرتا تھا.

دونوں نے محبت سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے بہت ہی بے قراری سے اپنے بچے کی خیریت پوچھی، عورت نے اسے یقین دلایا "وہ بالکل خوش و خرم ہے۔ ابھی ابھی بڑی مشکل سے سویا ہے۔ تم شور مت مچاؤ نہیں تو جاگ جائے گا!"

وہ بچے کو ایک نظر دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کمرے تک دبے پاؤں پہنچا جہاں وہ سو رہا تھا. اس کے اوپر جھک کر دیکھا۔ وہ سچ مچ پانچ سال کا ہو چکا ہے۔ بہت ہی خوبصورت اور بالکل تندرست ہے! وہ خوش ہو کر مسکرا دیا اور پھر بڑی حقارت سے ان چار بچوں پر نگاہ ڈالی جو اس کے بچے سے ذرا فاصلے پر الگ سو رہے تھے۔ اس کے بچے سے

یں بڑے تھے۔ ان چاروں کی عمروں میں بھی ایک۔ تفاوت تھی۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی شکل دوسرے سے نہیں ملتی تھی
سب الگ الگ باپ سے تھے۔ لیکن ان کی ماں یہی عورت تھی وہ اس کا پانچواں شوہر تھا۔ اس عورت کو حاصل کرنے کے
ہر ایک شوہر نے اس کے پہلے مرد کو مار ڈالا تھا۔ لیکن کوئی اس کے ایک بھی بچے کو اس سے دور نہیں کر سکا تھا۔ وہ
یت اتنی خوبصورت تھی کہ اس کی خاطر قتل بھی کیا جا سکتا تھا اور بلا شبہ اس کی ہر خواہش کو پورا بھی۔ عورت اس کا
م تھے۔ دونوں ہی بہت کشش انگیز تھے جس شخص نے اس عورت پر قبضہ کر لیا وہی اس کے گھر کا مالک بھی بن گیا۔

اپنے بچے کو دیکھنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آ گیا یہ کمرہ بہت ہی کشادہ تھا اور ہمیشہ بڑی نفاست سے سجا
اتھا۔ چاروں طرف بیش قیمت مورتیاں، تصاویر، جنگلی بھینسوں کے چمکدار نوکیلے سینگ اور شیروں وغیرہ
وپڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ قدیم و موجودہ زمانے کے وہ ہتیار بھی بڑی احتیاط سے رکھے ہوئے تھے۔ یہ سارے
ر اس کے گزشتہ شوہروں کی یادگاریں تھیں۔ انھیں بھی اس عورت نے اپنے سے الگ نہیں ہونے دیا تھا
شوہر نے آتے ہی انھیں چھین لینے اور برباد کر دینے کا ارادہ کیا لیکن پھر اس کی ضد اور خواہش کے سامنے
گیا تھا۔

اس نے اپنی بیوی کے سامنے باہر سے لائی ہوئی دولت کی گٹھڑی کھول کر رکھ دی۔ جسے دیکھ کر وہ اس کی
[illegible] خوش ہو کر مسکرانے لگی۔

عورت نے اس کے سامنے کھانے پینے کے کئی لوازمات لا کر رکھ دیئے جنھیں اس نے بڑی لگن کے ساتھ تیار
[illegible] طرح طرح کے لذیذ اور خوشبودار کھانے دیکھ کر وہ مسرت سے باؤلا سا ہو اٹھا۔ عورت کو پہلو میں بٹھا
راب پینے لگا اور اسے اپنے سفر کے حالات سنانے لگا۔

سفر کے دوران میں اس نے کئی حسین عورتیں دیکھی تھیں لیکن اس نے اعتراف کیا کہ کوئی عورت اس کی
سے بڑھ کر حسین نہیں تھی۔

شراب پیتے پیتے وہ مدہوش سا ہونے لگا۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگا۔ عورت اتنی حسین کیوں ہوتی ہے؟ اس
ونٹوں میں شہد کی سی مٹھاس کیوں ہوتی ہے؟ اس کے جسم کی قوسوں میں کیسا جادو ہوتا ہے کہ ـــ!

وہ ایک گیت گانے لگا۔ اپنی زبان میں گیت۔ عورت اس کی زبان سمجھتی تھی۔ ساتھ رہ کر اس نے اپنے ہر ایک
ہر کی زبان سیکھی تھی۔ جب وہ اس طرح بدمست ہو کر گانے لگتے تھے تو وہ ایک معنی خیز خاموشی کے ساتھ سنا کرتی تھی۔

اس کا شور سن کر ساتھ کے کمرے میں سوئے ہوئے سارے بچے جاگ اٹھے۔ پھر اکر اسی کمرے میں چلے آئے اور آتے
ل سے لپٹ گئے۔ اس نے اپنے بچے کو دیکھا تو خوش ہو کر اسے گود میں اٹھا لیا اور اسے سینے کے ساتھ لپٹا لپٹا کر پیار
ہوئے کہنے لگا۔ "او وہ تم کتنے خوبصورت ہو! کتنے پیارے ہو! بالکل میری طرح ہو۔"

اس نے پلٹ کر اپنی عورت سے بھی پوچھا۔ "یہ بالکل میرا ہم شکل ہے نا!" عورت مسکرائی رہی۔ فخر اور بے بسی سے۔

بچہ اپنی ماں کی گود میں جانے کے لیے مچل اُٹھا۔ رونے لگا تو باپ نے اسے پچکارا۔ "کیوں؟ کیوں؟ کیا ہوا میرے بچے کو؟ تم میری گود میں رہو نا! میں تمہارا باپ ہوں۔" بچے نے اپنی ماں کو پکارا اُس نے اپنے اجنبی باپ کے بازوؤں میں سے اٹھا لینے کے لیے کہا۔ باپ نے اس کی آواز سنی مگر اس کی زبان نہ سمجھ سکا۔ بہت حیران ہوا پھر کسی قدر غصے میں آ کر کہا "تو نے اسے بھی اپنی زبان سکھا دی ہے؟ میری زبان کا ایک لفظ تک نہیں سکھایا!" اس کا نشہ ہرن ہو گیا۔ ساری خوشی غائب ہو گئی بولا۔ "تو اپنے طور طریقے خود اپنے اور دوسرے بچوں تک نہ رہنے دے۔ دوسرے بچوں سے کوئی سروکار نہیں لیکن میں اپنے بچے پر تمہاری چھاپ پڑنے دوں گا نہ تیری۔" عورت نے اپنے مرد کی طرف بڑی محبت بھری نظر سے دیکھا جس میں قناعت تھی۔ ایک انوکھا صبر۔ آنکھوں میں آنسو لا کر بولی "اس نے میری چھاتی کا دودھ پیا ہے۔ اس بات کو تم کیوں بھلا رہے ہو؟" اور وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بچے کو لے لینے کے لیے بازو پھیلا دیئے۔ وہ بھی بچے کو دیر تک اپنے پاس روک نہ سکا۔ جب بچہ ماں کے پاس پہنچ گیا تو اس نے شربت کا ایک اور جام چڑھایا۔ اور بڑی خونخوار نظروں سے اپنی عورت کی طرف دیکھنے لگا۔



قیصر تمکین

اسفنکس[۱]

ایمپلائمنٹ دفتر میں جونیر اسسٹنٹ کی خالی جگہ کے لیے انٹرویو تھا اور رنجیت کو بھی بلایا گیا تھا۔ اس نے اپنے دوست کے اصرار پر اس جگہ کے لیے درخواست تو بھیج دی تھی مگر اس کے بعد وہ اس واقعے کو بھول بھی گیا تھا جب انٹرویو کے لیے اس کو بلایا گیا تو وہ تشویش میں پڑ گیا، اور کوئی وقت ہوتا تو وہ صاف کہہ دیتا کہ نہیں جائے گا مگر اس دن صبح سے ہی دو چار ایسے واقعات پیش آئے کہ اس کو انٹرویو کے لیے جانے کا ارادہ کرنا پڑا۔ اس نے سوچا کہ کیا پتہ اس کو منتخب ہی کر لیا جائے۔

صبح وہ بیچ اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹل کے استعمال کے کمرے میں تھا اور بے خیالی میں کتاب الٹ پلٹ کر رہا تھا کہ اتنے میں اشفاق نے پہلے تو اپنا ہاتھ اور مسکراتے طرف اشارہ کیا اور پھر اس کو مخاطب کر کے کہا "رنجیت صاحب آج تو سارا دن یونہی گزر گیا"۔

رنجیت نے بے بسی، شرمندگی کے ساتھ جیب میں پیسہ نہ ہونے کا عذر کیا یعنی اس نے محض ہاتھ کے اشارے کیا ورنہ زبان سے تو اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔

اشفاق کا مطلب یہ تھا کہ آج چائے یا کافی کچھ بھی نہیں پی گئی۔ مگر اسی کے ساتھ ہی ایک دوسرا مفہوم بھی تھا اور وہ بھی سب لوگ سمجھ گئے۔ دوسرا مفہوم یہ تھا "سارے روز دوسروں سے پیتے ہو اور کافی پینا ہو تو کبھی خود بھی تو کچھ کرو"۔
اس بات کو رنجیت نے بہت شدت سے محسوس کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کنجوس کبھی بھی نہیں تھا مگر ادھر مسلسل بیروزگاری اور دوسری طرف گھر کے تمام ذرائع آمدنی بند ہوجانے کی وجہ سے وہ بالکل قلاش رہتا تھا۔ اشفاق جو اس کو ہر وقت دوسروں کی نگاہ میں برا ٹھہرانے کا منتظر ہی رہتا تھا اس نے رنجیت کی موجودہ عسرت میں اپنے لیے ایک اور مضبوط پہلو ڈھونڈ نکالا تھا۔

رنجیت نے اشفاق کی بات کا اثر نہیں لیا، نہ کیوں کر پہرہ اس اعتنا تھی۔ یہ معاشرے کا معمولی نمبر تھا جہاں دوسروں کی بدحالی یا پریشانی کے باعث تعریض ہی ہوتی ہے۔ اس کو تو ہر وقت صرف اپنی مسلسل بیروزگاری اور مفلسی پر تھی۔

وہ چپ چاپ گھر آ کر بستر پر لیٹ رہا اور ٹیگور کی نظموں کا نیا مجموعہ دیکھنے لگا۔ رنجیت نے انگریزی شاعری میں اپنے لیے

---

[۱] SPHINX

ڈارک کوئی نیا پہلو دریافت کرلیا تھا اور پریشانی اور ذہنی کوفت کے عالم میں وہ اپنے سرہانے رکھے ہوئے انگریزی اور امریکی شعراء کے شعری مجموعے اٹھا کر پڑھنے لگتا۔ چنانچہ اس وقت وہ "ڈارک ہاؤسز" کی ورق گردانی کرنے لگا۔

لیکن اسی وقت بوس بابو کے مکان کے پاس جوگلی کے موڑ پر بنا ہوا تھا "ردی، ٹین، بوتل بیچ ڈالو" کی آواز گونجی اور رنجیت نے دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں الٹ پلٹ کرنے کے بعد ایک طویل نظم پڑھنا شروع کردی۔

رنجیت کی ماں نے مکان کے پچھلے دروازے پر کھڑے ہو کر ردی والے کو پکارا۔ یہ دروازہ ایک تنگ گلی میں کھلتا تھا جس میں عام طور پر آس پاس کے مکانوں کا کوڑا ہر سے پہر کو پابندی کے ساتھ پھینکا جاتا تھا اور پتھر کے کوئلے کی انگیٹھیاں سلگنے کے لیے رکھ دی جاتی تھیں اور ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ جب کوئی گھریلو عورت دروازے پر جھانکتی تو بدھا رنجامن بڑبڑاتا ہوا گزرتا "حرامزادہ۔ لینڈی کتا۔ بلڈی ڈاگ"۔

یہ گالیاں وہ اپنے کتے کو دیتا تھا مگر دراصل اس طرح عورتوں کے سامنے بڑبڑاتے ہوئے گزر کر وہ ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا تھا۔

جب رنجیت کی ماں نے دروازے پر کھڑے ہو کر پرانی لالٹین اور ردی اخبار خریدنے والے کو پکارا تو بنجامن بڑبڑاتا ہوا گزرا "بلڈی سوائن ۔ لینڈی کتا"۔

رنجیت کی ماں دروازے کی اوٹ میں ہوگئی اور بنجامن کے گزر جانے کے بعد اس نے دو پرانی لالٹین ردی والے کو دکھا کر کہا "کتنے میں لوگے"۔

ردی والے نے دونوں لالٹینوں کو اچھی طرح پرکھا اور پھر تین آنے بتائے۔

اتنے میں رنجیت اٹھ کر آگیا۔ متوسط درجے کے غلط یا صحیح رکھ رکھاؤ کے جذبے سے بے چین ہو کر وہ نکلا اور ماں پر برس پڑا۔ "ماتا جی۔ یہ آپ کو کیا ہوگیا ہے۔ دروازے پر کھڑی ہوئی ماٹھو کی ماں کی طرح سودے والوں کو پکار رہی تھیں۔ پھر وہ بھی یہ کہ سامنے کھڑی ہوئی پرانی لالٹین بیچ رہی ہیں۔ آپ کو کسی بات کا خیال ہی نہیں رہا ہے"۔

ماں پہلے تو دھیمے دھیمے ردی والے سے سودا کرتی رہی پھر جھلا کر بولی "لے چار آنے میں لینا ہے تو لے لو ــ نہیں تو جاؤ"۔

رنجیت کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ بالآخر دونوں لالٹین چار آنے میں بک گئیں اور ماں نے کہا "یہ لو چار آنے اس کی شام کو سبزی آئے گی"۔

ماں نے چار آنے منی کی طرف بڑھا دیئے۔ منی نے پلنگ پر لیٹے ہی لیٹے چونی لے لی۔ مگر تب تک رنجیت کے غصے کے سارے ہتھیار کند ہو چکے تھے۔ تاہم وہ اتنا جھلایا ہوا تھا کہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا "سبزی بنے نہ بنے، روٹی بنے، مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتا جی آپ اس طرح دروازے پر کھڑے ہو کر سودے والوں کو نہ پکارا کیجیے۔ منی سے بلوا لیا ہوتا ــ مجھ سے کہا ہوتا"۔

"منی کو دیکھو رہے ہو کتنا بخار چڑھا ہے"... آگے ماں کچھ اور کہتی جس کے تصور سے ہی رنجیت ڈر گیا کیونکہ اس کو اپنی کمزوری یاد آگئی۔ اسے یاد آیا کہ وہ ہر بڑے رکھ رکھاؤ سے رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ جدید امریکی شاعروں کے کلام کو وہ بے موقع سناتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ صبح سویرے ہاتھ میں جھولا لٹکا کر سبزی لینے جانا یا سائیکل پر آٹے کی بوری لاد کر لانا ایسا تصور ہے جو آرٹ اور لٹریچر کے ذوق سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ اس کا ذہن نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ پھر وہ دیر تک ماتا جی کہہ رہی تھیں "عزت ہے کس کی جس کے پاس پیسہ ہوتا ہے اسی کی عزت ہوتی ہے۔ پیسہ نہ ہو تو اپنے لڑکے بالے بھی عزت نہیں کرتے۔"

رنجیت پر بڑی گہری چوٹ پڑی وہ تلملا کر رہ گیا اور رچرڈ کمنگز کی منتخب نظمیں پڑھنے لگا۔

شام ہوتے ہی گلی میں پان والے کی آواز گونجی۔ ایک آدھ گھر کا دروازہ کھلا۔ شاید کہیں سے کسی عورت نے جھانکا کیونکہ اسی وقت بنجامن اپنے کتے کو گالیاں دیتا ہوا گلی سے گزر رہا۔ بلڈی سوائن۔ . . .

لیکن آج پان والے کو پکارنے والوں میں منی کی آواز شامل نہیں تھی۔ رنجیت کو یاد آیا کہ کل اسی بات پر اس کا ماتا جی سے جھگڑا ہو چکا ہے۔ اس نے ماں کی پان کھانے کی عادت پر اعتراض کر دیا تھا اور ماں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اس کو چپ کرا دیا تھا۔ پر آج جب منی نے پان والے کو نہیں پکارا تو رنجیت کو بڑا دکھ ہوا۔ کمنگز کی ٹیڑھی میڑھی نظمیں پڑھتے پڑھتے اس نے سنا۔ ماتا جی کہہ رہی تھیں۔ "پہلے دو پیسے کے پان لے لیتی تھی۔۔۔ وہ بھی کبھی کبھی نہیں۔ اس پر بھی ٹوکا جانے لگا۔ سب نے ایسا کہا کہ اب پہلے دو پیسے کے پان بھی بھاگ میں نہیں رہ گئے۔"

"میں کیا کروں ۔۔ میں کیا کروں۔" وہ تقریباً بے بس ہو گیا وہ آج تک ماتا جی کے لیے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ باپو جی کے مرنے کے بعد سے وہ اب تک بے کار تھا اور اب گھر میں پیسے پیسے کی محتاجی کے دن آگئے تھے۔ ماتا جی کی باتوں سے اس کو سخت رنج اور صدمہ ہوا وہ جتنا اس بارے میں سوچتا اتنا ہی بے بس ہو جاتا۔ دو پیسے صرف دو پیسے۔۔

ایک دم اس کو خیال آیا کہ کیا ہم لوگوں کی حالت دیکھ کر کوئی یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ ہمارے گھر میں دو پیسے بھی نہیں ہیں۔ وہ اپنی حالت پر آبدیدہ ہو گیا مگر فوراً ہی اٹھا، منہ دھویا اور نئی صاف قمیص پر کاڈرا کا پتلون پہن کر باہر نکل آیا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کسی سے دو چار پیسے ہی مانگ کر ماں کے لیے پان تو لا ہی دے گا۔ گلی کی موڑ پر ایک بھکاری نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "بھیا اچھے رہیں۔ دو پیسے کا سوال ہے بابو جی۔"

رنجیت جھلا گیا اور غصے میں اس کو "شٹ اپ" کہہ کر آگے بڑھا۔ اس کے ذہن میں بھی دو پیسے کا سوال تھا۔

اسی عالم میں اس کو انٹرویو کا خیال آیا۔ انٹرویو کا خط وہ دو تین دن سے جیب میں ڈالے گھوم رہا تھا لیکن اس دن رات گئے تک بازاروں میں بیکار گھومتے گھومتے اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ انٹرویو میں جائے گا۔ پھر اس بات کا ذکر رلونترہ کے سامنے بھی آگیا، اور رلونترہ نے اس سے اصرار کیا کہ وہ جونیئر اسسٹنٹ کی خالی جگہ کے لیے ضرور جائے۔ رلونترہ کی بات ٹالنا آسان نہ تھا۔

عب

رنجیت انٹرویو کے لیے چل تو دیا مگر جونیئر [illegible] کی جگہ کام کرنے کے تصور ہی سے وہ اپنے وجود سے نفرت کر رہا تھا۔ وہ زندگی میں طرح طرح کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ اس نے ادب اور آرٹ کی خدمت کرنے کی کوا پنا نصب العین بنا رکھا تھا مگر بنیادی سوال [illegible] ہے اس کی لوہا لے [illegible] [illegible] سے مندرت [illegible] والے [illegible] کی نگہبان دلویاں کبھی کسی [illegible] نہیں ہوتی ہیں۔

ایمپلائمنٹ افسر ایک نوجوان لڑکا جو طالب علم تھا وہ رنجیت وغیرہ کے ساتھ کا پڑھا ہوا تھا اس نے بے روزگاری کے مسائل پر ایک مقالہ لکھا تھا جس کے بارے میں [illegible] ہنگامہ بھی رہا تھا مگر بہرحال اس کو ایمپلائمنٹ افسر کی جگہ مل گئی [illegible] اس نے [illegible] [illegible] نوجوانوں کو اپنے پاس ایک [illegible] روپیہ کی نوکری کے لیے انٹرویو میں بلایا تھا اور رنجیت کو بھی جانا ہی پڑا۔

جب رنجیت وہاں پہنچا تو اس کو بہت سے جانے پہچانے ملے وہ سب اسی کی طرح نئے نئے یونیورسٹی کی خوبصورت [illegible] آئے تھے۔ رنجیت [illegible] سعید نالش سے ملا اور بولا کہو یار۔ آرٹ وارٹ کا کیا حال ہے۔

سعید [illegible] آرٹ وارٹ [illegible]۔

"سعید" رنجیت [illegible] [illegible] یہاں [illegible] آ [illegible]

[illegible] [illegible] نہیں [illegible] زندگی [illegible] کچھ نہیں [illegible] [illegible] دولت [illegible]"

کے [illegible] [illegible] [illegible] ہوگئی ہے۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے [illegible] کی سماعت [illegible] دونوں سے [illegible] [illegible] [illegible] بچے اور بچے [illegible] [illegible] [illegible] ہوئے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] ہوئے ہیں کہتے ہیں [illegible] آج بھی [illegible] [illegible] نے مجھ [illegible] دیا۔ [illegible] کو ایمپلائمنٹ [illegible] کے ذریعہ بلوایا [illegible] ہے۔ اور مجھ کو لے لیا جائے گا۔"

[illegible] سعید [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کوئی [illegible] [illegible] انٹرویو [illegible] [illegible] ہوتا ہے۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔ جب [illegible] ہاتھ ملایا اور سعید [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مذاق [illegible] [illegible] [illegible] ہنسی مذاق کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی حالت میں [illegible] [illegible] آتا۔

اچانک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی [illegible] آ [illegible] [illegible] ایک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔ سعید [illegible] [illegible] اس کو [illegible] [illegible]

رنجیت دوسری طرف خالی خالی نگاہوں سے تاک رہا تھا۔ چپراسی نے چک اٹھا کر صاحب کے اندر جانے کے لیے راستہ بنایا اور پھر اپنی مونچھیں اینٹھ کر حقارت سے سب امیدواروں پر نظر ڈالی۔

"ارے یہ تو طوطارام ہے اپنا۔" نیل کنٹھ نے کہا۔

"ہاں یار وہ جس کو ایڈیٹ تم کہتے تھے۔" سعید تابش نے تلخی سے کہا۔

"مگر یار یہ ایمپلائمنٹ افسر کیسے ہو گیا۔" نیل کنٹھ کی ساری خوش مزاجی ختم ہو گئی۔

"یہ بھئی اب اس سے خود پوچھو۔ مجھے معلوم ہوتا تو میں بھی ہو گیا ہوتا۔" سعید نے گفتگو کو پھر قدرے مزاحیہ رنگ دینے کی کوشش کی۔

رنجیت نے اپنے کھدر کے پتلون میں دونوں ہاتھ ٹھونس کر کہا۔ "نیل کنٹھ۔ ایڈیٹ طوطارام نہیں تھا۔ وہ اپنی چپل گھسیٹتا ہوا ہر تیسرے دن یونیورسٹی کے ہر ملازم کی خوشامد کرتا پھرتا تھا اور تم اس کو ایڈیٹ کہتے تھے۔"

"ارے یار یہ لوگ سب جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ کون اپنے میرٹ پر ترقی کرتا ہے۔" نیل کنٹھ نے بہت اداس اور انتہائی تلخی سے کہا۔ اس کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اب اس کو طوطارام کے سامنے جا کر ملازمت کے لیے گڑگڑانا ہوگا طوطارام جس کا اس نے ہمیشہ مذاق اڑایا تھا اب اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ساری دنیا طوطارام ہے اور سب لوگ چلا چلا کر اس کو ایڈیٹ کہہ رہے ہیں۔

اتنے میں گھنٹی بجی۔ چپراسی اندر گیا اور اس نے باہر نکل کر صدیقی کا نام پکارا۔ صدیقی نے گھبراہٹ میں رومال نکال کر پسینہ پونچھا اور پھر کوٹ پر اچھی طرح ہاتھ پھیرتا ہوا اندر چلا گیا۔ نیل کنٹھ اب بھی رنجیت کے ساتھ تھا۔

باری باری کر کے کئی لوگ اندر گئے۔ جیسے ہی کوئی امیدوار باہر نکلتا باقی لوگ اس کو گھیر لیتے اور پوچھتے کہ کیا کیا پوچھا گیا۔ وہ امیدوار تھوڑی دیر تک سارا غم بھلا کر بڑے بڑے معرکے کے جواب سناتا۔ کہتا پھر میں نے یہ کہا، پھر میں نے وہ کہا جس سے وہ دونوں آدمی بہت متاثر ہوئے — وغیرہ وغیرہ۔

جب نیل کنٹھ اندر گیا تو رنجیت دفتر کی پشت کی طرف ٹہل رہا تھا اس طرف انٹرویو والے کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رنجیت نے ذرا گردن اونچی کر کے کمرے میں دیکھا نیل کنٹھ بہت ہی مرعوب طور پر "یس سر" کہہ رہا تھا اور طوطارام اس کو ڈپٹ رہا تھا۔

"یہ تھرڈ ڈویژن لے کر آتے ہوئے آپ کو شرم نہیں آئی۔" طوطارام نے ڈپٹ کر کہا۔

"یس سر" — نیل کنٹھ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ طوطارام نے پھر ڈپٹا۔ "جائیے تشریف لے جائیے۔"

جب نیل کنٹھ باہر نکل رہا تھا تو اس نے طوطارام کو کہتے سنا "ایڈیٹ"

رنجیت کو سخت غصہ آیا۔ اب وہ پشیمان تھا کہ وہ خود کیوں یہاں آیا۔ اس نے آخر کیوں درخواست دی "کیوں آ! کیوں آیا" یہ سوال اس کو اتنا پریشان کر رہا تھا کہ اس کو اپنا سارا خون غصے اور افسوس سے کھولتا ہوا محسوس ہوا اس کو

ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ساری نسیں پھٹ جائیں گی اور خون ڈھل ڈھل کر بہنے لگے گا۔ تبھی اس نے کھڑکی سے نظر ڈالی۔ وہاں شکلا بیٹھا ہوا بڑی عاجزی سے اپنے گھر کی پریشانیاں بیان کر رہا تھا۔ "میں بڑا ڈزروِنگ کینڈیڈیٹ ہوں سر۔ فادر کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔ گھر میں دال روٹی کا سوال ہے۔ فاقے کی نوبت آنے والی ہے — وغیرہ وغیرہ۔

رنجیت نے جب شکلا کو یہ سب کہتے سنا تو اس کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ وہ وہاں سے ہٹ آیا اور کوریڈور میں ٹہلنے لگا۔ مگر اس وقت شکلا باہر آگیا اس نے جیب سے کنگھا نکال کر اپنے بال سنوارے اور مسرت کے ساتھ مسکراتا ہوا بولا — تبھی وہ ان کو خود ہی خیال تھا ڈپٹی منسٹر صاحب کا فون مل چکا تھا۔"

لوگوں نے سوال کیا کہ "پھر بھی تم سے کیا پوچھا"۔ شکلا نے لاپرواہی سے کہا "کچھ نہیں یار فادر کی ڈیتھ کے بارے میں پوچھتے رہے۔"

پھر رنجیت کا نام پکارا گیا — اس نے چک اٹھا کر اندر جانا چاہا مگر اس کے قدم رک گئے — اور یک لخت وہ دوسری طرف مڑ گیا۔ اس کے قدم آہستہ آہستہ گھر کی طرف اٹھنے لگے۔

تب اس رات گھر میں روٹی کے ساتھ سبزی نہیں تھی۔
مرچ کے اچار کے ساتھ ماتا جی نے منّی کو کھانا کھلایا اور روکھی روٹی لے جا کر رنجیت کے کمرے میں رکھ دی یہ شاید اس کو یاد دلانے کے لیے کہ گھر میں عام حالات کن منزلوں سے گزر رہے تھے
مگر رنجیت دن بھر کی باتیں بھول کر اشینلے کنسر کی نئی نظمیں پڑھ رہا تھا۔ گلی کے سناٹے میں نجامن کی آواز گونج رہی تھی — "حرامزادہ بلڈی ڈاگ"
اور نجامن کا خارشتی زدہ کتا بڑی بھیانک آواز میں رو رہا تھا۔

قمر ساحری

ایک تکیہ ایک سر

تھکے ماندے، کندھے لٹکائے حاجی علی جب اپنے گھر لوٹے تو انھیں آگ بگولہ ہونا پڑا۔ آج پھر ان کی پہلی بیوی کا سات سالہ لڑکا مکان میں نہیں تھا۔ انھوں نے سلیمہ کو آواز دی، اختر کی نسبت پوچھا اور جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ سلیمہ نے اختر کو کسی بھی کام سے نہیں بھیجا تو ان کا غصہ اور بڑھ گیا۔ وہ بڑی گرجدار آواز میں سلیمہ کو ڈانٹتے اور کہتے کہ ساری بے توجہی محض اس لیے ہے کہ سلیمہ اختر کی سوتیلی ماں ہے اور وہ ایک لمحہ بھی اختر کو اس کے مکان میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ برخلاف اس کے سلیمہ خود اپنے پانچ سالہ بچے کا اس طرح خیال رکھتی جیسے وہ ابھی دودھ پیتا بچہ ہی ہے۔ یہ امتیاز حاجی علی کو کھلتا اور کڑھتے کہ انھوں نے دوسری شادی ہی کیوں کی جو ان سے پہلی اور آخری حماقت سرزد ہوئی۔

اختر کی ماں کے انتقال کے بعد انھوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ دوسری شادی کا تصور تک نہیں کریں گے اور اپنی باقی زندگی اختر کے لیے وقف کر دیں گے، یہی ان کی زندگی کی آخری تمنا تھی۔ اختر کی ماں نے دم توڑنے سے پہلے حاجی علی سے عہد لیا تھا کہ اختر ان کا بیٹا ہی نہیں بلکہ ایک امانت بھی ہے اور یہ امانت حاجی علی کی [illegible] دونوں کی زندگی کا حاصل تھی۔ اٹھارہ برس منتیں مرادیں مانگتے ہی گزر گئے۔ انیسویں برس اختر نے جنم لیا اور ابھی دو برس کا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اختر کی ماں نے حاجی علی اور اپنے دو برس کے بچے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ ایک برس تک حاجی علی نے بڑی مصیبت سے اختر کی نگہداشت کی اور ایک دن جب اچانک اختر کو ملیریا نے آ لیا تو ان کے ہوش اڑ گئے تھے۔ اختر کی صحت یابی پر انھوں نے مٹھائیاں تقسیم کیں، نماز شکرانہ پڑھی اور پھر اس پڑوسی کے مشورے سے سنجیدگی سے غور کرنے لگے جس نے کہا تھا کہ "تمھیں بیوی کی ضرورت نہ ہو لیکن اختر کو ایک ماں کی ضرورت ضرور ہے۔"

پھر انھوں نے طے کیا کہ وہ اپنے لیے نہیں، اختر کے لیے دوسری شادی ضرور کریں گے ـــــ

سلیمہ سے شادی کے بعد وہ مطمئن ہو گئے کہ اختر کو ماں مل گئی لیکن ان کی ساری توجہ سلیمہ سے زیادہ اختر ہی پر رہی، شادی کے دوسرے ہی برس کسی منّت و مراد کے بغیر جب سلیمہ کے ساجد پیدا ہوا تو انھوں نے رسمی خوشی سے ساجد کا استقبال کیا، سلیمہ کو یقین تھا کہ حاجی علی کی آنکھوں میں کالے پیلے اختر کے بجائے خوبصورت ساجد کی تصویر چمکنے لگے گی لیکن ایسا نہیں ہوا، حاجی علی کی آنکھوں میں اختر ہی بسا رہا۔ کبھی کبھی سلیمہ ساجد کی بدنصیبی کا گلا کرتی تو وہ اسے اس کے وہم کا نام دیتے اور قہقہے لگا کر یقین دلاتے کہ ساجد بھی انھیں اختر ہی کی طرح بے حد پیارا ہے لیکن سچی بات تو یہ تھی کہ جب بھی حاجی علی گھر لوٹتے تو سب سے پہلے اختر کو آواز دیتے، اختر کی آواز سن کر مطمئن ہوتے اور مسکراتے پھر ساجد کی طرف دیکھ کر بلی کی آواز نکالتے، شام ہوتی تو اختر اور ساجد کو لے کر کھانا کھاتے، کچھ دیر سلیمہ سے گپ لڑاتے اور پھر حسب معمول اختر کے ساتھ بستر پر سو رہتے، حاجی علی کی اختر سے اسی بے پناہ محبت نے سلیمہ کے دل میں اختر کے خلاف نفرت کے بیج بو دیے تھے وہ سوچتی ہی نہیں بلکہ یقین کرتی کہ یقیناً اختر پچھلے جنم میں حاجی علی کی بیوی رہا ہوگا۔ جب ہی تو وہ آج بھی اس کی محبت اور اس کی راتوں پر قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ حاجی علی بغیر اختر کے سو ہی نہیں سکتے تھے اور یہی بات سلیمہ کے دل پر ایک گہرے زخم کی طرح ہری تھی ـــــ آج جب حاجی علی گھر لوٹے تو اختر کو مکان میں نہ پا کر آپے سے باہر ہو گئے۔ ان کے شدید غصے کی بنیادی وجہ یہ تھی شہر میں بچوں کے اغوا کی خبر پھیلی ہوئی تھی اور آج ہی منہ سے تین لڑکے اغوا کیے گئے تھے ان کے دل میں یہ شک کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا کہ کہیں تین لڑکوں میں اختر بھی نہ ہو، پھر انھوں نے سلیمہ سے پوچھا کہ اختر کب سے لاپتہ ہے، جب سلیمہ نے بتایا کہ وہ کوئی تین چار گھنٹے پہلے نظر آیا تھا حاجی علی کانپ اٹھے ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اختر کی ماں کے آخری الفاظ ان کے کانوں میں گونجنے لگے، انھوں نے سلیمہ کو ایک گندی گالی دی اور چیخ کر کہا۔

”تجھے خبر ہے آج پھر تین بچے غائب ہو گئے“

یہ کہہ کر حاجی علی دیوانہ وار گھر سے نکل پڑے ـــــ

حاجی علی کی گندی گالی پر سلیمہ نے کوئی توجہ نہیں کی۔ بچوں کے اغوا کی خبر سن کر وہ چپ سی ہو گئی، اس کے چہرے پر تردد سے زیادہ سکون تھا وہ سوچنے لگی کہ اگر واقعی اختر کا اغوا کیا گیا ہے تو آج سے اس کی نئی زندگی میں کسی سوت کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کا چہرہ سہاگن کی طرح دمک اٹھا، اس نے بڑی حقارت سے اس چھوٹے سے تکیے کو کونے میں اچھال دیا جس پر وہ تنہا سر رکھے سوتی آئی تھی پھر اس نے اسی کونے سے ایک بڑا سا تکیہ نکالا، اس کی گرد صاف کی، ستھرا غلاف چڑھایا اور بڑے پیار سے تکیے کو تھپتھپا کر اپنے بستر پر ڈال دیا، پھر اسے خیال آیا کہ اس کے بال الجھے ہوئے ہیں وہ سنگار میز پر پہنچی اور اپنے کھلتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر جھینپ سی گئی۔ اس نے دھیمے سروں میں گنگناتے ہوئے جوڑا کھولا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے حاجی علی کے تیور یاد آ گئے، وہ خیالوں میں ڈوب گئی، اسے یہ بھی دھیان نہ رہا کہ اس کا ساجد بھوکا ہی اس کے بستر پر سو گیا ہے۔ پھر وہ اس وقت چونکی جب حاجی علی کے قدموں کی آہٹ سنسان گلی میں گونج اٹھی

— حاجی علی کے ساتھ اختر نہیں تھا — وہ گم سم سے تھے سلیمہ نے اختر کے تعلق سے پوچھا تو جواب میں وہ گھور کر رہ گئے سلیمہ کا دل دھڑکنے لگا، اس نے ہمت کر کے پھر اختر کے بارے میں پوچھا۔ حاجی علی نے رو دینے کے انداز میں کہا۔

"خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کہاں ہے۔"

وہ سیدھے اپنے بستر پر لیٹ گئے اور چپ سادھ لی، ورنہ وہ ہمیشہ سونے سے پہلے لہک لہک کر مزے دار باتیں کرتے اختر اور سلیمہ کو خوب ہنساتے ساجد کو بلّی کی آوازیں نکال کر چھیڑتے۔ ساجد چڑتا تو سب ہنس پڑتے۔ یہ سلسلہ صرف اختر کی آنکھ لگنے تک جاری رہتا۔ اختر کے سوتے ہی وہ بھی چپ ہو جاتے۔ سلیمہ کوئی بات لے بیٹھتی تو جماہیاں لیتے ہوئے نیند کا بہانہ کرتے اور آنکھیں بند کر لیتے پھر اختر سے پیٹھ لگائے خراٹے لینے لگتے۔

لیکن آج گھر کی فضا بدلی ہوئی تھی نہ مزے دار باتیں تھیں نہ اختر کی کھلکھلاتی ہنسی، نہ بلی کی آوازیں تھیں نہ ساجد کا چڑچڑاپن اور سب سے بڑھ کر حاجی علی کے ان خراٹوں کا پتہ ہی نہ تھا جو اُن کے سوتے ہی جاگ پڑتے اور گھر کے محافظ بن جاتے۔

سلیمہ اپنے بستر پر بیٹھی دور سے حاجی علی کا چہرہ دیکھ رہی تھی اسے حاجی علی کے چہرے پر آنکھیں نظر ہی نہیں آرہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حاجی علی کی دونوں آنکھیں ان کے چہرے سے نکل کر شہر کی سنسان گلیوں میں اختر کو ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔

سلیمہ کو یقین تھا کہ حاجی علی غصے ہی کا سہارا لے کر اسے اختر کی تفصیلات بتلائیں گے۔ ان کی مسلسل خاموشی سے وہ گھبرا اٹھی۔ رات کے تین بج رہے تھے، حاجی علی کے خراٹے اونگھ رہے تھے سلیمہ چپکے سے اٹھی، ساجد کو کندھے پر ڈالے حاجی علی کے قریب پہنچی، اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ یہ حاجی علی ہیں یا ان کی سانس لیتی ہوئی لاش پڑی ہے اس نے چپکے سے اپنے ساجد کو حاجی علی کی پیٹھ سے لگا کر سلا دیا اور اپنے بستر کی طرف لوٹ گئی، تھوڑی ہی دیر بعد حاجی علی کے خراٹے جاگ اٹھے، سلیمہ تکیے میں منہ چھپائے پھوٹ پڑی اسے اختر نہیں بلکہ اپنا ساجد یاد آرہا تھا۔

جاوید لطیفی

مس شیریں کھٹارے والا

اور شیریں نے حیرت و خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ شیریں کو دیکھا . . . . .

ریس کورس کے پاس والے سینما سے میں پکچر دیکھ کر باہر نکلا ـــــ آسمان ابر آلود تھا، شام ابھی کچھ دور تھی لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا شام ہو گئی ہے، آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے جو اس بات کا پتہ دے رہے تھے کہ وہ جلد ہی برسنے والے ہیں، ہوا بھی تیز چل رہی تھی، قریب ہی کے ایئرپورٹ کی سرچ لائٹ ابھی سے وقفے وقفے کے بعد آسمان کی سمت دیکھنے لگی تھی۔

میں نے فضا کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہوئے اپنی موٹر سائیکل سنبھالی ـــ سوچا گھر جانا بہت دور ہے، جلد از جلد روانہ ہو جانا چاہیئے، بارش کا موسم ہے کچھ بھروسہ نہیں، جانے کب پانی برسنے لگے۔

ٹینک بنڈ تک تو میں آگیا لیکن یہیں سے بارش شروع ہو گئی۔ میں نے موٹر سائیکل کی رفتار تیز کر دی۔ تالاب میں ہواؤں نے تموج پیدا کر رکھا تھا اور لہروں کے ٹکرانے کا ہلکا شور سنائی دے رہا تھا، دوسری سمت سڑک کے نیچے گہرائی میں پھیلے ہوئے علاقے پر دھند سی چھائی ہوئی تھی جو اس بات کا پتہ دے رہی تھی کہ وہاں بارش ہو رہی ہے اور اس طرف بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ روڈ پر تالاب اور کھلی جگہ کے باعث ہوا کافی تیز تھی، سائیکل سوار ہوا کی تیزی کے باعث سائیکلوں پر جھکے ہوئے جا رہے تھے، ٹانگے، رکشا، بسیں اور موٹریں ہواؤں کو چیرتی آگے بڑھ رہی تھیں، میری موٹر سائیکل بھی تیزی سے چلی جا رہی تھی اور میری قمیص کے کھلے ہوئے کالر میری گردن اور کانوں پر اس طرح پڑ رہے تھے جیسے ننھے ننھے چپت کی تھپڑیاں۔

دیکھتے ہی دیکھتے پانی بڑھ گیا اور میں بھیگ گیا، پورے راستے پر سوائے کچھ پیڑوں کے سر چھپانے اور آسرا لینے کے لیے کوئی اور جگہ نہیں تھی اور وہ پیڑ بھی بہت آگے تھے، میں اس منزل پر تھا کہ آگے بڑھ سکوں نہ پیچھے جا سکوں، اب تو پانی اور بھی تیز ہو گیا تھا، اس کی شدت سے یہ مشکل تھی کہ پانی کے قطرے شیشوں پر سے بہہ رہے تھے اور سامنے کا منظر دھندلا نظر آ رہا تھا، قریب سے گزرنے والی موٹروں کی ہیڈلیمپس اور بیک لائٹ کی سرخ روشنی بھی مشکل سے دکھائی دیتی

شبنموں پر بہنے والے پانی کی بوندوں سے لپٹ کر آڑی ترچھی ہوئی جا رہی تھیں۔ ۔ ۔ ۔

راستے میں ایک چھوٹی سی کینٹین پڑتی تھی، میں کافی بھیگ گیا تھا اور آگے آسرے کی جگہ تک جانا مشکل معلوم ہو رہا تھا اس لیے میں کینٹین کے پاس آکر رک گیا اور موٹر سائیکل اسٹینڈ کر کے کینٹین پر آ گیا۔

کینٹین کا کوئی چھجہ نہیں تھا جہاں بارش سے پناہ لی جا سکے۔ یہ ایسی دکان تھی کہ باہر فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے چائے کافی یا سوڈا لیمن پیا جا سکتا ہے سگریٹ یا چپس خریدی اور چلتے بنے، اندر کچھ سامان اور فروخت کرنے والی لڑکیاں یا عورتیں ہی ہوتی تھیں گاہکوں کے بیٹھنے کا انتظام نہ اندر تھا اور نہ باہر ——

کینٹین میں ٹیوبلکس کی نیلاہٹ لیے سفید روشنی پھیلی ہوئی تھی میں جب موٹر سائیکل اسٹینڈ کر کے آگے بڑھا تو ایک ادھیڑ عمر کی موٹی سی پارسی خاتون نے اخلاق و ہمدردی کا ثبوت دیتے ہوئے اندر ہی سے پکارا ——

"یہ باجو سے اندر آ جاؤ، پانی بڑے جور سے گر رہا ہے"

اور میں کینٹین کے اندر پہنچ گیا —— خاتون کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے کپڑوں پر سے بارش کے پانی کو جھاڑا، پھر اپنا بھیگا ہوا رومال نچوڑ کر پہلے عینک صاف کی پھر منہ ہاتھ گردن وغیرہ پر سے پانی پونچھا اور اطمینان کا سانس لیا کہ چلو بچ گئے ورنہ خوب بھیگنا پڑتا اب جو میں نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا تو آنکھوں کے سامنے ہی شیریں کھارے والا کھڑی ہوئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ اور میں نے حیرت و خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ شیریں کو دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مجھے شیریں کو دیکھے ایک لمبا عرصہ ہو گیا تھا —— تمام یادیں تازہ ہو گئیں اور اس بات کی تو بے حد خوشی ہوئی کہ میں آج ہی اپنے شہر واپس آیا تھا اور آج ہی شیریں سے ملاقات ہو گئی تھی بالکل خلاف توقع —— یہ بات سچ تھی کہ جب میں شیریں سے جدا ہوا تھا تو وہ مجھ سے ناراض تھی، بہت ہی ناراض —— لیکن یہ ناراضگی خود اس کی اپنی پیدا کردہ تھی اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا ——

یہ اس وقت کی بات تھی جب شیریں اور میں پڑوسی تھے اور ہمارا طالب علمی کا زمانہ تھا، میری فرصت کا بہت سارا وقت اسی گھر میں گزرتا تھا کبھی کیرم کھیلا جا رہا ہے تو کبھی آنکھ مچولی ہو رہی ہے، کبھی قصے کہانیاں سنائی جا رہی ہیں تو کبھی سینما یا پارک میں تفریح ہو رہی ہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے بغیر چین ہی نہیں آتا تھا۔ شیریں کے ماں باپ بھی مجھے بے حد چاہتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قصے کہانیوں میں اونگھ جاتا اور وہیں سو جاتا تو وہ لوگ مجھے بیدار کر کے گھر نہیں بھیجتے تھے بلکہ وہیں سوتا رہنے دیتے اور میرے گھر پکار کر کہہ دیتے کہ میں سو گیا ہوں، فکر نہ کریں۔ ۔ ۔ ۔

اور پھر ہم سن شعور کو پہنچ گئے۔ ۔ ۔ ۔

شرارتیں، کھیل کود، قصے کہانیوں کا زور خود بخود کم ہو گیا اور آپس میں کچھ رکھ رکھاؤ اور پاس و لحاظ پیدا ہو گیا لیکن ایک شوق جس میں شیریں بچپن سے الجھی ہوئی تھی اب بھی باقی تھا اور وہ تھا پتنگ اڑانے اور لڑانے کا شوق ——

کمال کی بات یہ تھی کہ وہ خود تو پتنگ اڑانا نہیں جانتی تھی لیکن مجھ سے پتنگ اڑوا کر اسے بے تحاشا خوشی حاصل ہوتی تھی جیسے ہی تل سنکرات کا تہوار قریب آتا اور شہر میں پتنگ بازی شروع ہو جاتی، شیریں ایک آفت بن کر میرے سر ہو جاتی۔ نہ جانے اسے پتنگ اڑوانے میں کیا لطف آتا تھا کہ گھنٹوں وہ اس مشغلے میں پاگل و بے خود بنی رہتی تھی اور ساتھ ساتھ مجھے بھی پتنگ کی ڈور کی طرح اپنے ساتھ الجھائے رکھتی تھی، بعض اوقات تو میری طبیعت گھبرا جاتی لیکن اس کے شوق اور اس کی معصومانہ التجاؤں کے آگے مجھے جھک جانا پڑتا تھا۔

ایک بار میں نے پتنگ کی ڈور اس کے ہاتھوں میں تھمادی اور کچھ دور جا کھڑا ہوا، وہ پتنگ کی ڈور اس وقت تک تھامے رہی جب تک پتنگ آسمان میں سیدھی اڑتی رہی اور جب وہ ڈگمگانے اور غوطے کھانے لگی تو وہ بچوں کی طرح چیخنے لگی ـــــ

لے لو لے لو۔ ۔ اب سنبھالو۔ ۔ ۔ ۔ پتنگ غوطے کھا رہی ہے ـــ

میں اس سے اور دور ہٹ گیا اور کہنے لگا ـــــ

تم خود ہی سنبھالو نا، اتنے دنوں سے پتنگ کا شوق ہے کچھ تو سیکھو ـــ

اوئی ۔ ۔ ۔ دیکھو دیکھو پتنگ درختوں میں الجھ جائے گی پلیز ۔ ۔ ۔ پلیز ۔ ۔ ۔ ۔ لے لو پلیز ۔ ۔ ۔

لیکن میں نے پتنگ نہیں سنبھالی اور وہ بہت دور ایک درخت پر الجھ گئی اور شیریں نے ایک ایسی سانس لی جیسے کہ درخت پر پتنگ نہیں بلکہ اس کی جان الجھ گئی ہو، وہ غصہ میں کانپتی ہوئی چھت پر سے اتر کر اپنے کمرے میں چلی گئی میں ہنستا ہوا اس کے پیچھے لپکا لیکن جیسے ہی اس کے کمرے میں گھسا اور اسے منانے کے لیے اپنی طرف کھینچا، اس نے چٹاخ سے ایک طمانچہ میرے گال پر رسید کر دیا اور مجھے کمرے سے باہر دھکیل دیا۔

میں حیران و پریشان واپس لوٹ گیا، میں نے تو مذاق کیا تھا لیکن وہ تو واقعی ناراض ہو گئی، اتنی ناراض کہ آپے سے باہر ہو گئی دو کوڑی کی پتنگ کی خاطر اس نے مجھ پر ہاتھ ہی اٹھا دیا عجیب لڑکی تھی تھپڑ کھانے کے بعد اصلی غصہ تو مجھے آ گیا تھا جی میں آئی کہ ایک تھپڑ میں بھی رسید کر دوں لیکن ضبط کر گیا یہ سوچ کر کہ عورت پر ہاتھ اٹھانا ۔ ۔ ۔ کوئی بہادری نہیں، اچھی بات نہیں ۔ ۔ ۔ ۔

ایک دو دن تک ہماری آپس میں بات چیت بند رہی ـــــ لیکن آسمان پر پتنگ ہی پتنگ دیکھ کر شاید شیریں سے ضبط نہ ہو سکا اور اس نے مجھے منا لیا، جب وہ حجاب آمیز انداز سے میرے پاس آئی تو میں نہ جانے کیوں موم کی مانند پگھل گیا ۔ ۔ ۔ ۔

پھر تل سنکرات کے دن خوب لطف رہا۔ ہم دونوں نے کئی دن پہلے سے اپنے ہاتھوں سے نہ جانے کیا کیا مصالحے ڈال کر مضبوط اور قیمتی تاگے کا مانجھا تیار کیا تھا، اتنا تیز مانجھا کہ انگلیاں اور جسم بھی کٹ جائے اور پھر بھوک پیاس سے بے نیاز ہو کر صبح سے شام ہونے تک ـــ نہ جانے کتنے پیچ لڑائے اور کتنی پتنگیں کاٹ ڈالیں جب دوسروں کی پتنگ کٹ جاتی تو چرخی سنبھالے شیریں بچوں کی طرح چیختی اور اچھلتی وہ کاٹا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کاٹا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کاٹا ۔ ۔ ۔ ۔

شام تک پتنگ اڑاتے اور پیچ لڑاتے ہم تھک گئے تھے لیکن دل خوشیوں سے معمور ہو رہے تھے بچی ہوئی پتنگ اور چرخی لے کر جب میں اس کے کمرے میں رکھنے پہنچا تو شیریں بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی اور کہنے لگی ـــ

آج تو کمال ہو گیا مزہ آ گیا کتنی پتنگیں کاٹ ڈالیں ہم نے، کل بھی خوب کاٹیں گے لاؤ ایک پیار دو ـــ

اور میری پیشانی کو چوم کر جب وہ ہنسنے لگی تو میں نے بھی جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا بوسہ لے لیا مگر جواب میں پھر مجھے اس کا ایک تھپڑ اپنے گال پر سہنا پڑا۔ ۔ ۔ ۔

اس دن کے بعد سے شیریں بھی بالکل بدل گئی، مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشی و محبت کی جو چمک پیدا ہوتی تھی وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی، اس کی شیریں و معصوم مسکراہٹ اس کا چلبلاپن اس کی شوخی ۔ ۔ ۔ ۔ سب نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اس کی یہ سرد مہری میری سمجھ میں نہ آئی، کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آیا، نہ اپنا قصور نہ اس کی فطرت۔

پہلے تو میں یہ سمجھا کہ اس کی خفگی کے یہ دن جلد ہی ختم ہو جائیں گے اور وہ پھر پچھلے مزاج پر آ جائے گی لیکن حسرت ہے کہ ایسا نہیں ہوا ـــ

شیریں کے سامنے ہواؤں میں پتنگیں اڑتی رہتیں لیکن اب وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی، اس کے دل میں شاید اب پتنگ اور پتنگ بازی کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی، دوسرے معنوں میں شیریں کے دل میں میرے لیے کوئی مقام نہیں رہا تھا گویا میں اس کے نزدیک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تھا۔

اس طرح ایک عرصہ بیت گیا اور کسی وجہ سے مجبوراً ہمیں شیریں کا پڑوس چھوڑ دینا پڑا اور ہم شہر کے ایک دوسرے محلے میں چلے گئے پھر میں کاروبار کی مصروفیتوں میں الجھ کر ایک دوسرے شہر چلا گیا۔ بس شیریں کی [illegible] عجیب و غریب فطرت اور اس کے نرالے سلوک کی چبھن گھٹن اور کسک سینے میں لیے۔

اور میں نے حیرت و خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسے دیکھا۔

شیریں ـــ میں نے آہستہ سے پکارا۔

اس نے گرم گرم کافی کا ایک کپ میرے سامنے لا کر رکھ دیا اور منہ پھیر لیا، اس کی صورت پر چھائی ہوئی گہری متانت اور سنجیدگی سے میرے دل کو صدمہ سا پہنچا اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اب مجھ سے نفرت کرتی ہے بلکہ اس کی نفرت اور گہری ہو گئی ہے

جب میں موٹر سائیکل پر روانہ ہوا تو بارش تھم چکی تھی، سڑک پر دو رویہ ایستادہ بجلی کے کھمبوں پر قمقمے روشن ہو چکے تھے اور میرا سایہ گیلی اور بھیگی سڑک پر کبھی آگے اور کبھی پیچھے دوڑ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آخر شیریں کی مجھ سے اتنی نفرت کی وجہ کیا ہو گی ـــ کینٹین میں کافی پیش کرتے وقت کمبخت نے رسمی طور پر مسکرا کر بھی نہیں دیکھا جیسے ایسے موقعوں پر پاکٹس کی دوسری لڑکیاں اپنے گاہکوں سے مسکراتے ہوئے مخاطب ہوتی ہیں ـــ

قدیر زماں

گیلا کفن

گاڑی ہانکتے ہانکتے مبارک نے پلٹ کر چھوٹے سرکار کی طرف دیکھا تو چھوٹے سرکار اونگھ رہے تھے۔ تکیہ سے لگا ہوا ان کا جسم گاڑی کی رفتار کے ساتھ ہچکولے کھا رہا تھا۔

مبارک کے ہاتھ دونوں بیلوں کے کولھوں پر پڑے اور اس کے حلق سے "ہا" کی آواز نکلی تو بیل دوڑنے لگے۔

"مبارک گاڑی آہستہ چلاؤ۔"

راستہ کی ناہمواری سے ہلکا سا جھٹکا پا کر چھوٹے سرکار نے حکم دیا۔

"اچھا سرکار۔" مبارک نے تعمیل کی۔

چھوٹے سرکار کے ٹرین سے اترنے کے بعد ابھی تک مبارک کو موقع ہی نہ ملا کہ وہ ہریالی کی باتیں کرتا۔ وہ تو صرف اسی قدر پوچھ سکا کہ "سرکار آپ یہاں عرصہ کے بعد تو گاؤں آ رہے ہیں۔ اور پھر مالا جی کی برسی نہ ہوتی تو شاید اب بھی نہ آتے۔"

ایک بار آنکھ کھل گئی تو چھوٹے سرکار نے پھر اونگھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی آنکھیں ان لکیروں کی طرف تھیں جو گاڑی کے پہیوں کے گھومنے کی وجہ سے راستے پر بنتی جا رہی تھیں۔

"مبارک تم نے ہریالی کی موت کی تفصیل نہیں بتائی۔ چاچا جی نے صرف اتنا ہی لکھا کہ اسے نمونیہ ہو گیا تھا اور وہ صرف تین دن میں چل بسی۔" چھوٹے سرکار نے مبارک پر ترس کھاتے ہوئے دریافت کیا۔

مبارک کو یقین ہی تھا کہ چھوٹے سرکار ہریالی کے بارے میں ضرور پوچھیں گے اور پھر وہ شاید اس پہاڑ کو جسے گزشتہ دو ہفتوں سے اپنے سینے پر لیے لیے پھر رہا ہے پگھلا کر آنسوؤں کی راہ کچھ تو بہا دے گا اور اس کے غم کا بوجھ اس طرح سے ہلکا ہو گا۔

"سرکار میری ایک بیٹی تھی۔" مبارک نے ایک لمحہ کے لیے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں ——— "میری ہریالی بیٹی! نوجوان مری ہے بیٹی ——— تو ہریالی تھی مال تو ہریالی تھی۔"

"سرکار جانتے ہیں، چھوٹی عمر میں ماں مرگئی تو میں ہی اس کی ماں تھا"۔ مبارک کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "کتنی امیدوں سے بیٹی پالا پوسا تھا میں نے"۔ مبارک نے اپنے سر سے پگڑی کھولی اور آنکھیں خشک کرنے لگا۔

"میں نے اس کا بیاہ بھی طے کر دیا تھا سرکار ۔۔۔ ٹھیک چودہ دن ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ جمعرات کا دن تھا منہ اندھیرے ہی مزدوروں کو لے کر لکڑی کٹوانے جنگل گیا۔ بیٹی نے بڑی رات سے توشہ بنایا پھر میں سر شام واپس ہو کر دیکھتا ہوں تو بیٹی پلنگ پر پڑی ہوئی ہے۔ جسم اس کا بھٹی کی طرح جل رہا تھا۔ منجھلے سرکار سرکار وارہ سے باہر گئے ہوئے تھے وہ رات تو میں نے بیٹی کے پلنگ سے لگ کر بیٹھے بیٹھے گزار دی ۔۔۔ چھ سات سال پہلے بھی اسے نمونیہ ہو گیا تھا سرکار ۔ ۔ ۔ ۔ ماں جی جو تھیں وہ خود ہریالی کو لے کر ضلع کے دواخانہ لے گئیں تھیں ایک ہفتہ میں آرام ہو گیا تھا ۔۔۔ صبح لوگوں نے رائے دی تھی کہ میں اسے پھر دواخانہ لے جاؤں۔ پھر اس دفعہ ساتھ کوئی نہ تھا۔ میں خود ہی گیا۔ پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ میم صاحب نے انجکشن دیا پر رات بھر وہ بڑبڑاتی رہی۔ صبح ہوتے بیٹی نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں ۔۔۔

آخری بار مجھ سے بات بھی نہیں کرنے پائی سرکار"۔

آنکھیں ڈبڈبائیں تو مبارک نے چھلکتے آنسوؤں میں ہریالی کی قبر دیکھی جو ماں جی کی قبر کے قدموں کی جانب تھوڑے سے فاصلے پر بنائی گئی تھی۔ مٹی کا یہ پانچ چھ فٹ لمبا ڈھیر ابھی سوکھنے بھی نہ پایا تھا۔

اپنے قدیم نوکر کے غم سے چھوٹے سرکار بھی شاید متاثر تھے۔ ہریالی کے بعد دنیا میں مبارک کا کوئی نہ تھا۔

"تم اب کام کاج چھوڑ دو مبارک" چھوٹے سرکار نے ۔ ۔ ۔ ۔ دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ "اللہ کا دیا گھر میں بہت کچھ ہے صرف نوکروں پر نگرانی کر لینا۔ گھر تمہارا ہے۔ ہاں میں نے تم سے کہا نہیں ہریالی کی شادی کے لیے میں نے بنک میں ایک ہزار روپیہ رکھوایا تھا۔ تم جب چاہو اسے لے سکتے ہو۔ جی چاہے تو اسے خیر خیرات کر دینا"۔

مبارک کی آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگ گئی۔ ایک اور بار اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر نظریں نیچی کیں اور بہت ہی دھیمی آواز میں کہا "اب سب کچھ آپ ہی ہیں چھوٹے سرکار"

گاڑی گھر پہنچی تو نوکر چاکر دوڑے دوڑے آئے۔ چند تو پہلے ہی سے منتظر تھے۔ چھوٹے سرکار کا سامان اترنے لگا۔

"اسے تم اپنی حفاظت میں رکھو مبارک، یہ پھول صبح ماں جی کی قبر پر چڑھانے ہیں۔ انھیں بھگوئے رکھنا"۔

چھوٹے سرکار نے کیلوں کے پتوں سے ڈھکی ہوئی ٹوکری مبارک کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا اور مکان میں داخل ہو گئے۔

رات دیر گئے تک چھوٹے سرکار سے ملنے گاؤں کے چھوٹے بڑے لوگ آتے رہے۔ چاچا جی آئے تو دوسرے دن منائی جانے والی ۔ ۔ ۔ ماں جی کی برسی کی تفصیل انھوں نے اپنے بھتیجے کو سنائی۔

"صبح سویرے فاتحہ کے لیے سب کو قبرستان چلنا ہے" یہ کہہ کر چاچا جی رخصت ہوئے۔

صبح سویرے مبارک نے اٹھتے ہی جلدی جلدی نہا کر کپڑے بدلے اور چھوٹے سرکار کی پیشی میں حاضر ہوا۔

چھوٹے سرکار کو جگایا گیا تو انھوں نے چاچاجی کو اطلاع کرنے کے لیے کہا اور خود غسل خانے کا رخ کیا۔
سورج نکلنے سے پہلے ہی چاچاجی اور رشتے ناتے کے چھوٹے بڑے سب ہی حاضر ہو گئے۔
"چاچاجی مبارک سے کہیے کہ ٹوکری سے پھولوں کو نکال کر ایک کشتی میں رکھے اور ایک دوسری کشتی کو شیرینی سے بھر دے۔"
چھوٹے سرکار نے اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھوتے ہوئے کہا۔
مبارک نے ٹوکری کھولی تو اس میں سے پھولوں کی دو چادریں نکلیں۔ دونوں چادروں کو کشتی میں رکھ کر مبارک نے تیزی سے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ملایا پھر انھیں کشکول کی شکل دی۔
"چھوٹے سرکار . . . . . آپ کا اقبال بلند ہو۔"
پھر مبارک کے کام میں پہلے سے زیادہ پھرتی آ گئی۔
دونوں کشتیوں کو اپنے دونوں کاندھوں پر رکھے مبارک حاضر ہوا تو سب قبرستان کی طرف چل پڑے۔ چھوٹے سرکار اور چاچاجی شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ کیا بچے، کیا بڑے، سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی دبی دبی آواز میں کچھ کہتا۔ کتنوں ہی کو اپنے مرے ہوئے عزیزوں کی قبریں یاد آ رہی تھیں۔ کسی نے سبزے کے پتے اور کسی نے سدابہار کے پھول پہلے ہی سے اپنے ساتھ کر لیے تھے۔
جوں جوں قبرستان قریب ہوتا گیا مبارک کے دل کی دھڑکن بڑھتی گئی اس کی آنکھوں کے سامنے صرف ایک ہی منظر تھا۔ دو قبریں سفید سفید موتیا کی چادروں سے ڈھکی ہوئی ہوتیں اور سارا قبرستان ان کی خوشبو سے مہک رہا ہوتا ـــ غم اور مسرت کی ملی جلی ایک لہر مبارک کے سارے جسم کو کپکپا دیتی۔
چھوٹا سا یہ قافلہ قبرستان پہنچ گیا تو لوگوں نے ماں جی کی قبر کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مبارک نے جلدی سے کشتی کو چھوٹے سرکار کے سامنے رکھ دیا۔ بزرگوں نے پھولوں کی چادر کو پھیلایا اور دیکھتے ہی دیکھتے چادر کوئی تین فٹ بلندی پر قبر کے متوازی ہو گئی ـــ بچوں اور بڑوں سب کے ہاتھ چادر کی طرف بڑھ گئے ـــ اور آن کی آن میں چادر قبر پر بچھ گئی۔ ماں جی کی قبر براق جیسے پھولوں سے ڈھک گئی تو مبارک کے دل کی دھڑکن اور بھی تیز ہو گئی۔
آج اس کی ہریالی دلہن بنے گی۔
چادر چڑھ گئی تو چاچاجی نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سینے تک اٹھا کر "فاتحہ" کہا۔ سب نے تقلید کی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں سب ہاتھ زمین کی طرف آ رہے۔
بچوں کے منہ ادھر ادھر ہو گئے لیکن بزرگوں نے چھوٹے سرکار کی طرف دیکھا کہ اب کدھر کو بڑھیں۔ مبارک نے پھر سے کشتی کو ڈھانک دیا تھا۔ پھر ایک بار وہ چھوٹے سرکار کے سامنے ہو گیا۔
"مبارک یہ چادر بڑے سرکار کی قبر پر چڑھانی ہے۔"

بزرگوں نے بڑے سرکار کی قبر کا تعین کیا اور بچے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

مبارک کے قدم لڑکھڑائے تو ایک بزرگ نے سہارا دیا۔

"کیا وفاداری ہے جناب کی، بڑے سرکار کی یاد تو برسوں کے بعد بھی اسے تڑپا دیتی ہے۔" کسی نے چاپلوسی کی۔

بڑے سرکار کی قبر کے اطراف حلقہ بن گیا تھا۔ چھوٹے سرکار اور چاچا جی کے لیے جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔

ایک اور بزرگ نے خوان اٹھایا اور کشتی سے چادر نکالی۔

آگے بڑھتے بڑھتے چاچا جی نے پانچ چھ فٹ لمبے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا اور چھوٹے سرکار سے کہا۔

"یہی ہے مہربانی کی قبر"

چھوٹے سرکار نے دونوں پاؤں زمین میں گاڑ لیے، پھر بھی ان کے پاؤں زمین میں گڑتے گئے، گڑتے ہی گئے۔

کھڑے کھڑے انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا جیسے کہنا چاہتے ہوں "لوگو! ادھر آؤ"

چادر کو چاروں طرف سے پھیلایا جا چکا تھا۔ چاچا جی حلقے میں شامل ہو چکے تھے۔ ان کے دونوں ہاتھ چادر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ براق جیسے ... سفید سفید پھولوں کی چادر آن کی آن میں کوئی تین فٹ بلندی پر بڑے سرکار کی قبر کے متوازی ہو گئی۔ چھوٹے سرکار نے پلک جھپکی تو وہ صرف دو فٹ بلندی پر تھی۔

چھن سے چھوٹے سرکار کے پاؤں کی زنجیر ٹوٹی۔ زمین میں دھنسے پیر اپنے آپ باہر نکل آئے۔ پلک جھپکنے سے پہلے ان کے ہاتھ چادر تک پہنچ چکے تھے۔

گھاس اور خاردار پودوں سے اگی ہوئی زمین کا یہ حصہ چادر سے ڈھک گیا تو چھوٹے سرکار نے محسوس کیا کہ ان کی اپنی لاش کو کسی گیلے کفن میں لپیٹا جا رہا ہے۔

"فاتحہ" چاچا جی نے کہا۔ اور پھر ایک بار سب نے اپنے ہاتھوں کو اپنے اپنے سینوں تک اٹھایا لیکن چھوٹے سرکار کے ہاتھ نہ اٹھ سکے۔ وہ تو اپنے ہاتھوں سمیت کسی سرد سرد کفن سے لپٹے جا رہے تھے۔

رقیہ شہناز

دل کی کلیاں

سیما جب پہلے پہل سینی ٹوریم میں آئی تو اس کا دل کچھ بوجھل سا تھا۔ لیکن پھر ماحول کا حسن اس کی اداسیوں پر غالب آتا گیا۔ پہاڑی علاقے میں واقع اس سینی ٹوریم کی عمارت بہت بلندی پر تھی۔ ہر طرف پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے، اور نیچے وادی میں حسن کی دنیا سی بکھری ہوئی تھی ـــــ رات کے خاموش لمحات میں جب دنیا نیند کے سنسار میں گم ہوتی وہ بستر پر لیٹی اس انجانے سحر میں گم ہو جاتی جو چاند کی شیتل کرنیں جگاتی ہوتیں یہاں تک کہ اس کے وارڈ کے قریب کھلنے والی بیلے کی کلیاں بھی اس سحر کے اثر جھومتی ہوتیں ـــــ وہ سوچتی دنیا کتنی حسین ہے لیکن پھر اچانک کسی مریض کی کھانسی کی آواز کسی کے کراہنے کی صدا اس طلسم کو توڑ کر رکھ دیتی اور اپنی محرومی کا احساس اس کے دل و دماغ کو پاگل بنا دیتا۔ حیات و موت کی اس کشمکش سے وہ عاجز آ گئی تھی لیکن تمنائے حیات کے ولولے ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔ اسے تو یاد بھی نہ تھا کہ یہ روگ کب سے اس کے وجود کو کھوکھلا کر رہا تھا۔ چھوٹی سی تھی تو ہمیشہ صحت خراب رہتی۔ کہیں ٹھنڈ میں باہر نہیں نکل سکتی کسی کھیل میں حصہ نہیں لے سکتی۔ ذرا بڑی ہوئی تو اور بھی کمزور ہوتی گئی۔ اسکول سے واپس آتی تو جسم بخار سے جلتا ہوتا نتیجتاً اسکول بھی چھڑوا دیا گیا۔ شاید یہی وہ دور تھا جب ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ ٹی بی میں مبتلا ہو چکی ہے گو کہ یہ چیز اس سے چھپائی گئی تھی ـــــ آہستہ آہستہ اس نے اپنے لیے دلچسپی کا سامان پیدا کر لیا اور یہ تھی اس کے ابا کی لائبریری وہ سارا دن پڑھتی رہتی۔ مطالعہ کے اس شوق نے اس کے دل سے ان تمام چیزوں کی یاد بھلا دی جن کی وہ کمی محسوس کرتی آئی تھی۔ اس کا جسم کمزور ہوتا گیا لیکن ذہن ترقی کرتا گیا۔ مطالعے کی وسعت نے اس کی نظر میں گہرائی اور شعور میں پختگی پیدا کر دی تھی وہ زندگی کی اصل حقیقت اور اس کی قدر و قیمت سے واقف ہو چکی تھی اور یہی چیز تھی جس نے اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت یا دوسرے معنوں میں زندگی سے محبت پیدا کر دی تھی۔ دنیا میں پھیلے ہوئے حسن کو جب وہ دیکھتی تو قدرت کے جانے کتنے اسرار اس کے سامنے آشکارا ہو جاتے۔ زندگی کی چاہ اور حسن کے احساس نے آپس میں محبت کے ایک تصور کو جنم دیا تھا ایک تصور جو اسے انجانی مسرتیں بخشتا وہ اس محبت کی جستجو میں گم ہو جاتی۔ بچپن سے لے کر اب تک ہر کوئی اس پر ترس کھاتا، اس سے رحم جتاتا آیا تھا لیکن کسی نے بھی اسے وہ محبت نہیں دی تھی جس کی وہ متلاشی تھی

زندگی اور موت سے برسرپیکار رہتے اس نے اپنی زندگی کے کتنے سال گزار دیئے۔

اب ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اسے سینی ٹوریم میں شریک کرا دیا گیا تھا لیکن وہ محسوس کر رہی تھی کہ سینی ٹوریم میں شریک ہونے کے بعد اس کے ذہن کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہاں کا صحت بخش ماحول تھا اور کچھ میڈیکل اسٹاف کا پرخلوص برتاؤ۔ خاص کر ڈاکٹر سہیل کے طمانیت بخش جملے اس میں نئی طاقت پیدا کر دیتے اور وہ کچھ دیر کے لیے اپنی بیماری بھول جاتی۔ ڈاکٹر سہیل کی شخصیت یوں بھی پورے ہسپتال پر چھائی ہوئی تھی۔ ان کا پرخلوص برتاؤ ہر مریض کے لیے اکسیر کا اثر رکھتا تھا۔ سیما ان سے بہت زیادہ متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ ان کا انداز گفتگو، ان کی ہدایتیں سب ہی زندگی بخش تھے اور سیما کے لیے بہت ہی انوکھی باتیں ـــ سیما کا جی چاہتا ڈاکٹر اس سے باتیں کرتے ہی رہیں۔ لیکن وہ تو اپنے مخصوص وقت پر آتے اور ہر مریض سے کچھ باتیں پوچھ کر کچھ ہدایتیں دے کر چلے جاتے۔ ـــ پھر وہ محسوس کرنے لگی کہ ڈاکٹر سہیل بھی عام لوگوں سے کچھ زیادہ جدا نہیں تھے۔ وہ ایک دق زدہ کمزور مریض کو دلاسا دیتے تھے۔ ان کی نظروں میں اس کی شخصیت کی کوئی اہمیت نہ تھی ان کے برتاؤ میں بھی وہی رحم اور ہمدردی چھپی ہوئی تھی جس سے وہ ساری زندگی متنفر رہی۔ رحم اور ہمدردی کا وہ جذبہ جسے وہ حقارت کی ایک شائستہ شکل سمجھتی آئی تھی لیکن پھر بھی وہ ڈاکٹر کو عام لوگوں میں شمار کرنا نہیں چاہتی تھی۔

رات بھر تیز زبردست بارش ہوتی رہی۔ صبح بارش تو کم ہو گئی لیکن فضا میں غیر معمولی خنکی ابھی ہوئی تھی سیما اپنے بستر پر بیٹھی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں بیلے کی کلیاں مسکرا رہی تھیں اور دور برف پوش وادیوں میں بادلوں کے ٹکڑے تیرتے پھر رہے تھے وہ اس منظر میں گم تھی کہ کسی آہٹ پر چونک پڑی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈاکٹر سہیل تھے چہرے پر وہی مخصوص مسکراہٹ تھی۔ وہ پوچھ رہے تھے۔

"سیما تمہیں سردی نہیں لگ رہی ہے کیا۔ نہ تو تم نے شال اوڑھی ہے نہ گلے میں مفلر لپیٹا ہے۔"

"کیا سردی بہت ہے" سیما نے پوچھا۔

"رات بھر اتنی بارش ہوئی۔ یہ وہ بھی پہاڑی مقامات کی بارش ہوائیں تو جیسے برف بستہ ہو رہی ہیں اور تمہیں سردی کا احساس نہیں ہو رہا ہے" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"عجیب سی بات ہے ماحول کی اس خنکی اور بارش کی اس زیادتی کے باوجود بھی یہاں اتنے انگارے [illegible]"

ڈاکٹر نے ایک لمحے کے لیے حیرت سے سیما کی طرف دیکھا پھر ہنس کر کہا "او ہو تم تو فلسفی ہوتی جا رہی ہو تم جیسی بچیوں کو ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں۔"

سیما کے احساسات میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اپنی محرومی کا احساس جیسے سارے کا سارا سمٹ کر اس کی آنکھوں میں [illegible] اسے ایک کمزور اور بے بضاعت بچی سمجھتے ہیں۔ وہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ وہ انھیں کیسے بتا سکتی تھی کہ اس کا

ذہن اس کی عمر سے بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اس کا جسم دق زدہ ہے، دماغ نہیں۔ وہ صرف رحم کی محتاج نہیں ہیں۔ لیکن یہ ڈاکٹر بڑی کیا مختصر سوچتا ہے ایک ایسے صفر رحم کا محتاج سمجھتا تھا۔ کسی نے آج تک اس کی حسرت زدہ ہنسی کا راز نہیں پڑھا یا تھا۔ کسی نے اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کی بپتا نہ سنی۔ وہ باتیں نہ کی تھیں۔ کسی کو بھی احساس نہ تھا کہ اس کا شعور ان لوگوں سے کہیں پختہ ہے جو اپنے صحت مند لیکن کھوکھلے دماغوں کے ساتھ محفل کی جان بنے ہوئے ہیں۔ پھر وہ سوچتی وہ تو سدا سے ان اذیتوں کو برداشت کرتی آئی ہے مگر، ڈاکٹر سہیل ہی سے کیوں متمنی ہے کہ وہ اس محرومیوں کی بے رنگ راتوں میں کچھ رنگ آمیزی کر سکیں گے۔ وہ اپنے دل کو اسی طرح سمجھاتی لیکن ان دنوں جانے کیوں اس کی آنکھیں بےبسی کی راتیں زندگی کی تنہائیوں پہ ساری زندگی وہ نہیں روتی تھی لیکن اب تو ایسا لگتا جیسے آنسو آپ ہی آپ اس کی آنکھوں سے بہتے جا رہے ہیں۔ رات کی ڈیوٹی کی نرس ملائکہ سے بہت لگاؤ تھا وہ اکثر سیما کو تسلیاں دیتی رہتی۔

پھر ایک دن ڈاکٹر سہیل نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

"سیما تم سے ایک بات پوچھوں"

"ضرور پوچھیے"

"شاید آج کل تم کچھ پریشان رہتی ہو۔ کوئی خاص بات ہے کیا"

"نہیں تو نہیں بالکل پریشان نہیں رہتی" اس نے انکار کیا۔

"تو کیا یہ غلط ہے کہ تم چھپکے چھپکے آنسو بہایا کرتی ہو"

"نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب ایسی کوئی بات نہیں" سیما نے ہونٹوں پر جھوٹی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ملائکہ نے مجھ سے جھوٹ کہا" ڈاکٹر کی نگاہیں جواب طلب کر رہی تھیں۔

جھوٹی مسکراہٹ کے پیچھے چھپے ہوئے آنسو آپ ہی آپ اس کی آنکھوں سے ابل پڑے

"کیا تکلیف ہے تمہیں سیما" ڈاکٹر کے لہجے میں بے انتہا ہمدردی سمٹ آئی تھی۔

"تکلیف تو کچھ بھی نہیں ہے رونے کا تو مجھے عارضہ ہو گیا ہے۔ یقین جانیے اس کا تعلق میری مرض سے کچھ نہیں ہے۔ میں زندگی بھر کبھی نہیں روتی تھی لیکن اب محسوس کرتی ہوں جیسے آنسو بہا کر دل ہلکا سا ہو جاتا ہے۔ بیلے کی ان کلیوں کو دیکھیے دن بھر مجھے روتے دیکھ کر مسکراتی رہتی ہیں لیکن شام کے قریب جانے کیوں خود بخود مرجھا جاتی ہیں"

کچھ دیر دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے پھر سیما ہی نے پوچھا "ڈاکٹر صاحب آپ لوگ مریض کی ظاہری علامتوں کو ہی دیکھتے ہیں اور ان کا علاج کرتے ہیں لیکن کبھی آپ لوگوں نے مریض کے دل کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آپ لوگوں نے ہمیشہ مریض کو مریض ہی کے روپ میں دیکھا ہے کبھی اسے صرف انسان سمجھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے"

"نہیں سیما تمہارا یہ خیال غلط ہے ایک کامیاب ڈاکٹر وہی ہوتا ہے جو انسان کی نفسیات سے واقف ہو اور اس لئے وہ کبھی مریض کی دل شکنی نہیں کر سکتا"

"اور یہی مقام ہے جہاں لوگ غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ اچھا بتایئے ایک مریض کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی ہے؟"
"یہی کہ وہ جلد از جلد صحت مند ہو جائے۔"
"یعنی بالکل ان لوگوں کی طرح جو صحت مند ہیں جو زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں کیا کبھی ایسے لوگوں پر ترس کھایا جاتا ہے کیا کبھی ان کی جا و بیجا دلجوئی کی جاتی ہے محض اس لیے کہ وہ رحم کے قابل ہیں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کیا جاتا ہے ان پر ترس نہیں کھایا جاتا اس لیے کہ انھیں اپنے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اگر لوگ مریض کے دل کو سمجھتے، نفسیاتی نکتوں سے واقف ہوتے تو وہ مریض کے دل سے یہ خیال گم کرنے کی کوشش کرتے کہ وہ مریض ہے اس پر غلط قسم سے رحم کھا کر اس احساس کو گہرا نہ کرتے کہ وہ عام انسانوں سے جدا ہے۔"
ڈاکٹر سہیل اس کی باتیں غور سے سن رہے تھے آج وہ انھیں ایک خاموش اور کم سخن لڑکی نہیں نظر آ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اس کمزور جسم کے ساتھ ایک صحت مند ذہن منسلک ہے۔
اس دن کے بعد سے ڈاکٹر کے رویہ میں کچھ فرق سا آ گیا تھا جب بھی وہ سیما سے باتیں کرتے ان کا انداز دوستانہ ہوتا۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ سیما کو قابلِ رحم بننا پسند نہ تھا یہ اس کی اپنی خودداری پہ اپنا معیار تھا یہ تبدیلی سیما کے لیے بہت طمانیت بخش تھی۔ زندہ رہنے کی امنگ پوری قوت سے اس میں جاگ اٹھی تھی۔ اس کی صحت میں نمایاں تبدیلی ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر سہیل اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے اس سے مشورے طلب کرتے۔
ایک دن انھوں نے اس سے پوچھا۔
"سیما میں تم سے ایک دوستانہ مشورہ لینا چاہتا ہوں۔
"بتایئے کیا بات ہے" سیما نے اشتیاق سے پوچھا۔
"اگر کوئی کسی چیز کو ساری عمر تلاش کرتا رہے اور وہ اچانک اسے نظر آجائے تو اسے کیا کرنا چاہیئے ــ؟"
"میں تو سمجھتی ہوں اسے کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہیئے۔"
"اگر پانا مشکل ہو تو ـــ"
"اگر جذبہ صادق ہے اور عشق کامل تو پھر مشکل کا سوال ہی نہیں ہوتا۔"
اس دن سیما کے احساسات میں ہلچل سی مچی رہی۔ وہ ڈاکٹر کی باتوں کے بارے میں سوچتی گئی۔ کبھی ایسا لگتا جیسے وہ اس راز کو پا گئی، اور کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ ہسپتال میں یہ خبر مشہور ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر سہیل کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر جا رہے ہیں۔ اپنی روانگی سے ایک دن قبل انھوں نے سیما سے کہا تھا کہ وہ واپسی پر اسے ایسی خبر سنائیں گے کہ وہ حیران رہ جائے گی ـــ ڈاکٹر سہیل چلے گئے تھے لیکن سیما اس دن کی شدت سے منتظر تھی جب وہ اسے ایک چونکا دینے والی خبر سنانے والے تھے زندگی ایک حسین انتظار بن گئی تھی ـــ

بارش کی بوندیں آسماں کی بلندیوں سے پھسل پھسل کر نیچے ڈھلکتی آرہی تھیں۔ لیکن فضا کچھ بوجھل سی تھی جیسے ابھی کھل کر برسنا باقی ہے۔ سیما اپنے بستر پر لیٹی بیلے کے شگوفوں کو دیکھ رہی تھی جو کچھ اداس اداس نظر آرہے تھے وہ نیلا کے قدموں کی آہٹ پر چونک پڑی وہ بہت مسرور نظر آرہی تھی۔

"سیما تم نے سنا ڈاکٹر سہیل کی شادی ہونے والی ہے"

"کیا" ؟ سیما چونک پڑی۔

"ہاں سبھی حیرت زدہ ہیں وہ اچانک اسی لیے چلے گئے۔ چلو اچھا ہوا انھیں اپنی پسند کی لڑکی مل گئی۔ یہ رہے ہم سب کے دعوت نامے" نیلا نے چند رقعے اس کے سامنے ٹیبل پر پھیلا دیے۔

نیلا جانے کیا کیا کہتی رہی سیما کے لیے اتنا سننا ہی کافی تھا اسے اب لگا جیسے وہ بلندیوں پر چڑھتی جا رہی تھی کہ ایک ٹھوکر نے اسے فضاؤں میں معلق کر دیا۔ وہ سوچتی رہی تو یہ تھی "ڈاکٹر صاحب کی عمر بھر کی تلاش اور یہ تھی ان کی... چونکا دینے والی خبر ــــ اسے اپنی خام خیالیوں اور اپنی سوچ کی اڑان پر کچھ غصہ اور کچھ ترس آیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ انسان اتنا خود فریب کیوں ہوتا ہے۔ کیوں وہ ہر دم حقیقت سے کنارہ کشی کرنا چاہتا ہے اپنی حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے بھی وہ کیوں خوش فہمیوں میں مبتلا رہی۔

اس رات بڑی طوفانی بارش ہوتی رہی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس طوفان کی زد سے کچھ باقی نہ بچ سکے گا سیما کی حالت اچانک خراب ہوگئی تھی۔ تمام ڈاکٹر اور نرسیں اس کے وارڈ میں جمع ہوگئے تھے۔ موت و حیات کی پرانی کشمکش پوری شدت سے جاری تھی۔ لیکن اس بار حیات تھک سی گئی تھی اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔ جیسے اس میں اب طاقت نہ رہی ہو، اور پھر صبح کے اولین اوقات میں حیات نے ہار مان لی۔ بارش تھم چکی تھی رات بھر بارش میں بھیگی ہوئی کلیاں اپنے کسی ہمدم کو نہ پاکر اداس اداس، آنسو بہا رہی تھیں۔ جیسے وہ آج صبح ہی سے مرجھا جانا چاہتی ہوں ــــ !!

یوسف ناظم

بور ہو کر

آدمی اب بہت بیزار ہو گیا ہے، زندگی نہیں بلکہ زندگی کی یکسانیت سے۔ دنیا کی قدامت سے نظامِ شمسی کے بے ڈھنگے پن سے اور قدرت کی روایتی بے ضابطگی سے۔ زندگی میں سچ کہئے تو کوئی تحرّل ہونی چاہئے۔ وہ سنسنی جو روح کو گرما دے اور قلب کو تڑپا دے، زندگی کے اس صدیوں کے پُرانے ڈھانچے سے غائب ہو چکی ہے۔ آدمی یوں تو بچارا بہت ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اپنی بساط بھر کوشش کرتا ہے کہ زندگی کو کوئی نئی چیز ملے۔ وہ طرح طرح کی ایجادیں کرتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں بھی ڈرامائی تبدیلیاں لاتا ہے۔ پُرانے سکوں سے اکتا جاتا ہے تو نئے پیسے ڈھالتا ہے، نئے پیمانے بناتا ہے، اچکن اور شلوار سے جی بھر جاتا ہے تو لباس کا فیشن بدل دیتا ہے، شیروانی ٹوپی اتار کر رکھ دیتا ہے اور صفر لٹکتے ہوئے ازاربند والا پاجامہ اور کھلے گلے کی ڈھیلی ڈھالی قمیص پہن کر دفتر جاتا ہے۔ مرقع چغتائی کو طاق میں رکھ کر ماڈرن آرٹ شروع کرتا ہے تو کبھی علامتی شاعری سے جی بہلاتا ہے۔ غرض کہ آدمی ہونے کے ناطے وہ ہر جگہ نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن آدمی بچارا جو آدمی ہی ہے اور اس پر مختاری کی صفر تہمت ہے جو میر تقی میر کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ کاش اسے مختاری کی تہمد یا دستار نصیب ہوتی تو دنیا دیکھتی کہ نظامِ قدرت میں بھی ہر دس پندرہ سال بعد ایک نئی تبدیلی یوں آتی ہے جیسے پرانے لیڈر کی جگہ نیا لیڈر آ جایا کرتا ہے۔ نظامِ قدرت میں اگر اسے ذرا بھی دخل ہوتا تو دنیا اتنی سنٹرلنگ اور سنسنی خیز ہوتی کہ آدمی ہمیشہ بال ڈانس کے موڈ میں رہتا۔

اب بھی ہماری یہ رائے ہے کہ نظامِ قدرت کے ایسے مسائل جن کا راست تعلق اہلِ زمین سے ہے، اہلِ زمین ہی کی رائے سے طے پانے چاہئیں۔ ہاں وہ باتیں جن کا تعلق ستاروں کے چمکنے یا بجھنے اور سیاروں کی گردش وغیرہ سے ہے، بالکلیہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق حسبِ عملدرآمد، آئندہ بھی جاری رکھی جا سکتی ہیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے تو قیامت تک مشرق سے نکلتا رہے، یا جب بھی اللہ تعالیٰ چاہے مغرب کی طرف سے نکلنا شروع ہو جائے، آدمیوں کا اس سے کچھ بگڑتا نہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ موسم اور جاریہ ہوائیں جو روزِ اول سے رائج ہیں، ان کے جاری اور برقرار رہنے میں ہمیں کوئی عذر نہیں۔ شفق آگے بھی سرخ رنگ کی ہو سکتی ہے اور بادل اودے ہو سکتے ہیں۔ ان سے ہمیں کیا لینا ہے۔ ایسی اور سینکڑوں باتیں ہیں جن میں ہم خواہ مخواہ دخل دے کر بدمزگی نہیں پیدا کرنا چاہئے لیکن ان کے علاوہ چند

ایسی اہم باتیں ہیں جن کا تعلق انسان کی زندگی اور اس کی مہذب سوسائٹی سے ہے، اور ہم سمجھتے ہیں یہ ہر لحاظ سے قرین انصاف ہوگا اگر ان باتوں میں ہم انسانوں کی رائے لی جائے۔ دنیا کی بہبودی اب زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ہمارا خیال ہے کہ دنیا میں اب اس سے زیادہ تباہ ہونے کی سکت بھی نہیں ہوگی۔ اس زمین پر چند ایسے سقراط ابھی ہیں جو انسانوں کی نبض کے علاوہ دنیا کی نبض بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ دنیا کی نبض اب ذرا تکلیف سے چلتی ہے اس لیے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ قدرت انسانوں کے خانگی اور نجی امور میں ان سے مشورہ کرے۔ مثال کے طور پر آبادی کا مسئلہ ہے۔ دنیا کی آبادی نہایت بے تکے پن سے پھیلی ہوئی ہے کہیں تو آبادی کی وہ بھرمار ہے کہ آدمی اگر جیب میں چاقو نہ رکھے تو جینا مشکل ہو جائے، اور کہیں یہ حال ہے کہ آبادی معشوق کی کمر بن کر غائب ہے۔ یہ غم بھی ہم سہہ لیتے لیکن ستم تو یہ ہے کہ کہیں مردوں کی تعداد زیادہ ہے تو کہیں عورتوں کی بہتات ہے۔ کم عورتیں اور زیادہ مرد، بھی اتنے ہی خطرناک ہیں جتنی کہ بکثرت عورتیں اور کھانے میں نمک کی طرح مرد۔ اب ان کا اوسط اور ان کا فی صد نکالتے بیٹھے رہیے نتیجہ سوائے تشویش کے کچھ نہیں اسی لیے تو آدمی صنف تبدیل کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ آدمی سے یوں شرافت وغیرہ کی بہت کم توقع کی جا سکتی ہے لیکن پھر بھی اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر مردوں اور عورتوں کا تناسب برابر ہو جائے تو آدمی شاید جامہ کے اندر رہے اور اگر آدمی جامہ کے اندر رہ سکا تو دنیا میں سیکس کی حد تک تو ضرور امن قائم ہو جائے گا۔ اس بات کو ہم ذرا تفصیل سے بیان کرنا پسند کریں گے۔

دنیا کی آبادی میں مردوں اور عورتوں کے مساوی تناسب پیدا کرنے کے لیے ایک پلان بنانا چاہیے اور نظام قدرت میں اہم اور بنیادی تبدیلیاں لائی جانی چاہئیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ اگر آدمی کی پیدائش کے تعلق سے قدرت اپنے اولین طریق کار کی طرف لوٹ جائے تو کیا حرج ہے یعنی آئندہ عورت صرف مرد کی پسلی سے پیدا ہوا کرے اس منصوبہ پر عمل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ فی الحال یا کسی مناسب موقعہ پر عورتوں کی پیدائش کا سلسلہ یک لخت موقوف ہو جائے، اور اس کے بعد مرد کی بائیں پسلی کو از سر نو وہ صلاحیت عطا کی جائے جو آدم کی بائیں پسلی میں تھی۔ اس طریقہ کار سے زندگی کے دو اہم مسئلے حل ہو سکیں گے۔ ایک تو مساوی تعداد کا اور دوسرا ازدواج کا۔ اس تجویز کی مزید تفصیل یہ ہے کہ ہر مرد جب شادی کی عمر کو پہنچ جائے اور اپنے قدموں پر کھڑا ہو جائے تو اس کی اپنی پسلی سے اس کی رفیق حیات پیدا ہو۔ آپ نے سنا ہوگا کہ بچوں کو پسلی چلنے کی بیماری ہوا کرتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ ایسی پسلی ہوگی جس سے عورت کی پیدائش عمل میں آ سکتی ہے چونکہ ڈاکٹر اس پسلی کو پھڑکتے رہنے سے روک دیتے ہیں یہ پسلی عورت کو پیدا کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔ طب کے اس اہم مسئلہ کو فی الحال یہیں چھوڑ دیجیے اور اس بات پر غور فرمائیے کہ جب قدرت کی طرف سے مرد کی پسلی سے عورت پیدا ہوگی تو دنیا میں منگنی شادی اور جہیز کے جھگڑے نہ ہوں گے۔ آپ سے کوئی ناراض نہ ہوگا کہ آپ نے اپنے بھانجے کی شادی اس کی بھتیجی سے کیوں نہیں کی۔ سمدھنوں کی اعصابی جنگیں نہ ہوں گی، بھاوج اور نندوں کی مہابھارت نہ ہوگی۔ سسرال اور میکے مغربی اور مشرقی جرمنی نہیں بنیں گے۔ کیوں کہ ان سب کا تصور ہی نہ ہوگا۔ عورت شروع ہی سے اپنے گھر میں

پیدا ہوگی۔ وہ نہ میکہ میں پیدا ہوگی اور نہ سسرال جائے گی۔ خاوند کا گھر اس کا اپنا گھر ہوگا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بچیوں اور لڑکیوں کی بجائے صرف مکمل عورتیں پیدا ہونی شروع ہو جائیں تو وہ پڑھیں کب؟ اور گھر گرہستی کیوں کر سیکھیں گی۔ پولنگ بوتھ پر جا کر ووٹ کیسے دیں گی اور پڑوسن سے کس طرح لڑیں گی۔ ان باتوں کا حل بھی مشکل نہیں۔ کھانا پکانے کے فن سے وہ ناواقف رہیں تو نقصان کیا ہے۔ کیوں کہ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ دنیا کے اعلیٰ ترین ہوٹل میں کوئی باورچن کھانا پکاتی ہے بلکہ کسی معمولی ہوٹل میں بھی شاید ہی کسی عورت کو کھانا پکانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہو کیونکہ یہ مسلمہ بات ہے کہ عورتوں کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا صرف خاوند اور بچے برداشت کر سکتے ہیں۔ اس لیے عورتوں کا کھانا پکانا سیکھنا یا نہ سیکھنا زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ عمدہ ترین کھانے صرف مرد پکا سکتے ہیں۔ رہا پڑھنے لکھنے کا سوال تو اس کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ قدرت مرد کی پسلی سے پڑھی لکھی عورتوں کی پیدائش کا انتظام کرے۔ یہ قدرت کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ لڑنے کا فن البتہ عورتوں کو خود سیکھنا ہوگا۔ تاہم یہ بات اسی وقت صاف ہونی چاہیے کہ عورت اس طرح کی پیدا ہوگی جیسی کہ عام عورت ہوا کرتی ہے۔ مرد کی پسلی سے پیدا ہو کر نہ تو وہ تتلائے گی نہ گھٹنوں کے بل چلے گی۔ وہ اپرنٹس بن کر دنیا میں نہیں آئے گی۔

ہمیں یقین ہے کہ پیدائش کے طریقہ میں مجوزہ تبدیلی سوسائٹی کے حق میں فال نیک ثابت ہوگی۔ والدین بیٹوں کی بیویاں تلاش کرنے میں حیران و سرگرداں نہیں پھریں گی۔ بیوی کے اچھے برے ہونے کا الزام کسی کے سر نہ ہوگا جو بھی بیوی ملے گی قدرت کی طرف سے ملے گی۔ انتخاب کا سوال ہی کہاں پیدا ہوگا، اور سب سے بڑی بات یہ ہوگی کہ ہر عورت سہاگن پیدا ہوگی۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس طریقہ کار کی وجہ سے کئی مسائل ایسے ضرور پیدا ہوں گے جن سے آدمی کو نمٹنا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ ممکن ہے کہ ایک مرد اپنی خودسری کے باعث ازدواجی زندگی گزارنا ہی نہ چاہتا ہو تو ایسی صورت میں اس کی رفیقِ حیات کا کیا بنے گا۔ یہ بات ہو سکتی ہے یا معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ ایسی باتوں کی روک تھام کے لیے سوسائٹی خود قانون بنا لے گی یا قدرت چاہے تو کسی نااہل مرد کی پسلی ہی کو بیکار کر دے تاکہ اس کی بیوی پیدا نہ ہو سکے۔ ایسے مرد سوسائٹی میں نکو بن کر پھرا کریں گے اور ہاؤزنگ بورڈ کے مکانوں میں انھیں پناہ نہ ملے گی۔ وہ کسی محکمے کے ممبر نہ بن سکیں گے اور صرف کافی ہاؤز میں بیٹھ کر سیاست پر گفتگو کرنے پر مجاز ہوں گے۔ پولس کے رجسٹر میں ان کا نام درج ہوگا اور اکثر انھیں تھانہ پر طلب کیا جاتا رہے گا۔ اس طریق کار کا ایک اور فائدہ جو ابھی ہماری سمجھ میں آ رہا ہے یہ ہوگا کہ کثرت ازدواج کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو جائے گا نہ کسی کے مذہبی حقوق میں دخل اندازی ہوگی نہ کسی کی دل شکنی۔ دنیا میں مقررہ تعداد سے زیادہ عورتیں ہی نہ ہوں گی تو پھر جھگڑا ہی کیا رہا۔

ہماری تجویز میں ایک قباحت ضرور ہے کہ دنیا میں صرف لڑکے ہی لڑکے نظر آئیں گے لڑکیاں سرے سے غائب ہو جائیں گی۔ گرلس اسکول بند ہو جائیں گے اور کاسمیٹکس کی تجارت کو نقصان پہنچے گا لیکن یہ ایسی معمولی باتوں [illegible] کے

بارے میں زیادہ سوچنا عبث ہے۔ بڑے فائدے کے لیے چھوٹے چھوٹے نقصانات برداشت کرنا ہماری شان ہے۔ عورت جب صرف بیوی بن کر پیدا ہوگی تو بڑے کام کی چیز ہوگی نا تو ہاکی کھیلے گی نہ سوئمنگ کرے گی۔ ہمارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ عورت کے بیوی بن کر پیدا ہونے کی وجہ سے فلم انڈسٹری کی بہت سی برائیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ کیوں کہ جو بھی ہیروئین دستیاب ہوگی کسی نہ کسی کی رفیق حیات ہوگی۔

انسان جتنا بے درد ہوتا ہے اتنا ہی رقیق القلب بھی ہوتا ہے ممکن ہے بعض ذرا ذرا سی بات پر رو پڑنے والے حضرات یہ سوال کریں کہ وہ عورت جو باپ کی ڈانٹ اور ماں کی مار سے محروم ہوگی سوسائٹی کے لیے کیوں کر مفید ثابت ہوگی ان حضرات کو یہ معلوم ہونا چاہیے آئندہ زمانہ کی عورت کے والدین وہی ہوں گے جن کے بیٹے کی پسلی سے وہ پیدا ہوگی اور بیٹے کے ماں باپ، ساس اور سسر نہیں بنیں گے۔ ان کی بہو ان کی بیٹی بھی ہوگی۔ آج یہ بات شاید ان ہونی یا غزل کا شعر معلوم ہو لیکن کل یہی والدین اپنی بہو کو چاہنے پر مجبور ہوں گے کیوں کہ ان کی کوئی دوسری بیٹی ہوگی ہی نہیں۔ داماد کا سلسلہ البتہ ختم ہو جائے گا۔

تعویذ گنڈے والوں کو چاہیئے کہ وہ ابھی سے اپنی روزی کا کوئی اور ذریعہ سوچ لیں۔ مناطاؤں کو بھی کسی اور کام کی تلاش شروع کر دینی چاہیئے۔ کیوں کہ آئندہ کوئی ماں یہ پوچھنے نہیں آئے گی کہ اس کی بیٹی کے ہاتھ کب پیلے ہوں گے، اور اس کا بر کدھر سے آئے گا۔ ہماری تجویز کے تحت ہر عورت، ہاتھوں میں مہندی رچائے پیدا ہوگی — اور اس کے گلے میں کالی پوت کا لچھا ہوگا۔

ساجدہ عابد

خلیل خاں

تم کبھی خلیل خاں سے ملے ہو ؟

نہیں تو ۔

اگر نہیں ملے تو آؤ آج ان سے ملا دوں۔ سامنے کی سڑک . . . سے دائیں جانب مڑ جاؤ۔ بائیں جانب تیسرا گھر ان ہی کا ہے۔

تم گھر کا پتہ بتا رہے ہو یا ان سے ملا رہے ہو۔

اجی سنو تو۔ بات جب تک پوری نہ ہو بیچ میں نہ بولا کرو۔

اچھا بھئی، تم ان سے اتنی دلچسپی کیوں رکھتے ہو۔

اس لیے کہ انھیں ساری دنیا کے انسانوں سے دلچسپی ہے۔ تو پھر کیوں نہ دنیا ان سے دلچسپی لے۔ اس کے علاوہ وہ ہیں بھی بڑے دلچسپ آدمی۔

ہاں تو شروع کرو ایک دو تین ۔

میں آنکھ مچولی تھوڑا ہی کھیل رہا ہوں۔

انسانوں سے ملنا ملانا، لڑنا لڑانا دوسروں سے ان کی خوبیاں بیان کرنا یہ بھی ایک آنکھ مچولی ہے۔

اچھا تو یوں سمجھو کہ تم چور ہو، اور خلیل خاں کو ڈھونڈ رہے ہو۔ پٹی تو آنکھوں پر بندھی ہوئی نہیں ہے۔ مگر ان سے ملنے کے بعد بڑی سی موٹی پٹی آنکھوں پر ضرور باندھی جائے گی۔

کیا مطلب ـــ

یہی کہ پھر تم ان کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھا کرو گے جس طرح بند آنکھوں والا انسان ٹٹولتا پھرتا ہے اسی طرح تم بھی ان سے مل کر بھٹکنے لگو گے۔

تو بھئی ان کو دور ہی سے سلام۔

نہ نہ سلام نزدیک سے کرو تو لطف آئے۔ وہ لوگوں کی آنکھوں پر رنگ کی عینک چڑھا دیں دنیا کو اسی رنگ کے انسان نظر آتے ہیں۔

تو کیا ان کے پاس کوئی جادو ہے۔

جادو سے بڑھ کر ان کا کھیل نرالا ہے۔ دن رات رام رام نام جپتے ہیں اور بھگوان کو خوش کرنے کے لیے انھوں نے ایک کنٹریکٹ کیا ہے۔ دنیا والوں کے تمام چھپے ڈھکے کرتوت کی رپورٹ تیار کرتے ہیں اور بھگوان تک پہنچاتے ہیں۔ بھگوان کی کرپا سے سی۔ آئی۔ ڈی کا کام کرتے ہیں۔

پھر تو بڑے خطرناک ہیں۔

نہیں تو خطرناک اس لیے نہیں ہیں کہ ان کی جتنی رپورٹیں تیار ہوتی ہیں وہ سب جھوٹی ہوتی ہیں، اور بھگوان نے انھیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ مرے والے کو تنکے کا سہارا یا بقول خلیل خاں کو دوسروں کے اعمال کا سہارا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کے سہارے وہ سیدھے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ جنت میں!

جنت دوسروں کے ذریعہ حاصل کرنا کوئی کمال تو نہیں۔

کیا کیوں نہیں کوئی اپنے عمل سے جنت حاصل کرتا ہے کوئی دوسروں کے ذریعہ۔ پہنچنا تو سبھی کو ہے۔ کوئی سیدھی سڑک سے جاتا ہے کوئی ٹیڑھی۔

ٹیڑھی سڑک سے پہنچنے میں خطرہ ہے۔

خطرہ کی بھی ایک ہی کہی۔ ابھی خطرہ ان کے پاس پھٹکنے نہیں پاتا کیوں کہ اس دشوار گزار گھاٹی میں وہ دوسروں کو پھنسانے ہیں اور خود دور سے تماشہ دیکھتے ہیں۔

واقعی بڑے عجیب انسان ہیں۔

اس میں کوئی شک تھوڑا ہی ہے۔ ارے وہ دیکھو وہ خود چلے آرہے ہیں مجھے ان سے ملانے کی ضرورت نہیں وہ خود اپنا آپ تعارف ہیں۔

آداب عرض ہے۔

آداب عرض ہے۔

خیریت۔

اجی میاں مجھ سے کیا خیریت پوچھتے ہو اپنے پڑوسی لالہ جی سے پوچھو۔

محلہ میں میں اتنا بڑا حادثہ ہو گیا، آپ کو اب تک خبر نہیں۔

نہیں تو۔ کیا کوئی بم پھٹا۔

بم سے بڑھ کر زبردست دھماکہ ہوا

کیا زلزلہ آیا۔

زلزلے کی بھی ایک ہی کہی۔
آخر بات کیا ہے۔
بات معمولی بھی نہیں۔ چھوٹی بھی نہیں اور اچھی بھی نہیں۔
آخر۔
یہی کہ ——
آپ رک کیوں گئے۔
زبان نہیں اٹھتی۔
فرمائیے فرمائیے۔ ہمارے کان سننے کے لیے بے تاب ہیں۔
لالہ جی کی بڑی لڑکی فرمائش خاں کے خانساماں کے ساتھ فرار ہو گئی۔
فرار ہو گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔

جی ہاں فرار ہوئی اور پُراسرار طریقے پر۔ کل میں لالہ جی کے گھر کے پاس سے گزر رہا تھا دیکھا کہ گھر میں ہنگامہ بپا ہے۔ رونا دھونا سر پیٹنا میں نے سوچا خیر تو ہے۔ چلتے چلتے رک گیا۔ اندر پہنچا۔ ڈرائینگ روم میں سارا سامان الٹ پلٹ تھا۔ گلدان ٹوٹا ہوا۔ چیزیں بکھری ہوئی اور اندر ماتم

ماتم —— ؟

جی ہاں۔ ماتم۔ لالہ جی کی سیٹھانی سینہ کوٹ رہی تھیں۔ میں نے دستک دی۔ سیٹھانی جی آئیں۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ لالہ جی بری طرح زخمی ہو کر بستر پر آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ ان کے پاس پہنچا۔ سر پھٹا ہوا۔ پٹی بندھی ہوئی شکل سمجھ میں نہ آتی تھی۔ مجھے بھی نہیں پہچانا۔ معلوم ہوا خانساماں رات میں مع دس غنڈوں کے گھر میں گھس آیا لڑکی تو تیار تھی ہی۔ ماں باپ جاگے۔ لڑائی ہوئی لڑکی کو بچانے کے لیے لالہ جی نے ریوالور چلایا۔ ایک غنڈا مرا۔ پھر کیا تھا سب نے مل کر اس کی درگت بنا دی۔ میرا تو خیال ہے ان کی حالت کل بگڑی ہوئی تھی اب وہ سدھار بھی چکے ہوں گے۔ انا للہ . . . بیچارے بڑے اچھے آدمی تھے۔ بڑے ہمدرد۔ خلوص و محبت والے۔ مگر قرض دار۔ بال بال قرضہ میں جکڑا ہوا۔ دن رات پریشان، اور یہ قرضہ بچوں کی وجہ سے تھا۔

مگر صاحب۔ لالہ جی خود دوسروں کو قرض دیا کرتے تھے۔

اجی میاں اتم لونڈے ہو تمہیں کیا خبر۔ دوسروں سے قرض لے کر تیسرے کو دیتے تھے بیچارے لالہ جی توند تو بہت بڑی تھی جن لوگوں کی توند بڑی ہوتی ہے نا وہ بہت کنجوس مکھی چوس ہوتے ہیں روپیہ جمع کرنے میں ماہر اسی لیے تجوری ہمیشہ بھری رہتی تھی۔

مگر جناب ابھی آپ نے فرمایا کہ وہ قرض دار تھے۔

ہاں ہاں تو کیا ہوا اپنا پیسہ محفوظ رکھ کر دوسروں کا پیسہ لینا، اترانا، اور دوسروں کو ڈبونا بہت سارے لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے یہی صفت ہمارے دوست پڑوسی رائے بہادر کی بھی ہے۔

مگر صاحب وہ دیکھئے لالہ جی تو ــــ

ارے ہاں شکر ہے، سلامت ہیں۔ آیئے لالہ جی ــ

نمستے خلیل خاں صاحب۔

اجی نمستے لالہ جی۔ آپ سے ملیے۔ یہ ہمارے محلہ کے بڑے لالہ ہیں۔ بڑے اچھے آدمی ہیں۔ ان کا دل تو ہیرا ہے ہیرا۔ محلہ بھر میں چراغ لے کر ڈھونڈیئے تو لالہ جی کی طرح کے انسان نہ ملیں۔ ہاں تو میں رائے بہادر کی حقیقت بیان کر رہا تھا۔

کون رائے بہادر۔

اجی لالہ جی وہی جو ہمارے پڑوسی ہیں۔ بڑے رائے بہادر بنے پھرتے ہیں۔ ظاہر میں ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں۔ مگر ان پر تو وہی مثال صادق آتی ہے کہ . . . اندر مٹی اوپر چونہ۔

مگر ان کی آبائی جائداد ہے۔

آبائی جائداد تھی ایک زمانے میں اب کہاں رہی۔

شراب پینے والوں کے پاس کہیں روپیہ رہا ہے۔

شراب !!

جی ہاں شراب دن رات چڑھایا کرتے ہیں جام پر جام لنڈھاتے ہیں۔ سارا روپیہ اسی میں پھونک ڈالا۔

مگر خلیل خاں وہ تو بڑے اچھے منش ہیں۔

لالہ جی منش ہیں تو اور بھی خراب بات ہے۔

صاحب منش ہندی لفظ ہے اور اس کے معنی انسان کے ہیں۔

توبہ توبہ۔ منش عربی کا بھی لفظ ہے اور فارسی کا بھی اور اس زبان میں اس کے معنی آوارہ، بدمعاش اور اوباش کے آتے ہیں۔ لالہ جی میں وہی سمجھا۔

جی نہیں صاحب۔ منش عربی اور فارسی کا لفظ نہیں ہے۔

اجی لالہ جی کبھی میری لائبریری آیئے تو عربی کی لغت میں بتادوں۔

آپ کے پاس لائبریری بھی ہے۔ مجھے اب تک معلوم نہ تھا۔

خوب! لائبریری تو میری جان ہے۔

تو صاحب چلئے آپ کی گیٹ تو سامنے ہی ہے وہیں چلیں۔ لغت دیکھ لیں پھر بیٹھ کر باتیں کریں۔

لائبریری اس گھر میں کبھی تھی مگر جب کتابیں خوب ہوگئیں تو اس کو تین جگہ منتقل کرنا پڑا۔ کئی کتابیں سالار جنگ نے خرید لیں کئی کتابیں کتب خانہ آصفیہ میں بکیں اور یونیورسٹی میں بھی میں نے بہت ساری کتابیں . . . بیچ ڈالیں۔ ان ہی کتابوں کے پیسے سے میں نے انگلستان کا سفر کیا تھا۔

آپ انگلستان بھی گئے تھے۔

جی ہاں پہلے دلی گیا سو جب اتنا قریب آ ہی چکے ہو تو کیوں نہ انگلستان بھی دیکھ لو۔ لہٰذا جاتا ہوا بمبئی ہوتا ہوا کرشمیئر ہوتے ہوئے انگلستان پہنچا۔ انگلستان بڑا ہی گرم ملک ہے۔ اس سے ہمارا ہندوستان ٹھنڈا ہے۔ لالہ جی ہندوستان جنت ہے جنت۔ جی ہاں جہاں آپ جیسے انسان بستے ہوں وہ جنت نہیں تو اور کیا ہوگا۔

جنت میں اور کیا خوبی ہے بھلا۔ اچھا خلیل خاں صاحب اب ہمیں اجازت دیجئے ضروری کام سے جا رہا تھا۔ باتوں میں لگ گیا۔

کہاں جا رہے ہیں آپ۔

عابد شاپ۔

مجھے بھی عابد شاپ جانا ہے چلئے میں بھی چلوں۔

آپ عابد شاپ کیوں جا رہے ہیں

ہمارا ملازم کل سے سخت بیمار ہے۔ رات بچنے کی امید نہ تھی ڈاکٹر نے آ کر انجکشن دیا۔۔۔ وہ کہتا تھا کہ ملازم سے اتنی ہمدردی اس نے آج تک نہ دیکھی نہ سنی تھی اور وہ بھی کیسا ملازم۔ چور، ڈاکو، لیٹرا۔ اس نے میرا روپیہ نہیں لیا بلکہ محلہ کی بہت ساری لڑکیوں کو بھگا کیا کیا بتاؤں لالہ جی باہر کا کمرہ ہے نا وہاں ایسے ایسے نظارے دیکھے کہ خدا ہی جانتا ہے۔ ان آنکھوں سے کن کن شریف بہو بیٹیوں کو آتے دیکھا ہے توبہ توبہ قیامت قریب ہے خدا کا قہر نازل ہونے والا ہے یہ جو گرمی ہے نا یہ قہر ہی تو ہے۔ ہاں تو ایسے ملازم کے ساتھ اتنی ہمدردی۔ ڈاکٹر حیران تھا مگر انسان ہونے کی حیثیت سے میرا دل پسیج گیا۔ بیچارہ بری جنس کی رکھوالی کرتا ہے، دودھ میں پانی ملا کر بیچتا ہے اوپلے بیچ کھاتا ہے۔ خیر برائیاں تو بہت ہیں اس میں مگر میرا ملازم ہے نا وہ آج کل شرافت ہے بستر سے اٹھ نہیں سکتا۔ اس کے لیے دوا لینے جا رہا ہوں۔

اجی خلیل خاں صاحب۔ آپ کا ملازم تو مجھے ابھی راستہ میں ملا تھا۔ سودا لینے جا رہا تھا۔

اچھا ہو گیا ہوگا۔ جتنا میرا مال کھاتا ہے اتنا ہی وفادار بھی ہے۔ گو ہو کر رہے مگر میں تو اسے آخری دم تک نہیں نکالوں گا۔

بڑی خوبیوں کے مالک ہیں آپ۔

لالہ جی بھلا مجھ میں خوبیاں کہاں ؟

اتنی انکساری نہ کیجئے۔ اچھا چلئے مجھے دیر ہو رہی ہے۔

چلیے۔

خدا حافظ۔

خدا حافظ

مل چکے پڑوسی سے

ہاں۔ خلیل خاں ڈاکٹر بھی معلوم ہوتے ہیں۔

جی ہاں دوسروں کے ناسور چھیڑ کر اس سے خون بہاتے ہیں اور مرہم پٹی کرتے ہیں زخم کو کبھی بھرنے نہیں دیتے۔ دوا کی بجائے نمک چھڑکا کرتے ہیں اور صاحب ساتھ ساتھ خاکے بھی خوب اڑاتے ہیں

بازگشت

میں نے اپنے خط میں کہیں بھی یہ نہیں کہا ہے کہ خواتین کو جنسی موضوع پر قلم نہیں اٹھانا چاہیئے۔ میں نے لکھا تھا کہ "آمنہ صاحبہ نے ایک خاتون ہوتے ہوئے اس قدر بے باکی اور بے حجابی سے جنسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔" اور آگے لکھا تھا کہ "کسی خاتون کو اس انداز کی کہانیاں لکھنا زیب نہیں دیتا"

ادیب مرد و خواتین پر جنسی یا کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے یا نہ اٹھانے کا حکم لگانے والا میں کون ہوتا ہوں۔ تاہم ہر شریف اور نیک نفس انسان ادب کے ذریعہ معاشرے میں جنسی بے راہ روی اور بد اخلاقی کے جراثیم چھوڑنے والوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا حق ضرور رکھتا ہے۔ لکھئے اور ہر موضوع پر لکھیئے لیکن تحریر کے آداب و معیار کو بھی ملحوظ خاطر رکھیئے۔

محترمہ ریاست خانم صاحبہ نے آمنہ صاحبہ کے افسانے کی تائید و حمایت فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ موصوفہ نے درد کا رشتہ کو آمنہ کی ایک بہترین کہانی قرار دیا ہے، اگر بہترین کہانی ایسی ہو سکتی ہے تو نہ جانے بدترین کہانی کا کونسا تصور ان کے ذہن میں محفوظ ہے۔ بہن ریاست خانم صاحبہ کے خط سے تو یہی جان پڑتا ہے کہ "ارتکاب جرم عمل میں آچکا ہے اور وہ ملزم کو بچانے کے لیے عدالت میں قانونی موشگافیوں کا سہارا لے کر تائیدی بحث فرما رہی ہیں"

جاوید لطیفی۔ حیدرآباد دکن

آج صبح کی ڈاک میں مجھے "صبا" کا جنوری کا شمارہ ملا۔

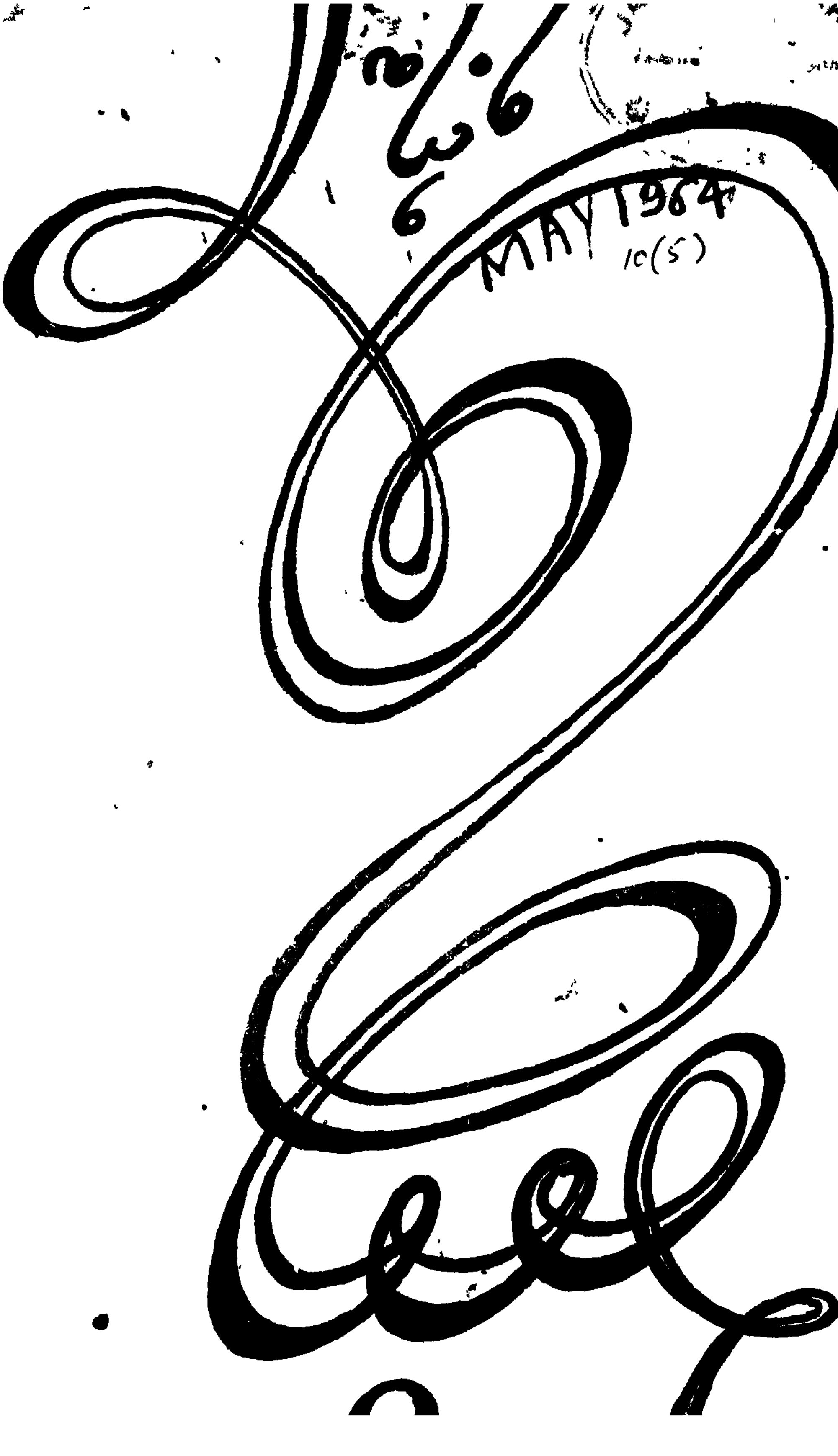
گزشتہ دو شماروں میں ظ انصاری کے مضمون اور خط کے بارے میں خطوط پڑھے۔ یہ آپ کا بازگشت کا صفحہ واقعی بے کار کی چیز ہے، نیاز فتح پوری کا ایک خط اور وحید اختر کا ایک طویل خط آپ نے اس سلسلہ میں شائع بھی کیا تھا۔ میری بھی رائے میں اگر آپ "بازگشت" کا صفحہ ہی نہ رکھیں تو اچھا ہو۔

اسد اللہ (برلن)

☆

N. 3461/57 REGD. NO. A. 215.

SABA MONTHLY



منظور شدہ محکمہ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

زر سالانہ ہند و پاک سے .. ۱۰ روپے
ششماہی ..... ۶ روپے
بیرون ہند سے ..... ۲۰ شلنگ

ایڈیٹر:۔
سلیمان اریب

کتابت:۔ محمد مظہر

فون :۔ (۴۴۴۰۲)

جلد ۱۰
شمارہ ۵
ماہ مئی
سنہ ۶۴
قیمت ایک روپیہ

ماہنامہ

صبا

حیدرآباد دکن

دہلی آفس :۔ ۱۹۵۷ ترکمان گیٹ دہلی ۶
پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۳۷۰۲) کراچی ۳
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب، ۱۷ عیدگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد، مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان

ایک دور کی موت

یہ جنگل خوبصورت، گھنا اور تاریک ہے
لیکن مجھے اپنے وعدوں کو پورا کرنا ہے
اور سونے سے پہلے کئی میل کی مسافت طے کرنی ہے

رابرٹ فراسٹ کے ان مصرعوں کو پیش نظر رکھنے والے جواہر لعل نہرو نے سونے سے پہلے اپنے کئی وعدے پورے کیے اور ابھی ان کو کئی اور وعدے پورے کرنے تھے کہ ان کی روح ان کے جسدِ خاکی کو چھوڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئی۔

پنڈت نہرو کی موت سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام عالمِ انسانیت کا نقصانِ عظیم ہوا ہے اور اس نقصان کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ ہم ان کے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔

سردار جعفری

گردشِ پیمانۂ رنگ

بخیالِ چشمہ گری زند قدِ نے جنونِ دلِ تنگِ ما
کہ ہزار میکدہ می دود بہ رکابِ گردشِ رنگِ ما
بیدلؔ

غالب نے ایک فارسی شعر میں کہا ہے کہ خزاں اور بہار کی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں کہ آسمان پیمانۂ رنگ مسلسل گردش کر رہا ہے اس کا ایک رنگ بہار ہے اور ایک خزاں۔ یہ مسلسل گردشِ وقت کا قدیم ترین تصور ہے۔ کائنات کے اصولِ اول یعنی ایار اور الکاہ پانی میں تیرتے ہوئے شیش ناگ پر لیٹا ہوا قادرِ مطلق وشنو اپنی شکتی اپنی مایا کو بار بار جنم دیتا ہے۔ پنسار پھلتا پھولتا ہے، بگڑتا ہے، اجڑتا ہے اور پھر وشنو کے وجود کے اندر خواب بن کر محو ہو جاتا ہے اور پھر جنم لے لیتا ہے۔ یہ چکر ازل سے چل رہا ہے جس کی کوئی ابتدا نہیں اور ابد تک چلے گا جس کی کوئی انتہا نہیں ؎

نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
اقبالؔ

لیکن انسان جو ازلی بچہ ہے ان گریزاں رنگوں کے پیچھے اس طرح دوڑتا ہے جیسے تتلیوں کے پیچھے بچے بھاگتے ہیں اسی جذبے کی ترجمانی مصحفی نے اپنے ایک خوبصورت شعر میں کی ہے جس میں قافلۂ بہار کو پکڑ لینے کی طفلانہ اور معصومانہ کوشش ہے ؎

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

لیکن قافلۂ بہار ٹھہرنے والی چیز نہیں اس کا سارا رنگ، ساری نکہت جنبش اور گریز ہی کی رہینِ منت ہے اس لیے میر تقی میرؔ نے اس کو پکڑنے کے بجائے اس قافلے کے ہجوم میں گم ہو جانے کی خواہش کی ؎

بوئے گل و رنگِ گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے، جو تو بھی چلا چاہے

برنگِ بوئے گل اس باغ کے ہم آشنا ہوتے
کہ ہمراہِ صبا ٹک سیر کرتے اور ہوا ہوتے

اور انگریزی کے جواں مرگ رومانی شاعر کیٹس نے تو موشنے کی دعوت دی ہے۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ جب شہد کی مکھی پھولوں کا رس چوس لیتی ہے تو آنے والی بہاریں پنکھڑیوں کا رنگ اور زیادہ سرخ ہو جاتا ہے۔

یہ گردش پیمانۂ رنگ ادب اور تہذیب کی دنیا میں بھی جاری ہے۔ فکر اور خیال کے دامن پر بکھرے ہوئے بیل بوٹے ایک بہار کے رنگ کو دوسری بہار کے رنگ سے ملا دیتے ہیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینے سے وہ تفریق پیدا ہوتی ہے جو انسانوں کو نسلوں، رنگوں اور جغرافیائی حدوں میں تقسیم کرکے اسیر کر دیتی ہے۔ جب یہ حدیں محبت سے نہیں توڑی جاتیں تو نفرت سے توڑی جاتی ہیں اور جنگ اور موت اور غارت گری سب کا خون بہا دیتی ہے اور زمین اپنے عریاں سینے میں ہر خون کو جذب کر لیتی ہے۔

دوسری جنگ میں ہٹلر اور مسولینی کی فاشسٹ فوجوں نے سارے یورپ کو روند ڈالا۔ ان کے فوجی بوٹوں کی ڈراؤنی آواز ساری دنیا میں سنائی دیتی۔ یہ تھی اس قتل اور غارت گری میں انسانی فکر اور تہذیب کی بے شمار قدریں خون میں نہا گئیں۔ ان گنت شاعر و ادیب، معمار اور فنکار موت کے گھاٹ اترے۔ شہید ہونے والوں میں بلغاریہ کا نوعمر شاعر وائپت بھی تھا جو نازیوں کی آریائی برتری اور جرمن اقتدار کے بہیمانہ تصور کا دشمن تھا۔ آخر کو انسانی تصور کی جیت ہوئی اور بلغاریہ میں اشتراکی حکومت قائم ہو گئی۔ اگر وائپت سارف زندہ رہتا تو ۱۹۵۹ء میں اس کی عمر پچاس سال کی ہوتی۔

دسمبر ۱۹۵۹ء میں بلغاریہ کی راجدھانی صوفیہ میں وائپت سارف کا جشن منایا گیا جس میں دنیا کے مختلف ممالک کے ادیب اور شاعر جمع ہوئے۔ ہندوستان کے ادیبوں کی نمائندگی میں نے اور خواجہ احمد عباس نے کی۔ جشن کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے مجھے بے ساختہ اقبال کا فارسی قطعہ یاد آگیا جو وائپت سارف کی موت کے سبب بہت موزوں تھا۔

سحر می گفت بلبل باغباں را
دریں گل جز نہال غم نگیرد
بہ پیری می رسد خار بیاباں
ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

(ترجمہ:- ایک صبح بلبل نے باغباں سے کہا کہ اس زمین میں غم کے پودے کے سوا اور کوئی پودا جڑ نہیں پکڑتا جنگل کا کانٹا آہستہ آہستہ بوڑھا ہو جاتا ہے لیکن پھول جیسے ہی جوان ہوتا ہے کمہلا جاتا ہے)

جشن کے دو تین دن بعد ایک دعوت کے موقع پر بلغاریہ کے بوڑھے شاعر لامار نے ایک طویل نظم سنائی جو اقبال کے اس قطعہ سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس نظم کو سن کر میری آنکھوں کے سامنے سے صدیوں کے حجابات اٹھ گئے اور میں نے محسوس کیا جیسے میں بہ یک وقت قدیم یونان، ایران، جرمنی، ہندوستان سب کی سیر کر رہا ہوں اور میرے چاروں طرف شعر اور نغمے کے آبشار گنگنا رہے ہیں۔

دو ڈھائی ہزار سال پہلے مقدونیہ کے اس علاقے سے جس کے ایک شہر بانسکو میں وائپت سارف پیدا ہوا

ایک فاتح اٹھا تھا اور اس کا نام سکندر اعظم تھا۔ ارسطو اس کا استاد اور اتالیق تھا۔ یہ طوفان ایران اور افغانستان سے گزرتا ہوا دریائے سندھ کے ساحلوں سے آکر ٹکرایا۔ ہندوستان میں پورس کو شکست ہوئی۔ چندر گپت موریہ کے دربار میں یونانی لڑکیاں سفیروں میں لپٹی نظر آئیں۔ ایران میں سکندر نے نوشابہ سے محبت کی۔ گندھارا میں گوتم بدھ کا پہلا مجسمہ بنایا گیا جس کا چہرہ یونانی دیوتا اپالو کی شکل کا تھا۔ بدھ کا لفظ جو گیان اور عرفان کا ہم معنی تھا بت میں تبدیل ہو گیا، اور فارسی زبان میں مجسمے اور معشوق کے معنوں میں استعمال ہونے لگا اور پھر ایران سے ہندوستان میں ایک اجنبی لفظ بن کر داخل ہوا اور اردو زبان اور شاعری میں گھل مل کر ہماری زبان کا لفظ بن گیا۔

اسی یونان سے علم اور فلسفے کے دھارے بہے اور مشرق اور مغرب کی سرزمینوں کو سیراب کرتے رہے لیکن نوفلاطونی عہد تک پہنچتے پہنچتے ان میں بابل اور نینوا کی تہذیبی اقدار اور عبرانی پیغمبروں کی آوازیں شامل ہو چکی تھیں جو مقامی، نسلی، شہری ریاستوں کی حدود میں اسیر دیوتاؤں کے بجائے ایک ان دیکھے خدائے واحد کے نام پر ایک وسیع تر انسانی برادری کا تصور پہلی بار پیش کر رہے تھے۔ اس صورت کے تنوع اور معنی کی وحدت کے تضاد کو فلسفیانہ سطح پر سمجھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ہندوستان سے ویدانت اور اپنشد کی ہوائیں چل رہی تھیں اور مشرق قریب کے علاقوں سے مسیحی تصورات کا نور پھیل رہا تھا۔ اسکندریہ کے بازاروں میں مشرق اور مغرب کے مال کا تبادلہ ہو رہا تھا اور وہاں کی دانش گاہوں میں یونانی اور مسیحی تعلیمات ایک دوسرے کے شانوں سے شانہ رگڑ رہی تھیں۔ ایران میں نوشیروان کے دربار میں زرتشتی تصورات کے ساتھ ساتھ نوفلاطونی تصورات بھی بار پا رہے تھے اور پھر مشرق وسطیٰ میں گوتم بدھ کی محبت بھری آواز گونج رہی تھی اور وہاں کے وہاروں میں محبت اور مکتی اور نروان کے نئے عقیدے انسانیت کے درد اور دکھ کے سمجھنے اور زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تصورات، خیالات اور عقائد اس طرح گھل مل رہے تھے جیسے مختلف دریاؤں کا پانی سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ متضاد سمتوں سے چلنے والی ہوائیں آپس میں ہم آغوش ہو جاتی ہیں۔

بہاروں کا سفر جاری ہے پیمانۂ رنگ گردش کر رہا ہے

عرب کے ریگزاروں سے ہدایت کا ایک نیا چشمہ پھوٹا جس نے بلا تفریق حبش کے بلال اور فارس کے سلمان اور عرب کے ابوذر غفاری کی پیاس بجھائی۔ لیکن بہت جلد وہاں کی سوکھی ہوئی ریت اور خشک ہواؤں نے اس آب زلال کو جذب کرنا شروع کر دیا اور پیغمبر اسلام کی وفات کے تیس سال کے اندر اختلافات پیدا ہو گئے۔ وہ جو رحمت اور شفقت بن کر آیا تھا اس کے نام پر مصر سے لے کر ایران اور دریائے سندھ کے ساحلوں تک فوجی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پانی اور زمین پر انفرادی قبضہ ہو گیا اور اسلامی دنیا مکمل جاگیردارانہ نظام میں تبدیل ہو گئی اور جاگیرداری شہنشاہیت نے خلافت کا تاج سر پر رکھ لیا۔ اب بقول اقبال کے شام اور بغداد کی شوکت ایک طرف تھی اور ساحل فرات پر بہتر روحوں کی شہادت دوسری طرف تھی

ایں دو قوت از حیات آمد پدید
موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید

شوکتِ شام و فرِ بغداد رفت
سطوتِ غرناطہ ہم از یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

عرب کے فاتحین مشرق اور مغرب کے ممالک کو فتح کر رہے تھے لیکن مشرق اور مغرب کے علوم اور فلسفے عرب کو شکست دے رہے تھے۔ ایران میں غلاموں، کسانوں اور دستکاروں کی بغاوتیں ہو رہی تھیں اور بغداد کے عربی دربار میں ایرانی امرا کا اقتدار بڑھ رہا تھا۔ عباسی خلفا کی سرپرستی میں یونانی علوم اور فلسفے کی کتابوں کے ترجمے ہو رہے تھے۔ افلاطون اور ارسطو کے نام عربی انداز اختیار کر رہے تھے اور ان کی سلطنت کے گوشے گوشے سے اخوان الصفا اور معتزلہ عقل پرستی اور ذہنی وسعت کا پیغام دے رہے تھے۔

عرب اقتدار کی جاگیرداری گرفت جتنی سخت ہوتی جاتی تھی ایرانی دانشوروں اور شاعروں کی آواز میں اتنی ہی بلندی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ فردوسی، ناصر، خسرو اور عمر خیام کی شاعرانہ نوا سنجی جاگیرداری فکر کے مستحکم نظام میں شگاف ڈال رہی تھی اور بوعلی سینا کی فکر ایک نئے نظامِ حیات کی بشارت لیے ہوئے تھی۔ اب ایران کا خطہ ایک میخانہ تھا جس میں ایک طرف سے ویدانت اپنشد اور بودھ تصورات کا گنگا جل آتا تھا۔ دوسری طرف سے نوفلاطونی اور مسیحی تصورات کا آبِ حیات اور زرتشتی اور مزدکی شراب میں حل ہو کر دو آتشہ اور سہ آتشہ بن رہا تھا اور اسلامی تصورات کے پیمانوں میں ڈھل رہا تھا۔

اسلام کئی حصوں میں بٹ گیا تھا لیکن اس کے اہم ترین حصے دو تھے۔ ایک سرکاری اور صاحب اقتدار طبقے کا اسلام تھا اور دوسرا عوام کا اسلام۔ ایک شریعت تھا اور دوسرا طریقت۔ ایک مذہب تھا اور دوسرا تصوف۔ ایک ظاہری مذہب تھا اور دوسرا باطنی۔ جاگیرداری فکری نظام پر یہ سب سے بڑا حملہ تھا جو بارہویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مختلف ناموں، مختلف شکلوں اور مختلف لباسوں میں پھیلا ہوا تھا۔ کہیں اس کا نام مسٹی سزم تھا کہیں تصوف، کہیں بھگتی، کہیں چی این اور کہیں ژن (ZEN) اس کا ظاہری لباس مذہبی تھا لیکن اندرونی اور داخلی حقیقت انقلابی اور باغیانہ۔

تصوف قرونِ وسطیٰ میں انسان دوستی کی عظیم ترین تحریک کی شکل میں ابھرا تھا جس نے رقص، سرود، اور شاعری کو حربہ بنایا تھا اور عشق، محبت، گناہ اور مستی کو روحانی انداز دے دیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا حملہ ان اہلکاروں پر تھا جنھیں سعدی نے شمر ذی الجوشن اور یزید سے تشبیہ دی ہے۔ ان میں مذہبی اہلکار بھی تھے جو خدا اور بندے کے درمیان حائل تھے اور سرکاری اہلکار بھی تھے جو جاگیرداری ریاست کو چلاتے تھے اور بادشاہ اور رعایا کے درمیان حائل تھے اور چونکہ ریاست اور کلیسا ایک دوسرے کے حامی تھے اس لیے مذہبی اہلکار اور سرکاری اہلکار کبھی کبھی ایک ہی ہوتے تھے۔ سرکاری مذہب کا خدا قہار اور جبار اور انتقام لینے والا تھا اور صوفیوں کا خدا انسانوں کے عیوب چھپانے والا رحیم و کریم

مہربان اور شفقت کرنے والا۔ اس لیے صوفی انا الحق کہنے کی بھی ہمت کر لیتا تھا چاہے دار ہی پر کیوں نہ کھینچ دیا جائے۔

مولانا جلال الدین رومی نے ایک بڑا دلچسپ نکتہ پیدا کیا ہے اور وہ یہ کہ انا الحق انکساری کی آخری منزل ہے جس طرح شہد میں ڈوب جانے والی مکھی ہل نہیں سکتی اسی طرح عالم استغراق میں کوئی صوفی انا العبد (میں بندہ ہوں) نہیں کہہ سکتا کیوں کہ انا العبد کہنے میں دوئی ہے۔ ایک خدا اور دوسرا بندہ اور یہ غرور کی منزل خدا کے وجود کے سامنے اپنے وجود کا اعلان ہے لیکن انا الحق کہنے میں "میں" کا وجود باقی نہیں رہتا۔ صرف وحدت ہی وحدت ہے۔

(مثنوی کا انگریزی ترجمہ از نکلسن۔ جلد ۲)

ظاہر ہے کہ اس منزل وحدت میں کسی سفارش کرنے والے مولوی کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی استعارے کو ذرا اور پھیلا دیا جائے تو رعایا ہی بادشاہ ہے اور اس لیے سرکاری اہلکار فضول اور بے معنی جو صرف رعایا کو لوٹتے ہیں اور بادشاہ کے نام پر ظلم اور جبر کرتے ہیں۔

اس مقام پر رنگ نسل، مذہب، ملت ہر طرح کی تقسیم ختم ہو جاتی ہے اور صرف انسانیت باقی رہتی ہے جس کی آخری معراج انا الحق ہے۔

انسانیت کا یہ عظیم الشان تصور صوفی افکار کے ذریعے سے ایک نئے آفتاب کا نور بن کر ایران کے عظیم شعرا کی شاعری میں جلوہ گر ہوا۔ اور اس کا پورا عکس سعدی اور حافظ کی شاعری پر پڑ رہا ہے جس میں عشق، گناہ اور مستی کی عظمت ہے اور حسن کی ہمہ گیری۔ یہاں گناہ دنیا کو برتنے کا ایک پردہ ہے۔ اسی گناہ نے آدم کو نیکی اور بدی کے تصور سے آشنا کیا تھا اور بہشت سے نکال کر زمین پر خلافت قائم کی تھی۔ یہ مصلحت خداوندی تھی، عشق انسانوں کے احترام کا ایک ذریعہ ہے جس میں دو ضدوں کی وحدت "من و تو" کے فرق کو مٹا دیتی ہے۔ خدا تو دکھائی نہیں دیتا اس سے محبت کا دعویٰ کرنے والے اگر دکھائی دینے والے انسانوں سے محبت نہیں کر سکتے تو مکاری کے سوا اور کس چیز کے مرتکب ہوں گے، اور مستی جو جاگیرداری عہد کی آویزشوں سے بچنے کا ایک بہانہ بھی ہے احساس حسن کے سوا ہر چیز سے بے نیازی کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی اور محتسب، ملا اور مفتی پر پھبتیاں کسنے والا حافظ حسن کی بارگاہ میں اتنا خوش نوا ہے۔

حافظ کی خوبصورت غزلوں نے پانچ چھ سو سال... میں ایران کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کا دل موہ لیا۔ اس کی شاعری آج بھی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ محو سفر ہے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں جب فانے ہیمر نے ۱۸۱۲ء میں دیوان حافظ کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع کیا تو جرمن ادبیات میں ایک مشرقی تحریک کا آغاز ہوا اور جرمن زبان کا سب سے بڑا شاعر گوئٹے حافظ کا گرویدہ ہو گیا اور اس نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ "مغربی دیوان" کے نام سے شائع کیا۔ اقبال کے الفاظ میں "یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لیے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اس کی بیتاب اور بلند پرواز روح نے

مشرقی فضا کے امن وسکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تیار کرلیا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کردیا جس نے آخر کار مغربی دیوان کی ایک پائیدار اور مستقل صورت اختیار کرلی۔"

اقبال نے اس سلسلہ میں گوئٹے کے مشہور سوانح نگار بیل سوشکی کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے:-

"بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح بھی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کرچکی ہے۔ وہی زمینی مسرت وہی آسمانی محبت وہی سادگی وہی عمق، وہی جوش وحرارت، وہی وسعت مشرب، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی غرض کہ ہر بات میں ہم اسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب اور ترجمان اسرار ہے اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہان معنی آباد ہے اسی طرح گوئٹے کے بیساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر وغریب سے خراج تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم انسان فاتحوں کو اپنی شخصیت سے متاثر کیا۔ (یعنی حافظ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں نے عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان وسکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے (دیباچہ پیام مشرق)

اور گوئٹے کے سو برس کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے عظیم شاعر اقبال نے اس کے جواب میں اپنی مشہور فارسی کتاب "پیام مشرق" لکھی جس پر حافظ اور گوئٹے دونوں کے بھرپور اثرات ہیں اور اقبال نے اس کتاب کے ذریعہ سے دنیا کو امن ومحبت کا خوبصورت پیغام دیا۔ اہم بات یہ نہیں ہے کہ اقبال نے اپنی اس کتاب میں حافظ کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اور گوئٹے کی بعض نظموں کا ترجمہ کیا ہے بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ شاعری ملکوں کی جغرافیائی حدوں کو توڑ دیتی ہے اور پہاڑوں ریگستانوں اور دریاؤں کو پار کر کے انسانی اقدار سے ایک محبت بھری دنیا بناتی ہے جو وقتی حکومتوں سے اور ان کے قوانین سے بالاتر ہوتی ہے۔

حالانکہ اقبال نے تمام عمر عجمی تصوف کی مخالفت کی اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب خود حافظ کے بر خلاف ایک نظم لکھ دی لیکن ایرانی تصوف نے محبت اور انسانیت کی جو حسین قدریں دی تھیں انھیں اقبال کو قبول کرنا پڑا، اور یہ جواہرات اقبال کے پورے کلام میں بکھرے ہوئے ہیں۔

حافظ کا ایران مقامی خانہ جنگیوں اور تیموری یلغاروں کی آماجگاہ تھا اور گوئٹے کے یورپ میں نپولین کی فوجیں کوچ کررہی تھیں اور اقبال کی دنیا پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور سرمایہ داری شہنشاہیت کے جبروتشدد کا شکار تھی گوئٹے کے مغربی دیوان سے پیام مشرق کی تحریک کیسے ہوئی اس کے متعلق اقبال نے خود لکھا ہے کہ "سو سال پیشتر کے جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس لیے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی ... جس نے دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے دفن کردیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی

خاکستر سے غلطت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔"

اس نئی دنیا پر اقبال کی نظر ضرور پڑی جو اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷ء) کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی تھی۔ لیکن عجمی تصوف کی طرح اس کی بھی بعض خوبصورت اقدار کو قبول کر لینے کے باوجود اقبال کا ذہن اس کی حقیقی ہیبت کا اندازہ نہ کر سکا۔ پیمانہ رنگ کی اس گردش میں بہار کے ساتھ خزاں کے رنگوں کی آمیزش کتنی دلچسپ ہے۔

اقبال کی نگاہ آفاق گیر تھی اس لیے پیام مشرق میں ہنگامی موضوعات کی آلودگی نہیں ہے۔ لیکن ماضی اور مستقبل کی غرض آج کا گریزاں لمحہ ہی دیتا ہے اس لیے لمحات کی پرچھائیوں سے بچنا اقبال کے لیے ممکن نہیں تھا اور پیام مشرق میں ہنگامی حالات کا عکس دیکھا جا سکتا ہے جس میں سب سے زیادہ اہم پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاری، برطانوی شہنشاہیت، انقلاب روس اور ہندوستان کی سیاسی بیداری تھی۔ نظموں کے علاوہ بعض قطعات میں بھی اس آگ کا سراغ ملتا ہے جو ہمارے ملک اور قوم کے سینے میں دہک رہی تھی۔

گاندھی جی سے اقبال کو بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی لیکن پھر بھی جب ایک برطانیہ پرست اخبار نے ایک کارٹون شائع کیا تو گاندھی جی بھارت ماتا کو جس کی آنکھ پر پٹی بندھی ہے ایک طوفان زدہ سمندر میں کودنے والے ہیں تو اقبال نے قلم اٹھا کر اس کے نیچے یہ مصرعے لکھ دیئے اور کارٹون کا مفہوم بدل گیا ؂

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

پیام مشرق میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن یہ قطعہ موجود ہے اور اس واقعہ سے الگ بھی اپنی معنوی وسعت اور ہمہ گیری سے محروم نہیں ہے۔

کیا عجب ہے کہ تحریک آزادی کے نو عمر مجاہدوں نے بھی اقبال کو متاثر کیا ہے (جلیانوالا باغ پر دو مصرعوں میں اقبال کے آنسو ٹپکے تھے) اور پیام مشرق میں ایسے قطعات او راشعار کی کمی نہیں ہے جن کا اطلاق ہندوستان اور ہندوستان سے باہر آج کے عہد کے باطنی اضطراب سے پیدا ہونے والے بت سے طوفانوں پر ہو سکتا ہے اور اسی لیے اس میں ایک ایسا قطعہ بھی نکل آیا ہے جو سنہ ۱۹۴۲ء میں بیس بائیس سال کی نو عمری میں شہید ہونے والے وابستہ سرفروشوں پر صادق آگیا۔ اس جواں مرگ شاعر کو اس سے بہتر خراج عقیدت میں اور کیا پیش کر سکتا تھا ؂

سحر می گفت طبل باغباں را   درین گل جز نہال غم نہ گیرد
بہ پیری می رسد خار بیاباں
ولے گل چوں جواں گردد بمیرد

اور جب لامار نے اس سے متاثر ہو کر اپنی طویل نظم پڑھی تو میں نے دیکھا کہ اس محفل میں ایک یونانی شاعر بھی موجود ہے اور میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ یونانی فکر نے ایران اور حافظ کو متاثر کیا، حافظ نے گوئٹے کو اپنا گرویدہ بنایا، گوئٹے نے اقبال کو نغمہ سنج کر دیا اور اقبال کے قطعے نے بلغاریہ کے لامار کو اتنی حسین نظم کہنے پر اکسایا، بس اتنی بات باقی ہے کہ اگر یونانی شاعر بھی لامار کی نظم پر ایک نظم کہہ دے تو گردشِ پیمانۂ رنگ مکمل ہو جائے گی۔ انسانی وحدت کے لیے اس سے بہتر تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

(زیرِ طبع کتاب لکھنؤ کی پانچ راتیں اور دوسری یادیں کا ایک باب)

مغنی تبسّم

رابرٹ فراسٹ

"زندگی ایک امتحان ہے" اور دنیا ایک بازیچہ ہے" یہ اقوال مشہور امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی حیات پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔

رابرٹ فراسٹ ۲۶ مارچ ۱۸۷۴ء کو سان فرانسسکو میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ولیم پرسکوٹ فراسٹ نیو انگلینڈ کا باشندہ تھا۔ وہ ایک بے قرار اور مضطرب روح کا مالک تھا۔ شراب نوشی کے علاوہ صحافت اور سیاست اس کے محبوب مشغلے تھے۔ وہ ایسا قمار باز تھا جو زندگی کو بھی ایک جوا سمجھتا تھا۔ رابرٹ فراسٹ کی ماں ازابیل، تارک وطن اسکاٹ عورت تھی۔ کولمبس، اوہیو میں اعلیٰ تعلیم پاکر ایک اسکول میں ریاضی پڑھانے لگی تھی۔ اسے خانہ داری کے امور سے زیادہ رومانی شاعری سے دلچسپی تھی۔

(فراسٹ بچپن میں اپنی انجانی خطاؤں پر باپ کے ہاتھوں پٹتا رہتا تھا۔ جب وہ دس سال کا ہوا تو اسے دن کے اوقات میں اکیلا گھومنے پھرنے کی آزادی مل گئی۔ وہ اکثر آوارہ لڑکوں کی صحبت میں مارا مارا پھرتا اور کبھی چھوٹے موٹے جرائم میں بھی ان کا شریک ہو جاتا تھا۔ اس تو ریث اور ماحول کا فراسٹ کی افتادِ طبع پر گہرا اثر پڑا)

ابھی فراسٹ بچہ ہی تھا کہ ۵ مئی ۱۸۸۵ء کو اس کے باپ ولیم پرسکوٹ فراسٹ کا انتقال ہو گیا۔

(باپ نے مرتے وقت بیٹے سے وعدہ لیا کہ وہ رات کے وقت گلی کوچوں میں کھیلنے کے لیے گھر سے نہ نکلے گا) مرنے والے کی وصیت کے مطابق اس کی لاش کو نیو انگلینڈ میں دفنانے کے لیے نوجوان بیوہ اور دو یتیم بچوں پر مشتمل قافلہ تین ہزار میل طویل سفر پر روانہ ہوا۔ ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ کیلی فورنیا واپس ہو سکیں۔ مجبوراً وہیں مقیم ہو گئے ازابیل، نیو ہیمپشائر کے ایک دیہات میں بچوں کو پڑھانے لگی۔ اسی اسکول میں رابرٹ کی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اپنی ماں کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے وہ خود بھی کام کرنے لگا۔ کھیت مزدوری، کفش دوزی کارخانے کی ملازمت اور نہ جانے کتنے ہی کام اس نے کیے ۱۸۹۲ء کے اواخر میں لارنس ہائی اسکول سے اس نے میٹرکولیشن کا امتحان کامیاب کر لیا۔ ایک روز تاریخ کی کلاس میں "میکسیکو کی فتح" پڑھنے کے بعد کسی نامعلوم کیفیت کے زیر اثر اس نے

ایک رزمیہ بیلڈ لکھی۔ یہ اس کی پہلی نظم تھی جو اپریل ۱۸۹۰ء میں ہائی اسکول بلیٹن میں شائع ہوئی۔ اسکول میں لاطینی شاعری کے ساتھ لڑکیوں میں بھی اس کی دلچسپی بڑھتی گئی اور وہ ایلینر میریم وائٹ کو پسند کرنے لگا جو بعد میں اس کی بیوی بن گئی۔ ۱۸۹۲ء میں اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ڈارٹ موتھ کالج بھیج دیا گیا لیکن اب تعلیم سے اس کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی وہ ایک روز چپکے سے واپس چلا آیا اور اپنی ماں کے اسکول میں بچوں کو پڑھانے لگا۔ پھر کچھ عرصہ بعد لارنس جا کر ایک مطبع میں ملازم ہو گیا۔ ۱۸۹۴ء میں اس نے ایک رومانی نظم MY BUTTER FLY لکھی۔ یہ اس کی پہلی نظم تھی جو ایک معیاری ادبی رسالے INDEPENDENT میں شائع ہوئی۔ لارنس کے مطبع میں فراسٹ نے اپنی چھ نظموں پر مشتمل پہلا مجموعہ کلام TWILIGHT کے نام سے چھاپا۔ اس نے اس کتاب کے دو ہی نسخے طبع کیے ایک اپنی محبوبہ ایلینر کے لیے جو ان دنوں سینٹ لارنس میں زیر تعلیم تھی اور دوسرا خود اپنے لیے۔ اس کتاب کو لیے جب وہ ایلینر کے پاس پہنچا تو اس نے کچھ التفات نہ کیا۔ فراسٹ نے غم و غصے سے اپنی کتاب کے پرزے پرزے کر دیئے اور دل شکستہ ہو کر ایک نامعلوم مقام کو روانہ ہو گیا، اور کچھ عرصہ بعد لارنس واپس آ کر ایک اخبار کا نامہ نگار بن گیا۔ خلاف توقع حالات اس کے موافق ہو گئے ۱۸۹۵ء میں اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد ایلینر نے فراسٹ سے شادی کر لی۔ دو سال تک فراسٹ اپنی ماں کو اسکول چلانے میں مدد دیتا رہا پھر تعلیم کی تکمیل کے خیال سے دوبارہ ہارورڈ چلا گیا۔ اس بار وہ شدید بیمار ہو کر امتحان دیئے بغیر ہی لوٹ آیا۔ زندگی بسر کرنے کے لیے پہلے اس نے ایک پولٹری فارم قائم کیا پھر ڈیری جا کر ترکاریوں کی کاشت کرنے لگا۔ وہاں پنکرٹن اکیڈمی میں اسے انگریزی پڑھانے کی ملازمت مل گئی لیکن وہ اس زندگی سے جلد اکتا گیا۔ اپنے فارم کو بیچ کر وہ کسی جگہ چلا جانا چاہتا تھا جہاں وہ غریب رہ کر شاعری کر سکے۔ آخر ۱۹۱۲ء کو اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ انگلستان روانہ ہوا اور بیکنسفیلڈ بکنگھم شائر میں ایک مکان کرایہ پر لے کر مستقبل سے بے نیاز ہمہ تن شعر گوئی میں مصروف ہو گیا۔ زندگی کے ساتھ یہ جوا بہت کامیاب رہا۔ ۱۹۱۳ء میں ایک پبلشر ڈیوڈ نٹ نے اس کا پہلا مجموعہ کلام شائع کیا۔ ازرا پاؤنڈ اور دوسرے نقادوں نے ہمت افزا تبصرے کیے۔ دوسرے سال اسی پبلشر نے دوسرا مجموعہ NORTH OF BOSTON شائع کیا۔ یہ دونوں کتابیں اتنی مقبول ہوئیں کہ کچھ ہی دنوں میں تمام نسخے فروخت ہو گئے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کے آغاز کی وجہ سے یورپ میں ادبی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ رابرٹ فراسٹ امریکہ واپس ہوا اور فرینکونیا میں ایک چھوٹا سا فارم خرید کر کاشتکار کی زندگی بسر کرنے لگا وہ چاہتا تھا کہ اپنے آپ کو بالکلیہ شاعری کے لیے وقف کر دے لیکن اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی۔ کچھ اپنی معاشی دشواریوں اور کچھ اپنی انا کی تسکین کی خاطر وہ لکچر دینے اور نظمیں سنانے کی دعوتوں کو رد نہیں کر سکا۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں اس کی نظموں کا تیسرا مجموعہ MOUNTAIN INTERVAL شائع ہوا۔ اسی سال اسے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرس کا رکن بنایا گیا اور امہرسٹ کالج میں پروفیسری کی خدمت پیش کی گئی جسے فراسٹ نے پیشۂ معلمی سے نفور کے باوجود اپنی مالی مشکلات کے پیش نظر قبول کر لیا۔ اور یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ وہ تا دم آخر اپنے آپ کو مشتاق طالب علموں سے دور نہ رکھ سکا۔

فراسٹ پہلا امریکی شاعر تھا جو POET IN RESIDENCE کی حیثیت سے متعدد یونیورسٹیوں سے وابستہ رہا۔

چالیس سال کی عمر تک گمنامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد فراسٹ کو جو اعزازات حاصل ہوئے وہ شاید ہی کسی اور امریکی کے حصے میں آسکے۔ ۱۹۳۰ء میں اسے امریکن اکیڈمی کا ممبر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں اور سیر آف ہارورڈ یونیورسٹی کی حیثیت سے اس کا انتخاب عمل میں آیا۔ ۱۹۴۹ء میں ہارورڈ کارپوریشن نے آڈمس ہاؤز کا آنریری اسوسی ایٹ مقرر کیا۔ اس کو اپنی نظموں اور کلام کے مجموعوں پر کئی بار PULITZER AWARD اور دوسرے انعامات حاصل ہوئے۔ چالیس سے زیادہ کالجوں اور یونیورسٹیوں نے اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ اس کی پچھترویں اور پچاسیویں سالگرہ کے موقعوں پر ممالک متحدہ امریکہ کی سینیٹ نے رسمی قرارداد میں منظور کیں اور قومی مسرت کا اظہار کیا۔

۱۹۲۲ء سے ۱۹۴۲ء تک اس کی نظموں کے مزید چار مجموعے شائع ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں COLLECTED POEMS کی اشاعت کے ساتھ رابرٹ فراسٹ کی شہرت بام عروج پر پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۵۸ء میں اسے ایک نیم سیاسی اور نیم ادبی عہدے کنسلٹنٹ ان پوئیٹری ٹو دی لائبریری آف کانگریس کی پیش کش کی گئی۔ یہ حقیقت میں ایک قابلِ فخر اعزاز تھا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۶۱ء کو پریسیڈنٹ جان ایف کینیڈی کے افتتاح کے موقع پر رابرٹ فراسٹ نے اپنی نظم THE GIFT OUTNIGHT سنائی۔ ممالک متحدہ امریکہ کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا جب کہ ایک شاعر کی اس طرح تکریم کی گئی۔

عام طور پر شاعروں اور ادیبوں کی شہرت اور ان کے مرتبہ کے تعین میں شعر و ادب کے علاوہ بعض دوسرے عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں لیکن فراسٹ کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی شہرت اور عظمت کا دارومدار تمام تر اس کی شاعری پر ہے۔

رابرٹ فراسٹ کی شاعری کا آغاز عشقیہ اور رومانی نظموں سے ہوا۔ ابتدائی نظموں میں موسموں کی بدلتی ہوئی کیفیات کے ساتھ جذبات و احساسات میں متوازی تبدیلیوں کا مطالعہ خاصہ دلچسپ ہے۔ ان نظموں کا خاص موضوع انسان اور فطرت کا تقابل ہے۔ کبھی فطرت اسے انسان سے بے نیاز اور بے تعلق نظر آتی ہے اور کبھی ایک بداندیش بہیمانہ قوت۔ ان دونوں تاثرات سے ہٹ کر بعض اوقات وہ اس کو ایک کریم النفس الوہی قوت کے سوچے سمجھے منصوبے کے روپ میں دیکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ فراسٹ کی شاعری سے داخلیت کا رجحان کم ہو گیا، اور غم ذات کی جگہ عام انسانی بھائی چارگی کے احساس نے لے لی۔ دوسرے دور کی نظمیں انسانی ناکامیوں اور شادکامیوں سے پیدا ہونے والے حزن و مسرت کے ملے جلے جذبات کے پُر تاثیر مرقعے ہیں۔ آگے چل کر فراسٹ کی شاعری اس کے پختہ سماجی شعور کی آئینہ دار بن گئی۔ NEW HAMPSHIRE اور اس مجموعہ کی دوسری نظموں میں امریکی سماج بالخصوص بڑے پیمانے کے کاروبار اور مادہ پرستی پر تیکھا طنز ملتا ہے جہاں ہر چیز شاعر کو شوکیس میں رکھی دکھائی دیتی ہے۔

بنیادی طور پر فراسٹ کی شاعری داخلی اور غنائی شاعری ہے جس کا ایک اہم موضوع وسیع اور بسیط کائنات
اپنے وجود کی تلاش اور ساتھ ہی ساتھ خارجی مظاہر اور خالق کائنات سے اپنے رشتے کا تحقق اور اس کا اظ
شعرگوئی فراسٹ کے لیے مقصود بالذات ہونے کے علاوہ بالواسطہ طور پر زندگی اور زندگی کے بارے میں ا
رویے کی تفسیر و تشریح کا ذریعہ تھی۔ وہ فلسفیانہ اور مذہبی نظام ہائے فکر سے مطمئن نہیں تھا اور ان کی ناقابل بردا
حدبندیوں سے آزاد ہو کر استفسار اور مکالمے کے ذریعہ " سچائی " کی جستجو کرنا چاہتا تھا۔ اس جستجو کا آغاز ایک طرح
خوف سے ہوتا ہے جو کائنات کے مقابلے میں اپنی کمتری اور بالآخر اس میں گم شدگی کے احساس سے پیدا ہوتا
فراسٹ کے خیال میں اس خوف پر قابو پانے کے لیے سب سے پہلے انفرادی اور پھر سماجی اتحاد ، ہمت ، جرأت اور عـ
ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی زندگی موت اور حیات بعد الموت کے تصورات کو فراسٹ نے بہت خوبصورتی ـ
ساتھ علامتی اور تمثیلی پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس کی نظم TOO ANXIOUS FOR RIVERS اس کی ا
مثال ہے جس میں شاعر یہ بتاتا ہے کہ ایک دریا کو سمندر تک پہنچنے میں کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس نظم مـ
زندگی کا استعارہ ہے، پہاڑ موت کی علامت ہے اور سمندر سے حیات بعد الموت کو تشبیہ دی ہے۔ اپنی
WEST RUNNING BROOK میں فراسٹ نے اس نظریہ کو پیش کیا ہے کہ حیات کبھی ختم نہیں ہوتی او
اس کا تسلسل ہمیشہ قائم رہتا ہے۔

جدید سائنسی تجربات اور فتوحات میں گہری دلچسپی کے باوجود وہ آج کی دنیا میں سائنس کے تفوق
برتری کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس کا یہ قول بہت ہی دلچسپ ہے کہ سائنس شاعری کے بارے میں سائنٹـ
نہیں ہوسکتی لیکن شاعری سائنس کے بارے میں شاعرانہ ہوسکتی ہے۔ یہ شاعری سائنس کے مقابلے میں زیادہ عظیم ز
بسیط اور محتوی ہے۔

رابرٹ فراسٹ نے ایک ایسے دور میں جب کہ شاعری اور ادب میں نئے نئے تجربات کیے جارہے تھے۔ قد
غنائی، ڈرامائی اور کلاسیکی روایات کو اپنا کر عام لوگوں کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو عام لوگوں کی زبان میں پیـ
کیا۔ اس نے زیادہ تر وہی زبان استعمال کی جو نیو انگلینڈ کے دیہاتوں میں بولی جاتی تھی لیکن کسی مخصوص خطے یا طبقہ کی بول چال
اپنانا اس کا مقصد کبھی نہیں رہا۔ وہ ابتدا ہی سے آوازوں اور مکالماتی لہجوں کا دلدادہ تھا۔ اس کی شاعری لہجوں او
اصوات کی شاعری ہے جن کی مدد سے وہ شعر میں خاص موسیقیت اور معنویت پیدا کر دیتا ہے۔ رابرٹ فراسٹ کے ـ
کی دوسری اہم خصوصیت استعاروں اور علامتوں کا معجزانہ استعمال ہے جن کی وجہ سے فراسٹ کی شاعری گنج معانی بن گـ
ہے اور بیک وقت مختلف ذہنی سطحوں پر سمجھی اور پسند کی جاسکتی ہے۔ فراسٹ کی شاعری کا ایک خاص وصف جذبہ اور تخیل کـ
ہم آہنگی ہے۔ متضاد ذہنی کیفیتوں کو یکجا کرنے میں اسے کمال حاصل ہے اس کی ایک خوبصورت مثال اس کی نظم RCHES
جس میں بام عرش کو چھونے اور فرش کی پنہیوں سے بھی رابطہ استوار رکھنے کی متضاد انسانی خواہش کو ایک تمثیل کے ذریعہ

کیا گیا ہے۔ ایک لڑکا برچ کے ایک درخت پر چڑھ کر آخری ٹہنی تک پہنچ جاتا ہے اور دوبارہ زمین پر آ رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔ "میں چاہتا ہوں کہ کچھ دیر کے لیے زمین سے دور چلا جاؤں اور

پھر دوبارہ زمین پر آ کر مصروف ہو جاؤں۔"

تخیل اور حقیقت کے سنگم پر پہنچ کر بالعموم فراسٹ کی شاعری میں تنہائی کا شدید احساس جاگزیں ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر STOPPING BY WOODS ON A SNOWY EVENING کے اس بند کو ملاحظہ کیجئے۔

یہ جنگل خوبصورت، گھنا اور تاریک ہے
لیکن مجھے اپنے وعدوں کو پورا کرنا ہے
اور سونے سے پہلے کئی میل کی مسافت طے کرنی ہے

زندگی کے دشوار گزار سفر میں کئی میل کی مسافت طے کرنے کے بعد آج یہ عظیم شاعر بالآخر وطن کی آغوش میں ابدی نیند سو چکا ہے۔ لاکھوں امریکی عوام کے دل اس بات کی گواہی دیں گے کہ اس نے اپنے کیے ہوئے وعدے پورے کیے اور ان کی دھڑکنوں کی خوشبو کو شعر کے پھولوں میں بسا کر ایک ایسا گلدستہ ان کی نذر کر گیا جس کی مہک ہمیشہ مشام جاں کو فرحت اور تازگی بخشتی رہے گی۔

کسی خوبصورت عورت کے مستقل ساتھی

محض اس کے افرادِ خاندان نہیں ہوتے
اس کے دوست اور عزیز بھی نہیں
بلکہ اس کا سنگھار دان ہے
جو اسے ہر لمحہ، ہر جگہ اور ہمیشہ خوبصورت رکھتا ہے
اس سے پوچھ دیکھئے
وہ بھی آپ کو یہی بتائے گی
کہ اس کے مستقل ساتھی

افغان اسنو

کے سامانِ آرائش ہیں

افغان نیل پالش



کس آف فائر لپ اسٹک

افغان فیس پاوڈر

افغان اسنو

ای ۔ ایس ۔ پاٹن والا ۔ بمبئی ،، (انڈیا)

سعیدہ طاہر صدیقی

عورت ــ پریم چند کے ناولوں میں

منشی پریم چند کی کہانیوں کے نسوانی کرداروں کا ذکر آتے ہی دھنیا، جھنیا، مالتی، منورما، الپا، صوفیہ، اندو اور ایسے ہی کئی دوسرے کریکٹر ہماری آنکھوں میں گھومنے لگتے ہیں۔

یہ وہ تصویریں ہیں جن کے خط و خال میں زندگی کی حقیقتیں ملتی ہیں اور وہ ہمیں دیہاتی اور شہری زندگی میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔

موضوع اور مواد کے لیے انھوں نے اس زندگی کو منتخب کیا جس سے وہ عملی طور پر واقف تھے اور ادب کے کینوس پر زیادہ تر ایسی تصویریں پیش کیں جنھیں کھینچنے میں ان کا قلم کم سے کم غلطی کر سکتا تھا۔ اس فن میں پریم چند کی کامیابی کا راز ہے زندگی سے ان کی قریبی واقفیت اور عام انسان سے محبت۔

وہ خود لکھتے ہیں "میرے قصے اکثر کسی۔ کسی مشاہدے یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔"

پریم چند کے نسوانی کردار دو خاص اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جینے کا مقصد رونا نہیں ہنسنا ہے اس لیے ان کے ناولوں کے کیرکٹر مصیبت میں بھی انجمنِ زندگی کو رو کر افسردہ نہیں کرتے بلکہ ہنستے ہیں اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔ اور دوسرا اصول یہ کہ عورت کو ایثار، قربانی اور خدمت سے اپنے شوہر اور کنبہ کی زندگی کو مسرت سے معمور کرنا چاہیئے۔

پریم چند جو کچھ بھی لکھتے ہیں اکثر معمولی ذہانت کا آدمی بھی اسے حقیقت تصور کرتا ہے۔ ایک خاص بات جو ان کے ناولوں میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ عورت سماج میں سب سے زیادہ مظلوم ہے اور پریم چند اپنی تحریروں میں اس زیادتی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ اس مضمون میں تین ناولوں کا جائزہ لیا جائے گا۔

چھ سو صفحوں کی آخری تصنیف "گئودان" کو پریم چند کے تمام ناولوں میں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے۔ گئودان میں ہندوستانی دہقانوں کی زندگی کہانی کا بنیادی موضوع ہے۔ اس کہانی کی ہیروئن "دھنیا" میں عام ناولوں کی ہیروئنوں کی طرح جسمانی حسن نہیں ہے۔ وہ ایک چھتیس سالہ کسان عورت ہے اور اس عمر میں ہی اس کے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں، چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں، جسم بالکل ڈھل چکا ہے، گندمی رنگ سانولا بن چکا ہے۔ آنکھوں سے بھی کم دکھائی

دینے لگا ہے۔ لیکن معمولی شکل وصورت کی دھنیا اپنے فکر وعمل کی قوت سے پورے ناول پر چھائی ہوئی ہے۔ اور زندگی کے ساتھ اس کا حقیقت پسندانہ برتاؤ ایک معمولی ذہن کے قاری کے بھی دل ودماغ کو بہت متاثر کرتا ہے۔ دھنیا کا خاوند ہوری زندگی کے ناموافق حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرلیتا ہے اور دھنیا کے دل میں ان حالات کے خلاف ایک آتش فشاں پرورش پا رہا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود وہ ایثار اور بے غرضی کا مجسمہ ہے اس نے گرہستی کے لیے اپنے آپ کو تج دیا ہے اور اپنی ہستی کو فراموش کر دیا ہے۔

مفلسی اور تکالیف میں بھی دھنیا اپنے پتی کا آدر کرتی ہے، مزاج کی سخت ہے لیکن ہوری سے دب کر رہتی ہے۔ سماجی اور خاندانی زندگی کے اکثر معاملات میں وہ شوہر سے زیادہ عقل مند ثابت ہوتی ہے۔ اڑتی چڑیا پکڑتی ہے، جو بات ہوری دل میں رکھتا ہے، دھنیا بغیر کہے تاڑ لیتی ہے۔

دھنیا نے جدوجہد کو اپنا مسلک بنالیا تھا۔ ظاہر ہے جدوجہد کے لیے ہمت ضروری ہے ایسی ہمت جو زندگی کی تمام مشکلات پر حاوی ہو۔ کہتے ہیں غربت اور مفلسی کی چوٹ انسان کو پسپا کردیتی ہے لیکن دھنیا جی دار اور دلیر ہے۔ گائے کے مرنے پر ہوری نوبت کو دبا دینا چاہتا ہے لیکن دھنیا غیض وغضب سے بھرا اٹھتی ہے وہ دبنا نہیں جانتی وہ کہتی ہے "اندھیر نہیں اندھیر کا باپ ہو جائے میں لالہ سونا کو بڑے گھر بھجوائے بنا رہوں گی نہیں۔ تین سال چکی پسواؤں گی۔" ضد کی پکی دھنیا ہوری کے مارنے پیٹنے پر بھی نہیں مانتی اور اپنی بات پر اڑی رہتی ہے۔ داروغہ اور پولیس کو دیکھ کر گاؤں کے چودھری اور دوسرے لوگ سہم اٹھتے ہیں۔ ہوری مکان کی تلاشی سے گھبراتا ہے اور مرجاد اور عزت کے لیے مرتا ہے، لیکن دھنیا جھوٹی شان کو عزت نہیں سمجھتی۔ زندگی کو حقیقت کی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ اس کے ان الفاظ میں کتنی شدت اور سچائی ہے "گھر کے آدمی رات دن مریں، دانے دانے کو ترسیں، چیتھڑا پہننے کو نہ ملے اور انجلی بھر روپیہ لے کر چلا ہے اجت بچانے! ایسی بڑی ہے تیری اجت، جس کے گھر میں چوہے لوٹیں وہ بھی اجت والا ہے۔ داروگا تلاشی ہی تو لے گا۔ لے لے جہاں چاہے تلاشی۔ ایک تو سو روپیہ کی گائے گئی اس پر یہ پینتھن، واہ رے تیری اجت!"

دلیر اور ضدی دھنیا کے سینے میں ایک عورت کا رحم اور محبت کرنے والا دل دھڑکتا ہے۔ اس کے بیٹے گوبر کے ساتھ ایک جوان بیوہ عورت جھنیا بھاگ کر آجاتی ہے، اور دھنیا یہ سب جانتے ہوئے کہ گاؤں والے دشمن ہو جائیں گے، زمانہ ہنسے گا۔ برادری ٹانٹ باہر کر دے گی، جھنیا کو اپنے گھر میں پناہ دیتی ہے۔ عورت ہونے کے ناطے اس نے عورت کے دکھ کو جانا اور دھنیا کی محبت کے سہارے ہوری نے بھی سماج کے تیروں کی چوٹ کھانے کے لیے سینہ تان لیا ورنہ ہوری میں اپنے بیٹے گوبر کو سماج کے عتاب سے بچانے کی ہمت نہیں تھی۔

دھنیا کا جھنیا سے یہ کہنا کہ "تو چل گھر میں بیٹھ میں دیکھ لوں گی کاکا اور ججیا کو۔ سنسار میں انھیں کا راج نہیں" ایک عظیم کسان عورت کا کردار ظاہر کرتا ہے جس کا تصور صرف پریم چند کا روشن دماغ ہی کرسکتا تھا۔

گاؤں والوں کے ڈر سے گوبر جھنیا کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ لیکن دھنیا کو بیٹے کی یہ بزدلی پسند نہیں، کہتی ہے "منہ چور کہیں کا جس کی بانہہ پکڑی اس سے نباہ کرنا چاہیے کہ منہ میں کالک پوت کر بھاگ جانا چاہیے۔" جھنیا کے معاملے میں دھنیا نے سماج کو چیلنج کیا۔ اس نے پیٹھ نہیں دکھائی اور وہ گاؤں کے پنڈت کو یہ منہ توڑ جواب دیتی ہے "ہم کو گھرانے کی مرجاد اتنی پیاری نہیں ہے مہراج کہ

اس کے پیچھے ایک جوا ہتھیا کر ڈالتے بیانہ ہی پر اس کی بات تو کر لے ہے میری بیٹی نے"
سماج کی تمام برائیوں کو خوب اچھی طرح سمجھتی ہے اور ان کو سہنے سے دریغ نہیں کرتی۔ کہتی ہے "بڑے آدمیوں کو اپنی ناک دوسروں کی ناک سے پیاری ہوگی ہمیں تو اپنی ناک اتنی پیاری نہیں۔"
گوبر کی لکھنؤ سے واپسی پر بجائے شکوہ شکایت کے بیٹے کو سینے سے لگا کے گویا اپنے ماں ہونے کا صلہ پا گئی۔ ماں کی بے لوث محبت نے اس کا دل غرور سے بھر دیا اور نور سے اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ گویا وہ رانی ہے، تمام جہاں پر اسی کی حکومت ہے اس کو اپنے ماں ہونے پر فخر تھا۔
دھنیا اتنی معاملہ فہم ہے کہ بیٹے سے اپنی غربت اور گھر کی حالت کو چھپاتی ہے تاکہ وہ ایک دم گھبرا نہ اٹھے اور رنجیدہ خاطر نہ ہو۔ بات کی پکی، بااعتبار دھنیا سے سارا گاؤں تھراتا ہے اس لیے نہیں کہ وہ ظالم ہے یا دولت مند ہے بلکہ اس لیے کہ دل کی صاف ایماندار اور خوددار ہے۔ گاؤں کی سیٹھانی ہوری کو قرضہ دیتے ہوئے کہتی ہے "تم تو ہیو پار کے اتنے سچے نہیں مگر دھنیا پہ مجھے بسواس ہے"
پریم چند کشمکش حیات، ہمت، وفاداری اور جذبۂ ایثار میں ایک دلکش حسن پیدا کرتے ہیں اور یہی ان کا آئیڈیلزم ہے۔
گئودان کا دوسرا اہم نسوانی کردار لکھنؤ کی مشہور لیڈی ڈاکٹر مس مالتی کا ہے، جو زندگی کو محض کھیل کود سمجھتی ہے۔ بہت شوخ، خود پسند، اور فیشن پرست ہے۔ ظاہرداری اتنی کہ محض ناز و ادا دکھا کر لوگوں کو احمق بنا دے۔ روح میں گہرائی کے بجائے سپاٹ تصنع ہے اور زندگی کے حقیقی جذبات بالکل مفقود ہیں۔
ناول کا یہ کردار دراصل اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہے ایک عورت میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں ان کے برعکس مس مالتی کو پیش کر کے دراصل اعلیٰ طبقے کی خواتین کی اصلاح مقصود ہے اور انھیں یہ احساس دلانا ہے کہ عورت کی زندگی کا مقصد اپنے جسمانی حسن پر غرور کرنا نہیں بلکہ ایمانداری، سچائی، محبت اور خلوص کے جذبات سے اپنے دل اور دماغ کو روشن رکھنا ہے۔ پریم چند کے نسوانی کردار عام طور سے عقل و فہم میں کم نہیں ہیں۔ وہ عورت کو ایک بلند مقام دیتے ہیں ان کے خیال میں عورت مرد کو پستی کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ عورت کی ہمدردی اور محبت کے سایے میں وہ آسمان سے چاند اور ستارے بھی توڑ کر لا سکتا ہے۔
پریم چند کی کردار نگاری میں فوٹو گرافی نہیں بلکہ مصوری ہوتی ہے چنانچہ وہی مس مالتی جو شروع میں ایک خود غرض اور مغرور لڑکی ہوتی ہے دیکھتے دیکھتے ایک مثالی کردار بن کر ابھرنے لگتی ہے اور وہ اپنے محب مسٹر مہتا سے آخر میں شادی کرنے سے صرف اس لیے انکار کر دیتی ہے کہ اسے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونا . . . روحانی ارتقا میں رکاوٹ معلوم ہوتا ہے۔
پریم چند اپنی فکری قوتوں سے مالتی کو آہستہ آہستہ زندگی کی ایک اعلیٰ قدر کے قریب لاتے ہیں اور وہ مہتا سے صاف لفظوں میں یہ کہہ دیتی ہے کہ "شادی کر لینے کے بعد ہماری روحیں ایک چھوٹے سے پنجرے میں بند ہو جائیں گی اور ہم لامحدود تک نہیں پہنچ پائیں"
وہ چاہتی ہے کہ مہتا اپنے علم کو، اپنی عقل کو اور اپنی بیدار انسانیت کو دنیا کے لیے وقف کر دے۔ جہاں بے انصافی اور . . . ضعیف الاعتقادی پھیلی ہوئی ہے اور اس تاریکی کو دور کرے۔
ایک ایسا ہی چونکا دینے والا کردار ہمیں ناول "پردۂ مجاز" کی ہیروئن منورما میں ملتا ہے۔ منورما کی سیرت نگاری میں پریم چند

کے روحانیت سے متعلق تصورات اپنے پورے عروج پر ہیں۔ قوم غلامی کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے جاگرتی کا جذبہ پھیل رہا ہے تعلیم یافتہ لڑکے اور لڑکیاں جانبازی سے میدانِ عمل میں اتر آئے ہیں۔ منورما اسی دور کی ایک تصویر ہے۔ منورما جگدیش پور کے دیوان کی اکلوتی لڑکی ہے۔ سادہ لوح ہے روشن خیال اس قدر کہ جگدیش پور کے راجہ کے ساتھ شادی ہو جانے کے بعد بھی اپنے استاد چکردھر کی قومی خدمات کو سراہتی ہے۔ حقیقتاً وہ چکردھر سے محبت کرتی ہے لیکن محلوں کی رانی بننا اس لیے پسند کرتی ہے کہ اپنے محبوب کی انقلابی سرگرمیوں کو مالی امداد پہنچا سکے۔ وہ ثروت کا لطف اٹھانے کے لیے راجہ کے محل میں نہیں گئی۔ چکردھر سے کہتی ہے کہ "میں نے محض آپ کی خدمت کے لیے یہ سونے کی زنجیر اپنے پاؤں میں ڈالی ہے۔"

منورما کے کردار کی بلندی تو دراصل چکردھر اور اہلیا سے مقابلہ پر نظر آتی ہے۔ اہلیا جب جگدیش پور کے راجہ کی کھوئی ہوئی بیٹی سکھدا ثابت ہوتی ہے تو راج کے عیش و عشرت میں پڑ کر اپنے شوہر چکردھر کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ اور چکردھر کے مزاج میں بھی اپنے کو راجہ کا داماد محسوس کر کے دولت کا نشہ سرایت کرنے لگتا ہے۔ لیکن منورما دولت کو ہمیشہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور چکردھر کو شاہراہِ زندگی پر چلنا سکھاتی ہے۔

منورما ایک آئیڈیل کریکٹر ہے۔ مساوات کی حامی ہے۔ دولت پاکر شان نہیں کرتی۔ اس کی نوجوانی کے یہ خیالات کہ جگدیش پور کی رانی بن کر وہ اپنے استاد اور دل کے راجہ چکردھر کو نہیں بھولے گی، اس کی سیرت کی کتنی پختگی ظاہر کرتے ہیں۔ اس کو کتنا مستقل مزاج اور ثابت قدم دکھاتے ہیں۔ وہ آگرے میں اہلیا کے ساتھ چکردھر کے شادی کر لینے پر عام عورتوں کی طرح حسد نہیں کرتی اور نہ مغموم اور ملول دکھائی دیتی ہے۔ بلکہ چکردھر اور اہلیا کے استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن جاتی ہے۔

پریم چند کی کردار نگاری کا یہی وہ روشن پہلو ہے جو انھیں تعمیری ادب کا معمار بھی ظاہر کرتا ہے۔ رعایا پر راجہ کے کارندے ظلم کرتے ہیں تو منورما اپنے والد کو بھی دوش دینے سے باز نہیں آتی اور بڑی بے باکی سے کہتی ہے "جواں مرد تو جب جانوں جب آپ زورداروں سے ہاتھ ملائیں، غریبوں کو ستاتے ہوئے ہیں اسے حکومت نہیں کہتے۔"

منورما اور چکردھر کی روحانی محبت اس وقت پورے کلائمکس پر دکھائی دیتی ہے جب کہانی کے آخر میں دونوں راجہ وشال سنگھ کے مر جانے کے بعد ایک دوسرے کے ہوتے ہوئے بھی دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور چکردھر کی طرف سے منورما کو دیئے ہوئے پنجرے دونوں کے درمیان "پردہ مجاز" بن جاتے ہیں۔ اور ان پنجروں کو دیکھ کر منورما کی آنکھیں اپنے محبوب کی یاد میں پرنم ہو جاتی ہیں۔

منورما "پردہ مجاز" کا ایک مثالی کردار ہے جسے پیش کر کے پریم چند نے ملک کی تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقہ کی خواتین کو جھوٹی شان و شوکت سے دور رہنے اور دولت کو صرف عیش و عشرت نہ بنانے کی تلقین کی ہے۔

پریم چند چاہتے ہیں کہ ایسی عورتیں منورما کی طرح باعمل ہو کر ملک کی تعمیر اور آزادی میں حصہ لیں۔ اس سلسلہ میں واضح طور پر انھوں نے کہا کہ جب سماج انقلابی دور سے گزر رہا ہو اور بہتر سماج کی تعمیر کے لیے جدوجہد جاری ہو تو ادب کا کام جانبداری کے ساتھ لوگوں کو اس تحریک کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے اور صحیح ادب وہی ہوتا ہے جس میں تنقیدِ حیات کے ساتھ ترغیب

عمل بھی ہو۔

ماننا پڑے گا کہ اس مقصد کے لیے پریم چند نے اپنے اکثر ناولوں کے نسوانی کرداروں سے بہت اہم کام لیا ہے کیوں کہ وہ عورت کو معاشرتی زندگی کی ایک زبردست قوت تصور کرتے ہیں۔

اب دو جلدوں میں ساڑھے آٹھ سو صفحوں کے ناول "چوگان ہستی" کی صوفیہ، اندو اور رانی جاہنوی کو لیجیے۔

صوفیہ اس ناول کی ہیروئن ایک بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت عیسائی لڑکی ہے وہ فطرتاً رحمدل ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو حق اور انصاف کے راستے پر چلاتا ہے۔

پانڈے پور کے اندھے بھکاری سورداس کو اس کی حقیقت بیں آنکھیں فوراً ہی تاڑ لیتی ہیں اور وہ سورداس کو بھیک منگا سمجھنے کے بجائے اس کی دل سے عزت کرنے لگتی ہے۔

اس نے اعلیٰ تعلیم پائی ہے تعلیم و تربیت نے صوفیہ کے ضمیر کو روشن اور عقل و فہم کو اور تیز کر دیا ہے۔

مذہب اور فلسفے سے اسے خاص لگاؤ ہے۔ گو کہ مذہبی ماحول میں وہ اپنے آپ کو اندھی تقلید کے حوالے نہیں کرتی وہاں بھی دلائل سے وہ اپنے دل و دماغ کو مطمئن کرنا چاہتی ہے۔ وہ ضمیر کو اپنی زندگی میں سب سے اونچا درجہ دیتی ہے اور ضمیر کو حکم خدا سمجھتی ہے۔ وہی ضمیر جس کا گلا گھونٹ کر اکثر لوگ دنیاوی اور دینی معاملات کا جائزہ لیتے ہیں۔ زاہد بے عمل سے وہ نفرت کرتی ہے اور کہتی ہے مذہب کے معاملے میں قول و فعل یکساں ہونا چاہیے۔

صوفیہ کنور بھرت سنگھ کے بیٹے ونے کمار سے محبت کرتی ہے، اس لیے کہ ونے کی زندگی میں تیاگ ہے ایثار ہے۔ ایک راجکمار ہوتے ہوئے بھی نہایت سادگی سے زندگی بسر کرتا ہے اور عیش و عشرت کے بجائے مادر وطن کی خدمت کے لیے ہر وقت سر سے کفن باندھے جانثاری کے لیے تیار ہے۔

یہ وہ دور ہے جب ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور ملک میں آزادی کے جذبے کی لہر دوڑ چکی ہے جگہ جگہ انجمنیں اور سمیتیاں قائم ہیں۔

غیر ملکی حکام کو اس جاگرتی کا احساس ہے ایسی سمیتیوں اور ان کے رہنماؤں پر طرح طرح کی زیادتیاں کی جاتی ہیں۔ غرض کہ ظلم و ستم کا بازار گرم ہے۔

صوفیہ حق و انصاف کے لیے اپنے باپ کی ناجائز اسکیموں کی بھی پروا نہیں کرتی اور سورداس کی زمین کو جس کو اس کے باپ مسٹر جان سیوک نے زبردستی سگریٹ کا کارخانہ قائم کرنے کے لیے خریدا ہے، واپس دلاتی ہے۔

صوفیہ ونے کے ساتھ اپنی محبت میں پختہ اور ثابت قدم ہے۔ گو اپنی ماں کی خواہش پر ایک بڑے افسر مسٹر کلارک سے شادی کرنے کے لیے اس کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرتی ہے، لیکن حقیقتاً وہ مسٹر کلارک کی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر ونے کی رہائی کی کوشش کرتی ہے، جو ایک سازش کے تحت گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

صوفیہ ثروت پسند نہیں ہے وہ مسٹر کلارک کے عہدے اور دولت سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوتی، بلکہ اسے اپنے

ملک اور قوم کی بھلائی کا ایک آلہ بنانا چاہتی ہے۔

وطن پرست صوفیہ غیر ملکی سرکار کا ظلم و ستم دیکھ کر باغیوں کے گروہ میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ سرفروش بن کر حکام کے خلاف مسلسل جنگ کرتی ہے۔

اور اب اودے پور کی ریاست میں اسی کا بول بالا ہے۔

ونے کی ماں رانی جاہنوی جو صوفیہ سے نفرت کرتی تھیں وہ بھی اب اس کی دلیری، بہادری اور تیاگ سے خوش ہو کر اس کو معاف کر دیتی ہیں اور اس کو قابل احترام سمجھتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس سے ونے کی شادی کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہیں لیکن اس آزادی کی لڑائی میں ونے مارا جاتا ہے

صوفیہ محبت کو فرض پر کبھی غالب نہیں آنے دیتی یہی اس کی "روحانیت" ہے، اور یہی اس کا تیاگ ہے۔ ایک عورت کا احساس ذمہ داری اور جذبہ حب الوطنی کو پریم چند نے صوفیہ کے کردار میں پیش کر کے ایک اور ایسی نظیر قائم کی جو ملک کی موجودہ خواتین کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہے۔

یہ ہیں پریم چند کے ناولوں کے چند نسوانی کردار جو کہانی کے روپ میں بھی پڑھنے والے کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔ اور ہندوستان کی پرانی روایتوں میں دبی ہوئی عورت کو سماجی، سیاسی اور ازدواجی زندگی کا ایک اہم ستون ثابت کرتے ہیں۔

سلام مچھلی شہری

ایک اور پوجا

— چلو اے آفتابِ نو کی کرنو! تم بھی سو جاؤ
کھلی رکھی ہیں میں نے کھڑکیاں اپنے خیالوں کی

گزشتہ آفتابوں کی شعاعوں کو خبر ہوگی
کہ میں نے کس لگن سے روشنی کے گیت گائے ہیں
کبھی پھولوں کبھی ہونٹوں کبھی شعلوں کے بربط پر
مچلتی مسکراتی زندگی کے گیت گائے ہیں

گزشتہ دور کی صبحوں کے سورج بھی مبارک تھے
پرستش روشنی کی پہلے بھی فنکار نے کی تھی
عروسِ خوابِ انساں کی تجلی بخش آرائش
مجھ ایسے شاعروں کی فکرِ گوہر بار نے کی تھی

چلو اے آفتابِ نو کی کرنو! تم بھی آ جانا
مگر پہلی شعاعوں کی طرح آ کر نہ کھو جانا
جب اتنے شوق سے آکاش کے زینے سے اتری ہو
تو پھر دھرتی کی ہر اُمید سے منسوب ہو جانا

وگرنہ آج کا انسان خود دھرتی کے سینے سے
تمہاری عظمتیں ٹھکرا کے وہ سورج اگائے گا

کہ جس کی مسکراتی، لہلہاتی، نرم کرنوں میں
تمہارا آسماں بھی چال اپنی بھول جائے گا

پرستش کرتے کرتے آفتابوں ماہتابوں کی
ہوا جاتا ہے اپنا ذوقِ سجدہ بھی غلامانہ
کہیں ایسا نہ ہو پوجا کی بندش ختم کر ڈالے
کہ یہ سجدہ گزار انسان، دیوانہ تو دیوانہ

میں شاعر ہوں مجھے محبوب ہیں وہ دائمی قدریں
ملی ہیں نور میں جن کے مرے افکار کی لہریں
تم ہی اے آفتابِ نو کی کرنو لاج رکھ لینا
بڑی آئی ہیں اک دریائے آتش بار کی لہریں

کئی صدیوں سے ہم نازک تریں خوابوں میں کھوئے ہیں
ہمارے خواب کی کوئی حسین تعبیر دے دینا
بناتے آئے ہیں جس دورِ نو کے دلنشیں خاکے
مکمل کر کے ان خاکوں کو اک تصویر دے دینا

کئی صبحوں کا مارا ہوں مگر کتنی عقیدت سے
میں پوجا کر رہا ہوں آج کے تازہ اجالوں کی!

قاضی سلیم

نارس

میری روح نئی نئی نظموں میں جنم لیتی اور ہر تکمیل پہ میری ہمت پلٹ آتی ہے
ایک تمناؤں سے بھری میری شکتی ایسے روپ کی کھوج میں ہے
جس میں سب کچھ میرا ہو
جو میرے ہر اک کرب کو سہن کرے
اک ایسا روپ
جو کون و مکاں کی وسعت کو سمیٹے
چاند ستاروں سے پاتال تلک بہتا اپنی نجات کو پہنچے
آنے والے یگوں میں میری دھڑکن شامل ہو

لیکن جب بھی عدم کے کوہِ گراں کو چیر کے کوئی سوتا پھوٹا
میں نے دیکھا
اس کو ایسے پودے کا ہی روپ ملا
جس کی جڑیں دھرتی میں دفن ہیں
وسعت اس کی شاخوں تک محدود ہے
یا پھر ایسا درندہ ابھرا
جس کے گوشت میں خود ہی اس کے دانت گڑے ہیں
کبھی کبھی انسانی روپ ملا بھی تو اک ایسے ضدی بے بس بچے کا
جو اپنے خوابوں کے کھلونے توڑ رہا ہے
یہ سوچ کے جھنجلائے کیوں یہ کھلونے چلتے چلتے رک جاتے ہیں
کتنی بار وہ کوک بھرے گا
آخر کتنی بار میں کوک بھروں گا
زنگ آلود کمانوں میں اب تو گھماؤ بھی کم ہے
کہتے ہیں جنم جنم کا یہ پھیرا اپنے اپنے کرموں کا پھل ہے

شور مینائی

کفر و ایماں

ہو فکرِ فلاطوں کہ تصوّف کہ خودی ہو
اک فیل پہ یہ تبصرۂ بے بصراں ہے
کیا سیلِ حوادث کسی آئیں کا ہے پابند؟
جس سمت نظر کیجئے اس سمت رواں ہے
اک رخ پہ نہیں زیست کے دریا کا بہاؤ
اس بات کی شاہد مری چشمِ نگراں ہے

صرف ایک حقیقت کے مظاہر ہیں بہت سے
یہ حکمتِ کم فہم کا ہے دعوۂ بے جا
کم ظرفیٔ احساس کو پروازِ تفکر
مل جائے تو کر دیتی ہے اک فلسفہ برپا
جو اپنے پسندیدہ حقائق ہی کو دیکھے
وہ فلسفہ کیا اور وہ اندازِ نظر کیا

ہے لغزشِ پا کو نہ خبر نقشِ قدم کو
جاتے ہیں کہاں اور ہم آتے ہیں کدھر سے
عریاں نظر آئے گا تجھے جلوۂ ہستی
دیکھو آنکھ سے، مت دیکھ تو اندازِ نظر سے

پھولوں کا وہ اندازِ تبسّم ہے بدستور
بلبل نہ چمن میں ہو صبا آئے نہ آئے
اس راہ پہ بھی خارِ لبِ صد شوق کھڑے ہیں
جس رہ پہ کوئی آبلہ پا آئے نہ آئے
دنیا نہیں محتاج کسی حسنِ نظر کی
جلوے ہیں کوئی جلوہ نما آئے نہ آئے

انسان کی ہستی ہے بس احساس و نظر سے
یہ وسعتِ احساس حیاتِ ابدی ہے
گر ذوقِ نظر تم میں ہو تم مر نہیں سکتے
بے ذوقِ تماشا کبھی تم جی نہیں سکتے

یہ رازِ ازل ہے نہ تصوف نہ خودی ہے
میں معتقدِ کاشفِ انوارِ نظر ہوں
کیا تم سے کہوں ہے مرا اندازِ نظر کیا
ہوں اہلِ نظر منکرِ اندازِ نظر ہوں
حافظ ہوں نہ خیام، نہ اقبال نہ رومی
بس اک دلِ حساس ہوں اک دیدۂ تر ہوں

سردار الہام

عصرِ حاضر

کتنی صدیاں کھا چکی تہذیبِ انسانی مگر
کاروانِ ارتقا کی سست گامی ہے وہی
ساقیٔ نامہرباں، تقدیرِ میخانہ رہا
میکشانِ زندگی کی تشنہ کامی ہے وہی
دولتِ تہذیبِ عصرِ نو سمٹتی ہی گئی
نوجوانی کے لیے یہ وسعتیں محدود ہیں
وقت گزرا، زار و کسریٰ کے زمانے لد گئے
اب پجاری بھی نئے اور نت نئے معبود ہیں
جراتِ پرواز کو پابند کرنے کے لیے
مصلحت ہر گام پر اک دام بنتی ہی رہی
کتنی نو آغاز کلیوں کو کچل ڈالا مگر
فکرِ انساں تربتوں کے پھول چنتی ہی رہی
اضطرابِ تازہ تمہیدِ شکیبائی نہیں
چند سانسیں فیضِ اعجازِ مسیحائی نہیں

امیق عارفی

بن باس

تم کو تھا اس بات کا دعویٰ
وقت کی تم بھی "سیتا" ہو
لیکن آج تو "راون" نے ہی
جیت لیا ہے من کا دیس
"رام" اکیلا گھوم رہا ہے
نگر نگر ——— پردیس

نجات

ماضی کا آئینہ میں نے توڑ دیا ہے
ماضی کا آئینہ میں نے وقت کے پتھر سے ٹکرا کر توڑ دیا ہے
اس کے تیز نکیلے ٹکڑے
چُن کر میں نے
یادوں کے اس گاؤں کے باہر
آنسو کے تالاب میں جا کر پھینک دیئے ہیں
اب یہ تیز نکیلے ٹکڑے
میرے مستقبل کے تلوؤں میں نہ چبھیں گے

چندر پرکاش شاد

ڈھارس

گو غموں کا جوش ہے
دل بقید ہوش ہے
شب بہت خموش ہے
آ کوئی کریں گے بات
اے رفیقۂ حیات!

دیکھ تو ملول ہے
رنج تیری بھول ہے
تو تو میرا پھول ہے
یاد کر نہ سانحات
اے رفیقۂ حیات!

یہ وشال سرزمیں
گرچہ ہے بہت حسیں
اس پہ اپنا کچھ نہیں
اپنا ہے تو اپنی ذات
اے رفیقۂ حیات!

جیت ہے نہ مات ہے
سیدھی سادھی بات ہے
تو بھی بے ثبات ہے
اور میں بھی بے ثبات
اے رفیقۂ حیات!

ہے بلند بے گماں
عزم زیست کا نشاں
دل نشیں ہے کہکشاں
دیکھ وقت کی برات
اے رفیقۂ حیات!

آ مرے قریب آ
یوں نہ وقت کو گنوا
میرے دل میں ڈوب جا
تو ہے میری کائنات
اے رفیقۂ حیات!!

سکندر علی وجد

یہ رنج، نہ یہ جور و ستم یاد رہیں گے
خوشیوں نے جو بخشے ہیں وہ غم یاد رہیں گے

یادوں سے چراغاں ہے شبستانِ سخن میں
اے حسن، ترے نقشِ قدم یاد رہیں گے

طوفانِ جوانی کی مچلتی ہوئی موجیں
پیکر کے چھلکتے ہوئے خم یاد رہیں گے

ممکن ہی نہیں نقشِ وفا دل سے مٹانا
اے بھولنے والے، تجھے ہم یاد رہیں گے

اس منزلِ پرشور سے خاموش گزر جا
ہے جن کے یہاں دھوم وہ کم یاد رہیں گے

بشر نواز

یہ حسن ہے جھرنوں میں نہ ہے باد چمن میں
جس حسن سے ہے چاندر واں نیل گگن میں

اے کاش کبھی قید بھی ہوتا مرے فن میں
وہ نغمۂ دلکش کہ ہے آوارہ پون میں

اٹھ کر تری محفل سے عجب حال ہوا ہے
دل اپنا بہلتا ہے نہ بستی میں نہ بن میں

اے نکہت آوارہ ذرا تو ہی بتا نا
ہے تازگی پھولوں میں کہ اس شوخ کے تن میں

اک حسن مجسم کا وہ پیراہن رنگیں
کھل جائے دھنک جیسے کسی چندر کرن میں

چپ چاپ کھڑے ہم بھی رہیں۔ دیکھے ہے تجھے
تصویر سی پھرتی تھی کوئی ان کے نین میں

اس دور میں آساں تو نہ تھی ایسی غزل بھی
کچھ فن ابھی زندہ ہے مگر ملک دکن میں

برہمی سے نہ ان کی خوشی سے ملے
رنگ سارے ہمیں زندگی سے ملے

ہم خود اپنے سے یوں بھی ملے بار ہا
اجنبی جس طرح اجنبی سے ملے

مدتوں جن سے ملنے کا ارماں رہا
ہائے وہ لوگ کیا بے رخی سے ملے

اس سے بچنا بھی چاہیں تو جائیں کہاں
سارے رستے اسی کی گلی سے ملے

کس کو ٹھکرائیں کس کو لگائیں گلے
سب ہی غم تحفتاً زندگی سے ملے

ابن احمد تاب

صبح کی آس میں یوں رات بسر ہوتی ہے
ایک اک ڈوبتے تارے پہ نظر ہوتی ہے

رائیگاں جائے گا کس طرح چراغوں کا لہو
اب تو آثار یہ کہتے ہیں سحر ہوتی ہے

دل سے مضبوط رہے درد کا رشتہ یارب
ورنہ پھر زیست کی تہمت مرے سر ہوتی ہے

جن کی عمریں کٹیں راتوں کا قصیدہ لکھتے
ان کے ناموں سے ہی منسوب سحر ہوتی ہے

دل کے زخموں کو تو دیکھا نہ کسی نے اب تک
مسکراتا ہوں تو دنیا کو خبر ہوتی ہے

باتِ منزل کی سمجھ میں نہیں آئی اب تک
تابؔ منزل بھی تو اک راہ گزر ہوتی ہے

دیکھ اتنا تو تری راہ میں برباد ہوں میں
جو بھی کرتا ہے تجھے یاد اسے یاد ہوں میں

مسکراتا ہوں بہ اندازِ تصنع ہی سہی
کم سے کم دیکھنے والے تو کہیں شاد ہوں میں

غم نہیں تو نے اگر ساتھ میرا چھوڑ دیا
خوش ہوں اس پر کہ تری بھولی ہوئی یاد ہوں میں

لوگ ناحق مجھے نغموں کا مسیحا سمجھے
کیسے سمجھاؤں کہ فریاد ہی فریاد ہوں میں

اور بڑھ جاتی ہیں زنجیر کی کڑیاں یارب
وہم نے جب بھی کہا مجھ سے کہ آزاد ہوں میں

دیکھ کر مجھ کو ہر اک جام چھلک جاتا ہے
میں وہ میکش ہوں کہ میخانے کی بنیاد ہوں میں

جوہر میر

میری نیندیں مرے آرام کہاں سوتے ہیں
جن کی قسمت میں ہوں آلام کہاں سوتے ہیں

نیند آجائے گی ہم کو ہی کہیں رات گئے
جاگنے والے سرِ شام کہاں سوتے ہیں

ہم نے پھر اوڑھی ہے بے داغ وفاؤں کی ردا
اے زمانے ترے دشنام کہاں سوتے ہیں

جو کھلی رات کے سینے پہ نہ سوئے برسوں
وہ سیہ بخت تہہ دام کہاں سوتے ہیں

اپنے گھر میں ہیں تسلی کے ہزاروں پہلو
اجنبی شہر میں بدنام کہاں سوتے ہیں

لوریاں چپکے ہمیں گا کے سلانے والو
ہم اگر سوئیں در و بام کہاں سوتے ہیں

جاگتے درد کو اب کون سلائے جوہر
زخم بن جائیں جو الزام کہاں سوتے ہیں

سید حرمت الاکرام

دیارِ عقل میں پہنچے جو تیرے سودائی
ہوئی کچھ اور بھی رسوا جنوں کی دانائی
نکل کے محفلِ جاناں سے یہ ہوا محسوس
سمٹ کے رہ گئی کون و مکاں کی پہنائی
مزاجِ عشق تلون شعار بھی تو نہیں
وہ پوچھتے ہیں کہ ہونٹوں پہ کیوں ہنسی آئی
تری وفا پہ بھی گزرا ہے شک بہ اوقات
یہ پیار کی ہے کہ اس دور کی فسوں زائی
بلندیوں سے جو گرتے تو کوئی بات بھی تھی
ہمیں ڈبو گئی اپنے دلوں کی گہرائی
زبانیں جتنی فسانے بھی اتنے عنواں ایک
کہاں ہر ایک کو حاصل نشاطِ رسوائی
کہو یہ دل سے ہے جلنا تو شمع بن کے جلے
حیات لیتی ہے تاریکیوں میں انگڑائی
غمِ جہاں سے الجھنے لگا غمِ جاناں
کہاں گئی دلِ برباد کی توانائی
میں کتنی دور رہوں اپنے وجود سے حرمت
زمانہ گزرا خود اپنی خبر نہیں آئی

حمید الماس

ہم سے کبھی کبھی تو ملو آدمی کی طرح
رہتے ہو کیوں وطن میں کسی اجنبی کی طرح

کچھ پوچھئے نہ ان کے تعلق سے کیا کہیں
پہلو بہ پہلو جو تھے کبھی زندگی کی طرح

ہم روشنیٔ طبع تو لائے تھے مانگ کر
لیکن جہاں میں رہ نہ سکے روشنی کی طرح

کمزور کس قدر ہے زمانے کا حافظہ
دو دن میں ہم کو بھول گیا اجنبی کی طرح

چہرے جو ماہتاب سے اترے تھے خواب میں
نکلی سحر تو ڈوب گئے چاندنی کی طرح

خالد ندیم

ایک اک کر کے اترتے ہیں ستارے گھر میں
رت جگا رہتا ہے ہر روز ہمارے گھر میں

چشمِ حیراں میں نہ چھوڑا کوئی آنسو کوئی خواب!
بو دیے ہم نے دہکتے ہوئے تارے گھر میں

کوئی پوچھے تو بتائیں کہ جہنم کیا ہے؟
ہم نے اڑتے ہوئے دیکھے ہیں شرارے گھر میں

تم کہاں تھے کہ تمہیں ڈھونڈ رہی تھیں آنکھیں
تھا چراغوں کا سماں رات ہمارے گھر میں

کیا عجب شے تھی کہ آئی تھی قیامت بن کر
رینگتے پھرتے ہیں دلدوز نظارے گھر میں

ذکاءالدین شایاں

قدم اُٹھے تو ہیں پھر آج دار کی جانب
کوئی پکار نہ لے کوئے یار کی جانب

نسیم و گُل میں ذرا گفتگو تو ہونے دو
ابھی نگاہ نہ پھیرو بہار کی جانب

کہاں تک ایسے بھٹکتے پھروگے دیوانو!
قدم کو موڑ بھی دو اُس دیار کی جانب

ذرا سے شکوۂ غم پر تری نظر، برسوں
جھکی رہی ہے دلِ سوگوار کی جانب

کسی نے دوش پہ زلفِ سیاہ لہرا دی
نظر اٹھی ہی تھی ابرِ بہار کی جانب

ہم اُس جمالِ سحر رنگ سے سجا کر غم
چلے ہیں آج شبِ انتظار کی جانب

تراش لیں گے شبِ غم کے واسطے مہ و مہر
تُم آ تو جاؤ دلِ داغدار کی جانب

کیف احمد صدیقی

آتشِ گُل میں پیہم سلگتی ہوئی نکہت مضطرب آہ بھرتی رہی
اور موجِ نسیمِ سحر فطرتاً شعلۂ رنگ سے چھیڑ کرتی رہی

گو تری چلچلاتی ہوئی دھوپ میں میرے احساس کا پھول مرجھا گیا
لیکن اے آفتابِ غمِ زندگی تیرے چہرے کی رنگت اترتی رہی

اہلِ بزمِ جہاں گو ہر اک گام پر آرزوؤں کی بیڑی پنہاتے رہے
پھر بھی مجبور رقاصۂ زندگی آخری سانس تک رقص کرتی رہی

اپنے قدموں کی آواز سے چونکتا جیسے شہرِ خموشاں سے گزرے کوئی
آج کی رات یوں دل کے شمشان میں تیری یاد اپنی آہٹ سے ڈرتی رہی

کیفؔ میرے تخیّل کی رعنائیاں ذہن کی سطح سے ہٹ گئی تھیں مگر
جانے کس کے خیالوں کی قوسِ قزح میرے اشعار میں رنگ بھرتی رہی

زاہد کمال

کاش بدلے ہوئے دنیا کے نہ تیور ہوتے
گُل افکار مرے اور معطر ہوتے

واقفِ رازِ غمِ زیست نہ ہوتا میں اگر
میرے آگے بھی وہی ہجر کے دفتر ہوتے

خودکشی ڈر کے زمانے سے جو ہم کر لیتے
تذکرے اپنی محبت کے بھی گھر گھر ہوتے

کیا ہی آرام سے کٹ جاتیں ہماری راتیں
پُرتکلّم جو حسیں خوابوں کے پیکر ہوتے

بک گئے ہوتے اگر وقت کے ہاتھوں زاہدؔ
ہم بھی دنیا کی نگاہوں میں تونگر ہوتے

سکندر محسن

کوئی گیت گا رہا ہے سرِ شاخسار اب بھی
کہ نہیں ہے دل پہ اپنے مجھے اختیار اب بھی

کوئی چارہ ساز آئے کوئی دلنواز آئے
وہی کیفیت ہے دل کی میرے غمگسار اب بھی

نئی زندگی ملی ہے نئے حوصلے ملے ہیں
وہی ہم نوا مگر ہے غمِ روزگار اب بھی

نئی صبحِ صبحِ غم ہے نئی شام شامِ ہجراں
وہی انتشار اب بھی، وہی انتظار اب بھی

کہاں رنگ بھر سکا ہے، کوئی حسن کار اس میں
وہی نقشِ اولیں ہے ترا شاہکار اب بھی

عادل منصوری

دوہے

ملّاں جی کی بات ہمارے دھیاں میں کیسے آئے
پگلی خود سسرال نہ جائے سیانی کو سمجھائے

❁

اپنی آنکھیں اپنا چہرہ اپنا سینہ دیکھو
بہت جمائی آتی ہے ری جا آئینہ دیکھو

❁

روز یہ دودھ کی گاگر پھوڑے ماکھن لے کر بھاگے
نٹ کھٹ کرشن کنھیا پھر بھی من کو پیارا لاگے

❁

رم جھم رم جھم گرتا پانی من میں آگ لگائے
گوری تجھ بن یہ متوالا ساون کورا جائے

❁

قدم قدم پر بل کی چھنی، قدم قدم پر نار
شہر احمد آباد میں عادل کم ہوں گے بیکار

❁

ہونٹ رسیلے نین نشیلے چال قیامت ڈھائے
مستی بھری جوانی تیری ہم سے نہ دیکھی جائے

❁

آشاؤں سے دامن بھر لے بہت چلی ہے رات
من ہی من میں رہ جائے گی ورنہ من کی بات

❁

ہردے کا کشکول اٹھائے درد بھرے پہلو میں
ہم جوگی کا سوانگ رچا کر نگری نگری گھومیں

❁

سست، نکمے، آوارہ، بیکار، ترنگی، کاہل
خود کما نیا ئے تو کر نہیں سکتے نام رکھا ہے عادل

جوگندر پال

خالقِ رنگ و بو

(۱)

شاعر نے اپنی ایک نظم سنائی۔
پھر دوسری،
پھر تیسری،
پھر ایک اور،
اور پھر کہنے لگا۔
"اب ایک اور نظم سنیئے، اسلوب کا بڑا انوکھا تجربہ ہے"
اور وہ ذرا خاموش ہو کر سوچتا ہوا نظر آنے لگا۔
"واہ! واقعی آپ کا یہ شعری تجربہ بہترین ہے۔"
"کون سا تجربہ؟" شاعر اپنی نظم کا پہلا شعر بولتا بولتا رک گیا۔
"آپ کے شعر کہنے کا یہ ڈھنگ، بہ زبانِ خاموشی!"

(۲)

"شعرا کی تعریف؟"
"غزل کے اشعار، بظاہر یکجا، بباطن لاتعلق۔ مطلع سے مقطع تک جا پہنچیے، محال ہے کوئی ایک بھی اپنے کسی بھائی سے ہمدردی کا دم بھرتا ہوا نظر آجائے۔"

(۳)

"جاوید"
"ہاں" شاعر کے ساکت ہونٹ آخر اپنی محبوبہ کو متوجہ پاکر کسی شعر کے دو بڑے صحیح مصرعوں کے مانند علم عروض کے سانچے میں ڈھل ڈھل کر حرکت پذیر ہوئے۔
"میں تم سے اس لیے خائف رہتی ہوں کہ تم کبھی نثر میں بات نہیں کرتے۔"

(۴)

نصف شب سے بھی ایک گھنٹہ اوپر ہو لیا تھا، لیکن مشاعرہ بدستور جاری تھا۔
ایک شاعر نے اپنی بیاض کھولی۔
" حضرات، ایک نہایت عمدہ لوری لکھی ہے — سنیئے "
لیکن سامعین کی پہلی قطار میں ایک کرسی پر کسی خوابیدہ بچے کو دیکھ کر وہ ذرا ٹھہر گیا۔
" صاحب، اس بچے کو جگائیے — جگائیے نا، میری لوری کے چمتکار سے جھٹ سو جائے گا۔"

(۵)

" سنا ہے؟ ایک بچہ پیدا ہوا ہے جس کا منہ اس کی تالو میں ہے، اور منہ کی جگہ بالوں کا ایک بڑا گچھا ہے، کان ہی نہیں اور ٹھوڑی پر —"
" میرا خیال ہے خدا بھی ہمارے شعرا کی طرح نقادوں سے مرعوب ہو کر تخلیق میں نت نئے تجربوں پر اتر آیا ہے

(۶)

ایک بزرگ افسانہ نگار اپنا ڈیڑھ گھنٹے کا رومانی افسانہ سنا رہا تھا۔
کرشن چندر نے جماہی لے کر اپنے ساتھی کے کان میں کہا۔
" سالا ڈیڑھ گھنٹے کا رومان تو اصل زندگی میں بھی کرنا پڑ جائے تو آدمی بور ہو جاتا ہے۔"

(۷)

" میں تخلیق کار ہوں، خالق ہوں، خدا سے کم نہیں ہوں — تمھاری جیب میں ایک چونی ہوگی؟ لاؤ اکنی ہی کافی ہے! —"

(۸)

مشاعرہ میں شعرا حضرات کو داد دیتے دیتے اُسے اونگھ آ گئی۔
" بہت اچھے — اچھے!" اچانک جاگ کر وہ بڑبڑایا۔
" میں شاعر نہیں ہوں مولانا —" مشاعرہ ختم ہو چکا تھا اور اس کے سامنے شریف چمار ایستادہ تھا۔
" محض چمار ہوں — چھ ماہ سے آپ میری محنت کے جوتے پہن رہے ہیں پر ابھی تک پھوٹی کوڑی بھی ادا نہیں کی۔ آپ کو شرم —"
ایک شاعر دروازے کی جانب جاتا جاتا ٹھہر گیا — " یہ آپ کی خوش قسمتی ہے مولانا، کہ آپ محض شاعر نہیں چمار ہیں، ورنہ چھ ماہ تو کیا، اس خود افشادی سے آپ عمر بھر اپنی محنت کا صلہ طلب نہ کر پاتے۔"

(۹)

اپنی کہانی سنا کر کہانی کار نے کسرِ نفسی سے کہا۔

"اتنی اچھی تو نہیں بہر حال۔"

"آپ کی تخلیق تو بری ہو سکتی ہے میاں، کہ آپ بہر حال خاکی ہیں، پر آپ کو اپنے خالق کی فہانت پر شک کرنے کا اختیار نہیں۔"



خدیجہ ہاشمی

دیوداسی

شمو اور میں تھکے تھکے بوجھل قدموں سے بوجھل ذہنوں سے ہاسٹل میں داخل ہوئے تو ساڑھے پانچ ہو چکے تھے۔

ابھی ہم دونوں کمرے تک پہنچے بھی نہ تھے کہ نجمہ نے آواز دی ——— "شمیم "

"بکو مائی ڈیر" شمیم سے پہلے میں چلائی۔

"اس سے ملنے کوئی لاٹ صاحب آئے ہیں" اس نے شمیم کی جانب اشارہ کیا۔

"کیا" شمیم کے ہاتھ سے کتابیں گرتے گرتے بچیں۔

"کون لاٹ صاحب ہیں۔ کب آئے ہیں۔ ذرا تفصیل بولو نا" میں نے بات آگے بڑھائی۔

"ارے بھئی مجھے پتہ نہیں ——— بس اتنا معلوم ہے کہ کوئی مس شمیم فاروق احمد سے ملنے تشریف لائے ہیں۔ بڑی دیر سے آنکھوں میں دیدار کی دنیا بسائے منتظر ہیں ——— چلو اب جاؤ"

پھر میں اور شمو اسی طرح کتابیں سنبھالے، بکھرے بالوں اور دھول میں اٹے چہروں سے باہر چلے آئے۔ پردہ ہٹایا وِٹینگ روم میں جھانکا!! تو سچ مچ ایک سانولے سلونے دراز قد لاٹ صاحب کو بڑی بے چینی کے عالم میں ٹہلتے پایا۔ اضطراب سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ بیچارے انتظار بڑی بے چینی سے کر رہے ہیں۔

شمو نے انھیں دیکھا تو جیسے کرنٹ لگ گیا ——— کتابیں میرے ہاتھوں میں پھینک ایسی تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوئی کہ جیسے برسوں بعد ملن ہوا ہو، اپنے خوابوں کے شہزادے کا۔ اور میں کتابیں سنبھالے کمرے میں چلی آئی۔

— ⁖ ⁖ ⁖ —

شمیم اور میں ہاسٹل میں روم میٹ، کالج میں کلاس میٹ اور ہم خیالات میٹ بھی تھے۔ ہماری دوستی کی اصل بنیاد ہماری بے پناہ محبت کا راز بھی یہی تھا۔ وہ بڑی سادہ دل اور پُرخلوص تھی ——— کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بھولی بھالی ——— اور اکثر اس کا بھولپن، اس کی سادہ دلی اسے لے ڈوبتی ——— بعض وقت اس کی ان بھولی باتوں پر دنیا سے نرالی حرکتوں کی

صبا

غصہ آنے لگتا — میں ہمیشہ سمجھاتی کہ گڈی جی تم اپنی ان حماقتوں سے، بھولی اداؤں سے باز نہ آؤ گی تو دیکھ لینا ایک دن سر پکڑ کر اپنا سب کچھ گنوا کر رونے لگو گی —— اور وہ احمق ہنس کر ٹال جاتی — ! اس کے دل میں ایک سجے سجائے خوبصورت گھر کی چاہ کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کبھی پکنک میں کسی پر فضا شاداب کنج میں ہم لوگ پہنچ جاتے تو جھٹ سے چلا اٹھتی —— ذکو رانی میں تو اپنا گھران ہی فضاؤں میں بناؤں گی — ! تم آؤ گی نا ہر دن ملاقات کرنے ! !
یا پھر کسی دن کہنے لگتی — ذکو میرا دل چاہتا ہے کہ ہواؤں کے دوش پر اڑنے والے آوارہ بادل کا روپ لے لوں۔ یا دور دور تک گھوم آنے والے پرندوں کے تن میں سما جاؤں —— اور میں اس کا یا اپنا سر پیٹ کر رہ جانے کے سوائے کچھ نہ کر پاتی —— ! بس تلملا کر رہ جاتی — ! !

جس دن وہ لاٹ صاحب پہلی بار ہاسٹل آئے تھے تیموؔان کے ساتھ ملاقات کا وقت تمام ہونے تک بک بک کرتی رہی۔ اور میں اس کے بغیر کمرے میں بور ہونے لگی۔
واپس آئی تو چہرہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔
"کون ہے وہ —؟ بتاؤ جلدی سے" میں نے رعب جمایا ——
"ایک انسان —— اس نے مسکراتے ہوئے کہا ——
"وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا تھا —— ویسے آئندہ اگر انسان کہوں —— تو لعنت ہے سو بار مجھ پر ——
میں نے چڑ کر کہا —— بتاؤ گڈی جی کون تھے وہ لاٹ صاحب ——
"لکھنؤ کالج کے لکچرار ہیں —"
"کب سے جانتی ہو اسے" میں نے دوسرا سوال کھینچ مارا ——
"میں — میں —" اس نے نخرے شروع کیے۔
"ہاں ہاں تم —— میں نے جھنجھلاہٹ سے جواب دیا — وہ ڈھیٹ مسلسل منہ پھاڑے ہنس رہی تھی۔
تم ایسے نہیں مانو گی" میں نے اس کی گھنیری زلفوں والی بل کھاتی چوٹی پکڑ لی —— اب بتاؤ جلدی — کب سے ہے جان پہچان —— ؟"
"پچھلے جنم سے" —— وہ کہہ رہی تھی ——
"ہائے ! !" میں نے اس کے بال چھوڑ دیے — اب گئی تو کام سے"

اتوار کی صبح فرحانہ اور سرکھا ہاسٹل چلی آئیں —— ہم سب لان میں بیٹھے ببلا کے گاؤں سے آئی مٹھائیاں مونگ پھلی

اور جانے کیا کیا اپنے پیٹ میں ٹھونس رہے تھے۔ ایک اسکوٹر کی کرخت آواز پر ساری ہی نظریں اٹھ گئیں ــــ اور ساتھ ہی شمو ہاتھ میں لیا مٹھائی کا بڑا سا ٹکڑا میرے منہ میں ٹھونستی بے قراری کے عالم میں اس نیلی اسکوٹر کے پاس جا پہنچی۔ چند لمحے کچھ راز و نیاز، کچھ انکار کچھ اقرار ہوتے رہے ــــ پھر شمو میٹرن کے کمرے والی سیڑھیاں طے کر رہی تھی۔

چند منٹ بعد وہ باہر آئی ــــ پھر وہ اس لاٹ صاحب کے ساتھ اسکوٹر پر سوار تھی ــــ اور اسکوٹر ڈھیروں خاک اڑاتی ہوئی فرّاٹے بھرنے لگی۔

مر جاؤ تم ــــ میں نے اپنے منہ میں بھری مٹھائی کا خیال آتے ہی اس کی شان میں قصیدہ خوانی کی ــــ ساری زبانیں جو چپ تھیں میرے اس جملے پر چلنے لگیں۔

"بھگوان کرے اسکوٹر الٹ جائے" ــــ بیلا نے کوسا۔

"تم خود الٹ جاؤ ــــ میں غرائی ــــ "کیوں کوس رہی ہو میری گڈی کو ــــ"

"دیکھا نہیں کیسے زناٹے سے بھاگی ہے ــــ ساری مٹھائی خاک میں ملا دی ــــ" اور میں نے دیکھا واقعی شمو کی گود میں دھری پلیٹ نیچے الٹی پڑی تھی ــــ ساری مٹھائی ٹھنڈی اور نرم گھاس پر بکھر گئی تھی ــــ "وہ دشمن لگتا ہے مجھے تو" اس نے کہا۔

"ویسے بھی بزرگوں کا قول ہے کہ کھاتے سمے صرف دوست آتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"پر ذکو یہ مہاراجہ ہیں کون" ــــ ؟ فرحانہ نے پوچھا ــــ

"اللہ جانے یا پھر شمیم ــــ"

"کیوں تجھے نہیں بتایا اس نے ــــ"

"ارے وہی تو رونا ہے ــــ ظالم نے ایک لفظ بھی اس اسکوٹر والے گدھے کے متعلق نہیں کہا ــــ"

"لیکن ذکیہ ــــ ہاسٹل سے یوں کسی اجنبی کے ساتھ چلا جانا۔ ذرا بری بات ہے ــــ سب لوگ کیا سمجھیں گے ــــ" سرکیھا نے جملہ پھینکا ــــ

"اجی یہ تو ابتدا ہے ــــ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ــــ ناز نے طنز کیا ــــ

"ارے بھئی گئی ہے شبھم ــــ اگر کچھ نیک نامی ہو گی تو شمیم کی ــــ شہر کی نگر میں۔ بے چارے قاضی جی کیوں سوکھتے ہیں ــــ" فرحانہ نے جھٹ سے جواب دیا۔

ہم سب شمو کا انتظار دن ڈھلے تک کرتے رہے۔ سورج کی سنہری کرنیں بھی چھپ گئیں تو فرحانہ اور سرکیھا

گھر چلی گئیں — بیلا اور ناز اپنے کمروں میں جا گھسے ۔ اور میں ..... اکیلی بالکونی میں چلی آئی — سڑکوں پر چراغ بھی روشن ہونے لگے ۔ اور میں پاگلوں کی طرح تنہا اس گدھی شمو کا انتظار کر رہی ہوں — اس شمو کا جو میری نس نس میں بسی ہوئی ہے ۔ جس کے دکھ میرے دکھ ہیں ۔ میرے سکھ اس کے سکھ !! اس کے غموں پر اس کے دکھوں پر دل رو پڑتا ہے ۔ میری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ۔ اس اجنبی لاٹ صاحب کے ساتھ وہ چلی گئی — مجھے بتائے بغیر ہی — آخر کون ہے وہ ۔ جس کی شمو یوں دیوانی ہے ۔ جس کی ایک ایک جھلک دیکھ کر وہ شاداب پھول کی مانند کھل اٹھتی ہے — اور جانے میں کیا کیا سوچ رہی تھی ..... سیڑھیوں پر شمو نظر آئی ۔ راہوں میں جلتے چراغوں کے مانند اس کا چہرہ بھی روشن تھا ۔

"مر جاؤ تم —" میں اس پر ٹوٹ پڑی ۔ کہاں تھیں تم — کیوں اس گدھے کے ساتھ آوارہ ہوئیں ۔ اتنی دیر تک کہاں کہاں کے طواف ہوئے —" میں اسی تیزی کے ساتھ بولے جا رہی تھی جس تیزی کے ساتھ وہ اسکوٹر فراٹے بھرتی ہوا ہوئی تھی ۔

"ارے بھئی ذرا دم تو لو —" اس نے بڑے اطمینان سے کہا ۔ اور میں جل ہی تو گئی

"تم کو کچھ خیال بھی ہے ۔ ساری لڑکیاں کیسی عجیب عجیب باتیں سوچ رہی ہیں ۔ تمہارے متعلق — شرم نہ آئی تم کو اس کے ساتھ جاتے "

"آتی تھی شرم" — اس کا اطمینان اب بھی جوں کا توں سلامت تھا ۔ میں جھنجلا گئی اور وہی پرانا حربہ آزمایا دھنا دھن گھونسوں کی بارش شروع کر دی ۔" بتاؤ کہاں کہاں اس چڑیل کے ساتھ گھوم آئیں "

"سارا شہر — پر جناب اب یہ نوازش ختم — اور آدمی بن بیٹھو —" اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے —

"چلو اب تم بھی آدمیت کے ساتھ صاف صاف بتاؤ کہ کون ہے ۔ کہاں رہتا ہے ۔ تم اس کے ساتھ کیوں گھومنے گئی تھیں —" میں نے تمام سوال دہرائے ۔

"ذکورانی —" اسے یکدم مجھ پر بڑا پیار آ گیا ۔ میں انھیں کب سے جانتی ہوں ۔ اس کا خود مجھے علم نہیں ۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں اس کی پرستش کرتی ہوں ۔ اب سے پہلے صرف ایک بار ملاقات ہوئی تھی —"

"اری گدھی تو دوسری ملاقات ہی میں اس کے اتنے قریب آ گئی — میں نے حیرت سے کہا — تو اس کے ساتھ گھومنے ۔ شہر کے طواف کرنے بھی لگی ۔"

"قربت کے لئے ملاقاتیں کیا ضروری ہیں رانی ۔"

"تو نام محبت چلتے ہیں کہو — میں نے چٹکی لی ۔" اب تک مجھے بتایا بھی نہیں — بے ایمان کہیں کی "
اور وہ بے شرم ہنسنے لگی —

اچھا پجارن صاحبہ آپ کے دیوتا مہاراج کا شبھ نام تو بتائیے ——— میں نے پوچھا
"تم مجھے گڈی کہتی ہونا — اس کا بھی کوئی اچھا سا نام رکھ لو
"کیا میں اس گدھے کو گدا کہوں۔ شرم نہ آئی یوں کہتے" ——— میں نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا ———
اسے تم اسے گدھا مت کہنا ——— ورنہ میں بھی ہاتھ چلانا جانتی ہوں ———" اس نے گھونسہ تانا
"اچھا جی مینڈکی کو بھی زکام ہو گیا"۔ میں نے چھیڑا ——— پھر ہم دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے — اور کمرے میں چلے آئے ——— میں پلنگ میں گھس گئی۔ وہ بھی قریب آ بیٹھی ——— "اچھا گڈی کا اب ملیح — یہ بتاؤ کہ وہ غیر شادی شدہ ہیں"؟
"کہتے تو یہی ہیں" اس نے جواب دیا۔
"اور محترمہ آپ ابھی کنواری ہیں" میں نے پلنگ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔
تمھیں شک ہے کیا؟"
"شک تو بالکل نہیں۔ بلکہ ایک مقدس فرض انجام دے کر اللہ میاں کے نیک بندوں میں اپنا اضافہ کروانا چاہتی ہوں ——— سنو گی تو اچھل پڑو گی"۔
"دیکھیں کیا بات ہے آپ کی اچھل جانے والی ———"
"سنو شمو۔ اب وہ آئے نا تو میں اس سے ملوں گی۔ اور پھر تری۔ اس کی"
میں نے قریب کھسکتے ہوئے سرگوشی کی ——— شا ——— د ——— ی ———"
"اونہہ پاگل ہے تو پوری ———" اس نے منہ بنا کر جھڑک دیا۔
"بتا شمو تیری شادی کا بی اماں کو کتنا ارمان ہے۔ کتنے خط آتے ہیں ان کے۔ ہر دوسرے ماہ تو ایک نئے الو کا نام اور فوٹو لا ڈالی کی نذر کرتی ہیں۔ اب کی بار بی اماں کو میں اس اسکوٹر والے لاٹ صاحب کی تعویذ بھیجوں گی"۔
"بیکار سی باتیں مت کرو ———" وہ میری بات گول کر گئی۔

چند طویل ماہ گزر گئے . . . .
تقریباً تمام کلاس میں سناٹا چھایا ہوا تھا ——— ساری لڑکیاں لان میں بلبلوں کی طرح چہک رہی تھیں۔
میں اور شمو اپنی ریکارڈ بک مکمل کرنے میں الجھے ہوئے ایک روم میں تپ رہے تھے۔
"شمو۔ آج کی تازہ خبر ———" فرحانہ آندھی کے مانند ہل چل مچاتی اندر گھس آئی ———

"اونہہ۔ جاؤ جی آج شام تک یہ مکمل کر لینا ہے ۔۔۔ تم تنگ مت کرو" میں نے اس کی تازہ خبر والی بات کا کچھ نوٹس ہی نہ لیا ۔۔۔
"لیٹ لطیف! پہلے مکمل کیوں نہ کر لیا ۔۔۔ ہاسٹل میں سارا وقت گپیں مارتی ہو"
"اتنا ہمارا خیال ہے تو اپنے گھر رکھ لو نا ہمیں ۔۔۔" میں نے جل کر کہا۔
"میرا گھر پہلے ہی سے بھرا پڑا ہے۔ اب تمہیں کہاں لے جاؤں" فرحانہ نے بے مروتی دکھائی۔
"لیکن شمو تم نے پوچھا نہیں کہ آج کی تازہ خبر کیا ہے ۔۔۔؟" وہ شمو سے مخاطب ہوئی۔
"تمہاری ہی طرح بیکار ہوگی۔ میں جان کر کیا کروں" شمو نے ایک پل کو سر اٹھا کر کہا ۔۔۔
"ابھی ایسی زوردار خبر ہے کہ مجھے چوم لوگی" فرحانہ نے سچ مچ یہ بات منہ چوم لینے والے انداز میں سنائی۔
"پھر بکو نا" ۔۔۔ میں نے بیزارگی سے پوچھا۔
"آہنہ ۔۔۔ خوشامد کرو گی تو بتاؤں گی ۔۔۔ یوں اکڑ دکھائی تو ہم بھی کم نہیں ۔۔۔" وہ اکڑنے لگی
"اچھا بابا بتاؤ تمہارے رضوان کی قسم ۔۔۔" شمو نے زوردار قسم ڈال دی۔
"اب بھی نا بات ۔۔۔" فرحانہ رضوان کا نام سنتے ہی کھل اٹھی ۔۔۔
"کب آ رہے ہیں تمہارے جانِ من، جانِ جگر رضوان صاحب ۔۔۔" میں نے لقمہ دیا۔
"آج آ بھی گئے ۔۔۔" فرحانہ بس زعفران زار بنی جا رہی تھی۔
"دھت بدتمیز جب سے بتایا کیوں نہیں۔ خواہ مخواہ تنگ کرتی رہی۔ مٹھائی کدھر ہے"
میں نے پوچھا ۔۔۔
"اچھا تو آپ کی تازہ خبر یہی تھی ۔۔۔" شمو نے مسکرا کر پوچھا ۔۔۔ پر رضوان کی آمد پر تمہارا رخ روشن میں کیوں چوم لوں ۔۔۔"
"اے شمو پوری بات تو سنو ذرا ۔۔۔ رضوان کو ریسیو کرنے ہم لوگ اسٹیشن گئے تھے ......
پوچھو اب وہاں کیا کیا دیکھا ۔۔۔" فرحانہ پھر رک گئی ۔۔۔
"رضوان مع اپنی دلہن ۔۔۔" میں نے جلدی سے کہا ۔۔۔
"خاک تمہارے منہ میں ۔۔۔" فرحانہ چڑ گئی ۔۔۔ جاؤ نہیں بتاتی اصل بات"
"ارے ارے فرحانہ روٹھو مت ۔۔۔ ذکیہ تم بھی کیا پاگل ہو ۔۔۔ دلہن تو اب جائے گی ساتھ ۔۔۔
"شمیم نے مجھے ڈانٹتے والے انداز میں کہا ۔۔۔ اچھا ڈیر اب سنا دو وہ بات" فرحانہ کا موڈ پھر بحال ہو چکا تھا۔
"وہاں پر ہم نے ایک کمپارٹمنٹ سے آپ کے اسکوٹر والے لاٹ صاحب کو برآمد ہوتے دیکھا"

"دو کیا——" شمو اچھل پڑی — اور اس نے سچ مچ فرحانہ کا منہ چوم لیا——
" اب نہیں ہو گی یہ ریکارڈ بک مکمل —" میں نے ہاتھوں سے سر تھام لیا — شمو ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔
" کہاں گئی یہ ——" فرحانہ نے مجھ سے پوچھا ——
" فون کرے گی — اطمینان کرنا ہے نا —"
" ذکیہ تجھے اس لاٹ صاحب کی ہسٹری نہیں معلوم —" اس نے عجیب سوال کر ڈالے ۔
" ارے رونا تو یہی ہے ۔ کمبخت ایک لفظ نہیں اگلتی — اس کا بوائے فرینڈ ہے ۔ بس اتنا مجھے پتہ ہے ۔" میں نے کہہ دیا ۔
" آہا —— بوائے فرینڈ سے بھی بہت زیادہ ۔" فرحانہ اعتماد کے ساتھ بولی ۔
" لگتا تو اچھا ہے دونوں کا جوڑا ——"
کیا خیال ہے دونوں "کو" ایک کر دیا جائے ۔" میں نے پوچھا ۔
" خیال تو نیک ہے ذکو —— مگر اس لاٹ صاحب کے متعلق کچھ اتا پتا معلوم تو ہو "
فرحانہ نے ٹھیک ہی رائے دی ۔
اور اسی لمحے شمو مسکراتی چلی آئی ۔
" کر لی تصدیق —— فرحانہ نے جھٹ سے پوچھا ——
"ہاں بھئی کر لی —— مس نیوز ایجنسی آپ کا شکریہ !!"
" اچھا شمو اگر تیری اور اس کی .... فرحانہ نے جملہ ناتمام ہی چھوڑ دیا ۔
" اوں ۔ ہوں — ناممکن —— شمو نے اپنی ریکارڈ بک پر ایک شکل کے لئے لائین کھینچتے ہوئے کہا
" کیا — اس سے شادی کیوں ناممکن ہے ۔ تم تو گڈی جی اس کی پرستش کرتی ہو ۔ اس کے ساتھ بیاہ رچاتے کیوں انکار ——" میں نے حیرت سے پوچھا ——
" تم دونوں یہ لائین دیکھ رہی ہو — متوازی لکیریں —— "میں" اور "وہ" بھی بس اسی مانند ہیں برسوں سے ساتھ ساتھ چلتے آ رہے ہیں ۔ پر ملن نہیں ہو گا ۔ صرف آکاش مل جاتے ہیں ۔ لیکن یہ متوازی لکیریں نہیں ..... کبھی نہیں ——" شمو نے دلیل پیش کی ۔
" لیکن شمو شادی کرنے میں کیا ہرج ہے بھلا ۹ تمام عمر ایک ساتھ رہو گی ۔ فرحانہ نے بات کو وہیں رکھا ۔
" تم رضوان سے بے حد محبت کرتی ہو نا ۔ اور اب شادی بھی پکی سمجھو —— لیکن فرحانہ لیلیٰ اور قیس، ہیر اور رانجھا نے بھی ایک دوسرے کو چاہا تھا ۔ وہ " ایک" ہوتے ہوئے بھی دنیا کی نظروں میں الگ الگ ہی رہے ۔ انہیں

رسم و رواج کے بندھنوں میں باندھا نہیں گیا۔ اور جدائی کی آگ میں بےچارے جھلس کر ختم ہو گئے۔ مگر لازوال شہرت تو مل گئی۔ دنیا میں نام، نقش تو ہو گیا۔ بس انہی کی طرح میں بھی جدائی کی آگ میں جھلس جانا چاہتی ہوں۔"

"گرمی کا اثر بےچاری پر بہت ہو گیا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "گڈی جی اس صدی میں آپ کو قیس اور رانجھا نہیں مل سکیں گے۔" "شادی کر لو اس میں بھلائی ہے۔"

"پاگل ہیں آپ لوگ جو شادی کو زندگی کی معراج سمجھ لیتے ہیں۔ دیکھ لینا زندگی کے کسی حصے میں بھی میں ان چکروں میں نہیں پڑوں گی۔" اس نے عزم کے ساتھ کہا ——

"اونہہ کون سمجھائے تم کو —— فرحانہ نے چڑ کر کہا —— ضدی کہیں کی ——" اور پھر دو ... ... شمو کالج گول کر گئی —— کیوں؟؟

نیلی اسکوٹر ہوسٹل کے باہر موجود تھی جو شمو کو لئے نو دو گیارہ ہو گئی —— یہ شمو ہماری میٹرن صاحبہ کی بڑی منظور نظر تھی۔ جانے کون سا جادو کر رکھا تھا کہ اسے یوں جانے کی اجازت فوراً مل گئی۔

اتوار گزرا تو پھر کالج میں دوبارہ رونق آئی۔ کالج کا گوشہ گوشہ رنگ برنگے آنچلوں سے سج گیا۔ اس دن صبح ہی صبح فرحانہ نے ہمیں دور سے لان میں دیکھ کر پکارا۔

"شمو —— آج کی تازہ خبر ——" پھر قریب آنے کے بعد کہنے لگی۔ ایسی خبر ہے کہ ڈر لگتا ہے کہیں بی شمو بیہوش نہ گر جائے ——

"کچھ لاٹ صاحب کے متعلق ——" شمو نے ہنستے ہوئے پوچھا

"بالکل ——" فرحانہ بولی —— پرسوں شام میں نے اسے شہر کی ایک "چالو" خاتون کے ساتھ دیکھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" شمو بڑے اطمینان اور بھولپن سے کہنے لگی "—— سچ بات تو یہ ہے کہ "ان پر" بہت ساری لڑکیاں مرتی ہیں۔ ان کی ہمسفر بننے کی تمنا دل میں بسائے رکھتی ہیں۔ تب ہی وہ آتے ہیں تو کسی نہ کسی کے ساتھ گھوم پھر لیتے ہیں۔"

"ہائیں غنڈا کہیں کا ——" میں چلائی —— "تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا ——"

"تو کیا ہو گیا اس سے" —— وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ "بھئی لڑکیاں خود ملنے آتی ہیں ساتھ چلنے کی "فرمائش" کرتی ہیں۔ وہ بھی ذرا زندہ دل ہستی ہیں اور بس۔ شام گزار لیتے ہیں اکثر کے ساتھ۔"

میں نے اس کی بات نظر انداز کر کے فرحانہ کو مخاطب کیا۔ "تو نے کس کے ساتھ دیکھا تھا اس گدھے کو۔"

"وہ ایک ہے" بے بی آسیٹن "۔ خود کو بڑی فرسٹ کلاس شاعرہ ثابت کرتی پھرتی ہے۔ ایسی شاطر ہے۔ شکار کا ایسے نشانہ بناتی ہے کہ ایک ہی وار میں گھائل"

"کہیں تم اس مسرت جہاں کو تو نہیں کہہ رہی ہو—" میں نے شک ظاہر کیا۔

"ہاں ہاں ذکو وہی شیطان—— فرحانہ جلدی سے کہنے لگی—اس کے ساتھ لاٹ صاحب نظریں لڑا رہے تھے۔ میرا جی چاہا کہ پکڑ کر سر ٹکرا دوں دونوں کا—اس مسرت جہاں کی تو بس من چاہی مراد مل گئی۔ بلبل ہزار داستان بنی چہک رہی تھی—— بدمعاش کہیں کی۔ شادی شدہ ہے۔ پر نظریں ادھر ادھر لڑانے سے نہیں چوکتی۔ اللہ کرے مر جائیں ایسی عورتیں——" فرحانہ اپنے گال سرخ کیے جا رہی تھی——

"اس بیچاری کو کیوں کوس رہی ہو" میں کہنے لگی۔ یہ لاٹ صاحب کیسے بھولے بنے پھرتے ہیں ایک ایک سے عشق لڑاتے پھرتے ہیں۔

"ذکو—— ایسی باتیں مت کرو بھئی—— شمو کہنے لگی۔ وہ کسی موہنی مورت، خوب رو اور پیاری سی لڑکی کو اپنی زندگی کا کبھی نہ بچھڑنے والا ساتھی بنانا چاہتے ہیں۔ پر آج تک انہیں اپنا آئیڈیل مل نہ سکا۔ بس اسی کی تلاش کر رہے ہیں"

"تو کیا اس بے بی آسیٹن سے بیاہ رچائیں گے— اچھا جوڑ ہے۔ ساتھ ساتھ چلیں گے تا تو (۱۰) بن جائیں گے"

"شمو—— کل رات مسز کرمانی ہمراہ تھیں" فرحانہ لاٹ صاحب کی ایک ایک پول کھول رہی تھی۔ "تب گئے تھے۔ وہاں جام صحت چل رہا تھا۔ اب اللہ جانے خود بیوہ مسز کرمانی گلے بندھی ہیں یا اپنی لاڈلی کو لاٹ صاحب کا آئیڈیل بنا کر پیش کرتی ہیں"

"اونہہ—— یہ آئیڈیل تلاش کرنے والے زندگی میں کبھی شاد نہ ہو پائیں گے۔ ایک ہی ہنسی میں ہزاروں باتیں۔ خوبصورت بھی ہو، سوشل بھی، کنواری بھی ہو اور ممی نہ ہو ں۔

سچی شمو یہ آئیڈیل—— آئیڈیل پکنے والے بڑی بری ٹھوکر کھاتے ہیں—— میں نے جی کھول کر رکھ دیا۔

درست۔ ٹھوکر کھائیں آپ" وہ ذرا ناگواری سے کہنے لگی۔ "مجھے یقین ہے ذکو وہ اپنا آدرش ڈھونڈ لیں گے۔ اپنی منزل پا جائیں گے"

"ہاں جی تمہاری نیک دعائیں ساتھ جو ہیں" میں نے جل کر کہا——

اور بات یہیں پر ختم ہو گئی۔ کالج کی بل پہلے پیریڈ کا اعلان کر رہی تھی——

صبا

آموا پر بور نکل آئے۔ خزاں کا دور جانے کہاں گم ہوگیا۔ پودوں پر نئی نئی پتیاں فصل بہار کا پیغام لا رہی تھیں سجنی کو ساجن کی یاد بیکل کرنے لگی۔ اور میں اپنے امتحان کی تیاری کرتی تھی —— فائنل ایئر جو تھا —— شمو بڑی خوش تھی۔ رزلٹ کے ساتھ ہی کہیں نہ کہیں سروس مل جائے گی۔ پھر بی اماں کے روپیوں کا انتظار نہیں رہے گا۔ وہ کہا کرتی کہ میں نے جان بوجھ کر ہی۔ اے نہیں کیا۔ یہاں ٹکنیکل کالج میں چلی آئی کہ تین سال بعد تو اپنا روپیہ ہوگا پھر اپنا سجا سجایا چھوٹا سا گھر۔ اپنی مسکراتی گنگناتی دنیا! جس کا انتظار برسوں سے کر رہی ہوں!

اس بیچ میں بی اماں کے تین، چار خطوط آئے۔ نوٹوں کے ساتھ بے چاری شدید اصرار کرتیں کہ کسی کو منظور کر لے —— وہ لاکھ قدامت پسند سہی مگر لاڈلی کو زندگی کے ساتھی کا انتخاب کر لینے کا پورا موقع دے رہا تھا۔ تب ہی تو ڈھیر ساری تصویریں آ چکی تھیں۔ اور یہ شمو شاید اپنے لاٹ صاحب کے انتظار میں ہر بار ٹھکراتی رہی —— اس کا جواب ایک "نا" تھا سو قائم رہا۔

امتحان ختم ہوا۔ لڑکیاں کالج اور ہاسٹل کی جگمگاتی دنیا کو سونا کرتی بڑی خوشی کے ساتھ اپنے گھروں کو جا رہی تھیں۔

ایک شمو اڑی تھی انکار پر —— کہتی تھی۔ میں نے مسز دین دیال (وہ ہمارے اس ویمنس ہاسٹل کی انچارج تھیں) سے کہہ دیا ہے۔ وہ مجھے سروس ملنے تک یہاں رکھنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر میں چاہوں تو ہمیشہ ہی یہاں رہ سکتی ہوں۔" میں کہتی بی اماں روپے نہ بھیجیں تو ...... ہنس کر کہنے لگی اس کا انتظام بھی کر لیا ہے۔ مسز دین دیال نے وعدہ کر رکھا ہے کہ سروس ملنے کے بعد ہی روپیہ لیں گی۔ بے چاری میرا درد جانتی ہیں۔ میری مجبوریوں کا انھیں علم ہے —— بہت چاہتی ہیں نا مجھے۔ بیٹی بنا رکھا ہے۔

پر میں تو گھر جانے، بھائی بہنوں سے، امی سے ملنے بے چین ہو رہی تھی۔

"شمو آج میں گھر چلی جاؤں گی"۔ میں نے آخر اس دن کہہ دیا۔ جب ہاسٹل کی تمام لڑکیاں الوداع کہہ چکیں —— ایک سونیا رہ گئی تھی۔ جس کے والدین سیلون میں اس دور دیس میں آباد تھے —— یا پھر دو چار دوسرے کالجوں کی لڑکیاں۔

"شوق سے میری رانی" —— اس نے جواب دیا۔ چلو میں سامان باندھتی ہوں۔"

"لیکن گڈی تم کو بھی اپنے گاؤں جانا پڑے گا —— میں نے کہا ——

"نا بھئی میں نے ایک بار وہاں جانے سے انکار کر دیا نا —— گھر جا کر میں گھٹ جاؤں گی ذکر —— آپا طعنے دے کر مار ڈالیں گی۔ تجھے معلوم ہے کیسی جلاد ہے وہ —— اور بی اماں کہیں

صبا

ورا کسی بندھن میں نہ جکڑ دیں۔ ڈر لگتا ہے وہاں جاتے ــــ بس میں نہیں جاؤں گی"۔ اس نے اعتماد کے
کہا ــــ

"اچھا تو میرے گھر چل۔ تین ماہ بعد واپس آ جانا۔ یہ تپتی دوپہریں تجھے یہاں اکیلا جلا کر رکھ دیں گی"۔ میں نے
رائے دی ــ

اس نے چھت پر لگے اورشاں پنکھے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ــ" یہ بے چارہ گرمی کے علاج کے لئے
موجود ہے"۔

"نہیں گڈی کچھ بھی ہو تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔ ذرا دل تو بہلا رہے گا"۔ میں بھی ضد پہ اڑی رہی ــ

"سن رانی ...... اس بار گرمیوں میں "وہ" آئیں گے"۔

"کون وہ اسکوٹر والے لاٹ صاحب ــ میں نے چونک کر پوچھا ــ تب تو یقیناً میرے ساتھ چلنا ہے۔ ورنہ
اکیلی رہ گئی تو ظالم تباہ کر دے گا تجھے ــ"!

وہ بنا جواب دیے مسکراتی رہی۔

"سن شمو ــ یہ تیرا لاٹ صاحب کے ساتھ جانا، گھومنا پھرنا اچھی بات نہیں۔ وہ تو شادی کرنے سے رہا
یوں تو ان کی پاگل بنی تو اس پہ مرتی ہے۔ اری اپنی تو کچھ پوزیشن رکھ۔ وہ تو بس ہرجائی ہے پورا ــ

"شادی کرنے ہی کے لئے کسی کو چاہا جاتا ہے؟ کسی کو چاہا جاتا ہے کہ؟ اپنی غرض کے لئے کہ ہار
جائے! بعض لوگ بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں محبوب سے شادی نہ ہوئی جھٹ سے بے وفا، ہرجائی جانے
یا کہہ دیتے ہیں ــ"

"میں اتنی ساری بکواس نہیں سنتی ــ سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے تجھے کبھی اپنا سمجھا ہی نہیں ــ اس
کو بھی اپنایا نہیں۔ ارے اگر وہ ایک دو کے ساتھ گھومتے، ایک دو کو پیر کہتے تو کوئی بات بھی ہے
ہر پل نیا ہمسفر ...... آدمی بڑا گھاگ ہے گڈی تو چل میرے ساتھ ــ"

ذکیہ مجھے ایسی باتیں پسند نہیں۔ جانا ہے خود چلی جاؤ نا اپنے گھر مجھے کیوں گھسیٹ رہی ہو"۔ اس نے
اری سے کہا ــ میں وہی کروں گی جو میرا من چاہے"۔

"جاؤ چولہے میں ــ میں تو چلی آج رات ــ" میں نے چڑ کر کہا ــــ

میں غصہ میں بھری اپنی نئی چیزیں اکٹھا کرنے لگی۔ وہ بھی سامان باندھنے میں میری مدد کرتی رہی،
شام تک میں نے اس سے ایک بات بھی نہ کی۔ اس سے نفرت سی ہونے لگی۔ وہ بھی چپ چاپ بجھی بجھی رہی شام
ڈھلنے لگی۔ دیئے جل اٹھے۔ مجھے رات آٹھ بجے تک اسٹیشن پہنچ جانا تھا ــ سارا سامان باندھ کر

وہ بالکونی میں چلی گئی۔ اپنے مخصوص ستون کے سہارے وہ گم سم کھڑی تھی ——
"گڑیا میں جا رہی ہوں ——" میں نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔ دل میں کیسے کیسے طوفان ابل رہے تھے۔ یہ صرف میں ہی جانتی تھی۔ اسے یوں چھوڑ کر جانے کو دل کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔
آں —— وہ چونکی —— اچھا خدا حافظ۔ میری غلطیوں کو نظر انداز کر دینا۔ میری رانی مجھے بھول مت جانا۔ اپنی پگلی گڑیا کو یاد رکھنا۔ جانے پھر کب ملن ہو —— اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جھلملا رہے تھے۔ وہ آنکھیں جو ہمیشہ مسکراتی رہیں۔ آج رو رہی تھیں۔ میری گڑیا رو رہی تھی —— میں اس سے لپٹ پڑی۔ میں تجھے چھوڑ کر گاؤں نہیں جاؤں گی۔ کہیں نہ جاؤں گی" اور پھر میں نے سارا سامان بکھیر دیا۔ رات ہی گھر خط لکھ دیا کہ میں گرمیاں یہیں گزاروں گی۔ اپنی شمو گڑیا کے ساتھ!!

بی اماں کو شمو کے بیاہ کا ارمان اندر ڈال رہا تھا وہ ڈھیر سارے خط لکھ چکیں —— شہر آنے والوں کے ذریعہ سندیسے بھیجتی رہیں۔ پر شمو ٹس سے مس نہ ہوئی۔
ہمیشہ اس بات کو گول کر جاتی۔ کبھی بی اماں کو تسلی بھرا جواب اس نے نہیں لکھا۔ کبھی کہتی رزلٹ کے بعد سوچوں گی۔ کبھی کہتی۔ بس اگلی بار گاؤں آؤں گی تو ہاتھوں پر مہندی رچا لینا —— اور بے چاری بی اماں اسی بھروسے لاڈلی کو پڑھا رہی تھیں کہ تعلیم ختم ہو اور شمو آ جائے تو اللہ میاں کے گھر بن بلائے چلی جائیں گی —

"شمو" —— فرحانہ نے سیڑھیوں پر سے ہی آواز دی —— پھر اندر داخل ہوتے ہی کہنے لگی۔ ارے ذکیہ تو بھی گھر نہ گئی عجیب پاگل ہو ——"
"میں اپنے گاؤں جانا نہیں چاہتی تھی —— شمیم کہنے لگی ——" اور یہ میم صاحب مجھے اکیلا چھوڑ کے جاتے ڈرتی ہیں ——"
اچھا بھئی اب باقی باتیں راہ میں ہوں گی۔ ذرا امریکن لائبریری تک چلو۔ مجھے کتابیں واپس کرنی ہیں۔
"شمو —— تیرے لاٹ صاحب" فرحانہ نے بے اختیار کہا ——
"کدھر ——" شمو کی اور میری آواز گونجی —— اور فرحانہ نے ایک جانب اشارہ کر دیا۔ ہم نے دیکھ لیا...... وہ ایک چنچل اور ماڈرن تتلی کے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ لائبریری کی آہنی گیٹ سامنے تھی۔ میں اور فرحانہ اندر چلے آئے۔ لاٹ صاحب قریب سے گزرے تو ایک پل کو رک گئے۔

آہستگی سے کچھ کہا۔ شمو نے سر کو جنبش دی۔۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔ وہ اس رنگین تتلی کے ساتھ
ت ہو گئے۔!!

دوسری سہ پہر وہ ہاسٹل چلے آئے ـــــ اسکوٹر کے ساتھ (جانے کس دوست کی مانگ رکھی تھی۔)
یا ـــــ شمو اور میں بالکونی میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ لاٹ صاحب کو دیکھ کر اس نے کھسکنے کی فکر
۔ سونیا نے پوچھا ـــــ آپ کی تعریف ـــــ" شمو مسکرانے لگی۔ اور اس بے خود کرنے والی مسکراہٹ
میں پردہ سب کچھ، سونیا کی شاطر نظریں تاڑ گئیں ـــــ سونیا نے ہنستے ہوئے دعا دی۔
WISH YOU BEST OF LUCK

شمو شام کے دھندلکے میں واپس آئی۔ اور میرا دل دھک سا رہ گیا۔ وہ تو ہمیشہ لاٹ صاحب سے مل کر
اتی اٹھلاتی مچلتی آیا کرتی جیسے دو جہان کی ساری خوشیاں اس کے دامن میں سمٹ آئی ہوں۔ وہ خوب چہکتی اور
اسے الٹی سیدھی باتوں سے تنگ کیا کرتی۔ پر آج تو اسے ستانے کے لئے لاٹ صاحب کو گدگدا چند
نے کے لئے میری زبان ہی کھل نہ پائی۔۔۔۔۔ کیونکہ آج۔۔۔ آج اسے کیا ہو گیا تھا۔ بڑی اداس
ل قدموں کے ساتھ اس نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کی آنکھوں میں جانے کہاں کی وحشت سما گئی تھی۔
ئی کھوئی سی گم صم وہ پلنگ پر گر گئی ـــ میں نے ایک اوران جانی بات محسوس کی۔ اس نے اپنے ماتھے
بنگالی بندی سجا رکھی تھی ـــ !! میں بھی چپ چاپ پڑی رہی۔ اس کی بجھی ہوئی آنکھیں۔ کملایا ہوا چہرہ
نے اپنے پیچھے کتنی باتیں چھپائے ہوئے تھا۔ کہاں بھول آئی وہ اپنا شاداب چہرہ۔ کہاں کھو گئیں
مسکراتے والی آنکھیں۔
"ذکو رانی آج چپ کیوں ہو۔ مجھے ستایا کیوں نہیں" شمو کی آواز بڑی دیر بعد گونجی ـــ اداس اداس
ل آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔
"یہ مجھ سے پوچھ رہی ہو" ـــــ میں نے محسوس کیا میری آواز خود گمبھیر تھی۔ ـــــ تم خود اپنا چہرہ دیکھو
کیا ہو گیا ہے ـــــ "آج لاٹ صاحب سے کھٹ پٹ ہو گئی کیا" ـــــ میں نے اپنا شک ظاہر کر دیا۔
وہ چپ رہی ـــــ میں بھی چپ رہی۔ کمرے کے در و دیوار چپ رہے۔!!
"بتاؤ نا کیا ہوا ـــــ" میں نے بڑی دیر بعد پھر پوچھا ـــــ
"ہاں ـــــ ذکو اس نے آج بڑی عجیب اور تکلیف دہ بات سنا دی"۔ وہ خاموش ہو گئی۔
"لیکن کیا ـــــ" میں وہ عجیب باتیں جاننے کے لئے بے چین ہو رہی تھی ـــــ

"ذکو ـــ آج میں نے ان سے بی اماں کے تقاضوں کا ان کے ارمانوں کا ذکر کیا۔ .... اپنے انکار کا حال بتایا تو کہنے لگے ـــ "دیکھا تم نے کتنے ساروں کا راستہ میں گے کاٹ دیا ـــ اب اگر تم اپنی مرضی سے بیاہ رچا لو تب بھی میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا ـــ مجھے یقین ہے تم .... تم یوں ہی ملنے آتی رہو گی۔ جیسے اب ...... کٹی ہوئی پتنگ کی طرح چلی آتی ہو"

ذکو رانی میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ یوں کہہ جائیں گے ـــ اتنی گری ہوئی بات ـــ !
پھر میں واپس آنے لگی نا ـــ تب انہوں نے میرے ماتھے پر بندی سجا دی ـــ میں ایک لفظ نہ کہہ سکی۔ اس کی بندی نہ مٹا سکوں گی ...... تجھے معلوم ہے اس کا مطلب" وہ خاموش ہو گئی۔ آنکھیں بند کئے وہ پھر گم ہو گئی جانے کہاں ـــ !

میرے اللہ !! میں لرز گئی ـــ ظالم نے اس کے گرد کتنی آہنی اور مضبوط دیوار بنا دی۔ سارے پر نوچ کر بھی چین نہ آیا۔

"گڑیا ـــ تو چپ کیوں ہو رہی ـــ بندی لگانے ہی کیوں دی ـــ کیا تو نے ـــ اپنا تن بھی۔ ......" میں آگے کچھ کہہ نہ سکی ـــ

نہیں نہیں ذکو ایسا مت سوچنا ـــ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ـــ آج تک انہوں نے میرے جسم کو ہاتھ نہیں لگایا ـــ مجھے اپنے انگ کی طہارت پر ناز ہے"

پھر مٹا اس کی بندی ـــ ظالم مر جائے خدا کرے گھٹ کر"

"رانی ـــ تو اسے مت کوسنا۔ میرے ماتھے کی یہ بندی۔ یہ سہاگ کی جگمگاتی نشانی مٹانا چاہتی ہے تو سن یہ کبھی نہ مٹے گی ساری زندگی یوں ہی ماتھے پر یہ سجا کرے گی۔ میری چوڑیاں میز کی دراز میں رکھی ہیں فرا پہنا دینا"

شمو بہت ہی کم کسی موقع پر چوڑیاں ہاتھوں میں ڈال لیا کرتی تھی ـــ اس کی یہ بات سن کر میری آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔ اپنی اور اس کی بے بسی پر! میں نے آنسو پی کر کہا ـــ

"شمو پاگل پن ہے۔ اس نے تو یوں ہی دل لگی میں لمحہ بھر کی خوشی کے لئے بندی لگائی ہے۔ تو کیوں اس کے پیچھے پاگل بن جاتی ہے۔ وہ تو تجھے کچھ سمجھتا نہیں! تو بی اماں کو کیا جواب دے گی۔ ان کے ارمان کیسے چھن سے ٹوٹ جائیں گے"

"میں بی اماں کو منا لوں گی ذکو ـــ انہیں رو رو کر کہہ دوں گی کہ میں نے بیاہ کر لیا ہے۔ لڑکی صرف ایک سے بیاہ کرتی ہے ـــ صرف ایک دیوتا کو من مندر میں بساتی ہے ـــ"

"اری دیوانی اس سے ہوگا کیا؟؟ تیری زندگی تو تباہ ہو رہی ہے"
میں نے جھنجلا کر کہا ـــ

"زندگی میں رہ ہی کیا گیا ہے جو تباہ ہو!! بس "وہ" تو خوش ہوں گے مگن رہیں گے کہ شمیم کسی کی نہ بن سکی۔ ہر بار ان کی آمد پر خوشی سے جھومتی ان سے ملنے آیا کرے گی۔ شام ان کے ساتھ گزارے گی ذکو خدا کرے اس کا چین" اس کا قرار" یونہی بنا رہے۔ وہ برسوں زندگی کی خوشیاں لوٹے اور اس کے دم سے میرے ماتھے پر بندی جگمگاتی رہے۔ دنیا والے چاہے کچھ بھی کہیں — مگر میں نے خود کو تو اس سے منسوب کر لیا ہے۔ اسے اپنا سب کچھ مان لیا ہے —— میں تو اس کی دولہن ہوں نا — بندی سجانے والا کون ہوتا ہے آخر؟؟" کتنا درد بھرا تھا اس کی آواز میں ——

رات کا سناٹا بڑا بھیانک ہے۔ چاند جانے کہاں چھپ گیا۔ ستاروں کی روشنی بھی بڑی مدھم بڑی بیمار لگ رہی ہے —— سامنے والے پلنگ پر شمو میری گڑیا سو رہی ہے۔ اور میں گپ چپ اسے تکے جا رہی ہوں۔ ایک دیوی سمان لڑکی کو جس نے ایسے دیوتا کی چاہ کی ایسے دیوتا کی پرستش کی جو صرف دھوکا تھا۔ جس نے زندگی کی راہوں پر ہر ہر قدم پر ایک نیا نرم و نازک ہاتھ تھاما۔ وہ فصل بہار کا ایک لطیف جھونکا تھا جو چمن میں پھولوں کو چوم کر گزر جاتا۔ جو بھولی بھالی ان جانی لڑکیوں کے گرد ایسا خوفناک جال بنتا ہے کہ لڑکیاں نہ تو تڑپ سکتی ہیں۔ نہ آزاد ہو پاتی ہیں۔ کتنا ظالم کتنا سفاک صیاد ہے!!

میری بھولی شمو تو نے اس کی بھونروں والی صفت جانتے ہوئے بھی اس کی پوجا کی۔ اس کے نام سے خود کو منسوب کر لیا ہے —— اسے تو پتہ بھی نہ ہوگا کہ اس نے بندی لگا کر تجھے کیا بنا لیا۔ وہ تو کل تک بھول بھی جائے گا کہ اس نے کیا کیا تھا — اس کے نزدیک یہ تو پل بھر کی دل لگی ہے شمو تو نے بھولپن میں خود کو اتنا کیوں جکڑ لیا۔ اب تو تو سدا اسی کی بنی رہے گی — کوئی اور تیری زندگی میں نہ آئے گا نا —— اللہ کرے تیری تمنا پوری ہو — تیرا بندھن اس سے بندھا رہے

میں نے جھک کر شمو کا چہرہ چوم لیا —— دیوداسی کا بوسہ لیا — !!

اس کی پلکوں پر آنسو ابھی تک چمک رہے تھے !!

شمیم نکہت

گھروندے

ہنہ ۔ اماں تم گھر کیوں نہیں بنواتیں ۔ بتاؤ ۔ بتاؤ نا اماں ۔

زینب آج پھر ہمیشہ کی طرح ضد کر رہی تھی ۔۔۔ رات کے بے سلیقے اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور ماں کے ساتھ کوٹھے میں دھان کے پیال پر لیٹی ہوئی زینب کی آنکھیں چھپر سے باہر مختلف بھوت پریت تلاش کر رہی تھیں ۔ وہ ماں کے سینے سے اور چپک گئی ۔ چولہے پر رکھا ہوا ننھا سا مٹی کے تیل کا چراغ چھپر کو روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا ۔ چھپکے کے دروازے میں ابھی تک ٹٹی نہیں لگی تھی ۔ کیوں کہ خیراتی اس وقت تک کام سے واپس نہیں آیا تھا ۔

اماں ۔ بولو ۔ بولو نا ! تم گھر کیوں نہیں بنوالیتیں ۔

کیا یہ گھر نہیں ہے ۔ بری بات ۔ ہر بات کی ضد نہیں کرتے ۔

ماں زینب کو بہلا کر سلانا چاہتی تھی ۔ مگر ننھی زینب روز کی طرح آج بھی گھر کے لیے الجھ رہی تھی ۔ اسے یہ گھر بالکل پسند نہیں تھا ۔ وہ سوچتی ہمارے ابا آخر گھر کیوں نہیں بنواتے ۔ یہ بھی کوئی گھر ہے ۔ ایک چھپر اور دو رنگ ٹٹیوں سی گھری آنگن اور بس ۔۔۔ نہ گھر نہ دالان نہ آنگن نہ بیٹھک ۔ کوئی ملنے آئے تو املی کا سایہ بیٹھک بن جاتا ہے اور پھر اسے یہ تو بالکل اچھا نہ لگتا کہ ایک ہی چھپر میں چولہا ، چکی ، اوڑھنا ، بچھونا اور منہ لوٹے ہوئے اناج کے گھڑے بھلا یہ کوئی گھر ہوا ۔

اسے چودھری صاحب کا گھر بہت پسند تھا ۔ باہر بیٹھک پھر آنگن ، پھر دالان ، اور دالان کے اندر کمرہ ۔ چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں ۔ آنگن کے ایک طرف چھوٹا سا باورچی خانہ ۔ اور ایک کوٹھری جس میں بڑی بڑی بکھاریں لگی ہوئی ۔ اسے بہت تعجب ہوتا کہ چودھری صاحب کے یہاں اتنے بہت سے دروازے کیسے لگے ہیں جب کہ اس کے یہاں ایک بھی دروازہ نہیں تھا ۔۔۔ بس سرکل کی موٹی سی ٹٹی ۔۔۔

جب بھی وہ چودھری صاحب کے گھر جاتی ۔ اسے ایک انجانی مسرت کا احساس ہوتا ۔ ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی اس کے قدم ٹھٹک جاتے ۔ یہ گھر کتنا اچھا ہے ۔ وہ چپکے سے کھڑی ہو جاتی ۔ جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو ۔ اور پھر وہ

چودھرائن کی طرح اعتمادانہ قدم اٹھاتی ہوئی آہستہ آہستہ صدر دروازے کی طرف لوٹ جاتی ــــ دروازے کو تھوڑا سا بند کر کے پٹ کی اوٹ سے باہر جھانکتی ــــ جیسے اس گھر کی مالکن کو اکثر اس نے کرتے دیکھا تھا۔ پھر وہ دوڑ کر بیٹھک میں نکل جاتی ــــ اور وہاں پڑے ہوئے سینٹھے کے موڑھے ادھر ادھر کھینچنے لگتی ــ جیسے وہ اپنی بیٹھک ٹھیک کرنے میں منہمک ہو۔ بیڑی کے ٹکڑے چن چن کر باہر پھینکتی جاتی ــــ اور بڑبڑاتی رہتی۔

بہ تمیز ــــ بیڑی جلتی پھینک دی۔ اگر آگ لگ جاتی گھر میں تو ــــ تو ان کے باپ کا کیا بگڑتا ــــ اور میاں تو بربادی لگ جاتی۔

وہ چودھرائن کے الفاظ دہراتی جاتی اور اس کی آنکھیں بار بار سر آہٹ پر اٹھ جاتیں۔ کہیں کوئی اسے یہ سب کرتے ہوئے۔۔۔ دیکھ نہ لے۔ پھر وہ اندر چلی جاتی۔ سلمہ کو بلانے ــ اور جب سلمہ کمرے میں سے کودتی ہوئی دالان میں آتی تو اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ کمرے کے دروازے سے نکلتی ہوئی سلمہ اسے بہت بھلی لگتی ــ اور سلمہ کو دالان میں ہی چھوڑ کر وہ جھٹ سے کمرے میں گھس جاتی اور پھر وہاں سے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی دالان میں آتی۔ جیسے وہ اپنے گھر میں چل رہی ہو، اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے کو بالکل بھول جاتی۔ وہ غرور سے اونچی اونچی دیواروں کو دیکھتی ــ جیسے وہ سب اسی کی ملکیت ہوں ــ اور پھر سلمہ اسے خوابوں کی دنیا سے جھنجھوڑ دیتی۔ زینب چلو کھیلیں ــــ اور زینب چونک اٹھتی ــ اوں ــ ہاں چلو ــــ چلو گھروندا ــ گھروندا کھیلیں۔

وہ اپنے گھر کے سامنے والی املی کے نیچے کھیلنے بیٹھتی ــــ سب ہی لڑکیاں گھروندے بناتیں ــ گیلا رے کی زمین پر پیر پھیلا کر بیٹھ جاتیں، اور ایک پیر کو مٹی میں تھوپ کر اوپر سے دونوں ہاتھوں سے مٹی کو پیٹتی رہتیں ــــ اور منہ سے کہتی جاتیں۔

چیٹی چیٹی گھر بناؤ ــ گھر بنا کر گھر باؤ۔

سب کے گھروندے بن جاتے۔ زینب خوش ہو کر سب کو دکھاتی۔ میرا گھروندا دیکھو ــ دیکھو یہ کمرہ ــــ ایسے یہ بڑا سا ــ یہ اتنا بڑا آنگن اور یہ رہا باہر کا بیٹھک ــــ کونے میں بنا ہوا چھوٹا سا باورچی خانہ اور کوٹھری ــ مٹی کے گھروندے میں دیکھنا ہی کیا بس ایک خوب بڑا سا چبوترا اور دور تک دیوار کھینچ کر بنی ہوئی آنگن ــ ہاں سلمہ کا گھروندا وہ غور سے دیکھتی ــــ اور پھر ہنستے ہنستے دہری ہو جاتی ــــ نہ جانے کتنے کمرے ــ برآمدے اور ڈیوڑھی وہ مذاق اڑاتی ــــ آہا ان کو دیکھو بالکل بدھو ــ بھلا گھر میں کہیں اتنے سارے ہوتے ہیں ــ اور سلمہ منہ بناتے ہوئے چڑھ جاتی۔ ہٹ تجھے کیا معلوم ــــ دیکھو ــــ یہ دیکھو سونے کا کمرہ ــ یہ کھانے کا کمرہ۔ یہ دوستوں ملنے کا کمرہ اور یہ پڑھنے کا کمرہ ــــ چچا جان کا گھر بس بالکل ایسا ہے۔۔۔۔ میں تو بڑے ہو کر ایسا ہی گھر بنواؤں گا ــــ اور زینب سلمہ کی باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے اسے بے وقوف سمجھ کر پھر اپنے گھروندے میں لگ جاتی ــ شام کے سرمئی پردے گاؤں کے ذرے ذرے کو دھندلا کر دیتے۔۔ ۔۔ اور سب لڑکیاں اپنے گھروں کو چل دیتیں ــ زینب کا گھروندا ماتا

تک بنا رہتا اور جب وہ سونے جاتی تو اپنے گھروندے کا دروازہ مٹی کی پتلی سی دیوار بنا کر بند کر جاتی۔

روزانہ رات کو وہ ماں سے لڑتی۔ ماں تم گھر بنوا لو ــــ میں اس میں نہیں رہوں گی۔ اور ماں کے سمجھاتے سمجھاتے اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ پھر وہ اپنے کمرے اور دالان والے گھر کی رانی بن جاتی۔ رات بھر وہ چودھرائن کی طرح اپنے گھر کے کاموں میں مشغول رہتی۔ کبھی مرغیاں ہنکار رہی ہے۔ کبھی باورچی خانہ صاف کرتی کبھی کوٹھری بند کرتی اور کبھی کمرے میں تخت پر بیٹھ کر پان چباتی ــــ مگر جب صبح آنکھ کھلتی تو کوٹھری میں گھسا ہوا منہ اور پیروں میں الجھا ہوا پیال آسے بتا دیتا کہ وہ گھر کے بجائے صرف چھپر میں ہے۔ وہ جلدی سے آنکھیں بند کر لیتی مگر پھر اسے اٹھنا ہی پڑتا ــــ قریب ہی گھر گھر کرتی ہوئی چکی اسے کب سونے دیتی۔ وہ اٹھ بیٹھتی اور پھر اپنے گھروندے کو دیکھنے کے لیے جلدی جلدی باہر بھاگ جاتی۔ کہیں رات میں کسی نے گھروندا تو نہیں گرا دیا ــــ اور یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ جاتا کہ صبح گلیارے سے گزرتے ہوئے جانوروں نے اس کے گھر کو کیسے اپنے کھروں سے تباہ کر دیا۔ وہ تھوڑی دیر تو افسوس کرتی مگر پھر جلدی سے دوبارہ بنانے بیٹھ جاتی۔ وہ ڈرتی کہیں سلمہ اور منی وغیرہ نہ دیکھ لیں کہ اس کا گھروندا مٹ گیا ہے۔

دن مہینوں اور مہینے برسوں میں تبدیل ہو گئے اور اب زینب کا مٹی کے تودے میں پیر دبا کر بننے والا گھروندا اس کے ذہن میں بننے لگا۔ رات کو ماں سے ضد کرنے کے بجائے وہ پیال کے کونے میں دبک کر چپکے سے اپنے گھر کے بارے میں سوچتی رہتی ــــ گھر کے بارے میں سوچتے سوچتے اس کا دل دھڑک اٹھتا۔ اس کے بدن میں گدگدی ہونے لگتی ــــ اس کے خیالوں میں اب گھر میں ایک کمرہ ایک دالان ایک آنگن کے علاوہ ایک گھر والا بھی آ چکا تھا ــــ

سلمہ سے اس کی دوستی اب بھی تھی۔ مگر اب وہ گھروندے بنا کر سلمہ سے اپنی برتری کا اظہار نہیں کر سکتی تھی سلمہ کے غرور کے آگے وہ محض اس لیے سر جھکا دیتی کہ اگر سلمہ ناراض ہو گئی تو پھر وہ کس بہانے اپنے خیالوں میں بسے ہوئے گھر میں آ سکے گی ــ اکثر وہ چودھری صاحب کے گھر میں دن بھر رہتی ــــ سارے باورچی خانے کی دیواریں چھت تک پوتتی۔ چولھا ٹھیک کرتی۔ فرش دھوتی اور یہ سب کام وہ اس لگن سے کرتی کہ چودھرائن خوش ہو کر سلمہ کو ڈانٹنے لگتیں دیکھ زینب کو سب کام کیسے سلیقہ سے کرتی ہے ــــ بچاری کے نہ گھر بار تب بھی . . . . . اور زینب کے چلتے ہوئے ہاتھ یہ سنتے ہی ٹھٹھک جاتے ــــ نہ گھر نہ بار . . . . وہ تصور کے سنہرے جھولے میں سے حقیقت کی چٹان پر دھڑام سے جا گرتی۔ ہاں ٹھیک ہی تو ہے وہ سلمہ کے گھر میں کام کر رہی تھی وہ تو بالکل بھول ہی گئی تھی کہ یہ اس کا اپنا گھر نہیں ہے ــــ وہ خاموشی سے کام پورا کرتی اور چپکے سے اپنے ایک چھپر والے گھر میں چلی جاتی ــــ ایک چھپر اور ٹٹیوں والے گھر میں . . . . . .

اس کی کنول جیسی شفاف آنکھوں میں شبنم کے قطرے ابھر آتے ــــ اور وہ چپکے سے کونے میں بیٹھ کر انہیں اپنے آنچل میں چھپاتی رہتی ــــ ماں اپنے کاموں میں لگی رہتی اور باپ تو صبح ہوتے ہی مزدوری پر چلا جاتا ــ اور

اسے تنہائی میں سب کچھ سوچنے کے لیے کافی وقت مل جاتا ___

اب وہ اٹھارہ انیس سال کی ہو چکی تھی مگر جوانی کے سارے رنگین سپنے اس نے مٹی اور چونے کے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے گھر کے ہی اردگرد بنے تھے ___ چھوٹا سا صاف ستھرا اسلمہ جیسا گھر ___ وہ فاقے کر سکتی تھی۔ اسے زیور کا بھی شوق نہیں تھا۔ اسے پرواہ نہیں تھی کہ اس کی اوڑھنی میں کتنے پیوند لگے ہیں۔ لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے ذہن کو گھر کے تصور سے چھٹکارا نہ ملتا ___ وہ زمین پر بیٹھی اپنی سکھیوں سے باتیں کرتی رہتی اور ننھی سی کنکری اٹھا کر زمین پر بے خیالی میں لکیریں کھینچتی رہتی۔ اور وہ لکیریں آخر میں چودھری صاحب کے گھر کا پورا نقشہ بن جاتیں۔

اس کی سکھیاں شادی کی باتیں کرتیں ___ مگر زینب ہمیشہ گھر کے بارے میں بولتی ___ جب اس کی کوئی سکھی شادی کے بعد سسرال سے واپس آتی تو زینب سب سے پہلے سوال کرتی تیرا گھر کیسا ہے۔ لڑکیاں ہنس دیتیں۔ گھر کی بات پوچھتی ہے بے وقوف گھر والے کی پوچھ ___ اور زینب مسکرا دیتی ___ سب لڑکیاں دولہا کے بارے میں پوچھتیں اور زینب گھر کے بارے ___ تو جہاں بیٹھی تھی کمرہ تھا یا چھپر ___ آنگن تو ضرور ہوگی۔

اور جب زینب کے باپ نے اس کی شادی کی بات پکی کر دی تو وہ بے حد فکر ہوئی۔ پتہ نہیں سسرال میں گھر ہے یا چھپر اور پھر اس نے ایک رات خواب میں دیکھا۔ وہ دلہن بنی ڈولے سے اتر رہی ہے۔ اونچی سی دہلیز کے بعد جب اس نے اندر قدم رکھا تو کمرہ تھا۔ کمرے کے بعد وہ نہ جانے کتنی بڑی آنگن سے چل کر دالان میں پہنچائی گئی بالکل عام دیہاتی کی دلہن کی طرح۔ گھر بھی بالکل اسلمہ کے گھر سے ملتا جلتا ہی تھا۔ پھر نہ جانے کتنی رسموں کے بعد جب رات آئی تو اسے دالان سے اٹھا کر کمرے میں بٹھایا گیا۔ اس نے موقع ملتے ہی چھت کو جھانک لیا۔ موٹی موٹی دھنیوں والا سفید سفید کمرہ اور وہ مسرت سے بھول گئی ___ وہ رانی ہے ___ چودھرائن ___ اس کے بنائے ہوئے بچپن کے نہ جانے کتنے گھروندے مٹے تھے ___ اور ___ اور آج اس کا یہ گھر ___ کتنا شاندار ہے وہ اسلمہ کو ضرور بلائے گی اور چودھرائن کو بھی ___ اس کے کانوں میں چودھرائن کے الفاظ گونج اٹھے ___ نہ گھر نہ بار ___ وہ مسکرا دی ___ ہوں ___ اب تو میں بالکل... چودھرائن کی طرح رہوں گی۔ سارا کام میں خود کروں گی ___ کوئی کام ساس کو نہ کرنے دوں گی ___ روزانہ آنگن دھو ڈالوں گی پتہ نہیں مرغیاں ہیں یا نہیں وہ اپنے ذہن میں پورے گھر کے انتظام کا خاکہ بنا رہی تھی ___ کہ باہر زور زور سے کچھ بجنے لگے ___ پھر وہ آوازیں آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئیں ___ اور پھر گھر گھر کرتی ہوئی چکی کی آوازیں منتقل ہوگئیں ___ اس کے پیر میں الجھے ہوئے پیال نے اسے بتا دیا کہ وہ ابھی اس چھپر کے بندھن کو توڑ نہیں سکی ہے۔ وہ اٹھ بیٹھی اور آنکھیں ملتی ہوئی ماں کے ساتھ چکی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ چکی گھسیٹتے رہے اور وہ اپنے خوابوں میں بھٹکتی رہی۔ چکی سے اٹھ کر دوسرے کام کرتی رہی۔ آج وہ بے حد خوش تھی۔ اس نے سسرال والے گھر کو خواب میں دیکھا تھا۔ اب اس کے تصور میں اس کے گھر کی واضح شکل موجود تھی۔ وہ ایک لمحہ بھی اپنے گھر کو نہ بھول پاتی۔

ڈولے میں بیٹھتے ہی زینب رخصتی کا رونا دھونا بھول گئی۔ اب وہ ایسی جگہ جا رہی تھی جہاں اس کے بچپن کے

خواب پورے ہوں گے۔ مٹی کے بنائے ہزاروں گھروندے مٹ کر اسے ایک گھروندا مل رہا تھا ۔۔ اس کا اپنا گھروندا۔ کمرے، دالان اور بڑی سی آنگن والا گھروندا ۔۔ اب اسے کوئی جانور اپنے پیروں سے روند کر تباہ نہ کر سکے گا۔ وہ مالکن بننے جا رہی ہے۔ مالکن ۔ شاید ساس مالکن نہ بننے دے۔ مگر ہے تو وہ بہو ہی ۔۔ اور پھر بہو کا گھر ہوتا ہی ہے۔

ڈولا رکا ۔ عورتوں کا شور و غل سنائی دیا۔ چھم چھم زیور چھنکے اور کسی نے جھک کر اسے ڈولے سے باہر نکالا۔ اس نے جان بوجھ کر پیر زمین پر ٹکا دیا۔ کچی مٹی کی ٹھنڈک نے اس کے تلووں سے بتا دیا کہ فرش کچا ہے۔ اس کا منہ گھونگھٹ میں بالکل لپٹا ہوا تھا۔ ایک عورت کی گود میں وہ کہیں جا رہی تھی۔ اس نے سوچا شاید وہ آنگن سے گزر رہی ہے۔ پھر اسے ایک پلنگ پر بٹھا دیا گیا۔ وہ سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ گھونگھٹ ذرا ملکا ہوا، اور اس کی نظریں سامنے کی دیوار پر جم گئیں ۔ نرکل سے بنی ہوئی ٹٹی ۔ اس نے جلدی سے دوسری طرف مڑ کر دیکھا دوسری ٹٹی ۔۔ اور جب اس نے گردن پیچھے موڑی تو کچی سی دیوار نظر آئی۔ چھوٹی ٹٹی سے تپی ہوئی صاف ستھری دیوار ۔۔ اس کا سر گھومنے لگا اور جب ایک عورت نے اس کی بگڑتی ہوئی حالت کا اندازہ کر کے اسے اپنے گھٹنے پر سر رکھ کر لٹا لیا۔ تو اس کی آنکھیں چھپر سے لٹکتے ہوئے پتار و پر جم گئیں ۔۔ دھویں سے کالا چھپر۔ اس کے دل و دماغ پر جیسے اندھیرا چھا گیا ۔۔ گھور اندھیرا۔ پھر اسے کچھ نہیں معلوم اس سے کتنی رسمیں کرائی گئیں۔ اور کب رات ہو گئی ۔۔ بس اس کے کانوں میں کبھی کبھی دور سے ایک آواز ابھرتی محسوس ہوتی ۔۔ بچاری کے نہ گھر نہ بار ۔۔ پھر وہ نہ جانے کہاں کھو جاتی ۔

صبح اسے صرف یہ یاد تھا کہ حنیف نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ وہ شہر میں اس کے ساتھ مکان لے کر رہے گی۔ اسے یہ کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کب اور کس طرح حنیف سے پہلی ہی ملاقات میں ایک گھر کے بارے میں کہہ سکتی تھی۔ صبح اس نے آنگن سے دیکھا باہر نیم کی چھاؤں میں ایک طرف دو نادیں گڑی ہوئی تھیں جن میں دو مریل قسم کے بیل چارہ کھا رہے تھے۔ اس سے ذرا ہٹ کر دوسری طرف دو بانس کی چارپائیاں پڑی تھیں۔ جن پر کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس کے گھر کا بیٹھکہ بھی نیم کی چھاؤں تھی ۔۔ بالکل اس کے میکے کی طرح ۔۔ وہاں املی کا سایہ تھا اور یہاں نیم کا ۔۔ اس کا دل بھر آیا۔ اور آنکھوں میں آنسو جھلک گئے۔ اس کے گھروندے سے بالکل مختلف بیٹھکہ ۔۔ وہ خاموش کوٹھری میں لوٹ گئی ۔۔ وہ اپنے دل کو لاکھ سمجھا رہی تھی کہ وہ تو شہر میں جا کر رہے گی۔ مگر امڈتے ہوئے آنسوؤں کے دھارے کو کسی طرح نہ روک سکی۔

کئی دن گزر گئے۔ آج وہ میکے جا رہی تھی کیسے وہ اپنے گھر کے بارے میں بتائے گی کہ اس کے خیالوں میں بسا ہوا گھر بھی اس کے گھروندوں کی طرح مٹ چکا تھا۔ وہ بے حد پریشان تھی اور آخر حنیف آخری وعدے کے بعد کہ شہر جاتے ہی وہ مکان تلاش کر کے اسے جلد ہی لے جائے گا ۔۔ وہ میکے چلی گئی۔

چھ سات مہینے گزر گئے۔ حنیف دن بھر شہر میں رکشا چلاتا، اور ساتھ ہی مکان کی تلاش میں سرگرداں رہتا

اسے زینب سے کیے ہوئے وعدے دھندلے نظر آنے لگے تھے۔ بہت کوشش کے بعد آخر اسے ایک کرایہ کا چھوٹا سا مکان مل گیا۔ اور پھر وہ جلدی ہی گاؤں چلا گیا۔ زینب اپنے مکان کے بارے میں جان کر پھولے نہ سمائی ساس اور ماں دونوں نے ہی منع کیا کہ وہ ابھی شہر نہ جائے۔ وہ ماں بننے والی تھی۔ شہر میں اکیلی کیسے رہے گی اس نے خود تو کوئی جواب نہ دیا مگر حنیف کو اپنے ارادہ پر اٹل رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔

جب وہ اپنے شیش محل میں داخل ہوئی تو اس نے محسوس کیا جیسے وہ پریوں کی شہزادی ہے جو اپنے جادو کے محل کی پوری طرح مالک ہے۔ اس نے فخر سے گردن اٹھا کر سارے مکان پر نظر دوڑائی اور پھر اپنے مختصر سے سامان کو باقاعدہ سجانے لگی۔ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اتنی بڑی آنگن، کوٹھری، کمرہ۔ کیسے وسیلہ، چودھرائن، منی سب کو بلا کر دکھا دے کہ وہ اب اس مکان میں رہے گی۔ . . . . . وہ بے حد خوش تھی لیکن اس کی خوشی دیکھنے والا صرف حنیف ہی تھا۔ یہ سوچتے ہی اس کی خوشی میں جیسے بہت بڑی کمی ہو گئی ہو مگر تھوڑی دیر میں ہی وہ اس گھر کی مالکن کے تصور میں جیسے کھو گئی۔ حنیف رکشا لے کر چلا گیا۔ اور وہ اپنے بچپن کے خوابوں کی تعبیر میں کھو گئی۔ اس کا اپنا یہ گھر کتنا اچھا تھا۔ بالکل اس کے گھروندے سے ملتا جلتا۔

چند ہی دنوں میں زینب نے محلہ میں اچھی خاصی دوستی کر لی۔ سب کو ہی تعجب ہوتا کہ دیہات کی یہ لڑکی کس سلیقے سے گھر سجائے رکھتی ہے۔ اس طبقہ کی دوسری لڑکیاں اور عورتیں دن بھر ہر سودے والے سے کچھ نہ کچھ خرید کر کھاتی رہتیں۔ یا پھر سنگھار کی سستی چیزیں خریدتی رہتیں۔ پیتل کے زیور، موتی کے بُندے، ناخونوں کی لالی، پوڈر وغیرہ مگر زینب ان سب چیزوں کی طرف کبھی نظر بھی اٹھا کر نہ دیکھتی۔ اس کا شیش محل ابھی پوری طرح کہاں سج سکا تھا۔ ابھی اسے تخت، پلنگ اور نہ جانے کتنی چیزیں خریدنا تھیں، اور چھوٹی چھوٹی کتنی ہی چیزوں کی فہرست اس کے ذہن میں موجود تھی۔ جسے پورا کرنے کی وہ ہر کوشش کرتی۔ وہ بھوکی رہتی۔ اس نے ایک کپڑا ابھی بنوانے کا نام نہیں لیا۔ وہ اپنے سنگھار کی بھی کوئی چیز کبھی نہ خریدتی۔ جب اس کی مٹھی سے کبھی کچھ روپے کھسک جاتے تو گھر میں کوئی نئی چیز سج جاتی۔ کبھی کوئی دری کبھی کوئی چادر، اور کبھی چوکی یا مونڈھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس نے اچھا خاصہ سامان اکٹھا کر لیا تھا۔

برسات گزر چکی تھی اور آسمان کی بلندیوں سے بکھرے ہوئے ننھے ننھے قطرے دھرتی کے منہ میں پہنچ کر ابدی نیند سو چکے تھے، دور تک پھیلے ہوئے آسمان نے مہینوں کے اوڑھے ہوئے بادلوں کے سفید اور سیاہ لبادوں کو دور پھینک دیا تھا اور چمکتا ہوا نیلا آسمان بڑے بڑے بھیانک داغوں سے یکسر صاف ہو چکا تھا۔ برسات کے بعد ہی زینب کی ساس ایک ننھے منے مہمان کا استقبال کرنے آنے والی تھی۔ اور اب زینب کو اپنی ساس کا انتظار رہتا۔ وہ سوچتی جب ساس آئے گی تو کتنی خوش ہو گی اس نے چند ہی مہینوں میں کتنا بہت سامان اکٹھا کر لیا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا گھر بھی چودھری صاحب کے گھر سے کچھ کم نہ رہ جائے گا۔ وہ دن بھر گھر میں ہی لگی رہتی۔ کبھی دیوار کی مرمت ہو رہی ہے کبھی فرش برابر ہو رہا ہے۔ حنیف جب بھی گھر آتا زینب کو گھر میں لگا پاتا۔ اسے زینب کا یوں ہر وقت مشغول رہنا

بُرا لگتا۔ مگر زینب تیز ہو کر جواب دیتی ـــ مردوں کو کیا معلوم گھر بنانے میں کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔ انھیں بس کمانے سے مطلب۔ گھر عورتیں بناتی ہیں عورتیں۔ وہ پوری طرح دھاک جاتی ـــ اور حنیف خاموش ہو جاتا ـــ وہ جانتا تھا کہ اس کی تھوڑی آمدنی میں کتنی جلدی اس کا گھر دلہن کی طرح سجتا جا رہا تھا ـــ اور پھر اسے اس کا بھی احساس تھا کہ نہ جانے کیسے وہ اپنے ساتھیوں میں اب ذرا بھاری بھرکم مانا جانے لگا تھا ـــ

اور پھر اس نے ایک دن چوراہے پر سنا گومتی میں سیلاب آ رہا ہے۔ برسات کے بعد یہ بے وقت کا سیلاب کیسا ـــ کسی نے کہا ارے سیلاب نہیں خدا کا قہر کہو قہر ـــ دن بھر شہر میں سنسنی پھیلی رہی۔ گومتی کی دھیمی دھیمی مستانی چال قہر و غضب میں تبدیل ہو گئی تھی۔ دوپہر میں جب کھانا کھانے گھر آیا تو اس نے زینب کو خبر دی کہ شہر میں سیلاب کا پانی پھیل رہا ہے شہر کے بیچوں بیچ پگڈنڈی بناتی ہوئی نازک اندام گومتی چنگھاڑ چنگھاڑ کر خدائی خدائی کو للکار رہی ہے ـــ اور اپنے کناروں کو نگلتی ہوئی انسانی آبادی میں گھس آئی ہے۔ لوگ بے گھر ہو کر ادھر ادھر بھاگ رہے ہیں ـــ اور جب حنیف واپس چوراہے پر آیا تو خبروں نے دوسرا رخ اختیار کر لیا تھا ـــ ریل کے پل پر سے لوگوں نے دیکھا ـــ عورتیں، بچے اور ہزاروں جاندار پانی کے طوفان میں لڑھکتے ہوئے موت کی گود میں جا رہے ہیں ـــ کوئی عورت اپنے بچے کو سینہ میں دبائے پانی میں ڈوبتی ابھرتی دور نکل گئی ـــ تو کوئی بڑھیا اپنی جنم بھر کی گٹھری پیٹھ پر باندھے لہروں کے ساتھ کروٹیں لیتی نظروں سے اوجھل ہو گئی ـــ نہ جانے کتنا سامان ان طوفانی لہروں میں ہلکورے لیتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ان بھیانک تباہیوں کی خبروں سے محفوظ جگہوں پر رہنے والے بھی ہراساں نظر آ رہے تھے ـــ دوسرے دن پانی اور بھی پھیل گیا۔ سڑکیں انسانوں سے بھر گئیں اور گھر پانی سے خبر آئی امام باڑے میں پانی ہی پانی ہے ـــ آرٹ اسکول اور ندوہ پانی میں ٹاپو نظر آ رہے ہیں ـــ یونیورسٹی کا زیادہ حصہ پانی میں غرق ہو چکا ہے۔ یونین بلڈنگ دھارے کی ضد میں ہے ـــ اس کی خیریت نہیں ـــ اور سکندر باغ کی عمارت کی بُرجی تو فاتح سکندر اعظم کی اس تلاش کی نشان دہی کر رہی تھی جہاں اس کا نصب کردہ جھنڈا لہرا لہرا کر سمندر کی راہ پر چلنے والوں کو آگاہ کر رہا تھا ـــ ادھر مت آنا ـــ یہاں سمندر کی تھاہ نہیں ہے ـــ

اور اب اس کے محلے والوں نے بھی خطرے کا احساس کیا ـــ رات تک پانی ضرور اس محلے میں بھی پھیل جائے گا غراتی ہوئی لہریں ابھرتیں اور زمین کا تھوڑا سا خشک حصہ ان کی تہہ میں پہنچ جاتا۔ اور قدم قدم پر بڑھتے ہوئے اس طوفان سے گھبرا کر لوگ محلہ خالی کرنے لگے۔ زینب سے بھی حنیف نے مکان چھوڑنے کو کہا ـــ مگر وہ جانے پر راضی نہ ہوئی ـــ بھلا وہ کیسے خالی کر دے یہ گھر ـــ کتنی منتوں اور دعاؤں کے بعد تو اسے ملا تھا ـــ نہ معلوم کتنے خواب اس نے اس گھر کے دیکھے تھے اور اب تعبیر سے یوں منہ موڑ لے۔

مغرب کے وقت سارا محلہ خالی ہو گیا۔ حنیف کو زینب کی ضد کے آگے سر جھکانا پڑا ـــ اور اسے بھی رات گھر میں ہی رہنا پڑا۔ پانی اچانک تیزی سے بڑھنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے محلے میں پھیل گیا۔ زینب کے شیش محل کے درشن کے لیے اس نے نالی کا راستہ اختیار کیا۔ تیز لہروں کی ڈراونی آواز محلے میں گونجنے لگی۔

اور اس بھیانک گونج کے ساتھ ہی اتاد کا مکان پانی میں گم گھا گر کرنے لگے۔ زینب کا پچھلا کمرہ ایک دھماکے کے ساتھ گرا۔ اور زینب کانپ گئی۔ اب حنیف نے زینب کو زبردستی گھر چھوڑنے پر راضی کیا اور زینب خاموش ہو گئی ــــ باہر دو ایک سرکاری ناؤیں انسانوں اور ان کے سامان کو باہر نکالنے میں مشغول تھیں۔ کبھی کبھی شور و غل سنائی دیتا کہ ناؤ والا لوگوں کو کنارے سے اتار کر سامان لادے ہی واپس جا رہا ہے ــــ شور و غل اور لہروں کی گڑگڑاہٹ میں ناویں غائب ہو جاتیں ــــ اور لوگ سامان کا غم بھول کر جان بچ جانے پر ہی خدا اور گورنمنٹ دونوں کا شکر ادا کرتے۔

حنیف اور زینب ایک لگے ــــ اور کچھ سامان اپنے سروں پر لاد کر گھٹنوں تک پانی میں کچھ دور چلے اور پھر بڑی مشکل سے کسی رحم دل ملاح کو ان کی جانوں کی قیمت کا احساس ہوا اور یہ لوگ سڑک پر پہنچا دیے گئے جہاں سیلاب کی سیر کرنے والے اور سیلاب کے شکاروں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ کچھ دور تک تو سڑک کے اوپر بھی پانی لہریں لے رہا تھا۔ اور آگے سڑک بالکل بند ہو چکی تھی ــــ شاید گومتی سڑکوں اور گلیوں میں گھوم گھوم کر شہر کی تمام غلاظت کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور ہزاروں بے گھر لوگ فٹ پاتھ پر پڑے تھے۔ کارپوریشن کی طرف سے بانسوں کے سہارے ٹین کے سائبان ان تباہ حالوں کے لیے ڈال دیے گئے تھے۔ زینب اور حنیف نے بھی ایک کونے میں قبضہ کر لیا تھا ــــ یوں ہی تین دن گزر گئے۔ بھوک، پیاس، خوف اور غم سے زینب کا دم گھٹا جا رہا تھا ــــ پہلی کا پٹرنے کھانے کے بڑے بڑے تھیلے برسائے۔ موٹی موٹی لوہے کی تجوریوں میں سے پوریاں ابل پڑیں۔ مگر یہ سب نگلنے کے لیے حلق رندھ چکا تھا۔ ہزاروں گھروں کے ساتھ ہی اس کا گھر بھی مٹ چکا تھا ــــ جس گھر کا کونہ کونہ اس نے بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کر کے سنوارا تھا۔ اس کا ایک ایک حصہ زمین پر ڈھیر ہو چکا تھا۔ کرایہ کے اس گھر کو اس نے اپنا سمجھ کر سجایا تھا ــــ اب وہ کیا کرے گی۔ اس کا سارا سامان برباد ہو چکا تھا۔ اور پھر اسے تو بہت جلد ہی سر چھپانے کے لیے ایک پناہ گاہ کی ضرورت تھی ــــ اس کا ننھا مہمان ــــ وہ سوچتے سوچتے تڑپ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ــــ اور اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں کے سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک کوٹھی چمک رہی تھی۔ سفید چاندنی میں نہائی بہت بڑی کوٹھی ــــ زینب کی نگاہیں اس پر جم گئیں ــــ اتنی بڑی کوٹھی میں کتنے کمرے ہوں گے؟ کتنے دالان ہوں گے؟ اس نے سوچا۔ شاید سلمہ کا گھر وندا بھی ٹھیک ہی تھا جس کا اس نے ہمیشہ مذاق اڑایا ــــ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی اس کوٹھی کے اندر دیکھے کیسی بنی ہے، کتنے خانے ہیں اس میں۔ ایک دن جب کوٹھی کے دروازے پر سیلاب زدوں کو دال اور آٹا ڈلیوں سے ناپ ناپ کر بٹ رہا تھا۔ وہ بھی لینے گئی تھی۔ اس نے ڈیوڑھی میں بڑھ کر اندر جھانکنے کی کوشش کی مگر اندر دوسری ڈیوڑھی کی موٹی سی دیوار سامنے تھی، اور وہ اندر نہ دیکھ سکی۔ رات کو وہ ٹین کے سائبان کے تلے لیٹے لیٹے کوٹھی کے روشندانوں سے پھوٹتی ہوئی برقی روشنی تکا کرتی۔ کھڑکیوں پر لٹکنے پردوں میں اس کی آنکھیں الجھ

جاتیں۔ اور پھر سوچتی کتنا بڑا ہے یہ گھر — نہ معلوم کتنے کمرے تو بند پڑے ہوں گے۔ اور جب رات کی بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی اس کے بدن میں چبھ جاتی تو اس کی نگاہیں روشن دان سے نکلتی ہوئی گرم گرم روشنی پر جم جاتیں —

حنیف خراٹے لے کر سوتا رہتا اور وہ سوچتی رہتی اس گھر کے بارے میں جو اجڑ گیا۔ اس کے گھر کے بارے میں جو نہ بن سکا۔ اور پھر جس روز کارپوریشن کے مزدور سائبان کی ٹین اور بانس ٹھیلوں پر لاد رہے تھے — اسے چکر آگیا — اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا — اور اس کا سر حنیف کے سینے سے ٹک گیا — بانس کے چاروں طرف پرانے ٹاٹ کے پردے جو اس نے لٹکائے تھے ایک طرف کنارے ڈھیر تھے۔ اور سامان نیلے چمکتے ہوئے آسمان کے نیچے بکھرا پڑا تھا — اس نے سوچا اس کا گاؤں کتنا اچھا تھا — ایک چھپر — صرف ایک چھپر اور ٹٹیوں سے گھرا آنگن مٹی کا گھروندا — کتنوں کو پناہ دیتا تھا — میرا گھروندا، ایک کمرہ اور ایک دالان والا جو بہہ گیا — مٹ گیا — اور — اور پھر یہ سلمہ کا گھروندا — نہ جانے کتنے کمروں اور دالانوں والا — مگر — مگر سب دروازے مقفل —

حیدر پٹھان

رات پالی

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

کردار:-

میر جکر	مرہٹی اخبار کا ایڈیٹر
بیدل	اردو " "
مکرجی	بنگالی " "
تھامس	انگریزی " "

سلیمان
ارجن
انتونی
گربچن سنگھ
} چار مزدور

(پردہ اٹھتا ہے۔ آہستہ آہستہ روشنی ابھرتی ہے۔ تھامس کے اخبار کا آفس سامنے آتا ہے۔ اسباب اس طرح بکھرا ہوا ہے گویا آفس کی مرمت کا کام جاری ہو۔ دیواروں پر اُن انگریز شخصیتوں کی تصویریں آویزاں ہیں جنھوں نے ہندوستان کو اپنا گھر بنا کر اسی کی خدمت میں اپنی زندگی وقف کر دی تھی . . . ہارنیمان . . بسینٹ اینی بسینٹ . . . ڈی ایف اینڈریوز . . . تھامس بیزارگی کے عالم میں ٹہل رہا ہے۔ کبھی اس سرے، کبھی اس سرے . . کبھی کرسی پر دم لیا تو کبھی میز پر چپکرا مارا۔

عقب میں سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ ایک جلوس کے گزرنے کا شور سنائی دیتا ہے . . . "انگریزی ہٹاؤ" . . . . . "ہندی بھاشا امر ہے" . . . "اردو بدیسی زبان ہے" . . "ہندی، ہندو، ہندوستانی . . ." . . "اردو مر نہیں سکتی . ." کے نعرے گونجتے ہیں . . . کچھ وقفہ، جس میں

صبا

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا نغمہ پھر ایک بار ابھرتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ موسیقی دھیمی پڑتی ہے اور عقب میں ایک اور شور بلند ہوتا ہے۔ . . ." سکھ دھرم زندہ باد" . . "پنجابی صوبہ بن کے رہے گا" . . . "ہندو ظلم نہیں چلے گا" کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ پھر ایک اور وقفہ جس میں گھوڑوں کی ٹاپوں، موٹر کاروں اور سڑک کی چہل پہل کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ . . ." مہاراشٹرا جھالا پاہجے . . ." " ما مبئی امچی" کے ملے جلے شور میں کچھ گولیاں چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے . . . . اور تھامس گھبرا کر ایک صندوق میں چھپ جاتا ہے . . . . ایک سناٹا . . . . تھامس صندوق سے باہر آتا ہے . . . ہاکروں کی آوازیں . . . " آسامیوں اور بنگالیوں میں مارا ماری ہوگئی . . . . . زبردست فساد چھوٹ پڑا . . . . آج کی گرما گرم خبر . . . . مہاراشٹرا میں گولی چل گئی . . . . بہرام پور میں گائے بھڑک کر دوڑی . . . . فرقہ وارانہ فساد . . . . دس ہلاک، تیس زخمی . . . آج کا اخبار . . . آج کا اخبار . . ." . اور عقب میں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا گیت ختم ہوتا ہے (اس سارے وقت میں تھامس اسی بے چینی کے ساتھ ٹہلتا رہا ہے۔ اور گھڑی پر نظر ڈالتا ہے۔)

تھامس :۔ ڈیم فولس . . . . چھ بجے کا ٹائم فکس ہوتا ہے اور ابھی تک میٹنگ کو اٹینڈ کرنے کوئی آتا نہیں ہے . . . . ویسٹ آف ٹائم . . . . ہمرا ٹریبل ورک پینڈنگ ہے . . . (چکر لگانا جاری ہے) ہاؤ گڈ نیوز . . . . بنگالیز اینڈ آسامیز . . . . وبری فائن . . . . اس کا تو بینر ہیڈ لائن (BANNER HEAD LINE) مارنے کو مانگتا . . . کتنا لوگ اس نیوز کو دل سے پڑھے گا . . . پیپر کا سیل کتنا بوٹ بڑھ جائے گا . . . . بنگالی لوگ بہت گڈ . . . بہت گڈ . . . . خوب سنسیشن (SENSATION) والا کیبر پیدا کیا . . . . مراٹھی لوگ بھی جولی گڈ ہے " امچی ما مبئی"، کا بوم مارا تو ایک اخبار کو تین سال کا پرافٹ ایک سال کے اندر ہی دے دیا . . .

او گاڈ، تھینک یو . . . گڈ گولڈن ٹائم ہے . . . . ہمرا نیوز پیپر کے لیے . . . . مراٹھی، گجراتی لڑائی . . . . پبلک آوٹ آف کنٹرول . . . . جلسہ . . . . جلوس . . . . فائرنگ . . . دھڑا دھڑ، ٹھائیں، ٹھائیں (ہاتھ کو میز کے کونہ سے چوٹ لگ جاتی ہے) . . . . اور فنش فنش لیڈر لوگ کا اپیل . . . . شانتی، شانتی . . . . منسا نہیں . . . . پبلک کا غصہ . . . . لے کے رہیں گے . . . . ارے ہمارا نیوز پیپر ہوا، ہاٹ کیک کا ڈھیر ہوگیا . . . فوراً گم . . . . فنش، فنش آوٹ آف اسٹاک۔

(دیوار کی گھڑی گھنٹہ بجاتی ہے۔ تھامس گھڑی کی طرف دیکھتا ہے . . . . اس کی بیزاری شدت اختیار کرتی جاتی ہے۔ اس کا ٹہلنا تیز ہوتا جاتا ہے . . . . کھڑکی سے جھانکتا ہے . . . . . دروازے سے باہر گردن نکالتا ہے اور چلاتا ہے)

تھامس :۔ ڈیم فولس . . . . کم ناؤ . . . . کم . . . کم ناؤ . . . . کوئی نہیں آنا مانگتا ؟ . . . . کوئی

آنا سکتا نہیں؟ ویل . . . . ویل ہم آفس کے باہر کوئیک مارچ کرتا . . . گو ٹو ہیل . . . . . لفٹ رائیٹ ــ لفٹ رائیٹ۔

(بیدل لکھنوی لباس پہنے آفس میں داخل ہوتا ہے لیکن تھامس کی کوئیک مارچ کی زد میں آکر دھڑام سے گر پڑتا ہے۔ اس کی دستی چھڑی الگ جا گرتی ہے)

بیدل :۔ آہ ظالم تھامس . . . شیر دل رچرڈ نے بھی غازی صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کو اس انداز کی ٹکر مارنے کا تصور تک نہیں کیا ہوگا . . . آہ، کمر دوہری ہوی جارہی ہے . . . آہ۔

تھامس :۔ تم ہسٹری کا دو بڑا لوگ کا مجاک کرتا . . . . Look اب ایسا پیروڈی ہم سننے کو نہیں سکتا۔

بیدل :۔ ناراض نہ ہونا تھامس صاحب . . . اشتعال میں نہ آؤ۔ لو یہ کھڑے ہو رہے ہیں . . . آپ سے دو عظیم تاریخی شخصیتوں کی پیروڈی برداشت نہیں ہوتی . . . . . مگر یہاں تو ہماری تاریخ ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کی پیروڈی ہو رہی ہے۔ وہ آپ کیسے برداشت کریں گے؟ ہمارے مستقبل سے کھیل کھیلا جارہا ہے۔ وہ آپ کن آنکھوں سے دیکھ سکیں گے؟

تھامس :۔ جن آنکھوں سے تم کو دیکھتا ہے۔ جن آنکھوں سے اس SOCIAL CHAOS کو دیکھتا ہے۔ سب لفٹر دھمال مچا ہے . . . . زبان والا۔ صوبے بازی والا . . . دھرم والا . . . سب ایک ورڈ میں سما جاتا ہے . . . دھمال والا . . . . دھمال والا . . . اور ہم سب کو ایک ہی رسی سے باندھنے کو سوچتا۔ اور نعرہ لگاتا ہے NATIONAL INTEGRATION . . . چلو شروع کرو کاروائی اس کمیٹی کی . . . . . . بیدل، تم نیشنل انٹیگریشن کو کیا بولتا؟

بیدل :۔ قومی یک جہتی۔

تھامس :۔ لکھو، کوئی یک جاتی کمیٹی . . . یونیٹی کا واسطے یہ کدم اٹھانا مانگتی ہے کہ . . .

بیدل :۔ مگر اور ممبران کے قدم ابھی تک آج کی اس کمیٹی کی جانب نہیں اٹھے ہیں . . . . تھامس صاحب۔

تھامس :۔ تو کس نے ان کا کدم ادھر آنے کو روکا تھا؟ . . . کاہے کو ادھر نہیں مرا ابھی تک؟ چلاتا ہے۔ نیشنل انٹیگریشن . . . نیشنل انٹیگریشن . . . . . جو لوگ ایک ٹائم پر اکٹھا نہیں ہو سکتا وہ ایک کیسے ہو سکتا؟ . . AT LEAST ایک جگہ اکٹھا ہونے کو تو مانگتا . . . UNITY کوئی الہ دین کا چراغ نہیں ہے۔

بیدل :۔ تھامس صاحب، اس پورے مسئلہ کو آپ ٹھنڈی سوچ دیجئے . . . دیس میں جو ہنگامے ہو رہے ہیں وہ سیاسی اور سماجی ابال ہیں . . . . آپ کا اس کڑوے انداز میں پورے مسئلہ پر گفتگو کرنا، چغلی کھاتا ہے کہ اس ابال کے جراثیم آپ میں سرایت کر رہے ہیں . . . قومی یک جہتی کا یہ مسئلہ ان ہنگاموں کی گود میں پلی ہوی اکلوتی سنجیدگی ہے۔

تھامس :۔ ڈونٹ بکواس پلیز (زور سے) سنجیدگی اور اُس دھمال کا گود میں۔ واٹ نان سنس۔

(تھامس پاٹ دار قہقہہ لگاتا ہے جو اسٹیج پر چھا جاتا ہے۔ ۔ ۔ بیدل ہکا بکا کھڑا ہے۔ اسی دوران میر جکر اپنی دھوتی سنبھالتے ہوئے داخل ہوتا ہے گویا کہیں سے دوڑ کر آ رہا ہے۔ ۔ ۔ ہاتھ میں کاغذات کا ایک پلندہ ہے)

تھامس :۔ میر جکر۔ تم چڑیا مار کی طرح کیا داخل ہوتا ہے۔ ۔ ۔ بولو، نیشنل انٹیگریشن کس چڑیا کا نام ہے؟ (میر جکر اور بیدل دونوں خاموش ہیں)۔ بوت افسوس کا بات ہے۔ ۔ ۔ بڑا بڑا لوگ بھی نہیں جانتا۔ ۔ ۔ مگر بابا لوگ کی طرح سب بوم مارتا ہے۔ ۔ ۔ WE WANT NATIONAL INTEGRATION ۔ ۔ ۔ مگر لائیف نے کونسا پارٹ میں مانگتا۔ ۔ ۔ ہمارا تو ماتھا گھوم گیا سن کر۔ ۔ ۔ مگر کوئی نہیں بتلانے کو سکتا۔ ۔ ۔ اول می ہم کرسچین ـــ میر جکر ہندو ـــ بیدل مسلم ـ دوسرا سکھ اور تیسرا پارسی۔ ۔ ۔ کیا ہم سب کو ایک مانگتا۔ ۔ ۔ ہمارا اسٹڈی بولتا کہ سب دھرم کو ایک کرنے کا کام تو سادھو سنت، پیر، پیغمبر اور گاڈ کا ہے۔ ۔ ۔ ہم چار لوگ کیسے کرنے کو سکتا؟؟ ۔ ۔ ۔ ہم کیا سیاسی بہروپیوں کا نیشنل انٹیگریشن مانگتا؟ تو یہ کام ہمارا نہیں ہے۔ ہم ان کو اکٹھا نہیں کر سکتا۔ ۔ ۔ یہ کام جیل کا دارو گر کر سکتا ہے، یا پولیٹیشین اور بڑا اسٹیٹسمین کر سکتا۔ ۔ ۔ کیا مجبور اور سرمایہ دار کو اکٹھا کرنا مانگتا ہے؟ تو میاں بیدل اور شریمان میر جکر۔ ۔ ۔ آپ بے بس ہے۔ یہ کام آپ سے کیسے ہونے سکتا؟ یہ تو حکومت کا کام ہے کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ اکٹھا پانی پئیں۔ ۔ ۔ یہ کچھ ماری ہمارا نہیں۔ ۔ ۔ ہندی، اردو، انگریزی اور تلگو والوں کو اکٹھا کرنا مانگتا تو مولوی، پنڈت اور لنگویسٹ کو بلاؤ۔ ۔ ۔ ہم کو کیوں ادھر اکٹھا بلایا؟ ۔ ۔ ۔ ہم کیا کرنے کو سکتا ہے؟؟ ۔ ۔ ۔ تم نے چیخوف کا کہانی ایکوالٹی پڑھا ہے؟ (بیدل کی طرف دیکھ کر) کیوں تم کو چیخوف کا نام سے خوف آ گیا؟ ۔ ۔ ۔ اس میں بڑا مچھلی چھوٹا مچھلی کو نگل جاتا ہے۔ ۔ ۔ اور ایکوالٹی قائم ہو جاتا ہے۔ ۔ ۔ بس۔ ہندو سب کو نگلے گا۔ ۔ ۔ ہندی سب کو نگلے گا۔ ۔ ۔ بات ختم۔

میر جکر :۔ تو ہم کون کچھ ماری کرنے کو ادھر آیا ہے؟

بیدل :۔ قومی یک جہتی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے واسطے۔ ۔ ۔ اس کا پرچار کرنے کے واسطے۔ ۔ ۔ اس پیغام کو، اس سندیس کو ہر گھر اور ہر بستی پہنچانے کے واسطے۔ ۔ ۔ سمجھے میرے دوست۔ دلوں کے میل اور محبت کے ملن کے واسطے۔

تھامس :۔ تو چلو آؤ یہی کریں۔ ۔ ۔ چلو۔

بیدل :۔ میر جکر جی آپ۔ ۔ ۔

میر جکر :۔ نہیں تم۔ ۔ ۔

تھامس :۔ تم لوگ رکتا کاہے کو ہے؟ ۔ ۔ ۔ ہاں، ہاں سمجھا۔ کون چوہا بلی کو گھنٹی باندھے؟ ۔ ۔ ۔ ہاہا۔

(مکرجی داخل ہوتا ہے اور سب کو پرنام کرتا ہے۔ لیکن تھامس اپنی دھن میں کہے جا رہا ہے)

؟... WHO BELLS THE CAT ... ہا ... ہا ...

مکرجی :۔ کون چوہا بلی کو گھنٹی باندھے! WHO BELLS THE CAT .... (تعجب سے) کیا معاملہ ہے؟؟ ... چوہے کون اور بلی کون؟

بیدل :۔ چوہے ہم ہیں قبلہ مکرجی۔ اور بلی .... قومی یک جہتی .... تھامس صاحب کہتے ہیں کہ ہم قومی یک جہتی کا پرچار کریں.... (کچھ جھجک کے بعد) .... مکرجی صاحب، آپ کیجئے نا، اپنے اخبار کے ذریعہ۔

میر جکر :۔ ہاں ہاں مکرجی .... ابھی تمہارا اور آسام والوں کا معاملہ گرم ہے۔

بیدل :۔ کرونا بنگالیوں کی رہنمائی، قومی مفاد کے ناطے .... قومی یک جہتی کے حصول کی خاطر۔

مکرجی :۔ مسٹر بیدل .... اور اوہ میر جکر جی .... ہمرا جکھم پر نمک مت مارو .... ہم ابھی ایسا نہیں کر سکتا ہمرا اکھبار کوئی بنگالی نہیں خریدے گا ..... یہ مارا ماری اور کھون کھرابے کی کھبر کو سب پڑھنا مانگتا ... اگر یہ کھبر نہ چھپے تو ہمارا اکھبار ردی کے بھاؤ بھی نہیں اٹھے گا .... ابھی اپن کو معافی دو .... ہم یہ بات اکھبار میں نہیں چھیڑ سکتا ..... ابھی تو ہم یہی لکھے گا کہ بنگالیوں کی مانگیں پوری کرو ..... ان کو ان کا حق دے دو ..... اوہ مائی بنگال ... گریٹ بونگلا کلچر ... کالی ماتا کی طرح شکتی ماں ... ہم تجھ کو پرنام کرتا ... ہم بنگال سے گداری نہیں کرنے سکتا ..... ہم بونگلا دھرتی کا دودھ کھایا ہے .... وہاں کی دھرتی سے ہم کو کھون ملا ہے ..... یہ جندگی ملا ہے ..... بونگلا دشمنی چھوڑو رے نا ..... بھگوان تو بنگالیوں کو اپنے سرن میں لے .... (زور سے روتا ہے)

بیدل :۔ بڑے چھوٹے دل کے ہو یار .... رونے لگے ...... ہاں اب تو ہر ایک اپنا رونا روتا ہے .... آہ بد نصیب اردو .... بیچاری اردو .... خدا تجھے سلامت رکھے ہزار سال اور ہر سال کے دن ہوں پچاس ہزار .... (بیدل بھی رونے لگتا ہے)

(MONOLOGUE) ہاں مگر مردہ حالت میں زندہ رہنا .... تاکہ تیرے حقوق مانگنے کا دعویدار ہو سکوں .... خاص نمبر نکال سکوں .... چندے وصول کر سکوں .... ابنِ اردو یا پھر بابائے اردو کہلا سکوں ... اب مذہبی شاعری چلتی نہیں کہ میر انیس کے قصیدے کام آسکیں .... تیرا دردناک مرثیہ لکھوں .. خود بھی روؤں اوروں کو بھی رلاؤں (اور رونے لگتا ہے)

میر جکر :۔ تھامس، تم بھی دھاڑیں مار مار کر رو ... انگلش ملک سے نکالی جا رہی ہے (مکرجی اور بیدل کا رونا زور پکڑتا ہے)

مکرجی :۔ مذاک مت کرو میر جکر جی۔ آئینہ میں اپنے منہ کا فوٹو دیکھو ..... بمبئی میں لینگویج پرابلم کو

پالٹکس کا ہانڈی میں ابال ابال کر نہچتر کا آگ بھڑکا بھڑکا کے کیتا کون میں ڈوبا ہوا اکبار کا سُرکھی مارتا تھا .... جنتا کے من میں مارا ماری کا بس گھولا اور اکبار کا سیل ٹرھایا۔ اب دو گھڑی نہیں، ہر گھڑی موج میں کھیلتا ہے۔

بیدل :۔ خون میں ڈوبی ہوئی اخبار کی سرخی ..... آہ کتنی خطرناک بات ہے ..... اوہ قومی یک جہتی، تو اگر کوئی مسیح یا مہدیٔ موعود ہے تو جلد ہی تیرا نزول ہو ..... اگر تو رحمت خداوندی ہے تو فوراً برس .... اگر بھگوان کا کوئی اوتار ہے تو جلد ہی ظہور میں آ ...... اور ختم کر یہ خون خرابے ..... یہ فتنے جو ہر سمت جنم لے رہے ہیں۔ ہر طرف ملی کٹی ہو رہی ہے ..... میر مکبر اور مکرجی، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرو .... قومی یک جہتی کی ضرورت عوام سے زیادہ آپ اور ہم سب کو ہے۔

مکرجی :۔ تم اپنی ٹانگ بیچ میں مت مارو .... سب ماتے صفائی کی کرتا ہے۔

بیدل :۔ میرے خیال میں یہاں ہر ایک یہی کر رہا ہے۔

مکرجی :۔ مگر تمہارا دامن تو اس صفائی کے بعد بھی پاک نہیں ہے۔

میر مکبر :۔ ہاں ٹھیک ہے مکرجی۔ آزادی کے بعد اردو والوں نے سب سے زیادہ رونا رویا ہے حالانکہ اردو کے کوک کے واسطے سبھی جنتا لوگ اچھا بولتا ہے۔

مکرجی :۔ اور پنجابی صوبے کا پورا ایجی ٹیشن اردو بھاشا کے ذریعہ ہوا .... کیا اس سوچائی سے تم انکار کرتا اور پھر بھی اردو کا رونا روتا ہے۔

بیدل :۔ اس میں زبان کا کیا قصور .... میرا کیا قصور۔

تھامس :۔ چلو، سب آئی ایم سوری کا نعرہ زور سے لگاؤ اور سب کا قصور معاف کرو ..... بولو .... آئی ایم سوری .... (اور سب ایک ساتھ آئی ایم سوری کہتے ہیں) ..... بیدل، چلو، یہ کام تم اپنا پیپر میں شروع کرو۔

بیدل :۔ تھامس صاحب، بخدا میں اس کام کو انجام دینا چاہتا ہوں۔ مگر فی الوقت کیسے؟

تھامس :۔ سب کا جواب یہی ہے تو پھر کیا ہو؟

میر مکبر :۔ ہونے دو جو ہو رہا ہے .... کیا یہ ہنگامے اکبار والے روک سکتے ہیں۔ یہ تو پولیس کا کام ہے۔ بیدل اپنے پیپر میں یہ کام شروع کرو۔ نہیں تو ہم ہندی کی حمایت میں لکھے گا ...... اردو کو اورنگ زیب کی زبان ثابت کرے گا .. غالب دادا کا ہیں۔

بیدل :۔ میری مجبوری کو سمجھو میرے دوست۔ اردو کی بقا کے لیے ایک مہم چل رہی ہے .... عوام سے ایک میمورنڈم پر دستخط لیے جا رہے ہیں ... یہ میمورنڈم صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا .... میرے اخبار کا سیل اس لیے بڑھ گیا ہے کہ میں اس مہم کے پرچار میں پیش پیش ہوں۔ زیادہ تر کالم اسی مہم کے لیے نذر کر دیئے

ہیں . . . . پھر رہا سے لسانی فارمولا کا سوال . . . . وہ بھی میرے اخبار میں جگہ پاتا ہے . . . . پیارے مکرجی عزیز میر جکر اور محترم تھامس صاحب . . . . میں تو اس کمیٹی میں آکر پھنس گیا . . . . . آپ سوچیے میری حالت کیا ہوگی . . . اردو کا ایک رونا تو میرے سر سا تھ ہے ہی ۔ پھر یہ کیا ظلم ہے طبع نازک پر کہ دوسرا رونا بھی میرے ہی سر تھوپ رہے ہو ۔

مکرجی :۔ پہلا رونا ختم ہو تب دوسرا رونا شروع کرو . . . . . مشاعروں کی کارروائی ہی جو پورا صفحہ کالا کرتا ہے اس کو مٹا کر "کومی یک جاتی" کو وہاں تھوپ دو ۔ مالکوٹ اور تھالکوٹ کے مشاعروں سے پبلک کو کیا مزا . . . کم از کم ہم حکومت اور عوام سے کہہ سکے گا کہ کمیٹی کچھ کر رہی ہے ۔

بیدل :۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ پہلا رونا ان حالات اور واقعات کی روشنی میں بھلا کب ختم ہوگا . . . . مشاعروں کی رپورٹ اگر شائع نہ کروں تو میرا اخبار اردو اخبار کیسے کہلائے گا اور گم نام شعرا اپنی دل بستگی کیسے کریں گے ۔

میر جکر :۔ تو پھر وہ مسجد میں خون والے مقدمے کی رپورٹ پبلش مت کرو ۔

بیدل :۔ وہ کیسے ہو میرے یار . . . . وہ تو مسلمانوں کے دو فرقوں کا جھگڑا ہے . . . . . اس سے میرا سیل کافی بڑھ گیا ہے . . . . . میں تو اپنے کارڈ کھول کر آپ لوگوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں . . . میر جکر جی کی طرح نہیں کہ آج ابھی قومی یک جہتی کی میٹنگ میں شرکت کر رہے ہیں اور کل مہاراشٹرا اور میسور کے سرحدی تنازعہ کو آگے بڑھانے کے لیے ستیہ گرہ کریں گے ۔

میر جکر :۔ سچ ، بالکل سچ ، یہی میری مشکل ہے . . . . دیکھیے یہ نعرہ کب تک زندہ رہتا ہے اور کیا کیا گڑبڑ پیدا کرتا ہے . . . . . . مہاراشٹرا کے لوگوں کو "کومی یک جاتی" سے نہیں اس مسئلہ سے زیادہ دلچسپی ہے . . . . اور ایسی حالت میں تو اپنی "کومی یک جاتی" کا ڈھول اپنی گردن میں ڈال کر نہیں پٹ سکتا . . . . . . بنگالیوں کی طرح مہاراشٹر والوں کا بھی سب مانگیں پوری ہونا مانگتا . . . . . . پھر ہم اس کام کو سب سے زیادہ کرے گا . . . پکا وعدہ کرتا ہے ۔

تھامس :۔ تم سب لوگ کا یہ نعرہ ہے تو اپنا بھی نعرہ بتانے کو مانگتا اور پوزیشن کو صاف کرنا مانگتا . . . . آپ سب جانتا کہ ہمارے اکھبار کا زیادہ پونجی ایک پکا کمیونسٹ ہندو دھنی کا ہے . . . . . وہ ہم کرسچین کو بھی مجبوری سے برداشت کرتا ہے . . . بھلا "کومی یک جاتی" کو کیسے برداشت کرے گا . . . . . ہم اس کو بولا تو گصہ ہوا . . . ہم سوری بولا تو کہنے لگا کہ فائی ننس منسٹر ملک کو آگے بڑھانے بدیسی بھیک کہاں سے لاتا ، اس کا رپورٹ دو . . . تمام بیوپاری پڑھے گا . . . . اسپورٹ ، اکسپورٹ پر اس کا اثر پڑتا ہے . . . . یہ کھاس ضرورت کا کھبر ہے . . . . . پھر لیڈر لوگ کا بکواس . . . . کسی ایمبیسڈر کا آنا جانا . . . . ہوائی جہاز . . . . ریل . . . . اور کار کے ایکسیڈنٹس . . . . . اب آپ بولو ۔ ہم یہ نیشنل انٹگریشن کا کھبر کدھر ڈالے گا . . . . . ہم سیٹھ کو بولا کہ ہم جو

کوٹا بلیک کرتا ہے اسے کام میں لائیں تو کہتا ہے تم پاگل ہو..... یہ دھندا ہے دھندا........ ہمرا مجبوری بہت کھراب ہے ڈیر۔

میر جگر:۔ کون پرواکرتا ہے تمھاری مجبوری کا... "کومی یک جاتی" میں انگلش کا کیا رول ؟!

بیدل:۔ وہی رول ہے جو ریلوے اسٹیشن پر لگا ہوا انگلش پوسٹر GROW MORE FOOD اناج کی پیداوار میں کرتا ہے۔

میر جگر:۔ اس زبان کو تو اب دیس نکالا دیا جارہا ہے..... دے دو دیس نکالا اس زبان کو..... پھینک دو اس کو سمندر کی تہ میں... بھیج دو اس کو کالے پانی۔

تھامس:۔ یہ آپ لوگ کا مرضی کس کو کالا پانی بھیجتا... مگر تم یہ علم سروجنی نائیڈو کے لائرکس... ٹیگور کا لٹریچر... دت اور اینی بیسنٹ سے کرسکتا...... انگلش چلا گیا تو میرا اسٹیٹسمین مراٹھی اور بنگلہ اکھبار نکالے گا.... اس کے پاس تم سب سے زیادہ مال پانی ہے... تمھارا اکھبار ٹھپ ہو جائے گا۔

بیدل:۔ تھامس صاحب آپ بجا فرماتے ہیں۔

مکرجی:۔ کیا بکتے ہو... تمھاری اردو کو بھی دیس نکالا دیا جائے گا۔

میر جگر:۔ ہاں ہاں... کیوں نہیں۔

بیدل:۔ (جذباتی ہوکر) دے دیجئے دیس نکالا...... اردو زبان و ادب کو.... اردو بولنے والوں کو... غالب کی شاعری کو...... نظیر کے لوک گیتوں کو...... چکبست و حسرت کی وطن دوستی کو.... جوش اور فراق کے نغمات کو...... مولانا آزاد کی روح کو.... (لبورتے ہوئے لہجہ میں).... اگر یہ ہوا تو تمھاری تہذیبی جھولی میں کیا رہ جائے گا ؟

ہم تمام یہاں کس لیے اکٹھا ہوئے ہیں ؟ کس کس کو دیس نکالا دیا جائے یہ سوچنے یا قومی یک جہتی کی عملی راہیں تلاش کرنے کے لیے ؟ ..... جہاں ہندو، مسلم، سکھ عیسائی سبھی اپنے آپ کو ہندوستانی محسوس کریں.... جہاں ہندی، اردو، مراٹھی، بنگلہ... تمام زبانیں ہمجولیوں کی طرح رہیں اور ایک دوسرے کی مانگ سنوارتی رہیں.. جہاں وطن دوستی اور عوام دوستی میں تمام ہندوستانی ہم آہنگی محسوس کریں... اے کاش ایسا ہو سکتا۔

دہائی ہے، اے ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب... تیری مانگ سلامت رہے..... تہذیبی ڈاکوؤں کی نظر بد سے خدا تجھے بچائے..... کبیر، نظیر، میرا بائی اور خسرو...... جاگو جاگو.... تمھاری آتما کو دیس نکالا دیا جارہا ہے... اوہ نانک، آ، اور آشتی کا سبق دھرا... (بیدل بیہوش ہوکر گرنے لگتا ہے اور تھامس بڑھ کر سہارا دیتا ہے)

مکرجی (اکڑ کر) بکواس بند کرو...... اردو کو دیس نکالا دینے کا سوال آیا تو تم کو "کومی یک جاتی" کا موجھا

۔۔۔۔ ایسا لمبا لمبا بھاشن شروع کر دیا۔
میر جکر:۔ تھامس نے بھی یہی کیا تھا۔
بیدل:۔ (جل کٹ کر) ہاں، ہر کوئی یہی کر رہا ہے۔
مکرجی:۔ ہاں، تھامس اور بیدل پاگل ہو گئے ہیں۔۔۔ سبھی پاگل ہیں۔ اکثر، اور کلاتو بس ہمارا بونگلا باشیوں کا حصہ ہے۔
میر جکر:۔ بکواس۔ انگریز لوگ کا غلامی تم لوگ نے سب سے پہلے سویکار کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم مرتے آخری وقت تک لڑتے رہے۔
مکرجی:۔ لڑتے رہے!؟۔۔۔۔ یہ مت بھولو کہ آجادی کا بگل سب سے پہلے بنگال میں بجا۔۔۔ آجادی کا مُووَمنٹ نے بنگال میں جنم لیا۔
تھامس:۔ (غصہ میں) اسٹاپ دِس نان سنس۔۔۔۔ ماتھا پھٹ رہا ہے۔۔۔ کام کرو۔۔۔۔ کام کرو۔
میر جکر:۔ یہ کمیٹی کام کرنے کے لیے نہیں، سوچنے اور بچار کرنے کے لیے بنی ہے۔۔۔۔ بولو، سوچ بچار کرو۔۔۔۔ کام کرو۔
بیدل:۔ سوچ بچار بگلے کی طرح کھڑے ہو کر نہیں بیٹھ کر کرنا چاہیئے۔
(چاروں کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں)
میر جکر:۔ تو ابھی تک کیا ہو رہا تھا؟!
تھامس:۔ وہی بلوہ اور فساد جو سارے انڈیا میں ہو رہا ہے۔۔۔۔ ایک ریزولیوشن رکھتا ہوں کہ حکومت ہم کو "کومی ایک جاتی" کے پرچار کے لیے نیوز پرنٹ کا اور کوٹا دے گی۔۔۔۔ اور ہم چاروں مل کر گرینڈ سائز پر نیشنل انٹیگریشن نمبر نکال لیں گے۔
بیدل:۔ میر جکر اور مکرجی (ایک ساتھ) نہیں، نہیں۔۔۔ یہ تجویز ہمیں منظور نہیں۔
تھامس:۔ وہائی۔۔۔۔ وہائی ناٹ؟!
مکرجی:۔ پچھلا نمبر میرے آفس میں ردی میں پڑا ہے۔
میر جکر:۔ اپنا بھی یہی حال ہے۔ کل ردی والے کو بلایا ہے۔
تھامس:۔ THEN WHAT TO BE DONE?
بیدل:۔ ہاں ٹھیک ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔ ورنہ لوگ کہیں گے کہ قومی مفاد کے اتنے اہم کام میں ہم پیچھے رہے۔
مکرجی:۔ بیدل بولتا تو ٹھیک ہے۔

میر مکر:۔ اِس برابر بولتا ہے، ہر ایک یہی بولتا ہے..... مگر کیا کام کیا جائے؟ کچھ تو سمجھ میں آئے کہ پنجابیوں کو کون سمجھائے؟ بنگالیوں کو کون راستہ دکھائے؟... ساوتھ انڈیا کا سر درد کس کے سر میں جائے...؟ ہندو، مسلم سکھ، عیسائی کا معجکس کون سنے؟.... آخر کیا کام کیا جائے؟

تھامس:۔ آپ لوگ برا نہ مانئے پلیز.... ایک بات بولتا.... تم لوگ کا نیشنل انٹیگریشن نمبر دیکھا.... جٹ ان میں ایڈورٹائزمنٹ بوت اور میٹر کم تھا..... منسٹر لوگ کا MESSAGE زیادہ اور آرٹیکل کم تھا... پھر بولو، ایسا نمبر کو کون خریدے گا؟

(سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں.... خاموشی)

اگر کچھ کرنا ہی مانگتا تو تمھارا پرانا اسٹاک جو ردی میں پڑا ہے اسے دہلی کا پی کے ساتھ بھیج دو.. نیشنل انٹیگریشن کا سب کا اس نمبر بھی ختم ہو جائے گا اور اپنا نام بھی ہو جائے گا کہ سپلیمنٹ نکالا۔

بیدل:۔ نہیں صاحب یہ بھی نہیں ہو سکتا..... ہم اسے نامنظور کرتے ہیں۔

تھامس:۔ THEN WHAT ELSE CAN BE DONE ?

بیدل:۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ مسلم فرقہ پرست مجھ سے ناراض ہو جائیں گے.... مجھے غدار اور ناہنجار کہیں گے.... دشنام دھریں گے... گالیاں دیں گے کہ مسلمانوں کو اکثریت میں ضم کرنا چاہتا ہے ناپاک کہیں کا۔

میر مکر:۔ یہی حال میرا بھی تو ہے..... مجھ سے جن سنگھی ناراج ہوگا.. رام راج اور ہندو راج والا ناراج ہوگا.... میں بھی ملیچھ کہلاؤں گا... دھرم بھرشٹ کرنے والا ٹھیروں گا

مکرجی:۔ کھترا تو ہم کو بھی ہے.... تھامس یہ رائے کینسل کردو۔

تھامس:۔ میرے ماتھے میں کچھ نہیں آتا۔

بیدل:۔ ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ بشرطیکہ آپ لوگ اسے منظور کریں۔

مکرجی:۔ کہو بھی، کیا بات ہے؟

بیدل:۔ ہم نیشنل انٹیگریشن نمبر نکالنے کے لیے حکومت سے نیوز پرنٹ کا مزید کوٹا لیں..... حکومت کے ہر محکمے سے اشتہار بٹوریں... اور نہایت قلیل تعداد میں نمبر شائع ہو...... ایڈورٹائزرز کو کاپیاں جائیں....... پیغامات دینے والے وزیروں اور لیڈروں کو کاپیاں جائیں۔ کچھ کاپیاں اخباروں اور رسالوں کو تبصرے کے لیے روانہ کی جائیں اور کچھ کاپیاں برائے نام فروخت کے لیے اسٹالوں پر رکھی جائیں....... سمجھے آپ حضرات! ؟ باقی رہا پورا کا پورا کوٹا....... جسے محمد علی لکڑا والا یا کوڑی مل جیسی کوئی بھی نقدی بلیک میں لے گا....... آم کے آم، اور گٹھلیوں کے دام اسے کہتے ہیں...

تھامس صاحب...... مکرجی ہا ہا شے..... میر مکرجی.....!....!......!!!:.....!

..... ہاہاہا (دیوانہ وار ہنستا ہے اور پورے اسٹیج پر ہنسی چھا جاتی ہے)

میر جگر:۔ مکرجی، یہ تجویز ہمیں منظور ہے........ آج کی کارروائی مکمل ہو گئی....... ہمیں منظور ہے۔

میر جگر اور مکرجی نعرے لگاتے ہیں! بیدل زندہ باد..... بیدل زندہ باد۔

تھامس:۔ روکو بکواس، روکو بکواس۔

میر جگر:۔ کیوں؟ آخر کیوں؟؟

تھامس:۔ یہ کیا منظور کیا تم نے؟..... چوری... چوری.... حکومت سے... پبلک سے!!

مکرجی:۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا.... آپ اخبار میں نوکر ہیں.... مالک نہیں... یہ فیصلہ ہم تینوں کا ہے جو اپنے اخبار کے مالک ہیں اور تمہاری طرح نوکر نہیں.... بیدل زندہ باد۔

تھامس:۔ یہ سوال نوکر اور مالک کا نہیں۔ ملک کا ہے... عوام کا ہے، ہندو کا ہے مسلمان کا ہے۔... سکھ، عیسائی، بنگالی، پنجابی، مدراسی سبھی کا ہے اور ان سب کا ہے جن کا دل ہندوستانی ہے.... آپ اخبار والے..... سیاست والے...... ان تمام کا دل اور ماتھا ہو.... اگر دل اور ماتھا غلط ہوا تو باڈی کا کیا ہو گا؟

مکرجی، میر جگر، بیدل، ہاں ہاں ٹھیک ہے... ہماری تجویز ٹھیک ہے.... بیدل زندہ باد، میر جگر زندہ باد، مکرجی زندہ باد۔

(تینوں ناچنے لگتے ہیں اور خوشی کے مارے بیدل کو کاندھوں پر اٹھا کر باہر جاتے ہیں۔ تھامس ہکا بکا کھڑا انھیں دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہتی ہے اور پھر چار مزدور سلیمان، انتونی، ارجن اور گربچن سنگھ داخل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں اوزار ہیں.... تھامس ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور وہ سلام کرتے ہیں)

تھامس:۔ تم سب تو پانچ بجے کام ختم کر کے چلا گیا تھا.... پھر واپس کیوں آیا؟

انتونی:۔ ساب، ہم سب رات پالی کرنا چاہتے ہیں؟

تھامس:۔ ہائیں، رات پالی؟!

سلیمان:۔ ہاں ساب رات پالی۔ آپ کے پاس صرف ایک دن کا کام رہ گیا ہے۔ ہم چاہتے کہ رات پالی لے کر صبح تک ختم کر دیں۔

تھامس:۔ لیکن کیوں؟... دن بھر کام کر کے تم تھکا نہیں جو رات پالی کرنا مانگتا.... اور جیسا گیا ویسا ہی اوزار لے کر واپس آ گیا۔

گربچن :۔ تھکا تو بہت ہے صاحب۔ لیکن ایک مصیبت بھی آگیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

انتونی :۔ گربچن سنگھ کو گاؤں سے تار ملا ہے سر۔ اس کی ماں سخت بیمار ہے وہ صبح کی گاڑی سے جانا چاہتا ہے (گربچن آگے بڑھ کر تار دکھاتا ہے)

سلیمان :۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جانے کے لیے اس کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے ہم کو ایک راستہ سوجھا کہ کل کا کام آج رات پالی لے کر پورا کرلیں۔

ارجن :۔ اور ہم سب کی مزدوری گربچن بھیا کو دے دیں تاکہ وہ ۔ ۔ ۔ ۔

انتونی :۔ اپنی ماں کے پاس جا سکے۔

سلیمان :۔ ایک ہی جگہ رہنا بسنا ہے تو آپس میں دکھ درد بانٹ لینا پڑتا ہے صاحب۔

تھامس :۔ (متاثر ہوکر) اوہ۔ ۔ ۔ تم لوگ دکھ درد بانٹ لیتا ہے۔ ۔ ۔ اور ہم ۔ ۔ ۔ ہم لوگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نیمتر کا بٹوارہ کرتا پھرتا ہے۔ اُف (سر کو جھٹکا دیتا ہے) اچھا، اچھا، تم لوگ کام شروع کردو۔ ۔ ۔ ۔ میں رات پالی کا مزدوری ابھی دے دیتا ہوں۔

(جیب سے بٹوہ نکال کر نوٹ گنتا ہے)

انتونی، یہ لو تم چاروں کی مزدوری۔ (انتونی نوٹ لے لیتا ہے)

سلیمان اور ارجن کہتے ہیں! گربچن بھیا کو دے دو۔

(انتونی تمام روپیہ گربچن کے حوالے کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور گربچن نہایت احتیاط کے ساتھ نوٹوں کو اپنی پگڑی میں رکھتا ہے۔ سب کام میں مشغول ہوجاتے ہیں اور عقب میں "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا گیت ابھرتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

منظور شدہ محکمہ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

ماہنامہ

صبا

حیدرآباد دکن

رسالانہ ہندو پاک سے ۱۰ روپے

ششماہی ۶ روپے

بیرون ہند سے ۲۰ شلنگ

ایڈیٹر :۔

سلیمان اریب

فون (۲۲۴۰۲)

جلد	۱۰
شمارہ	۶
ماہ	جون
سنہ	۱۹۶۴ء
قیمت	ایک روپیہ

دہلی آفس :۔ ۱۹۰۰ ترکمان گیٹ دہلی ۶

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۲۰۰۲) کراچی ۳

ایڈیٹر پبلشر و پرنٹر سلیمان اریب ۵ ابجدگاہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد۔ مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

اس شمارے میں

حق مغفرت کرے

۶ رجون کو پروفیسر حامد حسن قادری کا انتقال کراچی میں اور ۱۴ رجون کو مولانا اصلاح الدین احمد کا انتقال منٹگمری میں ہوگیا۔ یہ دونوں بزرگ اردو کے بہت بڑے ستون تھے۔ اگر پروفیسر حامد حسن قادری نے ایک مصنف، مولف، محقق، اور معلم کی حیثیت سے ایک پوری نسل کو متاثر کیا تھا تو مولانا اصلاح الدین احمد نے ادبی دنیا کے ذریعہ اچھے اچھے شاعر و ادیب پیدا کرکے اور اپنا جان و مال اردو کے لیے وقف کر کے ایک نادر مثال قائم کر دی تھی۔

حق مغفرت کرے کیا صاحب قلم اور صاحب کردار لوگ تھے

ظ انصاری

شاد عارفی کی شاعری اور شخصیت

شاد عارفی (مرحوم) کا کلام کوئی تیس برس سے اردو کے اچھے رسالوں میں چھپتا رہا ہے لیکن ان کی زندگی اور شاعری پر اہلِ نظر کے مضامین نظر سے نہیں گزرے۔ اتنے بھی نہیں جتنے ان کے "کم سخن" ہم عصروں پر لکھے جا چکے ہیں۔ غالباً اسی لیے شاد عارفی کی شاعری اور شخصیت پر ہلکا سا نقاب پڑا رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قناعت پیشگی کو انھوں نے زندگی کے اس پہلو پر بھی مسلط کر لیا تھا۔

بہت برسوں سے میں ان کا کلام توجہ سے پڑھتا ہوں۔ فن اور فنکار کے باطن میں اتنا گہرا تعلق ہے کہ اس کلام سے مرحوم کی دھندلی سی تصویر بھی میرے تصور میں ضرور ابھری۔ یہ تصویر کچھ ایسی ہے جیسے دریا اور پہاڑ دونوں سے ہٹ کر، ذرا فاصلے پر ایک سوکھا موکھا ٹیڑھا میڑھا درخت کھڑا ہے جس میں نمو کی قوت تو تھی لیکن لُو کے جھونکے سب برگ و بار اڑا لے گئے۔ وہ ریگستان کے مسافروں کو گھنی چھاؤں تو نہیں دینے پاتا لیکن اپنے اجڑے ہوئے ٹہنیوں سے اُن کی خیمہ گاہ بن جاتا ہے۔

جس طرح رشید احمد صدیقی کی نثر کو علی گڑھ کی خوش باش زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا عین اسی طرح شاد عارفی کی شاعری ہے جو یوپی کی چھوٹی سی ریاست رام پور کے ماحول سے بیزار بھی ہے اور اس کا آئینہ بھی۔

رام پور میں ان کی کم و بیش ساٹھ برس کی زندگی کیسے گزری ہوگی اس کا صحیح اندازہ ان کے کلام سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ایک بڑی صفت ہے کسی شاعر کی۔ خاص کر ایسے زمانے میں، جب گول مول استعاروں، مبہم اشاروں ایک سی ترکیبوں اور تشبیہوں کے رنگین کاغذوں اور شوخ پنیوں سے لوگ بھری پُری پھلواری لٹا جاتے ہیں

اردو شاعری کی تجربہ گاہ میں شاد عارفی اور یگانہ (چنگیزی) کا خمیر ایک ہی اجزا سے تیار ہوا ہے۔ یگانہ پہلے یاس عظیم آبادی تھے، پھر یگانہ ہوئے، کچھ یاس یگانہ ہوئے پھر یاس یگانہ لکھنوی ہو گئے، بالآخر یگانہ چنگیزی پر پہنچ کر دم لیا۔ ان کی چنگیزیت خود انھی پر حملہ آور ہوئی اور جو انجام اُن کی شاعری اور شخصیت کا ہوا، وہ سب کو معلوم ہے شاد نے ساری عمر نا شاد بسر کی (ٹھنڈی ہوا کا ایک آدھ جھونکا تو خیر سبھی کو مقدر ہوا ہے) اور ہر ایک گراہ کو انھوں نے

طنز کا تیر بنالیا۔

بعض اوقات حقیقتوں کو کسی نسبت سے دیکھا جاتا ہے۔ شاد عارفی کو اُنھی کے ہم عصر یگانہ چنگیزی کی نسبت سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ دونوں کا رخ ایک جانب ہے۔ اپنے اردگرد کی زندگی، اس کی ظلمتوں، ناکامیوں، نام لیواؤں اور وہم پرستیوں پر طنز کرنا، سطح کو کھرچنا، خود دیکھنا، دوسروں کو دکھانا، چٹکی کاٹنے میں دونوں استاد ہیں۔ دونوں اپنے اپنے ماحول کے حساب سے نہایت سرکش ہیں، دونوں اپنے برتاؤ اور فن میں NON CON FORMIST رہنا چاہتے ہیں۔ پہلے تو پکے پھوڑوں کو کھرونچتے ہیں، پھر اپنے لہو سے ایک ایک بوند کا تاوان ادا کرتے ہیں، وہی بات کہ ؎

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

(اس شعر میں 'مژگانِ یار' کا مفہوم کس قدر وسیع ہوگیا ہے!) یگانہ اور شاد دونوں زندگی کے نقاد شاعر ہیں لیکن یگانہ کو جو مقام اہلِ نظر نے دیا، وہ شاد کو ان کے جیتے جی نہیں مل سکا۔ وجہ اس کی محض اتفاقِ وقت نہیں بلکہ مطالعہ کائنات کا فرق ہے۔ شاد کے ہاں مطالعہ کائنات کا زاویہ وہی ہے جو یگانہ کا ہے، حدِ نظر کی وسعت البتہ وہ نہیں ہے۔

کائنات کے مطالعہ کا ایک رمز یہ ہے کہ الگ الگ مظاہر یا PHENOMENON کسی ایک بڑی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے رہتے ہیں۔ اجزا تحلیل ہو کر ایک کل میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور پھر

آئے ہے جزو میں نظر کل کا تماشا ہم کو

یہ "جزو" میں "کل کا تماشا" کرنا مختلف لوگوں کو مختلف طریقوں سے نصیب ہوا ہے۔ بھگتوں نے دھیان گیان کی راہ سے اسے پایا، صوفیا کو کثرت میں وحدت کے عرفان سے یہ درجہ ملا، سیّاحوں کو وحدت میں کثرت کا جلوہ دیکھ کر علما کو کثرتِ مطالعہ کے ذریعہ، مفکروں کو کثرتِ مشاہدہ سے، مدبّروں کو بین الاقوامی تاریخ کی کھوج سے، کارل مارکس کو مغربی فلسفہ اور سائنس کی ترقیوں کی تہہ میں اترنے سے نگاہ کی یہ وسعت اور گہرائی نصیب ہوئی۔ یہاں پہنچ کر فنکار آتشِ جوالہ بن جاتا ہے اور اپنی سی آگہی صدی کی آمد کا پُرشکوہ اعلان کرتا ہے۔ جو واقعات چھوٹے ذہنوں کے لیے ہنگامہ خیز اور ہیجان انگیز ہوتے ہیں، وہ اس کی نگاہ میں دریائے بیکراں کی صد ہزار موجوں کے اندر پانی کے ایک بلبلے کی سی نمود رکھتے ہیں۔

اردو شاعری کی صفیں کی صفیں مطالعۂ کائنات کے اس مقام سے محروم ہیں۔ شاد عارفی تو بیچارے پس ماندہ یوپی کے ایک پس ماندہ دیسی ریاست کے پسماندہ ماحول میں عمر بھر سانس لیتے رہے اور جزو میں جزو کا تماشا کرتے رہے جس سے نگاہ پارہ پارہ ہوجاتی ہے۔ ہم انھیں کیا الزام دے سکتے ہیں! ان کی شاعری میں تو جو کچھ لڑنے کا انداز ہے (کوھاڈ، الٹا وٹا گوما " کی سان پر جو وہ اپنے تیروں کے پیکان تیز کرتے رہتے ہیں)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی موجوں کو طوفانِ بلاخیز سمجھ کر انھی کا مقابلہ کرتے رہے۔ افسوس کہ انھیں اپنی شاعری میں (اور غالباً زندگی میں بھی) جن سے دست و گریباں ہونا پڑا وہ یا تو ایسے قدامت پسند اور خشک مغز اعادہ تھے جو ہاری ہوی لڑائی لڑتے لڑتے "منیم" کی اہمیت کھو چکے ہیں یا پھر الیسی بے حیثیت ہستیاں" جن میں سے کوئی بھی شاد عارفی کے درجے کی نہ تھی، چناں چہ اُن کی طنزیہ شاعری ناخن چبھونے کی حد سے اگر آگے بڑھتی بھی ہے تو آس پاس کے بام و در پر غلیل کا نشانہ تک لیتی ہے۔ اور آپ جانیے، غلیل سے پرندے شکار ہوتے ہیں درندے نہیں۔

شاد عارفی کی شاعری میں جو تیکھا پن ہے، وہ اسی وجہ سے، معرکۂ صفات کے بجائے معرکۂ ذات بن کر رہ گیا ہے۔

یگانہ کی طرح جو قدرتِ کلام ان کو میسّر تھی، پینترے بدلنے اور داؤ کرنے میں جو استادی وہ رکھتے ہیں، وہ ہماری نسل کے اردو شاعروں میں شاید ہی کسی اور کو آتی ہو۔ قابلِ غور اور دادطلب بات یہ ہے کہ انھوں نے اس قدرتِ کلام کو پیٹ کا ایندھن جمع کرنے کے لیے نہیں اپنایا، بلکہ سکھایا اور چوبِ خشک کو تراش تراش کر اپنا ترکش بھر لیا۔ حالات اور نگاہ کی مجبوری سے ان کے تیروں کی رسائی بہت دور تک نہیں ہے اور ایک عہد میں فنکار کی شاعری اور شخصیت کو اسی ایک صفت سے ناپا جاتا ہے۔

فردوسی اپنے شاہنامے کی عظمت کے باوجود غالباً نامامی کی موت مرتا اگر چند اشعار کی وہ ہجو اس میں شامل نہ ہوتی جو ہمیں ایک اور ہی افسانہ سناتی ہے اور اس کرب اور کشمکش سے آگاہ کرتی ہے جس میں جی کر شاہنامے کے مصنف نے وہ دور مار توپ تیار کی جو بالآخر شکست خوردہ ایرانی قوم کا سر اونچا کر گئی۔

—.:.—

شاد عارفی کھلی آنکھوں کے شاعر ہیں۔ اپنے زمانے کے سیاسی، ادبی، علمی اور مجلسی زندگی پر اس کی قدامت اور جدت کے پہلوؤں پر اُن کی نظر جاتی ہے،[1] خیالات لے کر پلٹتی ہے اور خیالات بڑے بے رحم ہوتے ہیں، ان کی فطرت

---

[1] ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو ۔ گھری ہوی ہے طوائف تماش بینوں میں

شاد ہجر و وصل تک محدود تھی میری نظر۔ اک زمانہ تھا مگر

آج میری ہر غزل وابستۂ حالات ہے۔ سوچنے کی بات ہے

ہم وفا شعاروں کی تا کجا دلازاری، طنز تلخ ماداری طعنۂ سبکساری

چاہیے رواداری اے بتانِ سنگیں دل آبرو نہیں بیچی ہم نے آرزو کی ہے

کیا تعجب ہے کہ تیشوں کی طرف بڑھ جائیں

لوگ ہاتھوں کو سوالوں سے جو مہلت دیں گے

ستائے جو رہبر و تو نہ دیکھے کوئی طعنہ ۔ یہ دیکھیے ہمت تو نہیں ہار رہا ہے

کپڑوں کی سی نہیں ہے جو آدمی کی کھال کے اوپر دھرے رہتے ہیں کہ جب میلے ہوئے دھلوا لیے، اور جب پہننے قابل نہ رہے، بالکل بدل ڈالے۔ یہ ظالم کھال کے اندر اتر جاتے ہیں اور آسانی سے بدلتے نہیں (کھال سے مراد یہاں حساس آدمی کی نرم کھال سے ہے، موٹی چمڑی سے نہیں کہ خیالات اس کے اوپر صرف منڈھے رہیں۔ ظ انصاری) جو خیالات شاد عارفی کی شاعری سے ظاہر ہوتے ہیں، وہ زندگی کے ہیوپار میں اور شاعری کے ملبن میں اپنے ماحول کے پروردہ نہیں ہیں، "کچھ اور وسعت" کے طلبگار ہیں اس لحاظ سے وہ عہدِ حاضر کے نوجوان کا برہم مزاج رکھتے ہیں، لیکن مزاج کو "حسن" بھی چاہیے، شکست و ریخت کی انتھک قوت اور بے پروائی بھی درکار ہے اور پھر اس کا بل چکانا پڑتا ہے، خیالات کے یکسر تبدیل کرنے میں اس سے زیادہ ذہنی اور جسمانی درد سہنا پڑتا ہے جتنا زندہ کھال کھرچوانے میں۔ یہ درد انھوں نے سہا لیکن اتنا لہو بہہ گیا کہ اونچی پرواز کی طاقت ہی جواب دے گئی۔

شاد عارفی ایسے آدمی تھے جن کی شاعری "روشنیٔ طبع" کی آمیزش سے اُن کے لیے بلا ہو گئی اور زندگی نے انھیں اتنی راحت بھی نہ دی جو ان کا حق تھی اگر وہ شاعر نہ ہوتے۔

انھی کا شعر ہے ؎

پھول کھلنا تھے کہ خوشبو اڑ گئی   موج بہہ نکلی، کنارا رہ گیا

—•••—

بن تو بیوں سے ان کے ہاں نئے پن کا احساس ہوتا ہے، وہ صرف خیالات کی تازگی نہیں، بلکہ الفاظ اور تراکیب سے ان کا جمہوری برتاؤ بھی ہے۔ وہ لفظوں کی ذات بندی سے گھبراتے نہیں بلکہ نظم تو نظم غزل کی وضعدارانہ محفل میں ہر برادری ہر ایک گوت، اور ہر ایک فیشن کے لفظ کو پاس بٹھا لیتے ہیں۔ نہ ناک بھوں چڑھاتے ہیں، نہ ذات برادری پوچھتے ہیں۔ کتنے ایسے غزل گو ہیں، جو شاد عارفی کی طرح یہ دعویٰ کر سکیں کہ اُن کی غزل جدید نظم کے لب و لہجے سے اس قدر قریب ہے؟ شاد کی غزل ہمارے "تازہ واردانِ بساط" کو جرأت دلاتی ہے اور لفظوں کے انتخاب میں رواداری نہیں، بے باکی کا سبق دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ معاملہ صرف انتخابِ الفاظ تک محدود نہیں رہتا، اس سے آگے جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ سیاسی حالات کے بیان میں غزل کا دائرہ اور غزل گو کا بیان کس حد تک واضح یا مبہم ہو سکتا ہے؟ مجلسی زندگی کے واقعات میں کیا کچھ کہا جا سکتا ہے؟ مقامیت اور غیر مقامی تاثر کی شاعری میں کیا تناسب ہے؟ شاعر کی شخصی زندگی اور حالات کو اس کی شاعری کی فضا سے کیا نسبت ہے؟

کچھ لوگ اس ڈر سے کہ ان کی شاعری کہیں مقامی و لمحاتی، محدود، یا جوانا مرگ نہ ہو جائے، بہت دنوں کی لیتے ہیں، آفاقی، ابدی اور کائناتی مسائل کو غزل کے شہرپّوں سمیٹتے ہیں۔ بعضوں کے ہاں یہ جرأت اس قدر مضحکہ خیز ہو جاتی ہے جیسے اُس بودے کا تصور جو اپنے گھونسلے میں اپنے پاؤں اوپر کر لیتا ہے تاکہ آسمان ٹوٹ کر گرے تو اس کے سر پر نہ گرنے پائے۔

"تخلیقِ آدم" موت وحیات کا رمز، قوتِ نمو، فوق البشر، وجودِ کائنات، جدلیاتِ حیات، پر ایسے ایسے باکمالوں کی (ناتمام) طویل نظمیں اور غزل کے اشعار نظر آتے ہیں جنھیں پڑوسی کے چولہے سے اٹھنے والے دھوئیں کی حقیقت نہیں معلوم۔

شاد عارفی نے انتخابِ الفاظ میں جس وسعتِ نظر بے باکی اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے، وہ موضوعات کے انتخاب میں بھی اسی طرح قائم ہے۔ وہ اس طرح کے شعر کہنے سے کبھی نہیں شرماتے ؎

جس کی لاٹھی اسی کی بھینس ہے آج ۔۔۔ کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج؟
یہ پراؤں پہ گھومنے والے ۔۔۔ ہم سے کرتے ہیں دعوئ معراج
آپ کی نگاہوں نے موٹروں کے شیشوں سے مختصر سے وقفے میں نوجوان دیکھے ہیں
کاش غور فرماتے عمر کی رعایت سے ان کے قلب کے اندر بوند بھی لہو کی ہے؟

یہ بڑی خوبی ہے لیکن اس میں ایک اندیشہ بھی رہتا ہے عام استعمال کے سادہ، کھردرے دو ٹوک اور پڑے پھرتے لفظوں یا ناموں کو شعر میں ٹانک لینے کے بعد شاعر کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کیوں کہ پڑھنے یا سننے والے کا ذہن ان خاص چیزوں یا کیفیتوں کی کھونٹی پر ٹنگ جاتا ہے اور شعر کے مفہوم کے ساتھ اس کی نغمگی بھی اٹکنے لگتی ہے۔ ایسی حالت میں چابک دست اور صاحبِ نظر شاعر کا فرض ہے کہ وہ ذہن کو اس کھونٹی سے اتار کر کھلی ہوا میں لہرائے ۔۔۔ اور استعارہ یہاں کام آتا ہے ۔۔۔ نازک، حسین، خوش آواز اور رنگا رنگ مفہوم کا استعارہ ہے جو مفہوم کو گھٹی ہوئی چار دیواری سے نکالتا ہے، خیال کو پرواز کی جانب مائل کرتا ہے، بدلتے ہوئے حالات کے باوجود شعر کو تازہ رکھتا ہے اور ہلکی سی جالی دار نقاب میں حسن کی نشاندہی اور دلآویزی کا سامان کرتا ہے۔

اب یہ ہر شاعر کے بل بوتے پر ہے کہ اس نے اسما اور صفات کو ٹھوس اور مقامی شکل دیتے وقت خود کن کن فضاؤں میں پرواز کی اور کس قسم کے استعاروں سے کام لیا۔

شاد عارفی کے یہاں ایسے مقامات پر تنگ دامانی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ وہ استعاروں کے ذریعے اپنے شعر کے لیے نہ تو وسیع امکانات کھول پاتے ہیں، نہ ذہن کو دور تک لے جاتے ہیں۔

ان کے مداح اس زمانے میں ۔۔۔ جیسے کتے قصائی خانے میں
جن کے پینے میں ہوں نہ کھانے میں ۔۔۔ منہمک ہیں مجھے ستانے میں
میں تو چٹنی سے کھا رہا ہوں شاد ۔۔۔ دال ملتی ہے جیل خانے میں

٭

ہم خدا کے ہیں وطن سرکار کا ۔۔۔ جب چلی اپنوں کی گردن پر چلی
حکم چلتا ہے مگر زردار کا ۔۔۔ چوم لوں منہ آپ کی تلوار کا
بعض احمق تکتے ہیں آج تک ۔۔۔ آسرا گرتی ہوئی دیوار کا

ان اشعار سے جس خاص صورتِ حال کا تصور ہوتا ہے، وہ روزمرہ کی بات معلوم ہوتی ہے مگر نہ تو ہمیں کچھ سوچنے پر مائل کرتی ہے، نہ فکر کو غذا عطا کرتی ہے، نہ شعر کے مفہوم کو وسیع کرتی ہے نہ شعر کی نغمگی سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیتی ہے۔

جو لوگ اس غزل کو شاد عارفی کے مطبوعہ کلام میں دیکھیں گے ممکن ہے، انھیں خیال گزرے کہ اس کا سب سے اچھا شعر میں نے عمداً اڑا دیا ہے اور وہ یہ ہے:-

خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے کیا کریں گے ابر گوہر بار کا

یہ شعر ضرب المثل ہونے قابل ہے۔ لیکن اس شعر کے حسن میں اضافہ اس غزل کی بحر، قافیے اور ردیف نے کیا۔ اس بات کو ذرا کھول کر کہنا ہوگا۔

صنفِ غزل کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے (اور اس کی طرف ہمارے ناقدوں نے دھیان نہیں دیا) کہ یوں بظاہر غزل کا ہر ایک شعر اکائی (UNIT) ہے، لازم نہیں کہ اسے اگلے پچھلے شعر سے خیال یا فضا کا کوئی تعلق ہو، وہ اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے، مکمل نہ ہو تو قطعہ بند ہو کر مکمل ہو جائے گا۔ لیکن چونکہ غزل کی ایک خاص فارم ہے، ردیف نہ ہو تب بھی ہر شعر کا ایک بحر میں، ایک قافیے پر تمام ہونا لازم ہے اس لیے غزل کی غنائیت میں جو ایک ان کہی کیفیت خود شاعر اور اس کے مخاطب کو مشترک طور پر محسوس ہوتی ہے وہ اول سے آخر تک ایک خاص جھنکار کے لیے ذہن کو آمادہ رکھتی ہے۔ اس کیفیت کا نتیجہ ہے کہ غزل کا اچھا شعر بھی، اگر مفہوم کی گہرائی، وسعت اور رنگارنگی نہ رکھتا ہو تو محض اسی غزل میں اسی مقام پر لطف دیتا ہے اور اسی مخصوص بحر، قافیے اور ردیف کی لڑی میں پرویا ہوا اچھا لگتا ہے۔ اس سے الگ ہو کر دو ٹکے کا رہ جاتا ہے۔

اس نکتے کی دو ایک کلاسیکی مثالیں لیجیے، صوفی شاعروں نے شریعت کی پیچیدگیوں سے دامن چھڑایا اور طریقت کی نیک اعمالی پر اور سادگی پر زور دیا۔ یہ ایک پرانا موضوع ہے۔ حافظ شیرازی سے بھی پرانا۔ حافظ اسے یوں کہتے ہیں:

حدیث از مطرب و مے گو، و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

(موت و حیات کے راز تلاش کرنے میں کیوں پڑتے ہو۔ اس معمّے کو کسی نے آج تک فلسفے سے نہ کھولا ہے، نہ کھُلے گا۔ خیریت اسی میں ہے کہ لذاتِ دنیا کی باتیں کرو، شراب و سرود کا لطف لو (دردِ سر سے نجات پاؤ))

ہر زمانے میں اس خیال کو مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا، غالب نے ایک غزل میں قطعی یہی بات کہی ہے:

بحث و جدل بجائے ماں میکدہ جوے کاندراں
کس نفس از جمل نزد، کس سخن از فدک نخواست

(مذہبی قصّوں، قضیوں کو اُنھی کی جگہ پڑا رہنے دو۔ تم تو میکدے کی راہ لو، کیوں کہ یہ وہ ٹھکانا ہے جہاں سُنّی شیعہ ایک دوسرے سے نہیں الجھتے، یہاں نہ جنگِ جمل کی بحث ہے نہ باغِ فدک کا مطالبہ ہے)

ان دونوں اشعار میں جو آزادانہ طرزِ عمل ہے، وہ تو ہے ہی، لیکن جس صفت نے، انھیں زندہ رکھا وہ ان غزلوں کے درمیان واقع ہوا جو کی نغمگی آریائی نسلوں کی موسیقی سے میل کھاتی ہے۔ نغمے کی لذّت سے بے نیاز ہو کر ان اشعار سے لطف اندوز ہونا مشکل ہے[1] اپنی محفوظ نشستوں سے اٹھنے کے بعد دونوں اشعار کے رتبے میں فرق آ جاتا ہے۔ حافظ نے اس کمی کو حدیث حکمت، کمتر جو، کشود و کشاید کے الفاظ سے پورا کرنے کی (شعوری یا غیر شعوری) اور غالب نے جدل، جل، نفس سخن، فدک کے ہم وزن الفاظ سے بوشوخی کے ساتھ ذہن کو چھیڑتے بھی ہیں۔

شاد کی ایک مزے دار غزل ہے اور وہاں قطعی اسی مفہوم کا شعر آگیا ہے ؎

کسی بھی در پر علاج آویزشِ یقین و گماں نہ ہوگا

ادھر چلا آ کہ میکدے میں اگر نہیں ہے مگر نہیں ہے

یہ شعر اس غزل میں اپنی "محفوظ نشست" سے اٹھ کر عام اور سرسری معلوم ہوتا ہے۔ پہلے مصرعے میں کسی گہرے اشارے کے ذریعے شعر کی معنوی وسعت اور لفظی حسن کو بہت بڑھایا جا سکتا تھا، لیکن شاعر نے اسی پر قناعت کر لی کہ — "اگر نہیں ہے، مگر نہیں ہے" کی ترکیب اس غزل میں ذرا انوکھی اور دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

شاد کے ہاں بھی اردو غزل کی یہ ایک غیر شاعرانہ روایت اکثر جگہ باقی رہ گئی ہے، اور اس نے ان کے کلام کے ایک خاصے حصے کو روزناموں کی شاعری سے قریب کر دیا ہے[2] شعر کا عام فہم ہونا ایک بات ہے اور عام پسند ہونا دوسری بات وہ اس نکتے سے خداوندِ خدا ای طرح آگاہ تھا، کیا پتے کی بات کہہ گیا ہے ؎

شعر میرا ہے گو خواص پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

یگانہ کے بعد شاد عارفی دوسرے شاعر ہیں جنھیں لہجے کا شاعر کہنا چاہیے کیا غزل اور کیا نظم ان کے بیشتر

---

[1] میں اپنے اس بیان کی تفصیل کسی اور مضمون میں پیش کروں گا۔

[2] ہمارے شاعر غلط بیانی سے آج بھی کام لے رہے ہیں

وہ کون محبوب ہے کہ جس کے دہن نہیں ہے کمر نہیں

میرے نغمے نہ سمجھنے والے ٭ سب سمجھتے ہیں مگر بنتے ہیں

صرف اپنوں کے تقرر کا ارادہ ہوگا ٭ اور اخبار میں اعلانِ ضرورت دیں گے

ہر غلط بات پہ بھی ہاتھ اٹھاؤ ٭ یہ نمائندگی نہیں، شرماؤ

بہ اعتبارِ لباس یہ شیخ وقت ہے اور وہ برہمن

بہ اعتبارِ مزاج و طینت، اسے اٹھا دیں اسے بٹھا دیں

اشعار ایسے ہیں جنھیں خاص لہجہ اختیار کیے بغیر پڑھا نہیں جا سکتا ہے اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔[1]

یہ لوگ جو اپنے شعر میں تیکھے لہجے پر بڑا زور دیتے ہیں، نرالی وضع کے لوگ ہوتے ہیں، یہ زمین پر سیدھے نہیں چلتے اور آسمان پر ٹیڑھے اڑتے ہیں اکثر مگر نرم دل ہوتے ہیں اور ریاکارانہ انکساری سے پاک۔ ان کی "بات بات میں اکڑ" ہوتی ہے، اہلِ اقتدار سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے اور بے اقتداروں کی سی وضع نہیں رکھتے۔ ان کی ایک آواز کو ہزاروں آوازوں کی ٹر بونگ میں الگ سنا جاتا ہے۔ یہ اپنے زخموں کو قلمدان کی طرح سنبھالنے شاداب رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں کہ اس سے ان کا فن اظہار پاتا ہے۔ ان میں ہر درجے اور ہر لہجے کے لوگ ہوتے ہیں، مادی آسائش نصیب ہو یا نہ ہو، تاریخ ادب نے انھیں جب دیکھا تا شاد ہی دیکھا اور یوں نہ ہوتا تو ایسے شعر کیوں کر ڈھلتے ؎

زندگی پر دلیر ہیں وہ لوگ ۔۔۔ مقبروں سے جو لے رہے ہیں خراج
وقت کیا شے ہے پتہ آپ کو چل جائے گا ۔۔۔ ہاتھ پھولوں پہ بھی رکھوگے تو جل جاؤ گے
رنگ کو دھوپ کھا گئی بو کو ہوا اڑا گئی ۔۔۔ کہیے اس اقتدار سے آئی بہار یا گئی؟
یاد ہیں جس شخص کو صحرا نوردی کے مزے ۔۔۔ دوسروں کے پاؤں میں کانٹے چبھونے سے رہا
آج کل راتیں بڑی ہیں اس لیے دن گھٹ گیا ۔۔۔ تھے کبھی ہم لوگ بھی شایانِ شان کوے دوست
جذبۂ محبت کو تیرِ بے خطا پایا ۔۔۔ میں نے جب اسے دیکھا دیکھتا ہوا پایا
یہ بتانِ مرمریں بت کدہ ۔۔۔ جیسے اب انگڑائی کی بات کی
عہدِ حاضر کی روشنی پہ نہ جاؤ ۔۔۔ جب ستارے بجھیں چراغ جلاؤ
سینک سکتے ہیں آپ بھی آنکھیں ۔۔۔ جل رہے ہیں نشیمنوں کے الاؤ

---

[1] اب اربابِ طریقت جانیں ۔۔۔ میں نے میخانے سے لا دی
اس نے جب سو تیر لگائے ۔۔۔ میں نے ایک غزل چپکا دی
آپ کے تیور بتاتے ہیں برا مت مانیے ؎ آپ سے کوئی اصولی کام ہونے سے رہا
جن مسائل میں وطن الجھا ہے ۔۔۔ ہاتھ لگتا ہوں اگر سلجھا دو
راستیِ قدِ خوباں پہ نہ جاؤں ؎ فائدہ مند نہیں سرو کی چھاؤں
آپ کو کتنی اذیت ہوگی ۔۔۔ میں اگر آپ کی باتوں میں آؤں

چمن خواجائیوا

اُردو افسانے کی ایک "ٹیڑھی لکیر"

مسز چمن خواجائیوا تاشقند یونیورسٹی کی ام اے ہیں اور اب" اردو کی خواتین افسانہ نگار" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کر رہی ہیں۔ مسز چمن، مس چرنی کوواسونیا کے ساتھ کلچرل ایکسچینج کے پروگرام کے تحت پچھلے دنوں ہندوستان آئی تھیں اور اب اپنے وطن "تاشقند واپس جا چکی ہیں۔ "صبا" میں ایک روسی اسکالر کا مضمون شائع کرتے ہوئے ہمیں مسرت ہو رہی ہے۔ (اریب)

ہندوستان میں چھ مہینے قیام کے دوران میں بہت سے لوگوں سے ملی اور ان سے جدید اردو ادب کے مسائل اور خاص طور پر عصمت چغتائی کی تخلیق کے بارے میں باتیں کیں — چاہے عام قارئین ہوں یا نقاد، چاہے ادیب ہوں یا ادب دوست، وہ سب کے سب عصمت چغتائی کا نام آتے ہی یا ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں یا ان کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور تحریریں نہیں معلوم وہ کیا غیر معمولی بات ہے کہ لوگوں کی رائیں الگ الگ ہو جاتی ہیں؟ ان کی تحریریں کیا پرکشش قوت ہے جو قارئین کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہے؟ — عصمت چغتائی اردو ادب کی پہلی نمایاں فنکار خاتون ہیں جنھوں نے اپنی جدت پسند تحریر، قوت مشاہدہ، بے باکانہ طرز بیان، بے جھجک جرات اور اپنی رسیلی "زنانہ" زبان کی وجہ سے اردو افسانے میں نمایاں جگہ حاصل کر لی۔ مصنفہ کی تصانیف پڑھنے کے بعد مختلف نقطہ نظر رکھنے والے لوگوں میں متضاد جذبات اور احساسات پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عصمت چغتائی کی تصانیف کا موضوع اور ان میں پیش کردہ مسائل ایک ایسے زاویہ اور انداز سے پیش کیے جاتے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے خود مصنفہ کے نقطہ نظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ اکثر و بیشتر عصمت چغتائی پر عریانی اور فحاشی کا الزام لگایا جاتا ہے جس کے ثبوت میں ان کی صرف ایک کہانی "لحاف" کی مثال دی جاتی ہے۔ یہ نقاد، ادیب یا عام پڑھے لکھے لوگ جو اس کہانی کا ذکر کرتے ہیں یہ بھول جاتے ہیں کہ "لحاف" ۱۹۴۲ء میں لکھی گئی تھی یعنی ترقی پسند تحریک میں شامل ہونے سے پہلے۔ جب مغربی ادب کے اور خاص طور پر لارنس اور دیگر اسی قسم کے ادیبوں کے زیر اثر اردو ادب میں جنسی میلانات کی ایک ہلکی سی لہر مختصر عرصے کے لیے دوڑ گئی تھی۔

یہ صحیح ہے کہ عصمت چغتائی اپنے "لحاف" کی وجہ سے ہندوستان کے گھر گھر میں مشہور ہو گئیں مگر سچی شہرت ان کو

دوسری کہانیوں کی بدولت حاصل ہوئی ــــ اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ صف "لحاف" والی عصمت چغتائی نہیں بلکہ وہ پختہ فنکار عصمت چغتائی ہیں جنھوں نے زندگی کی بنائی ہوئی "ٹیڑھی لکیر"، "دردبھری داستاں"، "چوتھی کا جوڑا" زندگی کے تھپیڑوں سے غم اٹھانے والی "معصومہ" اور محنت کش انسان کی تعریف کرنے والے "دو ہاتھ" لکھے ہیں۔

عصمت چغتائی کے بارے میں بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے اور کہا بھی گیا ہے۔ جدید اردو ادب کے بارے میں جتنی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں ان میں ایک بھی کتاب اور مضمون ایسا نہیں ملے گا جس میں ان کا نام نہ لیا گیا ہو چاہے ان کی برائی کی گئی ہو یا تعریف چاہے سرسری ذکر کیا گیا ہو یا تفصیل سے لکھا گیا ہو ــــ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ عصمت چغتائی غیرمعمولی شخصیت رکھنے والی ضرور ہیں۔

ان تنقیدی مضامین کا جن میں عصمت چغتائی کا ذکر آیا ہے خصوصیت یہ ہے کہ ان میں گہرا اور ہمہ گیر مطالعہ نہیں پایا جاتا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ ہے کہ یہ مضامین زیادہ تر پورے جدید ادب سے متعلق ہوتے ہیں اور ان کا موضوع بہت وسیع ہوتا ہے۔ دوسری وجہ میرے خیال میں یہ ہے کہ ہندوستان میں زندہ ادیبوں کی تخلیق کا گہرا مطالعہ نہیں کیا جاتا اس خیال سے کہ وہ ابھی اپنے راستے سے ہٹ سکتے ہیں اور بالکل الٹی چیز لکھ سکتے ہیں اس لیے کوئی مستقل رائے نہیں دی جا سکتی ــــ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ تصنیف کو وقت کی کسوٹی پر پورا اترنا چاہیے۔ اس کے علاوہ کئی ایک تنقیدی مضامین میں تنقید نگار اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتا بلکہ جو بڑے نقاد نے کسی ادیب کے بارے میں جو کچھ کہا ہے بار بار اسی کو دہراتا ہے یہاں میری مراد صرف عصمت چغتائی کے متعلق مضامین سے ہے بلکہ دیگر ادیبوں کے متعلق مضامین سے بھی ہے۔ علم کے کسی بھی شعبے میں اور خاص کر . . .

ادب میں آخری فیصلہ یا آخری رائے نہیں ہو سکتی اور کسی بڑے نقاد کے الفاظ ابدی حقیقت کی طرح دہرانا مناسب نہیں ہے کسی بھی تصنیف کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالنی چاہیے، اس کے تمام اندھیرے گوشوں کو اپنے حق پسند قلم کے ذریعہ روشن کرنا چاہیے۔ نقاد کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے اور اس کی ذمہ داریاں بھی بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ اگر ضرورت پڑنے پر اس کا قلم تلوار کا کام کرتا ہے تو مناسب حالات میں وہ ایک اچھا اور مہربان معالج اور سا ایک عقلمند رفیق بھی ہوتا ہے اس کو ایسی باتیں کہنی چاہئیں جن سے مصنف کی حوصلہ افزائی ہو اور اس کے دل میں بہتر کہانیاں لکھنے کی خواہش پیدا ہو۔

بقول عصمت چغتائی :ــ

"تنقید کرنے والے کا رتبہ اگر وہ ایمانداری سے اپنا فرض انجام دے تو بہت بلند ہے۔ ایک طرف وہ ادیب کے دماغ کو خوراک پہنچاتا ہے تو دوسری طرف ادب کی حفاظت کرتا ہے۔ اس ادب کی جس کا زندگی سے دامن بندھا ہوا ہے اور اس طرح وہ زندگی کا بھی محافظ ہے۔ جیسے ہر انسان کو دندان ساز کے پاس وقتاً فوقتاً جانے کی ضرورت ہے اسی طرح ہر ادیب کو تنقید کی ضرورت ہے۔ دانت اکھڑوانے میں درد تو بڑا ہوتا ہے مگر صحت بھی بنی رہتی ہے۔ صرف صحیح تنقید ہی بہکنے والے قلم کو سیدھا اور صحت بخش راستہ دکھا کر غلط موڑ سے بچا سکتی ہے وہ ادیب جو تنقید نہیں سہ سکتے ہیں وہ نہ

زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں"۔ [۱]

اگر ایسا ہے تو نقادوں کو نہ صرف پرانے ادب اور مرحوم ادیبوں کی تخلیقات پر دھیان دینا چاہیئے بلکہ زیادہ توجہ موجودہ لکھنے والوں کی طرف دینا چاہیئے، ان کی رہنمائی کرنا چاہیئے اور ان کو ٹھیک راستہ بتانا چاہیئے۔

اکثر یہ دیکھا گیا کہ عصمت چغتائی کے بارے میں رائے دینے میں مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ فرمایئے اردو کے مشہور ادیب عزیز احمد صاحب نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں مختلف ترقی پسند مصنفوں کا ذکر کرتے ہوئے اور ان کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"عصمت چغتائی کو ترقی پسند ادیبوں میں شمار کرنا ترقی پسند ادیبوں کی سرپرستی اور خاتون پرستی ہے ان کا رجحان سعادت حسن منٹو سے بھی زیادہ رجعت پسند اور مریضانہ ہے"۔

یہ کہہ کر عزیز احمد صاحب نے اس بے بنیاد الزام کی وضاحت کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ بہر حال آگے اس بات کو ماننے پر مجبور ہیں کہ:

"یوں عصمت چغتائی میں بڑی صلاحیت ہے۔ ان کے طرز تحریر میں نسوانیت ہے یعنی وہ اس طرح لکھتی ہیں جیسے کوئی عورت اپنے نقطہ نظر سے لکھ رہی ہو۔ ذہنی طور پر مرد بن کر نہ لکھ رہی ہو۔ اسلوب میں عورتوں کی چلتی ہوئی زبان کی روانی ہے"۔ [۲]

جو لوگ عصمت چغتائی کے بارے میں لکھتے ہیں وہ سرسری طور پر ان کی کئی ایک تصانیف پڑھ لیتے ہیں اور جو بھی پڑھ لیتے ہیں اس کو بھی اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں کہ مصنفہ اپنی فلاں تصنیف میں کیا کہنا چاہتی ہیں تصنیف کا کیا مقصد ہے مرکزی خیال کیا ہے۔ عصمت چغتائی کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے ایسا لگنے لگا کہ ان کی زیادہ تر تصانیف سمجھی نہیں گئیں۔

ذرا ان کی افسانہ نگاری کے پہلے دور کی طرف نظر دوڑائیے یہ دور ۱۹۳۸ء سے شروع ہوتا ہے جب ان کا پہلا مضمون "فسادی" رسالہ "ساقی" میں جنوری ۱۹۳۸ء میں چھپا تھا اور ۴۲-۱۹۴۱ء تک جاری رہتا ہے۔ "فسادی" کے بعد ۱۹۳۸ء کے "ساقی" ہی میں باری باری "بچپن"، "میرا بچہ"، "کافر" "خدمت گار"، اور دیگر افسانے شائع ہوئے۔

ان کی پہلی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں انگارے اور انگارے میں حصہ لینے والی خاتون افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں اور مغربی ادیبوں میں موپساں، اوہنری اور خاص کر برنارڈ شا نے عصمت چغتائی کو زیادہ متاثر کیا۔ چنانچہ ان افسانوں اور ڈراموں میں رشید جہاں کی بے باکی "انگارے" کی باغیانہ جھلکیاں اور مغربی ادیبوں کی

۱۔ عصمت چغتائی۔ چھوئی موئی۔ جاوید پریس کراچی ۱۹۶۳ء ص ۱۳۹

۲۔ عزیز احمد۔ ترقی پسند ادب۔ رزاقی مشین پریس۔ حیدرآباد دکن مارچ ۱۹۴۵ء ص ۲۰۳

رومانیت کا اثر نظر آتا ہے۔ ان میں غیر شعوری طور پر سماج پر چھوٹی چھوٹی چوٹیں کی گئی ہیں اور لوگوں کو چونکا دینے والی ایسی بھی باتیں ہیں جن کی وجہ سے کئی ایک نقاد عصمت چغتائی کو غیر شعوری باغی کہتے ہیں ــــ ان پہلی تصانیف میں۔ عصمت چغتائی نے فرسودہ رسم ورواج اور جھوٹے اخلاق کی بے ہودہ پابندیوں کے خلاف اور ہندوستانی عورت کے حقوق کے تحفظ اور آزادی کے لیے آواز اٹھائی۔

۱۹۳۳ء میں ادیبوں میں یہ خیال پھیلا ہوا تھا کہ آزادی کے معنی ہیں جنسی آزادی اور اس کی بدولت عورت کو پوری آزادی اور مرد سے برابری کا درجہ ملے گا۔

چنانچہ عصمت چغتائی کے پہلے ڈراموں اور افسانوں میں بھی جنسی آزادی کا مطالبہ ملتا ہے ــــ مگر اس وقت وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ آزادی عورت کو کیسے ملے گی۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اگر وہ ان پرانے رسم ورواج اور سماج کی دوسری پابندیوں کو توڑ مروڑ دیں جو عورت کے پاؤں میں بیڑیوں کی طرح پڑی تھیں تو اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا ــــ مگر عورت کی آزادی بغیر اقتصادی، سیاسی، اور سماجی آزادی کے پوری نہیں ہو سکتا۔ یہ بات ان کو بعد میں معلوم ہوئی۔ مثال کے طور پر ان کے پہلے ڈرامے "فسادی" کو ہی لے لیجیے جو ٹکنیک اور پلاٹ کے لحاظ سے بہت ہی کمزور ہے اور اس میں نہ کوئی بڑا مسئلہ پیش کیا گیا ہے اور نہ زندگی کا کوئی بڑا واقعہ لیا گیا ہے۔ یہ ہندوستان کی روزانہ زندگی کا ایک معمولی سین ہے ــــ اس ڈرامے میں مصنف نے بچپن کی منگنی اور لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی پر احتجاج کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ احتجاج خود ہیروئن نہیں کرتی جو حقیقت کے مطابق بہت ہی مجہول مزاج، خاموش چپ چاپ رونے والی لڑکی ہے بلکہ ایک نوجوان لڑکا نشاط کرتا ہے۔

وہ سماج کے بے ہودہ شکنجوں کے خلاف ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے بڑے بھائی سے کہتا ہے۔

"اس دنیا میں سب ہی ہر بات کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اب اگر بجائے آپ کے میں عزت سے شادی کرنا چاہوں تو سب معیوب سمجھیں گے۔ اب عزت جو آپ کی بہ نسبت مجھ کو زیادہ پسند کرتی ہے کیا معیوب بات نہیں کرتی۔ بالکل معیوب! اسے کیا حق ہے کہ مجھے زیادہ پسند کرے اور آپ کو کچھ یا بالکل نہیں۔ یہ سراسر غلط تھا کہ عزت کے پیدا ہوتے ہی اسے آپ کے ساتھ منسوب کر دیا جائے۔ کیا یہ معیوب نہ تھا۔ عزت کچھ بھی نہ جانتی تھی بیچاری۔ جب سے وہ بڑی ہوئی آپ ہی کو شوہریت کے لیے مقرر کیا ہوا پایا۔ لیکن وہ بھی تو انسان ہے۔ اس کی خود بھی تو کوئی آزاد رائے ہے۔ وہ مجھے پسند کرتی ہے خواہ ہفتہ بھر بعد وہ آپ کی بیوی ہو جائے۔ عزت بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہے ــــ لیکن خود سے نہیں۔ دنیا ڈرپوک ہے۔ اسی لیے وہ بھی ڈرتی ہے۔ اعتراض سے ڈرتی ہے"[1]

"فسادی" میں عصمت چغتائی عورتوں کو اعتراض کرنے کے لیے بلاتی ہیں۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کیسے

---

[1] عصمت چغتائی۔ کلیاں۔ اردو مرکز لاہور۔ ص ۱۸۵، ۱۸۸

عتراض کیا جائے۔
عصمت چغتائی کی پہلی کہانیوں اور ڈراموں میں جو ۱۹۴۲ء تک لکھے گئے تھے عورت کے کردار اور اس کے مسائل کو اہم جگہ دی گئی۔ اس وقت ان کا خیال تھا کہ عورت کی غلامی اور مظلومی کی وجہ مرد ہے وہی اپنی بھلائی کے لیے عورت کو جہالت اور غلامی میں رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ بغاوت نہ کرے اور اپنے حقوق حاصل نہ کر سکے ــــــ عصمت چغتائی نے عورتوں کی سب بلاؤں کا قصور وار مرد کو اور ماں باپ کو ٹھہرایا تھا اور مردوں کی ضد میں مختلف طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ عورت فطری طور پر مرد کے برابر ہے اور بعض اوقات مرد سے بھی برتر اور بہتر ہے۔
ڈرامہ "ڈھیٹ" میں جو ۱۹۳۸ء میں "ساقی" میں شائع ہوا تھا، ہیروئن ایسی "بے حیائی" کی باتیں کرتی ہے جو ایک لڑکی کو سماج کے اخلاق کے مطابق کرنا نہیں چاہیئے اور جن کو پڑھ کر دل پر چوٹ لگتی ہے۔ یہ بھی عورت پر لگائی ہوئی سماجی پابندیوں کے خلاف اپنی قسم کا ایک احتجاج تھا۔ شروع میں ہیرو کہتا ہے "عورت خواہ کتنا ہی بلند مرتبہ پالے بڑے بڑے کام انجام دے لیکن پھر بھی وہ عورت ہے ایک کمزور ہستی ہے"۔[1]
عصمت یہ ڈائلوگ اس طرح مرتب کرتی ہیں کہ مزاحیہ اور چونکا دینے والی باتوں کے ذریعہ اس جملے کے بے ہودگی اور مرد کی بے وقوفی ثابت ہو جائے۔ "ڈھیٹ" کی ہیروئن جو منہ پھٹ اور باغی قسم کی لڑکی ہے۔ آخر میں ہیرو کو الّو بنا کر اس کو بھگا لے جاتی ہے اور اس طرح جیت جاتی ہے۔
پہلے دور کا سب سے نمایاں افسانہ "جنازے" ہے جو ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا تھا۔ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ اس کہانی میں عصمت چغتائی نے اپنی ہیروئن کا کردار پیش کیا ہے جس کو مرد کی بہ نسبت لڑکیوں سے زیادہ لگاؤ ہے۔ یہ سراسر غلط بات ہے کیونکہ اس کہانی میں ہیروئن لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی پر احتجاج کرتی ہے۔ اس کا یہ خیال ہے کہ عورت شادی کے بعد مرد کی باندی بن جاتی ہے اور عورتوں کو مردوں کی حکومت نہ سہنی چاہیئے۔ اس کی باتیں عورت کی مظلومی کے خلاف غیر شعوری بغاوت کے جذبات سے بھرپور ہیں۔ ایک جگہ ہیروئن اپنی سہیلی سے کہتی ہے۔
"کبھی تمہارے دل میں اپنی جنس کی بہتری کا خیال بھی آتا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچتی ہو کہ ہم کب تک ظالم مردوں کی حکومت سہیں گی۔ کب تک وہ ہمیں اپنی لونڈیاں بنا کے چہار دیواری میں قید رکھیں گے۔ کب تک یونہی ہم بے دبے مار کھاتے رہیں گے"[2] اسی لیے تو جب سہیلی کی شادی ہو جاتی ہے تو ہیروئن کو ایسا لگتا ہے کہ اس کی سہیلی کا جنازہ نکل رہا ہے۔
اسی سلسلے کے دوسرے افسانے "بھول بھلیاں" میں اس عام خیال کے برخلاف کہ عورت بغیر مرد کے

---

[1] عصمت چغتائی۔ کلیاں۔ اردو مرکز لاہور ۱۹۴۲ء ص ۱۹۵
[2] عصمت چغتائی۔ چوٹیں۔ اردو مرکز لاہور ۱۹۴۲ء ص ۱۸۰

اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتی ہے عصمت چغتائی نے ایک رومانی ہیروئن کے کردار کے ذریعہ یہ دکھایا ہے کہ عورت بدنام ہو کر بھی نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اپنے بچے کو بھی بغیر کسی مدد کے سنبھال لیتی ہے۔

عصمت چغتائی کی اس دور کی ہیروئن کچھ ایسی رومانی ہے جو ہمیں عام زندگی میں نہیں ملتی ــــ یہ خود مصنفہ کا ایک IDEAL ہے۔ وہ زندگی میں بھی ایسی خود مختار، آزاد اور عقلمند عورتوں کو دیکھنا چاہتی ہیں جو کسی چیز میں بھی مرد سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہیں جو نہ صرف اپنی اچھی زندگی کا خواب دیکھتی ہیں بلکہ دیش کی ترقی میں شریک ہونے کے خواہاں ہیں یہ ہیروئن اپنی جنسی آزادی اور حقوق کے لیے لڑتی ہیں مگر ان کی یہ لڑائی ڈان کوئک زوٹ کی فضول حرکتوں کی طرح ہے۔

۱۹۵۱ء میں حیدرآباد میں ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے جو مخدوم محی الدین کی جیل سے رہائی پر ان کے استقبال کے لیے منعقد ہوا تھا عصمت چغتائی نے اس دور کی اپنی ہیروئن کی بہت ہی جیتی جاگتی تصویر کھینچی تھی۔

"میں نے اپنی ہیروئن کو یہ بتایا تھا کہ اس کی اصلی دشمن اس کی بوڑھی نانی اور دادی ہیں جو اسے ہیرو کا انتخاب کرنے کا حق نہیں دیتیں۔ اب میں دس برس بعد دیکھتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ میری ہیروئن کو ہیرو مل گیا ہے لیکن اس کے مسائل حل نہیں ہوئے ہیں ــــ وہ اب بھی پریشان ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ ہیروئن کو ہیرو تو مل گیا اور دس برس میں اس کے آٹھ بچے بھی پیدا ہو گئے لیکن ہیرو کو نوکری نہیں ملی۔ ہیرو کو نوکری کون نہیں دیتا؟ وہ سماجی نظام جس کے شینٹوے پر مخدوم نے اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس لیے میں اب یہ کہتی ہوں کہ میں نے دشمن کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ میری ہیروئن کی اصلی دشمن بوڑھی نانی اور دادی نہیں ہیں بلکہ وہ سماجی نظام ہے جس کے خلاف مخدوم جدوجہد کر رہا ہے۔ ہم تمام ترقی پسند ادیبوں کو اس نظام کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔"[۱]

آپ پر واضح ہو گیا ہو گا کہ سماجی شعور کی یہ تبدیلی عصمت چغتائی میں بعد میں آئی جب وہ ترقی پسند تحریک میں شامل ہوئیں۔ ترقی پسند تحریک نے ان پر بہت ہی خوشگوار اثر ڈالا انھوں نے ایسے افسانے لکھے جن سے ان کی شہرت دور دور پھیل گئی اور ان کا نام موجودہ دور کے صف اول کے افسانہ نگاروں جیسے راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس کے ناموں کے ساتھ آنے لگا۔

عصمت چغتائی دیگر خواتین افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی ایک رہنما بھی ہیں اور ہندوستانی عورتوں کے حقوق اور آزادی کی انتھک مجاہد بھی۔

اس بڑی تبدیلی پر دوسری بار موقع ملنے پر بحث کی جائے گی مگر اب یہ کہنا غیر از دلچسپی نہ ہوگا کہ اردو کلاسیکی ادب اور جدید ادب کے نمائندہ ادیبوں کی تخلیقات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ہم ہندوستان کی

---

[۱] سردار جعفری۔ ترقی پسند ادب۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۱ء ص ۱۹۹

ایک بڑی فنکار خاتون عصمت چغتائی کی تصانیف سے اپنے روس کے لوگوں کو روشناس کرانا چاہتے ہیں جن کی تحریر میں ہندوستانی عورت کی سچی تصویر اور اس کی ساری امنگوں اور خواہشوں کی بخوبی عکاسی کی گئی ہے اور جن کا دل عام لوگوں کے لیے پرخلوص ہمدردی اور محبت سے بھرپور ہے۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ عصمت چغتائی آئندہ زمانے میں بھی اپنا یہ بلند رتبہ قائم رکھیں اور "روشن" جیسا افسانہ نہیں بلکہ "چوتھی کا جوڑا" جیسے اچھے اچھے افسانے لکھ کر اردو ادب کی خدمت اور عالمگیر ادب کی آرائش میں حصہ لیں۔

ہم نئے لکھنے والوں کا

چیلنج قبول کرتے ہیں

اگر آپ کو شکایت ہے کہ آپ کو نظر انداز کیا جا رہا ہے

اور

آپ کو چھپنے کے مواقع حاصل نہیں

اگر آپ کو بھی ہمارا چیلنج قبول ہے تو

ہمیں صبا کے لیے اپنی بہترین تخلیقات بھیجیے

دفاع اور



ترقی کا کام



ساتھ ساتھ چلتا ہے

ملک کے ترقیاتی منصوبے ملکی دفاع کا اہم جزو ہیں۔ ہنگامی حالات کے پیشِ نظر اب نئی ترجیحات مقرر کی گئی ہیں۔ انجینئرنگ اور حفاظتی سلسلے کی تربیت، بجلی، ایلومینیم اور فولاد، مشین، مشینیں اور اوزار، بجلی کا ساز و سامان، کوئلے کی کان کنی اور ریلوے جیسی بنیادی صنعتوں کے ترقیاتی پروگراموں پر تیزی سے عمل کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔
طاقت کی ٹھوس بنیاد پر ہی دفاع کی تیاری کا انحصار ہے۔ ہمارے مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔
اس مہم کو کامیاب بنانے کے لئے جی جان سے ہاتھ بٹائیں۔ کروڑوں جیالوں کی بے غرض خدمت اور ان تھک کوشش کی بدولت ہی بھارت اپنی دفاعی طاقت کو بڑھا سکتا ہے۔



پلان کو کامیاب بنائیے

بھارت کے دفاع کو مضبوط کیجئے

نجمہ صبیح

گُلِ تر کی رعنائیاں

جدید اردو شاعری غمِ جاناں سے غمِ دوراں کی طرف ایک طویل سفر ہے ۔ غمِ دوراں کا احساس رنگارنگ ہوتے ہوئے بھی بڑا تلخ اور سنگین ہے ۔ یہاں حُسن، رومان اور آسودگی کے فانوس بجھ جاتے ہیں اور زندگی کی محرومیاں اور تشنگی کچھ اور بھی کسک پیدا کر دیتی ہے ۔ مگر غمِ دوراں نے ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں ایک نیا احساس اور زندگی کا نیا ادراک پیدا کیا اس احساس نے تلخی اور بغاوت کے جذبے جگائے اور اس طرح اردو شاعری میں خارجی دنیا اپنی پوری بے رحم سچائی اور سنگین حقیقت کے ساتھ در آئی ۔ آج شاعر کی آواز اپنی داخلی گہرائیوں ہی سے نہیں بلکہ کائنات کی وسعتوں سے آرہی ہے ۔ وہ محض جذبے کے سہارے نہیں بلکہ علم و شعور کی روشنی میں شاعری کو نئی نئی بلندیوں سے آشنا کر رہا ہے ۔ زندگی کے ہمت شکن ماحول میں بھی اُمید کے نئے چراغ جلا رہا ہے ۔ انسانیت کی روندی ہوئی کلیوں میں بھی ایسے "گُلِ تر" کی تلاش کر رہا ہے جو انسان کے مشامِ جان کو مہکا دے ۔ اس کی کچلی ہوئی روح میں زندہ رہنے کی امنگ پیدا کر دے ۔ وہ مایوسیوں سے گہرے اندھیرے میں بھی ایک نئی سحر کا انتظار کر رہا ہے ۔ یہ رات طویل سہی، اُجالا کبھی تو پھوٹے گا ۔ ؟ اور انتظار کے بعد آئی ہوئی صبح کتنی حسین، کتنی تابناک اور دلآویز ہوگی ۔

مرمریں صبح کے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام آئے گا
رات ٹوٹے گی اجالوں کا پیام آئے گا

ایک نئی صبح شاعر کے خواب کی تعبیر ہے وہ خواب جس کا صرف تصور کل تک ہماری شاعری میں ہلچل پیدا کر رہا تھا ۔ آج وہ تصور ایک انقلابی زندگی کے قالب میں سما کر سامنے آچکا ہے ۔ اس طرح اردو شاعری جو بیسویں صدی کے آغاز تک بھی اپنی وجدانی نزاکتوں اور فنی باریکیوں کے ساتھ محض تفریحی اور فراری تھی ۔ انقلابی افکار کی ایک نئی شاہراہ پر نکل آئی اور شاعری میں ایک ایسے دور کی ابتداء ہوئی جس میں عوام کی نبضِ حیات کی دھڑکنیں نمایاں تھیں ۔

اردو شاعری اس انقلاب کے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے جن نئی نئی منزلوں کی طرف بڑھی ہے ۔ جن ترقی پسند رجحانات کی وسعتوں اور گہرائیوں سے روشناس ہوئی ہے ان میں مخدوم محی الدین کا نام اور کلام نمایاں ہے ۔ مخدوم کی

شاعری ایک ایسا نشانِ راہ ہے جس سے ہم اس منزل کا پتہ پاتے ہیں جہاں ذہنی انقلاب کی تمام قوتیں جمع ہو رہی ہیں۔ ان کی شاعری عمومی افکار کی آئینہ دار ہے۔ یہاں مجھے مخدوم کے کلام پر تنقید کرنا نہیں ہے میں توان تاثرات کو ظاہر کرنا چاہتی ہوں جو "گلِ تر" کے پڑھنے کے بعد ہوئے ہیں۔

"گلِ تر" "سرخ سویرا" کے مقابلے میں مخدوم کے ذہنی اور شعوری ارتقا کی نیا یاں نشان دہی کرتا ہے۔ مخدوم نے آج کے مسائل کو بڑے حسن، بڑی دلآویزی اور بڑے فنکارانہ انداز سے اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ "چاند تاروں کا بن" میں ان کانٹوں کی نوک نظر آ رہی ہے جو دلوں میں کھٹک رہے ہیں۔ نظم کے آخری حصے کا لہجہ بڑا غمگین ہے۔ جس آزادی کے لیے شہیدوں نے موم کی طرح اپنے تن گھلائے تھے وہ آزادی آئی بھی تو آرزووں کے خون میں ڈوبی ہوئی مگر شاعر اپنے ہمدموں سے مایوس نہیں اور نہ شاعر کو مایوس ہونا چاہیئے کیوں کہ شاعری ہمارے دل سے گفتگو کرتی ہے۔ اس کا اثر ہماری روح، دل و دماغ، وجدان غرض ہماری مکمل شخصیت پر ہوتا ہے۔ اگر شاعر ہمیں یاس کی بھیانک ظلمتوں میں ڈھکیل دے تو امیدوں کے نازک آبگینے چور چور ہو جائیں گے۔

غرض ــ وہ اپنے ہمدموں سے مایوس نہیں ــ

رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا بھی ہے
صبح کا کچھ اُجالا اُجالا بھی ہے
ہمدمو ــ
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی، منزلیں دار کی، کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

میرے خیال میں شاعر کو غمگین تو ہونا چاہیئے مگر مایوس نہیں۔ مخدوم کے کلام میں ہمیں کہیں بھی یاس اور بیزاری نظر نہیں آتی۔ اگر کہیں یاس ہے بھی تو اس کے پہلو میں امید اور آرزو اور ارادے کے نقش بڑے گہرے نظر آتے ہیں جس سے کلام میں اثر کچھ زیادہ ہی ہو جاتا ہے اور عمل کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ مثلاً "پیار کی چاندنی" کا یہ بند ظلم و زیادتی کے محبس میں بھی زندگی کی سرگرمیوں میں شامل رہنے کی تحریک دلاتا ہے۔

ابنِ آدم کو سولی چڑھاتے رہو
رند کافی سرِ دار گاتی رہے
یادِ یاراں میں اک جامِ غم اور دو
رات کی تیرگی سوز گاتی رہے
دل بڑھاتی رہیں ہاتھ کی نرمیاں
پیار کی چاندنی جگمگاتی رہے

اسی طرح "جانِ غزل" اور دوسری غزلوں میں مخدومؔ نے دل کے اس ساز کو بہت آہستہ سے چھوا ہے جس سے محبت کا ایک غمگین نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ بہت مدھم اور نازک ـــ مگر محبت کے ان پُر کیف لمحات میں وہ چاہتے ہوئے بھی دنیا کے غم بھول نہیں سکتے۔

مل گیا راہ میں اجنبی موڑ پر کوئی جانِ غزل
آج تو یاد آئیں نہ دنیا کے غم
آج دل کھول کر مسکرا چشمِ نم
آج چھٹکی ہے رخسار کی چاندنی
چھٹ گئیں بدلیاں، کھل گئے پیچ و خم
"کتنا بھاری تھا یہ زندگی کا سفر
میری جانِ غزل

"جانِ غزل"، "ہم دونوں" رومانیت اور جذبات کی مے سے چھلکتے ہوئے جام ہیں ان میں زندگی کی امنگوں اور بےتابیوں کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ محبت اور پیار کی پرخلوص خواہش جدائی کے اذیت ناک لمحوں میں بھی مایوس ہونے نہیں دیتیں۔

میں جہاں بھی رہوں جس جا بھی رہوں
اپنی آنکھیں تو افق زاروں پہ ملتی ہی رہیں گی کہیں دور
اور یہ دل چپکے سے مل جائیں گے دل ہی دل میں

مخدومؔ کے یہاں دھیمے دھیمے سے حزن و ملال کی جو کارفرمائی نظر آتی ہے وہ کسی "رنگین حادثے" کی بدولت ہے اور اسی لیے ان کے کلام میں جو گہرائی اور گیرائی ہے وہ بھی کچھ ان ہی حالات کی رہینِ منت ہے ورنہ وہ ایسی اثر آفریں غزلیں نہ کہہ پاتے۔

یہ کون آتا ہے تنہائیوں میں جام لیے — جلو میں چاندنی راتوں کا اہتمام لیے
چٹک رہی ہے کسی یاد کی کلی دل میں
نظر میں رقصِ بہاراں کی صبح و شام لیے

ان کی بعض غزلیں بڑی مرصع ہیں ان میں مشاقی کی شان پوری آن بان کے ساتھ جھلکتی ہے میں نے ان غزلوں کو کئی کئی بار پڑھا ہے اور ہر بار ایک نیا لطف محسوس کیا ہے

روشن ہے بزمِ شعلہ رخاں دیکھتے چلیں

اور

سازِ آہستہ ذرا گردشِ جام آہستہ — جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ۔

ایک جگہ انھوں نے خود ہی کہا ہے :-

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل
تمام رات غزل گائیں دیدِ یار کریں

فیض کے اثرات کے ہلکے ہلکے نقوش غزلوں کے بعض مقامات پر بہت پُر کیف ہیں۔

وا ہو رہی ہے میکدۂ نیم شب کی آنکھ
انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھتے چلیں
سرگوشیوں کی رات ہے رخسار و لب کی رات
اب ہو رہی ہے رات جواں دیکھتے چلیں

کہیں کہیں ان غزلوں میں نوجوانی کے سے سطحی جذبات بھی جھلک اٹھتے ہیں۔

مخدوم موجودہ شاعروں میں صف اول کے شاعر ہیں ان کے ہی شعور میں خلوص و صداقت حقیقت و واقعیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ ان اقدار کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اس کے بغیر ان کے نزدیک فن کی تخلیق ممکن ہی نہیں۔ مگر کاش وہ جزوی غلطیوں کو نظر انداز نہ کریں۔ معمولی لفظوں کا ذرا سا الٹ پھیر ساری نظم کی خوبصورتی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم "ہم دونوں" کا یہ حصہ :-

اپنے گوندھے ہوئے غم کے بندھن
شب کے سناٹے میں
جاگ اٹھتے ہیں، تڑپ جاتے ہیں، چلاتے ہیں

پہلے تو غم کے بندھنوں کو گوندھنا پھر اسے استعارے کے پھیر میں لا کر جاندار تصور کر کے انھیں تڑپانا اور پھر ان کا چلّا اٹھنا! مسرت و غم کو ذی روح صفات سے متصف کیا جا سکتا ہے مگر غم کے بندھن نہ تڑپ سکتے ہیں اور نہ چلّا سکتے ہیں۔ اس سے زبان سے لاپرواہی کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر اسی نظم میں آگے چل کر انھوں نے بڑی سیدھی سی خوبصورت تشبیہ دی ہے۔

میرے سیلاب تخیل میں تری یاد اے دوست
اس طرح تیرے گی
صبح دم تیرتا پھرتا ہے کسی جھیل میں جیسے کوئی ہنس

ان کی نظم احساس کی رات "خوبصورت" حسین نظم ہے اگرچہ اس میں بھی الفاظ کا غلط استعمال اور غلط استعارے کھٹکتے ہیں مثلاً

شفقِ زیست کی پیشانی کا رنگین قشقہ

زیست کی پیشانی کا رنگیں قشقہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر زیست کی شفق ۔۔ اور نہ صرف یہ بلکہ شفق پر پھر ایک رنگین قشقہ بھی لگا دیا۔ اسی طرح بعض نظموں اور غزلوں میں بعض الفاظ کا استعمال محلِ نظر ہے۔

یہ کوہ کیا ہے یہ دشتِ الم فزا کیا ہے

الم فزا کہنا فصیح اردو نہیں بلکہ یہ لفظ کی غلط ترکیب ہے۔ فزا کا لفظ اس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں خوشی اور مسرت کا اظہار کرنا ہو۔ ایک اور جگہ ایسی ہی فاش غلطی ان سے سرزد ہوئی ہے۔

ان کے پہلو کے مہکتے ہوئے شاداں جھونکے

جھونکے مہک سکتے ہیں مگر شاداں کیسے ہو سکتے ہیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کاش ہمارے شعراء ان ذرا ذرا سی غلطیوں پر نظر رکھیں تاکہ پڑھنے والے کا تاثر ختم نہ ہو۔

بہرحال — چند فنی اور لسانی لغزشوں سے قطع نظر مخدوم کے کلام میں ایک بات نمایاں ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب نہیں ان کے پاس جذبات کے ساتھ ارادے کی قوت بھی کارفرما ہے۔ ان کے المیہ میں زندگی دوڑتی پھرتی ہے جو کرب والم کے عالم میں بھی جینے کے لیے کوشاں ہے۔ ان کے تفکر میں سنجیدگی، خلوص اور انسانیت کا ایک حسین امتزاج ہے اور ان کے پرخلوص لہجے کی سری میں ایک ترنم ہے۔ ان کے تصورات کی گرم آنچ اور جذبات کی سچی میں ایک ایسی روح تڑپ رہی ہے جسے سماجی اور معاشی بدحالی سے نفرت ہے، مجبور انسانیت کی غلامی سے نفرت ہے سماج کی خودغرضیوں سے نفرت ہے۔

آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

ان کی اکثر نظموں اور غزلوں میں تشنہ کام محبت کے تصورات و جذبات کی لو بھڑکتی نظر آتی ہے،

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخیٔ ایام بھی پی ہے

مگر کرب و اضطراب کے اس عالم میں بھی وہ تسکین و طمانیت کے سامان ڈھونڈ لیتے ہیں،

دراز ہے شبِ غم سوز و ساز ساتھ رہے   مسافرو مئے مینا گداز ساتھ رہے

قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں
سفر کٹھن ہے دمِ شعلہ ساز ساتھ رہے

"دمِ شعلہ ساز" اگر ساتھ ہے تو زندگی کی راہوں پر پھول بکھر جاتے ہیں کیوں کہ،

زندگی لطف بھی ہے زندگی آزار بھی ہے
ساز و آہنگ بھی زنجیر کی جھنکار بھی ہے
زندگی دید بھی ہے حسرتِ دیدار بھی ہے
زہر بھی آبِ حیاتِ لب و رخسار بھی ہے
زندگی دار بھی ہے زندگی دلدار بھی ہے

دار سے دلدار کی منزلوں تک پہنچنے کے لیے کتنے کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے۔

مخدوم کی نئی نظموں میں جو ایک نیا رجحان ابھرا ہے وہ گزرتے ہوئے لمحے سے مسرت کا رس نچوڑنے اور ماضی یا مستقبل کے مقابلے میں حال کو اہمیت دینے کا رجحان ہے۔ جو صحت مندی بھی ہے اور زندگی سے پیار کا ثبوت بھی

یہ رقص رقصِ شرر ہی سہی مگر اے دوست
دلوں کے ساز پہ رقصِ شرر غنیمت ہے
قریب آؤ ذرا اور بھی قریب آؤ
کہ روح کا سفرِ مختصر غنیمت ہے

حقیقت یہ ہے کہ شعر پڑھ کر رہ جانے والی کیفیت ایک ایسے ہی شاعر کا حصہ ہے جس کی شاعری میں ساحری ہو — اور مخدوم کی شاعری میں محبت کی خوشبو کے ساتھ سوزِ وطن کی سوندھی سوندھی مہک بھی شامل ہے۔

حبیب تنویر

سحر ہونے تک

اڑتے رہتے ہیں پتنگوں کی طرح سر میں حروف
روح تک ملتی چلی جاتی ہے احساس کی شمع
تب رگ و ریشہ سے رہ رہ کے پگھلتا ہے خیال
اور لہو سے کی طرح نطق پہ آ جاتا ہے

زندگی یونہی گزرتی ہے سحر ہونے تک
اور ازل ہی سے سحر یہ مرا وعدہ ہے
وہ جب آئے گی افق پر تو میں سو جاؤں گا

خلیج

کیا یہ چاند
وہ نہیں ہے کہ جو تھا
کیا گلستاں کی بہار
ہو گئی دیکھتے ہی دیکھتے اتنی تبدیل
اور مرا ذوق ہی بیگانۂ تغیر رہا

چاند شاید ہے وہی
یہ گلستاں یہ بہار
یہ شگوفے
یہ وہی ہیں کہ جو تھے
کچھ جو بدلا ہے تو بدلا ہے مرا دل مری آنکھ
اجنبی میرا ہی اک ذوق ہے —
ورنہ ماحول وہی ہے کہ جو تھا
آج سے ساٹھ صدی قبل

حیرتی ایک میں تنہا ہوں گلستانوں میں
ورنہ گلشن بھی وہی شاخ نشیمن بھی وہی
فطرت دہر وہی
اجنبی میری ہی اک فطرت ہے —
جو بدلتی ہی بدلتی ہی رہی
اپنے ماحول سے ہوتی رہی دور
یعنی ماحول وہی ہے کہ جو تھا
آج سے ساٹھ صدی قبل

سحر انصاری

مجسّمہ

تمھارا یہ خیال ہے
کہ تم کو زندگی کے لمسِ گرم نے
جوان آگ کے بجائے برف میں بدل دیا
فشارِ قید و بند نے
تمھارے شیشۂ وجود کو کچل دیا
تمھارے ہات کی حنا تمھارے دل کا خون ہے
تمھارا چہرہ آفتاب تو ضرور ہے
مگر اس آفتاب میں
شعاعِ التفات کا گزر نہیں
اس آفتاب کو
سیاہیِ گریز و انفعال سے مفر نہیں
تمھارا یہ خیال ہے
کہ مرمریں مجسمہ ہو تم جسے کوئی
گلے لگا کر پیار بھی کرے تو شرمسار ہو
تمھاری چشمِ سحر آشنا
تمھارے لب کی مسکراہٹیں
تمھارے جسمِ ناز کے خطوط نور آفریں
طلسم کاری و فسونِ دستِ نقش ساز ہے
تمھارا جیتا جاگتا وجود بے گداز ہے

مگر مجھے یقین ہے
تمھارے جسمِ ناز میں سانس لے رہا ہے سیلِ آرزو
چہک رہا ہے شاخ شاخ گلستانِ رنگ و بو
تمھاری تشنگی ہے صرف جسم و جاں کی تشنگی
تمھاری زندگی کو چاہیے سرورِ زندگی
تمھارے غم کو عشرتِ نشاط کا لباس چاہیے
تمھارے دل کی شام کو چراغِ التماس چاہیے

مرے قریب آ کے دیکھ لو کہ میں
تمھارے دل کی شام کا چراغِ التماس ہوں
میں نغمۂ حیات ہوں نشاط کا لباس ہوں
مرے قریب آ کے دیکھ لو
کہ زندگی کے لمسِ گرم سے بھی زندہ تر ہوں میں
اگر مجسمہ ہو تم
تو میں تمھارے حق میں ہو، رگوں میں دوڑتا لہو
مگر مجھے یقین ہے
بایں وجود مرمریں مجسمہ نہیں ہو تم
کہ جس کو آسماں سے مہر و ماہ دیکھتے رہیں
کہ جس کو صف سرِ راہیانِ راہ دیکھتے رہیں

کمار پاشی

گندے دنوں کا قصہ

وہ شہروں سے آئے تھے
تہذیب سے آشنا تھے
نفاست سے رہنا انھوں نے ہی
ہم کو سکھایا تھا
ایسا کتابوں میں میں نے پڑھا ہے

وہ نعرے لگاتے ہوئے چل رہے تھے
فلک بوس نعرے
مگر ہم نے (جو
دور جاتی ہوئی سڑکوں کے دونوں طرف
ہاتھ باندھے کھڑے تھے) کہا:
یہ بجا ہے، ہمارے بزرگوں کو تم نے
نفاست سے رہنا سکھایا تھا
لیکن
ہماری تمھاری زبانیں جدا ہیں
ہماری زباں میں بھی اک آدھ نعرہ لگاؤ
تبھی ہم تمھارے سفر کے صعوبت کا الزام لیں گے

یہ سن کر انھوں نے
ہماری زباں میں بھی دو چار نعرے لگائے
تو ہم سب
جواباً بڑی دیر تک مسکرائے

اسی رات ہم نے
کھلے آسمانوں تلے
ان کا سواگت کیا
اُن کے سینوں پہ جگ مگ ستاروں کے تمغے لگائے
اور ان کی وِجے کا بھی دیوتاؤں سے وردان مانگا

کئی رات تک یہ حسیں جشن جاری رہا
چندرماؤں کے پیالوں میں ہم نے انھیں
جَو کی مے پیش کی
جس کو پہلے پہل وہ جھجکتے ہوئے
پھر مچلتے ہوئے
پھر فلک بوس نعرے لگاتے ہوئے
مل کے پینے لگے

تب ہمارے بزرگوں کے وقتوں کے سازندوں نے
ساز اپنے اٹھائے
خلاؤں میں نغموں کے جگنو منسے
رات اپنی لٹیں کھول کر رقص کرنے لگی

تب بڑی دیر تک
وہ ہماری حسیں بیویوں کے
تھرکتے نتمبوں
دھڑکتے دروجوں
کا گن گمان کرتے رہے
پھر ہماری کنواری جواں بیٹیوں کو
بغل میں لیے
دور پھیلے ہوئے سایوں میں کھو گئے

(۳)

(اور) وہ شاید دسمبر کا اک سرد دن تھا
کہ جب ہم نے کپڑے اتارے
بدن پر سیاہی ملی
اور ہاتھوں میں اپنی لکھی سب کتابیں اٹھائے
ہزاروں کی تعداد میں گھر سے نکلے
تو سڑکوں پہ چلتی ہوئی موٹروں میں بسوں میں
سے کتنے ہی لوگوں نے فقرے اچھالے

مگر ہم کہ شرمندگی اپنا تعویذ تھا — بازوؤں پر سجائے
افق کے اشارے پہ گھر چھوڑ کر
ان پہاڑوں پہ پہنچے
جہاں ہم نے مل کر خود اپنی لکھی سب کتابیں جلا دیں
ہزاروں برس بعد
شہروں میں آئے
تو لوگوں نے ہم کو بتایا
حکومت ہماری ہے
ہم سارے کتب تمھیں سونپتے ہیں
تمھیں پھر سے بچوں کو تعلیم دینا پڑے گی
تمھیں پھر سے ان سب کتابوں کو لکھنا پڑے گا

(اختتامیہ)

مگر ایک دن
ہم نے سپنے میں دیکھا
ہماری کنواری، جواں بیٹیوں نے
جو بچے جنے تھے
وہ اب اپنے ہاتھوں میں ترشول لے کر
ہماری ہی جانب چلے آ رہے ہیں
تو شاید انھوں نے
ہماری ہی بیٹیوں (اپنی بہنوں) کے جسموں کی بو سونگھ لی ہے

عادل منصوری

روح کی روشن گپھا میں...

روح کی روشن گپھا میں
آنکھ میچے دھیان میں ڈوبے ہوئے
جوگی کے ننگے جسم سے
اس کی ادھوری خواہشوں کا اژدھا لپٹا ہوا ہے
اس کے سر پہ سایا کرتے
بوڑھے پیپل سے
گزرتی موسموں کے ساتھ گرتے پیلے پتے
اس کے جلتے جسم کی خوشبو کو چھو کر
سبز ہو جاتے ہیں پھر سے
اس کے چہرے پر چمکتا نور کا ہالہ
برابر پھیلتا جاتا ہے
میرے جسم کی تاریکیوں میں
سانس لیتا ہوں تو
اس کے جسم سے چپکی ہوئی
پچھلے جنم کی راکھ اڑ کر
خواب بھر جاتی ہے میری آنکھ میں
رات مر جاتی ہے میری آنکھ میں

میرین ڈرائیو

شہریوں سے تنگ آکر
شور سے دامن چھڑا کر
اونچی اونچی بلڈنگیں
خودکشی کرنے کی خاطر
صف بہ صف دریا کنارے
دیر سے آکر کھڑی ہیں

اختر نظمی

جال

میں خوابوں میں گھرا ہوا ہوں
خواب جو رنگیں آنچل بن کر
لہراتے ہیں
بھولے ہوئے ماضی کا پیکر
بن جاتے ہیں
خواب جو ایک کہانی اکثر
دہراتے ہیں
بیتے لمحوں کی خوشبو سے
مہکے مہکے ان خوابوں میں
کتنا گہرا طنز چھپا ہے
لیکن طنز سے حاصل کیا ہے
میں وہ راہیں چھوڑ آیا ہوں
سارے رشتے توڑ آیا ہوں
پھر یہ جال سا کیوں پھیلا ہے؟

نیا موڑ

میری منزل تھی، مرا جادہ تھا
اپنی ہی دھن میں بڑھا جاتا تھا
ایک آہٹ نے قدم تھام لیے
ایک آواز نے بڑھنے نہ دیا
ایک آواز وہ دلکش نغمہ!
دل میں اترا۔ تو اترتا ہی گیا
اسی آواز کی جانب ہوں رواں
اپنی منزل کا پتہ یاد نہیں

احسن یوسف زئی

گرد لمحوں کی...

ہم سرِ جادۂ حیاتِ حزیں
کھوئی نظروں سے تک رہے ہیں وہاں
گرد لمحوں کی اڑ رہی ہے جہاں

محض دیوانگی سہی لیکن
دامنِ تار تار میں اپنے
گرد لمحوں کی بھر رہے ہیں ہم
سوچتے ہیں کہ شاید ان ہی میں
وہ بھی لمحہ میسّر آجائے

جب دلِ زار مسکرایا تھا
آپ کا پیار اس نے پایا تھا

زندگی

دل کو یارو بناؤ نہ تیغ
زندگی کے عظیم دریا کی
تند موجوں میں ڈوب جائے گا
تہہ میں دریا کی بیٹھ جائے گا
ظلمتوں کی جگہ
فنا کی گود

دل کو دے دو صفت سفینے کی
زندگی کے عظیم دریا کی
تند موجوں میں تیر سکتا ہے
سینہ دریا کا چیر سکتا ہے
زندگی کا
یہی تقاضا ہے

شاہد پرویز

صلیب

اک مصوّر کی تخلیق کو دیکھ کر
سوچتا ہوں کہ فنکار کے ذہن نے
شب کے تاریک لمحوں سے دل... مانگ کر
دیدۂ زندگی سے لہو مانگ کر
جاگتی خواہشوں سے خاکے چُنے
پھر کہیں جا کے پیکر مکمل ہوا، ایک تصویر کا
جسم پر کوئی جس کے لبادہ نہیں، ڈھانپنے کو بدن
کوئی چادر نہیں
اپنی آغوش میں ایک بچّہ لیے، مسکراتا ہوا
اور حیران آنکھوں سے تکتی ہوئی
ظلمتوں کے مکیں، جابروں کی طرف
یہ ہے مریم اگر تو رفیقو سنو
اس سے پہلے کہ ننھا سا عیسیٰ نفس

ظلمتوں کی ردائیں دریدہ کرے
اس کو مریم کی آغوش سے چھین لو
زندگی کی رگوں سے لہو کھینچ کر
دار پر اک چراغ اور روشن کرو
ابن مریم کو خالق کا بیٹا کہو
پھر اسے زندگی کا مسیحا کہو
اور روتے رہو ایک مصلوب کو
آج اک بار پھر خونچکاں داستاں
وقت کے راستے پیچ کی آواز پر
منتظر ہے تمھارے ستم کے لیے

جوہر سعید

شہزادیو

تبسم، ترنم کی شہزادیو
مجھے جلد ہی بھول جاؤ گی تم

مری خود فراموشیوں کا فسوں
نہ ٹوٹا تو بے جان ہو جائے گا
مری اپنے انجام پر ہے نظر
تبسم ترنم کی شہزادیو
مجھے جلد ہی بھول جاؤ گی تم

ہنسا تا نہیں خندۂ گل مجھے
نئے ہیں مری نارسائی کے غم
مرے دجلۂ شوق میں آج بھی
سمندر سمندر ہیں طغیانیاں
نہیں سہل بننا مرا ہم سفر
تبسم، ترنم کی شہزادیو
مجھے جلد ہی بھول جاؤ گی تم

میں اُس پار کا رہنے والا نہیں
تقدس کے چشمے رواں ہیں جہاں
لطافت جہاں فوج در فوج ہے
جہاں کے تصور میں ہے چاندنی
کثافت جہاں نام کو بھی نہیں
جہاں رقص کرتے ہیں ماہ و نجوم
جہاں نور ہی نور ہے جلوہ گر
تبسم، ترنم کی شہزادیو
مجھے جلد ہی بھول جاؤ گی تم

مسائل کی شاموں میں رہتا ہوں گم
جگاتی نہیں میری صبحیں مجھے
غمِ دیگراں کی شرابوں کا رس
پلاتا ہوں، اپنی امنگوں کو میں
مری زندگی، میری اپنی نہیں
میں اپنے لیے ہوں ابھی اجنبی
نہ پوچھو، ابھی مجھ سے میرا پتہ
میں دشتِ تحیّر میں آباد ہوں
جو شہرِ یقیں سے ہے نزدیک تر
تبسّم، ترنّم کی شہزادیو
مجھے جلد ہی بھول جاؤ گی تم

عداوت اندھیروں سے رکھتی ہو تم
اجالے مری زندگی میں نہیں
جو صدیوں سے ہے میرے دل میں کہیں
وہ غم بے کشش ہیں تمھارے لیے
تمھارا تعلق بہاروں سے ہے
تمھیں پھول ہی پھول درکار ہیں
تمھیں چاہیئے نکہت و نغمگی
امنگوں کی لہروں پہ بہتی ہو تم
میں کیسے تمھاری روش پر چلوں
مجھے فرصتِ یک نفس بھی نہیں
تمھیں چاہیئے، دمبدم شور و شر
تبسّم، ترنّم کی، شہزادیو
مجھے جلد ہی بھول جاؤ گی تم

غلام ربانی تاباں

جستجو ہو تو سفر ختم کہاں ہوتا ہے
یوں تو ہر موڑ پہ منزل کا گماں ہوتا ہے

ایسے لمحے بھی گزرتے ہیں تری یاد کے ساتھ
دل پہ کمبخت دھڑکنا بھی گراں ہوتا ہے

آئینۂ رازِ تکلم ہے مری خاموشی
کچھ نہ کہنا بھی اک اندازِ بیاں ہوتا ہے

کیا قیامت ہے کہ ہر مرحلۂ ترک و طلب
اہلِ دل کے لیے پیغامِ زیاں ہوتا ہے

شدتِ غم کو تبسم میں چھپانے والے
دل کا ہر راز نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے

میری آشفتہ کلامی پہ بہت طنز نہ کر
دل کی ہر بات میں اک ربط نہاں ہوتا ہے

عشق وہ دشمنِ تمکیں ہے کہ اکثر تاباںؔ
دوست کا لطف بھی اک آفتِ جاں ہوتا ہے

مسلم ضیائی

(حیدرآباد سے رخصت ہوتے ہوئے)

مسافر ہوں بھٹکتا پھر رہا ہوں
وطن میں اجنبی سا ہو گیا ہوں

ابھی کچھ پھول باقی ہیں چمن میں
انہی پھولوں کو جا کر چومتا ہوں

نہ جانے اب کہاں وہ صورتیں ہیں
گلی کوچوں میں جن کو ڈھونڈتا ہوں

جہاں پر مسکراتی تھیں نگاہیں
وہیں اب خوں کے آنسو رو رہا ہوں

مرے کھوئے ہوئے نغمے کہاں ہیں
شکستہ بربطوں سے پوچھتا ہوں

شعورِ زیست بخشا ہے جنھوں نے
میں وہ مشفق نگاہوں ڈھونڈتا ہوں

مرے پیارے دکن کے دلنوازو
خدا حافظ' اجازت چاہتا ہوں

رفیق سبزیری

ہم نے مانا خار و خس رشکِ بہاراں ہو گئے
اُن گلستانوں کو دیکھو جو بیاباں ہو گئے

اس بھری برسات میں کچھ کھیتیاں مرجھا گئیں
کچھ خزاں پروردہ ہم رنگِ بہاراں ہو گئے

مسندِ گل بسترِ خارِ مغیلاں بن گئی
کس قدر سنسان یہ شہرِ نگاراں ہو گئے

دیدہ و دل عشق و مستی سے تہی ہونے لگے
ہائے کیسے ملک کتنی جلد ویراں ہو گئے

ہم خزاں نا آشنا کچھ لوگ تیرے شہر میں
اب شہیدِ حسرتِ صبحِ بہاراں ہو گئے

علم و فن کے مدعی ہیں کیسے کیسے کم سواد
مرکزِ بہبودِ طفلاں سبھی دبستاں ہو گئے

ہم زمانے میں سفیرِ موسمِ گل تھے رفیق
اور ہم ہی قسمتِ خارِ مغیلاں ہو گئے

محسن احسان

نگارِ فن پہ حریفانِ شعر کی یلغار
نیامِ حرف کہاں ہے خیال کی تلوار
رہینِ مرگِ تمنا تھی کامرانیٔ وصل
جھلس گیا ہے مجھے قربِ شعلۂ رخسار
تڑختی دھوپ میں اب اور کس جگہ بیٹھوں
سمٹ کے میں گیا دیوار - سایۂ دیوار
ہوا کچھ ایسی چلی دشتِ نامرادی سے
اجڑ کے بس نہ سکے پھر کبھی دلوں کے دیار
جلا گئی ہے مری آگ پیرہن میرا
میں کیا گلہ کروں تجھ سے چراغِ محفلِ یار
ذرا رسائیٔ منزل گہِ مراد تو دیکھو
چلے تھے شہرِ وفا سے پہنچ گئے سرِ دار
یہ کس نے سروِ گلستاں کا ذکر چھیڑا ہے
نکھر چلا ہے نگاہوں میں پیکرِ قدِ یار
یہ کس جزیرۂ بے رنگ و بو میں بستے ہیں
نہ طائرانِ چمن ہیں نہ آہوانِ تتار
یہ کون گزرا ہے محسن خرابۂ دل سے
کہ اڑ رہا ہے ہر اک سمت حسرتوں کا غبار

مظفر حنفی

اس جرم میں گواہ جو میرے خلاف ہیں
سچ مانیے حضور کہ "وعدہ معاف" ہیں

"تعمیر کے خیال میں" وہ بھول ہی گئے
دیوار میں ابھی سے ہزاروں شگاف ہیں

شاید انھیں خبر بھی نہیں "رات ڈھل چکی"
"پروانہ ہائے شوخ" کہ محوِ طواف ہیں

مرکز چُنا گیا ہے جسے اجتماع کا
ذرّہ پرہ وہ اس مقام پہ سو اختلاف ہیں

اے دوستو! فریب نہ کھانا نگاہ کا
دل کی خباثتوں پہ سنہرے غلاف ہیں

نیّت وہ باغبان کی پہچانتے نہیں
وہ لوگ جو سرے سے خزاں کے خلاف ہیں

کہتے ہیں یار لوگ مظفر کے باب میں
"کڑوے زبان کے ہیں طبیعت کے صاف ہیں"

وہ جن کے دم سے نہیں جو دعویں کے ماہ کی خیر
وہ آرہے ہیں مرے گھر، چراغِ راہ کی خیر

چھلک نہ جائے کہیں تابِ ضبطِ نظارہ
کدھر اٹھی ہے الٰہی، مری نگاہ کی خیر

عوام ہی کو نہ کیوں بادشاہ قتل کریں
عوام ہی تو مناتے ہیں بادشاہ کی خیر

ہوائیں جن کے لیے خاک، ان کی آمد ہے
بساطِ راہ سلامت غبارِ راہ کی خیر

ادھر بھی اک نظرِ التفات ہو جائے
متاعِ حسن کا صدقہ، جہاں پناہ کی خیر

چمک رہی ہے کوئی برق سی بیاباں پر
نہیں ہے آہ ہماری قیام گاہ کی خیر

وہ طنز تھا کہ دعا تھی، کہا مظفر نے
"کہ غم گسار کی، ناصح کی خیر خواہ کی خیر"

اثر مجیدی

یقیں وعدۂ فردا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
بہانے زیست کے ڈھونڈا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

زباں کا ہم نوا پیدا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے
دہانِ زخم کو گویا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

فضا سنسان ہی رہتی تو یہ بھی سانحہ ہوتا
شکستہ ساز کو چھیڑا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

نظر جب تک نہ فرشِ راہ ہوتی آنکھیں نہیں کھلتیں
کسی کا راستہ دیکھا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

جنوں کی منزلیں سب کی کہاں متعین کون اپناتا
فریبِ آگہی کھایا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

ملے تھے چند قطرے پیاس اتنی تھی کہ کیا کہیے
انہی قطروں کو سمجھا دریا نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

اثر دیر و حرم دو مختلف منظر ہیں پردے پر
نگاہوں کو پسِ پردہ نہ کرتے ہم تو کیا کرتے

احمد وقار واثقی

وقت کے ہاتھوں سے کیا پوچھیے کیا ٹوٹ گیا
ایک وہ جام کہ تھا، جامِ تمنا ٹوٹ گیا

وہ مہک اٹھی۔ ہوا حالِ گلستاں جیسے
کل مرے ہاتھ سے جو بندِ قبا ٹوٹ گیا

کل اسی وقت یہیں چمکا تھا کوئی تارہ
آؤ دیکھیں ذرا، ہے آج بھی یا ٹوٹ گیا

وہ نہ آئے تو تری چال میں بھی فرق آیا
کیا ترا پاؤں بھی اے بادِ صبا ٹوٹ گیا

تا قیامت بھی کہیں رہتے ہیں لمحاتِ نشاط
کیوں پشیماں ہوئے تم آئینہ تھا، ٹوٹ گیا

انوار ظہوری

جانتے ہیں فکر کا معیار وہ
باخدا کرتے ہیں مجھ سے پیار وہ

اور کیا ہوگی بھلا دادِ سخن
گنگناتے ہیں مرے اشعار وہ

مجھ سے بڑھ کر میرے فن سے پیار ہے
مجھ سے کچھ بڑھ کر ہیں دنیا دار وہ

کوئی خط بھیجا نہ اک تصویر دی
واقعی نکلے بڑے ہشیار وہ

جب نہیں میری تمنا پر نظر
ذکر کرتے ہیں میرا بیکار وہ

ان سے کیا پوری ہو کوئی آرزو
شہر کی سب سے بڑی سرکار وہ

خواب کی حالت میں کب دیکھا انہیں
مجھ سے پہلے ہو گئے بیدار وہ

میرے دل سے کیا مسیحا کو غرض
اک صحت مند کا بیمار وہ

بے تکلف اب تو سب کے سامنے
نام لیتے ہیں ترا انوار وہ

اس کا مجھے خیال نہ تھا اے مہِ تمام
ہوگا مسافرانہ ترے شہر میں قیام

جس وقت راستے میں تمہارا خیال تھا
میرے بھی ساتھ ساتھ چلا وقت چند گام

وہ حسنِ اتفاق سے خود مل گئے مجھے
منزل پہ آچکا ہوں سفر ہو چکا تمام

تقدیر دیکھئے کوئی بھیجا نہ جا سکا
خط بے شمار میں نے لکھے ہیں کسی کے نام

نازک ہے ان کی لغزشِ پا کا مقابلہ
دل بعد میں سنبھال وہ گرنے لگے ہیں تھام

کہنے لگے وہ سن کے ظہوری مری غزل
اک داستانِ شوق کہی وہ بھی ناتمام

حسب

جوگندر پال کی یہ تازہ کہانی
STREAM OF
CONCIOUSNESS
ماحول کی عکاسی فکر کی گہرائی
اور فن کی چابکدستی کی ایک
کامیاب مثال ہے۔ (اریب)

جوگندر پال

ابرِ دکن

امی کے ہاتھوں سے گندھے ہوئے آٹے کا پاؤ سیر کا پیڑا اچھل کر پرات میں آگرا۔
خدو وہاں باورچی خانے کی چوکھٹ پر آکر ہنس کیا پڑی، امی اپنی بھونچکی آنکھوں میں اس کا یہ بت کا بت کھڑا پاکر اندھی سی ہو گئی۔

"ہائے، یہ کتنی بڑی نکل آئی ہے!"

وہ اپنی کنواری بیٹی کو گھڑی بھر کے لیے بھی نگاہ سے اوجھل نہ ہونے دیتی پر ہر گھڑی اسے یہی معلوم ہوتا کہ اپنی بیٹی کو کئی برس بعد دیکھا ہے اور وہ اتنی بڑی نکل آئی ہے۔ خدو کے بھرے بھرے ہاتھ پیر دیکھ دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو دوڑ آتا۔ "یا اللہ، بس چھت کے بغیر ہی ہو لیگی، پر کسی طور یہ کو تھا سے گھر سے اٹھا۔"

"لاکھ بار بول چکی ہوں۔" امی کو اپنی بیٹی پر بے سبب غصہ آنے لگا۔ "اپنا سر ڈھانپ کے رکھا کرو اور سینے پر یہ جو ہالہ کھڑا کر رکھا ہے اسے بھی چھپا کر رکھو۔"

اور خدو بے چاری کی آنکھوں میں چپکے چپکے ابرِ دکن گہرا ہونے لگا، جو برستا ہے نہ بکھتا ہے، بس تیز و تند ہواؤں سے از خود کہیں ادھر ادھر غائب ہو جاتا ہے۔

امی کو اپنی خدو کی جوانی پر ترس آنے لگا۔

"ہمارے محلے میں اور بھی بیسیوں چھوکریاں ہیں، ایک ایک گھر میں ایک ایک نہیں چار چار، پر وہ چاروں ٹھیک سے ہیں، سیدھا سیدھا ناک نقشہ، پھیکا رنگ، سوکھا بدن۔ پر ہماری یہ خدو؟ خدا بچائے اتفاق سے کوئی مواد دیکھ لے تو نظروں ہی نظروں میں بھگا لے جاتا ہے۔"

خدو نے اپنی موٹی سفید چادر سے سر ڈھانپ کر سینہ چھپانا چاہا تو سر ننگا، اور سر ڈھانپنا چاہا تو سینہ گستاخ۔

امی کو اپنی بیٹی کی بے چارگی پر رحم آنے لگا اور وہ اٹھ کر اسے منہ سر ڈھانپنے کا انداز سمجھانے لگی۔

"یوں — اور یوں — اور یوں۔" اور پھر وہ اپنی بیٹی کے بھولے سے صحت مند چہرے کو دیکھ کر لمحاتی طور پر اپنا سارا دکھ بھول گئی اور جی ہی جی میں اس کی بلائیں لے کر توے کی جانب جھکی اور اس کی پشت سے اپنی انگلی پر سیاہی

لگاکر غدو کی پیشانی پر چپک دی۔

خوبصورت غدو کم بخت اور خوبصورت نظر آنے لگی، اور جیسے امی کی پاسبانی اپنی چور خود آپ بن گئی۔ "جاؤ بیٹی دروں خانے میں بیٹھ کر گیہوں چھانٹو۔"

غدو چھینا کے سے مڑی اور فرش کو پاٹ پاٹ کر دروں خانے کی طرف مڑی۔

"اری آہستہ!" اس کے تیز تیز گام گویا امی کے دل میں کھب رہے ہوں۔ "اس طرح قدم اٹھاؤ کہ پتہ ہی نہ چلے۔ ہاں، اور سست — اور —"

اور دروں خانے میں پہنچ کر غدو نے گویا اپنی ہستی کے دروں خانے میں قدم دھرا اور وہ اپنے آپ کو اس قدر قریب سے یوں گھور گھور کر دیکھتی پا کر شرما گئی۔

"یہ لوگ مجھے جی بھر کے کسی طرف دیکھنے کا موقعہ ہی نہیں دیتے۔ اب بولو ادھر مت دیکھو اب بولو ادھر مت دیکھو، بے چاری سمجھ کر چپ تنگ کرتے رہتے ہیں۔"

"چھ — چھنٹ — چھچھا —!" وہ گیہوں پھٹکنے لگی۔

"پھر میں اپنے آپ کو تو نظر بھر بھر کے دیکھ سکتا ہوں۔" اس نے ہالہ سے چادر اٹھا کر پرے دے ماری۔

"چھ — چھاچھا — چھنٹ —!" اس نے اپنی بالوں کی گھنی چوٹی کو پیار سے دیکھ دیکھ کر اسے گلے کا ہار بنا لیا، اور اپنے آپ پر ٹکٹکی باندھ لی۔

"چھ — چھا —!" ("غدو!" اُسے غسل خانے میں ذرا دیر ہو جاتی تو امی کی چڑچڑی آواز سنائی دیتی۔ "دو گھنٹے سے ابھی تمہارا غسل نہیں ہوا کیا؟ — باہر نکلو غدو! — اری او غدو کی بچی —!" "ہونھ!")

"چھ — چھنٹ — چھ — چھ — چھ — چھ چھ!"

"میں کتنا اچھا ہوں! بڑا پیارا ہوں! —" ("تم حیدرآبادی لڑکیاں اپنے متعلق لڑکوں کی طرح بات کیوں کرتی ہو؟" دو برس پہلے جب وہ دلی گئے تھے تو وہاں اس کی خالہ زاد بہن نے پوچھا تھا۔

"کیا ہے کی؟" غدو نے حیدرآبادی لہجے میں جواب دیا تھا۔ "کیا پتہ، کیوں؟"

"میں بتاؤں؟ وہاں لڑکوں کی ذات عنقا ہوگی۔"

غدو ہنس دی تھی۔)

غدو ہنس رہی تھی۔

"چھ — چھنٹ چھٹ چھٹ — چھ — چھ — چھ چھ —!!"

"ارے!" باورچی خانے میں امی کی چھٹی حس اُسے بے چین کرنے لگی۔ "یہ چھوکری اندر بیٹھی اپنا بدن چھینٹ رہی ہے یا گیہوں؟" وہ باورچی خانے کا کام چھوڑ کر دروں خانے میں چلی آئی۔

"چھ چھ چھٹانک چھٹ — !"
خدو اپنی آنکھیں بند کیے چوٹی کو گلے کا ہار بنائے 'ہمالہ' کو زیر و بم کرتی ہوئی سوپ کو بے تحاشہ ہلا ہلا کر گیہوں پھٹک رہی تھی۔

"اے اے! خدو!"
اور خدو نے آنکھیں کھولیں، گھبرا کر سوپ پرے پھینک دیا اور عجلت سے سر اور سینے کو چادر میں لپیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاؤ امی!"
"میں نے تمھیں اپنا آپ چھانٹنے کو تو نہیں کہا تھا نامراد۔ گیہوں ایسے چھانٹا جاتا ہے؟"
"ہاؤ امی!" ابر دکن میں اب اپنے آبی سرمائے کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہ رہی تھی۔
"ہاؤ، امی کی بچی، دیکھو اپنا کیا حال بنا رکھا ہے، کوئی ادھر آ نکلتا تو —"
"درون خانے میں باہر کے لوگ تھوڑا ہی آتے ہیں امی، یہاں تو —" (یہاں درون خانے میں تو صرف میں ہی میں ہوں امی، میں ہی میں — نہیں، میں اور — اور — اور کون؟") وہ جھلا گئی۔
"آخر آپ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے کیوں پڑا رہنا ہے امی؟"
"ہاتھ دھو کر؟" امی نرم پڑ گئیں۔ "تاکہ تمھارے منہ پر ہولے سے پیار کی چپت ماروں تو تمھارا گورا چٹا گال میلا نہ ہو جائے — چلو یہ گیہوں چھوڑ کر باورچی خانے میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔ کلموئی ماما کو بھی آج ہی نہیں آنا تھا، ادھر وہ لاٹ صاحب کا بچہ ریاض ہے کہ اپنے دوستاں کو آج رات کھانے پر لا رہا ہے۔"
"کتے دوستاں کو، امی؟"
"ہوں گے کوئی چھ مشٹنڈے۔"
"پورے چھ؟! خدو نے اپنی مسرت کو تحیر میں لپیٹ کر پوچھا۔
"ہاں۔" مگر وہ اپنی بیٹی کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگیں۔ "چھ میں تو کیا؟"
(ہاں، پوری درجن بھی ہوں تو کیا؟ میرے لیے تو — میں تو —)
خدو سر جھکا کر امی کے ساتھ باورچی خانے میں چلی آئی۔
"وہ ہانڈی دیکھو، گوشت بھن گیا ہے کیا؟" امی خود روٹیاں پکانے کے لیے بیٹھ گئیں۔
بھن بھن کر گوشت کا رنگ گہرا ہو رہا تھا۔ خدو نے حسب عادت نظر بچا کر ہانڈی میں پسی ہوئی لال مرچ کی سالم کڑچھی الٹ دی، اور ابلتے ہوئے پانی میں مرچ کے لال لال باریک ریزوں کو گوشت کے ٹکڑوں میں سمٹتا دیکھ دیکھ کر اسے معلوم ہوا جیسے اس کے اپنے گوشت میں کوئی دانت کٹکٹانے لگا ہے۔ "اوئی ابا!"

امی اس کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

"مرچ تھوڑی ڈالنا؟" امی کو اچانک خیال آیا۔ "تب کے ہاتھوں کا گوشت چکھ کر مرزا بیچارہ آج تک سی سی کرتا ہے۔"

"جس گوشت میں سی سی نہ ہو وہ گوشت ہی کیا امی؟" خدو اپنی دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کا گہرا تیکھا رنگ دیکھنے لگی (ہاں، وہ گوشت ہی کیا جو پھیکا پھیکا ہو؟ کوئی کھائے تو ——) اس نے اپنی انگلی منہ میں ڈالی۔

"امی، رضو بھیا کب آئیں گے؟"

"آجائے گا کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں —— جلدی جلدی کام نمٹاؤ بابا، اب بے کار کاہے کو وقت خراب کر رہی ہو؟"

خدو پھر کام میں جٹ گئی۔

(بھیا ——!" میں دیوان خانے کا دروازہ ہولے سے کھٹکھٹا کر کہوں گا۔ "چپاتی لایا ہوں۔"

"ہاں، ہاں، لے آؤ خدو۔ آجاؤ، یہاں سب اپنے ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔"

اپنے؟ ایک رضو بھیا کا وہ لمبا سا دوست ہوگا رفیع جو ہر دم ترکی ٹوپی پہنے رکھتا ہے۔ شکل تو دیکھی نہیں پر آواز سے بڑی مردانگی ٹپکتی ہے۔ اس دن ہمارے دیوان خانے میں قہقہے لگا رہا تھا یوں لگتا تھا کہ کوئی پٹھان بچہ اپنی دونالی بندوق چلا رہا ہے اور ایک وہ سعیدہ کا بھائی ہوگا۔ سعیدہ بولتا تھا میرا بھائی بولتا ہے، سعیدہ آج تمہارے خدو کو دیکھا، برقعہ اوڑھے یوں چل رہا تھا جیسے برقعے کے اندر ہی اندر کہیں غائب ہو جانا چاہتا ہو۔ بھئی مزہ آگیا، سعیدہ آج تمہارا خدو دیکھ کے، —— تمھیں میرا بھائی پسند ہے نا خدو؟ ——)

"اری نامراد، کاہے کو ہانڈی میں کڑچھی گھمائے جا رہی ہو؟ او خدو —— خدو!"

"ہاؤ، امی گوشت پک کر تیار ہوگیا ہے۔"

"تو کاہے کو آگ سے نہیں اتارتی؟ عجیب لڑکی ہے! پلاؤ کا نچ کی پلیٹیں نکال کر صاف کرو، ذرا دھیان سے۔"

"ہاؤ، امی۔"

(یہ سعیدہ کا بھائی ہمارے گھر اتنا کیوں آتا جاتا ہے؟ پرسوں کتنی ہی دیر دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔ کھٹ کھٹ سٹ! میں گھر میں اکیلا تھا۔ کھٹ —— ٹ! گھر میں کوئی اور نہ تھا۔ کھ —— ٹ —— ٹ! میں کھٹ کھٹ سنتا رہ گیا اور وہ چلا گیا، اور وہ چلا گیا تو میرے جی میں آیا کہ جا کے کواڑ کھولوں اور وہ اندر آجائے، اور وہ اندر آجائے —— اور —— اور ——)

"چھن —— ن —— ن!"

"آخر توڑ ہی دیا نا پلیٹ کو —— اری ویدے پھوٹی، تم سے کام کروا کے ہمیشہ پریشانی ہوتی ہے ——

اب میری طرف ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہی ہو؟ اٹھاؤ یہ کانچ کے ٹکڑے۔"

"ہائے، امی۔"

خدو کانچ اٹھانے لگی۔

"اوئی ابا!" ابھی اس نے شروع ہی کیا تھا کہ کانچ کا ایک ٹکڑا اس کی انگلی میں چبھ گیا۔

"ہائے اللہ" امی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے دوڑ کر اس کے پاس آئی۔ خون کا فوارہ چھوٹ پڑا ہے۔" وہ اپنے دوپٹے سے پٹی پھاڑ کر ہلدی ڈھونڈنے لگی۔ "یہ ہے!" ہلدی مل گئی۔ "میں بولوں کہ تم ہر وقت اندھی اندھی کیوں بنی رہتی ہو۔ جُپ نقصان کر دیا، جُپ اپنا خون بہا دیا۔" زخم پر ہلدی کی چٹکی ڈال کر وہ خدو کی انگلی پر پٹی لپیٹنے لگی

"سعیدہ کا بھائی ضرور آئے گا۔" پٹی بندھ گئی تو خدو نے اپنے آپ سے کہا۔

"—بھیا— ا— کھٹ ٹ! —چاول لایا ہوں بھیا! —

"ارے بھئی کہہ چکا نا، آ جاؤ۔ یہاں سب اپنے ہی لوگ بیٹھے ہیں۔"

"جاؤں؟ —بھیا بول رہے ہیں تو جانے میں کیا ہرج ہے؟ —جی —جیں —یں —ی! لو بھیا —چا —چاو —ل!"

"اری! عجیب لڑکی ہو! میرے منہ کے نیچے یہ سارے چاول لا رکھے۔ اُدھر میز پر رکھو بابا۔"

"ہاں —ں، ہاں بھیا! —دھپ —پ! او —و! سالم طشتری نیچے آ گری —امی!"

"اری! باہر کیوں جاتا؟ —امی! ی —!"

"ہہ ہاہہ ہہ ہا— ! —یہ رفیع ہنس رہا ہے، جیسے توپ کا گولا چھٹا ہو —اور یہ سعیدہ کے بھائی کے ہنہنوں کی آواز ہے —ہہ ہا ہہ —!—"

ابر دکن تاریک تر ہو گیا۔

"اری، تمھاری آنکھوں میں اتنا پانی کاہے کو جمع ہو رہا ہے؟ انگلی میں درد ہو رہا ہے کیا؟"

"نہیں امی۔" خدو رسوئی میں کھڑی چاول کی ہانڈی سے ڈھکنا اٹھا کر دیکھ رہی تھی کہ دانہ پک گیا ہے یا ابھی کچا ہے۔

ابھی سے ہانڈی کا منہ کیوں کھول دیا ہے؟ کچے چاولاں کھلاؤ گی کیا؟"

"اتی دیر سے تو آگ پر پڑے ہیں۔"

"تمھاری طرح، ہیں؟" امی نے پوچھا اور پھر نرم ہو کر سمجھانے لگی۔ "کئی بار بولا ہے اتی جلد بازی سے کام نہ لیا کرو۔"

"ہاؤ، امی" خدو نے ہانڈی کا منہ ڈھکنے سے بند کر دیا۔

"کوئی بھی کام کرو بیٹی، ہمیشہ سہج سے۔ سہج پکے سو میٹھا ہو۔"

("مجھے تو پک پک کر بائیس برس ہو لیے ہیں امی۔ اور اب میں اتنا میٹھا ہو گیا ہوں کہ —کہ خود ہی اپنے

آپ کو چاٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔")

خدو شرما کر ذرا سی ہنس دی۔

"آج کل کی چھوکریاں کی باتاں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں۔" امی حیرت اور خفگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ابھی ابھی آنکھاں پانی کے کٹورے بنی ہوئی تھیں اور اب گلدان۔ میں بھی تو جانوں کہ اب اتنی خوش کاہے کو ہو رہی ہے۔"

"امی، مجھے وہ [redacted] لادیجئے۔"

"کونسی چوڑیاں؟"

"وہ جو اس دن خان صاحب کی چھوٹی بیگم کی کلائی پر دیکھی تھیں۔ ویسی ہی ہاتھی دانت کی۔"

"دیکھو خدو، مجھے تمہارا ان شادی شدہ عورتوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا خطعی پسند نہیں۔"

"چوڑیاں لادے گا نا امی؟"

"نہیں۔" امی خفا ہونے لگی۔ "پہلے میری بات سنو۔"

"آپ تو کہتا تھا کہ۔"

"اچھا بابا لادوں گا ـــــ لادونگی ـــــ خدو، تم یہ کیا الٹی سیدھی زبان استعمال کرتی ہو؟" امی اپنی خفگی بھول کر ہنسنے لگی۔

"ہم سب لڑکیاں ایسے ہی بولتے ہیں۔"

"بولتی ہیں کہو ـــ تمہاری باتاں سن کے مجھے لگتا ہے کہ تم لڑکا بھی ہو اور لڑکی بھی ـــــ اگلی تو اب ٹھیک ہے نا؟" امی کا موڈ بہتر ہو رہا تھا۔ "وہ موا رنڈوا مولوی جو تمہیں پڑھانے آیا کرتا تھا، شاید تم لڑکیوں کی بولی سن سن کر ہی بیچارے کے لہجے میں بیوگی آگئی تھی۔ 'اچھا بیبی میں چلتی!'" امی مولوی کی نقل اتار کر ہنسنے لگی۔ "میں نے تمہارے ابا سے بولا تھا کہ شریعت کے مطابق مرد کے چار نکاح جائز ہیں، ایک اس مونچھدار مولون کو بھی گھر میں لا بٹھاؤ۔" امی زور زور سے ہنسنے لگی۔

اور خدو بھی۔

اور خدو کو اس قدر زور سے ہنستی دیکھ کر امی سنجیدہ ہوگئی۔

"اچھا، اب جلدی جلدی ختم کرو تاکہ رضو کے آنے سے پہلے پہلے سب پکوان دیوان خانے میں رکھ آئیں۔"

("تو کیا میں اس وخت وہاں نہیں جاؤں گا؟"

"کھٹ ـــ ٹ!"

"آجاؤ خدو، سب اپنے ہی بیٹھے ہیں۔ ارے بھئی آجاؤ نا۔"

"جی ـــ جیں ـــ یں! ـــ")

"اوئی ابا!"

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں امی۔ یوں لگا جیسے چاول کی ہانڈی نیچے آگری ہے۔"

"عجیب لڑکی ہو!"

"امی۔"

"ہاؤں"

"پکوان تو کسی وقت بھی دیوان خانے بھیجے جا سکتے ہیں۔"

"تو کیا جب وہ مشٹنڈے آجائیں گے، اس وقت لے کے جاؤ گی، سب کے سامنے؟" امی پھر خفا ہونے لگی۔ "چلو جلدی کرو۔ ابھی سے سبھی چیزیں رکھے دیتے ہیں۔"

غدو کا چہرہ اتر گیا۔

"ارے سنو، باہر کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔"

("وہ آگئے!") غدو کے چہرے پر رونق آگئی۔

"تمھارے ابا معلوم ہوتے ہیں۔" امی کو ابا کے ہر انداز کی ہر حرکت اور آواز کی بخوبی پہچان تھی۔

("پر میں تو سعیدہ کے بھائی کے پٹ سے بھی ناواقف ہوں")

"جاؤ غدو دروازہ کھولو ـــ نہیں ٹھیرو، شاید ان کے ساتھ کوئی اور ہو۔ میں ہی جا کے کھولتی ہوں۔" امی دروازے کی طرف جانے کے لیے اٹھی۔

"کھٹ کھٹ ـــ ٹ!"

("میں بیٹھا کھٹ کھٹ سنتا رہا اور وہ چلا گیا، اور وہ چلا گیا تو میرے جی میں آیا کہ بند کواڑ کھول دوں تاکہ ـــ تاکہ ـــ اور ۔۔)

"بھئی وہ لوگ نہیں آئیں گے!" ابا کی آواز سنائی دی۔

غدو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

"رضو نے کہلوا بھیجا ہے کہ انھوں نے مل کر کسی ہوٹل وِل میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

("تمھیں میرا بھائی پسند ہے نا غدو؟"

"نکو! نکو! مجھے کوئی بھی پسند نہیں! سب سے نفرت ہے! میں یہاں چولہے میں جل رہی ہوں اور وہ ہوٹل میں گلچھرے اڑانے چلے گئے ہیں۔ میرا کیا ہے؟ میرا کیا بگڑتا ہے؟ جہاں چاہیں جھک ماریں۔"

"غدو، تم تو خفا ہو رہا ہے گویا تمھارا میاں وقت پر گھر نہ لوٹا ہو۔"

"میرا میاں؟ میرا جوتا! مجھے کیا پرواہ ہے؟ میں اپنا میاں خود آپ ہوں، آپ ہی اپنا دلہن ہوں میں ـــ مجھے کیا؟ ـــ")

"اری! ـــ اری!" امی باورچی خانے میں آکر کچھ سونگھ کر چلّائی ـــ" چاولاں جل رہے ہیں کلموئی" وہ ہانڈی کی جانب دوڑی۔

فدو پہلے تو چپ چاپ کھڑی جلتی رہی پھر اُبل اُبل کر رونے لگی۔

"اری! اب کیا ہوا ہے؟"

"انگلی میں درد ہو رہا ہے امی"

"کیا ہوا ہے؟" ابا بھی وہیں آ گئے تھے۔

"انگلی میں کانچ چبھ گیا ہے" امی نے انھیں بتایا۔

لیکن فدو کی ہچکی کی آواز سن کر یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کانچ کی چبھن دل تک اُتر گئی ہے۔

"لاؤ تو، میں بھی دیکھوں ذرا" ابا اس کی انگلی سے پٹی کھولنے لگے" زخم تو بڑا نہیں بیٹی" پٹی کھول کر انہیں اطمینان ہو گیا" اتنا چلّا کیوں رہی ہو؟" انھوں نے پھر پٹی لپیٹ دی۔

"درد ہو رہا ہے ابی" اس نے روک کر کہا۔

"تو لو یہ لڈو کھاؤ" ابا کی عادت تھی کہ وہ کام سے لوٹتے ہوئے ہر شام کو مٹھائی لاتے۔

فدو لڈو کھانے لگی۔

"نامرادانی بڑی ہو گئی ہے پر ابھی نری بچی ہے" امی کو دکوٹھا کھلونا سا بن کر نظر آنے لگا۔

"میں جب تیری عمر کی تھی تو ـــ" ان کے الفاظ نے مسکرا کر امی کے منہ سے باہر آنا چاہا۔ لیکن امی ابا کی جانب دیکھ کر اپنی کنپٹی کے سفید بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"درد ہو رہا ہے تو تم جاؤ فدو، اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ"

("یہ عمر ہونے کو آئی ہے پر اب بھی امی یہی چاہتا ہے کہ ابا پاس ہوں تو آس پاس کوئی اور نہ ہو ـــ")

"میں تمھارا کھانا وہیں لے آؤں گی"

("ہونھ!") "نہیں مجھے بھوک نہیں"

"لو اور لڈو لو اور جاؤ، جا کے لیٹ جاؤ"

("تاکہ آپ ـــ آپ دونوں ـــ")

وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ "میں جاتا"

"ہاؤ، جاتا —— ہہ ہہ ہا ہہ —— وہ مولوی تھا نا ——" امی ہنس ہنس کر ہا ہا سے گویا ہوئی اور خدو فرش پاٹ پاٹ کر تیز تیز چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف ہولی۔

خدو اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو نیم خوابیدہ شام اپنے آپ کو اندھیرے کے سپرد کر رہی تھی۔

("تم حیدرآبادی لڑکیاں اپنے متعلق لڑکوں کی طرح بات کیوں کرتی ہو؟")

"اس لیے —— اس لیے کہ ——" خدو نے اپنے خالی خالی بستر کی طرف نگاہ اٹھائی "اس لیے کہ ! —— کر" اس نے بڑے پیار سے اپنے آپ کو "اپنے ساتھ" بستر پر لٹالیا۔ ——



ڈی۔ایچ۔لارنس

شور مینائی

میں وہ نہیں

برسوں کے بعد لوئی کو لمینارس مجھے وینس میں ملا۔ میکسیکو سے جلا وطن کر دیئے جانے کے بعد وہ اپنی بچی کچی پونجی کے سہارے اور تھوڑا بہت مصوری سے کما کر گزارہ کر رہا تھا۔ لیکن مصوری اس کے لیے آمدنی سے زیادہ ذہنی آسودگی کا ذریعہ تھی۔ افلاس اور تنہائی کی زندگی گزارتے ہوئے وہ ایک بھٹکی ہوئی روح کی طرح پیرس اور اٹلی میں گھومتا رہتا کیوں کہ ان جگہوں پر اس کے اخراجات نسبتاً کم رہتے تھے۔ وہ مختصر قد کا موٹا سا شخص تھا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ زرد رہتا تھا اور اس کی سیاہ آنکھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی سے نظریں چرا رہی ہوں اور اس کی تمام شخصیت ایسی تھی جیسے وہ کسی کو چکمہ دے کر بچ نکلنے کی کوشش میں ہو۔

"تمھیں معلوم ہے آج کل وینس میں کون آیا ہوا ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا، اور پھر خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا "کیٹا! وہ ہوٹل دو مانون میں ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے آج اسے لیڈو کے سوئمنگ پول میں دیکھا" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی کسی ہولناک مصیبت کو ایک کھسیانے مذاق سے ٹالنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تمھارا مطلب کیٹا بل فاسٹر سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ مگر اب اس نے وہ پیشہ ترک کر دیا ہے۔ تمھیں یاد نہیں ایک امریکی عورت اپنی وصیت میں اس کے لیے کافی دولت چھوڑ گئی ہے۔ تم اس سے کبھی ملے ہو؟" لوئی نے پوچھا۔

"ہاں فقط ایک ہی بار" میں نے جواب دیا۔

"تم شاید اس سے میکسیکو کے انقلاب سے پہلے ملے ہوگے۔ بعد میں اس نے کسی جنرل سے ایک زمینداری سستے داموں خرید لی تھی" لوئی نے کہا۔

"اب کیسا ہے وہ دیکھنے میں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت موٹا ہو گیا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی موٹا اور چھوٹے قد کا تھا۔ مگر اب تو وہ بالکل گول مٹول ہو گیا ہے

کیا تم اسے اچھی طرح جانتے تھے ؟" لوئی نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

"میں اس سے کافی بے تکلف تھا اُن دِنوں جب میں بہت امیر تھا اور میرا خیال تھا کہ میں ہمیشہ امیر رہوں گا" اتنا کہہ کر لوئی خاموش ہو گیا۔

مجھے ڈر تھا کہ شاید پھر وہ اس موضوع پر بات نہیں کرے گا۔ لیکن کیٹا جس کی شہرت چند برس پہلے ہسپانیہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک میں گونج اٹھی تھی اس کے دل و دماغ پر ایک طلسم کی طرح چھایا ہوا تھا۔ میں نے پھر اس سے پوچھا "لیکن کیٹا شاید سانڈ سے لڑنے والا ایک جانور ہی تھا۔ محض ایک درندہ۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایک دلچسپ انسان بھی تھا"

"وہ فقط ایک درندہ ہی نہیں تھا" لوئی نے کہا "تم نے کبھی اسے بل رنگ میں دیکھا ہے؟ ہسپانیہ میں جہاں سے یہ کھیل شروع ہوا تھا وہ ہمیشہ خود نمائی کے شوق میں لگے بندھے داؤں پیچ ہی دکھاتا تھا۔ لیکن میکسیکو میں وہ اپنے اصلی روپ میں نظر آتا تھا۔ سانڈ اور موت سے وہ لڑتا نہیں تھا۔ کھیلتا تھا۔ اور اس کی آنکھیں اگرچہ چھوٹی چھوٹی تھیں لیکن جب وہ کسی کو غور سے دیکھتا تو دوسرے شخص کو ایسا محسوس ہوتا جیسے کیٹا کی نظر اس کے دل و دماغ کی تہوں تک سرایت کر رہی ہو۔ کیا تم اس احساس سے واقف ہو جب کسی کی نظر تمہاری شخصیت کی تمام مدافعت کو ختم کر دے اور تمہیں ایسا لگے جیسے تم اس شخص کے ہاتھ میں موم کی طرح ہو؟"

"ہاں۔ کبھی کبھی میں نے ایسا محسوس کیا ہے" میں نے کہا۔

لوئی بظاہر میری طرف دیکھ رہا تھا مگر حقیقت میں اس کی نظر ماضی کے کچھ واقعات پر جمی ہوئی تھی اور اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بل رنگ میں وہ ایک نرالی شخصیت کا مظاہرہ کرتا تھا کئی بار وہ بڑھتے ہوئے سانڈ کی طرف پیٹھ کر لیتا اور جھک کر اپنے جوتے کے تسمے باندھتا رہتا۔ اور جب نتھنے پھلا کر دوڑتا ہوا سانڈ اس کے قریب پہنچتا تو ایک ہلکے سے قدم سے کیٹا اس کے راستے سے ہٹ جاتا اور سانڈ آگے بڑھ جاتا پھر وہ مسکرا کر خراماں خراماں سانڈ کے پیچھے چل پڑتا۔ وہ اسی طرح سینکڑوں بار موت کے منہ سے نکل آیا تھا"

انسان کا چہرہ مختلف قسم کے جذبات و احساسات کا عکاس رہتا ہے لیکن بعض اوقات ایک ہی جذبہ دل و دماغ پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ آدمی کی شخصیت تمام تر اسی جذبہ پر مرکوز نظر آتی ہے۔ لوئی کے ذہن پر بھی کیٹا کا تصور کچھ اسی طرح چھایا ہوا تھا۔ اور اس نے تھوڑے وقفے کے بعد پھر کیٹا کا ذکر شروع کیا۔

"عجیب بات ہے کہ میں نے ایسی آنکھیں کہیں نہیں دیکھی تھیں بلکہ اس کی نظر دوسرے آدمی کی شخصیت کی عمیق گہرائیوں میں داخل ہو جاتی تھی۔ وہ گہرائیاں جنھیں دیکھنے سے آدمی خود بھی کتراتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہماری بہادری اور مدافعت کا جائزہ لے رہا ہے اور ہماری تمام جرأت ایک بے نام

نہ اور دہشت سے تبدیل ہوتی جا رہی ہے . . . . وہ طبعاً خاموش قسم کا انسان تھا
لن اگر وہ کسی ایسی جگہ ہو جہاں اور بہت سے لوگ موجود ہوں تو بھی تم اس سے غافل نہیں رہ سکتے۔ اس کی مقناطیسیت
ں کا ذاتی طلسم کچھ ایسا تھا کہ وہ خاموش بھی بیٹھا ہو تو دوسرے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بعض ایسے
گ بھی تھے جنھیں وہ یوں متاثر نہ کر سکتا تھا لیکن وہ ایسے لوگوں سے پہلی بار کے بعد ملنا ترک کر دیتا تھا۔ بل رنگ میں
وہ تمام دیکھنے والوں پر چھا جاتا تھا۔ وہ موت سے یوں کھیلتا جیسے کسی چھوٹے بچے سے دل بہلا رہا ہو۔ عین موقع پر
ں میں بجلی کی سی سرعت آ جاتی مگر باقی وقت اس کے چہرے پر انتہائی اطمینان رہتا اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیلتی
رہتی۔ حاضرین میں عورتیں بھی کافی تعداد میں رہتی تھیں اور ان عورتوں کو وہ جس انداز سے متاثر کرتا تھا اس کا
یں تجزیہ نہیں کر سکتا۔ اس کی کشش کا راز کسی فلمی ہیرو کی طرح خوبصورتی، وجاہت یا انداز و اطوار کی نفاست
یں نہیں تھا بلکہ عورتوں کی نظر میں وہ ایک بے پناہ طوفانی قوت کی مانند تھا جس کے سامنے وہ اپنے آپ کو بے بس مجبور
اور عام اخلاقی قدریں اختیار کرنے کے ناقابل پاتی تھیں۔

”تو پھر اس نے بہت سی عورتوں سے تعلق رکھا ہوگا۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ نہیں“ لوئی نے کہا۔ ”شروع شروع میں تو وہ ایسا کرتا رہا۔ لیکن بعد میں اس نے میکسیکو کی دو قبائلی عورتوں کو اپنے گھر میں رکھ لیا تھا اور باقی سب عورتوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ اگر کوئی عورت اس سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتی تو وہ اسے غلیظ گالیاں دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔“

”تو جب اس نے بل فائٹنگ چھوڑی تو کافی امیر ہوگا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔ اور ایک امریکی عورت اس کے لیے اپنی وصیت میں پانچ لاکھ ڈالر بھی چھوڑ گئی تھی۔“

”یہ کب کی بات ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”یہ بہت عرصے کی بات ہے۔“ لوئی نے جواب دیا۔ ”شاید ۱۹۱۳ یا ۱۹۱۴ء میں جب میری اپنی مالی حالت کچھ ایسی اطمینان بخش نہیں تھی۔ ان دنوں ایک امریکی عورت میکسیکو آئی تھی۔ اس کا نام ایتھل کین تھا۔ پہلی بار میری اس سے ملاقات پیرس میں ہوئی تھی جہاں وہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی اس کا شوہر ایک چھوٹا سا مخنی قسم کا آدمی تھا۔ اس شخص کو مصوری سے کچھ شغف تھا مگر اس کا زیادہ تر وقت اپنی بیوی کا پیچھا کرنے میں صرف ہوتا تھا کیوں کہ ایتھل کو ہر قسم کے مردوں کو اپنے مداحوں میں شامل کرنے کا شوق تھا لیکن اپنے شوہر سے اُسے بالکل کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بالآخر ایتھل نے اس سے طلاق لے لی تھی۔ ایتھل کافی حسین تھی اور اس کے چہرے کا مصنوعی بھولپن بڑا جاذب نظر تھا۔ لیکن کبھی کبھی اس کی آنکھوں سے ایک خونخوار وحشت جھلکتی تھی۔ محض ایک لحظہ بھر کے لیے، اور پھر چونک کر وہ اپنے چہرے کو سادگی اور رنائیت کو تصویر بنا لیتی تھی۔ اسے قریب سے جاننے پر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے اندر ڈائنامو کی طرح قوت کا کوئی چشمہ ہے لیکن وہ اپنی قوت کا خود استعمال کرنے سے معذور تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مردوں کو کٹھ پتلی بنا کر اپنے آہنی ارادوں کی تکمیل کے لیے استعمال کرے۔ ایسے ارادے جن کے متعلق اس نے

خود کبھی وضاحت سے نہیں سوچا تھا۔ وہ انگلستان کی ملکہ الزبتھ یا روس کی ملکہ کیتھرین کی طرح اپنے گردوپیش کے حالات واقعات کو اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کے خواب دیکھتی تھی اور اس کے لیے اسے ضرورت تھی ایسے مردوں کی جو قوت ارادی ایتھل سے مستعار لیں اور بقیہ صلاحیتیں اپنی قائم رکھیں اس زمانے میں جیسا کہ تم جانتے ہو۔ میکسیکو میں سیاسی ہلچل مچی ہوئی تھی اور ایتھل اسی لیے وہاں آئی تھی کہ شاید وہاں کی طوائف الملوکی میں وہ اپنے خواب پورے کر سکے۔ میکسیکو پہنچتے ہی اس نے سپرمو سے ربط پیدا کر لیا۔ اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ میری غیر موجودگی میں میرا ذکر لوئی۔ . . . . . کیا ہے اس کا نام کہہ کر شروع کیا کرتی تھی لیکن اس کا حسن اور وہ بے پناہ جذباتیت جس کی جھلک میں نے کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں دیکھی تھی۔ مجھے اس کے حقارت آمیز انداز کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ اور اگرچہ ایتھل نے مجھ سے عاشق و معشوق کے تعلقات رکھنے کا کبھی خیال نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ مجھے اپنے قریب رکھنا چاہتی تھی کیوں کہ میں ایک شوہر کے تمام فرائض پورا کرنے کے لیے تیار تھا اور وہ بھی شوہر کے حقوق مانگے بغیر۔ ایتھل اپنی حرارت مندی اور والہانہ انداز کے باوجود جب کبھی نئے لوگوں میں ہوتی یا اپنے مخصوص حلقے سے باہر نکلتی تو بہت جھینپو اور شرمیلی ہو جاتی تھی۔ اور اسے ایک مرد کی ضرورت ہوتی تھی جو اس کے اور باہر کی دنیا کے درمیان ایک ڈھال کی طرح کھڑا رہے۔ میکسیکو میں وہ مجھے استعمال کرنا چاہتی تھی اور میں یہ سوچ کر رضامند ہو گیا کہ شاید اس طرح میں اس کے دل میں گھر کر سکوں۔

میکسیکو آنے کے بعد چند ہی ہفتوں میں ایتھل نے فوجی جرنیلوں اور با اثر سیاستدانوں سے ربط پیدا کر لیا تھا۔ لیکن یہ لوگ اس کے حسن کے پرستار تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ ایتھل اس کی داشتہ بن جائے اور جب ایتھل نے واضح کر دیا کہ وہ ایسا نہیں چاہتی تو سب کے سب اس سے دور رہنے لگے۔ میکسیکو کے مردوں کی نظر میں عورت صرف ماں، بیوی یا داشتہ ہو سکتی ہے اور کسی دوسرے روپ میں وہ عورت کو نہیں دیکھنا چاہتے۔

کوئی بھی با اقتدار شخص اس بات پر راضی نہ ہوا کہ ایتھل اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکے۔"

"تو ایتھل کی کیٹا سے کیسے ملاقات ہوئی؟ کیا تم نے ان کا تعارف کرایا تھا؟" میں نے کچھ بے صبری سے پوچھا۔

"ایک بار وہ مجھے ساتھ لے کر بل فائٹ دیکھنے کے لیے گئی۔ شروع شروع میں تو اسے یہ مقابلہ بہت وحشیانہ لگا لیکن جب کیٹا نے سانڈ کے ساتھ کھیلنا شروع کیا تو ایتھل بھی متاثر ہونے لگی۔ تین سانڈ ہلاک کرنے کے بعد جب آخری سانڈ جو خاص طور پر ہسپانیہ سے درآمد کیا گیا تھا میدان میں آیا تو کیٹا نے دور ہی سے دونوں بازو پھیلا کر جیسے کوئی اپنی محبوبہ کو پاس بلاتا ہے سانڈ کو پاس آنے کی دعوت دی کیٹا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھوں سے محبت یوں جھلک رہی تھی جیسے اس کے سامنے سانڈ نہیں بلکہ کوئی شرمیلی دوشیزہ کھڑی تھی جس کے عشق میں وہ سرشار ہو۔ اس وقت مجمع میں بہت سی عورتیں کیٹا کے انداز کی بھرپور لذتیت سے اور اپنے آپ کو اس کا مخاطب تصور کر کے یوں مدہوش ہونے لگیں جیسے کوئی نشے میں چور ہو۔ اس وقت سانڈ دوڑتا ہوا اس کی طرف آیا۔ کیٹا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک ہی قدم میں اس کے راستے سے پرے ہٹ گیا اور قریب سے گزرتے ہوئے سانڈ کی پیٹھ میں اس نے دو نیزے گھونپ دیئے۔ یہ بھی کیٹا کی محبت

. . . . . . تب ایتھل بھی جوش میں آگئی اور اس نے چلّا کر کہا خوب۔ بہت خوب کیٹا نے اس کی جانب دیکھا اور گردن کے خفیف سے جھکاؤ سے ایتھل کی داد کا جواب دے دیا۔ اس روز کا پروگرام ختم ہونے سے پہلے ہی ایتھل گھر واپس چلی آئی اور اس کے بعد اس نے کبھی مجھ سے کیٹا کا ذکر نہ کیا۔ چند ہفتوں کے بعد کیٹا مجھے ایک دوست کے گھر ملا تو اس نے بدتمیزی سے پوچھا۔

"وہ تمھاری امریکن چھوکری کہاں ہے ؟"

میں نے اسے بتایا کہ ایتھل عنقریب ہی امریکہ واپس جا رہی ہے۔ اس نے پھر کہا کہ میں اسے کیٹا کے گھر الوداع کہنے کے لیے لے آؤں۔ میں نے کیٹا سے کہہ دیا کہ جب ایتھل نے خود کبھی کیٹا کا ذکر مجھ سے کیا تھا تو میں کیسے ایسی بات چھیڑ سکتا ہوں۔

عجیب اتفاق ہے کہ اسی شام ایتھل نے مجھ سے پوچھا کہ کیٹا کے متعلق میری کیا رائے ہے۔ میں نے کہا کہ وہ محض ایک جانور ہے۔

لیکن بڑی تخیلی قوت رکھنے والا جانور" ایتھل نے جواب دیا کیا وہ یہاں آنا پسند کرے گا؟

لیکن تم تو اتوار کو امریکہ واپس جا رہی ہو، میں نے کہا۔

فی الحال میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا ہے، ایتھل نے کہا۔ جب میں خاموش رہا تو ایتھل نے بے صبر ہو کر کہا تم اسے یہاں کیوں نہیں لے آتے ؟

وہ فقط ایک وحشی جانور ہے۔ اسے یہاں لانے سے فائدہ ؟ میں نے احتجاجاً کہا

ایتھل نے ایک لمبی سانس لے کر کہا "شاید ہم سب جانور ہیں"

بالآخر مجھے وہی کرنا پڑا جو ایتھل چاہتی تھی۔ میں کیٹا کے گھر گیا۔ اس نے فوراً پوچھا، ارے وہ سنہرے بالوں والی چھوکری چلی گئی ؟"

میں نے کہا "نہیں۔ ابھی نہیں گئی۔ کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟"

اس پر کیٹا نے جھٹ پوچھا۔ کیا اس نے مجھے بلایا ہے ؟

میں نے جھوٹ کہہ دیا کہ ایتھل نے اسے نہیں بلایا۔ لیکن باتوں باتوں میں جب کیٹا کا ذکر چل نکلا تھا کہ وہ کیٹا کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہے۔

اس پر کیٹا نے کہا کہ وہ نہیں آئے گا۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ محض نخرہ کرنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔ اس لیے میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ شام کو اسے اپنے ساتھ ایتھل کے گھر لے جاؤں گا۔

اس شام کو جب کیٹا کے ساتھ ایتھل کے گھر پہنچا تو ایتھل کسی قدر گھبرائے ہوئے انداز سے اسے کاک ٹیل اور سگریٹ پیش کرتی رہی اور کیٹا بت بنا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں نہیں جانتا تھا صرف ہسپانوی

زبان جانتا تھا جو ایتھل کو نہیں آتی تھی۔ اس لیے ایتھل ایک ترجمان کے ذریعہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ ایتھل نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے بل فائٹنگ پسند ہے اور کیا وہ ریڈ انڈین نسل سے تعلق رکھتا ہے اور وہ کب سے بل فائٹنگ کر رہا ہے۔ ان سب سوالوں کا مختصر سا جواب دیتے ہوئے کیٹا کچھ اس انداز سے ایتھل کی طرف دیکھتا رہا، جیسے یہ سب کچھ ایک نمائشی اور سطحی بات چیت ہے جس کے پس منظر میں ایتھل کی حقیقی شخصیت چھپی ہوئی ہے وہ شخصیت جو ایک خونخوار جنگلی سانڈ سے چنداں مختلف نہ تھی جو بل فائٹنگ کے اندر کیٹا پر حملہ کرنے کے لیے بڑھتا ہے۔

اس کے بعد کیٹا نے باقاعدہ ہر شام کو ایتھل کے گھر آنا شروع کر دیا لیکن اس کے ساتھ ہمیشہ ایک ترجمان رہتا تھا ایتھل چاہتی تھی کہ کیٹا اس سے کچھ کھل کر باتیں کرے۔ اس مقصد کے لیے وہ کبھی ریڈ انڈین قوم کا کبھی میکسیکو کی تاریخ یا سیاست کے بارے میں۔ کبھی عشق و محبت یا یورپ اور امریکہ کے بارے میں ذکر چھیڑ دیتی تھی لیکن کیٹا عموماً خاموش رہتا تھا اور صرف براہ راست سوالوں کا مختصر سا جواب دے دیتا۔ فقط جب کبھی ایتھل کی باتوں میں روپے پیسے کا ذکر آتا تو کیٹا اس کی گفتگو میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتا تھا۔ ایسے ہی ایک موقع پر کیٹا نے اس سے پوچھ لیا کہ کیا وہ بہت امیر ہے۔ اس پر ایتھل نے کہا کہ کیٹا خود بہت امیر ہوگا۔ اس نے پھر پوچھا کہ کیا ایتھل کے پاس ایک ملین ڈالر تھے۔ ایتھل نے جواب دیا شاید۔ مجھے کچھ ٹھیک طور سے اپنی دولت کا اندازہ نہیں ہے۔

رفتہ رفتہ ایتھل کے مزاج میں تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ وہ کچھ جھنجلائی جھنجلائی سی رہنے لگی۔ آخر ایک روز میں نے اس سے پوچھ ہی لیا "کیا بھوت سوار ہے تمھارے دماغ پر"

"کیٹا" اس نے جواب دیا۔

"کیا تم اسے چاہتی ہو؟" میں پھر پوچھا۔

میں یہ فیصلہ ابھی نہیں کر پائی۔ میرا ذہن کہتا ہے کہ وہ محض ایک جانور ہے جس میں نہ تو کوئی تخیل ہے نہ کوئی فکر و نظر کی گہرائی لیکن میرے جسم کا رواں رواں اس کے لیے ترستا ہے۔ اور میں کسی ایسے شخص سے محبت نہیں کر سکتی جس کی جسمانی جاذبیت کے پیچھے اس کی تمام تخیلی قوتیں اور اس کے جذبات اور فکر و نظر کا تمام تر خلوص مجھے نظر نہ آئے۔

"خدا کے واسطے ایتھل تم جلد امریکہ واپس چلی جاؤ" میں نے تقریباً گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ لیکن ایتھل نے میری بات اَن سُنی کر دی۔

ایک روز جب کیٹا اور میں ایتھل کے گھر میں تھے تو ایتھل نے اپنی ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی زبان میں کیٹا سے پوچھا۔ تم کبھی اکیلے کیوں نہیں آتے؟ کیا تمھیں ڈر لگتا ہے؟

اس لیے کہ میں صرف ہسپانوی زبان جانتا ہوں اور بغیر ترجمان کے آپ سے بات چیت نہیں کر سکتا کیٹا نے جواب دیا۔

ایتھل نے پھر کہا۔ لیکن ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔

اس پر کیٹا نے جواب دیا۔ کیسے معلوم؟ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کیٹا نے پھر کہا " آپ میرے عجیب خیال نہ

تشریف لائیے۔"

اتھل نے کہا "لیکن تم شام کو ہمیشہ مصروف رہتی ہو۔"

اس پر کیٹا نے معنی خیز انداز میں کہا "آپ رات میں ۱۱ بجے کے بعد تشریف لائیے۔ مجھے فرصت رہے گی۔"

"لیکن کیا اتنی رات گئے بھی تمھارے ہاں ملاقاتی آتے رہتے ہیں؟" اتھل نے پوچھا۔

"ہاں اگر خاص ملاقاتی ہوں" تو کیٹا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

چند روز بعد جب میں اتھل سے ملنے گیا تو وہ شدید بیمار تھی اور سوائے ڈاکٹر کے کسی سے نہیں مل رہی تھی اور تیسرے روز اس نے زہر کھا کر اپنی زندگی ختم کر دی۔ وہ میرے لیے ایک مختصر چٹھی چھوڑ گئی تھی جس میں صرف اتنا ہی لکھا تھا۔

"میرا اندازہ درست نکلا۔ خدا حافظ۔ مگر میرا عقیدہ غلط نہیں۔"

وہ اپنی وصیت میں اپنی آدھی دولت کیٹا کے لیے چھوڑ گئی تھی۔

"تو اس کا جسم اس کے عقیدے سے زیادہ قوی نکلا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" کولیناس نے جواب دیا ـــــ "حقیقت اس سے بھی کہیں زیادہ المناک ہے۔"

"کیسے" میں نے پوچھا۔

بہت دیر تک کولیناس خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

"وہ اس رات گیارہ بجے کیٹا کے گھر گئی اور کیٹا نے اپنی خوابگاہ میں لے جا کر اسے لینے تل رنگ کے آٹھ دس ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔ رات بھر اتھل ان کی ہوس کا شکار بنی رہی اور صبح جب وہ گھر واپس آئی تو بستر سے نہ اٹھی۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا "تمھیں یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"کیٹا کے انھیں ساتھیوں میں سے ایک نے مجھے بتایا" کولیناس نے جواب دیا۔

ہیپا چن

ترجمہ :- راجہ مہدی علی خاں

توقعِ فضول

(سنہ ۱۳۶۹ء تا سنہ ۱۴۴۵ء کی ایک چینی نظم)

خدا کی راہ میں بیکار تم کرتے ہو قربانی
دعا بیکار ہے اس کا نہیں ہے فائدہ کچھ بھی
چلن بگڑے خدا کے ٹھیک کر سکتا نہیں کوئی
فریب اور غنڈے اس جہاں میں عیش کرتے ہیں
مگر جو نیک ہیں وہ اس جہاں میں بھوکے مرتے ہیں
برائی کا نتیجہ اس جہاں میں عیش و عشرت ہے
مگر نیکی کا پھل تکلیف و افلاس و مصیبت ہے
خدا سے بھی اگر انصاف پورا ہو نہیں سکتا
تو پھر یہ کام مجسٹریٹ بیچارہ کرے گا کیا

ناظم حکمت

ترجمہ: سرنیواس لاہوتی

(ناظم حکمت کی یہ نظم میرے ان کاغذات میں محفوظ تھی جو میرے ساتھ ماسکو سے آئے تھے مجھے اپنی زندگی میں دو بار ناظم حکمت سے ملنے کا موقع ملا۔ آخری بار جولائی ۱۹۶۲ء میں تو ان کو بہت ہی قریب سے دیکھنے کا اس وقت موقع ملا جب ماسکو میں ترک اسلحہ کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس کے دوران میں ایک بار ژاں پال سارتر کی صدارت میں مشاعرہ POETS GATHERING منعقد ہوا تھا۔ اس میں مرحوم ناظم حکمت نے حسب ذیل نظم سنائی تھی۔ جس کا آزاد ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ لاہوتی)

یہی تو اک سوال ہے!!!

دھرتی کی ساری دولت ان کی پیاس نہیں بجھایاتی
انھیں تو ہوس ہے کہ کافی دولت پیدا کریں
تاکہ دولت سے ان کی تجوریاں بھر جائیں!
وہ خشک ٹہنیوں پر منوّر قندیلیں لٹکائے
راستوں پر چمکیلے جھوٹ دوڑاتے ہوئے
بازاروں کے بیچ ڈھول پیٹتے ہیں
مگر سب کے چہروں پر غازہ ملا ہوا ہے!!
تم دھوکا کھاؤ گے یا نہیں؟
یہی تو ایک سوال ہے!!!
دھوکا کھانے سے بچ گئے تو زندہ رہو گے
اور دھوکا کھا گئے تو جینا محال ہے!!!!

لینگسٹن ہیوج
ترجمہ:۔ سری نواس لاہوتی

شہید کی موت

ماتم کے نقارے بجاؤ میرے لیے
ماتم اور موت کے نقارے بجاؤ میرے لیے
اور مجمع سے کہہ دو
کہ مل کر مرثیے گائے
تاکہ اس کی آواز میں میری ہچکیاں
اور میری موت کے غم میں
سسکتے ہوئے لمحہ کی کمزور اور دکھی آواز
ڈوب جائے!
مگر سورج کے سنگیت سے بھرپور
ناقوس کی ایک آواز بھی ہو
جو میرے ساتھ جائے!!
موت کی اس تاریک وادی میں
جہاں میں جا رہا ہوں!!!

کے۔ وینکٹیشور راؤ
ترجمہ:۔ سری نواس لاہوتی

میرے لوگ میرا گاؤں

گاؤں میں پیدا نہ ہونے والے نمک کو بھی
لوگ اناج دے کر حاصل کرتے تھے
اور آج تو سگریٹ جلانے کے لیے بھی
آگ بنا پیسے کے نہیں ملتی
ہائے اس گاؤں کو کیا ہوگیا ہے!
اس وقت نہ کمیونزم ہی تھا
اور نہ ہاتھوں میں چابک رکھنے والے راجے مہاراجے
لوگ ان پڑھ ہوکر بھی اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے تھے
اور سماج کی سیوا کرتے تھے
کیا یہ تعجب خیز بات نہیں ہے؟
تب بھی لوگ تاڑی پیتے تھے
برے کام کرتے تھے
چوری کرتے تھے
مگر ان کے دلوں سے پاپ کا ڈر لپٹا رہتا تھا،
یا پھر وہ دنیا والوں کے خوف سے لرزتے تھے
آج تو پاپ کا ڈر بھی مٹ چکا ہے
اور شرم و حیا ہم سے کوسوں دور چلی گئی ہے
اب تو پاپوں سے بوجھل انسان
اپنا سر اونچا کیے
آزادی سے گھوم رہے ہیں!!!

مجتبیٰ حسین

ہم طرفدار ہیں غالبؔ کے.....

مضمون شروع کرنے سے پہلے حضرت غالبؔ کا ایک شعر قارئین کی خدمت میں پیش ہے ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یعنی اس شعر میں مضمون نگار حضرت غالبؔ سے کہہ رہا ہے کہ "اے قبلہ حضرت غالبؔ اس گنہگار مضمون نگار کو اس تلخ نوائی کے لیے معاف فرمایئے کیوں کہ مضمون نگار کے دل میں اس وقت درد ہو رہا ہے اور یہ درد ایسا درد ہے کہ جو حد سے گزر بھی جاتا ہے تو درد ہی برقرار رہتا ہے۔ اگر آپ یہ پوچھیں کہ یہ درد کیوں ہو رہا ہے تو جواب اس کا یہ ہے بس ہو رہا ہے — کیوں ہو رہا ہے ؟ یہ بات ہم سے نہ پوچھیے۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ قبلہ آپ گفتگو کے دوران میں جا و بے جا، موقع بے موقع غالبؔ کو کیوں گھسیٹ لاتے ہیں تو انھوں نے کسی قدر تامل کے بعد کہا تھا "بس اس لیے کہ غالبؔ نے دیوانِ غالب لکھا تھا"۔ مطلب اس کا یہ ہوا کہ اگر حضرت غالبؔ دیوانِ غالب نہ لکھتے بلکہ "کلیاتِ میر" لکھتے تو شاید یہ صاحب غالب کی ذات پر رحم فرماتے اور یوں انھیں بات بات پر "دخل در معقولات" کا موقع نہ دیتے۔ آگے چل کر مضمون نگار اس شعر سے ہٹ کر یہ کہتا ہے کہ اس نے غالبؔ کے سخن فہموں کو تلاش کروانے کی بہت کوشش کی (اعلانات گمشدگی سخن فہمان غالب بھی اخبارات میں شائع کروائے) لیکن افسوس کہ اسے جگہ جگہ یا تو "طرفداران غالبؔ" ہی ملے یا پھر دیوانِ غالب کے نسخے نظر آئے۔ اس گنہگار مضمون نگار کی چشم گنہگار نے کہ جس پر عینک نہیں چڑھی ہوئی تھی جگہ جگہ غالبؔ کے ایسے ایسے طرفدار دیکھے ہیں جو غالبؔ کے اشعار سے اپنے "قلوب" کو گرماتے اور خود حضرت غالبؔ کی روح کو "سنراتے" رہتے ہیں مانا کہ ہمیں غالبؔ سے بہت محبت ہے اور طرفداری کہ اس محبت کا عملی مظاہرہ لیکن ایسی بھی کیا طرفداری کہ، طرفداری، طرفداری میں حضرت غالبؔ کسی طرف کے نہ رہیں۔ ایک صاحب کو ہم سے بھی بے پناہ عقیدت اور محبت ہے۔ لیکن جب کبھی وہ فرطِ محبت میں ہم سے بغل گیر ہوتے ہیں تو آن کی آن میں سینہ کی چوڑائی (۲۴) انچ سے گھٹ کر (۲۰) انچ رہ جاتی ہے اور سچ پوچھو تو غالبؔ کے اکثر طرفداروں کی عقیدت بھی اسی قسم کی ہے جو ایک طرف تو سینہ کی چوڑائی کو کم کر دیتی ہے اور دوسری طرف شاعری کا قافیہ تنگ کر دیتی ہے۔

ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ قبلہ! ضروریاتِ زندگی میں کون کونسی اشیا شامل ہوتی ہیں تو انھوں نے کہا تھا "کھانا

کپڑا، مکان، غالبؔ اور "دیوان غالب" صاف ظاہر ہے کہ یہ صاحب غالب کے طرفدار تھے اور اس حد تک طرفدار تھے کہ خود غالب کی ذات کو "دیوانِ غالب" سے جدا کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔

پھر ہم نے دیکھا کہ ان صاحب نے غالبؔ سے اپنی طرفداری کو نبھانے کے لیے "کلیات میر" پر بھی "دیوانِ غالب" کا ٹائٹل چڑھا رکھا ہے اور محض ٹائٹل کے دھوکے میں میرؔ کے کلام کو بھی غالبؔ کا کلام سمجھتے ہیں اور اس سلسلہ میں قطع کلام کرنے کا کوئی موقع غایت نہیں کرتے کیوں کہ ان صاحب کی نظر میں اردو شاعری نے صرف ایک ہی شاعر پیدا کیا ہے اور وہ ہے غالبؔ! ان سے ایک بار پوچھا گیا کہ جناب والا! اردو کے تین بڑے شعرا کے نام تو بتلائیے تو موصوف نے کہا تھا غالبؔ، مرزا غالبؔ، اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ۔" اس پر ہم یہ سوچتے ہوئے کہ اب آگے اُن کی دال نہ گلے گی۔ پوچھا کہ "اب چوتھے بڑے شاعر کا نام بھی بتایئے" تو کہنے لگے "نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالبؔ۔" غرض غالب سے ان کا تعلق خاطر" بھی غبار خاطر سے کچھ کم نہیں اور وہ کسی قیمت بھی حضرت غالب کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ان ہی صاحب کا ذکر ہے ایک بار وہ "کلیات میر" میں سے کہ جس پر "دیوانِ غالب" کا ٹائٹل چڑھا ہوا تھا۔ اپنے تئیں غالبؔ کا کلام پڑھ رہے تھے کہ اچانک کسی شعر پر پھڑک اٹھے اور کہنے لگے "واہ سبحان اللہ" کیا شعر کہا ہے غالب نے!" ہم نے کہا "بھئی ہم بھی تو سنیں کہ کونسا شعر ہے۔"

فرمانے لگے "

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے "

اس شعر کے ہماری رگِ ظرافت پھڑک اٹھی اور ہم نے پہلے تو ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ٹٹول ٹٹول کر ان کی دُکھتی رگ پکڑ لی اور کہا "جناب! یہ شعر غالبؔ کا نہیں میرؔ کا ہے۔" یہ سنتے ہی انھوں نے اپنی دکھتی رگ ہمارے ہاتھ سے چھڑا لی اور تنک کر بولے۔" بالکل غلط یہ شعر کسی طرح بھی میرؔ کا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میر صاحب تو روتے روتے سو گئے ہیں بھلا سوتے سوتے وہ کس طرح شعر کہہ سکتے ہیں۔ یہ شعر غالبؔ کا ہے اور ۹۹ فیصدی غالبؔ کا ہے۔" اس پر ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو یہی کیا کم ہے کہ وہ اس شعر میں حضرت میرؔ کو بھی ایک فیصدی کا حصہ دار سمجھتے ہیں۔ اگر وہ یہ بھی نہ سمجھتے تو بھلا ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے۔

ان کی عادت ہے کہ کسی نہ کسی بہانے غالبؔ کا تذکرہ زبان پر لایا جائے اور وہ غالب کا تذکرہ یوں کرتے ہیں جیسے غالبؔ سے ان کی رشتہ داری" تھی۔ ان کا تکیہ کلام ہے کہ "اگر آج غالبؔ زندہ ہوتے تو کیا ہوتا" مثلاً کسی مشاعرے میں کوئی لوبرشہ کر کلام سنا رہا ہے تو یہ صاحب فوراً کہیں گے "اگر آج غالبؔ زندہ ہوتے تو کیا ہوتا" ہم ان کی اس ناکام تمنا کے بار بار اظہار سے اس قدر عاجز آ گئے تھے کہ ایک بار جب انھوں نے حسب معمول رقت آمیز لہجہ میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر آج غالب زندہ ہوتے تو کیا ہوتا" تو ہم نے کہا "جناب اگر آج غالبؔ زندہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا کیوں کہ حسابی اعتبار سے ان کی عمر

پونے دو سو برس تک پہنچ گئی ہوتی اور ان کے قویٰ جو ایک سو سال پہلے ہی کمانی مضمحل ہو چکے تھے بھاری محاصل کے باعث اور مضمحل ہو جاتے۔ بھلا ایسے میں وہ کیا خاک شاعری کر سکتے تھے۔" ہمارے اس دندان شکن جواب کے بعد انھوں نے اپنے مصنوعی دانتوں کا ایک نیا سیٹ خرید لیا اور اپنی عادت ترک کر دی لیکن اب ہمیں ان صاحب سے شکایت ہے کہ جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی ہے تو غالب کے اشعار سنائے بغیر ہمیں نہیں چھوڑتے (مخفی مباد کہ ان میں سے اکثریت ایسے اشعار کی ہوتی ہے جو حضرت میر کے ہوتے ہیں) ایک بار کا ذکر ہے کہ وہ اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے تھے اور مالک مکان کی زیادتیوں کا دکھڑا رو رہے تھے (واضح ہو کہ کبھی کبھار یہ دکھڑا ہم بھی سن لیتے ہیں) کہ یکبارگی انھوں نے مکان کے در و دیوار کی جانب نظر دوڑائی ایک آہ سرد کھینچی اور نہایت درد بھرے لہجے میں غالب کا شعر یوں پڑھنے لگے۔

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ مرزا غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اس پر ہم نے کہا "قبلہ! اب تو آپ کی جرأت اتنی بڑھ گئی کہ" در و دیوار پر بھی "مرزا غالب" کو اُگانے لگے، جناب خدا کے لیے شعر میں "مرزا غالب" کی جگہ "سبزہ غالب" پڑھیے۔" تو بولے "آپ مجھے بہکانے کی کوشش نہ کریں۔ میں خوب جانتا ہوں کہ غالب کا پورا نام "سبزہ غالب" نہیں بلکہ "مرزا غالب" تھا۔ اس استدلال کو سننے کے بعد بڑی دیر تک ان کے گھر کے در و دیوار پر اُگے ہوئے "مرزا غالب" کو دیکھتے رہے اور ہمیں بار بار مرزا غالب کا یہ شعر یاد آتا رہا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

صاحب موصوف کے غلط شعر پڑھنے کی یہ کوئی واحد مثال نہیں ہے۔ بلکہ ہم سے قسم لیجیے اگر انھوں نے کبھی بھی غالب کا صحیح شعر پڑھا ہو ــــ انھیں طوطے اور مینائیں پالنے کا بڑا شوق ہے اور وہ غالب کے ساتھ ساتھ ان پر بھی جان چھڑکتے ہیں ــ ایک بار بیمار پڑ گئے، کمزوری اتنی بڑھی کہ ہاتھ میں رعشہ آگیا۔ ایسے میں انھوں نے نوکر کو آواز دی اور کہنے لگے "میاں میرے محبوب طوطے اور مینا کے پنجرے کو میرے سامنے لاکر رکھو اور پھر شعر پڑھنے لگے ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی طوطا و مینا مرے آگے

ایک بار انھوں نے غالب کا شعر یوں پڑھا تھا۔

"گدھا" سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اس پر ہم نے کہا "جناب! "گدا" کی جگہ "گدھا" پڑھ کر آپ نے جو خود تنقیدی فرمائی ہے اس کا کوئی جواب نہیں اور سچ پوچھیے تو ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب کہ انھوں نے غالب کے شعر کو اس کے صحیح معنی و مفہوم کے ساتھ پڑھا تھا۔

غلط شعر پڑھنے کی بات تو چھوڑ دیئے وہ جب غالب کے اشعار کی تشریح پر اتر آتے تو غالب کے پرزے اڑا دیتے ہیں۔ اور غالباً غالب نے ان ہی کے بارے میں کہا تھا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

لیکن افسوس کہ جب تماشا ہو رہا ہے تو غالب ہم میں موجود نہیں ہیں۔ ایک بار انھوں نے غالب کا یہ مشہور شعر پڑھا۔

دھول دھپہ اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اور پھر اس کی تشریح یوں فرمانے لگے "حضرت غالب فرماتے ہیں" ہم نے کہا "کس سے فرماتے ہیں؟" بولے "بھئی اس شعر میں فرماتے ہیں کہ ان کے معشوق کا شیوہ دھول دھپہ ہرگز نہیں تھا لیکن ایک دن ان سے ہی یہ غلطی ہوگئی کہ انھوں نے اپنی معشوق کی خدمت میں ایک "دستی" بطور تحفہ "پیش" کردی اس پر معشوق کو بڑا غصہ آیا اور اس نے اس "دستی" کی آڑ میں "دراز دستی" شروع کردی۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

اس طرح اور بھی بہت سے اشعار ہیں جن کی تشریح وہ کرتے ہیں تو کلام غالب کا "جغرافیہ" اپنے سارے محل وقوع کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ مرزا غالب جب دلی کے ارون ہاسپٹل میں زیر علاج تھے تو انھوں نے دواخانہ کی بدانتظامیوں کے خلاف یہ شعر کہا تھا۔

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

پھر کہنے لگے میاں ابن مریم سے مراد ایسے ڈاکٹر ہیں جو ولایت جاکر بھاری بھرکم ڈگریاں لے آتے ہیں۔ اس کے بعد کہنے لگے "تو مرزا غالب فرماتے ہیں کہ صاحب آپ ہوں گے ابن مریم اپنی جگہ۔ بڑی بڑی ڈگریاں بھی ہوں گی آپ کے پاس لیکن ان ڈگریوں کا آخر کیا فائدہ جب تک کوئی مریض دکھ کی دوا نہ کرے۔ لیکن جب ڈاکٹروں کو یہ شعر سنا چکے تو ارون ہاسپٹل کے ہوشیار اور چالاک ڈاکٹروں نے غالب کو فوراً انہی کا ایک شعر سنایا کہ ؎

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اس پر غالب بہت شرمندہ ہوئے اور فوراً ڈاکٹروں کو "فیس مشورہ" ادا کردی۔ پھر وہ عمر بھر مرنے کی "آرزو" میں جیتے رہے۔

ان صاحب کا تذکرہ چھوڑیئے اور اب ایک اور "طرفدار غالب" کا حال سنیئے جنھوں نے غالب کو اپنا خاندانی شاعر سمجھ رکھا ہے۔ یعنی بیوی سے لے کر بچوں تک بات بات پر غالب کے پرزے اڑاتے رہتے ہیں۔ روزمرہ میں غالب کا استعمال جتنا ان کے گھر میں ہوتا ہے شاید ہی کسی اور گھر میں ہوتا ہو۔ مثال کے طور پر ہر روز صبح جب ان کی بیوی اپنے نوکر کو سودا سلف لانے کی

ہدایت دیتی ہیں تو فرماتی ہیں" ارے اسلم! بازار سے جاکر آدھ سیر پیاز، پاؤ بھر ہلدی، ایک چھٹانک مرچ، دو سیر نمک اور ایک عدد "دیوانِ غالب" لانا اور ہاں دیکھو! امتیاز علی عرشی والا دیوان لانا۔ مالک رام والا لاؤ گے تو واپس کر دوں گی۔" اگر آپ وجہ پوچھیں کہ انھیں "دیوانِ غالب" کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ یہ صاحبہ "کتب فروش" ہیں اور ان کی دکان پر ہر روز کم از کم ایک "دیوانِ غالب" تو ضرور فروخت ہو جاتا ہے۔ کتب فروش ہونے کے ناطے ان صاحب کو ادب سے ایسا ہی لگاؤ ہے جیسے مینڈک کو زکام سے ہوتا ہے جب دیکھیے ادب کے کسی نہ کسی گھسے پٹے کیا بلکہ پٹے پٹائے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ نہ جانے کس ڈاکٹر نے انھیں مشورہ دے رکھا ہے کہ ادب کا تنقیدی جائزہ لینا اور غالب کی مٹی پلید کرنا ان کی صحت کے لیے نہایت ہی ضروری ہے۔ ایک بار جگر کی شاعری پر بحث ہو رہی تھی کہ اچانک ہمارے دوست بھڑک گئے اور کہنے لگے کہ "صاحب! میں تو جگر کو شاعر ہی نہیں مانتا۔ بھئی جو شخص مراد آباد میں پیدا ہو وہ کیا خاک شاعری کرے گا۔" ہم نے ان کی لے دے کی تو بولے "جناب جگر کے بارے میں یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں بلکہ خود مرزا غالب بھی جگر سے بڑے نالاں تھے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں"

قبل اس کے کہ ہم ان کی "گوشمالی" کرتے ایک اور صاحب بحث میں ٹپک پڑے اور کہنے لگے "قبلہ! میں جگر کے بارے میں غالب کی رائے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کیوں کہ ہر شاعر دوسرے شاعر کی برائی کرتا ہے "چشمکانہ معاصرت" جو ہوتی ہے شعرا میں!"

اس پر ہمارے دوست بھڑک کر بولے "خبردار جو تم نے غالب پر "چشمکانہ معاصرت" کا الزام عائد کیا گو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب نے کسی شاعر کے بارے میں "جانب داری" یا "تنگ نظری" سے کام نہیں لیا۔ حد تو یہ کہ یگانہ چنگیزی، غالب کی شاعری کے "شدید" مخالف تھے لیکن یہ تو غالب ہی کی صاف دلی تھی کہ اس مخالفت کے باوجود انھوں نے ہمیشہ یگانہ کی تعریف ہی کی چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

نہ جانے بحث کب تک چلتی رہی۔ ہم تو خیر وہاں سے اٹھ کر آ گئے۔

ایک بار تو ان کتب فروش صاحب نے کمال ہی کر دیا۔ یعنی ایک صاحب نے جب ان سے غالب کی کوئی غزل سنانے کی خواہش کی تو کہنے لگے غالب کی ایک تازہ غزل ہوئی ہے کہیے تو سنا دوں۔ پھر غالب کے تخلص ثانی کا قافیہ باندھ کر غالب کی غزل یوں سنانے لگے۔ عرض کیا ہے کہ:۔

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ
بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ

غالبؔ سے ان کی طرفداری اور "سخن نافہمی" کے یوں تو بہت سے قصے مشہور ہیں لیکن چلتے چلتے ہم ایک اور واقعہ کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایک جگہ محفلِ موسیقی بپا تھی، ہمارے کتب فروش دوست بھی وہاں پہنچ گئے۔ اتفاق سے قوال اس وقت حضرت داغؔ کی وہ مشہور غزل گارہا تھا جس کا ایک شعر ہے:

میرا طریقِ عشق جدا ہے جہان سے
چلتا ہوں چھوڑ چھوڑ کے ہر راہ گزر کو میں

غزل ختم ہوئی تو یہ صاحب ہماری طرف پلٹے اور بولے "بھئی اس ساری غزل میں ہمیں ایک ہی شعر پسند آیا اور وہ ہے:

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

غرض یہ صاحب ایسے ہیں جنھیں ہر وہ بات "خوشگوار" گزرتی ہے جس کا سارے فسانے میں ذکر نہیں ہوتا۔

اب آخر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غالبؔ کی طرفداری صرف چند اصحاب ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ صاحب ہماری فلم انڈسٹری بھی اس "طرفداری" میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ اور اس "طرفداری" کے ذریعہ غالبؔ کی ذات پر بڑا احسان کر رہی ہے اور یہ احسان بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک صاحب نے سہگل کی آواز میں غالب کی غزل سننے کے بعد کہا تھا۔ بھئی! سہگل نے تو غالبؔ کی غزل گاکر غالب کو امر بنادیا ہے۔ نہ جانے غالب کی کونسی بدی آڑے آگئی کہ وہ فلم پروڈیوسرز کے ہتھے چڑھ گئے۔

آپ نے فلم "مرزا غالبؔ" تو ضرور دیکھی ہوگی جس میں مرزا غالبؔ کو بالکل "بھارت بھوشن" کی طرح دکھایا گیا ہے بس یوں معلوم ہوتا ہے کہ "بھارت بھوشن" کو غالب کی داڑھی اور مونچھیں لگادی گئی ہیں۔ غالبؔ صاحب فلمی اداکاروں کی طرح سینہ پر ہاتھ رکھ کر مکالمے ادا کرتے ہیں اور اپنا کلام بھی بلمپت لے میں گاکر سناتے ہیں طبلہ پر کوئی اور شاعر سنگت کر رہا ہوتا ہے اور ان کا کوئی ہمعصر شاعر پیانو بجارہا ہے ہمیں یاد ہے کہ اس فلم کو دیکھنے کے بعد ایک تماشائی نے سینما ہال سے باہر نکلتے ہوئے کہا تھا" بھائی غالبؔ صاحب باوجودیکہ شاعر تھے لیکن اداکاری میں بھی ان کا کوئی جواب نہیں تھا کیا غضب کی ایکٹنگ کی ہے ظالم نے۔ پتہ نہیں غالبؔ نے اداکاری جیسے پینگ پروفیشن کو چھوڑتے ہوئے

شاعری جیسا پیشہ کیوں اختیار کیا تھا؟"

اس پر دوسرے تماشائی نے کہا " اور ایک بات تو تم نے محسوس ہی نہیں کی۔ غالب کی آواز بھی بہت اچھی تھی بلکہ میں تو کہوں گا کہ غالب کی آواز طلعت محمود کی آواز سے بہت ملتی جلتی تھی۔ کئی گانوں پر تو واقعی مجھے شبہ ہوا کہ کہیں یہ گانے طلعت محمود تو نہیں گا رہا ہے؟"

اس پر تیسرے تماشائی نے آہ سرد بھرتے ہوئے کہا۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" کہ وہ کبھی ایک پیشہ کا پابند نہیں رہا۔ لیکن یار مجھے یہ شکایت ہے کہ غالب نے اس فلم میں اپنی ساری پرانی غزلیں ہی ریکارڈ کرا دی ہیں۔ اگر غالب صاحب کوئی غزل نہیں کہہ سکتے تھے تو کیا وہ شکیل بدایونی سے کہہ کر دو چار غزلیں نہیں لکھوا سکتے تھے؟"

اس پر چوتھے نے کہا " نہیں بھائی! غالب اور شکیل کی کبھی نہیں بن سکتی کیوں کہ ان دونوں کا ہے انداز بیاں اور"

الغرض قارئین کرام! غالب کے طرفداروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ گلی گلی، سڑک سڑک، مکان مکان، جنگل جنگل صحرا صحرا، غالب کے طرفدار ان بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن افسوس کہ گلی کے کسی کونے پر، سڑک کے کسی فٹ پاتھ پر، مکان کے کسی گوشہ میں جنگل کے کسی درخت پر اور صحرا کے کسی نخلستان میں غالب کا کوئی سخن فہم نہیں ملتا۔ اور ہم چار و ناچار غالب کے ان طرفداروں کی طرفداری کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور وہ جو غالب نے کہا تھا تو ٹھیک ہی کہا تھا ؎

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

(یہ مضمون "یوم غالب" کے موقع پر اردو ہال میں سنایا گیا)

میرا فرض تھا کہ میں شوکت مرحوم (شوکت علی خاں) پر خود مضمون لکھتا اور ان کی دوستی اور بے لوث محبت کو خراج پیش کرتا۔

یہ نہیں کہ میں اتنا عدیم الفرصت ہوں کہ ان پر مضمون لکھنے کے لیے اپنی زندگی سے تھوڑا سا وقت نہیں نکال سکتا۔ یہ بھی نہیں کہ میں ان پر مضمون لکھوں تو ان کی یا میری رسوائی ہوگی لیکن بات دراصل یہ ہے کہ میں اپنے کسی عزیز دوست کی موت پر رواروی میں مضمون لکھ ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ جہاں لطف ساجد، شاہد صدیقی، اور نظر حیدرآبادی کا قرض مجھ پر ہے وہاں اب میں شوکت کا بھی مقروض ہوگیا ہوں۔ اگر غم روزگار نے کبھی اتنی مہلت دی کہ میں اپنے دل کے زخموں کا بیٹھ کر شمار کر سکا تو انشاءاللہ ان سب کا قرض چکا دوں گا۔

اس شمارے میں یوسف ناظم کا ایک مضمون اور شوکت کی بڑی بہن عظمت عبدالقیوم کا ایک خط شائع کیا جا رہا ہے۔

اریب

یوسف ناظم

یاد اس کی اتنی خوب نہیں

عالم میں لوگ ملنے کے اب گو نہیں رہے
ہر چند ایسا ویسا تو عالم بہت ہے یاں (میر)

شوکت علی خاں ۔ فانی نہیں تھے لیکن پھر بھی وہ رخصت ہو گئے۔ ان کے مرنے کے دن نہیں تھے لیکن پھر بھی وہ مر گئے۔ جواں سال عارف کی طرح۔ جس گھر کے وہ ماہ و شب چار دہم تھے اس گھر کا نقشہ اب کونسا آرکیٹیکٹ یا ٹاؤن پلانر بنا سکتا ہے ـــ مانا کہ وہ داد و ستد کے بڑے کھرے تھے لیکن اس طرح ان کے مرجانے میں بھلا کیا تک تھا نہ کسی سے کچھ کہا نہ سنا۔ ٹرین سے سکندرآباد اسٹیشن پر اترے۔ اور ہسپتال میں ہی دم توڑ دیا۔ مانا کہ یہ دنیا شریفوں کے رہنے کی نہیں ہے لیکن یک لخت اس سے یوں رشتہ توڑ لینا نہایت غیر شریفانہ طریقہ ہوتا ہے۔ یہ عجیب قسم کا سفر تھا۔ شوکت علی خاں نے ٹکٹ صرف سکندرآباد کا لیا ہوگا لیکن وہ اس کے بہت آگے چلے گئے۔

متصل روتے ہی رہیئے تو بجھے آتش دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

شوکت علی خاں کے نام کے ساتھ کتنی ہی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں جو اب تیر بن کر دل چھید دیتی ہیں۔ جب تک شوکت زندہ تھے ایسا معلوم ہوتا تھا محبت اور خلوص کا سورج ڈوبے گا نہیں۔ زندگی توانائی پاتی رہے گی، قنوطیت نزدیک نہ آئے گی۔ شوکت علی خاں جواں مرد تھے۔ پٹھان ہونے کے ناتے سے نہیں مزاجاً۔ سرکاری ملازمت نے انھیں خشک مزاج اور بے حس نہیں بنایا۔ وہ بہت کم چیزوں کا اثر قبول کرتے تھے ہاں دوستی ان کی کمزوری تھی۔ یہاں وہ بچھ جاتے تھے، اور ان کا سارا طنطنہ، دھرا کا دھرا رہ جاتا تھا۔ خط لکھنے کے وہ ماہر تھے۔ اپنے مزاج کا سارا نچوڑ، محبت کا سارا عطر اور شوخی طبع کا سارا حسن، ان کے خط میں یوں اتر آتا تھا جیسے خط نہ ہو اکسیر کی مشین ہو۔ ان کے خط رقعات عالمگیر نہیں، مکاتیب غالب نہیں اور نہ ہی مکتوبات نیاز ہیں لیکن ہر وہ خط جس میں کاتب کا دل دھڑکے اور جو مخاطب کو سر سے پاؤں تک نشہ میں نہلا دے، صرف خط نہیں ہوتا، خط استوا بھی ہو سکتا ہے۔ دل نشیں تحریر کے تو شوکت استاد تھے۔ وہ ادیب نہیں تھے لیکن ادیب بننے کے

سارے سازوسامان سے وہ مسلح تھے۔ اور پھر تحریر اتنی خوبصورت گویا کسی ہوشیار سنار کا بنایا ہوا زیور ہو۔ یعنی صرف پتہ لکھا ہوا لفافہ ہی مل جائے تو آنکھوں میں طراوٹ آجائے۔ صرف شوکت ہی تھے جن کے خط مجھے ان کی موت کے بعد ملے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۳ء کو ان کا انتقال ہوا اور اس کے تین دن بعد مجھے ان کا سال نو کی مبارک باد کا خط ملا۔

ان سے میری ملاقات تو بس یونہی ہوگئی۔ نہ کوئی تعارف اور نہ کوئی سلسلہ، نام ان کا کئی لوگوں سے سنا تھا اور ملنے کی تمنا بھی تھی۔ سنہ ۱۹۵۲ء میں نظام آباد پر اچانک ان سے ملاقات ہوئی اور پھر ۲۳ نومبر ۱۹۶۳ء تک ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ دسمبر ۶۳ء میں تو وہ انتقال ہی کر گئے۔ لیکن مرنے کا اہتمام پہلے ہی سے کر رکھا تھا۔ ۲۰ مئی کو چاندہ سے شوکت نے لکھا۔

برادرم یوسف

تمھارا محبت نامہ ملا۔ شکایت درست ہے۔ میں نے تمھیں ایک عرصے سے خط نہیں لکھا۔ میں تم سے بہت ناراض ہوں۔ میں بیمار ہوگیا تھا۔ اتنا زیادہ کہ جینے کی توقع نہ تھی۔ مگر تم نے پلٹ کر بھی نہ پوچھا۔ دوستی اسی کا نام ہے؟ تمھارا عید کارڈ حیدرآباد کے پتہ پر آیا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ تمھیں میرے رخصت پر جانے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اگر پوچھ لیتے کہ رخصت کس تقریب میں لی گئی ہے تو کیا حرج تھا۔ سچ مچ تم لاعلم ہو تو سنو۔

ستمبر میں ایک مہینے کی ٹریننگ کے بعد جب میں مسوری سے واپس آیا تو قلب کے دورے پڑنے لگے حالانکہ وہاں کوئی ایسی واردات نہ ہوئی تھی۔ دو مہینے تک حالت تباہ رہی اور سمجھ ہی میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ آخر یہ حالت ہوگئی کہ دو باتیں کرنا۔ دو قدم چلنا دشوار ہوگیا۔۔۔ لیکن ایمرجنسی کے زمانے میں باتیں کرنے اور گھومنے سے پرہیز نہیں کیا جاسکتا۔ دسمبر تک طبی مشورے کی توفیق نہیں ہوئی۔ معالج دیکھ کر حیران رہ گئے کہ میں بچ کیسے گیا۔ مجھے اپنے سخت جان ہونے کا پہلے بھی یقین تھا اب بھی ہے۔ جنوری اور فروری پلنگ پر چپ چاپ لیٹے لیٹے کٹ گیا۔ یکم مارچ سے پھر کولھو میں لگ گیا ہوں۔ صحت محنت کی اجازت نہیں دیتی لیکن محنت کے بغیر مزدور کو روٹی کیسے ملے گی۔ غالب کو نیند رات بھر نہیں آتی تھی اور میں بڑے اطمینان سے سوتا ہوں ــــ ایک خوشخبری ــ سلیمان اریب سے تجدید ملاقات ہوگئی۔ جب زندگی خطرے میں پڑ گئی تو سوچا پرانے دوستوں سے ایک بار مل لوں۔ "صبا" پر ٹیلیفون کیا۔ وہ غریب دوڑا دوڑا آیا۔ دل پر جمی ہوئی گرد دھل گئی۔

تمھارا شوکت

اس خط میں چند اور دوستوں کا بھی ذکر ہے جو ملنے نہیں گئے۔ اب اس کا ذکر کیا؟

شوکت علی خاں سگریٹ بکثرت پیتے تھے۔ شاید سوچتے ہوں کہ اگر وہ سگریٹ نہیں پئیں گے تو سگریٹ فیکٹریاں بند ہو جائیں گی۔ یہ سلسلہ آخر تک قائم رہا۔ نومبر میں یعنی موت سے ایک ماہ قبل وہ ۲۰، ۲۲ دن بمبئی میں تھے اور ملاقات ہوئی تھی اور سگریٹ کا برابر ذکر آتا تھا لیکن سگریٹ ان سے نہ چھوٹنی تھی، نہ چھوٹی۔ نومبر میں جب کہ وہ موت کے اس قدر قریب تھے میں نے انھیں زندگی سے بھرپور پایا۔ وہ اپنی ترقی سے مطمئن تھے۔ مالی مشکلات سے بچا دور نظر آئے۔ بمبئی میں خوب شاپنگ کی کہتے تھے کہ زمانہ کے بعد شاپنگ کر رہا ہوں۔ ساڑیاں، شرٹس، ٹائیاں، بچوں کے کپڑے، کھلونے، غرض ہر چیز نہایت

شوق سے خریدی۔ بمبئی سے جب وہ جا رہے تھے تو ہم سب انھیں چھوڑنے وی ٹی اسٹیشن گئے۔ بس یہی ان سے آخری ملاقات تھی۔ ان کا وعدہ تھا کہ وہ جلد ہی بیوی بچوں کے ساتھ بمبئی آئیں گے۔ بس یہی ایک بات انھوں نے جھوٹ کہی۔

شوکت دوستوں اور ماحول کو اپنانے کے ماہر تھے۔ سیل ٹن میں جب وہ ڈپٹی کلکٹر تھے تو انھیں رہنے کے لیے جیل کے کمرے ملے تھے کیونکہ وہاں مکان میسر نہ تھا۔ لکھتے ہیں۔

"ڈیر یوسف۔ تم نے جیل سے نکلنے کا مشورہ دیا ہے۔ کبھی کسی کے مشورے پر چل کر لوگ جیل جاتے ہیں مشورے پر نہیں آتے۔ کیونکہ باہر آنا اپنے بس کی بات نہیں ہوتی۔ سچ پوچھو تو اس زندگی میں ایک نیا لطف آ رہا ہے۔ دلوں بیت جاتے ہیں اور کسی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ مجھے مرہٹی نہیں آتی، اور جو لوگ ہماری اردو کو ہندی کہتے ہیں ان سے اردو میں گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔ اسی ضد میں طبیعت کچھ خاموشی پسند ہوتی جا رہی ہے۔ زبان درازی کی کافی سزا مل چکی۔ اب چپ رہنے کی بھی تھوڑی سی داد ملے ۔۔۔!

وقت گزاری کے لیے افسانے لکھتا رہتا ہوں۔ جیل جا کر کئی اَن پڑھ لیڈر ادیب بن گئے۔ ہو سکتا ہے یہ سعادت مجھے بھی نصیب ہو۔ مگر اپنے افسانے تمھیں نہیں بتاؤں گا۔ تم نے میرے ترجمہ کی تعریف میں اس قدر مبالغہ سے کام لیا کہ اب تم سے تنقید کی توقع نہیں رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ تمھاری زبان اور قلم سے چبھتے ہوئے جملے سن کر جتنا دل پھڑک جاتا ہے اتنی تعریف سن کر نہیں پھڑکتا۔ طنز اور تنقید سے ہٹ کر تمھیں کچھ نہیں لکھنا چاہیے۔

تم نے مختصر نویسی کی شکایت کی تھی جی چاہتا ہے کہ اتنا لمبا خط لکھوں کہ تم کہنیوں سے توبہ کر لو۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ظالموں نے ظلم سہنا سکھایا۔ ظلم کرنا نہیں۔ تمھارا شوکت

اب آپ ہی بتایئے اس سے اچھی نثر کیسی لکھی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ شوکت اپنے آپ سے واقف نہیں تھے بس ہمارے سامنے بنتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔ ایک خط اور پڑھیے جو اس مضمون کا محرک ہے۔ شوکت قطعی نجومی نہیں تھے اور پھر ۱۹۵۲ء میں بھلا انھیں اپنی موت کی یاد آنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ اس وقت وہ لودھن پر ڈپٹی کلکٹر تھے اسی زمانہ میں لطیف ساجد کا انتقال ہوا تھا۔ انھوں نے مجھے ایک خط کے جواب میں لکھا۔

برادرم یوسف! محبت نامہ ملا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ کچھ دیر کے لیے مجھے یاد ہی نہ رہا کہ یہ تمھارا خط ہے۔

لطیف ساجد کی موت کا مجھے بھی صدمہ ہے۔ دو سال پیشتر جب میں نرمل پر تھا تو وہ اریب اور نظر کے ساتھ وہاں آئے تھے دو تین دن میرے یہاں رہے اس کے بعد اُن سے ملاقات نہیں ہوئی گو اکثر رسائل میں ان کا کلام چھپتا رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ حیدرآباد کے آسمانِ ادب پر بڑا چمکدار ستارہ طلوع ہو رہا ہے۔ افسوس ہے کہ ایسے ستارے بہت جلد ڈوب بھی جاتے ہیں۔ تمھارا مضمون پڑھ کر میں بے حد متاثر ہوا۔ اگر تم وعدہ کرتے ہو کہ میرے مرنے کے بعد ایسا ہی ایک مضمون لکھو گے تو پھر میں مرنے کی دعائیں مانگوں۔

اب جب میں اس خط کو پڑھتا ہوں تو سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ ہنسی مذاق میں کہی ہوئی یہ بات آج

ایک ٹھوس حقیقت بن کر یوں سامنے ہے جیسے کوئی سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو۔

زہر دیں اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

شوکت علی خاں نے مرنے کی دعائیں نہیں مانگیں۔ زندگی کی تلاش، زندگی کی طلب، اور زندگی کا شوق انھیں تھا اور کیا تعجب کہ زندگی کی حرارت ان میں اب بھی ہو۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ دل جس نے محبت کرنا سیکھا ہو رک کیسے گیا وہ قلب جو اتنا وسیع تھا کہ ہر درد کو اپنے میں چھپا لے اس قلب کی حرکت رک کیسے گئی۔ کتنی ہی محفلیں تھیں جو شوکت کی شیریں بیانی سے جگمگا اٹھتی تھیں۔ شوکت بے تکان گفتگو کرتے تھے لیکن ویسی گفتگو نہیں کہ سامع مرعوب ہو — مسکراہٹیں بکھیرنا ان کا شغل تھا۔ یہ کام وہ بغیر تنخواہ لیے کیا کرتے تھے۔ جتنے وہ محفل میں من موڑ تھے اتنے ہی وہ مزاج کے سنجیدہ بھی تھے۔ ذمہ داری کا ہر کام انھیں سونپا جا سکتا تھا۔ بصارت ان کی یقیناً کمزور تھی لیکن انھیں بصیرت جو ملی گئی تھی جس گھرانے کے وہ رکن تھے اس سے انھیں ڈسپلن کی تعلیم ملی تھی۔ ورنہ انھیں تو ایسے سے زیادہ کاہل اور آرام طلب شخص ہونا چاہیے تھا۔ میں انھیں ہمیشہ معروف پایا۔ حتیٰ کہ غیر ضروری معروفیتیں بھی انھیں قبول تھیں۔ ان ساری معروفیتوں کے باوجود لکھنے پڑھنے سے وہ کبھی غافل نہیں رہے سچ بات کہنے سے بھی وہ کبھی نہیں چوکے ۲۶؍ جون ۱۹۵۹ء کو ناگپور سے انھوں نے یہ لکھا:

"میر حسن کہاں ہیں — کوئی کہہ رہا تھا کہ اشفاق کو ترقی ملی ہے اور عاقل گلبرگہ کالج کا پرنسپل ہو رہا ہے۔ نشرگاہ اور کالج کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔ عاقل سے خط و کتابت ہوتی ہو تو میری طرف سے دو چار گالیاں لکھو —"

شوکت، شاعر اور ادیب نہیں تھے اور نہ ہی صورت گر تھے لیکن ہند کے شاعروں، صورت گروں اور افسانہ نویسوں کی طرح ان کے بھی اعصاب متاثر تھے۔ فرماتے ہیں:

"ڈیر یوسف — تمھارا محبت نامہ ملا۔ دلی خوشی ہوئی۔ تمھاری شوخیٔ تحریر دیکھ کر سوچتا ہوں کہ تم لڑکی ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ شاید اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت ہو۔ کون جانے محبت کے حربے سے تم کتنے دلوں کو گھائل کرتے۔ نیم بسمل کئی ہوتے، کئی بے جان ہوتے۔ ہمیشہ رخصت پر رہنا تمھاری عادت ہے۔ دو چار دن کی رخصت اتفاقی لے کر آجاؤ تو کیا ہرج ہے؟"

شوکت کی ان اداؤں پر کوئی قربان نہ ہو جائے تو کیا کرے؟ یہ تو شوکت علی خاں کی تصویر کا وہ رخ ہے جس پر ہر شخص کو پیار آ سکتا ہے لیکن ذمہ داری کے احساس کی بھی بات سن لیجیے۔

جل گاؤں - ۱۲؍ مارچ

برادرم یوسف - تمھارا محبت نامہ ملا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ جب تک حیدرآباد ہمارا تھا اور ہم حیدرآبادی تھے حیدرآباد کے نام کو سر بلند رکھنے کا خیال آتا ہی نہ تھا۔ تقدیر کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ مرحوم

حیدرآباد کے نام کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری ہم پر اس وقت عائد ہوتی جب کہ ہم حیدرآبادی نہ رہے"
شوکت صاحب کھلنڈرے نہیں تھے۔ میں نے کہا نا کہ ان کے مزاج کی تشکیل کچھ اس طرح کی گئی تھی جیسے کوئی مرصع نظم ہو۔ ان کی زندگی کو مختلف خانوں میں آسانی تقسیم کیا جا سکتا تھا۔

اپنے دل میں بے پناہ محبت اور بیکراں خلوص رکھنے والا یہ شخص یوں چپ چاپ ۔ ۔ ۔ محفل سے اٹھ جائے گا پتہ نہ تھا۔ بادِ صبا کا جھونکا تھا جو محبت کی خوشبو پھیلا کر گزر گیا۔ جگنو کی چمک تھی جو سب کا دل لبھا گئی اور اپنی یاد چھوڑ گئی۔ اس یاد میں غم کے کتنے ہی نشتر ہیں جو رگِ جاں کے نزدیک رکھے ہوئے ہیں ہر یاد کے پردے سے وہ مسکراتا ہوا چہرہ جھانکتا نظر آتا ہے جو مجسّم زندگی تھا مگر

"اسے اے زندگی لاؤں کہاں سے"

عظمت عبدالقیوم

چند آنسو

(یہ ایک بھائی کا مرثیہ ہے، بہن کے قلم سے)

برادرِ عزیز! مائہ خلوص جب پہنچا اس زمانے میں غم کی آہنی چٹانوں سے ٹکرا کر میرے حواس پاش پاش ہو گئے تھے اور میری حالت پاگلوں کی سی تھی اس لیے ہندوستان اور پاکستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے اعزا و احباب کے تعزیتی پیامات مجھ تک نہیں پہنچائے جاتے تھے بلکہ انھیں میرے میز کی دراز میں محفوظ کیا جا رہا تھا۔ چند روز بعد جب آپ کے ماموں صاحب نے وہ خط لا کر دکھایا جو بظاہر ان کا موسومہ تھا اور درحقیقت سراسر مجھ سے متعلق تو پھر میں نے اپنی چھوٹی بہن تاج سے کہہ کر تعزیتی خطوط کے انبار سے آپ کا خط نکلوایا اور نہ جانے کتنی بار پڑھا۔ آپ کے سوز و غم میں ڈوبے ہوئے جملے میرے زخم دل پر مرہم کا اثر کرتے رہے اور میں نے اس عالم مدہوشی و خود فراموشی میں بھی بارہا کوشش کی کہ کسی طرح خط لکھ کر آپ کی ہمدردی و دلجوئی کا شکریہ ادا کروں۔ لیکن مجھ سے نہ ہو سکا کہ اس عظیم و جانکاہ صدمۂ بے پناہ کے تعلق سے کچھ لکھوں جو اچانک رونما ہوا اور اپنے پیچھے آہوں، آنسوؤں اور ماتمی یادوں کا محشرستان چھوڑ گیا۔ باور کیجئے جب بھی لکھنے کا ارادہ کیا میرا دل اور میرا قلم کانپ گیا۔ شوکت کی بے وقت موت نے مجھے زندہ درگور کر دیا ہے ایک مردے کی طرح خاموش پڑی ہوئی دن رات آنسو بہاتی ہوں اور سوچتی رہتی ہوں کہ آخر قدرت نے کیوں مجھے:

"وہ غم دیا جہاں میں جو مشکل نظر آیا"

سنتی ہوں کہ دوسری بہنیں بھی اپنی اپنی جگہ بے حال و پریشاں ہیں جی چاہتا ہے کہ خط لکھ کر انھیں تسلّی اور دلاسا دوں ان کی کچھ خبر لوں لیکن آج تک نہ لکھ سکی اور شاید آپ کو بھی ابھی نہیں لکھتی لیکن یکے بعد دیگرے آپ کے کئی محبت نامے ملنے کی وجہ سے بہت متاثر ہوئی۔ دور رہ کر بھی آپ کو میرا کتنا خیال ہے آپ کے خلوص کی معترف تو میں ہمیشہ ہی رہی لیکن آپ کو مجھ سے اور میرے خاندان سے اس قدر بے لوث و بے پناہ محبت ہے اس کا اندازہ صحیح طور پر سچ پوچھیے تو اب ہوا، ورنہ کون کسی کے غم پر تڑپ اٹھتا ہے ــــ ؟ ہنسنے والے کے ساتھ تو دنیا ہنستی ہے رونے والے

کے ساتھ آنسو بہانا بہت بڑی بات ہے آپ کی سچی ہمدردی اور حقیقی غمگساری کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ اور سبھی لوگ صبر کی تلقین کرتے ہیں اور میں شوکت سے کہتی ہوں ۔

لوگ کرتے ہیں صبر کی تلقین　　اور مجھ کو عزیز غم تیرا
دل سلگتا ہے رات جلتی ہے　　جانے والے یہ ہے کرم تیرا
ایک پل بھی سکوں نہیں ملتا　　کیا کروں آج میں کدھر جاؤں
میرے غم کا تو یہ تقاضہ ہے　　غم کی حد سے بھی میں گزر جاؤں

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شوکت اس قدر جلد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو جائے گا۔ شوکت مجھے چھوڑ کر چلا گیا وہ حیدر آباد آیا اور مجھ سے ملا تک نہیں میں خود اس سے ملنے جلد از جلد جاؤں گی اور اسے اس کی بے وفائی کا احساس دلاؤں گی جاتے ہوئے اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اس کے بغیر میں جی کیسے سکوں گی۔ آپ بخوبی واقف ہیں کہ مجھے اس سے کس قدر پیار تھا میں نے اسے اولاد کی طرح عزیز رکھا اور وہ مجھ سے روٹھ کر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ یہ قیامت نہیں تو اور کیا ہے۔

اللہ نہ دکھلائے الم نور نظر کا　　بہہ جاتا ہے آنکھوں سے لہو قلب و جگر کا

میرا خاندان بے نام و نشان ہو گیا میرے گھر کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا ۔

کیا قیامت کی وہ گھڑی آئی　　چھا گیا رینگتا ہوا سایہ
بجھ گئیں مشعلیں تمنا کی　　لٹ گیا زندگی کا سرمایہ
آہ شوکت تری جوانی پر　　موت کو رحم بھی نہیں آیا
سہ دانجان سے اندھیروں میں　　پیار کا ماہتاب گہنایا

میری امیدوں کا لہلہاتا چمن آن کی آن میں خاک کا ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ ایک عربی شاعر کے الفاظ میں جو کچھ دل پر گزر گئی اگر او نچے پہاڑوں پر گزرتی تو جل کر راکھ ہو جاتے۔ یوں لگتا ہے جیسے بے شمار کانٹوں سے کھینچ کر چھڑائے ہوئے ریشمی آنچل کی طرح میری روح دھجیاں دھجیاں ہو چکی ہے۔

کیا بتاؤں شوکت تمہیں دیکھنے کے لیے کیسے آنکھیں ترستی ہیں۔ تمہاری ایک ایک بات جب یاد آتی ہے تو دل صدمات پر کباب ہو جاتی ہے۔ تمہاری ایک ایک حرکت تمہاری ایک ایک دل فریب ادا مرتے دم تک نہ بھلائی جا سکے گی۔ تم آگے گئے خیر سے ہم نیں سب تمہارے پیچھے آنے کے لیے تیار بیٹھی ہیں اب تم ایک ایک کا وہاں خیر مقدم کر لینا۔

کیا قیامت نہیں بہن کے لیے　　داغ اپنے عزیز بھائی کا
آنسوؤں کے چراغ دیتا ہے　　فاصلہ دائمی جدائی کا

بلقیس کے خط سے میری حالت خراب ہونے کی اطلاع پاکر آپ کو افسوس ہوا۔ اور میں حیران ہوں کہ اب تک میں

زندہ کیسے ہوں ــــــ؟ مجھے تو اسی روز مر جانا چاہیئے تھا۔ آج کل فانی کا ایک شعر اکثر یاد آتا ہے۔

اللہ رے تری سخت جانی
جب دیکھیے جی رہا ہے فانی

کیا یہ حادثہ ایسا تھا کہ برداشت کر لیا جائے ـــــ؟ اس خبر کو سنتے ہی میرے قلب کی حرکت بند کیوں نہ ہو گئی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

آپ نے پوچھا ہے کہ کیا میری زندگی اب کبھی نہ مسکرائے گی ـــــ؟ میرا ایقان یہ ہے کہ قسام ازل ہر چیز کی طرح ہر شخص کے لیے مقدار مسرت بھی معین فرما دیتا ہے اور جب انسان اپنے حصے کی مسرتیں ختم کر لیتا ہے تو پھر اس کی زندگی پر ہمیشہ کے لیے غم و یاس کی بدلیاں چھا جاتی ہیں اور اس کے لیے دنیا اس قدر تاریک ہو جاتی ہے کہ خوشی کی ہلکی سی کرن بھی کہیں نظر نہیں آتی۔ چنانچہ میں نے بھی اپنے حصے کی مسرتیں سمیٹ لی ہیں اب تلاش مسرت سعیٔ لاحاصل ہے۔ زندگی ہمیشہ مسرتوں کے نور میں نہیں نہاتی اس کا کچھ حصہ آہوں اور آنسوؤں کے دھوئیں میں بھی چھپا ہوتا ہے اس سے فرار انسان کے بس کی بات نہیں آپ کا مشورہ ہے کہ اب میں مسکرا کر گھر میں اجالا کر دوں ــــــ پہلے تو یہ کہ میں اور مسکراہٹ اب دو متضاد چیزیں ہیں اور اگر بالفرض محال میں مسکرا بھی دوں تو اس گھر میں اب کبھی اجالا نہیں ہو سکتا۔" خیاباں" اب خیاباں نہیں رہا بیاباں ہو گیا ہے۔ اس پر رونق، شاندار کوٹھی پر اب مقبروں کی سی اداسی اور خاموشی چھا گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس گھر کے در و دیوار بھی نالہ کناں ہیں، سوگوار ہیں۔

کل کوئی جھومتا تبسم تھا — آج ہے آنسوؤں کی طغیانی
کل جہاں اک حسین جنت تھی — ہے وہاں آج ایک ویرانی
یہ فضائیں یہ گھر کی دیواریں — آج بھی تیرا نام لیتے ہیں
غمزدہ ماتمی حزیں لمحے — دل کے دامن کو تھام لیتے ہیں

مکتبۂ صبا

۷ اجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد سے حاصل کیجئے

انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی مطبوعات

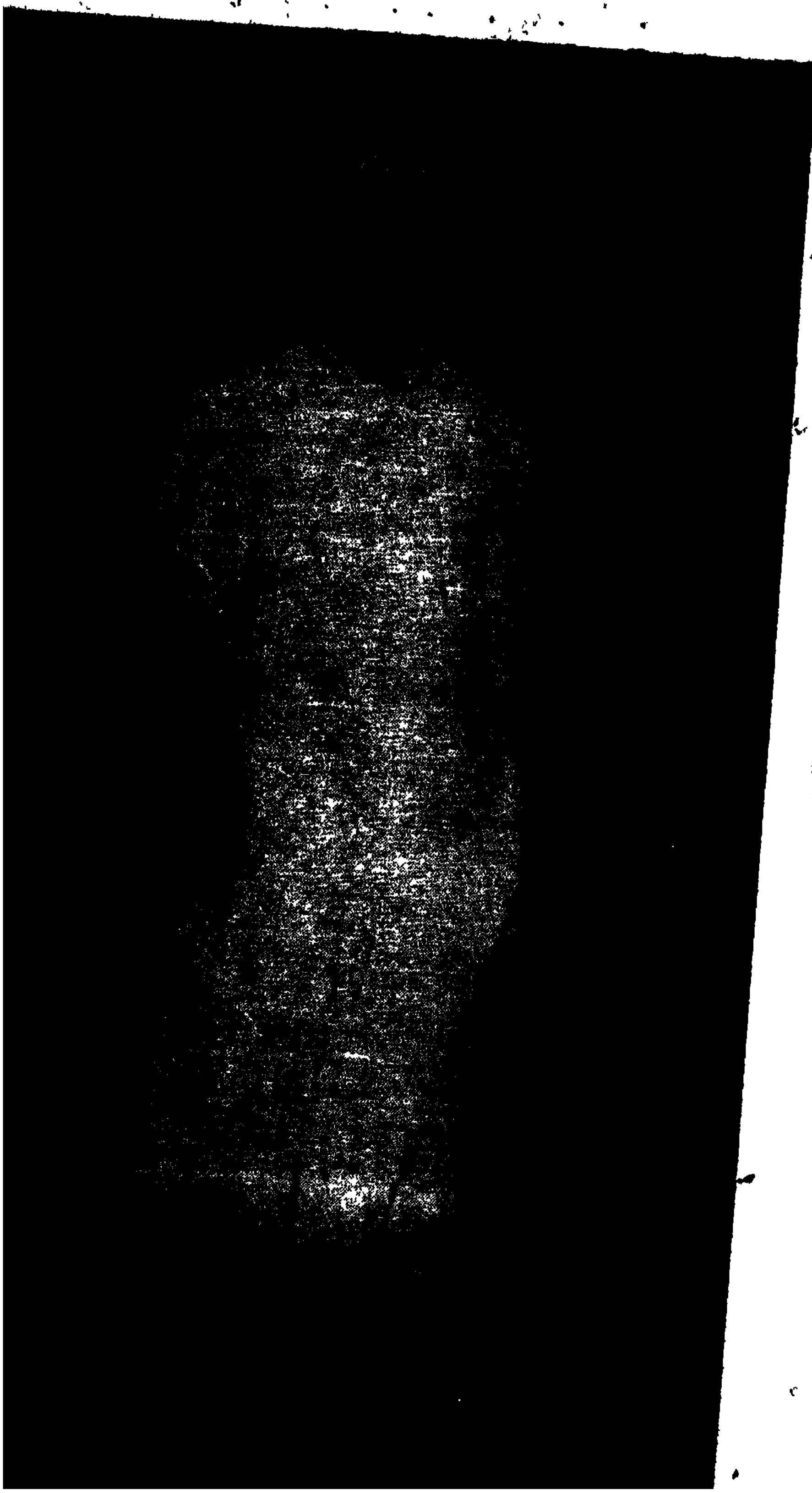
گوتم بدھ	(طویل نظم)	فضل الرحمن	۱/۰
چنگیز	(ڈراما)	〃	۲/۰
سقراط	〃		۱/۲۵
چراغِ منزل	(مجموعۂ کلام)	شاہد صدیقی	۲/۰
پاس گریباں	〃	سلیمان اریب	۲/۵۰
رخسارِ سحر	〃	خورشید احمد جامی	۲/۷۵
زبان اور علم زبان	-	پروفیسر سروری	۷/-
یادگارِ فرحت	-	غلام یزدانی	۲/-
تلگو ادب کی تاریخ		راما نج راؤ، زینت ساجدہ	۳/-
تلگو اردو لغت		گوپال کرشنا راؤ	۳/۵۰
اردو تلگو لغت	(زیر طبع)	ڈاکٹر راما راؤ	
بچوں کی کتابیں	(مکمل سٹ)		۲/۰
کلپنا	(مجموعۂ کلام)	اختر عادل	۱/۰
غزل اور مسائل	(تنقید)	ڈاکٹر حفیظ قتیل	۲/۰
اجلی پرچھائیاں	(افسانے)	اقبال متین	۴/۵۰
نقشِ آذر	(مجموعۂ کلام)	راشد آذر	۲/-
نظامی گنجوی	(تحقیق)	رضیہ اکبر حسن	۳/۵۰

مکتبۂ صبا کی مطبوعات

گلِ تر	(مجموعۂ کلام)	مخدوم محی الدین	۱/۵۰
نیا انسان	(منظوم ڈراما)	فضل الرحمن	۱/-

ان کے علاوہ

کاروانِ وطن	(مجموعۂ کلام)	تلوک چند محروم	۷/۵۰
بہارِ وطن	(بچوں کی نظمیں)	〃	۳/۵۰
بیکراں	(مجموعۂ کلام)	جگن ناتھ آزاد	۴/۵۰
اردو	-	〃	/۵۰
آب و تاب	(مجموعۂ کلام)	سعادت نظیر	۱/۵۰
نوید گل	〃	〃	/۶۰
پھول کلیاں	〃	〃	/۶۰
نیرنگ نظر	〃	روحی علی اصغر	۲/-
جام صہبا		ابو الخیر صہبا	۲/-



منظور شدہ محکمہ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

ماہنامہ

صبا

نہرو نمبر

کاتب:- محمد مظہر

ایڈیٹر:- سلیمان اریب

زرِ سالانہ ہند و پاک سے

۱۰ روپے

ششماہی

۶ روپے

بیرونِ ہند سے

۲۰ شلنگ

فون:- (۴۲۴۰۲)

پاکستان میں ترسیلِ زر کا پتہ:
ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۲۰۰۲)
کراچی ۳

جلد	۱۰
شمارہ	۷
ماہ	جولائی
سنہ	۱۹۶۴ء
قیمت	ایک روپیہ

حیدرآباد دکن

دہلی آفس:- ۱۹۵۷ ترکمان گیٹ، دہلی ۶

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب ۱۷ مجرد گاہ اعظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن، مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان، حیدرآباد

اس شمارے میں

انجمن کی نئی مطبوعات

۱۔ **خطوط غالب** مرتب مالک رام۔
یہ غالب کے خطوط کا مکمل مجموعہ ہے جو مالک رام صاحب نے نہایت سلیقے سے تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ اس میں غالب کے وہ تمام مطبوعہ خطوط شامل ہیں جو مختلف رسالوں اور کتابوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ غالب کے خطوط کا یہ مکمل مجموعہ غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ قیمت سات روپے ۵۰ پیسے صفحات ۷۴۴۔

۲۔ **نسیم مغرب** مترجم۔ اے بی بہار
۲۶۴ انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ ہے جو بہار صاحب نے نہایت سلیس اور شگفتہ انداز میں نظم کیا ہے۔ ترجموں میں اصل کا حسن پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ جن شاعروں کی نظموں کے ترجمے اس میں شامل ہیں آخر میں ان سب کے مختصر حالات بھی دیئے گئے ہیں۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ قیمت دو روپے پچاس پیسے صفحات ۱۲۰

۳۔ **سوگوار یاد** مترجم۔ رحم علی الہاشمی
یہ لارڈ ٹینی سن کی مشہور نظم ان میموریم کا منظوم اردو ترجمہ ہے جس کو رحم علی الہاشمی صاحب نے نہایت سلیس زبان میں نظم کیا ہے۔ شروع میں ٹینی سن کے مختصر حالات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ قیمت دو روپے ۲۵ پیسے صفحات ۱۱۱

۴۔ **مطالعہ حضرت غمگین دہلوی** مرتب محمد یونس خالدی
اس میں مرتب کا ۸۰ صفحات پر مشتمل تفصیلی مقدمہ اور حضرت غمگین کے کلام کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ حضرت غمگین کا دیوان ۷۹۹ غزلوں پر مشتمل ہے۔ یہ اس میں سے ۱۳۲ غزلوں کا ردیف وار انتخاب ہے اس کے علاوہ حضرت غمگین کی اردو رباعیوں کا انتخاب بھی شامل ہے۔ سائز ۱۸×۲۲/۸ قیمت تین روپے صفحات ۱۵۲

شعراء کے نئے انتخابات

(ہر انتخاب کی قیمت ۷۵ نئے پیسے)

ریاض خیرآبادی۔ محروم۔ جمیل مظہری۔ شاد عظیم آبادی۔ فانی بدایونی۔ اصغر گونڈوی۔ یگانہ چنگیزی
شمیم کرہانی۔ الم مظفر نگری۔ کیفی چریاکوٹی۔ شفیق جونپوری۔ نشور واحدی

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

پہلی بات

سب پیدا ہوتے ہیں مرنے کیلئے لیکن بعض لوگ مر کر امر ہو جاتے ہیں اور ایسی ہی زندۂ جاوید ہستیوں میں جواہر لال نہرو بھی تھے۔

ہر بڑے آدمی کی طرح جواہر لال بھی مخدوم و ممدوح اور محمود و مردود رہے لیکن دنیا کی کوئی ایسی برگزیدہ شخصیت نہیں ہے جو مرجع خلائق ہونے کے باوصف ہدفِ دشنام و ملامت بننے سے بچی ہو۔

ایک انسان کی حیثیت سے پنڈت جی میں بھی کچھ کمزوریاں ہو سکتی ہیں لیکن کسی شخص کی بڑائی اور اچھائی ناپنے کے لیے یہ دیکھنا ہی ایک صحیح پیمانہ ہے کہ وہ ظالموں کے ساتھ رہا یا اس نے مظلوموں کا ساتھ دیا اور اس کی ذات سے وطن اور عالم انسانیت کو کیا ملا؟ تو کیا کروڑوں اشک بار آنکھوں کی نمی اس بات کی نفی نہیں کرتی کہ ظالم کی موت پر یہ خراجِ عقیدت نہیں پیش کیا جاتا اور کیا اپنی خاکستر کو خاکِ وطن میں ملا دینے کے بعد بھی کسی سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس نے کیا دیا؟

"صبا" کا یہ نمبر جو رواروی میں نکالا گیا ہے ایک حقیر نذرانہ ہے اس خوبصورت انسان کی محبت، شرافت، شائستگی اور دردمندی کے حضور جو تہذیب کے ایک ورثہ کے طور پر ہم کو ودیعت کیا گیا تھا اور جس نے نیکی اور سچائی کی راہ پر چلنے کی حتی المقدور کوشش کی۔

پیامات

وائس پریسیڈنٹ انڈیا — یکم اگست ۶۴ء

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ ماہنامہ "صبا" کا "نہرو نمبر" شائع ہونے والا ہے۔ یقین ہے کہ "صبا" اس خصوصی نمبر کے ذریعہ پنڈت نہرو کے مشن اور ان کے اعلیٰ مقاصد کو اہلِ فکر تک پہنچانے میں کامیاب ہوگا۔ یہ کوشش مستحسن تحسین ہے۔

میری نیک خواہشات اور دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کامیاب کرے

ذاکر حسین

راج بھون۔ احمد آباد — ۱۰؍ جولائی ۶۴ء

گورنر گجرات

جواہر لال جی کے کارنامے اور اعلیٰ اوصاف ایسے عظیم اور ان گنت تھے کہ ایسے لوگ (اگر کوئی بھی ہوں) تو نہ ہونے کے برابر ہیں، جنھیں کسی نہ کسی طرح ان کی محبت و شفقت توجہ اور دلچسپی میں حصہ نہ ملا ہو۔

یہ بات نہایت موزوں اور مناسب ہے کہ صبا نے ہمارے محبوب رہنما جواہر لال جی کی ادبی دلچسپی ان کے ادبی کارناموں، ادیبوں اور مصنفوں کی قدرشناسی اور اردو زبان سے ان کی والہانہ محبت کے پیش نظر اپنے آئندہ شمارے میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے

مہدی نواز جنگ

راج بھون۔ کلکتہ — گورنر مغربی بنگال — ۶؍ جولائی ۶۴ء

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ صبا اپنا نہرو نمبر شائع کر رہا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس نمبر کے لیے کچھ روانہ نہیں کر سکی کیوں کہ ان دنوں ادبی مصروفیتوں کے لیے وقت نکالنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔

پدمجا نائیڈو

ڈاکٹر ذاکر حسین

خراجِ عقیدت

آپ اور ہم سب یہاں اکٹھا ہیں۔ آپ اور ہم جانتے ہیں کہ یہاں بہت دفعہ بڑے بڑے جلسے ہوئے ہیں۔ اس منچ سے لوگوں نے بڑی بڑی تقریریں کی ہیں، بھاشن دیئے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا آپ ہزاروں کی تعداد میں ان جلسوں میں آتے تھے اور ایک آدمی یہاں اونچی منبر پر بیٹھ کر آپ سے گھنٹوں باتیں کرتا تھا آپ کو بتاتا تھا کہ دیش میں کیا ہو رہا ہے آپ سے کہتا تھا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ آپ کچھ سمجھتے تھے اور کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اس کو دیکھ کر آپ کو طاقت پہنچتی تھی۔ اس کو دیکھ لینے سے آپ یہ سمجھتے تھے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ یہ سمجھتے تھے کہ جو کچھ کرنا ہے وہ یہ کر لے گا۔ جو یہ کہتا ہے اس پر چلنا چاہیئے۔ آج آپ کی آنکھیں اس کو یہاں ڈھونڈتی ہوں گی۔ وہ تو چلا گیا۔ آپ اسے کبھی یہاں نہیں دیکھ سکیں گے۔ کل ہم نے اس کے بدن کو شعلوں کے سپرد کر دیا۔ وہ خاک ہو گیا۔ لیکن ان تین دنوں میں ہمارے دیش میں کوئی آنکھ نہیں ہوگی جس نے آنسو نہیں روئے ہوں گے۔ کوئی دل نہیں ہوگا جو سسکا نہیں ہوگا۔ کسی کو ایسا لگتا ہے کہ اس کا باپ مر گیا کسی کو ایسا لگتا ہے کہ بھائی چلا گیا، کسی کو ایسا لگتا ہے کہ دوست چلا گیا، اور سب کو ایسا لگتا ہے کہ ان کا پیارا، ان کا محبوب چلا گیا۔ اس لیے کہ جو آدمی چلا گیا ہے اس نے اپنی ذات میں ایسی اچھائیاں پیدا کرلی تھیں، ایسی خوبیاں اکٹھی کرلی تھیں کہ ایسا لگتا تھا کہ وہ سب کا محبوب ہے، ہم سب کا پیارا ہے۔ اس پر جان نچھاور کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اسے دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارا بھلا چاہنے والا ہے۔ اس کے پاس بیٹھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی اچھی چیز کے پاس بیٹھے ہیں۔ اس سے دل کو تقویت ملتی تھی۔

وہ چیز تو چلی گئی، اب نہیں مل سکے گی۔ لیکن ایک چیز ہے جو نہیں گئی اور وہ چیز ہے جس نے پنڈت نہرو کو ہمارا محبوب بنایا تھا۔ اور جس کی وجہ سے ہمارا دل ان پر آیا تھا۔ ...... وہ چیز اس دیش کی سیوا تھی۔ اس کو بڑا بناتا تھا۔ اس میں ایکا پیدا کرتا تھا۔ اس کے سوئے ہوئے لوگوں کو جھنجوڑ کر جگاتا تھا ایسے لوگوں کو جو پرانے ڈھنگ سے اپنی روزی کمانا چاہتے تھے ان کو نئے ڈھنگ پر چلانا چاہتا تھا، نئے طریقوں سے چیزیں پیدا کرنا سکھاتا تھا۔ کھیتی کے نئے طریقے بتاتا تھا۔ نئی یوجنائیں بنائی تھیں اور اس دیش کی کایا پلٹ دی تھی۔

ار ا آدمی چلا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ سناٹا ہو گیا ہے۔ اس دلی کا ایک شاعر تھا غالب اس نے کہا تھا ؎

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

تو آج ہی یہ اداسی ہم پر چھائی ہے۔ مانا کہ یہ اداسی صحیح ہے اور ہم اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ لیکن پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنے دلوں میں زندہ رکھنا ہے۔ ان کو امر بنانا ہے۔ کل جب ان کی ارتھی اٹھ رہی تھی تو ہمارے بچے، اسکولوں میں پڑھنے والے بچے پکار رہے تھے "چاچا نہرو امر رہیں" تو ہم سب کی پکار ہونی چاہیے کہ وہ کیسے امر ہوں گے۔ وہ ہمارے دلوں میں امر ہوں گے ہمارے کام سے امر ہوں گے۔ دیش کی ترقی سے امر ہوں گے اور اگر ہم یہ نہ کر سکیں گے تو ایسا ہوگا کہ ہم نے ان کو مار ڈالا آپ میں سے کون ان کو مارنا چاہے گا۔ وہ زندہ رہ سکتے ہیں وہ امر رہ سکتے ہیں لیکن وہ آپ کے دلوں میں ہو سکتے ہیں۔ آپ کی محبت اور محنت سے ہو سکتے ہیں۔

اس لیے اب آنسو بہانے کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ آنسو سوکھ بھی جاتے ہیں۔ بہتے ہیں اور بہتے ہیں اور پھر سوکھ جاتے ہیں ہمارے آپ کے آنسو بھی سوکھ جائیں گے لیکن دل کی گرمی کو بجھنے نہیں دینا چاہیے۔ ارادے کو مضبوط رکھنا چاہیے اور آگے زندگی کو اچھی طرح چلانا چاہیے کہ سب سے بڑی بات آپ کا اتحاد ہے۔ پنڈت نہرو اور ان سے پہلے ان کے گرو مہاتما گاندھی نے ہماری جیون کی جڑ کو اس طرح بویا تھا کہ جب تک ہم میں ایکا نہیں ہوگا ہم اچھی زندگی نہیں گزار سکیں گے۔ اس ایکتا کے لیے آپ اپنے دل میں فیصلہ کر لیجیے کہ کسی ہندوستانی کا ہاتھ چاہے وہ ہندو کا ہو، مسلمان کا ہو، چاہے وہ سکھ کا ہو یا پارسی کا ہو، کسی دوسرے ہندوستانی پر نہیں اٹھے گا۔ اگر اٹھے گا تو اسے روکنا ہوگا۔ اس دیش کے ہر باسی کو عزت کے ساتھ آبرو کے ساتھ، سچائی کے ساتھ دوسرے کے ساتھ رہنا چاہیے اور اس کی ذمہ داری ہم پر، آپ پر، سب پر ہے۔ ہم یہ نہیں کر سکیں گے تو پنڈت نہرو مر جائیں گے۔ ہم یہ نہیں کر سکیں گے تو گاندھی جی بھلا دیے جائیں گے۔ ہمیں تو اس دیش کو ایک بنانا ہے۔ اس کے دیش باسیوں کو بھائی بھائی بنانا۔ ان میں محبت اور پریم پیدا کرنا ہے۔ ان میں جو نفرت ہے اس نفرت کی آگ کبھی لگ جاتی ہے یا لگا دی جاتی ہے، اس کو ہر طرح سے بجھانا ہے۔ یہ آپ کر لیں گے تو سب کام ہوتے رہیں گے اور حکومت کا کام ٹھیک چلے گا۔ یوجنائیں بنیں گی، بڑے بڑے کارخانے بنیں گے۔ لیکن یہ سب ناکارہ ہو جائیں گے، بے کار ہو جائیں گے، اگر ہم میں ایکتا نہیں ہوگی، اگر ہم مل جل کر کام نہیں کریں گے مجھے امید ہے کہ ان کے نام پر ان کے گرو مہاتما گاندھی کے نام پر آپ اپنے دلوں کو مضبوط کریں گے۔

عقیدت کے دو پھول میں بھی چڑھاتا ہوں۔ آپ نے بھی چڑھائے ہیں اور میں کیا چڑھا سکتا ہوں، لیکن اگر ہم یہ عہد کر لیں پکی نیت کر لیں تو ہم کھوئی ہوئی ہمت حاصل کر لیں گے۔ زندگی میں ایک کمی ہمیشہ رہے گی لیکن اس کو پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قاضی عبدالغفار

جواہر لعل نہرو

قرنوں اور صدیوں دور ایک دھندلے مستقبل میں جس کا تصور عوامی دماغوں میں نہیں سما سکتا اس زمانے کا مورخ ہندوستان کی اس تاریخ کا مطالعہ کرے گا اور جب اور جہاں جواہر لعل کا نام آئے گا وہ ٹھہر جائے گا اور ان کی زندگی کے تمام پھیلاؤ پر نظر ڈالے گا اور اپنے دل سے بار بار کہے گا "جواہر لعل! یہ تو کوئی ایسا آدمی ہوگا جس سے میں ہر زمانہ اور ہر دور اور دنیا کے مختلف گوشوں میں اور ہر قوم و ملت کے انقلابوں میں ملتا رہا ہوں۔ میں اس کا نام صرف ہندوستان ہی کی تاریخ میں کیوں کر لکھوں اس کو تو عالمگیر انسانیت کی تاریخ میں لکھا جانا چاہیے۔"

"میری میراث کیا ہے۔ وہ چیز کیا ہے جس کا میں وارث ہوں۔ جو کچھ انسانیت نے لاکھوں برس میں حاصل کیا جو کچھ اس نے لاکھوں برس میں پیدا کیا جو کچھ اس نے سوچا اور محسوس کیا جو تکلیفیں اٹھائیں اور جو خوشیاں حاصل کیں اس کی فتح کے نعرے اور شکست کی تلخی اور زندگی، کروہ جدوجہد جو لاکھوں سال پہلے سے شروع ہوئی اور اب تک جاری ہے، اور ہمیں عمل کی دعوت دیتی ہے یہ سب اور اس کے علاوہ وہ سب میری میراث ہے جو انسانوں کو مشترک پہنچتی ہے۔"

"ایک جستجو کی قوت تھی جو میرے اندر کام کر رہی تھی گویا میں یکے بعد دیگرے زمانوں اور عہدوں میں زندگی بسر کرتا رہا اور ان انسانوں کا ہمسفر ہوتا رہا جو گزرے ہوئے زمانوں میں زندہ رہے تھے۔"

کسی ایسے زمانہ میں جب اس انقلابی دور کا انسان زندہ نہ ہوگا جب کوئی آنے والا مورخ اپنی تاریخ کے نگار خانہ میں اس زمانہ کی تصویریں آویزاں کرے گا اور ان میں سے بعض کے نیچے وہ لکھے گا کہ نسلِ انسانی کے یہ وہ لوگ ہیں جو میری تصویروں میں پوری طرح سمانے نہیں تو ان تصویروں میں ایک تصویر جواہر لعل کی ہوگی۔ ہمارے تصور کا ایک داستان گو اس تصویر پر لکھے گا کہ یہ شخص آزاد ہندوستان کا پہلا وزیر اعظم تھا۔ مگر اس عہدے سے اس کی بڑائی کچھ زیادہ ظاہر نہیں ہوتی۔ اس کی بڑائی اس کے عہدے میں نہ تھی بلکہ اس عہدے کی بڑائی اس کی انسانیت میں تھی۔ اس نے اپنی آدھی زندگی ایک ایک غیر حکومت کے جیل خانوں میں گزار دی تھی اور باقی آدھی اس نے ایک نئے ہندوستان کا محنت کش معمار بن کر گزاری تھی۔ جب خود اس کی قوم کے بعض کم نظر اور کم مایہ افراد اس کے خون کے پیاسے تھے لیکن اس کا ارادہ اور اس کا کام نہ ایک جابر حکومت کے جبر سے رکا اور نہ قاتلوں کی دھمکیوں سے اس نے تو اپنی مشعل ہاتھ میں لی اور زندگی کی راہیں روشن کرتا چلا گیا۔

آج سے پندرہ برس بعد جب اس زمانے کے مورخ کی لکھی ہوئی یہ داستان پڑھی جائے گی تو اہل نظر اسے پڑھیں گے اور سوچیں گے اور بحثیں کریں گے کہ ہندوستان کی تہذیب کا یہ معمار، مدبر، لیڈر، اور انقلابی کس حیثیت سے زیادہ بڑا تھا بالیڈر یا انقلابی۔ فکر و نظر کے حلقوں میں یہ بحثیں جاری رہیں گی، لیکن پھر بھی کارساز موجودات کے بنائے ہوئے نقش زندگی میں پوری طرح اس بے چین روح اور اس فطرت کے خدوخال نمایاں نہ کیے جا سکیں گے۔ جس نے جواہر لعل کے جسد فانی کو ایک لازوال زندگی بخشی۔ مورخ اگر کوئی فلسفی شاعر یا صوفی منش ہوگا تو وہ اپنی محفل خیال میں جواہر لعل کی تصویر کو اس طرح مخاطب کرے گا۔

"تم وہی تو ہو جسے میں نے رامائن اور مہابھارت کے اس زمانہ میں دیکھا تھا جس کی جنتری کوئی مورخ مرتب نہ کر سکا۔ اور کیا تم وہی نہیں ہو جس سے میں بابل اور نینوا میں ملا تھا یا جو مجھے بدھ اور مہاویر اور اشوک اور چندرگپت کے عہد میں ملا کرتا تھا یا جس کو میں نے پاٹلی پترا اور مگدھ کے محلوں میں دیکھا تھا۔ میں نے تو تمہارے دوہے تلسی داس، کالیداس اور کبیر کی زبان سے سنے تھے اور میں نے تمہاری حسن کار روح کے نظارے اجنتا اور ایلورا کے پتھروں میں دیکھے تھے میں نے تمھیں قدیم مصر اور روما اور یونان میں بھی دیکھا تھا۔ موجودہ دنیا سے قریب تر زمانے میں میں نے تمھیں انقلاب فرانس کے ہنگاموں میں دیکھا۔ تبیل کی دیواریں گراتے ہوئے امریکہ کی جنگ آزادی میں دیکھا۔ ٹیپو سلطان کے دوش بدوش دیکھا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں رانی لکشمی بائی کے ساتھ ساتھ دیکھا، اور انقلاب روس کے ہنگاموں میں دیکھا اور میں نے تمھیں وطن دیوتا گاندھی کی ارتھی کے ساتھ ساتھ بھی دیکھا۔"

وزیر اعظم جواہر لعل سے بھی زیادہ بڑا آدمی وہ جواہر لعل ہے جس کے نام کے ساتھ نہ کوئی انقلاب ہے نہ کوئی خطاب۔ صوفی منش مفکر جس کی فکر کے دائرے میں سارا جہاں سماتا ہے جب ملک اور قوم کی حدوں سے گزر کر انسانیت کی غیر محدود وسعتوں میں اپنے لیے حیات جاوید پاتا ہے تو وہ قوموں کے بڑے بڑے عہدیداروں کو تلاش کرنے کے بجائے بڑے بڑے انسانوں کی انسانیت کا سراغ لگاتا ہے اور اپنے افکار کی اس سلطنت میں ایسے لوگوں کے لیے جو صرف بادشاہ اور وزیر ہوں کوئی گنجائش نہیں پاتا۔

جواہر لعل کی بڑائی نہ تو ان کے علم و فضل میں ہے نہ ان کی شخصیت میں اور نہ محض اس امر میں کہ وہ ایک بڑے باپ کے بڑے بیٹے ہیں۔ ان کی بڑائی یہ ہے کہ ان کی وطن پرستی نے مقامی حدوں کو توڑ دیا اور وہ اپنی ذہنی فضا میں صرف کسی ایک ملک یا صوبہ یا براعظم کی شہرت سے گزر کر عالمگیر شہرت کے دائرے میں داخل ہو گئے دنیا میں شاید چند ہی ایسے افراد ہیں جنھیں عالمی شہرت کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جواہر لعل کے افکار کا رشتہ زیادہ تر ایشیا اور ایشیائی ممالک ہی سے زیادہ استوار ہے تو یہ بھی سچ ہے۔ لیکن اس کا سبب کوئی نسلی، یا مذہبی تعصب نہیں ہے بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کی انسانیت (جس طرح ہر بڑے انسان کی انسانیت) مظلوم کی طرف زیادہ جھکتی ہے۔ وہ نہ تو دور حاضر کی نمود و نمائش اور ترقیوں سے مرعوب

ہوتے ہیں اور نہ ماضی سے اس طرح لپٹے ہیں کہ وہ اپنے ملک کو قدامت کی زنجیروں میں از سر نو باندھنا چاہیں بلکہ وہ ہر ایسے احمقانہ جذبہ سے بیزار ہیں جو عہد جدید کی ترقیوں سے قطع نظر کر کے قدامت کے سوکھے ہوئے دریاؤں میں پانی کا تقاضا کرتے ہوں۔ ان کی پیش قدم فطرت نے اپنے اندر قدیم و جدید کا ایک توازن قائم کر لیا ہے اور ان ہی کے قلم سے بار بار یہ حقیقت واضح ہوتی ہے مثلاً "ڈسکوری آف انڈیا" میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

"جذبات اور افکار اور ذوق و شوق کی ملی جلی قوت نے جس کا مجھے دھندلا سا احساس تھا میرے خیالات کو عمل کے میدان میں آگے بڑھانے اور ہر عمل کی قوت نے میرے اندر غور و فکر اور عہد حاضر کو سمجھنے کی خواہش پیدا کی۔ دورِ حاضر کی سچائیاں ماضی کی تاریخ میں بھی ان کو ڈھونڈا اور ہر وقت اس فکر میں رہا کہ اگر ماضی میں دورِ حاضر کے کچھ اشارے ملتے ہوں تو انھیں دیکھوں لیکن مجھ پر دورِ حاضر کا جو غلبہ تھا اس سے میں اس وقت بھی نہ بچ سکا جب میں گزرے ہوئے واقعات اور ایسے لوگوں کی یاد میں گم ہو جاتا تھا جو بہت پہلے اس دنیا سے گزر چکے ہیں اگر کبھی میں یہ محسوس بھی کرتا کہ میں تو کسی عہدِ گزشتہ سے وابستہ ہوں تب بھی میرا احساس یہ ہوتا کہ گویا دورِ حاضر کے اندر بھی وہ عہدِ گزشتہ میری ملکیت ہے"۔ اب میں اس طرح کام نہ کر سکتا تھا یعنی ایک تیر کی طرح خود بخود صرف ایک ایسے نشانہ کی طرف جاؤں جسے میں نے اپنے لیے منتخب کر لیا ہو، اور اس نشانے کے علاوہ ہر چیز کو نظر انداز کر دوں"

آج ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر اپنی فکر و نظر کے محدود دائرہ میں تہذیب و تمدن کے قافلہ کو قدیم کلچر کا نام لے کر آگے بڑھانے کے بجائے پیچھے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس گزری ہوئی منزل کی طرف پسپا ہونا چاہتے ہیں جس کو ایک تیز رفتار زمانہ پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ شاید وہ جواہر لعل کی ترقی پسند فطرت کے اس تقاضے کو سمجھ بھی نہ سکے اور عرصہ تک ان کی راہ میں حائل ہوتے رہے ہیں۔ لیکن قدامت کے مندروں کا دیوتا کتنا ہی زور لگائے وہ فطرت کے قانون کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور فطرت کا قانون آگے بڑھتا ہے پیچھے ہٹتا نہیں ہے۔ یوں تو تمام دنیا میں یہ عمل جاری ہے لیکن خود ہندوستان کے لیے قدیم و جدید کی اس کشمکش کا جو تجزیہ جواہر لعل کرتے ہیں وہ بہت گہری سوجھ بوجھ کا ستحق ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ،

"اپنے کلچر کی روایات کے متعلق کوئی لفظ بھی ہم استعمال کریں ہندوستانی، ہندی، انڈین ہم گزشتہ زمانے میں مختلف اجزاء کے امتزاج کی ایک ایسی لگن دیکھتے ہیں جو ذہنی طور پر ہندوستان کے افکار سے پیدا ہوئی اور ہندوستان کے کلچر اور نسلی ترقی کا نمایاں عنصر ہے۔ غیر ملکی عناصر جب کبھی داخل ہوئے اور وہ ہندوستانی کلچر کے مقابلہ میں آئے تو ذہنی ہندوستان نے اس کا مقابلہ ایک نئے امتزاج اور تخیل کے عمل سے کیا۔ یہی عمل ہر دفعہ اعادۂ شباب کا عمل ہوتا تھا۔ - - - - - - - - - -

...... اور جس سے ہر دفعہ ایک بنیادی پس منظر میں نئی تہذیب کی نئی نئی کونپلیں پھوٹی تھیں۔

مذاہب، عقائد اور تہذیبوں کے امتزاج کا یہ عمل ترقی اور تجدد کا ایک ایسا عمل تھا جس نے ہندوستان کا رشتہ عالمی زندگی کے لیے قائم رکھا۔

انسانیت کے اتحاد کا یہ ایک اعلیٰ تصور جواہر لعل کی زندگی کو روشنی بخشتا ہے اور وہ انسانیت کے اسی نقطۂ نظر سے اپنے وطن کی تہذیب کو دیکھتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ:

"اتحاد کا ایک خواب ہندوستان کے دل میں تہذیب و تمدن کے آغاز ہی سے جاگزیں بن رہا ہے۔ اس اتحاد کا تصور کوئی خارجی طور پر عائد کیا ہوا تصور نہ تھا وہ ظاہری اعمال یا رسمی عقائد کی کوئی معیاری صورت نہ تھی وہ تو اس سے زیادہ گہری کوئی چیز تھی جس کے خود عقائد اور مراسم کی وسیع ترین رواداری مصروف عمل ہوتی تھی اور ہر مختلف عقیدہ نہ صرف قبول کیا جاتا بلکہ اس کی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔"

اسی بنا پر آج جواہر لعل کی نظر میں ہندی قومیت ہندو قومیت نہیں ہے اور نہ اس کا تخیل مذہبی ہے۔ ان کی معنوی زندگی میں اس ملک کی تہذیب ایک عالمگیر انسانیت کا جزو ہے اور اس میں شریک ہے۔

مہاتما جی نے آج سے ۲۰ سال پہلے "ینگ انڈیا" میں لکھا تھا کہ:

"ہمارے زمانہ کی ہندوستانی تہذیب اب بن رہی ہے ہم میں سے بہت سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان تہذیبوں میں جو بظاہر اس وقت ایک دوسرے سے متصادم ہیں ایک امتزاج پیدا کریں کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی جو دوسری تہذیبوں کو اپنے اندر سے خارج کر کے قائم رہنا چاہے ایسی تو کوئی چیز اس وقت موجود نہیں جسے خالص آریائی تہذیب کہا جائے۔ یہ سوال کہ آریائی لوگ ہندوستان ہی کے باشندے تھے یا باہر کے ناخواندہ مہمان تھے۔ میرے لیے کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہے مجھے جس بات سے دلچسپی ہے وہ تو یہ ہے کہ میرے قدیم آباؤ اجداد ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو گئے اور اس طرح موجودہ نسل کا امتزاج پیدا ہو گیا۔"

تہذیب و تمدن کا یہی تصور وہ نقطۂ اشتراک تھا جہاں وسیع الخیال گروہ اور اس کے وسیع النظر چیلے کی روحیں ایک دوسرے میں گھل مل گئی ہیں آج ہندوستان کے لیے مہاتما جی نے اپنی جو سب سے بڑی اور زندہ میراث چھوڑی ہے اس کا نام جواہر لعل ہے۔ حق اور طلب حق کی جو مشعل گاندھی جی نے آدھی صدی تک روشن رکھی وہ اب اس گروہ کے سب سے بڑے چیلے کے ہاتھ میں منتقل ہوتی ہے یہ مشعل حکومت اور حکومتی اقتدار کی مشعل نہیں ہے بلکہ تہذیب اور کلچر اور فکر و نظر کی ایک روشنی ہے جس کے خلاف اس وقت بعض گوشوں میں قدیم اوہام پرستی اور نراو پرستی اور توہمات کی قیدی ذہنیت دھرم اور مذہب کے نام پر جھنڈے بلند کر رہی ہے۔ آج تو ایک غیر ملک کی زبردستی اور بالادستی کے مقابلہ میں جواہر لعل اور ان کے ہندوستانی رہنماؤں کو ایک بہت بڑی جنگ میں اپنی انقلابی قوت صرف کرنی پڑ رہی ہے لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کو اس کے صحیح مقام پر مستحکم کرنے کے لیے گاندھی جی کی اس معنوی اور روحانی اولاد کو اپنے گھر میں تصورات کی ایک جنگ اور لڑنی ہوگی تاکہ انسانوں کی عقل پر پردے نہ ڈالے جا سکیں، اور ترقی کا میدان محصور نہ کر لیا جائے۔

قرنوں اور صدیوں دور ایک دھندلے مستقبل میں جس کا تصور عوامی دماغوں میں سما نہیں سکتا اس

زمانے کا مورخ ہندوستان کے اس زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا، اور جب اور جہاں جواہر لعل کا نام آئے گا وہ ٹھہر جائے گا۔ اور انسان کی زندگی کے تمام پھیلاؤ پر نظر ڈالے گا اور اپنے دل سے بار بار کہے گا۔

” جواہر لعل! یہ تو کوئی ایسا آدمی ہوگا جس سے میں ہر زمانہ اور ہر دور اور دنیا کے مختلف گوشوں میں اور ہر قوم و ملت کے انقلابوں میں ملتا رہا ہوں میں اس کا نام صرف ہندوستان ہی کی تاریخ میں کیوں کر لکھوں اس کو تو عالمگیر انسانیت کی تاریخ میں لکھا جانا چاہیے۔“

عبدالماجد دریابادی

جواہر لال نہرو

۱۸۸۹ء تا ۱۹۶۴ء

پنڈت جی کے مذہبی عقیدوں سے یہاں بحث نہیں۔ ان کی لادینی عالم آشکارا تھی۔ یہاں ذکر ان کی بلند کرداری اور شرافت نفس کا کرنا ہے۔ وہ ایک بڑے شریف و کریم باپ کے بڑے شریف و کریم فرزند تھے۔ تعلیم اعلا پائی پرورش بڑی ہی خوشحالی اور انتہائی ناز و نعمت کے ماحول میں ہوئی آزادیاں ہر قسم کی، کیا ہندوستان اور کیا انگلستان میں میسر رہیں بے فکری سے جس طرح چاہتے خوب پیتے پلاتے یار آشناؤں کے ساتھ خوب گلچھرے اڑاتے ہر طرح داد عیش دیتے یہ کچھ نہ ہوا۔ شروع ہی سے زندگی پاکیزہ، سنجیدہ، شریفانہ رہی اور ظرف بڑا ہی عالی رہا۔ پڑھنے لکھنے میں برق علمی بلندیوں کے شیدا ملک کی آزادی اور وطن کی خدمت ہی کو شروع سے اپنا مقصود زندگی بنا لیا اور اس لگن کو آخر تک نباہ دیا، نہ دنیا کا لالچ کیا نہ مال و جاہ کی محبت کو سینے میں جگہ دی، نہ اپنے کو بڑا مانا نہ کسی پر اپنا تفوق جتایا۔ خدمت لینے نہیں خدمت کرنے کی دھن سوار رہی۔ دنیا نے خادم کی جگہ انھیں مخدوم بنا دیا اور اپنے سر اور آنکھوں پر جگہ دینا شروع کر دی۔ جوانی میں بڑی سختیاں جھیلیں۔ خدا معلوم جیل ہی میں کتنی مدت کاٹی۔ دوستوں کی بے وفائی طوطا چشمی غداری کے شکار آخر تک رہے۔ اپنوں ہی کے تیر پر تیر کھاتے رہے۔ صحت جو آخر عمر میں اتنی گر گئی تھی سن شیخوخت سے کہیں زیادہ دخل ان مسلسل دل شکنیوں اور شدید مایوسیوں کو تھا۔

مسلمانوں سے ہمیشہ خوب بنی۔ پوشاک، کھانے پینے، بول چال، عام طرز معاشرت و تمدن میں دوسرے کشمیری پنڈتوں کی طرح مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو بالکل اپنائے ہوئے تھے، اور اپنے والد پنڈت موتی لال کے قدم بہ قدم تھے رفیقوں، دوستوں، مخلصوں میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر سید محمود، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید خواجہ، چودھری خلیق الزماں، تصدق احمد خاں شروانی سے گہرے تعلقات تھے اور رفیع احمد قدوائی تو جیسے ان کے عزیز قریب ہی تھے۔ خدا جانے کتنے نوجوان مسلمانوں کو اپنے خرچ سے پڑھوایا۔ ملازمتیں دلائیں روزگار سے لگایا

اور کتنے سن رسیدہ مسلمانوں کو اپنے ہاں سے مالی امداد کی۔ جوانی کی زندگی کا کوئی بھی ساتھی اقتدار ہاتھ میں آنے کے بعد مل گیا تو اس کی آؤ بھگت اسی پرانے طریقے پر کی۔ یہ پتا بھی نہ چلنے دیا کہ وہ اس وقت وزیر اعظم ہند سے مل رہا ہے۔ غریبوں ضعیفوں مصیبت زدوں کی امداد میں ملکہ خاص حاصل تھا۔ غرض جوہر انسانیت کا ایک نمونہ تھے۔ اور ایک ہی وقت میں مدبر بھی مفکر بھی صاحب علم بھی۔ پرانی اردو میں ایک لفظ "وضعداری" آتا ہے۔ وہ گویا ان پر ختم تھی۔ عام مسلمانوں کے لیے اب بھی بڑا سہارا بنے ہوئے تھے۔ ان کے دکھ درد میں شریک — مزاج میں تواضع و فروتنی اتنی تھی کہ سنہ ۱۹۲۴ء میں جب میں نے مولانا محمد علی سے پوچھا کہ گاندھی جی کا جانشین آپ کے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟ تو انھوں نے چٹ سے نام جواہر لال کا اور صرف انھیں کا لیا۔ اور ساتھ ہی یہ کہا کہ ان میں اگر کمی ہے تو بس یہ کہ وہ اپنے کو پیچھے بہت رکھتے ہیں مولانا ہی نے انھیں اپنے زمانہ صدارت کانگریس (سنہ ۱۹۲۳ء) میں انھیں کانگریس کا جنرل سکریٹری بنایا اور۔ اور طریقوں سے بھی آگے بڑھایا۔

ہندوستان کی ۴۶ کروڑ مخلوق کے گویا سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ بر اعظم ایشیا بلکہ کہنا چاہیے کہ روئے زمین پر اقتدار کے حصہ دار تھے۔ مرجع خلائق اور ناموران عالم کے مرکز بنے ہوئے تھے۔ جب وقت موعود آیا تو آنے میں چند گھنٹے بھی مشکل ہی سے لگے۔ ۲۷ مئی کو صبح ۶ بجکر ۲۰ منٹ پر اچانک بیماری کی پہلی علامتیں معلوم ہوئیں اور ماہر فن ڈاکٹر ٹیلیفون پر طلب ہوئے اور ہر ممکن انسانی تدبیر دوا و علاج کی شروع ہو گئی۔ کچھ ہی دیر بعد بیدار مغز اور مجسمۂ ذہانت وفطانت مریض بیہوش تھا۔ ڈاکٹر پر ڈاکٹر جمع ہوتے گئے۔ مریض کی حالت بگڑتی گئی ۱۱½ پر حالت اور بگڑی آکسیجن پہلے سے دیا جا رہا تھا۔ بلڈ پریشر گرنے لگا، اور ڈیڑھ بجے نبضیں ڈوبنے لگیں اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ اٹل تقدیر کے آگے عقل سائنس تدبیر کی متحدہ و ترقی یافتہ کوششوں کی شکست کا ایک اور اعلان یہاں تک کہ دو بجکے دو بجے ہی مملکت ہند کا آفتاب اپنی ساری خیرکن تابانیوں کے ساتھ غروب ہو کر رہا۔ موت جس طرح دنیا کے حقیر ترین گدائے بے نوا کو آتی ہے اسی قطعیت اور اسی برق رفتاری سے وقت کی ایک مقتدر ترین ہستی کو آ کر رہی! ڈاکٹروں اور ماہرین فن کی پوری ٹیم مل کر منٹ دو منٹ کے لیے ہوش میں لے آنے میں ناکام رہی!

پروفیسر محمد مجیب

پنڈت جواہر لال نہرو

۲۷ رمئی کی صبح کو کسی رگ کے پھٹ جانے سے ایک ایسا مرد میدان سے رخصت ہو گیا جس نے اپنی تمام عمر میں کبھی ٹھہرنے اور سستانے کا نام نہیں لیا تھا۔ رگ کا پھٹنا اور خون کا بہہ جانا اور اس کی وجہ سے آخر کار قلب کی حرکت کا رک جانا بھی ایک استعارہ تھا جس میں جواہر لال جی کی پوری زندگی بیان ہو جاتی ہے۔ ان کو موت نہیں آئی ان کا خون رگوں سے نکل پڑا، جان جسم سے آزاد ہو گئی، ڈوبتے ہوئے سورج نے تاریکی سے شکست نہیں کھائی بلکہ آسمان پر وہ رنگ بکھیر دیے جو اس کے اندر بھرے تھے اور منہ پھیر کر چلا گیا۔ مگر خالق کائنات آدمی کو جس شان سے بھی واپس بلائے واپس ضرور بلا لیتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ تو سبھی کہیں گے کہ جواہر لال جی کی سوانح حیات بیان کرنا ہندوستان کی ستر پچھتر برس کی تاریخ بیان کرنا ہے انھوں نے اپنے آپ کو اپنے ملک کے لیے اس طرح وقف کر دیا کہ گویا اپنے لیے کچھ الگ رکھنا چاہتے نہ تھے لیکن اسی وقف ہو جانے سے ان کی شخصیت میں ایسی صفات پیدا ہو گئیں کہ وہ ملک کے حالات سے، ماحول سے بالاتر ہو گئے۔ ہندوستان جواہر لال میں سما گیا، جواہر لال ہندوستان میں محو ہو گئے۔ ہماری زندگی کے ہر انقلاب نے ان کی شخصیت کے کسی پہلو کو نمایاں کیا، اور آخر تک وہ ہم سے اس قدر بلند رہی کہ ہماری زندگی سے بہتر زندگی کے نقشے دیکھتی اور دکھاتی رہی۔

جواہر لال جی کو میں نے پہلی مرتبہ غالباً ۱۹۱۹ء کے شروع میں دیکھا۔ بھائی جان کے ایک دوست کندن لال صاحب اوکسفرڈ سے آئے تھے، اور ہم لوگوں سے ملنا اور لکھنؤ کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ ایک روز انھوں نے کہا "جواہر لال یہاں آئے ہوئے ہیں، راجہ صاحب محمود آباد کے مکان پر ٹھہرے ہیں۔ میں ان سے ملنے جا رہا ہوں تم بھی چلو۔" میں ساتھ ہو لیا۔ ہم قیصر باغ میں راجہ صاحب کے مکان پر پہنچے، اطلاع کرائی اور تھوڑی دیر میں بلا لیے گئے۔ جواہر لال نہرو بار ایٹ لا، اس وقت قریب قریب تیس بتیس برس کے تھے، بہت خوبصورت، بہت فیشنیبل عدالت میں جانے کے لیے سیاہ الپکا کا کوٹ، ساڑھے تین انچ اونچا سخت کالر پہنے ہوئے، سر پر بال برائے نام تھے مگر جتنے بھی تھے انھیں اہتمام سے برش کر کے مانگ نکالی گئی تھی، ان کا بدن اور کپڑے ہی نہیں بلکہ ہر حرکت صابن سے دھلی معلوم ہوتی تھی، کندن لال صاحب کچھ بہت سمجھدار آدمی نہیں تھے اور جواہر لال جی کی مسکراہٹ سے اندازہ

ہوتا تھا کہ وہ ایسے آدمی سے بات کر رہے ہیں جو صرف بیوقوف نہیں ہے بلکہ بے وقت بھی آگیا ہے۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ گفتگو میں شریک ہوتا۔ باتیں سنتا رہا اور کوئی خاص اثر لیے بغیر چلا آیا۔

دوسری مرتبہ میں نے جواہر لال جی کو لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں دیکھا، کھدر کا کرتا اور دھوتی پہنے تھے معلوم ہوتا تھا اپنے خیالات میں ڈوبے ہیں، جسم اور جان کی پروا نہیں ہے، بس حق بات کہنا چاہتے ہیں چاہے وہ تیج بہادر سپرو اور موتی لال نہرو کی مرضی کے خلاف ہو اور مصلحت اندیش لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے۔ وہ اسی زمانے میں روس سے واپس آئے تھے، ایک نئی زندگی کا نقشہ ان کے ذہن میں تھا جسے اس وقت کے سیاسی ماحول میں دوسروں کے لیے قابل فہم بنانا تقریباً ناممکن تھا۔ مجھے ان کی تقریریں بہت بے ربط لگیں یا یوں کہیے کہ ان میں نظم اور ترتیب اتنی ہی تھی جتنی کہ ساحل سے ٹکراتی ہوئی سمندر کی لہروں میں۔

مگر ساحل کی بے حسی موجوں کے تھپیڑوں کا بہت عرصہ تک مقابلہ نہ کر سکی۔ ۱۹۳۰ء میں جواہر لال جی کی ہی تحریک سے کامل آزادی کو ہندوستان کی سیاسی تحریک کا نصب العین قرار دیا گیا۔ عام طور سے گاندھی جی کی محبت اور مصلحت اندیشی جواہر لال جی کے جوش کی روک تھام کرتی رہتی تھی، اعلان کے بعد گاندھی جی ہی قومی تحریک کو منزل مقصود کی طرف لے جانے کی تدبیریں کرتے رہے، مگر کامل آزادی کو منزل مقصود جواہر لال جی نے بنایا تھا اور اس کی ایسی وضاحت کی تھی کہ اس کے کامل آزادی ہونے میں شبہ نہ رہے۔

عام طور پر بڑی شخصیت کسی ایسی اخلاقی قدر کی حامل ہوتی ہے کہ وہ اس قدر کا مجسمہ بن جاتی ہے اور اسی کے ذریعے سمجھی اور پہچانی جا سکتی ہے۔ جواہر لال جی میں سینکڑوں خوبیاں تھیں مگر غور کیجیے تو یہ سب اس شرافت کو ظاہر کرتی تھیں جو ان کی طبیعت بن گئی تھی۔ وہ ایسی بات کو چاہے گوارا کر لیتے جو عقل یا مصلحت یا مفاد کے خلاف ہوتی، ایسی بات گوارا نہیں کر سکتے تھے جو شرافت کے خلاف ہوتی۔ شرافت نے ان کو ان تمام لوگوں کا سرپرست اور سہارا بنا دیا جو بغض یا کینہ یا تعصب سے نقصان اٹھا رہے تھے، اسی شرافت نے ان کو جمہوری اصولوں کے برتنے میں انتہا پسند بنا دیا ہندوستان کے کسان اسے بہتر سمجھتے اور شاید زیادہ فائدہ میں بھی رہتے اگر انھیں یہ حکم دیا جاتا کہ یہ کرو یہ نہ کرو، لیکن یہ شرافت کے سیاسی معیار کے خلاف تھا کہ ان پڑھ کو بھی حکومت کا پابند کیا جائے۔ اسی معیار کو قائم رکھنے کی خاطر جواہر لال جی نے جمہوری طریقہ کار کو بڑی سختی سے برتا۔ ان سے بہتر کون جانتا تھا کہ کتنے کام ہیں، انھیں جلد سے جلد انجام دینا کتنا ضروری ہے اور اگر غیر ضروری بحثوں اور خواہ مخواہ کے اختلافات کو سمجھا بجھا کر دور کرنے میں کتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ وہ کام جلد کرنا اور کرانا چاہتے تھے اور بلا وجہ دیر لگتی تو بہت الجھتے تھے۔ جمہوری طریقہ کار کو برتنا ان کے لیے بڑی ریاضت تھی، مگر وہ تمام عمر یہ ریاضت کرتے رہے اور کبھی اسے ترک کرنے کا خیال نہیں کیا۔

اسی شرافت کا ایک منظر ہم نے دیکھا جس کا دل پر بہت اثر ہوا۔ ایک وزیر کے یہاں غالباً نئے نائب صدر کو مبارکباد دینے کے لیے دعوت کی گئی تھی، شامیانے میں ایک طرف، جہاں بڑے آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام

کیا گیا تھا، زمین بھی کوئی چھ انچ اونچی کر دی گئی تھی، جو جہاں آیا، خود اپنے مرتبے کا اندازہ کر کے اونچے حصے کی طرف چلا جاتا یا نیچے ہی رہتا ہے۔ راشٹرپتی تشریف لائے، انھیں ظاہر ہے اوپر ہی بٹھایا گیا۔ جواہر لال جی آئے تو راشٹرپتی اور دوسرے لوگوں کی طرف بڑھے، پھر یہ دیکھا کر اس طرف زمین اونچی کی گئی ہے تو مسکراتے ہوئے چھوٹے لوگوں کی طرف مڑ گئے، اور رخصت ہوتے وقت تک اونچی جگہ پر نہیں گئے۔ حفظ مراتب کا نظام درہم برہم کرنا جواہر لال جی کی ایک بڑی پیاری شرارت تھی جس کا بیان سن کر ہندوستان کے ہر شہری کا دل باغ باغ ہو جاتا تھا۔

ہندوستان میں بہت سے لوگ، بہت سے ادارے ہوں گے جو جواہر لال جی کی شفقت اور عنایت کے سہارے پروان چڑھے۔ جامعہ ان میں سے صرف ایک ہے، مگر ان کی نظر جامعہ پر جب بھی پڑتی ایسی بھرپور محبت کی نظر ہوتی تھی گویا ان کا دل جامعہ میں اور جامعہ ان کے دل میں آباد ہے بلکہ مجھے ڈر ہے انھیں شکایت رہتی ہوگی کہ ہم ان سے الگ رہے جب ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہر وقت ہمارے گلے میں ہاتھ ڈالے رہنا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہہ بھی دیا۔ دہلی یونیورسٹی میں جلسہ تھا، اس کے بعد چائے۔ ان کے سامنے بڑی لمبی میز بچھی تھی اور بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں دوسری میز پر تھا۔ رخصت ہونے لگے تو دو قطاریں بن گئیں اور ان کے لیے بیچ میں رستہ چھوڑ دیا گیا دوسرے لوگ آگے بڑھنا چاہتے تھے میں پیچھے ہٹتا گیا۔ وہ سامنے سے گزرے تو میری طرف دیکھ کر کہا "اچھا ہم سے چھپنا چاہتے ہو!"

مجنوں گورکھپوری

پنڈت جواہر لال نہرو

ایک ذاتی تاثر

(ایک نوجوان دوست کے نام اپنے ایک خط سے اقتباس)

۲۷ رمئی ۱۹۶۴ء — ۸ بجے رات

"...... آج دن میں بہت تھک کر کمرہ بند کر کے لیٹ گیا تھا۔ چار بجے دروازہ کھول کر نکلا تو پہلی خبر جو سنی وہ جواہر لال جی کی موت تھی۔ جگر اکر رہ گیا۔ ملک کی بڑی نازک ساعت میں موت نے ان کو ہم سے چھین لیا۔ ۱۹۳۲ء کے بعد مجھے جواہر لال جی سے ملنے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ اس سے پہلے خاص کر ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء تک اکثر قرب حاصل رہا مجھے ۱۹۲۵ء کا زمانہ اس وقت بڑی کسک کے ساتھ یاد آرہا ہے۔ ۱۰۷۔ ہیوٹ روڈ الہ آباد کے ایک فلیٹ کی تیسری منزل پر میں اور رگھوپتی سہائے (فراق) رہتے تھے اور کئی دوسرے کانگریسی دوست بھی بغل کے کمروں میں تھے نیچے دوسری منزل پر کانگریس کمیٹی کا دفتر تھا۔ جواہر لال جی اس کے جنرل سکریٹری تھے۔ دن میں کئی بار ملاقات ہوتی تھی۔ وہ اور رفیع احمد قدوائی مرحوم کبھی کبھی چائے پینے ہمارے کمرے میں آجاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب الہ آباد کا انگریز کلکٹر کالوری ڈکیتی کے بہانے شریف سے شریف کانگریسیوں کو شبہ میں ماخوذ کر کے ان پر مقدمہ چلاتا تھا اور چار ماہ تک جیل میں رکھ کر ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا تھا۔ پنڈت موتی لال مرحوم، جواہر لال جی اور الہ آباد کے دوسرے اکابر نے اس بلا کو دور کرنے میں کیسی کیسی مشقتیں اٹھائیں؟ اس کا اندازہ آج کے آزاد ہندوستان میں نئی نسل مشکل ہی سے کر سکتی ہے۔ اسی زمانہ میں انگریز کی فرقہ وارانہ حکمت عملی نے الہ آباد میں رام لیلا کے موقع پر ہندو مسلم فساد کا اندرونی طور پر پورا سامان کر رکھا تھا۔ فساد نہیں ہونے پایا۔ الہ آباد کے نیک نیت اور سربرآوردہ لوگوں نے جاں فشانی کے ساتھ اس کے روک دینے کی کوششیں کیں ان کوششوں میں جواہر لال جی صدق دل سے پیش پیش تھے۔ اسی وقت سے میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ واقعی فرقہ وارانہ ذہنیت کے دشمن تھے۔ وہ ایک مہذب انسان تھے اور مہذب انسانیت کے قائل تھے۔ وہ دہریہ یا ملحد یا خدا سے منکر ہوئے بغیر صحیح معنوں میں غیر دینی (SECULAR) مزاج لے کر پیدا ہوئے تھے۔ ان کے اس غیر دینی مزاج کی ہر قیمت پر لاج رکھنا ہمارا اولین فرض ہے۔

وہ فطری طور پر پیش قدم (PROGRESSIVE) تھے اور نہ صرف اپنے ملک بلکہ ساری انسانی دنیا کی آزادی اور ترقی چاہتے تھے۔ ہندوستان کو صحیح راستہ پر لگانے اور صلح و امن کے ساتھ آزاد رہ کر آگے بڑھانے کے سلسلے میں انھوں نے جتنا کچھ کیا وہ ان کے اپنے مزاج و کردار کا تقاضا تھا، اور جو کچھ وہ کرنا چاہتے تھے اور نہ کر سکے اس کے ذمہ دار عاملات و مزاحم تھے جو ہر ملک میں ترقی کے راستے میں خلل انداز ہوتے آئے ہیں اور جن کی ہمارے ملک میں بھی افراط ہے۔ میں نے جواہر لال جی کو ہمیشہ اپنی تخییل کے مطابق ایک شریف ہندوستانی اور ایک صاف ستھرے ہندوستانی کا حامی سمجھا۔ . . . وہ ہندوستان کے جسم کی صحت، اس کے دل و دماغ کی روز افزوں قوت، اس کے نفس کی شرافت یعنی بحیثیت کل ہندوستان کی مائل بہ ارتقا سالمیت کی ضمانت تھے۔ دیکھو اب کیا ہوتا ہے اور ہمارا ملک کدھر جاتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک پورا جگ آج ختم ہو گیا۔ اس کے بعد نیا جگ کیسا ہوگا؟ خدا کرے بہتر ہو۔ مگر جواہر لال جیسے لوگ روز نہیں پیدا ہوتے۔ وہ صرف ایک ذات نہیں تھے۔ وہ ایک علامت تھے ملک کے ترقی پذیر رجحان اور خوب سے خوب تر مستقبل کی ایک حوصلہ انگیز اور امید افزا علامت۔ وہ آج کی ساری دنیا میں ہندوستان کی آبرو تھے۔ پورے تیس سال سے میں نے ان کو نہیں دیکھا۔ ان سے میری آخری ملاقات ۱۹۳۴ء میں آنند بھون میں ہوئی جب کہ وہ حال میں جیل سے نکلے تھے اور بہار کے زلزلے کے سلسلے میں ریلیف فنڈ کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے تھے مسز کملا نہرو آنجہانی نے جس تپاک سے ہم لوگوں کو چائے پلائی تھی اس کی لذت کو میں کبھی نہیں بھولا۔ خاموش طور پر میں . . . جواہر لال جی سے ذہنی میل اور روحانی قرب آج بھی اتنا ہی محسوس کر رہا تھا جتنا اب سے چالیس سال پہلے محسوس کرتا تھا زندگی کا ایک پورا دور ختم ہو چکا۔ اب تم لوگوں کا زمانہ ہے۔ خدا تم لوگوں یعنی نوجوانوں کو سلامت رکھے، اور توفیق دے کہ وہ ہم سے بہتر کچھ کر کے دکھا سکیں . . . . ''

آل احمد سرور

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

آخر وہی ہوا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ جواہر لال نہرو دہرہ دون میں تین دن آرام کرنے کے بعد دہلی واپس آئے رات کو آرام سے سوئے۔ صبح معمول کے مطابق اٹھے۔ چھ بج کر بیس منٹ پر انھوں نے کچھ تکلیف محسوس کی اور بے ہوش ہو گئے۔ دو بجے ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔

صرف ان کی زندگی کا چراغ گل نہیں ہوا، ہندوستان میں اندھیرا ہو گیا۔ ایشیا کی روشنی جاتی رہی۔ دنیا پر غم کے بادل چھا گئے۔ ہندوستان کا محبوب رہنما صرف ہندوستان کا رہنما نہیں تھا۔ وہ ساری دنیا کا رہنما تھا۔ اس نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں صرف ہندوستان کو آزاد نہیں کرایا کتنے ہی غلام ملکوں میں آزادی کی ایسی تڑپ پیدا کی کہ ان کی زنجیریں ایک جھٹکے کے ساتھ ٹوٹ گئیں۔ اس نے ہندوستان کی آزادی کی لڑائی اس طرح کامیابی سے لڑی کہ دوست دشمن سب کے سر احترام میں جھک گئے۔ اس نے سیاست کو اخلاق سکھایا، اس نے اندھیری راتوں میں افق پر روشنی کی ننھی سی لو لگانا سکھایا۔ اس نے زندگی کے آداب سکھائے، اس نے موت کے آداب سکھائے وہ ہندوستانی تھا، وہ مشرقی تھا، وہ مغربی تھا، وہ عالمی ذہن رکھتا تھا اس میں متضاد عناصر اس طرح جمع ہو گئے تھے کہ اس صدی میں "انسان" کی تصویر نظر آ گئی تھی۔

وہ ہندوستان کی ننگی بھوکی جنتا کے دل کی ہر دھڑکن کو محسوس کر سکتا تھا وہ عوام کے چہروں سے ان کے جذبات پڑھ سکتا تھا۔ عوام ہی سے اسے طاقت اور گرمی ملتی تھی، وہ ان کا عاشق تھا اور عوام اس کے عاشق تھے۔

اس عظیم الشان ملک میں جہاں ۴۵ کروڑ انسان بستے ہیں جہاں ہر طرح کی آب و ہوا، ہر طرح کا طرز زندگی ایک درجن سے اوپر قومی زبانیں اور سینکڑوں چھوٹی چھوٹی بولیاں ہیں جس کی بڑی شاندار تاریخ ہے جس نے انسانیت کے غیر قانونی کارناموں کے ساتھ بربریت کے افسوسناک مظاہرے بھی دیکھے ہیں، مگر ایک شاندار مستقبل جس کا انتظار کر رہا ہے، ایک جواہر لال ایسا تھا جو سب کی زبان سمجھتا تھا، سب کے درد سے آشنا تھا جس کے یہاں مذہب زبان، علاقے، عقیدے کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا تھا جسے ہندوستان کی پوری تاریخ سے محبت تھی، جو اس

کے جلوۂ صد رنگ کی ہر کرن کو عزیز رکھتا تھا، جو سب کا تھا اور سب کے لیے تھا۔ ہندوستان میں بڑے بڑے فاتح، مدبر، عالم، دانشور، بزرگ، ادیب، شاعر، مفکر گزرے ہیں، مگر ایسا جامع حیثیات آدمی ہماری سرزمین سے کوئی نہیں اٹھا جو بیک وقت خوابوں کا پجاری، حقائق کا رمز شناس، جنگ آزادی کا سورما اور آزادی کے بعد قوم کا معمار اعظم، ادیب، مورخ، دانشور، مدبر، عمل کا مرد میدان، حال کے پیچ و خم کو سلجھانے والا اور مستقبل کے ہر سربستہ راز کا محرم ہو۔

ہم ہندوستانی کنویں کے مینڈک کی سی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ جواہر لال نے ہمیں عالمی افکار و اقدار کا محرم بنایا۔ دور دراز ملکوں میں آگ لگی تو انھوں نے اس کی چنگاری اپنے دل میں محسوس کی اور ہمیں بھی دوسروں کے درد سے آشنا کیا۔ یہی وجہ ہے آج ہم ہی اس گراں بہا متاع کے لٹ جانے پر ماتم نہیں کر رہے ہیں، ساری دنیا اپنے ایک رہنما کا ماتم کر رہی ہے۔

یوں تو جواہر لال نہرو نے ہندوستان کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اس کی تفصیل ایک دفتر چاہتی ہے، مگر ان کا سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ انھوں نے بامعنی اور بامقصد زندگی کا مفہوم سمجھایا۔ ساڑھے چوہتر سال کی زندگی یوں کم نہیں ہے مگر اس زندگی میں جواہر لال نے کیا کچھ نہیں کیا۔ "تلاش ہند" میں ۱۹۴۴ء میں انھوں نے لینن کا یہ قول نقل کیا تھا۔

"انسان کی سب سے عزیز متاع زندگی ہے، اور چونکہ اس کے مقدر میں ایک ہی دفعہ جینا ہے، اس لیے اسے اس طرح زندگی بسر کرنا چاہیے کہ مرتے وقت وہ کہہ سکے، میری ساری زندگی اور ساری قوت دنیا کے سب سے بڑے مقصد کے لیے وقف تھی یعنی بنی نوع انسان کو غلامی سے نجات دلانا۔ انسانیت کی تاریخ میں اس مقصد کی خاطر اپنی زندگی کو وقف کر دینے کی اور سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے، سفر میں یا حضر میں، خوشی میں یا غم میں اس مقصد کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دینے کی مثالیں اور بھی ملیں گی مگر ہمارے ملک میں کم ہیں۔ اس صدی میں گاندھی جی کے علاوہ ہندوستان میں کوئی ایسا نام ذہن میں نہیں آتا جو جواہر لال نہرو کی طرح اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ مقصد اور مشن کے لیے وقف کرنے کا ہو۔

پھر جواہر لال نہرو نے آزادی کو معنی اور مقصد عطا کیا۔ آزادی سے پہلے جب بہت سے لوگ صرف بدیسی سامراج سے نجات پانے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے اور آزادی کے بعد کا نقشہ ان کے ذہن میں نہ تھا اور نہ اس کو وہ ضروری سمجھتے تھے، جواہر لال نہرو نے منصوبہ بندی کا ایک کمیشن بنایا اور مستقبل کا ایک ڈھانچہ تیار کیا۔ آج ہماری جمہوریت کا جو قصر بلند ہے اس کی ہر اینٹ جواہر لال کی رکھی ہوئی ہے۔ جمہوریت غیر مذہبی ریاست اور سوشلزم کے تصور کو جواہر لال نے صرف زبان سے منوایا بلکہ دلوں میں بٹھایا۔ انھیں کی مسلسل تعلیم کے طفیل آج ہمیں یقین ہے کہ جمہوریت اور غیر مذہبی ریاست کے تصور کو ہندوستان کبھی نہیں چھوڑے گا اور اپنے طور پر سوشلزم کی منزل کی طرف برابر بڑھتا رہے گا۔

جواہر لال نہرو نے دنیا کے سیاسی معاملات میں طرف داری کے بجائے سخن فہمی سکھائی۔ انھوں نے سب کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا لیکن وہ کبھی بڑی سے بڑی طاقت سے مرعوب نہ ہوئے۔ انھوں نے ہمیشہ قوم کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی

تلقین کی انھوں نے دوستوں سے بھیک مانگنے کے بجائے خودکفالتی ہونے پر زور دیا۔ ہاں انھوں نے ایسی دوستانہ امداد بڑی خوشی سے قبول کی جس کے پردے میں کوئی سنہری زنجیر نہ تھی صرف اچھے کام میں تعاون کا جذبہ تھا۔

اور ہندوستان کا یہ محبوب رہنما اور دنیا کا چوٹی کا مدبّر اور لیڈر کیسی دلآویز شخصیت رکھتا تھا۔ اس میں کیسی شانِ محبوبی تھی۔ اس کا وہ تبسّم جو گرد و پیش کی ہر کثافت اور دلوں کے ہر غبار کو دور کر سکتا تھا، جس سے پتھر بھی پگھل جاتے تھے جس میں چاندنی کی سی لطافت اور دلاسا ئی تھی اور نسیمِ سحری کی سی تازگی اور رحمت و رافت، اس کی بچوں سے گہری دلچسپی، جس کے پیچھے انسانیت کی معصومیت اور اس کے مستقبل کے امکانات سے لگن پوشیدہ تھی۔ اُس کی حسن اور حسن کاری کے ہر جلوے اور ہر ادا سے محبت بڑے سے بڑے مہمان کی موجودگی میں بھی ادبی محفلوں میں شرکت کے لیے وقت نکالنا، پالم سے سیدھے ساہتیہ اکاڈمی کے جلسے کے لیے دوڑنا، سیاست کے پیچ و خم سلجھاتے ہوئے، کسی ادیب کی مدد، کسی شاعر کی ہمت افزائی، کسی مصوّر کی سرپرستی، کسی فنکار کی دیکھ بھال کے لیے وقت نکالنا، سب کے دکھ درد میں شریک ہونا، سب کا دل رکھنے کی کوشش کرنا، غریب طالب علموں کی مدد کرنا اور ان کی زندگی سنوارنا، اُن پرانے ساتھیوں کے بال بچوں تک کی سرپرستی کرنا جن سے سیاسی اختلاف تھا، ہر ظلم اور زیادتی کے خلاف سینہ سپر ہونا، ہر تعصب اور تنگ نظری کا مقابلہ کرنا، خطروں سے کھیلنا، فسادیوں کے مشتعل ہجوم میں کود پڑنا اور ان کی خبر لینا۔ اس کی کس کس بات کو یاد کیا جائے۔ ہر کرشمہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے کہ تیری جگہ یہیں ہے۔

میرے ذہن میں جواہر لال نہرو کی ایک نہیں بہت سی تصویریں اُبھرتی ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں جے پور کی پی۔ ای۔ این کانفرنس میں ان سے ملاقات اور ان کی تقریر، ۱۹۴۷ء کے فسادات کے زمانے میں ان کا وہ درد میں ڈوبا ہوا مگر ایک عزم لیے ہوئے چہرہ، گاندھی جی کی شہادت پر اُن کی حزن بھری آواز کہ "ہماری روشنی چلی گئی، آج ہر طرف اندھیرا ہے" مولانا آزاد میموریل لیکچر دیتے ہوئے ہندوستان کے مسائل پر بصیرت افروز تقریر، ساہتیہ اکاڈمی کے جلسوں میں ادبی مسائل پر اظہارِ خیال، اردو کانفرنس دہلی میں آزادی کے بعد اردو کتابوں کی نمائش دیکھ کر ان کا تبصرہ، چینی حملے کے وقت گمبھیر آواز میں ہندوستانیوں کو متحد ہو کر دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی دعوت، گزشتہ سال انجمن ترقی اردو ہند کے دروازے پر وفد کا استقبال کیا اور ہر ممبر کا نہایت محبت سے خیر مقدم کیا۔ گزشتہ نومبر میں لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر کی صد سالہ برسی کے جشن میں ان کی شرکت۔ ہر تصویر اُن کی رنگا رنگ شخصیت کے کسی دلآویز نقش کو ظاہر کرتی ہے۔ ہر تصویر میں اچھے اور بڑے تصورات سے محبت، زندگی کی بہترین قدروں کی ترجمانی، تہذیب اور انسانیت پر مٹنے والا عزم نرمی، دل سوزی، دل داری کے لازوال نقش ہیں۔

کیا جواہر لال نہرو واقعی مر گئے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ان کا جسم خاکی ضرور شعلوں کی نذر ہو گیا۔ وہ جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر کشمیر سے کاویری تک اور آسام سے کاٹھیاواڑ تک اس سرزمین کے چپّے چپّے پر ان کے قدموں کے نشان ہیں، اس کی فضا میں ان کی آواز گونج رہی ہے۔ اس کے چنتالیس کروڑ باسیوں کے خوابوں میں ان کی

ی ہوئی کرنیں ہیں۔ وہ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ اُن کی نکالی ہوئی اور بنائی ہوئی ہے۔ تقریباً پچاس برس تک ہندوستان زندگی کے ہر موڑ میں وہ شریک رہے۔ آج ہم جو کچھ ہیں انھیں کی وجہ سے ہیں۔ وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ ہندوستان و اونچا لے جانے کے اُن کے خواب زندہ رہیں گے، جمہوریت اور غیر مذہبی ریاست کے استحکام کے لیے جاری ہر کوشش ہمیں اُن کی یاد دلائے گی اور مشکلات میں ڈھارس دے گی۔ سوشلزم کی طرف ہر قدم میں اُن کی للکار ہم سنتے رہیں گے۔ مشترک تہذیب کے ہر رنگ سے وفاداری کے لیے ہمیں ہر وقت اُن کی مثال کو سامنے رکھنا ہوگا، ہر قومی زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع دینے کے لیے، ہمیں ان کے ہر مشورے پر عمل کرنا ہوگا۔ ماضی کی شاندار اور صالح روایات کو اپناتے ہوئے نئے صنعتی دور کی بساط میں اپنی جگہ محفوظ کرنے کے لیے ہمیں جواہرلال کے بنائے ہوئے خطوط کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کے ترانے گانے کے لیے ان کے الفاظ سے گرمی لینی ہوگی، بیرونی خطروں سے ملک کو محفوظ رکھنے کے لیے ملک کو طاقتور بنانے کے مشن میں اُن کا عزم، ان کا حوصلہ یاد آئے گا۔ رزم ہو یا بزم دونوں میں پاک دلی و پاکبازی کے لیے بھی ان کی مثال سامنے رکھنی پڑے گی۔

جواہرلال نہرو نے ہندوستان کو اتنا کچھ دیا ہے کہ رہتی دنیا تک ان کا کام اور نام زندہ رہے گا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اب تک جب بھی ملک پر وقت پڑا انھوں نے ہماری رہنمائی کی اور ہر مشکل کا مقابلہ کیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ان کے تصور حیات، ان کی سماجی اقدار، ان کے اخلاقی جذبے، ان کی جامعیت، ان کی اَن تھک خدمت اور گرم و گداز طبیعت کو اپنا رہنما بنائیں۔ اُن کی طرح اپنی زندگی کے ہر لمحے کو ملک و قوم اور انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ جمہوریت اور غیر مذہبی ریاست کی تعمیر کو ایسا مستحکم کر دیں کہ کوئی آندھی اسے زیر و زبر نہ کر سکے۔ سوشلزم کی منزل کی طرف تیزی سے بڑھیں اور ملک کی یکجہتی کو ہر حال میں قائم رکھیں۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ جواہرلال کے لیے ہمارا سوگ جذباتی اور رسمی ہو کر رہ جائے۔ ان کی جدائی پر صدمہ قدرتی ہے اور اس غم میں آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جاری نہ ہو تو تعجب ہے۔ مگر ہمیں آنسو پونچھ کر جواہرلال کے مشن کی تکمیل میں لگ جانا ہے کیوں کہ یہی جواہرلال کے ساتھ ہماری محبت کا حقیقی ثبوت اور یہی ان کی گراں قدر خدمات کا صحیح اعتراف ہوگا۔

جواہرلال نہرو نے ہمیں جے ہند کہنا سکھایا تھا۔ اس لیے جے ہند پر ہی، ہم اس اکھڑی اکھڑی اور بے ربط تحریر کو ختم کرتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا سانحہ ہے کہ ابھی اپنے حواس مجتمع کرنا کم از کم میرے بس میں تو کیا، ان سب لوگوں کے بس میں نہیں جن کے لیے ان کا وجود زندگی کے ہر موڑ پر ایک مشعل راہ سا تھا، جن کے لیے جواہرلال کی پُرسوز شخصیت تسکین اور تقویت کا باعث تھی اور جو اس سے اس طرح محبت کرتے تھے کہ ہر رشتہ اس رشتے کے سامنے ہیچ تھا۔ جواہرلال نہرو زندہ باد۔ جے ہند

کرشن چندر

سب تمھارے بیٹے

دل کانپتا ہے۔ قلم رکتا ہے۔ کیسے کہیں وہ مرگیا، جس نے ہمیں زندگی دی۔ کیسے کہیں وہ آج ہم میں نہیں ہے، جو آج ہم سب میں موجود ہے۔ جس نے ہمارے ذہن کو سنوارا، ہمیں سیاسی بلوغت عطا کی، جو ہمارے عہد کی سب سے بڑی شخصیت تھی۔ کیسے کہیں وہ روشنی بجھ گئی؟ کیسے کہیں اب ہم اس اچکن کا گلاب کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔

دل کانپتا ہے اور بہت دور رہتا ہے۔ لاہور کے بریڈلا ہال میں انڈین نیشنل کانگریس کا جلسہ طے ہو چکا تھا۔ اسی لیے ہم نے لاہور اسٹوڈنٹس یونین کی طرف لاجپت رائے ہال میں طلبا کا ایک جلسہ منعقد کیا تھا، جس میں نہرو جی کو آنے کی اور طلبا کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ ایک طرف چند سر پھرے نوجوانوں کا جلسہ تھا۔ دوسری طرف کانگریس ایسی باوقار انجمن کی پیش کش تھی۔ مرحوم ڈاکٹر ستیہ پال، صدر پنجاب نیشنل کانگریس نے سن کر کہا "پنڈت جی تمھارے جلسے میں نہیں آئیں گے۔" ہمارا خیال تھا وہ آئیں گے، آئیں گے اور ضرور آئیں گے اور پنڈت جی آئے اور دیر تک پچاس ساٹھ جوشیلے نوجوانوں کی ٹولی سے بےتکلفانہ گفتگو کرتے رہے۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر ستیہ پال بھی تھے۔

ڈاکٹر ستیہ پال پنڈت جی کی گفتگو کے دوران میں بار بار گھڑی دیکھتے تھے اور ہمارے سوال تھے کہ ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب نے پنڈت جی کے کان میں کہہ دیا "بریڈلا ہال کے جلسے میں بہت سے لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

پنڈت جی اس پر بھڑک گئے۔ ہونٹ چباتے ہوئے بولے "وہ انتظار کرتے ہیں تو کرتے رہیں۔ میرے خیال میں یہ جلسہ زیادہ ضروری ہے!"

ہم نوجوانوں کے سینے گز گز بھر پھول گئے۔ ہم نے بڑے فخر سے پنڈت جی کی طرف دیکھا۔ پھر ڈاکٹر ستیہ پال کی طرف جو اس غیر متوقع حملے سے ذرا بجھ سے گئے تھے۔ پنڈت جی پھر مسکرا کر نوجوانوں سے باتیں کرنے لگے۔ باتیں انقلاب کی، باتیں سوشلزم کی، باتیں آزادی کی، باتیں افریقہ کی، چین کی، جاپان کی، جنوبی امریکہ کی، امپیریلزم سے لڑنے کی، ساری دنیا کے غریبوں کے دکھ دور کرنے کی۔ آج یہ باتیں بہت معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ وہ ہمارے ذہن اور شعور کا حصہ بن چکی ہیں لیکن اگر کوئی بھی پڑھنے والا غور سے سوچے، پوری طرح پیچھے جائے تو اس کے ذہن میں کہیں نہ کہیں [illegible]

اٹھے گا کوئی ایسا فقرہ یا جملہ جس نے ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ صرف ہندوستان کی آزادی تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ اسے ساری دنیا کے مسائل سے باندھ دیا تھا۔ پنڈت نہرو بلاشبہ سب سے پہلے ہندوستانی تھے۔ مگر وہ جب تک جیے، ہندوستان سے باہر کی دنیا کے درمیان ایک پل بن کر جیے۔ کون ہے جو اس پل پر نہیں چلا ہے؟ نہرو سے محبت کرنے والے نہرو کو پسند کرنے والے، نہرو سے جلنے والے، سب اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں، اپنی ذہنی اور سیاسی زندگی کے کسی موڑ میں اس پل پر چلے ہیں۔ اور آج جب اس پل کی محرابیں ٹوٹ گئی ہیں، ہم اس بوجھ کو محسوس کرسکتے ہیں، جس نے نصف صدی تک اپنے کندھوں پر اس بارِ عظیم کو اٹھایا تھا۔

نوجوان چہرہ

لاجپت رائے بھون کی اس چھوٹی سی سیاسی محفل میں سب سے پہلے میں نے پنڈت جی کو اتنے قریب سے دیکھا۔ سفید براق اچکن، سفید چوڑی دار پاجامہ، اور نازک کلائی پر خوبصورت سی گھڑی، شعلے کی طرح بھڑکتا ہوا حساس چہرہ، کبھی اونچی نخوت سے معمور، کبھی دلکش تبسم سے مسحور کردینے والا کتنا نوجوان چہرہ تھا وہ! لوگوں نے نہرو کی نوجوانی کو دیکھا۔ ہم نے اس کا کوئی دوسرا چہرہ نہیں دیکھا۔ ماہ و سال گزرتے گئے، ملک آزاد ہوا، ملک کی تقسیم ہوئی، ملک آگے بڑھا، ملک پیچھے ہٹا، ملک پر حملہ ہوا، مگر ہم نے نہرو کا کوئی دوسرا چہرہ نہیں دیکھا۔ لوگ کہتے ہیں اور یہ فوٹوگرافر تصویریں دکھاتے ہیں کہ نہرو کے چہرے پر لکیریں اور جھریاں آگئی ہیں۔ مگر ہم نے آج تک نہرو کے چہرے پر کوئی جھری اور لکیر نہیں دیکھی۔ زندگی سے موت تک ہم نے صرف ان کا بے داغ چہرہ دیکھا ہے، اور دشمنوں کا کوئی حربہ اور موت کا کوئی ڈر اس کے چہرے کو ہمارے دل سے نہیں بھلا سکتا! نہرو کی نوجوانی سدا بہار تھی اور آج جو ہم روتے ہیں تو اس لیے نہیں روتے کہ ہمارا وزیر اعظم مرگیا۔ ہم اس لیے روتے ہیں کہ ایک نوجوان مرگیا! جو اگر اور جیتا تو ہمارے وطن کے سنگ و خشت میں ایک گلزار کھلاتا . . . . !

نہرو کی ساری زندگی سیاست میں گزری، مگر میرے خیال میں نہرو کا دل اندر سے ایک شاعر کا دل تھا۔ ایک سیاسی آدمی کا دل نہیں تھا . . . . ایک ادیب کا دل تھا، ایک سیلانی کا دل تھا، ایک عاشق کا دل تھا، ایک سپنے دیکھنے والے کا دل تھا۔ سیاست کی بھاؤ تاؤ کرنے والی محفل شری میں وہ سب سے الگ تھلگ آزاد اور منفرد نظر آتا تھا۔ اس کی آواز کے لہجے، اس کی نظر کی وسعت، اس کی سوچ کی ادا سب سے نرالی تھی۔ اگر ملک غلام نہ ہوتا، اگر حالات مختلف نہ ہوتے تو ممکن ہے وہ "ہندوستان کی دریافت" کے بعد دوسرے ملک بھی دریافت کرتا۔ مگر اس کے سامنے اور اس کے لاکھوں ہم وطنوں کے سامنے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ جس کے دل کی شاعری انھیں کشاں کشاں انگریزوں کے جیل کی طرف کھینچ کر لے گئی۔ بہت سے لوگوں نے نہرو کو ہیملٹ کہا ہے۔ مگر کیسا ہیملٹ تھا وہ کہ جب اس نے برطانوی حکومت کے سینے میں اپنی تلوار اتاری، اس نے صرف اپنا کتھارسس نہیں کیا، پوری انگریز قوم کا کتھارسس کردیا۔ یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ نہرو کے دشمن

بہت تھے، مگر وہ کسی کا دشمن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب چین نے دوستی کے پردے سے چھپ کر ہم پر وار کیا تو نہرو کا خون ہو گیا۔ اس کی زبان سے پہلا جملہ جو نکلا وہ یہ تھا "یہ ایک غیر شریفانہ فعل ہے!" (INDECENT ACT) بیاسی لوگ آج بھی اس جملے پر ہنستے ہیں۔ لیکن اس جملے کی بلاغت کو صرف وہی سمجھ سکتا ہے جس کے سینے میں ساری دنیا کا غم پنہاں ہوں، جس کے دل کی وادیاں پیکنگ سے ماسکو اور نیویارک سے لندن تک پھیلی ہوتی ہوں، جس نے کبھی ایک متحد اور ایک عالمگیر انسانیت کا خواب دیکھا ہو، صرف وہی لوگ اس کے خفتہ درد کو سمجھ سکتے ہیں۔ جن لوگوں کے لیے سیاست پیشہ ہے یا روزگار ہے وہ اس جملے کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔

دل کی ارتھی

نہرو کو اپنی زندگی میں کیا کچھ نہیں ملا۔ فطرت نے خوبصورتی دی، جنتا نے پیار دیا، حالات نے طاقت دی، مگر کیسا عجب آدمی تھا وہ؟ اس نے اس خوبصورتی، اس پیار، اس طاقت کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کے کان ہمیشہ زمین سے لگے رہے، دل ہمیشہ عوام کے دل کے ساتھ دھڑکتا رہا، روح آسمانوں میں پرواز کرتی رہی۔ اس کی کمزوری یہ تھی کہ وہ حاکم نہیں تھا، وہ ایک دوست تھا، ایک مشیر تھا، ایک ٹیچر تھا، زیادہ سے زیادہ ایک باپ تھا۔ مگر کیسا باپ جسے صرف اپنی بیٹی اندرا سے پیار رہا بلکہ اپنے ملک اور اپنے ملک سے باہر لاکھوں کروڑوں بچوں کی زندگی سے اور ان کے مستقبل سے پیار رہا۔ آج جب ہم میں سے ہر شخص اپنے دل میں اس کی ارتھی اٹھائے چل رہا ہے، جی چاہتا ہے اس سے کہیں۔ ہمیں چھوڑ کر دور چلے جانے والے ہم سب تیرے بیٹے ہیں، ہم تیرے نام کو بدنام نہ کریں گے، تیرے گھر کو نہ اجاڑیں گے، تیرے سپنوں کو اپنی جد و جہد کا خون دے کر زندہ رکھیں گے۔

نہرو اقلیتوں کے لیے بہت نرم دل تھے۔ ان کا زاویۂ نگاہ ایسا تھا جو ایک عالمگیر انسانیت کی بنیاد رکھنے والا ہی جان سکتا ہے۔ نہرو کے پاس وہی سمجھ تھی جو فرقہ واریت سے بہت اونچا اڑتی ہے اور ہر اقلیت کے دکھ اور درد کو پہچانتی ہے۔ نہرو کو معلوم تھا کہ صرف دستوری تحفظ ہی سے کسی اقلیت کا تحفظ نہیں ہو سکتا۔ دستور کی دفعات بے روح ہیں جب تک ان میں عملی اقدام کی روح نہ دوڑے، جب تک ان سے انسانی ہمدردی، اخوت اور ہمسائیگی کی مہک نہ آئے۔ جس ملک میں پانچ کروڑ مسلمان رہتے ہوں، ایک کروڑ عیسائی رہتے ہوں، ایک کروڑ سکھ رہتے ہوں اور چھ کروڑ ہریجن رہتے ہوں، اس ملک کی سیاست کو نرم دلی، وسیع النظری، باہمی رفاقت اور ہمدردی کی کتنی ضرورت ہے اور اپنے ملک میں اس کی کتنی کمی ہے، اس کا مکمل اندازہ نہرو کو تھا، اور آج جب چرچ گیٹ کی پتھریلی دیوار سے لگے میں نے ایک مسلمان بڑھیا کو روتے دیکھا تو میں سمجھ گیا کہ اس حادثے سے خوف و ہراس کی سب سے تیز رو برق کس پر گری ہے یا صدیوں کی غلامی نے ہمارے قویٰ مضمحل کر دیے ہیں اور ہمارے فکر و عمل کے دائرے میں وہ سست رفتاری پیدا کر رہی ہے۔ اس برصغیر میں بہت کم پورے آدمی پیدا ہوتے ہیں زیادہ تر آدھے آدمی پیدا ہوتے ہیں یا تین چوتھائی آدمی یا ایک چوتھائی آدمی مگر پورے

آدمی بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ مگر نہرو ایک پورا آدمی تھا جو زندگی کے مختلف شعبوں پر بڑی قادر الکلامی سے حاوی تھا۔ پرانے ہندو رشیوں سے اس نے سیوا اور خدمت کا جذبہ لیا۔ ہندو اور مسلمان کی ملی جلی معاشرت سے زندگی کے مہذب انداز سیکھے مارکس اور لینن سے سوشلزم کی روشنی حاصل کی۔ گاندھی سے عدم تشدد اور عمل میں سچائی کی تلاش کو اپنایا اور ان سب کو ملا کر اپنا راستہ تلاش کیا۔ لوگ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں، اس کی کمزوریوں پر انگلی رکھ سکتے ہیں اس کے عمل کی سست رفتاری پر جزبز بھی ہو سکتے ہیں مگر نہرو کے خلوص اس کی سچائی، دیانت داری، عوام سے اس کی گہری محبت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اس سے بھی انکار کرنا مشکل ہے کہ وہ ایک پورا آدمی تھا اور ایک آدمی نہیں تھا بہت سے پورے آدمی تھا۔ اس کی نگاہ صرف سیاست پر نہیں تھی، سائنس پر بھی تھی، ادب پر بھی، کلچر پر بھی، تاریخ پر بھی معاشیات پر بھی، سنگیت پر بھی اور رقص پر بھی کرکٹ کو بھی پسند کرتا تھا اور روسی سنگر کی موسیقی کا بھی رسیا تھا اور روسی بیلے کا بھی عاشق تھا۔ وہ ہولی بھی کھیلتا تھا اور بچوں کا گھوڑا بھی بن جاتا تھا، اور دوسرے لمحے عالمگیر مسائل کو نہایت سنجیدگی سے سلجھانے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ ایسی پہلودار اور ہمہ دار شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے اور جب پیدا ہوتی ہے تو جغرافیائی حدود توڑ کر ساری دنیا کی ہو جاتی ہے اسی لیے آج جو ہمارا غم ہے وہ ساری دنیا کا غم ہے۔ آج صرف ہندوستان کا جھنڈا سرنگوں نہیں ہے، پوری انسانیت کا جھنڈا سرنگوں ہے!

یہ سچ ہے کہ نہرو نے بہت سے کام ادھورے چھوڑے ہیں، مگر ایک آدمی دن میں اٹھارہ گھنٹے کام کر کے بھی کتنا کام کر سکتا ہے؟ صدیوں کی غلامی کے اثرات سترہ سال کے قلیل عرصے میں دور نہیں ہو سکے، کیوں کہ کام بہت ہے اور وہ چلا گیا ہے۔ اور غریبی اور جہالت خویش پروری اور سرمایہ داری منہ پھاڑے ہمیں ہڑپ کر جانے کو کھڑی ہیں اور وہ چلا گیا ہے اور رہگزاروں پر لوگ بھیک مانگتے ہیں اور یتیم دانے دانے کو ترستے ہیں اور وہ مسلمان بڑھیا چرچ گیٹ کی دیوار سے ٹیک کر کھڑی رو رہی ہے۔

ایسے میں تو چلا گیا ہے۔ پر ہم تیری یاد کو زندہ رکھیں گے۔ تیرے کام کو آگے بڑھائیں گے، تیری نظر کی وسعت کو سمیٹ لیں گے۔ ہم تیری مٹی کی قسم کھا کر کہتے ہیں ہم کبھی تجھ سے بے وفائی نہ کریں گے۔ ہماری یاد میں تیری اچکن کے گلاب سدا کھلیں گے۔

"زندگی ریت سہی درد کا چشمہ بھی تو ہے"

باقر مہدی کا صحیح معنوں میں شعری مجموعہ

ریت اور درد

(زیر طبع)

قاضی عیاذ انصاری

بادِ نوبہار ــ جواہر لعل نہرو

جمہوریۂ ہند کے نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے الہ آباد کے سنگم پر پھول بہائے جانے کی رسم کے بعد کی تعزیتی تقریر میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو کی محبوبیت کا ذکر کیا تھا جو ابھی تشنۂ تفصیل ہے۔ انھوں نے کہا تھا "وہ عاشق تھے اس وطن کے اور خود محبوب تھے اس وطن کے باسیوں کے۔" میں سمجھتا ہوں عشق، عاشقی اور محبوبیت کے اس مثلث میں جواہر لعل کی شخصیت کا سب سے نمایاں خاکہ ابھر کر نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ اس میں عظمت بھی ہے اُن کے قامت کی جس کے لیے دنیا کے انقلابی اور سیاسی لیڈروں میں لینن اور واشنگٹن کے سوا کوئی تیسرا ان کے مدمقابل نظر نہیں آتا اور وہ معصومیت و محبوبیت ہے جس کی جھلک ہمیں کبھی قرۃ العین اور کبھی جوان آف ارک کی مخلص نڈر اور بے خوف سیرتوں میں نظر آتی ہے۔ وہی حیات نو کا مژدہ بادِ نوبہار، نئی زندگی کی مسکراہٹ، کبھی تعمیر و ارتقاء کا جلال تو کبھی نشاطِ تخلیق کا جمال، صبح امید کی سب سے شوخ کرن جس کی کلپنا شاعر نے یوں کی تھی ؎

اک شوخ کرن شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب

یہی وہ شوخ کرن تھی جس نے پھر ہند کی تاریک فضاؤں میں فکر و نظر کے چراغ جلائے۔ امنگوں اور ولولوں کو انگیز کیا کہیں وہ ستارہ بن کر چمکی تو کہیں قافلوں کی رہنمائی میں وہ کہکشاں بن گئی تو کہیں مہتاب آسا ظلمتوں میں نور کے جلوے دکھاتی رہی۔

شاعر کے جمالیاتی تجربہ میں، اس کے استعاروں میں اور کنایوں میں اس کرن کا افادی پہلو صاف جھلک رہا ہے۔ ممکن ہے شاعرِ امید کی تخلیق میں جواہر لال کے کردار کی شوخی کا محض توارد ہو اور وہ محض اتفاقی ہو۔ یہ کام اردو ادب کے طالب علموں کا ہے کہ وہ اس نظم کی نفسیاتی تحصیل کرتے رہیں۔ میں فی الوقت اس نظم کے کچھ حصہ کو جواہر لعل کی محبوبیت کا کرشمہ سمجھتا ہوں۔ نظم کو ایک مرتبہ پھر پڑھیے تو کسی ایسی ہی زندگی کا خاکہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے جو جواہر لعل کی زندگی نہ بھی سہی اس سے قریب تر ضرور ہے اور وہ دوسری زندگی کونسی ہے، اس کا کسی کو علم نہیں۔

شاعر اور ادیب اپنی تخلیق کو کتنا بھی رمز و کنایہ میں پیوست کر دے پھر بھی الفاظ کے انتخاب میں اس کے

تخیل کا افادی اور عملی پہلو نمایاں رہتا ہے شعاعِ امید کی تخلیق کا زمانہ کہیں نہ کہیں ۱۹۲۹ء، ۱۹۳۰ء کے ادھر اُدھر متعین کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ جواہر لعل کی سیماب پائی اور آرام سے فارغ زندگی علامہ کے تحت الشعور میں رچی ہوگی.

تحت الشعور اور لاشعور کی بھول بھلیوں کا حال ابھی ہمیں بہت تھوڑا معلوم ہو سکا ہے. ہم نہیں جانتے کہ جذبہ اور تخیل کی ہم آمیزی سے جو نفسیاتی کیفیت ظہور میں آتی ہے فکر سے اس کا کیا تعلق ہے اور پھر اس سارے عمل سے شاعر اور ادیب کس طرح زبان و الفاظ کے ذریعہ اظہار پر قادر ہوجاتا ہے ظاہری اسباب پر نظر ڈالیے تو شعاعِ امید کی تخلیق کے ساتھ ساتھ جواہر لعل کی محبوبیت کا متوازی تصور دور دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے یہی وہ زمانہ تھا جب جواہر لعل کی زندگی میں عشقِ وطن کے وہ عناصر پختہ ہو رہے تھے جن کے بل پر وہ مردانِ گراں خواب کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگانے میں اپنی توانائی کو صرف کرتے رہے.

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

۱۹۳۰ء ہی کے ادھر اُدھر ان کی محبوبیت بن سنور کر حسن و شباب سے مزین ہندوستان گیر ہوتی جارہی تھی. گاندھی جی نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی کامیابی پر جواہر لعل کے سر سہرہ باندھتے ہوئے لکھا تھا.

پیارے جواہر - دعائیں - تم نے بڑی بہادری کا کام انجام دیا، خدا تمہاری عمر دراز کرے، مری دعا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا سہرا بھی تمہارے سر ہو. کتنے محبت بھرے یہ الفاظ تھے اور کتنی عظیم یہ پیشن گوئی تھی. ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے لاہور میں جب مکمل آزادی کا اعلان کیا تو زندہ دلانِ لاہور نے اپنے محبوب لیڈر کی پذیرائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی. راوی کے کنارے گھوڑے پر سوار وہ محبوبیت کے پورے لوازمات کے ساتھ، نے نوازی کرتا ہوا لاکھوں انسانوں کا من موہ رہا تھا.

قومی تاریخ کا مورخ چاہے تو کانگریس کے لاہور سیشن کو اور مکمل آزادی کے اس ریزولیوشن کو جنگِ آزادی کا ایک اہم موڑ کہتا رہے، میرے نزدیک تاریخ کے اہم موڑ سے زیادہ جواہر لعل نہرو کی زندگی کا یہ ایک زریں واقعہ بھی ہے جس کے پس منظر میں تاریخی شخصیت سے زیادہ وہ آرٹ کا ایک حسین مجسمہ نظر آتے رہے ہیں. آج پینتیس ۳۵ سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی محبوبیت کے یہ نقوش مری طرح ہزاروں لاکھوں قلوب پر ثبت ہیں.

میری طالب علمی کا زمانہ تھا ۱۹۳۲ء، ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے پنڈت جی کچھ وقفہ کے لیے جیل سے باہر آئے تھے اور وہ طوفانی دورہ کر رہے تھے جب نوجوانوں کو خاص طور پر انھوں نے اپنا مخاطب بنایا تھا. علی گڑھ میں یہ سر راس مسعود کی وائس چانسلری کا زمانہ تھا. رات میں کسی وقت اقامت گاہوں میں یہ خبر گشت کر گئی کہ صبح کو میل سے پنڈت جواہر لعل نہرو تشریف لا رہے ہیں. طالب علموں کی ٹولیاں صبح ہی سے ریلوے پلیٹ فارم پر جمع ہوتی رہیں اور دس بجتے بجتے سارا کالج ریلوے اسٹیشن پر امڈ آیا. نظم و نسق کے اعتبار سے کالج کا یہ دور بڑا اہم تھا. رحمت اللہ کمیٹی کی سفارش پر علی گڑھ کے بگڑتے حالات کو سنوارنے کی خاطر انگریز نے خصوصی اختیارات دے کر سر راس کو کالج کا وائس چانسلر مقرر کیا تھا. ان کی موجودگی میں جواہر لال کے استقبال کا ہنگامۂ شوق

کالج کی تاریخ کا ایک زریں ورق ہے تو خود سر راس کی زندگی میں یہ طلبا دوستی کا ایک نقرئی واقعہ بھی ہے۔ انھوں نے کالج کی دور رس مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر، بذات خود اسٹیشن پہنچ کر جواہر لعل کے استقبال میں لڑکوں کا ساتھ دیا۔ جواہر لعل زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ لڑکوں کا اصرار تھا کہ وہ پنڈت جی کی گاڑی کو کھینچ کر کالج تک لے جائیں گے لیکن خود جواہر لعل جیسے ترقی پسند انسان کو یہ کب گوارا تھا۔ سر راس انھیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر وائس چانسلر لاج لے گئے، اور طلبا کا مجمع ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ وقت کا تعین جلسہ کا اعلان کچھ بھی تو نہ ہو سکا تھا۔ اس کشمکش و پیچ میں کچھ دیر ہی گزری تھی کہ کالج کی فضا میں پھر تموج سا پیدا ہوا اور ہر شخص اسٹریچی ہال کی طرف جاتا ہوا نظر آنے لگا۔ سر راس نے بہ نفس نفیس پنڈت جی کو ان کے ایثار و قربانی اور ان کی حب الوطنی پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان سے طلبا کو خطاب کرنے کی درخواست کی پنڈت جی کی تقریر ہوئی، نعروں اور تالیوں کی گونج میں۔ طلبا علی گڑھ اور سر راس کو اس فراخدلی اور بے باکی پر انھوں نے دلی مبارک باد دی کہ طلبا سے خطاب کرنے کا انھیں ایسا موقع دیا گیا۔

آج کی فضا میں یہ واقعہ بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ وہ وقت تھا جب ہم انگریز کی حکومت کے شکنجے میں پوری پوری طرح کسے ہوئے تھے۔ حکومت سے بغاوت کرنے والے اور اس بغاوت کے علمبردار خصوصی پنڈت جواہر لعل کی پذیرائی بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کو اس کی جرارت نہ ہوئی تھی کہ باغی جواہر لعل کو بطور خاص مدعو کرنے کی پہل کرے یہ فخر علی گڑھ اور صرف علی گڑھ کو حاصل رہا ہے کہ اس نے حوادثات کے تمام اندیشوں کو پس پشت ڈال کر اپنے محبوب لیڈر کی پذیرائی کی۔ ان کی محبوبیت کا یہ ایک رخ تھا۔ جواہر لعل کی زندگی میں سینکڑوں ہزاروں زاویے ایسے ملتے ہیں جن سے ہم اس محبوبیت کو محسوس شکل میں دیکھ سکتے ہیں تقسیم ہند سے کچھ پہلے قوم پرور مسلمانوں کی طرف سے دلی میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کا اعلان ہوا، اردو پارک کے وسیع میدان میں دلی کی پبلک امنڈ آئی تھی۔ ہزاروں کا مجمع تھا، رات کے بارہ بجے ہوں گے، شاہ صاحب کی تقریر کا رنگ جما تھا، ان کی جادو بیانی شباب پر تھی کہ اچانک کسی نے ڈائس کے پیچھے سے پنڈت جواہر لعل نہرو زندہ باد کا نعرہ لگایا، اور ساتھ ہی پنڈت جی کا مسکراتا چہرہ سامنے تھا وہ بلا اطلاع جلسہ میں تشریف لے آئے تھے۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب لارڈ ویول کی نگرانی میں مسلم لیگ کے نیتا پاکستان کی جڑیں مضبوط کر رہے تھے۔ انتشار کی باد سموم سے ہندوستان کی فضا مکدر تھی، مسلمانوں کی ترقی پسند جماعتیں شکست کھا چکی تھیں رجعت پسندوں کا زور تھا۔ دو قوموں کے نظریہ کا زہر لوگوں کے روئیں روئیں میں سرایت کر چکا تھا۔ ڈائس پر پنڈت جی کی جے کا ایک اور نعرہ بلند ہوا، ایک اور . . . . اور پھر بے چینی کی ہلکی سی ایک لہر مجمع پر دوڑ گئی جمعیۃ کے رضاکار اور احراری بلا ارادہ سمٹ سمٹ کر ڈائس پر جانے لگے اور جلسے کے کرتا دھرتا ایک لمحہ کے لیے حواس باختہ ہو گئے۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر پنڈت جی کی جے کاروں میں جناح صاحب کے دو قوموں کے نظریہ کو کھلا چیلنج محسوس کر رہے تھے اور اس کے خطرناک اثرات سے مرعوب ہو رہے تھے۔ مجمع میں ایک ادھیڑ عمر کا بدھائی قوم پرور مسلمانوں کی اس نفسیاتی کشاکش سے متاثر بے چین بلا ارادہ ادھر ادھر جھانکتا پھر رہا تھا، ڈائس پر بیٹھے پنڈت جواہر لعل نہرو کے پرسکون چہرہ پر یکایک اس کی نظر پڑی، وہ رکا

ایک لمحہ کے لیے بالو شجاعت نے شجاعت سے کچھ کہا اور وہ بے اختیاری کے عالم میں مجمع کی طرف مخاطب ہوکر آواز دینے لگا.

"بندھانی بندھانی سب جلسے سے باہر آجائیں"۔ ہرنوں کی طرح پچیس تیس نوجوان کندھے پھلانگتے ہوئے مجمع سے باہر آگئے۔ بوڑھا بندھانی اب ایک لیڈر تھا جو اپنے جوانوں کو ہدایت دے رہا تھا۔ میں نے گھبرا کر بوڑھے بندھانی سے پوچھا۔ "ملاں جی۔ خیر تو ہے۔ آپ نے تو سب کو گھبرا دیا"۔ حریفانہ انداز میں بوڑھا میری طرف پلٹا لیکن جمعیتہ کے نشان کو میرے سینہ پر آویزاں دیکھ کر پھر وہ ملتفت ہوگیا۔ "آپ نہیں جانتے لیگ کے نیشنل گارڈ بھی مجمع میں موجود ہیں۔ لہجہ کی تلخی کو ذرا نرم کرتے ہوئے اس نے کہا "ایسے میں اگر کسی کی زبان سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو عمر بھر کو کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا"۔ میں نے بندھانی کے جوش کو ذرا کم کرنے کے لیے اعتراضاً کہا۔ "زبان کس کس کی پکڑتے پھروگے ملاں جی"۔ میری چھاتی پر آویزاں جمعیتہ کے تمغے کو اس بار مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بوڑھے نے میری طرف سے منہ پھیر لیا اور اپنے جوانوں کو ہدایت دینے میں معروف ہوگیا۔ "پھیل جاؤ جلسے کے چاروں طرف۔ غنڈہ گردی نہیں چلے گی۔ نہیں چلے گی"۔ پنڈت جی کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے چار جوانوں کو ڈائس کی طرف جانے کے لیے کہا اور ساتھ ہی بڑے جوش میں ان کو تاکید کی کہ حفاظت کرتے ہوئے اگر کسی نے پیٹھ دکھائی تو ایسے کپوتوں کو بندھانیاں دودھ نہیں بخشتی"۔ آناً فاناً میں ان نوجوانوں نے سارے جلسے کو اپنے حصار میں لے لیا، ایسا محسوس ہونے لگا کہ باقاعدہ کسی فوجی دستے نے مجمع کو گھیرے میں لے لیا ہے۔

شاہ صاحب کی تقریر جاری رہی، نعرے لگتے رہے، جلسہ گرم رہا، اور پنڈت جی تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔ اگلے دن دلی کے قومی پریس میں جلسے کی کامیابی پر موٹی موٹی سرخیاں چھپیاں کی گئیں۔ کسی نے پنڈت جی کی شخصیت، کسی نے شاہ صاحب کی سحر بیانی پر اس کامیابی کو محمول کیا لیکن راز کی یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اردو پارک کے اس جلسے میں پنڈت جی کی ذات کے ساتھ بندھانیوں کی وہ محبت شامل ہوگئی تھی جس نے انھیں بروقت خطرہ سے آگاہ کر دیا اور وہ جان پر کھیل کر لیگ کے شر پسند عناصر کو مرعوب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اب نہ جواہر لعل ہیں، نہ عطاء اللہ شاہ بخاری، نہ قوم پرور مسلمانوں کے جلسے ہیں اور نہ سرفروش بندھانی۔ خود بندھانیوں کے متعلق بھی اب کسے معلوم ہے کہ وہ کون تھے، اور جواہر لعل سے ان کی یہ والہانہ محبت کیوں تھی۔ نئی اور پرانی دلی کے حدِ فاصل پر ملتانی ڈھانڈے میں بیں، رہنے والے مزدور بندھانی کہلاتے تھے۔ چھوٹی سی بستی، سادہ سی زندگی، ٹوٹے پھوٹے مکان، ٹھیلوں، تانگوں اور ریڑیوں کی قطاریں۔ دن بھر محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے والے اور رات کو سکون سے پاؤں پسار کر سونے والے وہ زندگی کے کسی ایسے موڑ پر نہیں رکے جہاں نئی اور پرانی زندگی نے میل کھایا ہے۔ نیلی تہ بند، ڈھیلا کرتا اور سر پر پانچ گز کی پگڑی ملتانی ڈھانڈے کا یہی گویا قومی لباس تھا۔ اپنے دروازے پر حقہ لیے بوڑھا بندھانی دو چار نوجوانوں کے گھیرے میں بیٹھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ نئی دلی کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہو "ہم نے ہی اس دلی کو جنم دیا ہے۔ اس حسین عشرت کدہ کو ہمارے ہی مضبوط ہاتھوں نے گوندھ گوندھ کر تیار کیا ہے۔ سرمایہ داروں اور مفت خوروں نے ہمارے خون پسینہ کی کمائی کے بل پر اونچے اونچے محل تعمیر کر لیے بڑے بڑے خطابات حاصل کر لیے۔ راجہ بنے، خان بہادر اور سردار بہادر کہلائے"۔ نئی دلی کی تعمیر کی کہانیاں

نانے سناتے بوڑھا ہندوستانی جوش میں آجاتا اور انگریز اور اس کی سامراجی حکومت کو وہ اپنا حریف سمجھنے لگتا، نفرت و حقارت کے چند جملے اس کی زبان سے نکلتے اور نوجوانوں کے دل و دماغ میں اتر جاتے۔ اس طرح انگریز دشمنی گویا ہندوستانی نوجوانوں کو ورثہ میں ملی تھی۔

دلّی میں کانگریس نے اپنی تحریک شروع کی تو ہندوستانی کے انگریز دشمن جذبے کو تھوڑا سکون ملنے لگا۔ اس نے سوت کی کتائی پر توجہ کی نہ وہ شراب پر دھرنا دے کر بیٹھا، سیوا سمیتی اور کانگریس سیوا دل کا وہ ممبر بھی نہیں بنا لیکن کانگریس سے اتنا الگ رہنے پر بھی وہ کانگریس کے نیتاؤں اور انگریز کے مظالم کا شکار ہونے والے ہیروز کا پرستار رہا ہے۔ بازار میں اسے کوئی جلوس نظر آتا تو وہ جلوس کی طرف کھنچ جاتا، مزدوری کی پرواہ کرتا نہ بیل ٹھیلے کو دیکھتا، جلوس پیدل چل کر بھی اس کا جی نہ بھرتا۔ بے تحاشا نعرے لگاتا، پولیس کی لاٹھیاں اور فوج کی گولیوں کے سامنے بھی سینہ سپر ہو جاتا۔ فتح پوری، گھنٹہ گھر اور فوارے کے چبوترے ہندوستانی خون کے گواہ ہیں جو آصف علی، احمد سعید اور ہمن ستیہ وتی کے پیچھے ہندوستانی نوجوانوں نے قومی تحریک کو دیا ہے۔ ہندوستانی نوجوان نے کانگریس تحریک کو اسی انداز سے اپنایا تھا کانگریس اور کانگریسی نیتاؤں سے کچھ ایسی والہانہ محبت تھی جو ان کی خشک زندگی میں میٹھے نغموں کی طرح سرایت کر گئی تھی۔ سوچتا ہوں اس روز اگر اردو پارک کے جلسے میں ہندوستانی نہ ہوتے اور ہندوستانیوں میں بھی پنڈت جی کی محبت اور عقیدت کا جذبہ اتنی شدت سے بیدار نہ ہوتا تو عالم بے ذہن کیا کچھ نہ ہو جاتا، ہندوستان کی سیاست کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ ۔۔۔ اور آنسوؤں کے ایک طوفان میں ہم گھر کر رہ جاتے۔ مجھے معاف کیجیے جواہر لعل کی محبوبیت کا ذکر کرتے کرتے میں جذبات کی رو میں غیر متعلق سی بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہوں لیکن کروں بھی کیا، حقیقت اور تصور کے ساتھ میرا واسطہ ہر قدم پر متصادم ہے۔ اب خواب کی سی کیفیت کل تک جو حقیقت تھی وہ اب تصور میں رواں دواں ہے۔ بقول جگر نظر میں ۔۔۔ سمائے ہیں۔

وہی لطافت، وہی نزاکت، وہی تبسم، وہی ترنم
میں نقش حرماں بنا ہوا ہوں وہ نقش حیرت بنا رہے ہیں
خرام رنگیں نظام رنگیں کلام رنگیں پیام رنگیں
قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں
ذرا جو دم بھر کو آنکھ جھپکی یہ دیکھتا ہوں نئی تجلی
طلسم صورت مٹا رہے ہیں جمال معنی بنا رہے ہیں

پچھلے دنوں حیدرآباد میں ان کا دو روزہ قیام تھا، نظام کالج کے وسیع لان پر ان کی تقریر تھی۔ ریڈیو کی طرف سے ریکارڈنگ کے لیے میں ڈائس پر متعین تھا۔ لاکھوں کا مجمع ان کی آمد کا منتظر تھا۔ ٹھیک ۔۔۔ بجے ان کی کار ۔۔۔ پہنچی ۔۔۔ آکر کرسی پر اپنے کام میں مصروف تھا PRIM. MINISTER کے ۔۔۔ کی جگہ، مائیکروفون ۔۔۔ مجھے اصلی ریکارڈنگ اور اس کی صحت و سلامتی ۔۔۔

چہرہ میری طرف ملتفت ہوا۔ "حیدرآبادی ہو" ان کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک شیریں آواز میرے کان میں آئی۔ "جی نہیں، میں یوپی کا رہنے والا ہوں" اپنے حواس کو بمشکل میں نے اکٹھا کرکے جواب دیا۔ "ریڈیو سے متعلق ہو" انہوں، سلسلۂ گفتگو کو بڑھاتے ہوئے کہا "جی" کہہ کر میں خاموش سا ہوگیا۔ اتنے مختصر جواب سے شاید ان کی تشفی نہ ہوئی ہو پہلو بدل کر مربیانہ انداز میں پھر انہوں نے پوچھا "یوپی میں کس جگہ کے رہنے والے ہو"۔ "سہارنپور کے ضلع میں ایک قصبہ ہے گنگوہ"۔ "اچھا اچھا مولانا گنگوہی سے کچھ تعلق ہے"۔ "جی نہیں" میں نے کہا "میرا تعلق قاضیوں کے خاندان سے ہے"۔ "قاضی مخدوم حسن صاحب سے کچھ رشتہ ہے"۔ "جی وہ میرے تائے تھے"۔ میں نے جواب دیا! "حقیقی" انہوں نے پھر پوچھا۔ "جی نہیں، میرے باپ کے وہ پھوپی زاد بھائی تھے"۔ "کیسے وضعدار لوگ تھے"۔
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ میری ذات کو بھول کر جیسے قاضی صاحب مرحوم کی یاد میں کھو گئے ہوں۔ "الہ آباد میں وہ سٹی مجسٹریٹ تھے کیسے کیسے معرکہ ان کے ساتھ رہے۔ الہ آباد میونسپل کارپوریشن کے پہلے سکریٹری بھی وہی تھے ایک طرح سے ہم لوگوں کے وہ دستوری استاد بھی تھے۔

مجھے نہیں معلوم کس حیثیت سے انہوں نے قاضی صاحب موصوف کو یہ رتبہ دیا ہوگا۔ میں آج ان کی ثقافتی برگزیدگی کا اندازہ کرکے حیرت میں رہ جاتا ہوں کہ ان کے حافظے میں ایسے دور افتادہ واقعات بھی محفوظ تھے۔ تاریخ کے عظیم تر اور اہم واقعات کی رو میں ان چھوٹے چھوٹے واقعات کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ لیکن زندگی نام ہے انہیں چھوٹے چھوٹے واقعات کے تانے بانے کا۔ یہ نہ ہوں تو پھر کیف و رنگ ہو نہ حسن و نزاکت، زندگی بے حس و بے جان سی ایک ایک مشین بن کر رہ جائے۔ سوچتا ہوں آرٹسٹ جواہر لعل کو زندگی کی ان نیرنگیوں کا کتنا شعور ہوگا کہ ایک منٹ کی مختصر سی بات چیت میں وہ زندگی کی جمالیاتی قدروں کا اتنا گہرا اثر مجھ پر چھوڑ گئے کہ اب جب کہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں بار بار ان کی مدھر آواز میرے کانوں میں رس گھولتی نکل جاری ہے اور دل ہے کہ مچل رہا ہے۔ "ایک بار پھر اس آواز کی بازآفرینی ہو۔ وہی لہجہ وہی دُھن، ایک دفعہ پھر سنتا، وہی تکلم پھر نصیب ہوتا۔ اور مسکراتا وہ چہرہ ایک مرتبہ اور دیکھ پاتا"۔ لیکن تصورات کی یہ دنیا ظواہر کی حقیقت سے کتنی الگ ہے۔ گوشت پوست اور خون کے جواہر لعل کو ہم نذر آتش کر چکے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی پوتر راکھ کو ہم نے فضا میں بکھیر دیا ہے اور اب ہم اسے کہاں پاسکیں گے ہاں ایک ہی راستہ ہے اس کی بازیافت کا اور وہ ہے تصور کا، کلپنا کا، تخیل کا اور جذبے کا۔ جواہر لعل کو ایک ادبی اور جمالیاتی قدر کی طرح ہم اپنے تصور میں جگہ دے پاتے تو پھر ان کی زندگی کو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا اور حیون موت کی شکست کا نام ہے جو ظواہر کی شکست اور تصورات کی جیت ہے۔ اب یہ کام ہمارے ادیبوں، شاعروں، مصوروں، نقاشوں کتھا کاروں، ایکٹروں، بت تراشوں اور رنگار خانوں کا ہے کہ وہ اپنے اس محبوب کی زندگی کو اپنے تصورات میں قائم رکھتے ہیں یا پھر دوسری اور زندگیوں کی طرح اسے بھی تاریخ کے خشک اور بے کیف و بے رنگ واقعات کے انبار میں گم کر دیتے ہیں۔

... "فھو المراد" ...

ظ۔ انصاری

چند یادیں

جواہرلال نہرو

(ایک تاثر — جس دن پنڈت جی کی راکھ بہائی گئی)

دریائے راوی کے کنارے ۲۹ء میں جب مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا، اس کے بعد سے اب تک، (۳۴) سال جواہرلال کی دلکش شخصیت نے ہماری نسل کے دل و دماغ میں ہنگامہ گرم کر رکھا۔ وہ ہماری روزمرہ کی زندگی کا ایک حصہ ہو گئے تھے۔ ہم لوگ "بھیا جواہرلال" کے گیت گاتے گاتے ان کی سی واسکٹ اور چپل پہننے لگے۔ ان کے جملے دُہرانے لگے اور پھر ان کی ایک ایک بات پر رائے زنی، بالآخر نکتہ چینی کرنے لگے یوں ہمارے سیاسی شعور نے آگے پیچھے کی کئی منزلیں جواہر نہرو کے دم قدم سے طے کر لیں۔

حیرت ہوتی تھی کہ یہ شخص جو اتنے بھانت بھانت کے لوگوں سے روزانہ ملتا ہے۔ ڈیڑھ دو بجے رات تک اپنے دفتر میں کام کرتا ہے، صوبوں اور مرکز کے سیکڑوں جماعتی جھگڑے چکاتا ہے۔ ایک کو بہلاتا ہے دوسرے کو ڈانٹتا ہے۔ پارلیمنٹ کے سوالوں کے جواب دیتا ہے اپنے رفیقوں کے لیے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ کئی کئی کالموں کی تقریریں کرتا ہے، پیغام لکھتا ہے، دو ہاتھ دو پاؤں کے اس ایک انسان کو مطالعہ اور سوچ وچار کا وقت کہاں ملتا ہوگا لیکن سائنس ہو یا فلسفہ، ادب ہو یا اقتصادیات، سیاست ہو یا شیئر سونک جب وہ دماغ سے اتار کر کوئی بات کہتے تھے یہی معلوم ہوتا تھا کہ بس یہ ان کا خاص موضوع ہے اور اب تک کی تمام معلومات ان کے ناخنوں میں بھری ہیں۔ وہ آخری لمحے تک بڑے باخبر رہے۔ واقعی وہ ایک شخص ہم بونوں میں دیو تھا اور اس لیے بھی ہماری محبتوں اور عقیدتوں کے ہجوم میں اس قدر تنہا رہ گیا تھا۔

وہ ایک سورما تھا جس کا چہرہ مسکراہٹ کے لمحوں میں اور چمک اٹھتا تھا۔

میں نے ایک دوست سے ذکر کیا کہ سنسکرت کی کسی قدیم کتاب میں سورما اس شخص کو کہا گیا ہے جس کے ہاتھ گھٹنوں سے نیچے تک جاتے ہوں۔ دوسرے دن ہی وہ جواہرلال نہرو کی خدمت میں گئے، انھوں نے کہا پنڈت جی، آپ کے ہاتھ تو بڑے بڑے ہیں! مسکرائے اور صوفے پر سے نوجوانوں کی طرح سیدھے کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ چھوڑ دیے، کہنے لگے، ہاں میرے ہاتھ میرے قد سے بھی لمبے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بات میری بہنیں بھی مجھ سے کہا کرتی تھیں۔ ان صاحب نے سادگی سے جواب دیا "تو پنڈت جی پھر آپ سورما ہوئے"۔ بولے "ہاں تمھیں کیسے معلوم ہو گیا کہ میں اکیلا سورما ہوں؟ ہم ہندوستانیوں میں بہت لوگ سورما ہوتے ہیں۔ تم نے کوئی سب کے ہاتھ تو ناپے نہیں"۔

جواہرلال نہرو نے وقت کی طنابیں کھینچ دیں اور نوجوانی کو پچاس سال پر پھیلا دیا۔ نوجوانوں کی سی تڑپ، زندہ دلی، علم کی پیاس، انجانی حقیقتوں کی کھوج اور جذباتیت ان میں سترہ برس کی عمر سے ستتر برس کی عمر تک باقی رہی۔

"زندگانی کی حقیقت" سمجھنے میں ان کے چوڑے سینے کے اندر "کوہکن" کا دل دھڑکتا تھا۔

"جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی"

اسے انھوں نے اپنے برتاؤ میں دکھا دیا۔ وہی جواہرلال جو کسانوں سے، مالیوں سے، طالب علموں سے، مسخروں سے ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے اپنے نواسوں سے اپنے ماتحتوں سے چھیڑ خانی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ چینی حملے کے گمبھیر لمحے میں ہمالیہ کی برف پوش چٹان بن گئے، کیا مجال جو کسی ایک حرف یا آواز سے باطن کا اضطراب جھلکتا ہو۔ جتنے زخم ہمارے نوجوانوں نے محاذ جنگ پر کھائے ہوں گے ایک ایک کا لہو جواہرلال کے سینے سے رستا تھا۔ سخت حملوں کے باوجود آئندہ کے فیصلوں پر اور ناطرفداری کی پالیسی پر اٹل رہنا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے تاریخ عالم کی لرزشیں ریکارڈ کرنے والا قلم کبھی بھول نہیں سکتا۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ایسے تھے جواہرلال! ان کی زندگی کے شبنمی پہلو کے بہت سے واقعات یاد آ رہے ہیں مجھ کو۔

ملک مسعود دلی آئے ہوئے تھے، جواہرلال نے اپنے خاص ٹیلر ماسٹر محمد عمر کو کشمیری دروازے سے بلوایا کہا کہ دیکھو ملک مسعود کے سالوں شہزادوں کے ناپ لے لو اور کمخواب کی نفیس شیروانیاں جلدی سے سی ڈالو۔ شیخ صاحب بوڑھے آدمی ہیں۔ موتی لال نہرو کی آنکھیں دیکھے ہوئے پنڈت جی سے چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتے تھے، بولے، کہ ان شہزادوں کی شیروانیاں تو خاص اپنے ہاتھ سے سی کر دوں گا صاحب! جب کہیے تیار کر دوں! پنڈت جی نے کہا۔ شیخ صاحب، آپ وعدے کے کچے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے اتنی جلدی کیسے سی سکتے ہیں! شیخ محمد عمر نے جواب دیا۔ میں خاص اپنے ہاتھ سے اس لیے سیوں گا کہ یہ سب کے سب بادشاہزادے ہیں۔ پنڈت جی بولے۔ تمھارے بادشاہ زادے کہاں سے ہو گئے۔ تمھارے بادشاہ تو وہ ہیں راشٹرپتی راجندر پرشاد! شیخ جی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اجی پنڈت جی، بس رہنے دیجئے۔ وہ تو ہمارے وطن کے بادشاہ ہیں، اور یہ ملک مسعود جو ہیں، تو یہ مکے مدینے کے بادشاہ ہیں۔ دین مذہب کے بادشاہ!

پنڈت جی نے کہا۔ اچھی بات ہے، شیخ صاحب ایسے خیالات رکھتے ہو تو اب تم کو وہیں بھیج دیا جائے گا۔ چنانچہ پنڈت جواہرلال نہرو جب سعودی عرب کے سفر پر جانے لگے تو شیخ صاحب بھی اپنی ضخیم پگڑی سمیت ساتھ ہو لیے اور اس طرح دین مذہب کے بادشاہ سے مل آئے۔

خواجہ غلام السیدین کی بیٹی کی شادی تھی، راشٹرپتی کے اے ڈی سی کرنل غفران، دولہا بنے بیٹھے تھے۔ پنڈت جی چند منٹ کو آئے۔ کرنل غفران کو پہچانا اور قریب آ کر بولے، میاں تم نے دولہن کو پہچان بھی لیا ہے یا پردے ہی میں شادی کر رہے ہو؟ سال اب یہ رواج ہے کہ دولہن کو پردے میں بدل بھی دیتے ہیں۔

نہر سوئز پر برطانیہ اور فرانس کی فوجوں کا حملہ ناکام ہوگیا۔ ادھر سے اسرائیل نے خشکی کی راہ سے بڑھنا شروع کیا۔ جواہر لال کو عرب قوم، خاص کر صدر ناصر سے خاص ہمدردی تھی۔ سخت بے چین ہوگئے۔ ٹھیک اسی روز صبح کو انجمن ترقی اردو کا ایک وفد پنڈت جی سے ملنے والا تھا۔ جب یہ وفد پرائم منسٹرس ہاؤس میں داخل ہوا۔ جواہر لال کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وفد میں جو لوگ وزیر اعظم سے خاص قربت رکھتے تھے خاص کر ممبر پارلیمنٹ بشیر حسین زیدی وہ ابھی تمہید اٹھا رہے تھے کہ جواہر لال ان پر برس پڑے۔

آپ کو ہوش بھی ہے؟ ایک انٹرنیشنل کرائسس کھڑا ہو گیا ہے۔ دنیا کی تقدیر خطرے میں ہے۔ ہم پریشان ہو رہے ہیں اور آپ آئے ہیں اردو کا رونا رونے، لے جائیے اپنی اردو کو، کیا ہے یہ اردو، اردو؟

دو منٹ میں غصہ فرو ہوگیا۔ خیال آیا ہوگا کہ میں نے خود ہی اس وفد کو ملنے کا وقت دیا، ان بیچاروں کو کیا معلوم کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے! اور پھر اتنے نرم ہوگئے، اتنے مہربان ہو گئے کہ بس۔ چلے تو اس ایک جھڑکی کے بدلے میں گویا یہ تمنا لیے گئے کہ ابھی ابھی اردو کو سرکاری زبان بنوا دیں۔

جواہر لال اپنی کمزوریوں کے لمحے میں ایک معمولی صورت اور اپنی خوبیوں میں موجودہ دنیا کی ایک مہان شخصیت لگتے تھے ان کے جلال میں بھی جمال ایسے ہی چمکتا تھا جیسے سمندر کے اوپر صاف پانی میں پورنماشی کا چاند۔ عظمت اور سادگی کا یہ عالم جوہر انھیں گاندھی جی سے بھی کئی قدم آگے لے گیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ مہاتما بدھ کے بعد ڈھائی ہزار برس کی تاریخ میں یہ اکیلا آدمی تھا جس نے سمندر متھ کر نیلا زہر حلق میں انڈیل لیا، رائج الوقت مذہبوں کے عقائد سے صاف انکار کیا، سیاسی توڑ جوڑ کی جگہ سچ کو اور مذہبی عقائد کی جگہ اخلاقی برتاؤ کو دی۔ اس پر بھی ایک بہت پرانے مذہبی ملک ہندوستان نے اسے اوتاروں کے سنگھاسن پر بٹھا دیا۔ اسے پیمبروں کی طرح پوجا گیا اور جب وہ گرا تو معلوم ہوا کہ بد عنصر کو موت کے دیوتا نے پچھاڑ دیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں تاریخ اپنے آپ کو ہرگز نہیں دہرانے والی۔

عالموں، ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں اور سائنس دانوں پر اکیلے جواہر لال اس قدر توجہ کرتے تھے جتنی کسی ایک بڑی اور ترقی یافتہ قوم کو کرنی چاہیے۔ ماسکو کے ہندوستانی سفارت خانے میں جواہر لال نہرو داخل ہوئے تو دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک پادری صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔ انھیں اشارہ سے پاس بلا کر بٹھایا۔ اتہ پتہ پوچھا اور جب انھوں نے بتایا کہ ہم نے ایک نیشنل چرچ کی بنیاد رکھی ہے اور روسی چرچ نے ہمیں مان لیا ہے۔ ہم ان کے بلاوے پر آئے ہوئے ہیں تو جواہر لال بہت خوش ہوئے۔ شکایت کے لہجے میں بولے یہ کیا طریقہ ہے صاحب، کہ آپ لوگ مجھ سے ملتے بھی نہیں۔ دہلی آئیے۔ مجھے بھی کچھ بتائیے۔ مجھے اس قابل نہیں سمجھتے ہیں آپ؟

ہندوستانی بک ٹرسٹ (بمبئی) نے دیوانِ غالب کا ایک نہایت نفیس ایڈیشن شائع کیا جب کوئی علمی، ادبی یا فنی کارنامہ ہمارے ملک میں منظرِ عام پر آتا تھا تو فوراً وزیر اعظم پر نظر جاتی تھی کہ وہ ہیں جو اس کی قدر کریں گے۔ لوگ دور دراز سے اپنے لمبے پیتے ڈاک میں لیے ہوئے جواہر لال کے دروازے پر پہنچ جاتے تھے۔ دیوانِ غالب کا یہ تحفہ جب جواہر لال نہرو کے پاس پہنچا تو خوش

ہوگئے۔ ایک ایک تفصیل پوچھی۔ پھر کہنے لگے، اس کام میں تو بڑا روپیہ چاہیے! آپ کیوں کر کام چلاؤ گے؟ پھر خود ہی سوچ کر نیشنل بک ٹرسٹ سے سفارش کی اور یوں ایک اہل قلم کی مدد کر کے بہتوں کو حوصلہ بخش دیا۔

اپنے مخالفوں پر تو وہ خاص طور سے مہربان رہتے تھے۔ ان کے سیاسی مخالفوں میں کئی ایک خاندانوں کے بچے جواہرلال نہرو کی جیب خاص سے تعلیم پا کر بڑے ہوئے اور ان کی پالیسیوں پر سر عام نکتہ چینی کے قابل ہو گئے پھر بھی نہرو کے گھر اس طرح جاتے تھے جیسے یہی ایک انسان رہ گیا ہے جس پر اس کے مخالفین کا برابر کا حق ہے اپنے نقطۂ نظر کو منوانے کے بجائے دوسروں کا اپنے مخالفین کا نقطۂ نظر سمجھنا جواہرلال کی فطرت کا بڑا اگرا جوہر تھا۔ یہ عمل افراد اور قوموں میں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ تہذیب کی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہیں۔ جواہرلال کی موت ان معنوں میں ہماری تہذیب کے سب سے اونچے کنگرے کا گر جانا ہے ہماری قوم کے سب سے چند۔ آدمی کی موت ہے، تہذیب کے ایک اعلیٰ معیار کا گم ہو جانا ہے۔ وہ شخص ہم سے اٹھ گیا جس کے قد کی بلندی سے ہم اپنی تمیز داری اور تہذیب کی بلندی ناپ سکتے تھے۔ اس شخص کی مٹی وطن کی دریاؤں میں بہائی گئی ہے جس سے ملنے کی تمنا ہمیں اپنے کاموں کو بہتر بنانے میں مدد دیتی تھی، جی چاہتا تھا، ہم اپنی قوم کے حق میں ایسا کوئی کارنامہ پیش کریں کہ قوم کا بیر زندہ و تابندہ دل و دماغ۔ جواہرلال نہرو ہمیں اپنے پاس بلائے، ہمارا حوصلہ بڑھائے اور یوں کریدکرید کر سوال کرے کہ ہم فخر کے مارے، اپنے دکھ بھول جائیں ؎

چو آن کحنِ افروز در خانہ نیست
ہمی ترا زمین ہیچ کاشانہ نیست

اقبال متین

نہرو چاچا اور پائلٹ انّو

"جنگل گھنا، تاریک اور بہت خوبصورت ہے لیکن مجھے بہت سے وعدے وفا کرنے ہیں اور سونے سے پہلے کئی میل کا سفر طے کرنا ہے۔"

ممتاز امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی نظم کا یہ حصہ ایک چھوٹے سے پیڈ پر خود عظیم نہرو کی تحریر میں موجود ہے۔ یہ پیڈ گزشتہ ایک سال سے اس میز پر تھا جہاں پنڈت نہرو کام کیا کرتے تھے۔

یہ خبر ۶ رجون کو میں نے اخباروں میں پڑھی ہے۔ اس خبر نے مجھ پر اتنا اثر کیا ہے کہ میں اس حصۂ نظم کی تہہ در تہہ معنویت میں ڈوب ڈوب گیا ہوں۔ سوچتا ہوا کہ کیا میں نہرو کی عظیم شخصیت کو نظم کے ان دو مصرعوں سے الگ کر لوں تو بھی میرے دل پر وہی نقوش ابھر سکیں گے جو ہندوستان کے اس مجاہد آزادی اور رسول امن کی ذات سے ابھرے ہیں۔ رابرٹ فراسٹ اگر آج زندہ ہوتے تو انھیں اس بات پر فخر محسوس ہوتا کہ اس عہد کے ایک بہت بڑے مفکر نہرو نے ان کے اشعار سے اتنی تقویت حاصل کی ہے کہ آخری دم تک اس نے وعدے وفا کیے ہیں۔

یہ معاملہ تو بڑی شخصیتوں کا معاملہ ہے میں تو ان کروڑوں عوام میں ایک فرد ہوں جو ہندوستان کے روشن مستقبل پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے کہ یہ ہندوستان نہرو کا ہندوستان ہے اور نہرو آج کسی ایک شخص کا نام نہیں ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں عوام میں ہر فرد کے جذبۂ بیدار کا نام نہرو ہے، چمن میں ہر کھلنے والے گلاب کا نام نہرو ہے۔ کھیتوں میں لہلہاتے ہر خوشۂ گندم کی سنہری تازگی کا نام نہرو ہے — اور اگر نہرو کا دوسرا نام رسول امن بھی ہے تو ہندوستان کے کروڑوں امن پسندوں کو آپ سلام تو کرسکتے ہیں ان پر بم نہیں گرا سکتے اس لیے کہ نہرو نے دوستوں کے پھینکے ہوئے بموں کو بھی اپنی محبت کے دامن سے ڈھک کر چھپا لیا ہے کہ کل ہماری انسانیت کے آگے انھیں اپنا سر تسلیم خم کرنا ہوگا۔

میں نے اوپر بتلائی ہوئی خبر جب پڑھی تھی اس وقت میں اپنے بچوں میں گھرا ہوا رفیق ذکریا کی مرتبہ کتاب "اے اسٹڈی آف نہرو" کی وہ ساری تصویریں انھیں بتلا رہا تھا جو دو سال کی ننھی سی جان کے ایک عظیم شخصیت بن جانے تک تقریباً ستر سالہ البم میں سے منتخب کی گئی تھیں۔

اس موہنی شخصیت کو اتنا بے پناہ پیار، اتنی بے اندازہ محبت جو ہندوستان کے بچّے بچّے نے دی ہے اس کی مثال میں نے آج تک نہیں دیکھی۔

ہادر ہند کے دوسرے گھروں کی طرح میرا گھر بھی نہرو کے پرستاروں میں سے ایک ہے لیکن میرے ایک بچّے نشّو کو جو تعلق خاطر اپنے نہرو چاچا سے ہے اس کا اندازہ آپ ذرا مشکل ہی سے کر سکیں گے اس لیے کہ خود مجھے ۲۷ مئی کی کڑی دوپہر سے پہلے اس بات کا کوئی اندازہ نہ تھا۔

میں تو صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ کھیل کھیل میں اپنے نہرو چاچا سے کچھ مانوس سا ہو چلا ہے۔ حالانکہ اس نے انھیں کبھی نہیں دیکھا۔ تصویریں دیکھ دیکھ کر اور ان کے بارے میں سن سن کر وہ انھیں عزیز رکھنے لگا ہے — وہ کچھ اس قسم کے کھیل اکثر کھیلتا رہتا ہے جس میں اس کے نہرو چاچا کہیں نہ کہیں شامل رہتے ہیں کاغذ کے ہوائی جہاز اڑانا اس کا محبوب مشغلہ ہے اور ایسے ہوائی جہازوں کا ایک اچھا خاصا کارخانہ اس کے پاس ہے۔ جس میں ہوائی جہاز کی اڑان اس کی اپنی دانست میں سب سے زیادہ بہتر ہوتی ہے وہ اس میں اپنے نہرو چاچا کو بٹھالیتا ہے اور پھر ہوائی جہاز کے وہ وہ کرتب دکھاتا ہے کہ کیا کسی پائلٹ نے آج تک دکھائے ہوں گے — وہ کہتا ہے کہ یہ جیٹ ہے — جیٹ — اس میں نہرو چاچا بیٹھے ہوئے ہیں اور میں اس کا پائلٹ ہوں — اب یہ جیٹ عام جہازوں کی طرح دیواروں اور دروازوں سے ٹکراتا کمرے کے فرش پر نہیں گر پڑتا بلکہ اس کی اڑان کا رخ بڑی احتیاط سے وہ اس طرح متعین کرتا کہ یہ جیٹ تخت پر بچھی ہوئی دری یا توشک پر یا صوفے پر اتر پڑتا اس لیے کہ اس میں اس کے نہرو چاچا بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ اس کا پائلٹ ہے۔

ایک بار اس کی آنٹی کرشنا پال نے اس سے پوچھا تھا کہ "بیٹا تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟"

نشّو کہنے لگا "میں ہوائی جہازوں کا انجینئر بنوں گا"

کرشنا پال کہنے لگیں "بہت خوب کیا کرو گے انجینئر بن کر؟"

اس نے چھوٹتے ہی کہا "میں نہرو چاچا کی ہلپ (HELP) کروں گا"

معاف کیجئے میں ہلپ کی بجائے مدد کا لفظ بھی یہاں رکھ سکتا تھا لیکن بغیر کسی کانٹ چھانٹ کے میں نہرو چاچا کے ایک ننھے سے پائلٹ کا کہا ہوا جملہ من و عن آپ کے کانوں تک پہنچا رہا ہوں۔

اس وقت ہم سبھی کو اس پائلٹ نے لمحہ بھر کے لیے چونکا دیا تھا — اس کی بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن جب بھی موقع ملے نشّو کی یہ بات ضرور کرتی ہے۔

ایک دن پانی سے بھرے ہوئے ٹب میں وہ دو کشتیاں تیرا رہا تھا — ان کشتیوں کو کبھی بہت قریب لاتا، کبھی دور کر دیتا۔ ساتھ ہی وہ آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا جو مجھے سنائی نہ دیتا تھا — یکایک دیکھتے دیکھتے اس نے ایک کشتی غرق کر دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا میں نے نہرو چاچا کی کشتی سے ٹکرا کر ہمارے

دشمن کی کشتی ڈبو دی ہے۔

میں نے کہا نشو میاں نہرو چاچا نے تو کسی کی کشتی نہیں ڈبوئی — تم نے اچھا نہیں کیا۔

اس نے چہک کر جواب دیا — لیکن اس نے کیوں نہرو چاچا کی کشتی ڈبونا چاہی — وہ ہمیں چھیڑتا کیوں ہے — اور پھر بڑی شان سے نہرو چاچا کی کشتی سطحِ آب پر رواں تھی اور وہ مطمئن تھا۔

میں کچھ بھی تو نہ کہہ سکا — سوچتا رہ گیا کہ پتہ نہیں ہندوستان بھر میں کتنے ہی گھر ہوں گے جہاں چھوٹے چھوٹے ہوائی جہازوں میں ننھے ننھے پائلٹ اپنے نہرو چاچا کو لیے لیے پھرتے ہوں گے کتنی ہی چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہوں گی جو پانی سے بھرے ٹبوں میں یا باغ کے حوضوں میں تیرتی ہوں گی نہرو چاچا ننھے ننھے دلوں میں رس بس کر وطن کا مستقبل بن گئے ہیں تو پھر کون کسی پائلٹ نشو کو روک سکتا ہے کہ وہ اپنی ہی آہٹ نہ سنے، اپنے ہی قدموں کی چاپ پر دھیان نہ دے، اپنی ہی آواز کے سحر کو نہ پہچانے۔

یہ کیسی محبت ہے جو بن دیکھے ان ننھے ننھے دلوں میں گھر کر گئی ہے — میں نے ابھی آپ کو بتلایا تھا کہ ۲۷ مئی کی کڑی دوپہر سے پہلے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ پائلٹ نشو کو اپنے نہرو چاچا سے اس قدر انس ہے۔

۲۷ مئی کو جب پڑوس کی بچی نے بھاگے بھاگے آکر گھر والوں سے یہ کہا کہ نہرو چاچا نہیں رہے — تو کوئی بھی اس بات کو سچ ماننے کے لیے جیسے خود کو تیار نہ کر سکا — اس دل ہلا دینے والی خبر کو جھٹلا دینے کی امید میں گھر سے میں نکلا چاہتا تھا کہ نشو دیوانہ وار بھاگتا ہوا آیا۔

"کیا ہوگیا نہرو چاچا کو؟" — اس کے ہاتھ سرد تھے۔

میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا — کچھ بھی تو نہیں ہوا — لوگ کہتے ہیں ان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے — بڑے بڑے ڈاکٹر ان کا علاج کر رہے ہیں — وہ جلد اچھے ہو جائیں گے — اس لڑکی کو جو دوڑی دوڑی یہ خبر لائی تھی میں نے اشارہ کر دیا اور اس نے بھی سر جھکا کر مجھے اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔

پائلٹ نشو نے نعرہ لگایا۔

"نہرو چاچا اچھے ہیں"

"نہرو چاچا زندہ باد"

اور وہ کھیل میں لگ گیا۔ اس خبر کے ملتے ہی جہاں سارے گھر کی فضا سوگوار ہو گئی تھی وہیں پائلٹ نشو کے اس ردعمل سے سارے ماحول پر ایک پُراسرار سکوت طاری ہو گیا تھا۔

آہستہ آہستہ میں نے نشو کو یقین دلا دیا کہ اب نہرو چاچا اچھے ہو رہے ہیں۔ وہ کھیلتے کھیلتے سوچ میں پڑ جاتا۔

دوسرے دن جب جنازے کے جلوس کا آنکھوں دیکھا حال ریڈیو سے نشر کیا جانے لگا تو میں نے اس کو الگ لے جا کر معروف رکھا — جانے کب میری نظر بچا کر وہ سب لوگوں میں جا ملا۔ کامنٹری تو اس کے پلے نہ پڑی وہ اتنا ضرور جانتا

تھا کہ ریڈیو پر جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ نہرو چاچا سے متعلق ہے ــــ اس نے دوسرے بچوں سے پوچھا۔

"نہرو چاچا اب کیسے ہیں ؟"

دس گیارہ سالہ یوسف نے کہا۔

"انھیں جلانے لے جا رہے ہیں۔"

یہ سب ہی بچے دل گیر تھے ــــ انھیں یاد بھی نہ رہا کہ پائلٹ نشو کی دلجوئی کرنی ہے ــــ اور یہ بات اس سے پوشیدہ رکھنی ہے۔

پائلٹ نشو اس ہنگامے سے نکل کر چپکے سے میرے پاس چلا آیا۔ میں اس منظر کو شاید کبھی نہ بھول سکوں گا ــــ پتہ نہیں ہندوستان کے کونے کونے میں کتنے ہی ماں باپ نے یہ منظر دیکھے ہوں گے۔

نشو کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔

اس کی ننھی سی پیشانی عرق عرق تھی۔

اس کی ناک کے نیچے پسینے کے ننھے ننھے قطرے تھے۔

اس کا نچلا ہونٹ میری آنکھوں کے سامنے کپکپا کر رہ گیا تھا ــــ میں لرز کر رہ گیا وہ یہ سمجھے ہوئے ہے کہ دنیا نہرو چاچا کی موت کو تسلیم کر لینے کے مترادف ہے ــــ اور پائلٹ نشو یہ مان لینے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

اس نے رندھی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا۔

"بابا ــ نہرو چاچا کو جلا دیں گے تو پھر وہ کیسے اچھے ہوں گے ؟"

آپ تو کہتے تھے کہ وہ حیدرآباد آئیں گے، آپ تو کہتے تھے کہ آپ مجھے ان سے ملائیں گے، اور میں ان سے کہوں گا کہ آپ کی تصویر کو میں اور ندو بھیا اپنی تصویروں کے پیچھے رکھتے ہیں کیوں کہ ہم آپ کے گارڈ ہیں۔

میں بت بن کر رہ گیا تھا ــــ میرے لیے خود اپنی کیفیت کو چھپانا مشکل تھا۔ جی چاہتا تھا کہ نشو کو اٹھا کر سینے سے لگا لوں ــــ لیکن ضبط مانع تھا۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے تسلی دی۔

"جھوٹ کہتے ہیں سب ــ نہرو چاچا تو اچھے ہو گئے ہیں۔"

وہ مصر تھا ــــ کہنے لگا۔

مجھ سے یوسف انکل کہہ رہے تھے ــ وہ اگر جھوٹ بولتے ہیں تو آپ ان کو بلا کر ڈانٹتے کیوں نہیں ــ وہ بضد تھا ــ اور اس جھوٹ کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔

میں نے یوسف کو بلایا ــ اب میرے لیے مسئلہ یہ تھا کہ میں یوسف کو نشو سے الگ کر کے سب کچھ سمجھا سکوں ــ وہ دروازے کے قریب پہنچا تو میں نے لپک کر اس کو جا لیا ــــ اور حکمت عملی سے اس کو بتلا دیا کہ اسے اعتراف کر لینا

ہے کہ جو کچھ اس نے کہا ہے وہ بالکل جھوٹ ہے۔

نشّو جیسے ہر سرگوشی کی حقیقت کو جان لینا چاہتا تھا۔ میں نے یوسف سے بات ختم ہی کی تھی کہ پائلٹ نشّو کا چہرہ مجھے کھڑکی میں نظر آیا — وہ تو وہیں تھا کہ میں یوسف سے کیا بات کرتا ہوں۔

یوسف نے نشّو سے اپنے کہے پر بڑی لجاجت سے معافی مانگی۔ اس کو یقین دلایا کہ وہ نشّو کو ستانے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا۔

نشّو کچھ دیر گم سم رہا۔ پھر میرے مزید یقین دلانے پر وہ مطمئن ہو گیا۔

جب وہ کھیلنے کے لیے اپنے ہوائی جہازوں کی طرف بڑھا تو اس کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی — چاچا نہرو زندہ باد —

اور میں سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی نہرو مر گئے ہیں۔

اگر یہ موت ہے تو پھر زندگی کیا ہے؟

اگر موت یہی ہے تو میں زندگی سے بھرپور پیار کے باوجود آج ہی ایسی موت مرنے کے لیے تیار ہوں جو زندگی سے زیادہ خوبصورت ہے۔

لیکن پائلٹ نشّو نے اپنا ہوائی جہاز ہواؤں میں اڑا لیا ہے جو ہندوستان کی اس پوتر دھرتی پر اڑ رہا ہے، دریاؤں کے شفاف پانی پر اڑ رہا ہے جس کا لاکھوں ننھوں کے چہیتے نہرو چاچا اب ایک روپ بن گئے ہیں۔ خود سوندھی سوندھی دھرتی بن گئے ہیں — خود ٹھنڈا میٹھا جل بن گئے ہیں — کل یہ ہوائی جہاز ہندوستان کے اسی دل میں اترنے والا ہے جس کا نام مستقبل ہے اور جس مستقبل کی آواز میں سن رہا ہوں — آپ سن رہے ہیں — ساری دنیا سن رہی ہے۔

جوگندر پال

زندگی ہی زندگی

میں ہمیشہ کہانیاں لکھتا ہوں۔ اصل واقعات کو بیان کرنے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں، کیوں کہ میں نے انھیں ہمیشہ بے روح پایا ہے۔ نرا جھوٹ موٹ۔ لیکن اب مجھے لگ رہا ہے کہ واقعات کہانیوں کی مانند سچے بھی ہو سکتے ہیں مثلاً نہرو کی موت — عظمت کی موت — "پنڈت نہرو؟" — "امر ہے!" گویا کل عالم کی زندگی، زندگی کے سبھی منتشر نفوس دفعتاً بدحواس ہو کر دوڑ کے ایک ہی مقام پر جمع ہو کر موت کو للکار رہے ہوں۔

"پنڈت جواہر لال نہرو؟"

موت زندگی کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہو کر ہنسنے لگی — "ارے بھئی! پنڈت نہرو کہو یا پنڈت جواہر لال نہرو ہے تو وہی نا — وہ!"

زندگی کے ہزاروں لاکھوں سر بیک وقت اس جانب اٹھ گئے جہاں موت اشارہ کر رہی تھی۔

"وہ دیکھو — وہ چتا!"

"امر ہے!" زندگی کے نفوس نے سہم کر چیخ مارنے کے انداز میں ایک ہی تان میں بہ آواز بلند کہا۔

اور موت بے طرح ہنسنے لگی، اور اس کے خاموش قہقہوں سے سناٹا چھا گیا

"کہاں ہے؟"

"امر ہے!"

"کہاں ہے؟"

"امر ہے!"

"مگر ہے کہاں؟" موت پوچھ رہی تھی "اپنے اس ساکت وجود میں، جو وہ اب اپنی مرضی سے ہلا بھی نہیں سکتا؟"

زندگی سوچ رہی تھی — "اسے حرکت سے کتنا پیار تھا، یوں چلتا تھا، یوں، اپنے بدن کا انگ انگ ہلا کر اور اب بے حس و حرکت پڑا ہے۔"

اور فضا میں آب دیدہ آواز کا ایک اور گرم چھینٹا گرا۔

"امر ہے!"

موت جھلا گئی اور اب کے ہنسنے کے بجائے اپنے دائیں پنجے سے فضا کا گلا گھونٹنے لگی اور زندگی کے سبھی نفوس گویا اٹکی اٹکی ہچکیاں بھر کر آخری پلوں پر آ گئے۔

"کہاں ہے؟" گھٹے گھٹے ماحول میں صرف موت کی غصیلی آواز ہی زندہ معلوم ہو رہی تھی۔

"اس وقت تمہارا پنڈت جواہر نہرو کہاں ہے؟ یہاں؟ — وہاں؟ — کہاں؟"

"امر ہے!" زندگی کی ہچکیوں نے احتجاج کیا اور یوں معلوم ہوا جیسے موت نے تضحیک سے منہ چڑا کر زندگی کی نقل اتاری ہو۔ "امر ہے!"

"ہاں" میں نے فنا کی قوت محسوس کر کے اپنے آپ سے پوچھا "جو مر گیا، وہ کہاں؟ جو چلا گیا وہ یہاں کہاں؟"

"نہیں" — موت ہنس ہنس کر سمجھا رہی تھی۔ "وہ یہاں، وہاں کہیں بھی نہیں، وہ کہیں گیا نہیں، مٹ گیا ہے، کلیتہً فنا ہو چکا ہے، کیوں کہ میں ہر جگہ موجود ہوں، یہاں بھی، وہاں بھی، ہر جگہ اور چونکہ میں ہر جگہ موجود ہوں، وہ کہیں بھی نہیں، نہ یہاں نہ وہاں۔"

میرا ذہن کانپ کانپ گیا۔

"تو پھر ان کی آخری امید کیا ہوئی؟ پانچ، پچاس یا سو سال کا فریب زندگی! کیا عظمت آدم کی دوام بھی ہماری روزمرہ کی زندگی کی طرح جھوٹا ہوتا ہے۔" فضا کو آگ لگ گئی، نہرو کی چتا سے شعلے بلند ہونے لگے، عظمت آدم جل جل کر راکھ ہونے لگی۔

"عظمت آدم سے متعلق خدا کے وعدے کیا ہوئے؟"

"موت کے بعد ایک حیات جاوداں، ایک اٹوٹ جیون، ایک مسلسل سکون! کیا یہ دراصل نہ رہنے کا سکون ہے، یکسر ختم ہو جانے کا سکون، فنا کا سکون؟ نجات کی راہیں ان ہی خاک کی ڈھیروں تک آ کر مسدود ہو جاتی ہیں —؟ ہماری یہ زمین شاید مردہ انسانوں کی خاک سے ہی بن بن کر ایک جہان بن گئی ہے۔ سب لوگ یہیں پیدا ہو کر یہیں ڈھیر ہو جاتے ہیں مٹی کے یہ تودے جمع ہو ہو کر پہاڑ بن جاتے ہیں تو انسان اپنی فنا کے کرب پر قابو پانے کے لیے ان پہاڑوں میں انسانوں کے دیوقامت مجسمے کھڑے کرتا ہے، اپنی بقا کا تصور قائم رکھنے کے لیے ان مجسموں پر سارا خون بہا دینا چاہتا ہے لیکن اس کی اس پیہم جہد کے باوجود خاک کے ان ساکت و صامت بتوں کو توڑا جائے تو خون کی ایک بوند بھی برآمد نہیں ہوتی کیوں کہ وہ اپنے مردہ آباؤ اجداد کی مٹی سے ان کے لاکھ بت بنائیں، آخر وہ مٹی کے بے جان بت ہی ہوں گے۔

بے چارہ انسان! اپنی خواہشات کے یہ خاکی پیکر بنا بنا کر ہی سمجھ لیتا ہے کہ وہ لافانی ہے، خدا کے وعدے کے مطابق ایک ابدی زندگی کا اہل ہے، بیچارہ محض اپنی خواہشات کو ہی خدا کے وعدوں پر محمول کرنے لگتا ہے۔

"پنڈت نہرو؟"

"امر ہے!"

مگر پنڈت نہرو کا وجود تو چتا کی آگ میں جل جل کر راکھ ہو رہا تھا۔ پنڈت نہرو تو غائب تھا، غائب شے کیوں کر موجود ہو سکتی ہے؟

جب پنڈت نہرو موجود تھا تو ساری دنیا کو اس کی موجودگی کا احساس تھا، اس قدر احساس کہ دنیا ڈر ڈر کر سوچتی تھی کہ وہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا؟ ـــــ اور آج جب وہ موجود نہیں تو اسے خود اپنی موجودگی کا احساس نہیں اس کے وجود کو آگ لگی ہوئی ہے۔ مگر اسے خبر نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو اب رہا ہی نہیں۔

لیکن دنیا سوچ رہی ہے کہ وہ اب بھی ہے پہلے دنیا کو یہ ڈر تھا کہ وہ نہ ہوگا تو کیا ہوگا اور اب وہ نہیں رہا تو یہ باور کرنا چاہتی ہے کہ وہ اب بھی ہے۔ ہمیشہ رہے گا۔

دنیا اپنی فطرت کے مطابق من ہی من میں اپنی خواہشات کا ایک جاودانی پیکر تراش رہی ہے۔

"پنڈت نہرو؟"

"ا ـ م ـ ر ـ ہے!"

میں قریب ہی سے ایک پوپلی رقت آمیز، بوڑھی آواز سن کر چونک پڑا۔ یہ نحیف آواز جیسے ہچکی بھر کر کسی تھکی ماندی ندی کی طرح زندگی کی اجتماعی آواز کے ساگر میں بہہ گئی ہو۔

بوڑھا بابا بہت بوڑھا تھا، پنڈت نہرو سے بھی کئی سال بڑا۔ میرا خیال ٹھٹک کر رہ گیا۔

"پنڈت نہرو اپنی پیدائش سے پہلے بھی زندہ تھا، اس بوڑھے کی زندگی، کسی بوڑھے کی زندگی میں، اور جب اس بوڑھے کی بصیرت بالآخر اسے اپنے آپ سے وسیع تر محسوس ہونے لگی تو پنڈت نہرو پیدا ہوا۔ اس بوڑھے کی بصیرت کے نئے اطراف کے وجود میں ڈھل کر، اور اب پنڈت نہرو کی بصیرت بھی اپنے وجود کے اطراف وسیع تر ہو چکی ہو گی اور"

"امر ہے"

ایک تنومند، نوجوان آواز پیام دے رہی تھی۔

ـــ اور وہ اپنے ناکافی وجود سے منحرف ہو کر اس نوجوان کے وسیع تر وجود میں آ داخل ہوا ہے۔ اب یہی نوجوان ہمارا پنڈت نہرو ہے۔

"پنڈت نہرو، پنڈت نہرو کی اپنی ذات کا نام نہیں، اس کی خُو کا نام ہے، متمدن شعور کے ارتقا کا نام ہے، اسم روحِ جمہور ہے ـــــ اور روحیں کبھی نہیں مرتیں، کیوں کہ یہ اپنی پیدائش سے پہلے بھی زندہ ہوتی ہیں۔

"پنڈت نہـــرو"

اور سب بوڑھے۔ جوان، بچے، ماضی کے نہرو، حال کے نہرو، مستقبل کے نہرو، ایک ہی وقت ایک ہی گرمجوش آواز میں ایک ہی یقین اور وثوق سے پکار اٹھے۔

"امر ہے!"

"کہاں ہے؟" موت نے انھیں بدستور دبانا چاہا۔

"اندھی ہو گئی؟ یہ دیکھو انسانی زندگی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر! یہ نہرو ہے! یہی نہرو ہے!!

پنڈت نہرو؟"

"امر ہے!"

"امر ہے!"

"امر ہے!"

چارسُو زندگی ہی زندگی دکھائی دے رہی تھی۔

"امر ہے!"

میں نے چتا کی طرف نظر اٹھائی۔ اور اب مجھے خیال آیا کہ یہاں نہرو نہیں جل رہا، خود موت جل جل کر راکھ ہو رہی ہے۔

ساجدہ عابد

جواہرلال

ایک تاریخ، ایک تاریخ ساز

وقت چلتے چلتے ایک لمحہ کے لیے رکا، دنیا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وقت نے کہا۔

" دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو "

لیکن گردشِ ایام نے پیچھے کی طرف دوڑنے سے انکار کر دیا۔

وقت پکار اٹھا۔

میرے دو ہی دن ہیں۔

ایک زندگی، دوسرا موت۔

زندگی اجالے کا نام ہے اور موت تاریکی کا۔

لیکن نہیں موت کا نام تاریکی نہیں روشنی ہے، اور زندگی امر ہے وہ کبھی اندھیرا نہیں کہلا سکتی۔ وہ دیکھو اندھیرے میں آسمان پر ستارے اور زیادہ چمک دار نظر آتے ہیں۔ رات کی تاریکی میں چاند اور زیادہ تابناک اور روشن ہو جاتا ہے چنانچہ ۲۷ مئی کو جب موت زندگی سے ٹکرائی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے آسمان پر ایک مہیب تاریکی چھانے لگی تو اس اندھیرے میں ہزاروں نہیں لاکھوں کروڑوں دل جل اٹھے جن میں جواہر لال نہرو زندہ تھا، اور جن میں جواہر لال اب بھی زندہ ہے۔

ہاں وہ زندہ ہے کیوں کہ اس کی زندگی دوسرے انسانوں کے لیے وقف تھی۔ اس کا دین دھرم انسانیت تھا۔ اس نے ہندوستان کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیا۔

موتی لال اور سروپ رانی کی آنکھوں کا تارا جواہر لال رئیس اور سالدار گھرانے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی پرورش ہوتی ہے ایک انگریز گورنس کی گود میں، تعلیم پاتا ہے ہارو اور کیمبرج میں۔ مغربی تہذیب میں جوانی گزارنے کے بعد وہ ہندوستان لوٹتا ہے تو بالکل ایک نیا عزم اور نئی لگن لے کر۔ اور وہ ہے ہندوستان کی آزادی اور سوشلزم کا تصور۔

میں سے وہ ایک سیاست داں بن گیا اور رات دن گاندھی جی کے ساتھ اپنے ملک کی آزادی و تعمیر میں ایک مجاہد اور مزدور کی طرح جٹ گیا۔

یہ ۱۹۱۵ء کا واقعہ ہے وہ پنڈت مدن موہن مالویہ کے ساتھ کسانوں کے لیے کام کرنے نکل گیا۔ گاؤں گاؤں گھوما ان کے ساتھ شانہ بشانہ کام کیا۔ انگریزی کپڑا ترک کر کے اصلی پہننی شروع کر دی اور کھادی کا پرچار کرنے لگا۔

۱۹۲۰ء میں رولٹ ایکٹ اور جلیان والا باغ کی فائرنگ کے خلاف احتجاج کیا۔ اور جیل بھی گئے اور اسی وقت سے برٹش حکومت کا ظلم ختم کرنے کا آہنی ارادہ کر لیا۔

بارڈولی میں زمین کے ٹیکس کے خلاف گاندھی جی اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ ستیہ گرہ شروع کی اور ۶ ماہ قید کی سزا پائی۔

اسی طرح اس نے کبھی نمک کا قانون توڑا تو کبھی سائمن کمیشن کے خلاف آواز اٹھائی۔ بہر حال ۱۹۲۶ء ہی سے اس نے ہندوستان کی کامل آزادی پر زور دینا شروع کر دیا جس کو گاندھی جی نے یہ سمجھ کر رد کر دیا کہ ہندوستان کو کامل آزادی نہیں مل سکتی لیکن یہ اس کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ گاندھی جی کو بھی اپنے خیالات بدلنے پڑے اور اسے کانگریس کی صدارت بار بار قبول کرنی پڑی۔ گاندھی جی نے آخر کہہ ہی دیا۔

"جواہر لال کے سوا اس پھولوں کے تاج (صدارت) کو کوئی نہیں پہن سکتا۔ کیوں کہ ان پھولوں میں کانٹے بھی ہیں:" اور یہی پھول اس وقت سے اس کے من کو بھا گئے جس میں کانٹے ہی کانٹے تھے۔

وطن سے اس کی سچی محبت ہی تو تھی جس کی خاطر اس نے اپنی خوشیوں کو بھی قربان کر دیا چنانچہ ۱۹۳۲ء میں جب گاندھی اروِن پیکٹ کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں اسے پھر قید کیا گیا تو قید خانہ میں اسے کملا نہرو کی بیماری کی خبر ملی تو اس نے اپنی بیوی کے بارے میں لکھا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ ایسے میں میرا ساتھ نہیں چھوڑے گی جب کہ مجھے اس کی شدید ضرورت ہے۔ ابھی ہم کو مل جل کر بہت سے کام کرنے ہیں۔"

لیکن اس کے خواب ادھورے رہ گئے جب کہ کملا نے اس کا ساتھ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا لیکن اس کے باوجود جواہر لال نے وطن سے اپنی سچی محبت میں کمی نہ آنے دی۔

۱۹۳۸ء میں نیشنل کمیشن کا اسے چیرمین بنایا گیا۔ جس سے اس نے ہندوستان کے ترقیاتی کاموں کی بنیاد ڈالی۔

۱۹۳۹ء میں جب جنگ شروع ہوئی تو گاندھی جی نے کہا:

"جواہر لال ایک جواہر ہے جس کی روشنی بھارت کے پست طبقہ کے لیے ہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام پسماندہ انسانوں کے لیے بھی ہے۔"

کانگریس کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں اور بالآخر انگریز حکومت سے کامل اقتدار سونپنے اور بھارت

چھوڑ دینے کا نعرہ بلند کرنا شروع کیا۔ حکومت نے اس مطالبہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۹۴۱ء میں گاندھی جی نے سول نافرمانی تحریک شروع کی جس کے سب سے پہلے ستیہ گرہی ونوبا بھاوے اور دوسرا ستیہ گرہی جواہر لال ہے۔

۱۹۴۶ء میں اسے پھر کانگریس کا پریسیڈنٹ چنا گیا۔

۱۹۴۷ء میں برٹش حکومت نے کامل اقتدار ہندوستانیوں کو سونپ دیا۔ ہندوستان اور پاکستان دو حصوں میں بٹ گئے جس کے نتیجہ میں فرقہ واری آگ بھڑک اٹھی، ہزاروں لاکھوں بے گناہ مارے گئے۔ اقلیت پر اکثریت کے ظلم کو وہ برداشت نہ کر سکا او چیخ اٹھا۔

"ہم مظلوموں کا ساتھ دیں گے۔"

دوسری طرف مظلوموں کا ساتھ دینے والا گاندھی جی کی موت پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔

"ہندوستان کی روشنی جاتی رہی۔ ہم نے اپنے انمول رتن کی حفاظت نہیں کی۔ ہماری گردن شرم سے جھک جانی چاہیئے۔"

اور سبھوں نے اس کی آواز پر گردن تو جھکالی لیکن مظلوموں کا شاید وہ تنہا ہی محافظ تھا۔ فسادات میں اس نے ایک مسلمان لڑکی کی جان بچائی، اور اسے اپنے گھر میں پناہ دی۔ اپنے کمپونڈ میں ایک ریفیوجی کیمپ رکھا جہاں سو مسلم خاندان پناہ گزین تھے اور انھیں اسی کے پاس سے راشن دیا جاتا تھا۔ فسادات کی وجہ سے دکانیں بند تھیں صرف سرکاری دکان سے راشن دیا جاتا تھا۔ ایک شام لوگوں نے دیکھا کہ حکومت کی راشن شاپ میں ایک شخص کیو میں سب کے ساتھ کھڑا ہے شاید کلرک اسے پہچان گیا۔ وہ تھا ہند کا وزیر اعظم ـــ جواہر لال ـــــ بھگدڑ مچی سبھوں نے کوشش کی کہ وزیر اعظم کو سب سے پہلے راشن دے دیا جائے۔ لیکن اس نے کہا۔

"نہیں اس جگہ میں عام لوگوں کی طرح کھڑا ہوں مجھے کیو سسٹم کے مطابق راشن ملنا چاہیئے۔"

پھر راکھی کا تہوار آ گیا تو سبھوں نے دیکھا کہ ساری مہاجر بہنیں اپنے اکلوتے بھائی کو راکھی باندھ رہی تھیں۔ ایک بار یوں بھی ہوا کہ پہاڑ گنج میں زبردست گولیاں چل رہی تھیں اور جواہر لال بغیر پولیس کی مدد اور اطلاع کے ان گولیوں کے درمیان زخمی انسانوں کو بچا رہا تھا کیونکہ وہ فرقہ واریت کو بھارت کے حق میں زہر قاتل سمجھتا تھا۔ اس زہر کو نکال پھینکنے کی کوشش میں اس نے محبت اور بھائی چارگی پر زور دینا شروع کر دیا چنانچہ اسی جذبہ کے تحت اس نے باوجود سب کی مخالفت کے دولت مشترکہ میں شرکت کی کیوں کہ:

"آج کل کی بدلتی دنیا میں امن کے قیام کی کوشش بہت ضروری ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتی ہے جب ایک قوم دوسری قوم سے اور ایک ملک دوسرے ملک سے بھائی چارہ پیدا کرے۔

دنیا میں امن اسی وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ دو دل نہ مل جائیں اور وہ دو دل اس وقت مل سکتے ہیں

جب انسان اپنے دل سے نفرت اور کدورت دور کر دے۔ یہ خیال اس کے دل میں جڑ پکڑ چکا تھا چنانچہ بچوں کا یہ چاچا بھارتی بالکوں کو اپنے ایک خط میں یہ سبق دیتا ہے۔

"میں حال میں امریکہ، کناڈا، اور انگلینڈ گیا، وہاں کے بچے مجھے بہت پسند آئے۔ ان سے میری دوستی ہو گئی اور جب کبھی موقع ملا میں ان کے ساتھ کھیلتا رہا۔ ہر جگہ کے بچے ایک سے ہیں لیکن آپس میں جو دوری پیدا ہوتی ہے وہ بڑے ہونے کے بعد۔"

دوسری جگہ لکھتا ہے:

"میں نے کسی سے نفرت نہیں کی تمھاری طرح کہ تم آپس میں کھیلتے بھی ہو، لڑتے بھی ہو، اور پھر مل بھی جاتے ہو۔"

اور یہی پریم کا وہ امرت تھا جسے وہ ساری دنیا کو پلا دینا چاہتا تھا لیکن یہ امرت اس وقت تک پلایا نہیں جا سکتا تھا جب تک کہ انسان دوسرے انسانوں کے دکھ کو نہ اپنا لے۔ دوسروں کی تکالیف کو نہ پہچانے۔ اس کے نزدیک دنیا کی سیاسی آزادی بے معنی تھی جب تک کہ سیاسی آزادی کے ساتھ معاشی آزادی نہ ہو۔ چنانچہ ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:

"بڑے تعجب کی بات ہے کہ جب دنیا میں بہت چیزوں کی کمی ہے اور ضروریات زندگی عوام کو میسر نہیں۔ نہ جانے بہت سے لوگ بھوک اور افلاس سے دم توڑ رہے ہیں تو ایسے وقت کیا یہ ممکن نہیں کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سیاسی معاملات سے چھٹی لے کر اپنے آپ کو معاشی حالات درست کرنے کے لیے مصروف کر دے اور ایسی جگہوں میں فلاحی کام کرے جہاں بھوک اور افلاس سے انسانیت دم توڑ رہی ہے۔"

انھیں خیالات کی بنا پر اس نے پلاننگ کمیشن کی بنیاد ڈالی ہندوستان کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے ۵ سالہ پلانس کو روبہ عمل لانے کی کوشش کی اور ایک سوشلسٹ سماج کا خواب دیکھا اور دکھایا۔ لیکن یہ بنیاد اس وقت تک مضبوط اور مستحکم نہ ہو سکتی تھی جب تک کہ خانگی ادارے بھی ملک کی معاشی اور سماجی ترقی میں حصہ نہ لیں۔ اسی خیال کے تحت اس نے چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹریز کے اجلاس میں کہا تھا۔

"ہم دونوں کو بھارت کی معاشی ترقی کے لیے ساتھ ساتھ کام کرنا ہوگا۔"

معاشی ترقی کے لیے پنج سالہ منصوبوں کو روبہ عمل لانے کے لیے کئی پراجکٹس تعمیر کیے اور ان کو تعمیر ہوتا دیکھ کر اس کی مسرت کی انتہا نہ رہی وہ چیخ اٹھا۔

"یہ پراجکٹس میری عبادت گاہیں ہیں۔"

غرض جواہر لال نہرو کبھی ہریجنوں، قبائلی لوگوں اور اقلیتوں کو ان کا جائز مقام دلانے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی افریقی اور ایشیائی قوموں کی آزادی کے لیے جد و جہد کرتا نظر آتا ہے۔ کہیں نہر سوئز کے جھگڑے کو چکانے کے لیے

اقوام متحدہ سے مخاطب ہے تو کہیں پنچ شیل کے اصول چین کو سمجھا رہا ہے لیکن جب چین نے پنچ شیل کے اصولوں کا یہ احترام کیا کہ بھارت کی سرحدوں میں گھس آیا تو اس نے آزادی کی حفاظت کے لیے قوم کے نوجوانوں کو للکارا۔

"متحد ہو جاؤ، آزادی ایک چراغ ہے جو کسی آندھی اور طوفان سے نہیں بجھ سکتا۔"

غرض موتی لال کا بیٹا، گاندھی جی کا ہیرو، ٹیگور کے خیالات کا وارث، عوام کا نیتا اور بھارت کا رتن، آزادی کے چراغ کو طوفان اور آندھی سے بچاتے بچاتے بالآخر تھک کر گہری نیند سو گیا۔

لوگ پکارنے لگے۔

اٹھو جواہر لال اٹھو سو نہیں۔

یہ جنگل خوبصورت، گھنا اور تاریک ہے

"تمھیں" اپنے وعدوں کو پورا کرنا ہے۔

اور سونے سے پہلے کئی میل کی مسافت "ابھی اور" طے کرنی ہے۔

تو اس نے چتا کے شعلوں میں سے ہنستے ہنستے جواب دیا۔

یہ جنگل خوبصورت ہے "لیکن تاریک نہیں

میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔

سونے سے پہلے کئی میل کی مسافت بھی طے کر لی ہے

اب یہ تمھارا فرض ہے کہ تم مجھ سے کیے ہوئے وعدے پورے کرو

اور میری روح کو شانتی دو۔

مادھو راؤ انوری

نہرو — امدادِ باہمی تحریک کے رہنما

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال کی موت کا سوگ صرف ہم ہی نہیں منا رہے ہیں بلکہ ساری دنیا ماتم گسار ہے۔ ان کا سوگ اس لیے منایا جا رہا ہے کہ انھوں نے پوری دانشمندی اور فہم و فراست کے ساتھ آزادی کے بعد کے برسوں میں ایک عظیم قوم کی بڑی کامیاب رہنمائی کی۔

ان کا سوگ اس لیے منایا جا رہا ہے کہ وہ ساری دنیا کے ممتاز رہنما تھے جنھوں نے امن کے قیام کو اپنا شعار بنایا اور اقوام عالم میں بھائی چارگی اور اخوت کو فروغ دینے کا پرچار کیا۔

لیکن ان کا سوگ خصوصی اسباب کی بنا پر امداد باہمی کے کارکن ساری دنیا میں منا رہے ہیں کیونکہ پنڈت نہرو ایک بڑے ملک کے وہ عظیم رہنما تھے جنھوں نے کوآپریٹیوز کو ترقی دینے کی حمایت کی اور ملک کی معاشی زندگی اور معاشی ڈھانچے میں انھیں بنیادی اہمیت عطا کی۔

پنڈت نہرو نے نہایت صاف طور پر ان وجوہات کو واضح کیا کہ آخر ہندوستان کی معیشت کا بڑا حصہ امداد باہمی کے کیوں تابع ہونا چاہیے تاکہ ہم اپنی بنیادی آزادیوں کو قربان کیے بغیر معاشی ترقی کے راستہ پر گامزن ہو سکیں۔

انھوں نے اپنی تقاریر اور بیانات میں بار بار امداد باہمی کے اغراض و مقاصد کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے بتایا کہ عوام کی امداد باہمی انجمنیں سرکاری کاروبار اور منافع خور سرمایہ داروں کے درمیان بڑی اہمیت کی حامل ہوں گی۔

وہ جانتے تھے کہ امداد باہمی کی انجمنیں، آزاد عوام کو آزادی کے دائرے میں ایسا موقع فراہم کرتی ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے مسائل کو ایک سماجی مقصد اور ایک سماجی پہلو عطا کر سکتے ہیں۔

پنڈت نہرو یہ بھی جانتے تھے کہ امداد باہمی کی انجمنوں کو فوراً ترقی دینے کے لیے ابتدا میں سرکاری سرمایہ فراہم کرنے اور سرکاری طور پر رہنمائی کرنے کی ضرورت ہے لیکن انھوں نے بار بار اس بات کو واضح کیا کہ امداد باہمی کی انجمنوں پر حکومت کا کنٹرول نہیں ہونا چاہیے اور یہ کہ ان انجمنوں کو حکومت سے حاصل کردہ قرضے اور سرمایہ فوراً واپس کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ جس قدر جلد ہو سکے حکومت کا کنٹرول ختم کیا جا سکے۔

وہ افراد پنڈت نہرو کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے جو امداد باہمی کی تحریک پر یقین رکھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

جاوید لطیفی

نہرو دور میں کلاسیکل سنگیت کی ترقی

آنجہانی جواہر لال نہرو کا دور ایک مکمل تاریخی دور کہلایا جائے گا جس میں آزاد ہندوستان کی ہمہ جہتی ترقی سنہرے الفاظ میں تحریر کی جا سکتی ہے جس طرح بھارت نے زندگی کے ہر میدان میں یعنی صنعت و تجارت میں زراعت و معاشیات میں ترقی کی ہے اسی طرح تہذیبی اور ثقافتی میدان میں بھی ترقی کی ہے۔

آزادی سے قبل ہندوستانی سنگیت کا کچھ نرالا ہی ماحول تھا — نواب، روسا اور راجے رجواڑے اس فن کے قدرداں اور سرپرست تھے، فن موسیقی کے چھوٹے بڑے فنکاروں کی پرورش انھیں کے ذریعہ ہوا کرتی تھی۔ انگریزوں کے دور حکومت میں خود حکومت کی جانب سے ہندوستانی سنگیت کے بڑھاوے، حوصلہ افزائی اور ترقی و ترویج کی کوئی سبیل نہیں کی گئی سوائے اس کے کہ آل انڈیا ریڈیو سے نامور فنکاروں کو پروگرام پیش کرنے کے مواقع دیے جاتے تھے۔ ہندوستانی شاستری سنگیت ایک روحانی سنگیت ہے جس کا فن اور اصول کے علاوہ زیادہ تعلق روح و جذبات ہی سے ہے، کروڑوں کی آبادی میں ہمیں صرف گنتی کے چند ہی فنکار نظر آئیں گے، اسی طرح کروڑوں عوام میں صرف ہزاروں کی تعداد میں اس کے شائقین، اور اس سے دلچسپی رکھنے والے ملیں گے۔ گو عوام کی اکثریت شاستری گانوں سے زیادہ مانوس نہیں ہے پھر بھی شاستری سنگیت کے پروگرام ان حلقوں میں کافی سنے اور پسند کیے جاتے ہیں جنھیں اس فن لطیف سے لگاؤ ہوتا ہے — فنی اور پکے گانے پُر تاثیر ہوتے ہیں اگر انھیں غور سے سنا جائے — پکے گانوں کی فنی باریکیوں کو علیحدہ کر کے فلموں میں جو "لائٹ کلاسیکل" میوزک دیا جاتا ہے وہ عموماً مقبول ہو جاتا ہے اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام فن اور اصولوں کو نہ جانتے ہوئے بھی کلاسیکل گانوں سے کس قدر متاثر ہوتے ہیں۔

دیس کی آزادی کے بعد در پردہ ہی سہی شاستری سنگیت کو سنبھالنے اور زندہ رکھنے کا مسئلہ بھی حکومت کے سامنے آگیا تھا۔ یہ روحانی اور جذباتی فن سینکڑوں برس سے اپنی ایک خاص تاریخ اور حیثیت رکھتا چلا آیا ہے دیوی دیوتاؤں کے مندروں سے لے کر راجوں مہاراجوں اور مغل بادشاہوں کے درباروں سے ہوتا ہوا یہ فن اور اس کے فنکار انگریزوں کے دور میں اور ان کے زیر سایہ ریاستوں کے اندر بھی زندہ تھا — لیکن آزادی کے بعد جب ریاستیں . . . ختم ہو گئیں اور فن موسیقی اور اس کے فنکار اپنے سرپرستوں سے محروم ہو گئے تو خیال یہ تھا کہ

شاید ان حالات میں یہ روایتی فن ختم ہی ہو جائے گا یا یہ کہ چند مخصوص فنکاروں کے گھرانوں ہی میں زندہ رہ سکے گا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ آزاد ہندوستان کی حکومت نے اپنی ترقیاتی اسکیموں کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی توجہ دی اور فن موسیقی کی روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کرکے اسے ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔

پنڈت نہرو کے تاریخی دور میں اس فن لطیف کی بھی بڑی سرپرستی کی گئی ——— آل انڈیا ریڈیو کے پکّے گانوں کے پروگراموں کو کافی جانچ کے بعد پیش کیا جاتا ہے۔ مغربی طرز کے ساز ہارمونیم کو ریڈیو سے متروک کر دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس ساز کی وجہ سے فنکاروں کے عیب نظر نہیں آتے اور نہ ہی محاسن سامنے آتے ہیں اس کے علاوہ یہ ایک بدعاٹکا ساز ہے جس میں "مینڈھ" نہیں ہے ——— یہ بات الگ ہے کہ اس ساز کے بعض بجانے والے بھی ماہر و عظیم فن کار گزرے ہیں ———

حکومت کی زیرِ نگرانی فنکاروں کے فن کی جانچ کی خاطر "ریڈیو میں میوزک جیوری" کا تقرر عمل میں آیا ہے جو فنکاروں کی صلاحیتوں کی جانچ کرکے انھیں درجہ دیتی ہے ہر ریڈیو اسٹیشن پر میوزک پروڈیوسر ہوتا ہے اور ہر زون کا ایک سنگیت صلاح کار بھی، اس طرح حکومت کافی اخراجات برداشت کرکے سنگیت کی حفاظت کے فرائض انجام دیتی ہے۔

حکومت نے ملک کے نامی گرامی فنکاروں کی نہ صرف قدر و منزلت ہی کی ہے بلکہ انھیں پدما شری اور پدما بھوشن جیسے خطابوں سے بھی سرفراز کیا ہے ——— مشہور فنکاروں کو حکومت کی سرپرستی میں چلنے والی اکیڈیمیوں اور کلا کیندروں میں سنگیت کی ترقی و ترویج کی خاطر بھاری تنخواہوں کے ساتھ ملازمتیں بھی دی ہیں ——— حکومت کی جانب سے ریاستوں میں سنگیت کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں بھی قائم کی گئی ہیں جن میں موسیقی سے دلچسپی رکھنے والے ہزاروں طالب علم آسانی سے فنی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

قابل اور مستحق لوگوں کو حکومت کی جانب سے فن موسیقی کو بہتر سے بہتر طریقے پر حاصل کرنے کے لیے وظائف بھی جاری کیے جاتے ہیں اور اس بات کا موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہر طالب علم فکرِ معاش سے آزاد ہو کر ملک کے جس عظیم و مقبول فنکار سے چاہے اس کی رضامندی کے بعد اس سے فن کے رموز و نکات سیکھے۔

ڈانس، ڈرامہ، اور میوزک ایسے فنون ہیں جو ہر ملک اور قوم میں پائے جاتے ہیں اور جن سے عوام بھی فطری طور پر دلچسپی رکھتے ہیں عوام سے دوستی اور خیر سگالی کے جذبات حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر اور موثر ذریعہ اور کوئی نہیں ہے اس لیے ہر ملک کی حکومت، دوسری حکومت اور وہاں کے عوام سے قریبی ربط و ضبط اور دوستانہ ماحول قائم کرنے کے لیے کلچرل ڈیلیگیشن روانہ کرتی ہے جس میں اس ملک کے ماہر و مایہ ناز فنکار شریک ہوتے ہیں ——— وہ اپنا مثالی فن پیش کرکے عوام کا من موہ لیتے ہیں اور دوستی کی اَن مٹ یادگاریں چھوڑ جاتے ہیں۔

ہمارے ملک کے فنکاروں نے بھی حکومت کی سرپرستی میں مختلف اوقات میں مختلف ممالک کا دورہ کرکے

وہاں کے عوام کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔ ہندوستانی قدیم موسیقی جب اپنے روایتی انداز میں صحیح طریقے پر پیش کی جاتی ہے تو سماں بندھ جاتا ہے اور لوگ مسحور ہو جاتے ہیں۔

تہذیبی اور ثقافتی وفود کے ساتھ ملک کے نامور فنکار استاد ولایت خاں (ستار نواز) نے مڈل ایسٹ اور یورپ کے کئی ملکوں میں متعدد بار سنگیت کے پروگرام پیش کر کے داد حاصل کی ہے۔ کمسن مگر بہت بڑے فنکار استاد رئیس خاں (ستار نواز) نے روس جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے، استاد عبدالحلیم جعفر خاں (ستار نواز) چین میں اپنے فن کے جھنڈے گاڑ آئے ہیں۔ ہندوستان کے مایہ ناز آرٹسٹ استاد علی اکبر خاں (سرود نواز) کے سرود سے امریکہ اور یورپ کے تھیٹر اور میوزیکل ہال گونج گونج اٹھے ہیں۔ ہر دلعزیز اور مقبول ستار نواز پنڈت روی شنکر نے کئی بار یورپ کا دورہ کیا ہے اور اپنے فن سے لوگوں کو مبہوت کر دیا ہے، اسی طرح نکھل چندر بنرجی نے ستار کے پروگرام پیش کر کے یورپ کے کئی ممالک میں عوام کو اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔ اگر موسیقی کو حکومت کی پناہ اور سرپرستی نصیب نہ ہوتی تو نہ جانے ہندوستانی سنگیت کا کیا حشر ہوتا۔ لیکن پنڈت نہرو کے دور حکومت میں بھارتی سنگیت نے نہ صرف ہند میں بلکہ بیرون ہند بھی ایک اونچا مقام حاصل کر لیا ہے اور بھارت میں سنگیت کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں، سنگیت کے متعلق شائع ہونے والے بے شمار لٹریچر، سنگیت سمیلنوں اور ریڈیو کے نیشنل پروگراموں کی وجہ سے ہندوستانی کلاسیکل موسیقی باقی ہے بلکہ سینکڑوں فنکار خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔

ضروری اعلان

گورنمنٹ نے اپنے جاری کردہ سرکولر نمبر MUN - 8263 - A مورخہ ۲۰ر دسمبر ۱۹۶۳ء کے ذریعہ تمام مجالس بلدیہ کو پابند کیا ہے کہ وہ ہر سال ٹیکس میں ۲٪ اضافہ کرے ورنہ گورنمنٹ کی طرف سے دی جانے والی گرانٹ منظور نہیں کی جائے گی۔ اس لیے مجلس بلدیہ پربھنی نے اپنی خاص میٹنگ بتاریخ ۲۴ر اپریل ۱۹۶۴ء کو بلڈنگ اور زمینات کے حصفی یہ موقع کرایہ پر یعنی (RATEABLE VALUE) پر ۲٪ جنرل لائٹ ٹیکس اندرون حدود بلدیہ پربھنی وصول کرنے کی قرارداد پاس کی۔ اس قرارداد کو اخبارات میں چھپوا کر شہریوں کی عذرداری اندرون مدت ایک ماہ منگوائی گئی تھی۔ اس ایک ماہ کی مدت میں صرف ایک عذرداری وصول ہوئی۔ جو قانونی اور واقعاتی نقطۂ نظر سے کوئی وزن اور اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے مجلس بلدیہ نے پھر اپنی خاص میٹنگ بتاریخ ۹ر جولائی ۱۹۶۴ء کو بہ اتفاق رائے یہ طے کیا ہے کہ اندرون حدود بلدیہ یکم اپریل ۱۹۶۴ء سے بلڈنگ اور زمینات کی (RATEABLE VALUE) کا ۲٪ جنرل لائٹ ٹیکس وصول کرے۔ یہ ٹیکس محصول جائیدادہی میں شامل سمجھا جائے گا۔ اور محصول جائیدادہی کے ساتھ اور اسی طریقے پر وصول ہوگا۔ اب تک محصول جائیداد کی شرح (RATEABLE VALUE) کی ۱۲ ½ ٪ تھی لائٹ ٹیکس کے اضافے کے بعد یہ شرح ۱۴ ½ ٪ ہو جائے گی اور اپریل ۱۹۶۴ء سے محصول جائیداد نئی شرح یعنی ۱۴ ½ ٪ سے وصول کی جائے گی۔

حدود بلدیہ پربھنی میں رہنے والے شہریوں کے علم و اطلاع کے لیے مشتہر کیا گیا۔

آر۔ جی۔ بھوگلے
ایگزیکٹیو آفیسر
مجلس بلدیہ پربھنی

مخدوم محی الدین

نہرو

ہزار رنگ — ملے اک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبار — مشتِ بہار
ہوا ہے وادیٔ جنّت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دورِ جستجو بن کر

سردار جعفری

صندل وگلاب کی راکھ

مرے وطن کی زمیں کے اداس آنچل میں
نہ آج رنگ نہ خوشبو بھری ہوئی ہے دھول
خبر نہیں ہے کہ کس دل جلے کی راکھ ہے یہ
کہ سر جھکا کے پہاڑوں نے بھی کیا ہے قبول
سُنا ہے جس کی چتا سے یہ خاک آئی ہے
وہ فصلِ گُل کا پیمبر تھا عہدِ نو کا رسول
اسے خبر تھی خزاں کس چمن میں سوئی ہے
وہ جانتا تھا کہ کیا ہے بہار کا معمول
سکھایا کشمکشِ جنگ و امن میں اس نے
جراحتوں کو چمن بندیٔ جہاں کا اصول
انھیں دلوں میں محبت کی کیاریاں بوئیں
اُگے ہوئے تھے جہاں نفرتوں کے ببول
عطا ہوئی تھی اسے روز و شب کی بے تابی
وہ اس کی جرأتِ رندانہ اس کا شوقِ فضول

جو آج موت کے دامن میں اک ستارہ ہے
وہ زندگی کے گریباں میں اک گلاب کا پھول
وفا کا ذکر ہی کیا، اس کی بیوفائی نے
خراجِ عشق و محبت کیا ہے ہم سے وصول
وہ برہمن کہ جسے مسجدوں نے پیار کیا
وہ بت شکن کہ جو بزمِ بتاں میں تھا مقبول
وہ جسم آج ہے جو صندل وگلاب کی راکھ
وطن کی خاک کے سجدوں میں اب بھی ہے مشغول
اتر رہا ہے کچھ اس طرح اپنی دھرتی پر
کہ آسمان سے جس طرح رحمتوں کا نزول
اب اس کے فیض سے بنجر بھی لہلہائیں گے
کھلیں گے خارِ بیاباں سے بھی بہار کے پھول

نمبر

سکندر علی وجد

جواہر لال نہرو

(سکندر علی وجد نے یہ نظم پنڈت جی کی زندگی ہی میں لکھی تھی)

چراغ محفل علم و عمل ہے نام ترا
بہار گلشن ہندوستاں پیام ترا
طول کر نہ سکا زہر قید و بند تجھے
تلاش حسن و صداقت رہی پسند تجھے
نئی حیات ملی سوز سعی پیہم سے
دھڑک رہا ہے دل ایشیا ترے دم سے
ثمر فشاں ہے مسلسل فروتنی تیری
مسافروں کے لیے چھاؤں ہے گھنی تیری
ہر ایک بے کس و بے زر تری پناہ میں ہے
دلوں کے زخم کا مرہم تری نگاہ میں ہے
مثال صبح اندھیرے کی زد سے دور ہے تو
شب سیاہ میں تنہا منار نور ہے تو
ترا جلال نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
وطن میں امن کا ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

صب

وقار انبالوی

بھارت کو پرسہ

وہ چاند چھپا جس چاند سے روشن بھارت تیرا امبر تھا
وہ پھول جھڑا جس پھول سے مہکا آنگن آنگن گھر گھر تھا

اک جوت جگی پراَدھینوں میں سوتنترتا کی بات چلی
وہ سب کو سوتنتر کر بھی گیا اور آپ سدا سوتنتر تھا
محلوں میں پلا تھا چاؤ سے وہ راج دُلارا موتی کا
تھا موم بنا وہ نرمی میں سختی میں مگر اک پتھر تھا
در در پر اس نے دستک دی انگریز کو بڑھ کر للکارا
یا ریل میں اس کی بیٹھک تھی یا جیل میں اس کا بستر تھا
کچھ دور تو ہم بھی ساتھ چلے اس بانکے تیکھے ہیرو کے
لیکن جب ہم ساتھ سے بچھڑے تو بھی وہ اک رہبر تھا
سوراج سے برسوں پہلے ہی ہر دل پر اس کا راج رہا
وہ راج دلارا بھارت کا ہر بات میں سب سے بڑھ کر تھا
سوراج بھی اس کے بھاگ سے تھا سوراج بھی اُس کے بھاگ لگے
ہر دل پر اس کا جادو تھا وہ ایسا موہنی منتر تھا
تھا اپنے جنم سے اُونچ مگر تھے کرم کھشا تر یل والے
وہ نہی تپی وہ دیش کا رکھشک اپنی جگہ اک لشکر تھا

ذکر اس کا کیسے ہی لفظوں میں کوئی چاہے لاکھوں بار کرے

شکیل بدایونی

آہ نہرو

خامشی ہے وطن کی محفل میں
ساز ٹوٹا ہے راگ اجڑا ہے
تیرے اٹھنے سے اے جواہر لال
زندگی کا سہاگ اجڑا ہے

دولتیں کتنی تجھ سے پائی ہیں
ہم نہ بھولیں گے تیرے لطف و کرم
جاتے جاتے بھی تو نے اے نہرو
دے دیے ہم کو اپنے نقش قدم

آج بھی تو ہمارے سامنے ہے
صبر لازم ہے غم رسیدوں کو
ہم تجھے کس لیے کہیں فانی
موت آتی نہیں شہیدوں کو

غلام ربّانی تاباں

وطن افسردہ ہے

پھول رنجیدہ، صبا غمگیں، چمن افسردہ ہے
آج تاباںؔ انجمن کی انجمن افسردہ ہے

ایک دیوانہ تھا وہ بھی اپنے رستے چل دیا
سوگ میں ڈوبا ہے صحرا اور بن افسردہ ہے

جس کے دم سے وادیٔ گنگ و جمن تھی پربہار
اس کے غم میں وادیٔ گنگ و جمن افسردہ ہے

دفعتاً دیر و حرم پر ایک حسرت چھا گئی
شیخ کی آنکھوں میں غم ہے برہمن افسردہ ہے

صدرِ محفل اٹھ کے اس محفل کو سونا کر گیا
غم برستا ہے فضاؤں سے وطن افسردہ ہے

مسعود اختر جمال

وہ ساقیِ انجمن کہاں ہے

وہی ہے اب بھی وطن کی رونق، مگر وہ نازِ وطن کہاں ہے
وہی تب و تاب ہے چمن میں، مگر وہ جانِ چمن کہاں ہے
کہاں ہے اے موسمِ بہاراں، وہ خوش خرام بہشت ارماں
صبا کے دامن میں تھی جو پنہاں، وہ نکہتِ پیرہن کہاں ہے
نظر تھی جس کی پیام ساحل، نفس تھا جس کا نوید منزل
وہ عزم سوز و سازِ محفل، وہ پیکرِ علم و فن کہاں ہے
ہر اک سخن بے نظیر جس کا، ہر اک قدم جوئے شیر جس کا
جو کر گیا قیصری دلوں پر، وہ تیشہ گر کوہکن کہاں ہے
ز شرق تا غرب تا بہ امکاں، رہی ہے کل تک جو نور افشاں
وہ غیرتِ صد ہزار انجم، جبیں شکن کہاں ہے
صنم کدے میں کوئی ہوا ایسا، جو حق پرستوں کے ناز اٹھائے
جو پاسداری کرے حرم کی، بتاؤ وہ برہمن کہاں ہے
وہ حسن لغزش میں اب کہاں ہے، نثارِ دنیائے ہوش جس پر
فدا جہانِ شعور جس پر، جنوں میں وہ بانکپن کہاں ہے
چراغ جام و سبو بجھا دو، صراحیِ مشکبو ہٹا دو
وقار تھا جس سے میکدے کا۔ وہ ساقیِ انجمن کہاں ہے
جمالؔ کیا رازِ دل کہوں میں، یہی ہے بہتر کہ چپ رہوں میں
سخن کی تھی جس سے قدر و قیمت وہ نکتہ سنجِ سخن کہاں ہے

سلام مچھلی شہری

تلاش

پھر آج اُن کے "پرانے خطوط" دیکھتا ہوں
پھر آج ڈھونڈ رہا ہوں میں ان کی تقریریں
"تلاشِ ہند" کے اوراق پھر الٹتا ہوں!
خیال تھا کہ ابھی اس کو سجدہ کرلوں گا
یہ روشنی تو بہر حال میرے گھر کی ہے!
تساہلی نے مجھے ہائے کر دیا برباد
کوئی بتاؤ میری روشنی کہاں گم ہے؟
"تلاشِ ہند" کے اوراق پھر الٹتا ہوں
وہ روشنی تو یہیں تھی، ابھی یہیں ہوگی؟!

سلیمان اریب

ایک دَور کی موت

آنکھوں میں اشک ہونٹوں پہ نالے ٹھہر گئے
نغمے گلے میں، سینے میں دم جیسے رک گیا
یکلخت چلتے چلتے ہوائیں سہم گئیں
ہر شاخ پر گلاب کا سر آج جھک گیا

اب کس ہوا سے غنچۂ خاطر بھلا کھلے
بہلا لیں دل کو ہم بھی مگر تو کہاں ملے

اب کس سے کیجے ذکر، یہ کیا حادثہ ہوا
کس غم سے آج دامنِ دل تار تار ہے
کس دکھ نے تابِ نوحہ گری ہم سے چھین لی
ہر آنکھ آج کس کے لیے اشک بار ہے

ہندوستاں سہاگ ترا کیا ہوا بتا
سنگم ترا سپوت کہاں کھو گیا بتا

کن کن قیامتوں سے نگاہیں ملائیے
کس کس سوالِ زیست کا اب دیجیے جواب
کس در پہ جائیے کہ ملے روشنی کی بھیک
اے زخمہائے دل کا کسے دیجیے جواب

دنیا کا درد بانٹنے والا نہیں رہا
امڈی وہ تیرگی کہ اُجالا نہیں رہا

اک شمع تھی کہ جل بجھی اپنی ہی آگ میں
اک داستانِ مہر و وفا ختم ہو گئی
اک روحِ بے قرار کو آرام آ گیا
اک پیار کی دکھی ہوئی آواز سو گئی

موتی کی آب لٹ گئی اپنے ہی دیس میں
آج ایک دور مر گیا نہرو کے بھیس میں

حبیب تنویر

نہرو کی وصیّت

میری خاک
ان فضاؤں میں اڑا دو
انھیں آوارہ ہواؤں میں تو پنہی تھی یہ خاک
دل کو کر دو انھیں آوارہ ہواؤں کے سپرد
دھول بن کر رخِ دہقاں پہ بکھر جانے دو
عرقِ محنتِ دہقاں میں یہ بس جائے گا
عرقِ محنتِ دہقاں سے یہ خاک
بن ہی جائے گی کبھی لالہ و گل گندم و جو

مشت خاک
لے کے گنگا میں چھڑک دو
موجِ گنگا سے اٹھی دامنِ گنگا میں پلی
بیٹھ جائے گی اسی پہلوئے بے چین میں خاک
لرزشِ موجِ غمِ دل بن کر
میری خاک
کچھ تو گنگا میں چھڑک دو
کچھ فضاؤں میں بکھر جانے دو
گردِ منزل ہے یہ خاک
اڑتے رہنے دو اسے
اس میں باقی ہے ابھی کاوشِ یک منزلِ نو

غ

خورشید احمد جامی

لہو سے جس نے کرنوں کی نئی فصلیں اگائی تھیں

وہ نہرو جس نے سارے دیش کی جلتی امنگوں کو — حسیں خوابوں کی صورت اپنی پلکوں پہ سجایا تھا
وفا کے پیار کے ترشے ہوئے انمول ہیروں سے — نئی تاریخ کے ماتھے کو اتنا جگمگایا تھا
لہو سے شوخ کرنوں کی نئی فصلیں اگائی تھیں — سحر کی آرزو بن کر سحر کے ساتھ آیا تھا
ابھرتے حوصلوں کو اعتبارِ زندگی دے کر — زمیں پر آسمانوں کی بلندی کو جھکایا تھا
گزرتے قافلے کو وقت کی شاداب راہوں میں — فروغِ حسنِ مستقبل کا آئینہ دکھایا تھا

وہ نہرو مر گیا لیکن وہ نہرو مر نہیں سکتا
جو دل کے ساتھ دھڑکے آنسوؤں کے ساتھ تھرائے

خیال و فکر کے کھلتے ہوئے لاکھوں دریچوں سے — امیدوں کا سویرا بن کے اپنا نور پھیلائے
نظر آئے وہی مانوس سا چہرہ فضاؤں میں — وہی آواز جادو بن کے سینوں میں اتر جائے
نہ ٹوٹے اعتبارِ روز و شب کا سلسلہ ہرگز — نہ کوئی باغ ویراں ہو نہ کوئی پھول مرجھائے

وہ عظمت وہ اجالا، وہ صدا وہ یاد زندہ ہے
تو پھر اے موت! ایسے میں ترا کیوں کر یقیں آئے

اختر حسی

اک آفتاب ڈوب گیا دوپہر کے وقت

کیسی ہوا چلی چمن روزگار میں
جلنے لگی بہار ہجوم بہار میں
اک حشر سا بپا ہے گلوں کے دیار میں
ویرانیوں کا راج ہے ہر لالہ زار میں

ہر آنکھ اشک بار ہے ہر دل ہے سوگوار
صبر و شکیب و ضبط کا دامن ہے تار تار

رخصت ہوا یہ کون مسیحائے خاص و عام
یہ کس کے سوز غم سے ہیں افسردہ صبح و شام
ماتم کناں ہیں سب در و دیوار و سقف و بام
دست طرب سے چھوٹ گیا تھرتھرا کے جام

تہذیب کے افق پہ اندھیرے سے چھا گئے
تاریخ ارتقاء کے قدم لڑکھڑا گئے

بگڑا کچھ اس طرح سے مزاج نگار دہر!
انوار صبح پی گئے تاریکیوں کا زہر!
گم ہو گیا دھندلکوں میں اک روشنی کا شہر
انگڑائی لے کے ڈوب گئی زندگی کی لہر

طوفان کا خروش سکوں کوش ہو گیا
ملاح تھک کے بیچ سمندر میں سو گیا

بڑھنے کا وقت آیا تو سیلاب گھٹ گیا
کھلنے لگی سحر تو اجالا سمٹ گیا
پیاسے کے پاس آ کے پیالہ الٹ گیا
منزل قریب آئی تو راہی پلٹ گیا

ہونٹوں پہ آ کے رک گئے نالے اثر کے وقت
اک آفتاب ڈوب گیا دوپہر کے وقت

وہ آفتاب جس کی ضمانت ہے زندگی
وہ موج نور جس کی وراثت ہے زندگی
وہ سوز عشق جس کی حرارت ہے زندگی
وہ ساز حسن جس کی لطافت ہے زندگی

وہ زندگی کے جام لنڈھاتا چلا گیا
ہر تشنہ لب کی پیاس بجھاتا چلا گیا

دجلہ سے چاک جیب کرشنا ملا دیا
گوداوری کو نیل کا جادو سکھا دیا
جمنا کو ٹیمز کا دم عشرت فزا دیا
گنگا کو وولگا کا فسانہ سنا دیا

دھرتی کو یوں سمیٹ لیا اپنے پیار میں
دلّی کا دل دھڑکنے لگا ہر دیار میں

واماندگان شب کو پیام سحر دیا
وابستگان صبح کو ذوق نظر دیا
ناموس امن کے لیے خون جگر دیا
داماں زیست لعل و جواہر سے بھر دیا

ہندوستاں میں پیار کی دولت بکھیر دی
سارے جہاں میں پیار کی دولت بکھیر دی

شاذ تمکنت

نظم

جاوِداں

بوئے گل خانۂ گل چھوڑ کے کس سمت چلی — اے چمن زارِ وطن یہ ترا مقسوم نہ تھا
مہر نے شرق کی وادی کو بھلایا کیوں کر — خضر بھی راستہ بھولے گا یہ معلوم نہ تھا

دیدنی ہے مرے زخموں کی ہراسانی بھی — آج گم ہو گیا سامانِ جراحت جیسے
یوں خیال آتا ہے جیسے تو مجسم آئے — یاد یوں آتی ہے دیکھی ہوئی صورت جیسے
اے جواں سال مثلِ بیج کے مانند تجھے — دل کی مٹی میں چھپایا ہے امانت جیسے

پھر بہار آئے گی پھر اگلے برس شاخوں پر — کونپلیں کوکیں گی پھولوں کا چراغاں ہوگا
فصل لہرائے گی سونے کی عماری کی طرح — سات رنگوں کا وہی موسمِ باراں ہوگا
جب دمِ نیم شبی ہوں گے الاؤ روشن — داستاں گو کی زباں پر ترا پیماں ہوگا
زندگی جہدِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں — یہی تقویمِ شب و روز کا عنواں ہوگا
ہر شگوفے کی رگوں میں ترا خوں جاری ہے — ہر نیا دور ترا دورِ زرافشاں ہوگا

شام در شام ملیں گے تری یادوں کے ایاغ
نسل در نسل ترا دردِ نمایاں ہوگا

نظم

میر ہاشم

تیرے بغیر

بات ایسی کوئی انہونی نہیں ہے پھر بھی
دل یہ کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہو سکتی
ذہن چپ چاپ ہے گم سم سی ہے دل کی دھڑکن
سوچ کہتی ہے کہ اب کیا ہو گا ؟

رات نے ڈس لیا، گل ہو گئے آنسو کے دیئے
نیند کم کم سہی ہر حال میں آجاتی ہے
رام لیلا کا یہ میدان، ہزاروں انساں
پھر وہی چاند سا چہرہ، وہی کندن سی جبیں
پھر وہی دیس کی باتیں، وہی پردیس کا ذکر

رات خوابوں میں کٹی
رات آنکھوں میں کٹی
اور اب دن کے نکلنے پہ ہے حیرت دل کو
وقت کیوں کر نہ تھما ؟
کیسے یہ سورج نکلا ؟
ایسی دنیا میں کہ جس دنیا میں
تیری آواز کا جادو بھی نہیں تو بھی نہیں

بشر نواز

صداقت مر نہیں سکتی

ہوائیں چلتے چلتے رک گئیں گہنا گیا سورج
بگولے تلملاتے خاک اڑاتے چار سو اٹھے
فضائیں ماتمی چیخوں سے بوجھل ہیں
گلستاں میں
نسیم صبح چلتی ہے تو ہوتا ہے گماں جیسے
کئی ناکام روحیں دور صحرا میں سسکتی ہیں۔
وہ غم ہے اشک آنکھوں میں لبوں پر حرفِ ماتم جم کر رہ جائے
رگوں میں دوڑتا خوں لمحہ بھر کو تھم کے رہ جائے
مغنی چاک داماں سر بہ زانو ہے
کہ تنہا فرد کا نوحہ بھی مانگے ہے لہو دل کا
یہاں اک قوم کا اک دور کا نوحہ سنانا ہے
کہاں سے ساز پائے کون سی آواز لے آئے
کہاں وہ دل کہ خاموشی سے جو اس غم کو سہہ جائے

گھٹا جاتا ہے دم بڑھنے چلے ہیں رات کے سائے
مگر اک پیار میں ڈوبی ہوئی آواز مشعل
فروزاں ہے
یہ کہتی ہے
محبت کی صدا چاہت کا نغمہ مر نہیں سکتا
وہ نغمہ پھیل جاتا ہے
کبھی خوشبو سے گُل ہو کر
کبھی معصوم ہونٹوں پر تبسم کی کرن بن کر
کبھی حرفِ وفا بن کر
کبھی طبلِ وغا بن کر
محبت کی صدا چاہت کا نغمہ اک صداقت ہے
صداقت مر نہیں سکتی تو وہ ہر محفل میں جیتی ہے
ہمیشہ دامنِ انسانیت کے چاک سیتی ہے

نظم

شور مینائی

آنسو اور گلاب

رشی، منی، اوتار، پیمبر
اس دھرتی سے اٹھے ہیں
سورگ اور نرک، برا اور اچھا
نیکی اور بدی کی بات
ان سب نے سمجھائی ہم کو
ہم نے ان کو پوجا ہے
سر نیوڑھائے چرن چھوئے ہیں
ہم نے ان کی پرستش کی ہے

اور بہت سے راجہ آئے
جن کی طاقت، جن کی دولت، جن کی عظمت، جن کا وقار
دیکھ کے ہم مرعوب ہوئے ہیں
ان کی ہم نے عزت کی ہے

اور آخر میں تم آئے ہو
سینے پر اک پھول لگائے

لال، سرخ، انگارہ پھول
دور سے دیکھ کے سمجھا ہم نے
شاید کوئی گھاو لگا ہے
سینے پر اک زخم پڑا ہے
اور جب تم پاس آئے تو دیکھا
یہ سچ مچ اک زخم ہی تھا
ہم سب کے دکھ درد دیکھ کر
سینہ تمھارا چھلنی تھا

اور پھر اُس سینے کی گہرائی سے اک آواز آئی
درد میں ڈوبی
آشا کی کرنوں کا تبسم ساتھ لیے
جھلاکر، جھنجلاکر اس آواز نے ہر دل تڑپایا
دستِ عمل کو دعوت دی اور بندِ قفس کو کھلوایا
اور بہت دن تک ہم اس آواز کے پیچھے چلتے رہے
تم نے ہم سے سورگ نرک کی

بات کبھی بھولے سے نہ کی
آنے والی دنیا پر
وشواس بھی تم کو کم ہی تھا
لیکن اس دنیا کے سبھی دکھ
تم نے ہم سے مانگ لیے
خون پسینے کی محنت کا رستہ ہم کو بتلایا
اور تمہاری بھیگی آنکھ اور زخمی دل اور اٹھتے ہاتھ
ہم نے ان سے محبت کی
تم عزت کے قابل۔ پوجا کے قابل بھی تھے لیکن
ہم نے تم سے محبت کی

اور پھر آج تمہارے دل سے
خون کے دھارے بہہ نکلے ہیں
جانے تم نے کیا دیکھا ہے
جانے تم نے کیا سوچا ہے
اب چپ ہے آواز تمہاری
ہونٹ سلے ہیں، آنکھیں بند
لال سرخ پھولوں کو مسل کر
آنسو، آہیں، سب ٹھکرا کر

آج اکیلے چل نکلے ہو
آگ کی سیج پہ لیٹ گئے ہو
اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں
تم نہ پلٹ کر آؤ گے

لیکن آج سے پہلے بھی
کتنی بار ہم نے دیکھا ہے
آگ کا دھاوا تم نے روکا
شعلوں سے کی تم نے لڑائی
اور ہمیشہ جیت کے آئے
اور اب کے بھی
تم جو پلٹ کر آ جاؤ تو دیکھو گے
کھلتے ہوئے ہر سرخ پھول کو اب بھی ایک ہی ارماں ہے
تم سے گلے مل جانے کا
وقت تو اپنی دھار پہ بہت جائے گا
لیکن جب تک آنکھیں ہیں
سوکھ نہ پائیں گے آنسو

تم جو پلٹ کر آ جاؤ گے تو جانو گے
تم ہو امر اور پیار ہمارا بھی ہے امر

یوسف ناظم

خاکستر

(پنڈت جواہرلال نہرو کی وصیت)

مجھے اس دیس کے لوگوں نے اتنا پیار بخشا ہے
کہ میرے جسم میں اس کی حرارت رقص کرتی ہے
مجھے ہر گام پر لوگوں نے عزّت دی محبت دی
مرے الفاظ جس کی ماہیت سمجھا نہیں سکتے
یہ مانا مجھ سے پہلے بھی کئی لوگوں نے پایا ہے
محبت کا یہ تحفہ اور عقیدت کا یہ سرمایہ
مگر مجھ تک تو ہم وطنوں کے اتنے پیار پہنچے ہیں
کہ میں جذبات کی شدّت سے کچھ بھی کہہ نہیں سکتا
بدل اس پریم کا کیا ہو؟ صلہ اس پیار کا کیا ہو؟

مری خواہش ہے اپنے دیس پہ میں خونِ دل چھڑکوں
مری خواہش ہے میرا دیس ہو آزاد بندھن سے
وہ بندھن جن میں تفریق و عداوت کار فرما ہوں
وہ زنجیریں جو جسم و روح کی بالیدگی روکیں
وہ بندھن جو بہاروں کی فسونِ تازگی روکیں
تمنّا ہے یہ زنجیریں یہ بندھن کٹ کے گر جائیں
قیودِ بغض و نفرت سے وطن آزاد ہو جائے

مگر ارمان یہ بھی ہے کہ ہم بھولیں نہ ماضی کو
کہ یہ میراث ہے اپنی، بڑی ہی بیش قیمت ہے
یہ ورثہ ہے محبت اور تہذیب و تمدن کا
مرے دل کی صدا یہ ہے نہ ٹوٹے رشتۂ الفت
رہے یہ روشنی قائم، رہے یہ سلسلہ قائم

مری یہ آرزو ہے جب میں مر جاؤں تو ہم وطنو!
چتا کے آتشیں شعلوں میں تم مجھ کو جلا دینا
مرا یہ جسم فانی راکھ کا جب ڈھیر ہو جائے
تو خاکستر اڑا دینا وطن کی ان فضاؤں میں
چھڑک دینا اسے کھیتوں میں تاکہ جزو بن جائے
وطن کی پاک مٹّی کا — جدا ہونے نہ پھر پائے

مری کچھ راکھ کو سنگم کے پانی میں بہا دینا
کہ اس پانی سے میں بچپن سے الفت کرتا آیا ہوں
مری وابستگی اس سے ابھی تک یونہی قائم ہے
مجھے گنگا پیاری ہے کہ اس کے بہتے پانی میں
مجھے اس دیس کی تہذیب کی تصویر ملتی ہے

حکیم یوسف حسین خاں

ماتمِ گُل

ق

شُرخ اک پھول کھلانے کے لیے
حدّتِ عزمِ جواں
اور نمِ صد کوہ کناں
ایک انسان کو درکار ہوا کرتے ہیں

پھول سینے پہ سجانے کے لیے
عشقِ صادق کی حنا
آبروئے دُرِّ وفا
ایک انسان کو درکار ہوا کرتے ہیں

پھول کو دیپ بنانے کے لیے
سُرخیٔ حُسنِ ازل
دُردِ تہہ جامِ غزل
ایک انسان کو درکار ہوا کرتے ہیں

اے گُلِ سرخ تقدّس ترا پانے کے لیے
صبح کے دل کا لہو
شام کے گہرے آنسو
ایک انسان کو درکار ہوا کرتے ہیں

پھول آنچ اُوس کی سورج کی نمی ہوتے ہیں
پھر بھی سب پھول مقدر کی ہنسی ہوتے ہیں

یا تو سینہ پہ جلا کرتے ہیں پھولوں کے چراغ
یا بکھرتے ہیں حِنا پرپی خوش رنگ سے خواب
آج کی سیج ہیں گُل۔ کل کے لیے شعلۂ داغ
پھول مت دو مجھے ہونٹوں سے لگانے کے لیے
خار کی طرح مرے دل میں کھٹکتا ہے گلاب!

راشد آذر

نہرو امر ہے

کیا دل کا سکون مٹ گیا ہے
کیا وقت کی نبض رک گئی ہے
یا رہزنِ مرگ کے قدم پر
پیشانیِ زیست جھک گئی ہے

وہ کون امیرِ کارواں تھا
یہ قافلہ جس کو رو رہا ہے
کس دکھ میں ہر ایک اپنا چہرہ
اشکوں سے لہو کے دھو رہا ہے

ہر ایک گلاب پوچھتا ہے
شاداب رہوں تو کس کی خاطر
ہر ایک کلی یہ پوچھتی ہے
میں آج کھلوں تو کس کی خاطر

وہ جس کا پیام ہے محبت
وہ جس نے سکون تج دیا ہے
کہہ دو کہ وہ مر نہیں سکے گا
گو موت نے قید کر لیا ہے

اے رہزنِ مرگِ ناگہانی
اس بات کی کیا تجھے خبر ہے
نہرو ہے امینِ امنِ عالم
نہرو کا یہ فلسفہ امر ہے

ہر ایک کے دل میں گھر کرے گا
نہرو تو کبھی نہیں مرے گا
نہرو تو کبھی نہیں مرے گا

نظم

وقار خلیل

حادثہ

روشنی بجھ گئی
پھول مرجھا گئے
اک سجل شخصیت دفعتاً اٹھ گئی
پھر وہی تیرگی قسمتِ دل بنی!
دیدہ ور اٹھ گیا
قافلہ لٹ گیا
صبح کے زرفشاں نقش سنولا گئے
دیپ جلنے سے پہلے کجلا گئے
فرقِ ظلمات پر
چاند گہنا گیا
خواب کی جاگتی وادیاں سو گئیں
آرزوؤں کی شہزادیاں کھو گئیں
نور پھر جم گیا
پھر گھٹا چھا گئی
حادثہ وہ ہوا، شاخِ گل جھک گئی
نور پھر تھم گیا، نبضِ پھر رک گئی
پھول مرجھا گئے
روشنی بجھ گئی

نظم

مادام مرزا کیمپی

ترجمہ ۔ حسن فرخ

شعلہ اور راکھ

میں پہلے تو تھا جگمگاتا ہوا ایک شعلہ
مگر اب فقط راکھ ہوں
سنو! راکھ کیا گا رہی ہے
"اٹھاؤ مجھے آسماں تک اٹھاؤ
اگرچہ کہ میں ہوں فقط راکھ
لیکن مجھے پنکھ ہیں، اور خواہش ہے
پرواز کرنے کی مجھ کو وہاں تک
جہاں جھومتے گنگناتے ہوئے نیلے نیلے سے
بے چین سے ابر پھیلے ہوئے ہیں
بکھیرو
اڑا دو، ننھے سند ماتا کی ابھری ہوئی چھاتیوں پر
انھیں ڈھانپ کر پھیل جاؤں گی
ریشم کے گھونگھٹ کے مانند پھر اس سے
سرگوشیوں میں یہ پوچھوں گی
— ماں کیا تو محسوس کرتی ہے مجھ کو
مری زندگی میں اور موت کے بعد
شعلے کی صورت میں اور راکھ کے پیرہن میں،
ہر اک شکل میں خود کو تیرے لیے وقف میں کر چکی ہوں"
مجھے اپنی چھاتی سے لپٹا کے
آہستہ سے ماں یہ کہتی ہے
"ٹھہرو! میرے پیارے بچے!
میں آرام کرنے کی تجھ کو کبھی بھی اجازت نہ دوں گی
فنا کے سیہ ساحلوں تک پہنچنے نہ دوں گی

تری نماک سے جنم لیں گے
جھکتے ہوئے سرخ نوخیز غنچے گلابوں کے
اور زندگانی کی خوشبو میں لپٹے ہوئے نودمیدہ کنول تیرے سینے پہ
ہردم مہکتے رہیں گے

میں آزاد تھا، غیر مغلوب تھا نیلی نیلی سمندر کی موجوں کی مانند
لیکن میں مجبور اہوں اب پرسکوں راکھ ہوں اب
سنو! راکھ کیا گا رہی ہے
"بس اک مٹھی بھر
بس اک مٹھی بھر مجھ کو لے لو
الہ آباد سے پھر
کسی کھیت کی ناچتی گاتی پگڈنڈیوں سے
گزرتی ہوئی خوبصورت سی ندی میں مجھ کو بہا دو
میں لافانی گنگا تلک پھر پہنچ جاؤں گی، جو کہ
آہستگی سے جھلاتے ہوئے مجھ کو لے جائے گی دور
یعنی سمندر تلک اور پھر ساری دنیا کے
اک اک سمندر تلک پھر میں
لوگوں کی سوچوں خیالوں، دلوں اور جذبوں میں بہنے لگوں گی
وہ مجھ سے یہ پوچھیں گے۔ اے امن کے دوست کی ہمسفر!
تو بھی آرام کرتی نہیں کس لیے؟
گلے تم سب آپس میں مل جاؤ۔ مل جاؤ آپس میں اک دوسرے سے گلے
یہ آواز آئے گی
اس موج سے جس کے سر پر مری راکھ کا تاج ہوگا
گلے مل کے پھر دوسری موج سے، اپنی نظریں جھکائے
وہ بڑھتی چلی جائے گی آگے ہی آگے
بے چین بے تاب اور تشنہ تشنہ کسی عالمِ مضطرب میں
ہر اک سمت نغمے ہی نغمے لٹاتے ہوئے
امن کے پیار کے، پیار کے امن کے"



منظور شدہ محکمہ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

ماہنامہ

صبا

حیدرآباد دکن

زر سالانہ ہندوپاک سے	۱۰ روپے
ششماہی	۶ روپے
بیرون ہند سے	۲۰ شلنگ

ایڈیٹر

سلیمان اریب

فون (۴۴۴۰۲)

(عبد بن محمد آرٹسٹ)

کاتب :- محمد مظہر

جلد	۱۰
شمارہ	۸
ماہ	اگست
سنہ	۱۹۶۴ء
قیمت	ایک روپیہ

دہلی آفس :- ۱۹۵۰ ترکمان گیٹ دہلی ۶

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :-

ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۳۷۰۲) کراچی ۳

بڑ پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب، ۷ امجد درگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد، مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان

آئیے ہم مل جل کر باہمی بھائی چارے کی فضا پیدا کریں۔ ملک اور اس کے تمام باشندوں کی ترقی کے لئے کام کریں۔ یہی ایک طریقہ ہے ملک کی خدمت کا، اسے عظیم، متحد اور مضبوط بنانے کا۔

— جواہر لال نہرو

ایک قوم ایک ملک

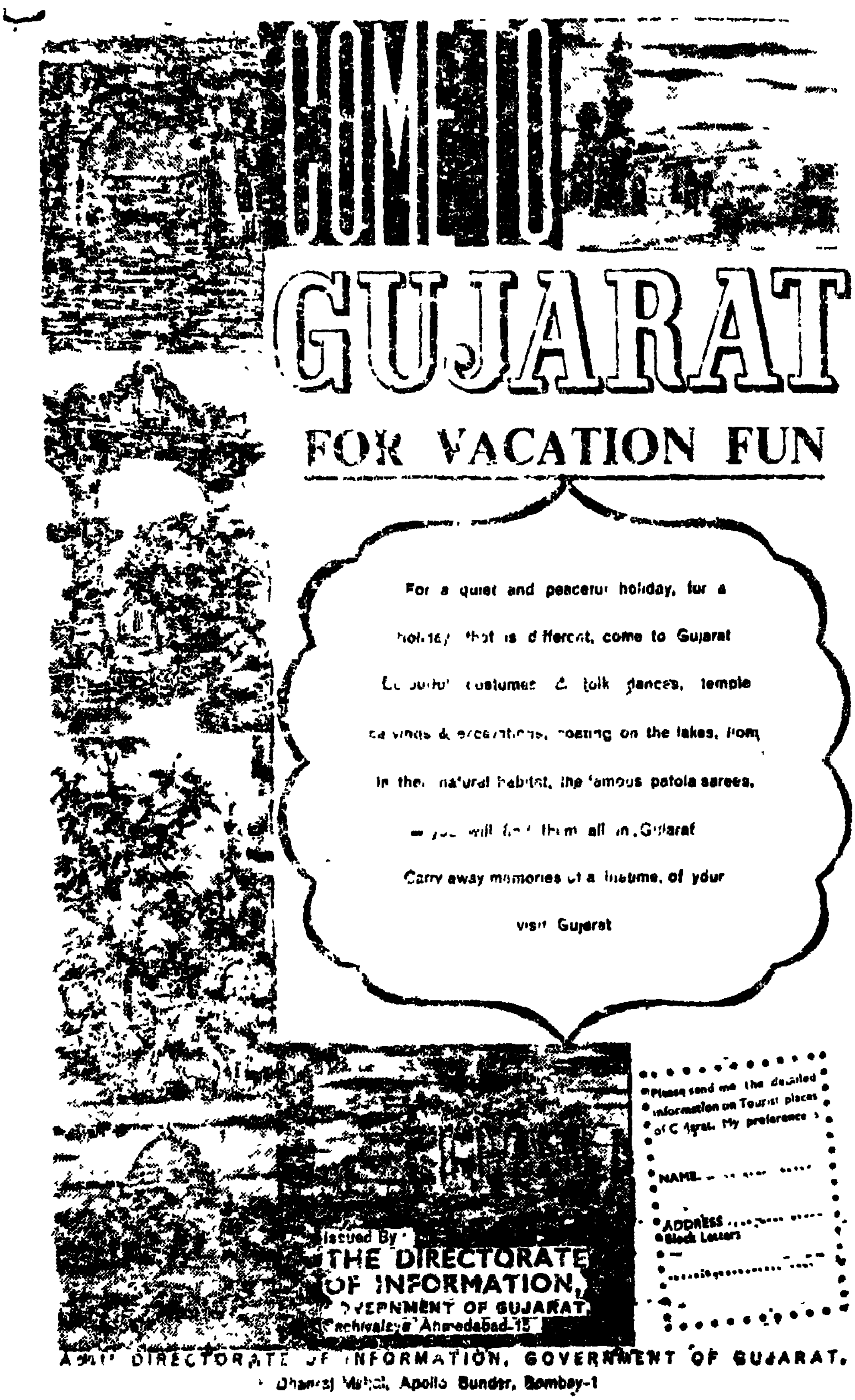
ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے عوام کو خواہ بعض معاملوں میں ان کے خیالات کتنے ہی مختلف ہوں، یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ سب ہندوستانی ہیں اور یہ کہ انہیں اپنے تمام اختلافات قوم اور ملک کے ناقابلِ تقسیم ڈھانچے ہی میں رہتے ہوئے دور کرنے ہیں۔

— لال بہادر شاستری
وزیر اعظم

بھارت کو مضبوط کرنے اور اس کے تمام باشندوں کے لئے آزادی اور خوشحالی کو یقینی بنانے کا ہمارا راستہ صاف اور سیدھا ہے۔
تمام لوگ مل کر ایک قوم کی طرح مل کر کام کریں۔ اپنے اندر قومی عزم، یگانگی کا جذبہ اور بردباری پیدا کریں۔
آج جو چیلنج ہمیں درپیش ہے اس کا صحیح جواب نظم و ضبط اور محنت ہی ہے۔

جے ہند

ایکتا بنائے رکھیے۔ آزادی کی حفاظت کیجیے


GUJARAT
FOR VACATION FUN
For a quiet and peaceful holiday, for a
come to Gujarat
folk dances, temple
on the lakes,
the famous patola sarees,
them all in Gujarat
Carry away memories of a lifetime, of your
visit Gujarat
Please send me the detailed
information on Tourist places
My preference
NAME
ADDRESS
Block Letters
Issued By
THE DIRECTORATE
OF INFORMATION,
GUJARAT
DIRECTORATE OF INFORMATION, GOVERNMENT OF GUJARAT,
Apollo Bunder, Bombay-1

اس شمارے میں

پہلی بات

اگست کا شمارہ جو ضخامت میں "صبا" کے عام شماروں سے کچھ کم ہونے کے باوجود بہت وقیع ہے، حاضر ہے۔ اس بار کہانیاں اور شعری تخلیقات شامل نہیں کی جا سکیں جس کی تلافی آئندہ شمارے میں کر دی جائے گی۔

ڈاکٹر گیان چند

اردو نثر کے ارتقا میں داستانوں کا حصہ

ناول کے طلوع سے پہلے اردو میں جو افسانوی ادب ملتا ہے اسے داستان اور حکایت کا نام دیا جاتا ہے۔ حکایت ایک مختصر اخلاقی کہانی ہے جس کا مقصد تفنن طبع یا خدمت ادب نہیں بلکہ اصلاح کردار ہے۔ ان میں مطلب کی بات اکثر حیوانات کی تمثیل میں کہی جاتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج میں اور اس کے بعد بھی فارسی حکایات کے کئی ترجمے ہوئے جن میں سب سے مشہور باغ اردو، اخلاق ہندی، بوستان حکمت ہیں۔ داستان کے کردار، روداد اور ماحول سب کچھ حکایت سے مختلف ہوتے ہیں۔ داستان کسی خیالی دنیا کا دلکش بیان ہوتا ہے اور اگر شاذ و نادر یہ واقعات ہماری دنیا کے ہوتے ہیں تو کم از کم کسی ایسے خطے کے جو ہمارا جانا پہچانا نہیں جس کی پہنائی تخیل کی جولانی کے لیے وسیع و عریض بازی گاہ مہیا کر سکتی ہے۔

داستان کی منطقی تعریف نہیں کی جا سکتی لیکن اس کی سب سے نمایاں خصوصیت غیر واقعیت کی طرف اشارہ کیے بغیر بھی نہیں رہا جاتا۔ اردو میں داستانوں کی جتنی کتابیں ہیں ان سب میں فوق الفطرت عناصر کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوتے ہیں لیکن فوق الفطرت ہونا داستان کی لازمی خصوصیت نہیں قرار دی جا سکتی۔ الف لیلہ کے سوتے جاگتے کی کہانی یا باغ و بہار کے پہلے درویش کی سرگزشت میں کہیں فوق الفطری مخلوقات نہیں لیکن انھیں کون داستان نہ کہے گا۔ ان دونوں داستانوں میں جو کچھ ہے وہ واقع ہو سکتا ہے لیکن ہوتا نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسرے دیار کے منتخب لوگوں کی باتیں ہیں جن تک ہم خاک نشینوں کی رسائی نہیں۔

داستان کے بارے میں دوسری عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ شیطان کی آنت کی طرح اور ژولیدہ ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے داستان کا جلی وصف نہیں۔ سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی کی بیشتر کہانیاں بہت خوش اسلوبی سے داستانی فضا کی حامل ہیں۔ طوطا کہانی کی کئی حکایتیں دراصل مختصر داستانیں ہیں۔ شاید [illegible] کا بیان تمام داستانوں کی قدر مشترک ہے۔ داستان کا جوہر عوام میں ہو سکتا ہے لیکن اسے یہ پسند نہیں۔

داستان کی دلکشی اور دل ستانی، داستان کی سحر طرازی اور افسوں گری افسانہ میں حکایت کو بہت پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ داستان کار اپنی دنیا کی بہترین چیزوں سے لطف اندوزی پر نظر رکھتا ہے۔ اسے حکایت نگار کی طرح

اس جہاں کو سدھارنے اور عافیت کو سنوارنے کی کوئی بے تابی نہیں۔

داستان کی مندرجہ بالا تاویل ذہن میں رکھیں تو ناول اور افسانہ سے پہلے کا تقریباً تمام افسانوی ادب داستانوں کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ ناول کے دوش بدوش چودھویں صدی تک داستان گوئی بھی نہ صرف رائج بلکہ عزیز خاطر رہی چنانچہ داستانِ امیر حمزہ (جس کا ایک دفتر طلسم ہوشربا ہے) اور بوستانِ خیال کے لکھنوی سلسلے بیسویں صدی کا دامن چھو لیتے ہیں اسی طرح کئی صدیوں تک۔ اردو نثر کا ارتقا داستان کی داستان ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل تک نثری ادب اور داستان تقریباً مترادف ہیں۔ اس صدی کے نصف آخر میں بھی داستانوں کا ایک وقیع سلسلہ ملتا ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کے آخر سے اردو نثر میں مستقل کتابیں ترتیب دی جانے لگیں اس طرح کوئی ساڑھے چار سو سال کے نثری ادب میں غالب حصہ داستانوں ہی کا ہے۔ اردو نثر کا آغاز دکنی صوفیوں کے تکیوں اور خانقاہوں میں ہوتا ہے محفل و دربار میں نہیں۔ اس کی وجہ تالیف اردو نثر کی خدمت نہیں دنیا و عقبیٰ کی اصلاح تھی۔ ابتدائی نثر نگار خواجہ بندہ نواز کے شکارنامے میں افسانے کے خدوخال دکھائی دے جاتے ہیں۔ یہ ایک عارفانہ تمثیل ہے جو معمّا نما قصّے کے روپ میں بیان کی گئی ہے۔ نثر کے ابتدائی ڈھائی سو سال میں متعدد عارفانہ اور مذہبی رسالے لکھے گئے۔ اردو ادب کی تاریخ میں انھیں محض ان کی قدامت کے باعث جگہ دی جاتی ہے ورنہ ان کے ظاہر و باطن میں ادب کا کوئی رنگ روپ نہیں۔ ابتدا میں جو کچھ بھی ملتا ہے مغتنمات میں سے ہے۔ جب افراط ہو جاتی ہے تو انتخاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اردو نقاد انیسویں یا بیسویں صدی کی مذہبی تحریروں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔

دراصل اردو نثر کی پہلی ادبی کتاب وجہی کی سب رس ہے جسے متفقہ طور پر اردو کا پہلا نثری قصہ تسلیم کیا گیا ہے۔ تمثیلی کرداروں سے قطع نظر یہ ہر طرح داستانی انداز لیے ہوئے ہے۔ اس کے بعد دکنی نثر پر افسانوں ہی کا عمل دخل ہو جاتا ہے جن میں سے گلستان اور انوارِ سہیلی کے دو ایک ترجموں کو چھوڑ کر باقی سب داستانیں ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

طوطی نامے کے دو ترجمے سنگھاسن بتیسی، کام روپ و کام لتا۔ قصہ ملکہ الزماں و کام کندلا۔ قصہ جہانگیر، امیر حمزہ۔ قصہ گل و ہرمز قصہ انار رانی، قصۂ بندگانِ عالی، ہشت گلشن قصۂ ممن رخ و آذر شاہ۔ داستانِ جہاں دار، بہارِ دانش کے چند ترجمے۔

یہ سب غیر مطبوعہ ہیں۔ شمالی ہند کے ابتدائی نثری ادب میں فضلی کی کربل کتھا اور شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر کے تراجم قرآن آثارِ قدیمہ کے طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اٹھارویں صدی کی نثر میں ادب کی مدعی محض تین کتابیں ہیں۔ نوطرزِ مرصع از تحسین قصۂ ملک محمد و گیتی افروز از مہر چند کھتری اور جذبِ عشق قلمی از شاہ حسین حقیقت۔ اس تفصیل سے صاف ظاہر ہے کہ انیسویں صدی سے پہلے کی نثر میں جزوِ غالب داستانوں کا ہے۔ شمالی ہند میں انیسویں صدی میں جس کثرت سے داستانیں لکھی گئیں وہ تفصیل سے بے نیاز ہیں۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو نثر کی زنبیل میں داستانوں کے سوا کیا ہے۔

باغ اردو اور آرائشِ محفل از افسوس۔ اخلاقِ ہندی از بہادر علی حسینی۔ نورتن از مہجور۔ بستانِ حکمت از گویا۔ آثار الصنادید از سرسید۔

ان میں بھی آرائش محفل اور آثار الصنادید کے علاوہ باقی سب کتابیں حکایات کا مجموعہ ہیں جو داستان سے زیادہ اصنی نہیں۔ سنہ ۱۸۵۵ء کے بعد سروش سخن اور طلسم حیرت کے علاوہ امیر حمزہ اور بوستان خیال کے سلسلوں کے متعدد ترجمے اور طبع زاد تصانیف ملتی ہیں۔ اس طرح کم از کم سنہ ۱۸۶۰ء تک کی اردو نثر داستان ہی کے سہارے پھلتی پھولتی اور بالیدہ ہوتی رہی ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء کے بعد بھی داستان نے اردو نثر میں وقیع اضافہ کیا۔

لیکن داستانوں کی اہمیت مقدار اور ضخامت ہی میں نہیں ان کے ادبی حسن میں ہے۔ داستان سے پہلے اردو نثر گرتی پڑتی لڑکھڑاتی چل رہی تھی۔ وہ معنی کا تن ڈھانپنے کے لیے ایک بے رنگ جامۂ حرف تھی۔ موضوع سے ہٹ کر اس میں کوئی جاذبیت نہ تھی لیکن سب رس کی بسم اللہ کے ساتھ داستان بڑی گھن گرج کے ساتھ دکن کے افق سے اٹھی اور آناً فاناً تمام اردو ادب پر چھا گئی۔ نثر اور نظم دونوں پر سردست ہمیں صرف نثر سے سروکار ہے۔ سب رس اردو کی پہلی داستان ہے لیکن یہ نقش اول اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ زبان کی فرسودگی سے قطع نظر اسے انشا پردازی کے کسی شاہکار کے روبرو رکھ دیجیے اس کی تابانی ماند نہ ہوگی۔ وجہی کے ہم عصر مولانا عبداللہ۔ میراں جی خدانما۔ میراں یعقوب وغیرہ کے روکھے پھیکے نثری رسالوں کے بعد جب ہم سب رس کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ نثر ارتقا کی اتنی منزلیں یہ کب جست لگا کر طے کر گئی۔

یہاں سب رس کے بارے میں کوئی تعارف یا تبصرہ قلم بند کرنا مقصود نہیں صرف اس طرف توجہ دلانی ہے کہ انشا پردازی کے جتنے حربے ہو سکتے ہیں وجہی نے ان کا خاطر خواہ استعمال کیا ہے۔ مسجع نثر لکھنے میں جو ہو بہو کیفیت اس کے یہاں ہے اس کی نظیر بعد کے اردو ادب میں کہیں نہیں ملتی۔ وہ مقفیٰ فقروں کے ایک جوڑ سے ہی بس نہیں کرتا بلکہ ان کا انبار لگاتا چلا جاتا ہے۔ ایک موصوف کی دس صفت بیان کرتا ہے جس میں تشبیہ و استعارہ سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ مثلاً

"سلطان عبداللہ۔ ظل اللہ عالم پناہ، صاحب سپاہ، حقیقت آگاہ۔ دشمن پرور، ثانی سکندر، عاشق صاحب نظر دل کے خطرے تی باخبر، صورت میں یوسف تی اگلے، آدم بے ہوش ہوئے، بہتر بگلے۔"

وجہی کی ادبیت اسلوب ہی تک مقید نہیں۔ وہ جس مجرد تصور یا شئے پر اظہار خیال شروع کرتا ہے دس دس صفحوں تک بند نہیں ہوتا۔ خیالات کا بحر ذخار ہے جس میں ٹھاٹھیں مارتا پانی اٹھتی چلی جاتی ہے۔ عقل۔ شراب۔ فقر۔ مشیروں کے انتخاب وغیرہ کے بارے میں اس کے خیالات کو علیحدہ کر لیا جائے تو بقول مولوی عبدالحق وجہی کی ایک جلد تیار ہو سکتی ہے۔ یہ مضامین کسی آشفتہ حکیم کی خشکی دماغ کی موشگافیاں نہیں ایک رند خانہ سوز کی کیف آمیز لٹکیں ہیں جنھیں شعر منثور کہا جا سکتا ہے۔ یہ خالص انشائیے ہیں۔ اگر انشائیے کو ایک طویل سلسلے کا جزو بننے کی آزادی دے جائے تو وجہی اردو کا پہلا انشائیہ نگار تھا۔ پہلی ادبی کوشش کے بعد ہی اردو نثر فارسی نثر کے مقابل کھڑی ہو گئی۔

سب رس کے بعد دکن میں بہت سی داستانیں لکھی گئیں جن میں سے ایک درجن سے زیادہ کے مخطوطے اب بھی

ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طویل عرصے میں متعدد داستانیں لکھی گئی ہوں گی لیکن دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں جو موجود ہیں ان میں سے ایک آدھ کے سوا نہ کسی کا سنہ تصنیف معلوم ہے نہ مصنف یا مترجم کا نام۔ ان سب میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ عبارت آرائی نہیں پائی جاتی۔ صرف ہشت گلشت میں کسی حد تک سجع کا استعمال اور فارسی محا کا ترجمہ ملتا ہے۔ عام طور سے ان داستانوں کو قصہ گوئی کے اصول کے مطابق سیدھے سادے طریقے سے بیان کیا گیا ہے تاکہ روداد کی دلچسپی کثرتِ الفاظ کے انبارِ خس و خاشاک میں گم نہ ہونے پائے۔ ان میں سے چند داستانوں کی ز میں قدیم دکنی انداز ہے گو بیشتر کی زبان صاف اور جدید ہے جس کی بنا پر انھیں اٹھارویں صدی سے پہلے جگہ نہیں دی جا سکتی۔ قصہ کام روپ و کام لتا سنہ ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ - ۵۳ء) یعنی فورٹ ولیم کالج کے قیام سے ۴۴ سال پہلے کی تالیف ہے کہ اس کی زبان کا نمونہ ملاحظہ ہو۔[1]

"کنور کام روپ وہاں سیر و شکار کو جاتا تھا ایک روز ایسا ہوا کہ راجہ شکار سے فارغ ہو کر عمارت میں آ بیٹھا اور چند شخص جو اس کے رفیق تھے وہ بھی حاضر تھے۔ مترچند کا بیٹا جو بہت عاقل تھا۔ دوسرا پدیا چند پنڈت کا بیٹا کہ نجومی خوب تھا۔ دھنتر حکیم کا بیٹا کہ حکمت میں پورا تھا۔"

یہ زبان حیرت ناک حد تک جدید ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کاتب نے متروکات کی اصلاح کر دی ہو۔ اسی زمانے میں اردو ادب کا مرکزِ ثقل دکن سے شمال کو منتقل ہو جاتا ہے جہاں دربار کی زبان فارسی تھی جہاں اردو نثر سے کوئی واقف ہی نہ تھا۔ ایسے میں فضلی نے کربل کتھا لکھی تو فارسی سے متاثر ہو کر۔ اس کے بعد ۱۷۷۵ء میں شمال کی پہلی نثری دا نو طرزِ مرصع وجود میں آئی۔ یہ مرصع رقم میر حسن عطا خاں تحسین کی کاوش کا نتیجہ تھی جسے انھوں نے بزعم خود ہر جگہ بیش از بیش مرصع بنا دیا۔ ترصیع کی فراوانی کے باعث نثر اس حد تک مغلق ہو کر گئی ہے کہ اس کا پڑھنا بارِ خاطر ہوتا ہے

"پر اس وقت وہ ابرِ نیساں آسمانِ عظمت و کرامت کا طوعاً و کرہاً موتی منصود کے تئیں بیچ صدفِ آرزوئے ملکۂ حور لقا زیبا طلعت کے پُر کر کے بعد فراغتِ غسل کے اس مکان سے اٹھ کر طرف خانہ باغ کے متوجہ ہوا۔"

شمالی ہند میں سلیس اردو نثر کے آغاز کا سہرا میر چند کھتری ہنر کے سر ہے جس نے ۱۲۰۲ھ میں نو آئین ہندی یعنی قصۂ ملک محمد و گیتی افروز لکھا۔ ہر کسی انگریز کو اردو زبان کا درس دینا چاہتے تھے . . . .

لیکن انھیں اردو نثر میں اس ڈھب کی کوئی کتاب نہ ملی۔ نو طرزِ مرصع عبارت کی گنجلک کی وجہ سے ٹکسال ا پائی گئی لہٰذا ہنر نے نو آئین ہندی کی تصنیف کی گویا جس بنا پر فورٹ ولیم کالج میں سلیس اردو نثر کا فروغ ہوا، اسی مقصد سے دراصل ہنر اس کا افتتاح کر چکے تھے۔ تحسین کے محض تیرہ سال بعد صنف داستان اردو نثر کو وہ زبان دیتی ہے جو آج بھی زرِ کامل عیار ہے۔ ملاحظہ ہو۔

---

[1] اردو نثر کا آغاز و ارتقاء از ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ص ۳۰۵

" ایک دن خورشید پر برسات کے موسم میں موافق معمول کے اپنے محل میں آرام کرتا تھا کہ یکایک آندھی چلنے لگی، ہوا کی شدت سے بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دو ایک کے بعد وہ آندھی تھم گئی اور ہوا موقوف ہوئی تو بادشاہ کے کان میں ایک عورت کی آواز آئی کہ آہ آہ کر کے کہتی تھی کہ میں جاتی ہوں کوئی ایسا ہے جو پیچھے رہ سکے۔ بادشاہ نے پلنگ پر لیٹے لیٹے پھر دو تین دفعہ یہی آواز سنی۔ پھر خواب گاہ سے نکل کر چھت پر آیا کہ آواز کا حال دریافت کرے۔"

یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ انشاء پرداز دکن کے نثر نگاروں کے وجود سے ناآشنا تھے۔ ان کے کارناموں سے اردو نثر کی عمارت بنیاد ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک اردو نثر کی طویل منزل میں جہاں ہمیں ادب کے پھول رنگ بکھیرتے نظر آئیں گے وہاں محض داستاں کے خیاباں ہوں گے۔ یہ روایت انیسویں صدی میں بھی جاری بلکہ اور بھی بامایہ ہو گئی۔ فورٹ ولیم کالج کی دکان میں جو متاع مختصر ہے وہ محض چند داستانوں کے زریں نوانا ستے ہیں۔

فارسی قطعے میں کہا گیا ہے کہ شعر میں تین پیمبر ہیں۔ فردوسی، انوری اور سعدی۔ کسی نے پوچھا اور حافظ؟ جواب ملا وہ تو خدائے سخن تھا؛ یہی کیفیت میرامن کی ہے۔ میر اگر اہل زبان تھے تو امن خالق زبان۔ انھوں نے دلّی کے قدیم طلبا لوگوں کو ملا کر سخن کا آب حیات پیش کیا۔ گھڑی بولی جس آب و تاب سے باغ و بہار میں جلوہ گر ہے دوسری جگہ نہیں۔ واہ کیا بات ہے۔

"اس دن سے یہ مقرر ہوا کہ خواجہ سرا صراحی اس جیو کرے کے ہاتھ لوالا دے اور بندی پی جاوے۔ جب کہ شہ طلوع ہوتا تو اس کی لہر میں اس کے لڑکے سے ٹھٹھا مزاح کر کر دل بہلاتی تھی۔"

اس دور میں ایک نہیں کئی داستانیں سہل اور سادہ رنگ میں لکھی گئیں اگرچہ ان میں میرامن کی سادہ پرکاری نہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں انشا نے رانی کیتکی کی کہانی میں نثر کا وہ تجربہ پیش کیا جو آج تک اپنی جگہ منفرد ہے۔ یہ بھی ایک انداز تھا۔

"کنور جی کا روپ انوپ کیا کہوں کچھ کہنے میں نہیں آتا۔ کھانا نہ پینا نہ لگ چلنا کسی سے کچھ کہنا نہ سننا جس دھیان میں تھے اسی میں کھوئے رہنا اور گھڑی گھڑی کچھ سوچ سوچ سر دھننا۔"

ہندی آمیز بلکہ ہندی سے متاثر انداز اردو داستانوں سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی میں ملتا ہے۔ آخر الذکر میں ایک راج کماری کے حسن کا نظارہ کیجئے۔

"اس کا مکھ چندرما کا سا، بال گھٹا سے، آنکھیں برق کی سی، ناک تیر کی سی، گلا کبوتر کا سا، دانت انار کے سے دانے۔ ہونٹوں کی لالی کندوری کی سی، کمر چیتے کی سی، ہاتھ پاؤں کونپل کے سے رنگ چیتے کا سا، غرض اس کے جوبن کی جوت دن بہ دن بڑھتی تھی۔"

مندرجہ بالا تینوں کتابوں میں اردو ہندی کی فصیلیں منہدم ہو جاتی ہیں۔ یہ تصانیف اردو ہندی کا مشترک سرمایہ

ہیں۔ ان کا اسلوب اردو کے اسالیب بیان میں ایک اضافہ ہے۔

نو طرزِ مرصع میں جس طرزِ نگارش کو بدسلیقگی سے پیش کیا گیا تھا اسی کی بنی بنائی اور سجی سجائی صورت فسانہ عجائب میں ملتی ہے۔ میرامن نے ٹھیٹ اردو کا ٹھاٹ دکھایا۔ رانی کیتکی کی کہانی، سنگھاسن بتیسی، اور بیتال پچیسی میں ہندی رنگ تھا۔ فسانۂ عجائب اردو کے فارسی زدہ اسلوب کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی نثر پر ہم کتنی ناک بھوں چڑھائیں کتنے رخنے نکالیں لیکن حقیقت کو کیوں کر جھٹلا سکتے ہیں کہ فسانۂ عجائب اپنے دور کی مقبول ترین کتاب تھی۔ فسانۂ عجائب کو لے کر اردو فارسی کے بیش رو انشانگاروں کے مقابل کھڑی ہو سکتی تھی۔ سرور نے ایسا جادو جگایا جو بیس سال تک اردو نثر کے سر چڑھا رہا۔ سرور اپنی معاشرت کی پیداوار اور اپنے ماحول کے ترجمان تھے۔ انھوں نے لکھنؤ کے علم دوست مذاق سے داد چاہی۔ اگر ایک گھڑی کے لیے ہم بھی خود کو اس ماحول اور مذاق سے ہم آہنگ کر لیں تو فسانۂ عجائب کی مرصع سازی مسجع ترنم اور فقروں کی نشست اور بندش کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

"خمِ ابرو محرابِ حسیناں، سجدہ گاہِ پردہ نشیناں، چشمِ غزالی سرمہ آگیں ہے۔ آہوئے رم دیدۂ کشورِ چیں ہے۔"

"باغ کا کیا کہنا۔ اگر ایک تختہ کی صفت تحریر کروں ہزار تختۂ کاغذ پر بخطِ ریحاں نہ لکھ سکوں۔ دمِ تسطیر قلم میں برگ نکلتے ہیں، لکھنا بار ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں بالکل سوتے ہیں۔ صفحۂ قرطاس پر گل پھولتے حاسد کو خار ہوتا ہے۔"

انشا کا یہ رنگ ایسا ہے جیسے کوئی رکن دربار مرغ زریں بنا ہوا کوئی بیگم دکھائی جو ہر نظر آ رہی ہو۔ بھولے سے سرور روزمرہ لکھ جاتے ہیں تو بیان کی حلاوت پر زبان کی فصاحت ہونٹ چاٹنے لگتی ہے۔

"ایک خواص خاص باشارۂ ملکہ آگے بڑھی۔ پوچھا کیوں جی میاں مسافر تمھارا کدھر سے آنا ہوا اور کیا مصیبت پڑی ہے جو اکیلے سوائے اللہ کی ذاتِ بے ہمتا نہ کوئی سنگ نہ ساتھ اس جنگل میں وارد ہو۔ شہزادے نے مسکرا کر کہا مصیبت خیلا تجھ پر پڑی ہوگی معلوم ہوا یہاں آفت زدے آتے ہیں۔"

اس مسکراہٹ میں داستانی کی کیا کیا ادائیں بھری ہیں۔ وہی سب شہزادے کے کلام سے پھوٹ پھوٹ کر جلوہ گر ہو رہی ہیں۔ سرور کے یہاں یہ رنگ خال خال ہے ورنہ وہ اپنی وضع کے پابند ہیں۔ بعد کی داستانوں میں ان کے یہاں فارسیت کم ہوتی گئی لیکن دوسرے حربے برقرار رہے چنانچہ گلزارِ سرور میں جو سب رس کی طرح کی تمثیلی داستان ہے سجع کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔

فسانۂ عجائب کا اسلوب داستانوں ہی کے ڈھب کا تھا۔ اس رنگ میں کوئی علمی کام تو نہیں ہو سکتا تھا اس مقبولیت نے اردو نثر کے ارتقا کے راستے میں سنگِ گراں حائل کر دیے۔ اس مردِ مجتہد سر سید احمد خاں نے ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید جیسی خالص علمی کتاب لکھی تو مجبور ہو کر اسی رنگ میں لکھی۔

"ان حضرات کی طبعِ رسا شکلِ رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بدیہی الانتاج سے اربابِ فہم و

اور ناخنِ فکر عقدۂ لاینحل کو پہلے اس سے وا کرتا ہے کہ گرہِ حباب کو انگشتِ موجِ دریا۔ معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبانِ سوسن نے کیا کہا۔"

یہ سرسید بول رہے ہیں کہ فسانۂ عجائب کا طوطا تقریر کر رہا ہے۔ سات سال بعد دوسرے اڈیشن کی اشاعت کے وقت سرسید میں اس قدر جراتِ رندانہ پیدا ہو چکی تھی کہ آثار الصنادید کو عالمانہ کی بجائے علمی رنگ میں لکھ سکے۔

۱۸۵۷ء کے بعد داستان کا طلسم کمزور پڑ کر شکست ہونے لگتا ہے۔ غدر سے پہلے اردو نثر پر داستانوں کا اجارہ تھا۔ ادب نثر میں جو کچھ پڑھنے کے قابل تھا وہ صرف داستانیں تھیں۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں داستانوں کی مقبولیت مخصوص ملکوں اور مخصوص علاقوں میں رہ جاتی ہے۔ کچھ سال تک فسانۂ عجائب داستانوں پر چھایا رہتا ہے چنانچہ سرورِ سخن (۱۸۶۱ء) اور طلسم حیرت (۱۸۷۲ء) اسی انداز میں لکھی گئیں۔ شعون کے طلسم حیرت کا کمال یہ ہے کہ اردو میں سجع جگت کے اعتبار سے کوئی کتاب اس کا سر دامن بھی نہیں چھو پاتی اس کتاب میں شاید دو سطریں بھی ایسی نہ ہوں گی جن میں ایہام کی پیترے بازی نہ ہو۔ ظہیر دہلوی کے قصۂ ممتاز پر بھی کسی حد تک فارسی کا غلبہ ہے اور سجع کی کوشش کو جا بجا کی گئی ہے۔ ضخامت کے اعتبار سے غدر کے بعد داستانوں کا سرمایہ سابق ذخیرے سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اس دور میں الف لیلہ، امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کے سلسلوں میں دفتر کے دفتر سیاہ کیے گئے۔ رام پور میں اردو داستانوں کی سب سے بڑی ضخیم جلدیں محفوظ ہیں۔ نول کشور پریس کے محافظ خانے میں بھی غیر مطبوعہ داستانوں کے انبار لگے ہیں۔ امیر حمزہ کے سلسلے میں نول کشوری ترجمہ (۱۸۸۳ء سے ۱۹۰۵ء) سب سے زیادہ مشہور رہا۔ اس میں عام طور سے سادہ و سلیس زبان استعمال کی گئی ہے جہاں داستان گو علم و فضل کی ترنگ میں آتا ہے وہاں فسانۂ عجائب کی لے الاپنے لگتا ہے۔ امیر حمزہ کے لکھنے والوں میں طلسم ہوشربا کی ابتدائی چار جلدوں کے مصنف منشی محمد حسین جاہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔ وہ اردو کے دوسرے بڑے انشا پردازوں کی طرح زبان و بیان کے ساحر تھے۔ فسانۂ عجائب کے رنگ میں لکھیں گے تو ہموار باذاق متوازن اسلوب ہوگا سادگی اور صفائی پر آئیں گے تو روانی کے ساتھ ذوقِ جمال کا ثبوت بھی دیتے چلیں گے۔ صرف ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"کنجی ازاربند سے اپنے کھول کر لگائی۔ اس وقت اس نازک بدن کا اونچے ہو کر ایک ہاتھ سے قفل تھامنا اور دوسرے سے کنجی لگانا ہزار بناؤ دکھاتا تھا۔ وہ پتلی پتلی انگلیاں، چوڑی ہتھیلی کا رنگ برنگِ شہاب، وہ دونوں پائنچے چھوٹ کر بازوؤں پر آجانا، قفل کھولنے میں منہ بن جانا، بالوں کا رخ پر آجانا، سر ہلا کر پائنچوں کو ہٹانا... آخر بمقتضائے ع کھولا کنجی نے جو رخنہ — مدِ اتفاق کی ہوئی قفل کھل گیا۔"

اتنے الفاظ میں ہمارے فن کار نے محض ایک تالا کھولنے کا بیان کیا ہے لیکن اس میں کن کن کرشموں پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں داستانِ امیر حمزہ ناولوں سے زیادہ مقبول تھی۔ خانوتر

ہونے سے پہلے چراغ بھڑکتا ہے۔ طلسم ہوشربا داستان کے چراغ کی بھڑک تھی۔ اس بھڑک نے قاریوں کے دیدۂ و دل روشن کر دیے۔

اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو نثر کا عہد شیرخوارگی اہلِ باطن کی خانقاہوں میں گزرتا ہے لیکن اس کے بعد داستان اس کی انگلیاں پکڑ کر چلنا سکھاتی ہے۔ دیو پری اس پر سایہ کیے رہتے ہیں اور ساحر اپنے آسیب سے محفوظ رکھتے ہیں یہاں تک کہ عقلیت کی برقی روشنی ان مخلوقات کو فرار کے لیے مجبور کرتی ہے۔ انھیں بھی یہ تسلی ہے کہ اب اردو نثر عنفوانِ شباب میں قدم دھر چکی ہے۔ اسے ان کی دست گیری اور پشت پناہی کی ضرورت نہیں۔

نثر کو داستان نے ایک جھوڑ کئی اسالیب دیئے، ادبیت دی، دل ستانی کے حربے دیئے، جو پہلے محض ایک مجموعۂ بے رنگ تھا اسے نہ صرف شاہ پسند بلکہ عوام پسند اور زرنگ بنادیا۔

لیکن نثر کو داستان کی دین محض آدابِ گفتگو ہی نہیں اس نے معاشرت کی بھرپور آئینہ داری بھی کی ہے۔ اس معاشرت میں بڑا تنوع اور پھیلاوا ہے۔ عام طور سے یہ معاشرت ہند، ایرانی یا مغل شاہی ہے۔ اس میں کہیں محمد شاہی دلی کا شکوہ ہے تو کہیں نوابین اودھ کا طمطراق برسے جاتے ہے۔ تفصیلات میں جانے کی مہلت نہیں۔ صرف باغ و بہار فسانۂ عجائب اور امیر حمزہ میں دلی اور لکھنؤ کی زندگی کے کئی پہلو جگمگ جگمگ جھلکیاں دے رہے ہیں۔ فسانۂ عجائب کے دیباچے میں تو نصیر الدین حیدر کا لکھنؤ (بغداد مشرق و رشکِ اصفہان) اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ نظاروں کے سامنے سے لرز رہا ہوتا ہے۔ لکھنوی داستان امیر حمزہ میں سے فوق الفطرت نکال لیجئے تو محض اودھ کی تہذیب ہی باقی رہے گی ایران و توران تو محض ایک بھرم ہے۔

داستانوں میں بھولے بھٹکے دوسری تہذیبوں کے نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں۔ سنگھاسن بتیسی، بتیال پچیسی رانی کیتکی کی کہانی وغیرہ میں قدیم ہندوستان اپنے راجاؤں اور جوگیوں، راج کماریوں اور باندیوں کو جلو میں لیے موجود ہے، تو الف لیلہ کی بہت سی کہانیوں میں شب رو خلیفہ ہارون رشید کا بغداد، بصرہ اور موصل دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔

داستان نے اردو نثر کو رنگ روپ نکھار اور رچاؤ بے شک دیا لیکن اس کی بڑھتی ہوئی... مقبولیت نے اردو نثر میں دوسرے موضوعات کی انگیخت کا سدّباب بھی کیا۔ دیو پری کے افسانوں کی جگہ ملک و ملت کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ردِّ سحر کی ضرورت پڑی۔ داستان نے بہ خوشی ناول کے لیے مسند خالی نہیں کی۔ ناول داستان کی ارتقا یافتہ صورت نہیں مغرب سے درآمد کی ہوئی جنس ہے۔ ناول کی امتیازی خصوصیت حقیقت نگاری ہے داستان کا مابہ الامتیاز وصف حقیقت فراموشی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں سحر و طلسم کی داستانیں رائج ہوئیں۔ انھیں واقعی زندگی کا روکھا پھیکا پن ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ کسی دوسری کائنات کے

وہ ناول کو کیوں کر جنم دے سکتی تھیں۔

اسیوں کے معاربات اور معاشقات میں کھوئی ہوئی تھیں۔
غرض داستان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بڑی عنت سے نثر کو دل نشیں اور دل نواز
بنادیا۔ اس میں متعدد اسالیب کے کامیاب تجربے کیے۔ شاعری کے بعد یہ ادب کا سب سے بڑا مخزن قرار پائی۔ نثر
میں کوئی صنف شاعری سے کندھا ٹکراتی ہے تو داستان ہے۔ داستان کی بدولت اردو نثر کو کتنی جلد پایۂ اعتبار ملا۔
وہ بہ یک جست بادشاہوں کی بارگاہوں، امرا کی مجلسوں اور عوام کے اجتماعوں کی روح رواں بن گئی۔ اس
نے اردو کو وجہی، میرامن اور رجب علی بیگ سرور جیسے صاحب طرز انشا پرداز دیئے۔ اس نے اردو نثر کو
فکر و ذہن نہیں دیا لیکن قلب و نظر، جذب و تاثر ضرور دیئے۔

کل سے بہتر آج ہو اور آج سے بہتر ہو کل

۱۔ پانچ سالہ منصوبوں نے صنعتی ترقی کی رفتار کو تیز تر کر دیا اور معاشی خود کفیلی کے راستے کو ہموار بنا دیا ہے۔ زراعت ایک سادہ زندگی بسر کرنے کا وسیلہ ہوتی ہے اور صنعت و حرفت زندگی کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے شہ رگ کا درجہ رکھتی ہے۔ جب مشینری کے پہیے تیزی کے ساتھ گھومنے لگیں اور ہل پوری قوت کے ساتھ زمین جوتنے لگیں تو یقیناً ملک مسرت و شادمانی کی تصویر بن سکتا ہے۔ حکومت آندھرا پردیش ملک کی ایک ایسی ہی تصویر بنانے کی جد و جہد میں مصروف ہے۔

۲۔ دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے تحت رقمی خرچ کا پروگرام ۵۰ء۷۵ کروڑ روپے کا ہے۔ اسٹیٹ انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے نیچے بتائے ہوئے چار پروجکٹ اپنی راست نگرانی میں شروع کر دیے ہیں۔

۱۔ ہائی ٹنشن اینڈ لو ٹنشن انسولیٹر پروجکٹس
۲۔ انٹگریٹیڈ گلاس پروجکٹ
۳۔ بال بیرنگس پروجکٹ اور
۴۔ پگ آئرن پروجکٹ

سمال اسکیل انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے اب تک چھوٹے پیمانے کے صنعتی اداروں کے لیے کنٹرول شدہ قیمتوں پر (۶۵) لاکھ روپے کی مالیت کا خام مال حاصل کر کے تقسیم کیا ہے۔

۳۔ مرکزی شعبے کے تحت ریاست میں دو عظیم الشان صنعتی کارخانے قائم کیے گئے ہیں ایک تو (۲۰) کروڑ روپے کا سنتھٹک ڈرگس پروجکٹ ہے اور دوسرا (۳۵) کروڑ کا ہیوی الکٹریکلس پروجکٹ۔ ان کی بدولت مستقبل قریب میں ریاست کا صنعتی افق نہایت خوشگوار منظر پیش کرنے والا ہے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ "ہندوستان مشین ٹولس" کا پانچواں یونٹ اور ڈیفنس الکٹرونکس فیکٹری بھی اس ریاست میں قائم کی جائے۔

آندھرا پردیش آج کے مسئلوں کو حل کرتے ہوئے ایک روشن مستقبل کی طرف قدم بڑھا رہا ہے جس کی کوشش یہی ہے کہ

"کل سے بہتر آج ہو اور آج سے بہتر ہو کل"

(جاری کردہ:۔ ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش)

شمس الرحمن فاروقی

شیکسپیئر اور ہم

دنیا کے چند بڑے شاعروں کے نام گنوائیے: ہومر، ڈینٹی، فردوسی، شیکسپیئر وغیرہ۔ کبھی آپ نے یہ غور کیا ہے کہ ایک اوسط درجہ کا تعلیم یافتہ انسان چاہے وہ کہیں کا بھی باشندہ ہو، اس فہرست میں شاید صرف شیکسپیئر سے ہی ذاتی طور پر واقف ہوگا۔ ڈینٹی یا ہومر سے نہیں۔ ہندوستان کی بات ذرا اور الگ ہے۔ کیوں کہ یہاں عام طور پر ہم خود اپنے ہی بڑے شاعروں سے واقف نہیں ہیں کجا کہ غیر زبانوں کے شاعروں سے۔ لیکن پھر بھی آپ کو زیادہ تر لوگ ایسے ملیں گے جنھوں نے کالی داس غالب اور ٹیگور کا ذاتی مطالعہ نہ کیا ہوگا لیکن شیکسپیئر سے کچھ نہ کچھ متعارف ضرور ہوں گے۔ اس حیرت انگیز حقیقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک انوکھی بات ہے کہ بہت سے لوگ شعوری یا غیر شعوری طور پر شیکسپیئر کو چار سو سال پرانا ایک کرم خوردہ دیوان یا شیرازہ سمجھ کر اپنے ذہن کی سطح سے مٹا دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اگر شیکسپیئر کو پڑھنا اور سمجھنا ہی ہے تو اس کے لیے طالب علموں کی طرح درس لینا ضروری ہے اور شیکسپیئر (یا شاید کوئی بھی) اتنی محنت کے لائق نہیں ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ کسی گم نام زمانے میں رہنے والے ایک وینس کے سوداگر یا کسی حبشی جنرل یا کسی احمق شہزادے جن کی اصلیت خواب و خیال سے زیادہ نہیں کے بارے میں کچھ جاننے سے فائدہ ہی کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کچھ طبقوں میں یہ خیال عام ہے کہ شیکسپیئر کے ڈراموں اور زمانۂ جدید کے حیرت انگیز حالات و تصورات میں کوئی ربط یا کوئی تناسب نہیں۔ شیکسپیئر دور حاضر کے روح فرسا مسائل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اس لیے شیکسپیئر کا مطالعہ کلاس روم کے باہر بے کار اور بے معنی ہے۔

اس طرح ہمارے سامنے دو سوال مرتب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ شیکسپیئر کا مطالعہ اور دوسرے شاعروں کے مقابلہ میں زیادہ عام کیوں ہے؟ کیوں کہ یہ آپ ملحوظ خاطر رکھیں کہ جو لوگ شیکسپیئر کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا وہ ہومر اور حافظ سے اور بھی نابلد ہیں۔ ہم پڑھنے والوں کی فہرست میں شیکسپیئر کا نام سر فہرست ہے لیکن ان لوگوں کی تعداد بھی کم نہیں جو شیکسپیئر یا کسی بھی اور شاعر سے جس کے انداز فکر و بیان میں بظاہر کچھ اجنبیت ہے واقف ہونا بھی نہیں چاہتے۔ اس لیے دوسرا سوال یہ کیا جا سکتا ہے ہم شیکسپیئر کو کیوں پڑھیں؟

ہم شیکسپیئر کو کیوں پڑھتے ہیں اور اگر نہیں پڑھتے تو کیوں پڑھیں۔ ان بظاہر سادہ سے سوالات میں شیکسپیئر فہمی کی ایک وسیع معنوی دنیا مخفی ہے اور اگر ہم ان کا تھوڑا بہت ہی تشفی بخش جواب دے سکیں گے تو ہماری شیکسپیئر اور ساتھ ہی ساتھ ذہن انسانی

یاہے۔ ان استعارات کی گہری معنویت کی طرف مس سپرجن نے سب سے پہلے اشارہ کیاہے، کس قدر زبردست ہے ں کا احساس آپ کو فوراً ہو گیا ہو گا۔

نفسیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی دماغ اور روح کی پُرپیچ گہرائیوں کا جب مطالعہ شروع کیا گیا اور ادب ب تمثیلیت کے نظریہ اور عمل سے باقاعدہ متعارف ہوا تو شیکسپئر کے استعارات میں کیرولائن سپرجن کی ڈھونڈی ہوی عنویت سے زیادہ گہرائیاں نظر آنے لگیں۔ اب وہ صرف اشارے نہیں بلکہ تمثیل یعنی ایک عرفان اور طرزِ فکر نا روشنیوں کے نقطے بن گئے۔ کسی ایک ڈرامے کا مفہوم تو واضح ہو گیا لیکن پورے فکر و فن میں کیا چھپا ہوا ہے اس کو یکھنے کے لیے شیکسپئر کی تمثیلیت کو سمجھنے کی کوشش ہونے لگی۔ اب مکبتھ کا اٹنگا لباس اس کے جرم کا نشان نہیں بلکہ ود جرم بن گیا۔ جس طرح لباس پورا اور صحیح پہننا ہوشمندی اور انسانیت کی نشانی ہے ویسے ہی اپنے بادشاہ کو ل کرنا جو قانون اور اصول کی تمثیل ہے کائنات کے لافانی اور پُراسرار قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ جرم بادشاہ کو قتل رنا نہیں ہے بلکہ روح کی بغاوت ہے جو اپنے مناسب لباس میں نہیں ہے بلکہ دوسروں کے بے ڈھنگے لباس پہن ر اپنی ہی پاکیزگی کی عصمت دری کرتی ہے۔

شیکسپئر کے کلام میں کوئی پیغام ہو یا نہ ہو لیکن اس میں معنی اور آگہی کی ایک روح ضرور موجود ہے، اور آج ہم اس کے رامون کی ظاہری چمک دمک سے زیادہ اس روح کی طرف متوجہ ہیں، کیوں کہ ہم انسانی تاریخ کے جس دور سے گزر رہے ں اس میں پھیلی ہوی بے چینی، بے یقینی اور بے راہ روی کے اثر سے ہم کو بچانے کے لیے نہ سائنس کے محیر العقول رنامے کام آتے ہیں اور نہ مذہب کی میٹھی لوریاں۔ انسان ایک حد تک جینے کی امید کھو چکا ہے۔ انسانی زندگی میں لاقانونیت رآدمی کے جسم و جان کی کم قیمتی نے ہمارے تمام حساس ذہنوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ مادہ میں چار عناصر ہوں یا بانوے لیکن اس میں سکون و طمانیت کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ اس ہمت شکن فضا میں شیکسپئر کے کلام کی ضرورت ہمارے لیے اور رہ جاتی ہے، گھٹتی نہیں۔

شیکسپئر کی شاعرانہ عظمتوں کا تذکرہ چھوڑ دیجئے۔ حالانکہ سب سے زیادہ سریع اور فوراً ظہور پذیر ہونے والے عمل جو پڑھنے والے یا دیکھنے والے پر مرتب ہوتے ہیں وہ اس کے کلام کی خوبصورتی سے ہی ہوتے ہیں۔ قلوپطرہ کے بجرے کا ر جو پانی پر آگ کی طرح روشن ہے، پانی کے اندر متلاطم اس آگ کا ذکر جو نیل کی تہہ میں بکھری ہوی کیچڑ کو حاملہ کر دیتی ہے ورج ڈوبتے وقت روشنی کے غلیظ ہو جانے کا ذکر، آموجن (IMOGEN) کے آنسوؤں کا ذکر جو اس ا آنکھوں سے اس طرح گرتے ہیں جیسے ہیروں سے موتی، شاہ لیئر کے روحانی کرب کا ذکر جو خود کو ایک آتشیں ؟ ں ـ بندھا ہوا پاتا ہے اور جس کے آنسو اس کو پگھلے ہوے سیسے کی طرح داغ رہے ہیں، گل مہکتے پھول جو بہار کی ہواؤں اپنے حسن سے مسخر کر لیتے ہیں، بادلوں کے پرے جو کبھی ریچھ بن جاتے ہیں اور کبھی شیر۔ اس طرح کے ہزاروں استعاروں ر تمثیل کی فن کاریوں کو اپنی روح میں اتار لینے کے لیے ہی اگر شیکسپئر کا مطالعہ ہم کریں تو ہماری محنت رائیگاں

نہ ہو۔ لیکن اس طرح کا حسن ہمیں اوروں کے یہاں بھی مل جاتا ہے چاہے اتنا فراواں اور اتنا متنوع نہ ہو۔ آج شیکسپئر کی ضرورت ہمیں جس جنس گراں کی وجہ سے ہے وہ ہمیں فردوسی اور ہومر، حافظ اور گوئٹے میں بھی نہیں ملتی۔ ڈینٹی کی طرح کے تنگ نظر اور ملٹن کی طرح کے محدود الخیال شاعروں کا ذکر ہی کیا۔

شیکسپئر اس وقت ہمارے سامنے نظم و ضبط کے ایک پیغمبر کی طرح کھڑا ہے۔ سرد و گرم جنگ کے تھپیڑوں سے کھلائی اور مضمحل اس دنیا کو جو ہزار ہا صف بستہ فوجوں میں منقسم ہے کسی ایسے شاعر کی ضرورت ہے جو اسے امید اور محبت سے بھر دے، جس کا کلام روزانہ ہونے والی چھوٹی موٹی چیزوں میں الجھ کر نہ رہ جائے بلکہ کائنات کے ان مقاموں کو چھونے کی کوشش کرے جہاں سے انسانی زندگی کا آغاز و اختتام ہوتا ہے۔ شیکسپئر کا بنیادی موضوع جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں نظم و ضبط تھا۔ ہنری پنجم کی عظمت یہ ہے کہ اس نے امن و ضبط قائم کیا۔ مکبتھ کا جرم یہ تھا کہ اس نے ایک مستحکم اور پختہ نظام کو بگاڑا۔ اوتھیلو اور انٹونی نے اپنی شخصیت کے توازن اور ضبط سے بغاوت کی اس لیے موت کے شکار ہوئے۔ ہیملٹ نے اپنی ماں کے جرم کو اس شدت سے محسوس کیا کہ اس کا توازن اور نظم ختم ہو گیا۔ پراسپرو اس لیے کامیاب ہے کہ اس نے سلطنت اور دولت کے کھو جانے پر بھی قائم شدہ نظام سے بغاوت نہیں کی۔ وہ اگرچہ عناصر کا نظام درہم برہم کرنے پر قادر ہے لیکن ایسا کرتا نہیں بلکہ اس کے بدلے کیلی بن (CALIBAN) کو جو ایک چڑیل کی اولاد ہے انسانوں کی طرح رہنا سکھاتا ہے۔ رچرڈ سوئم فطرت کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ اپنے ہی مقتول کی بیوی کو عشق کے سبز باغ دکھا کر اسے اپنے چنگل میں لے لیتا ہے اور ان معصوم بچوں کا خون کراتا ہے جو سلطنت کے صحیح حق دار تھے۔ اسی لیے میدان جنگ میں ہنری رچمنڈ سے شکست کھاتے وقت جب اس کا گھوڑا زخمی ہو جاتا ہے تو وہ اپنی سلطنت ایک گھوڑے کے لیے دینے پر آمادہ ہے۔ جس سلطنت کے لیے اس نے نظام فطرت سے بغاوت کی تھی اس کی رفعت اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ جب انٹونی سلطنتوں کو مٹی کہہ کر ایک عورت کی بے جا محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ توازن نظم، ضبط، استحکام۔ یہ شیکسپئر کے بنیادی موضوعات ہیں جو اس کے المیہ اور طربیہ دونوں میں جاری و ساری ہیں وائلا کی کامیابی کی وجہ یہی ہے کہ وہ ایک متوازن شخصیت ہے۔ شیکسپئر کی تمام طربیہ ہیروئنیں بہت ہی متوازن اور سنبھلی ہوئی طبیعتوں کی مالک ہیں۔

شیکسپئر اس دنیا کا شاعر ہے اور اس کے ذہن میں محدود و قیود کے وہ تار نہیں ہیں جن کی وجہ سے ڈینٹی نے پیغمبر اسلام اور ان کے صحابہ کو جہنم کے ذلیل ترین گوشے میں جگہ دی تھی اور نہ وہ کم فہمی ہے جس کی وجہ سے ملٹن نے شیطان کو ایک نہایت گھناونی شکل میں سانپ کا جسم رکھنے والی ایک ہستی کی اولاد دکھایا ہے۔ ملٹن گناہ سے ڈرتا تھا شیکسپئر کو گناہ سے محبت نہیں تھی لیکن خوف بھی نہیں تھا۔ مکبتھ سے ہی ہمدردی ممکن ہے، شاید شیکسپئر کو خود تھی۔ رچرڈ سوئم ایسا پکا مجرم بھی مرتے وقت ایک انوکھی انسانی عظمت حاصل کر لیتا ہے۔ فردوسی اور ہومر اپنی دنیا کے آگے ہاتھ پاؤں سے بیکار تھے۔ شیکسپئر ہی ایک حبشی اور مسلمان کو اپنے اعلیٰ ڈرامے کا ہیرو بنا سکتا تھا۔ شیکسپئر ہی شائلاک کی زبان میں یہ

صـ

پوچھ سکتا تھا۔ "کیا یہودیوں کی آنکھیں نہیں ہوتیں؟ کیا یہودیوں کے ہاتھ نہیں ہوتے؟... کیا وہ وہی کھانا نہیں کھاتا نہیں کھاتے جو تم کھاتے ہو؟ انھیں وہی بیماریاں نہیں ہوتیں جو تم کو ہوتی ہیں؟..."

شیکسپیر کا کلام انسان کے بنیادی تقاضوں سے بہت زیادہ نزدیک ہے۔ فطری رشتوں اور تعلقات کو قائم رکھنا اور قائم کرنا جو انسان کی پہلی ضرورت ہے یہ شیکسپیر کے موضوعات میں ایک اہم موضوع ہے۔ بقول لالر، شیکسپیر تعلقات اور رشتوں کو توڑ کر بسر کی جانے والی زندگی کی سزاؤں کو اور ان بے حساب امکانات کی بارآوری کو بار بار دہراتا ہے جو ایک بار انسانی دائرہ بن جانے پر ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ انھیں بنیادی تقاضوں سے نزدیکی کی وجہ سے اس کے پلاٹ اور واقعات میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ سوائے THE TEMPEST کے شیکسپیر کے ہر ڈرامے کا پلاٹ مستعار ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ آئندہ تحقیق THE TEMPEST کی بھی کوئی اصل نکال لے۔ پرانی داستانوں کی طرح جو ہر بار اور ہر شخص کے ساتھ بدلتی رہتی تھیں لیکن ہر داستان گو یہی کہتا تھا کہ وہ وہی پرانی داستان دہرا رہا ہے شیکسپیر کی حیثیت ایک اعلیٰ ترین داستان گو کی ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے داستان گو یہ کبھی نہیں کہتے تھے کہ داستان امیر حمزہ جو وہ سنا رہے ہیں من گھڑت ہے۔ ان کا یہی کہنا تھا کہ بڑے بوڑھوں سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے۔ لیکن ہر داستان گو حسب ضرورت ترمیم و اضافہ بھی کر لیا کرتا تھا۔ بالکل اسی طرح شیکسپیر کے کلام کی اصل قدر (VALUE) داستان کی ہے۔ ایک شخص کے چاروں طرف بیٹھ کر سننے والے جس طرح ہر ہر پہلو پر پہلو بدلتے تھے اور قصہ یوں سنتے تھے جیسے کل کی سی بات ہو اور انھیں میں کسی پر گزری ہو، ویسے ہی شیکسپیر نے اعلیٰ ادب کو داستان کی طرح فوراً منتقل ہو جانے والی شکل دے دی ہے۔ اگر آپ گوئٹے، ملٹن وغیرہ اور جدید عہد کے فلسفیانہ موشگافی کرنے والے ادیبوں کے سارے کام ایک طرف رکھیں اور شیکسپیر کا کلام ایک طرف تو آپ کو اچانک احساس ہوگا کہ جو یگانگت اور ذاتی تعلق آپ کو شیکسپیر سے ہے وہ ان لوگوں سے نہیں۔ کبھی کبھی اردو فارسی غزل بھی اسی یگانگت کا احساس دلاتی ہے۔ وجہ ایک ہی ہے۔ دونوں ہمارے سب سے زیادہ گہرے تقاضوں اور تصورات سے نکلے ہیں۔

جب ایلیٹ یہ کہتا ہے کہ نہ خوف ہماری حفاظت کر سکتا ہے نہ امید تو اگرچہ ہمیں ایک حقیقت کا احساس ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ایک شکست خوردہ بے چینی کا بھی۔ لیکن جب شیکسپیر کہتا ہے کہ انسانوں کو یہاں سے جانا یہاں سے آنے ہی کی طرح برداشت کرنا ہوگا۔ پختگی سب کچھ ہے تو ہمیں ایک الوکھا ٹھہراؤ اور طمانیت ملتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شیکسپیر کا یہ خیال غلط رہا ہو یا وہ پختگی جو سب کچھ ہے مل ہی نہ سکتی ہو لیکن ہمیں اس اٹمی عہد میں اس کے توازن، عقل مندی اور انسانی محبت کی بہت ضرورت ہے اور یہ ضرورت دنیا کا کوئی اور شاعر شیکسپیر کی حد تک پوری نہیں کر سکتا۔

صالحہ عابد حسین

مہدی نواز جنگ

مجھے حیدر آباد دیکھنے کی ایک مدّت سے تمنا تھی مگر پوری ہوئی پانچ سال پہلے۔ گرمیوں میں حیدر آباد جانے کا پروگرام بنا مگر سوال یہ تھا کہ ٹھہرا کہاں جائے۔ یوں بہت سے جاننے والے وہاں موجود تھے مگر اتنے گہرے مراسم کسی سے نہ تھے کہ دس پندرہ دن ٹھہرا جائے۔ ریسٹ ہاؤس وغیرہ میں ٹھہرنے سے جی میں گھبراتی ہوں۔ بھائی جان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا تو انھوں نے کہا میں نواب مہدی نواز جنگ کو لکھتا ہوں تم ان کے ہاں ٹھہر جاؤ۔ مجھے معلوم تھا کہ بھائی جان کے ان سے گہرے مراسم ہیں وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے اور قدر کرتے ہیں۔ میری ایک بار ان کے ہاں نواب صاحب کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ مگر میں ہچکچا رہی تھی۔ ایک تو مزاج کی افتاد ہی ایسی ہے کہ ایک دو بہت گہرے دوستوں اور اپنے بھائیوں کے سوا کسی کے ہاں دو چار دن سے زیادہ ٹھہرنا خود مجھ پر بار گزرتا ہے۔ عادتیں بھی کچھ ٹیڑھی ہیں۔ پھر بڑے لوگوں اور V.I.Ps سے بہت گھبراتی ہوں کہ اکثر نام بڑا درشن تھوڑے کی شکل صادق آتی دیکھی ہے۔ پھر یہ بزرگ نہ صرف آندھرا پردیش کے وزیر بلکہ "نواب" اور "جنگ" کے طرے بھی ساتھ لگے ہوئے۔ تعلیم یافتہ متوسط گھرانوں میں نوابوں رئیسوں وغیرہ سے جو ایک قسم کی جھجک بلکہ بدگمانی اور تعصب پایا جاتا ہے، میرا گھرانا بھی اس سے مبرا نہ تھا اور اپنے کو کسی سے گھٹ کر نہیں بلکہ بڑھ کر سمجھا جاتا تھا۔ اتفاق سے جو چند رئیس اور نواب لوگوں کو ذرا قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اس نے رائے بھی خراب کر دی تھی۔ اس لیے جب بمبئی میں بھائی جان کے خط کے جواب میں نواب صاحب کا تار ہمیں ملا جس میں انھوں نے دس دن کے لیے ہمیں اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی تو میں بہت "نروس" ہوئی۔ اب تک یہ امید تھی کہ شاید نواب صاحب انکار یا کوئی عذر کر دیں نواب صاحب سے زیادہ فکر ان کی بیگم صاحبہ کی طرف سے تھی۔ مردوں کی عادت ہوتی ہے کہ بلا تکلف لوگوں کو مدعو کر لیتے ہیں مگر گھر والیوں کو جن پر ساری ذمہ داریاں آکر پڑتی ہیں اکثر یہ بات اچھی نہیں لگتی اور اس کشمکش میں غیرت مند اور حساس مہمان پر جو گزرتی ہے وہ بس اس کا دل جانتا ہے۔ بہر حال صبح کے وقت ہم حیدر آباد کے شاندار اسٹیشن پر پہنچے۔ وہاں نواب صاحب کی گاڑی اور ایک صاحب ہمیں لینے کے لیے موجود تھے۔ شہر کی وسیع صاف ستھری سڑکوں سے گزرتے، بنجارہ ہل کے نشیب و فراز کو طے کرتے ہم ایک نرالی طرز اور عجیب سی دلکشی رکھنے والے مکان بنجارہ بھون پر پہنچے اس کا ذکر سن رکھا تھا کہ ..... پہاڑی کا کاٹ کر چٹانوں کے دامن میں یہ اپنی طرز کا یکتا مکان نواب صاحب نے بنوایا ہے۔ ایک سیدھے سادے مہربان صورت بزرگ

مسکراتے ہوئے سیڑھیوں پر سے اُترتے نظر آئے جنھوں نے میرے آداب کے جواب میں اس شفقت سے گلے لگایا کہ عہدہ مرتبہ خطاب اور اجنبیت کی ساری دیواریں مسمار ہوگئیں اور مجھے ان کے چہرے پر خلوص اور محبت کا وہ رنگ جھلکتا نظر آیا جو میرے اپنے بھائی جان کی خصوصیت ہے۔ سیڑھیاں چڑھ کر گھر میں داخل ہوئی سوتی ساڑی پہنے ایسی ہی سیدھی سادی خاتون جن کے چہرے پر شرافت اور شفقت کے ساتھ ساتھ کچھ شاید میری ہی سی جھجک اور ساتھ ہی شرمیلا سا انداز تھا آگے بڑھیں ــــ "بیگم صاحب ـ صالحہ بہن" نواب صاحب نے تعارف کرایا اور مغائرت کی دیواریں ہلتی نظر آئیں۔

مکان کے ہر حصے کو میں تحسین اور حیرت کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تیسری منزل کے ایک چھوٹے سے صاف ستھرے سادہ اور خوش ذوقی سے آراستہ کمرے میں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ گھر کے نوکر چاکر خود بیگم صاحب اور سب سے زیادہ صاحب خانہ بزرگ چھوٹی سے چھوٹی چیز کا خیال رکھتے کہ ان اجنبیوں کو پریشانی، تکلیف اور الجھن نہ ہو۔ کوٹھی کے سامنے کے منظر کی کیا تعریف کروں، میلوں دور تک پھیلا ہوا پُرانا شہر، بیچ میں زمرد کے نگینے کی طرح جڑا ہوا حسین ساگر اور ادھر اُدھر بکھری ہوئی اینڈی بینڈی پتھر کی چٹانیں اپنا ایک منفرد حسن اور شان لیے ہوئے۔ رات کو تو اس حسن میں اور چار چاند لگ جاتے جب ہزاروں ننھی ننھی رنگ برنگی روشنیاں جھیل کی سطح پر منعکس ہوتیں تو ایسا لگتا کہ یہ کوئی پریوں کا دیس ہے یا سپنوں کا شہر۔

نواب صاحب کے پاس صبح سے شام تک لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جن میں حیدرآباد کے بڑے بڑے رئیس اور سابقہ ارباب اقتدار بھی ہوتے اور موجودہ صاحبانِ حکومت بھی۔ سوشل ورکرز، علمی اور ادبی ذوق رکھنے والے مولوی پنڈت اور قاری خود ساختہ شاعر صاحبان، خوشامدی ٹٹو، محض عقیدت مند، رشتے دار، دوست، برج کے ساتھی اور ہم مشرب۔ غرض کہ ہر قسم کے لوگ آتے، ملنے، بیٹھنے، باتیں کرنے، کھاتے پینے، دو چار پہلے سے ناشتہ پر مدعو ہیں، دو ایک عین وقت پر آگئے کچھ دوپہر کے کھانے پر آرہے ہیں اور کچھ شام کو برج کھیلنے جس سے نواب صاحب کو بہت شوق ہے رات کے کھانے پر تو اکثر اور بھی زیادہ لوگ ہوتے تھے۔

ہم چاہتے تھے کہ دسویں دن کی واپسی کی سیٹ ضرور ریزرو کرالی جائے۔ نواب صاحب نے جتنے دن کے لیے بلایا ہے اس سے ایک دن بھی زیادہ نہ ہو۔ مگر نواب صاحب بڑی مشکل سے چودھویں دن ہمارے جانے پر راضی ہوئے۔ بار بار کہتے "خیر ڈاکٹر صاحب آپ معروف ہیں تو چلے جائیے مگر صالحہ بہن کو چھوڑ جائیے"۔

ان چند دنوں میں نواب صاحب کے ہمہ گیر ذوق اور وسیع تعلقات کی بنا پر میں نے قدیم وجدید، امیر و غریب، قدامت پرست اور تعلیم یافتہ فیشن ایبل اور جاہل، پس ماندہ حیدرآباد کے اتنے پہلو دیکھے جو کسی اور صورت میں مہینوں کے قیام میں بھی دیکھنے ممکن نہ تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں کے ہاں کی تقریبیں بھی اور غریب آدمیوں کے گھر بھی۔ دھوم دھام کی شادیاں جہاں ایرانی نسل کی حیدرآبادی خواتین کا حسن و جمال آنکھیں چندھیا دینے والا اور ان کے فیشن اور جواہرات وملبوسات دل گھبرا دینے والے تھے اور جہیز کی بہتات دیکھ کر امیر و غریب کا تفاوت دل کو برباد دیتا تھا۔ ایسی ہی ایک محفل میں یہ نظارہ بھی دیکھا کہ ایک اونچے ڈائس پر اکابرین و معززین کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ ہمارے نواب صاحب سخت اصرار کے باوجود وہاں نہیں بیٹھے بلکہ عام مہمانوں کے درمیان نیچے فرش پر جا بیٹھے اور ان کو

دوکرویت، رفتہ رفتہ سارے اکابرین "میاں" تک گر گورنر صاحب بھی اٹھ کر ان کے پاس ہی آ گئے۔ نواب صاحب کی اس شرارت سے دلہن کے دل پر کیا بیت گئی ہوگی اس کی انھیں ذرا پروا نہیں تھی۔ ایک اور جگہ بھی اصرار کر کے نواب صاحب مجھے بے دعوت (اکثر بلائے لے جاتے تھے) لے گئے۔ یہ ایک غریب اچھوت کے ہاں کی شادی تھی جس میں بہو بیٹے کو نواب صاحب اشیرباد دینے گئے تھے ہریجن دوستوں کے ہاں شادی بیاہ پر رسمی جوڑے اور تحفے دینا نواب صاحب پسند نہیں کرتے لیکن اچھوت کی بہو کے لیے انھوں نے خاص طور پر ساڑی منگوائی تھی۔ کس محبت، کس احترام، کس مسرت کے ساتھ سارا خاندان بلکہ سارا محلہ نواب صاحب کے گرد جمع تھا۔ کس چاؤ کے ساتھ انھیں اور ان کے مہمانوں کو کھانے پینے کی چیزیں پیش کی جا رہی تھیں، دولھا اور دلہن کے چہروں پر ناز و مسرت کے کیسے پیارے رنگ نکھرے ہوئے تھے۔ یہ سب دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

یہی نہیں ہم نے بہت کچھ دیکھا۔ عثمان ساگر، اور قلعہ گولکنڈہ کی سیر کی۔ سالار جنگ میوزیم کے نوادرات سے آنکھیں روشن کیں۔ نئے زمانے کے سدر یعنی عثمانیہ یونیورسٹی کی زیارت کی، ادارۂ ادبیات اردو میں مرحوم زور صاحب کی رہنمائی میں ان کے جمع کیے ہوئے بیش قیمت ادبی ذخیرے دیکھے اور ان کی مہمان نوازی کا لطف اٹھایا اردو ہال میں مدعو کیے گئے۔ کینسر ہاسپٹل دیکھا نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی انتھک کوششوں سے تعمیر ہوا ہے جہاں زندگی سے مایوس لوگوں کو نئے جیون کی بشارت ملتی ہے اور معذوروں، اپاہجوں کی آرام گاہ جہاں ان کو مفید کام سکھائے جاتے اور ان سے انسانوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور جانے کتنی اور چیزیں اور جگہیں۔

مگر اس صاف ستھرے، خوبصورت، صاحب ذوق مہمان نواز شہر کا تاج محل مہدی نواز جنگ کی ذات کو پایا۔ نوابی شان اور وزیری کھنڈ کا ایا ذکر کرلو یہ بدگمانی تو پہلی نظر ہی میں دور ہوگئی تھی۔ "نواب اور جنگ" تو وہ پرانے حیدر آباد کے روایاتی خطابوں کی وجہ سے بن گئے۔ وہ متوسط تعلیم یافتہ گھرانوں کے ان نوابوں میں سے تھے جو اپنی صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر ترقی کی منزلیں طے کیا کرتے ہیں) ان کے وسیع اخلاق، دردمند دل، خاموشی سے ضرورت مندوں کے کام آنے کا دلنشیں انداز چھکی چھکی ظرافت اور خوش ذوقی نے (میں نے ان کی علمی قابلیت، انتظامی مہارت اور سیاسی تدبر کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ یہ چیزیں میری حد کے باہر کی ہیں) ہم دونوں کو اپنا اتنا گرویدہ بنا لیا کہ جب ہم ان سے جدا ہوئے تو ایسا لگتا تھا ایسے کسی بہت پرانے بزرگ دوست یا پیارے عزیز سے بچھڑ رہے ہیں۔

پھر سنا کہ مہدی نواز جنگ گجرات کے گورنر ہو کر احمد آباد سدھارے۔ کچھ ہی دن بعد ان کا دعوت نامہ ملا کہ کچھ دن کے لیے یہاں آؤ۔ "راج بھون" اور "گورنر" کے نام پھر مجھے روک رہے تھے لیکن نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی محبت لے ہی گئی اور اس کے بعد سے تقریباً ہر سال ان کی صحبت میں کچھ دن گزارنے کا لالچ ہمیں ان کے پاس کھینچ لاتا ہے جہاں ہم ان دونوں کی محبت و شفقت کے سائے میں دس پندرہ دن، سب فکروں اور جھنجھٹوں سے آزاد رہ کر خوب آرام کرتے، لکھنے پڑھنے کا کام کرتے اور تر و تازہ ہو کر گھر واپس جاتے ہیں اور ہر قیام کے دوران ان کی شخصیت اور کردار کے کچھ اور دلکش پہلو میرے سامنے بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ کاش مہدی نواز جنگ

"نواب" اور "گورنر" نہ ہوتے تو میں اپنے "مہدی بھائی" کی دلکش اور عظیم شخصیت کو کتنی آسانی سے سراہ سکتی تھی مگر اب تو کئی بار یہ ہوا قلم ہاتھ میں لیا اور رکھ دیا۔ کئی بار کئی کئی صفحے لکھے اور پھاڑ ڈالے۔ ہمارے پرانے زمانے کے شاعروں اور ادیبوں کو قصیدہ گوئی اور مداح سرائی میں کمال حاصل تھا اور میں بھی ان بدگمان لوگوں میں سے ہوں اس کو ان کا محض شاعرانہ مبالغہ اور ممدوحوں کو خوش کرنے کی کوشش کہتے ہیں۔ آج سوچ رہی ہوں کہ یہی الزام مجھ پر لگ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمارے قصیدہ گو شاعروں کے بعض ممدوحوں میں بھی کچھ ایسی خوبیاں سچ مچ ہوتی ہوں جس کی وجہ سے ساختہ قلم سے ان کی مدح نکل جاتی ہو۔

راج بھون میں میں نے ان دونوں کو حیدرآباد سے بھی زیادہ سادہ اور بے بناوٹ پایا۔ وہ گورنر کے لیے جو آداب ترام مخصوص ہیں ان کا استعمال انتہائی مجبوری میں کرتے ہیں FORMALATIES سے ان کو کوفت ہوتی ہے۔ وہ اج بھون میں کسی آداب و رسوم کے قیدی بن کر نہیں اپنے گھر کی طرح بے تکلف اور اطمینان و آرام سے رہنا پسند کرتے ۔ راج بھون اسٹاف کے لوگ کسی حاکم کے ماتحت نہیں ایک خاندان کے چھوٹے بڑے افراد ہیں۔ ان کے اے۔ڈی۔سی سکریٹری یرہ منیجر اس انداز میں کھلتے ہیں جیسے ماں باپ اور بیٹے جہاں صرف عمر دی بزرگی کا فرق اور احترام ہوتا ہے۔ کوئی خاص ز کسی کی خاطر پسندیدہ ڈش بیگم صاحبہ اسے بار بار کہہ کر کھلاتی ہیں، جو موجود نہ ہو اسے گھر سے بلایا جاتا ہے، نہ آئے اس کے ہاں بھجوائی جاتی ہے۔ آموں (اور دیگر پھلوں) کے پارسل تحفے میں اور خود کے منگوائے ہوئے آتے ہی رہتے (اور اس سے زیادہ دوسروں کے ہاں بھیجے جاتے رہتے ہیں) جن کو نواب صاحب شوق سے کھاتے اور اصرار سے لاتے ہیں۔ اس میں صرف مہمان اور اونچے اسٹاف والے ہی شریک نہیں ہوتے بلکہ اکثر پورے اسٹاف کو (جن میں بڑے چھوٹے ر کئی سو افراد تو ہوں گے) تقسیم کیے جاتے ہیں۔ راج بھون میں کوئی فلم دکھایا جائے تو سارے راج بھون کے لوگ (جن ان کی بیویاں اور بچے بھی شامل ہوتے ہیں) ہال میں آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ اس سارے "گھرانے" کے دکھ سکھ میں شریک نا، ان کے مسائل کو حل کرنا، ان کی پریشانیوں کو دور کرنا غرض ہر طرح کا دھیان رکھنا ان دونوں کا ویسا ہی فرض ہے جیسا کہ خاندان کے سرپرست کا ہونا چاہیے۔ ایک بار میرے سامنے سردی کے زمانے میں صبح بہت سویرے پہرہ بدلنے سے پہلے ب صاحب اس فکر میں خود باہر گئے کہ سپاہیوں کو (جو رات بھر سردی میں پہرہ پر تھے) صبح گرم چائے ملی یا نہیں۔

لوگوں سے ملنا جلنا، سوشل تعلقات رکھنا، دعوتیں دینا سرکاری اور نیم سرکاری مہمانوں کی آؤ بھگت تو گورنر کا منصبی ٹھہرا لیکن نواب صاحب نے اس کو ذاتی فرض بلکہ ذاتی مسرت اور فیض عام کا وسیلہ بنا لیا ہے۔ یہاں راشٹرپتی، کیبنٹ منسٹرز لعہ پتی لوگوں سے لے کر بالکل عام آدمی اور ملکہ الزبتھ سے لے کر مجھ جیسی معمولی مہمان تک آکر ٹھہرتے رہے ہیں لیکن اگر میں یہ کہوں ہدہ، حیثیت، رتبہ اور اسٹیٹس کا فرق ہوتا ہے تو بس اتنا کہ بڑے لوگوں کے لیے ظاہری اہتمام کچھ زیادہ ہوتے ہوں۔ عام آدمی صاحب کے خلوص و محبت میں اور زیادہ حصہ پاتے ہیں تو اس میں ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

دعوتیں تو اتنی ہوتی ہیں کہ روزانہ ایک دو کا اوسط پڑتا ہوگا۔ سرکاری بھی اور غیر سرکاری بھی، سینکڑوں آدمیوں کا

بھی اور چند لوگوں کی بھی، اپنے دوستوں اور ملنے والوں کی بھی اور بالکل اجنبیوں کی بھی ان میں بڑے بڑے عہدے دار، راجے مہاراجے، وزیر و حاکم بھی آتے ہیں اور ہر مذہب کے عالم اور رہنما بھی، شاعر و ادیب اور فنکار بھی اور سوشل کام کرنے والے اور کچھ نہ کرنے والے بھی۔ جو لوگ نواب صاحب کو صرف گورنر کی حیثیت سے جانتے ہیں وہ شاید سوچیں کہ اتنی دعوتیں گورنر گجرات ہی دے سکتا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ دعوتوں کا شوق کوئی نیا نہیں حیدرآباد میں بھی ان کا یہی حال تھا اور یہاں بھی جو غیر سرکاری دعوتیں یا مہمان ہوتے ہیں وہ نواب صاحب کے ذاتی مہمان ہوتے ہیں سرکاری نہیں۔ نواب صاحب کا خاطر داری کا طریقہ بھی سب سے الگ ہے۔ وہ رسمی طور پر بار بار مہمان سے یہ نہیں کہتے رہتے کہ یہ لو اور وہ لو۔ ایک آدھ بار متوجہ کر دینا کافی سمجھتے ہیں (سوائے آم کی تواضع کے) ان کا خیال ہے کہ جب کسی کو دعوت میں بلایا جائے تو اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے اسے کھلایا پلایا جائے۔ لیکن ان کی نظر ہر ایک پر رہتی ہے کہ کون کتنا کھا رہا ہے کیا کھا رہا ہے؟ کم کھانے والے کے لیے ملازموں کو ان کے چشم و ابرو کا ہلکا سا اشارہ کافی ہوتا ہے۔

اپنے حیدرآباد کے عالیشان مکان میں نواب صاحب نے ایک چھوٹا سا کمرہ سب سے نیچے تہ خانے میں بنوایا تھا۔ ایک پتھر کی سیٹ پر ان کا بستر۔ چٹان میں کھدے ہوئے چند طاقوں پر ان کی کتابیں اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں۔ ایک اور پتھر ہی کی سیٹ دوسروں کے بیٹھنے کے لیے دیوان کا کام دیتی۔ دن کا کچھ وقت نواب صاحب وہاں خاموشی اور سکون کے ساتھ گزارتے تھے۔ یہ کھوہ نما کمرہ کسی نواب یا وزیر کا ایوان نہیں ایک درویش کی کٹیا لگتا تھا۔ گجرات کے راج بھون (شہزادہ خرم نے اپنے ولی عہدی وصوبہ داری کے زمانے میں یہ خوبصورت محل بنوایا تھا) کے کمروں اور ہال وغیرہ کو بیگم صاحبہ کی خوش ذوقی نے سادگی، حسن اور آرائش کے عجیب امتزاج کے ساتھ آراستہ کیا ہے۔ اس میں سب سے سادہ کمرہ گورنر گجرات کا ہے۔ اس وسیع کمرہ میں نمائش و آرائش کا سامان نظر نہیں آتا۔ لوہے کے ایک پتلے سے پلنگ پر صاف ستھرا مختصر بستر۔ دوسری طرف ایک بڑے سے تخت پر سفید چاندنی کا فرش اور سفید گاؤ تکیے اور اس کے سامنے نیچے لمبے میز پر اخباروں، رسالوں، فائلوں اور خطوط کے انبار۔ ایک طرف لکھنے کی میز پر کاغذ قلم دوات، ایک گھڑی ایک دو تصویریں، ٹیلیفون اور دو چار اور ضرورت کی چیزیں، اسی کے برابر بید کی کرسی جس کے بازو میں بڑا سا ریڈیو سٹ۔ گجرات کا ایک بڑا سا نقشہ، کتابوں کی دو الماریاں، ایک لوہے کی الماری، لوگوں کی محبت سے پیش کی ہوئی کچھ بے جوڑ سی چند چیزیں باقی اللہ اللہ خیر سلا۔ اس درویش منش حاکم کا یہ کمرہ اس کے مزاج کی سادگی اور طبیعت کی جفاکشی کی چغلی کھاتا ہے۔ لباس میں بھی یہی سادگی نظر آتی ہے۔ چکنی ڈلی اور چھوٹی الائچی کا نواب صاحب کو بہت شوق ہے مگر یہ نہ کار چوبی بٹوؤں میں ہوتی ہے اور نہ سونے چاندی کی ڈبیوں میں بلکہ پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں جو بلا تکلف راجوں مہاراجوں اور کروڑ پتیوں کو پیش کر دی جاتی ہے۔

گزشتہ دو سالوں میں مجھے ان کے ساتھ ماؤنٹ آبو جا کر رہنے کا اتفاق ہوا۔ چار ہزار فٹ اونچی پہاڑی اپنا ایک الگ ہی کیرکٹر اور ان گھڑ قسم کا حسن رکھتی ہے۔ راجستھان بھر کے پرانے راجے مہاراجے، مہارانیاں، راجکمار اور راج کماریاں یہاں گرمیاں گزارنے آتے ہیں۔ وہ اپنی ریاستوں کے حکمران نہ رہے ہوں خطاب اور دولت اب بھی ان کی باندیاں ہیں۔ محل

روزہی یہ ماضی کے حکمران نواب صاحب سے ملنے آتے رہتے تھے۔ نواب صاحب ان سے بڑے احترام اور انکسار سے
ملتے اور مجھے اندازہ ہوا کہ خاص کر یہ احترام اس لیے ہے کہ اب وہ والیان ریاست نہیں رہے اور نواب صاحب نہیں چاہتے
ذرا بھی ان کے جذبات کو ٹھیس لگے (حالانکہ ان میں سے اکثر نواب صاحب سے عمر میں چھوٹے ہیں) لیکن جس انداز میں وہ ان
ملتے ہیں اسی انکسار اور عزت کے ساتھ ہر آدمی سے ملتے ہیں۔ کچھ بھی ہو ہر ایک کی آتے وقت کھڑے ہو کر تعظیم کرنا اور کھڑے
ہو کر جھک کر تسلیم کر کے یا ہاتھ جوڑ کر سلام کر کے رخصت کرنا ان کی عادت ہے جس سے آپ لاکھ چاہیں ان کو باز نہیں رکھ سکتے۔
میں چند ہی دن میں نواب صاحب کے نام کی مالا جپے جانے لگی۔ طالب علم، استاد، معمولی درجے کے کلرک اور دیگر معمولی آدمی
کسی بہانے ان سے ملنے آتے۔ بچے تو نواب صاحب پر فدا ہی تھے جو بچے گھر پر آتے ان کی خاطر داریاں تو خیر ہوتی ہی تھیں سا
ٹہلنے کے وقت اپنی جیبوں اور اے۔ ڈی۔ سی کے اور چپراسی کے پاس تھیلیوں میں ٹافیاں بھری ہوتیں۔ جو جو راستہ بھر بچوں کو بانٹتے
بچوں کا یہ حال کہ دور سے انھیں۔ کہ دیکھا اور ساتھیوں کو آوازیں دینا شروع کیں۔ اب ہر ہر کونے سے بچے لپکتے چلے آ
ہیں۔ نواب صاحب کسی کا گال چھوتے، کسی کو چھیڑتے کسی سے سوال پوچھتے، جو بچے شرماتے دور کھڑے ہوتے ان کو
دہرا حصہ دیتے۔ مائیں کچھ دور کھڑی گھونگھٹ کی آڑ سے اپنے بچوں کو چاہنے والے کے درشن خوش ہو ہو کر کرتیں، مرد مسکرا
ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے۔ نواب صاحب آگے بڑھ جاتے اور پھر یہی سین دہرایا جاتا۔

بیگم صاحب اصولاً بچوں کو اس طرح "لالچی" بنانے کے خلاف ہیں مگر نواب صاحب مجبور ہیں۔ کسی بچے کو دیکھ کر جب تک
وہ اسے کچھ کھلا پلا نہ لیں ان کو چین نہیں آتا۔ اکثر ایسے اسکولوں کے بچوں کو (خاص کر بچیوں کو) جہاں نواب صاحب کا جانا ہو
منے تحفے دے کر نواب صاحب کو کتنی خوشی ہوتی ہے یہ... بڑے آدمی کی طرح انھیں بھی بچے عزیز ہیں۔ لیکن پیار کا عملی
ان کی طرح بہت کم لوگوں کو کرتے دیکھا۔

گجرات میں نواب صاحب نے کیا کیا، کیا اور اہل گجرات ان کے مستقبل میں کتنے ممنون احسان ہوں گے اس پر قلم اٹھانا یہ
آئندہ کے مورخ کا کام ہے میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ وہ یہاں ہر طبقے اور درجے کے لوگوں میں ہر دلعزیز ہیں۔ لوگ ان کی
اور رسمی تعریف نہیں کرتے بلکہ اس میں خلوص اور سچائی کا رنگ پہچانا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ انھیں مہدی بابا کہتے ہیں اور اس
چار سال کے عرصے میں وہ سچ مچ ہی اس نوزائیدہ اسٹیٹ کے سرپرست باپ کی طرح ہو گئے ہیں جس کو ہر وقت اپنے بچوں
بھلائی کی فکر رہتی ہو۔ آج کل یہاں وہ کینسر اسپتال سنوار رہے ہیں جس کا ایک حصہ تقریباً مکمل ہے اور امید ہے کہ اگلے سا
تک اسپتال مکمل ہو جائے گا۔ لاکھوں روپیہ لگ چکا ہے۔ لاکھوں اور جمع کیا جا رہا ہے پیسے والوں سے پبلک کے لیے روپیہ لینے
نواب صاحب کو کمال حاصل ہے اور گجرات کے اہل دول تو سنا ہے کہ اس معاملہ میں کچھ زیادہ ہی فیاض ہیں۔ نواب صاحب کے دو جملوں
پر وہ ایک دو لاکھ نہیں دس پانچ لاکھ نچھاور کر دیتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ اسپتال ہندوستان کا سب سے بڑا کینسر کا اسپتال بنے

آج کل صاحبان اقتدار کا فن اور فنکاروں کو "پیٹرونائز" کرنا کچھ فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ اس سے ان کی خوش ذو
اور قدر شناسی کا اچھا اشتہار ہو جاتا ہے۔ مگر ہمارے مہدی نواز جنگ کو سچ مچ فنکاروں سے محبت اور فن کا ذوق ہے ان

اپنے خاندانی رئیسوں کی سی وضع داری بھی ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کی قدریں اور مفاد بھی۔ وہ آرٹ اور آرٹسٹ کو محض احسان کرنے کے لیے "پیٹرونائز" نہیں کرتے بلکہ اس کے فن سے سچ مچ لطف اٹھانے اور دل سے اس کی عزت کرتے ہیں۔ کلاسکی موسیقی کے بوڑھے استاد ہوں یا نوجوان رقص و سرود کے دلدادہ لڑکیاں، خوش گلو قوال ہوں، پرانے انداز کے مصور ہوں یا جدید اور ماڈرن آرٹ کے رسیا آرٹسٹ، پرانے طرز کے صنم تراش ہوں یا نئے زمانے کے بے کار چیزوں کو خوبصورت اور کارآمد بنانے والے فن کار۔ قدیم رنگ میں کہنے والے غزل گو ہوں یا نئے شاعر۔ پرانے ادیب ہوں یا ترقی پسند، نواب صاحب سب کی قدر کرتے اور سب کے فن سے لطف اٹھانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر حساس فنکار یہ محسوس نہیں کرتا کہ محفل میں اس کی حیثیت کسی آرائشی سامان کی سی ہے بلکہ وہ اپنے دامن میں خود اعتمادی کی کچھ اور دولت لے کر اٹھتا ہے۔

نواب صاحب کو میں بہت خوش نصیب سمجھتی ہوں۔ صرف اس لیے نہیں کہ وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے خاطر خواہ کام لے کر دنیا کو اس سے فائدہ پہنچایا اور محض اس لیے کہ وہ ہزاروں آدمیوں میں ہر دلعزیز ہیں بلکہ خاص طور پر اس لیے کہ ان کی گھریلو زندگی قابلِ رشک ہے۔ ان کو اپنی شریک حیات بیگم کی صرف دلی محبت کی دولت ہی حاصل نہیں بلکہ ان کی دوستی، ہم خیالی، ہم رائے ہونے کی نعمت بھی نصیب ہے۔ ہمارے گھرانوں میں محبت تو میاں بیوی میں اتنی ہو سکتی ہے کہ ایک دوسرے پر جان دے دیں مگر وہ مفاہمت، وہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کی پاسداری اور ہم ذوقی جو اس رشتے کو سورگ والوں کے لیے قابلِ رشک بنا سکتی ہے بہت ہی کمیاب ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کسی شخص کی زندگی کا مشن پوری طرح کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کا شریک حیات (خاص کر شریکۂ حیات) اس کی سچی دوست اور ہم راز نہ ہو۔ نواب صاحب جیسے اونچے اصولوں اور خاص قسم کے معیار رکھنے والے، فیاض، ہمدرد، مہمان نواز اور خدمتِ خلق کے لیے اپنے کو کھپا دینے والے شوہر کے معیار پر پورا اترنے کے لیے، طاہرہ بیگم کو اپنی سیرت کے سونے کو کندن بنانے کے لیے کیا کچھ نہ جھیلنا اور سہنا پڑا ہوگا۔ میں نے یہ دیکھا ضرور ہے کہ انھوں نے نواب صاحب کے مقاصد اپنے مقاصد بنا لیے ہیں اور ان کے آرام و خوشی کے لیے اپنے کو وقف کر دیا ہے۔ کہنے کو وہ گورنر کی بیگم ہیں۔ مگر آرام طلبی، خود غرضی، عیش پرستی اور شان و غرور کا ان میں نام و نشان بھی نہیں۔ حیدرآباد میں وہ سرگرم سوشل کاموں میں حصہ لینے والی تھیں یہاں بھی جانے کتنی کمیٹیوں، انجمنوں اور اداروں کی رکن اور سرپرست ہیں۔ محض نام کی نہیں کام کرنے والی۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں انھوں نے باقاعدہ نرسنگ کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اور لوگوں سے ان کی خاموش محبت میں مادرانہ شفقت کے ساتھ ساتھ ایک سچی نرس کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ نواب صاحب کی صحت کی فکر اور دھیان رکھنا تو خیر ان کے دل کی لگن ہی ہے اور فرض بھی مگر ان کا تو یہ حال ہے کہ سارے راج بھون میں کوئی ذرا سا بیمار ہو جائے ان کو اس کی فکر لگ جاتی ہے۔ کسی مہمان کی ذرا سی طبیعت خراب ہو جائے تو وہ سخت پریشان ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر کو بلانا اور دکھانا، دوا اور غذا کی فکر، بار بار حال دریافت کرنا۔ شاید رات کو چین کی نیند بھی اس روز نہ آتی ہو۔ نوکروں سے ان کا انداز تحکمانہ نہیں ہوتا انھیں ہمیشہ "بچہ" کہہ کر مخاطب کریں گی (خواہ وہ بچہ عمر میں ساٹھ سے اوپر ہی کیوں نہ ہو) اگر کبھی ڈانٹنا ہی پڑ جائے تو اس میں آقا اور مالکہ ہونے کا گھمنڈ اور گھن گرج نہیں ہوتی بلکہ بزرگانہ تنبیہ اور ذرا سا تمسخر کا انداز ہوتا ہے۔ کام کرنے کا ان کو کافی شوق ہے۔ گھر (اور اب راج بھون) کے انتظامات، صفائی، سجاوٹ، مہمانوں کی دیکھ بھال، دعوتوں میں میزبانی کے

فرائض انجام دینا تو ان کو پڑتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کاڑھنے بُننے کے لیے بھی وقت نکال لیتی ہیں۔ اپنے بیٹے بیٹیوں پوتے پوتیوں ہی کے لیے نہیں اور بہت سے لوگوں کے لیے بھی۔ اب اس کے بچے کا اونی سٹ تیار ہو رہا ہے اب اس کے بچے کے لیے نٹنگ ہو رہی ہے۔ کبھی کسی کے لیے میز پوش اور رنگین بنائے جا رہے ہیں کبھی کسی کے لیے۔ شوق ان کے صرف دو ہیں میٹھے کا اور تاش کا۔ جو لوگ ان دونوں سے محروم ہوں (جن میں سے ایک میں بھی ہوں) ان کی کور ذوقی پر بیگم صاحب کو ماتم کرنا پڑتا ہے۔ ان میں اور نواب صاحب میں کبھی کبھی نوک جھونک بھی ہوتی ہے۔ وہ مثالی بیوی ضرور ہیں مگر دبّو اور ڈرپوک بیوی نہیں۔ نواب صاحب کو تنبیہ کرتے اور ڈانٹتے میں نے صرف انھیں کو دیکھا۔ ان میں سچی مساوات ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو روکنے ٹوکنے کا (وہ کتنی ہی تہذیب سے ہو) حق رکھتے ہیں۔ نواب صاحب ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کو انگیز کر لیتے ہیں مگر اکثر کرتے اپنے من کی ہی ہیں۔ البتہ جب ان کی صحت کا معاملہ ہو تو بیگم صاحب کو زبردستی کرنی ہی پڑتی ہے۔

نواب صاحب میں ایک بڑا لطیف سنس آف ہیومر ہے جو کم ہی لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ میں نے ان کو قہقہہ لگا کر ہنستے نہیں دیکھا۔ نہ وہ اس طرح کسی کا مذاق اڑاتے ہیں جس سے اس کا دل دکھے۔ وہ ہلکی ہلکی دلچسپ ہنسی یا صرف مسکراہٹ سے کام لیتے ہیں اور اکثر تو مزاحیہ بات اس سنجیدگی سے کرتے ہیں کہ سننے والا دھوکے میں آ جائے۔ یوں بھی ان کے لطیف مزاحیہ جملوں اور چبھتے ہوئے فقروں کو وہی سمجھ سکتا ہے جس میں خود یہ شئے لطیف موجود ہو۔

لیکن اس نرم دل، نرم خو انسان میں قوتِ عمل اور قوتِ ارادہ ستر سال کی کبرسنی کے بعد بھی جوں کی توں موجود ہے۔ کام اور ادائے فرض کے سامنے انھیں اپنی صحت کی بھی پروا نہیں۔ آرام ان کی لغت میں حرام ہے یہ اور بات ہے کہ بعض ڈاکٹر یا بیگم صاحبہ کے مجبور کرنے سے اس کو اپنانا پڑے۔ وہ بے حد خوش اخلاق اور ملنسار ہونے کے باوجود غلط قسم کی مروت اور بے کار کی باتوں میں اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرتے جس سے جتنا کام ہوا، جتنی دیر ملنا ضروری ہے، جتنا وقت اسے دینے کا پروگرام تھا اتنا دیتے ہیں اور پھر نہایت اخلاق سے اس سے رخصت لے کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ ایسا نہ کریں تو ہزاروں آدمیوں سے ملنے جلنے اور اتنے بہت کاموں کے نبٹانے کا وقت کہاں سے لائیں؟

وہ صرف بڑے کاموں پر ہی دل و جان سے توجہ نہیں دیتے بلکہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ان کی نظر رہتی ہے ذرا ذرا سی جزویات بھی ان کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہوتیں۔ مثلاً ان کا کوئی عزیز مہمان آنے والا ہو تو راج بھون کے سارے عملے کی کارگزاری پر وہ پورے طور پر مطمئن ہوں گے، خود گیسٹ روم میں جا کر ایک ایک چیز کا معائنہ کریں گے، پنکھے کی گردش، ایر کنڈیشنڈ کی مشین، نل کی ٹونٹی، دروازے کا کھٹکا، پانی کا فلش اور ریڈیو سٹ کی آواز سبھی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ صفت مردوں میں تو کیا گھر والی عورتوں میں بھی کم ہی ملتی ہے۔ نتیجہ یہ کہ سارا عملہ چوکنا رہتا ہے۔

ایک بار ان کے دو مہمان رات میں ذرا دیر سے احمد آباد پہنچنے والے تھے۔ نواب صاحب کو خیال آیا کہ وہ لوگ سویرے کھانا کھانے کے عادی ہیں۔ سویرے سے کھانے نہیں سو ہی آدمی ایسے میں صرف یہی سوچ سکتے تھے کہ یا تو ایک دن دیر سے

کھا لیں گے یا پھر راستہ میں کھا کر آئیں گے۔ لیکن نہیں۔ نواب صاحب نے انھیں لکھا کہ آٹھ بجے فلاں اسٹیشن پر تمھارے لیے کچھ کھانا بھیجا جائے گا۔ چنانچہ وہاں نواب صاحب کا سب سے مستعد کارگزار اور مہذب بیرا پورے اہتمام و ساز و سامان کے ساتھ ان معمولی مہمانوں کے لیے ڈنر لیے موجود تھا۔ اتنا زیادہ خیال عزیز سے عزیز دوست چاہنے والا باپ یا سرپرست کوئی نہیں رکھ سکتا ہاں صرف ماں کر سکتی ہے، اور اگر میں یہ کہوں کہ ان میں آدرش ماں کی کئی ملائم اور دلکش صفات ملتی ہیں تو گستاخی نہیں ان کی بہترین صفات کا اعتراف ہے۔

میں نے کہیں اور بھی کہا ہے کہ نواب صاحب بڑے چھوٹوں سب سے یکساں تپاک و عزت سے ملتے ہیں۔ لیکن صرف یہ جملہ پڑھ کر ان کی اس صفت کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کے بہت سے جلوے میں نے دیکھے ہیں۔ اس وقت صرف ایک چھوٹی سی مثال لکھوں گی جس کا میرے دل پر گہرا نقش ہے۔

پچھلے سال میں اور میرے بھائی جان نواب صاحب کے ہاں آبو میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ احمد آباد واپس آنے کا دن تھا نواب صاحب بہت مصروف تھے۔ صبح سے شہر کے اکابرین اور راجے مہاراجے خدا حافظ کہنے کے لیے چلے آ رہے تھے ہم دونوں بازار سے کچھ شاپنگ کے بعد واپس آ رہے تھے کہ ڈاک خانے کے پاس گاڑی ڈاک لینے کے لیے رکی۔ ایک دبلے پتلے ادھیڑ عمر کے غریب آدمی نے ڈرائیور کو ڈاک دی (وہ غالباً پیشہ ور ڈاکیہ نہیں کوئی معمولی مزدور تھا جس کو ڈاک پہنچانے پر مقرر کیا گیا تھا) اور ہم سے مخاطب ہو کر نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی شان میں نہایت گنوار اور مخلص انداز میں قصیدہ پڑھنے لگا۔ ڈرائیور جلدی جانا چاہتا تھا مگر بھائی جان اس سے بات کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ وہ کئی دن سے اس آرزو میں ہے کہ نواب صاحب سے ملے۔ درشن کر چکا ہے تعریفیں بہت سنی ہیں ملنے کی تمنا باقی ہے لیکن اب تک اندر رسائی نہیں ہو سکی۔ "حضور کوئی غرض نہیں — بس ان کے درشن کرنا ہے — بڑا میاں آدمی ہے — دیالو — شریف — داتا پیراں کی درگاہ پر میں نے ان کے لیے دعا کی تھی — وہ سب کو برابر سمجھتے ہیں — سب کی خاطر کرتے ہیں۔ اپنے برابر بٹھاتے ہیں۔ حضور یہاں سب ان کے گن گاتے ہیں۔" بھائی جان نے اسے ساتھ بٹھا لیا تھا اور رستے بھر اس نے اپنی بانی جاری رکھی۔ میرا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ آج نواب صاحب بہت مصروف ہیں۔ جانے اس سے ملنے کا وقت ہوگا یا نہیں۔ اور کس طرح ملیں گے؟ نہ مل سکے تو اس کے دل کو کتنی ٹھیس لگے گی؟ اور اگر کچھ مختلف انداز میں، جلدی میں اسے ٹال دیا تو مجھے کتنی مایوسی کتنا دکھ ہوگا؟

ہم پھاٹک کے سامنے اترے۔ برآمدے میں کھڑے نواب صاحب کسی مہاراجہ اور ان کے خاندان والوں کو رخصت کر رہے تھے۔ اس شخص کو باہر کھڑا کر کے ہم اندر آئے جیسے ہی نواب صاحب کے مہمان رخصت ہوئے میں نے عرض کیا "نواب صاحب ہمارے ایک دوست سے بھی مل لیجیے — بہت مشتاق ہے بیچارا۔"

"ہاں ہاں بلائیے بلائیے" وہ اندر جاتے جاتے واپس پلٹ آئے۔

بھائی جان نے اشارہ کیا۔ ڈرتا جھجکتا رعب و احترام سے کانپتا، دبیز ایرانی قالین کو سہم کر دیکھتا، پرانے جوتے دروازے پر اتارے ہاتھ جوڑے وہ شخص آگے بڑھا اور نواب صاحب کے چرنوں پر جھک رہا تھا کہ جلدی سے نواب صاحب نے اسے اٹھایا۔

مصافحہ کیا اور کمر پر تھپکی دی۔ وہ سہمی سہمی آواز میں اپنا راگ الاپ رہا تھا "حضور مائی باپ ہیں۔ آپ کے درشن کی بڑی تمنا تھی۔ بیگم صاحب بھی بہت اچھی ہیں —— وہ درزی کہتا تھا دگنی مزدوری سب کو دیتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

نواب صاحب نے کہا "بیٹھو بیٹھو" وہ قالین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی۔ مگر ایک لمحہ بعد میں نے دیکھا کہ نواب صاحب نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اصرار کر کے اس صوفے پر جس پر سے ابھی مہاراجہ صاحب اٹھ کر گئے تھے بٹھا دیا۔ وہ خود کھڑے تھے۔ مہمان بیٹھا تھا۔

"کیا نام ہے بھئی تمہارا"

"حضور ہری رام"

"واہ۔ کیا اچھا نام ہے۔ کتنا پوتر نام ہے۔ ایک بار حیدرآباد میں قحط پڑا۔ بارش کسی طرح نہیں ہو رہی تھی۔ شہر کے بیس ہزار لوگ ننگے سر دھوپ میں ایک میدان میں جمع ہوئے۔ میں بھی ان کے ساتھ تھا (اس وقت امدادی افسر قحط تھے) دو گھنٹے تک ہری رام ہری رام کا ورد ہوتا رہا —— اور آپ یقین مانیے گا سیدن صاحب (بھائی جان کی طرف مڑ کر کہا) دو گھنٹے بعد موسلا دھار بارش ہوئی۔"

ہری رام کا انگ انگ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ نواب صاحب نے کئی بار پوچھنے پر کہ اسے کوئی کام تو نہیں ہے اس نے یہ عجیب و غریب بپتا کہی۔ انہوں نے بتایا کہ اس کے ہمسائے نے (جو احمد آباد میں ہیں) اس کی بہو کو گھر بٹھا لیا ہے۔ وہ غریب آدمی ہے۔ بیٹے کی دوسری شادی بھی نہیں کر سکتا۔ حضور آپ بلا کر اسے کہہ دیں تو وہ شاید بھیج دے۔"

کوئی مانے یا نہ مانے اسی وقت نواب صاحب نے اپنے پی۔ اے کو بلا کر دونوں کا پتہ نشان نام وغیرہ لکھوایا اور ہدایت دی کہ احمد آباد پہنچ کر اس کا کام کر دیا جائے۔ پھر آموں اور شربت سے اس کی تواضع کر کے اسے رخصت کیا۔

سوچتی ہوں کہ اگر اس دن نواب صاحب عدم فرصت اور جلدی کے سبب ہری رام سے کچھ مختلف انداز میں پیش آئے ہوتے تو؟ اکثر بڑے آدمیوں کی ذرا سی معمولی بے پروائی عقیدت کے لیے بڑے بڑے قلعے ڈھا دیتی ہے۔

اور اب اتنا کچھ لکھ کر بھی مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس دلکش و ہمہ گیر شخصیت کے لیے میں نے کچھ نہیں لکھا ہے

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

ASIAN ELECTRONICS LIMITED

(۲۱ جنوری ۶۲ء کو کمپنیز ایکٹ کے تحت منظور شدہ)

"ایشین الکٹرونکس لمیٹڈ" عوام کے سامنے اپنے شیرز پیش کر رہی ہے جن حضرات کو کمپنی کے شیرز سے دلچسپی ہو وہ کمپنی کے رجسٹرڈ دفتر یا کمپنی کے ضامن (انڈر رائٹرز) دلالوں یا بینکروں کے دفتر سے پروسپکٹس کی کاپیاں منگالیں، جن میں مکمل تفصیلات دی گئی ہیں۔

رجسٹرڈ دفتر ہینڈلوم ہاؤس تیسرا مالہ ۔ 221 ڈاکٹر دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی ۱

کمپنی کا منظور شدہ سرمایہ	Rs 1,00,00,000
موجود اشو	30,00,000
ادا کیے گئے شیرز	7,38,500
کمپنی کے ڈائرکٹرز ان کے رشتہ دار اور دوست احباب کے شیرز	7,61,500
پبلک خریداری کے لئے دس دس روپے کے 15000 اکوئٹی شیرز	15,00,000
	30,00,000

پبلک خریداری کے پندرہ ہزار اکوئٹی شیرز کی ضمانت طے پا چکی ہے۔

شیرز کی درخواستیں پیر، ۳ ستمبر ۱۹۶۲ء کو بینک کا دفتر کھلتے ہی شیرز کی درخواستیں قبول کی جائیں گی۔ اور ۱۲ ستمبر ۱۹۶۲ء کو بینک کا وقت ختم ہونے پر یا اس سے پہلے جب ڈائرکٹرز چاہیں بند ہو جائیں گے۔ لیکن ہر حالت میں ۹ ستمبر ۱۹۶۲ء کو بینک کے وقت تک عام اجازت ہوگی۔

کمپنی کے ڈائرکٹرز

ڈاکٹر یوسف نجم الدین (چیرمین)	لفٹنٹ کرنل ہز ہائی نس شیخ سنگھ راؤ دی گائیکواڑ آف بڑودہ
کرنل بشیر حسن زیدی	مسٹر بورے پیرے زی
مسٹر شبیر بھائی صاحب نور الدین	مسٹر فخر الدین غلام علی
مسٹر منصور فدا حسین	مسٹر بی اے بھٹ
	مسٹر اے کے حافظ کا

منیجنگ ڈائرکٹرز مسٹر بی۔ اے۔ بھٹ اور مسٹر اے۔ کے۔ حافظ کا

دونوں صاحبان کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹرز مقرر کیے گئے ہیں عرصہ پانچ سال کے لیے

بینکرز بینک آف انڈیا لمیٹڈ، مہاتما گاندھی روڈ بمبئی ۱

کمپنی کی موجودہ اور آئندہ سرگرمیاں ایشین الکٹرونکس لمیٹڈ کو پہلی دسمبر ۱۹۶۱ء کو انڈسٹریز (ڈیولپمنٹ اینڈ ریگولیشن) ایکٹ ۱۹۵۱ء کے تحت لائسنس ملا ہے، تاکہ وہ کاربن فلم ریزسٹ کے ایک کروڑ بیس لاکھ عدد اور اسٹائرو فلکس کے پے سٹرز

(الکٹرونک کل پرزوں) کے بہتر (۲،) لاکھ عدد تیار کرے۔ الکٹرونک کے یہ کل پرزے بہت قسم کے آلات، اوزار، اور مشینی سامان کا خاص جز ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، آواز منتقل کرنے والے آلات، ٹیلی گراف اور ٹیلی ویژن کے ٹرانسمیٹر، ٹیلی فون ایکسچینج، نیوزر

ٹیکنیکل کا اشتراک کمپنی نے یوگوسلاویہ کی مشہور فرم AVTOMACIJA "اوتوماسیا" نے ٹیکنیکل شرکت میں کام کرنے کا معاہدہ کیا ہے۔ یہ کمپنی الکٹرونی کل پرزے بنانے میں عالمی شہرت رکھتی ہے، اور اپنی مصنوعات مغربی ملکوں کو، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو برآمد کرتی ہے۔

یوگوسلاویہ کی "اسکرا" فیکٹریوں میں ہندوستانی انجینروں کا پہلا گروپ فی الحال ٹریننگ حاصل کر رہا ہے۔

ایشین الکٹرونکس لمیٹڈ کو چودہ لاکھ روپیہ مالیت کی مشینیں منگوانے کا لائسنس مل گیا ہے، آرڈر دیئے جا چکے ہیں۔ دسمبر میں جہازوں کے ذریعہ سامان کی روانگی عمل میں آجائے گی اور انشاء اللہ ۱۹۶۵ء کے وسط سے کارخانہ چلنا شروع ہو جائے گا۔

اس پروجیکٹ کی لاگت کا اندازہ پچاس لاکھ کیا گیا ہے، جس کی تفصیل پراسپکٹس میں درج ہے۔

درخواست کے فارم جن کے ساتھ کمپنی کا پراسپکٹس بھی شامل ہے، کمپنی کے رجسٹرڈ دفتر سے مل سکتے ہیں۔ یا بیع مذکورہ بینکروں، انڈر رائٹروں سے بروکروں (دلالوں) سے منگائے جائیں۔

حصے خریدنے کی درخواست میں کم از کم پانچ روپے فی شیئر طلب کیے جائیں۔



یوسف سرمست

قدیم ادب اور نئی کسوٹی

"تلاش" کے سالنامے میں راہی معصوم رضا صاحب کا ایک مضمون "نیا ادب اور پرانی کسوٹی" کے عنوان سے چھپا ہے۔ مضمون میں بنیادی بات جو کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اردو کے اکثر و بیشتر ناقدین "نئے ادب کو پرانی کسوٹیوں پر پرکھنے کے بعد اسے رد کر بیٹھے ہیں۔" پہلے تو راہی صاحب کی یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ ناقدین نے نئے ادب کو "پرکھنے" کے بعد رد کیا ہے۔ اگر ہمارے ناقدین پرانی کسوٹی ہی پر نئے ادب کو پوری طرح پرکھ کے دیکھتے اور پھر اسے رد کر دیتے تو شاید نئے ادب کے معماروں کو اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن جو بات شدت سے محسوس کی جا رہی ہے وہ یہی ہے کہ ہمارے ناقدین نے نئے ادب کو بہت کم قابل اعتنا سمجھا ہے۔ بقول جانسن کے "ہم کسی مصنف کے لیے بدترین بات جو کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کے کام کے متعلق بالکلیہ خاموشی اختیار کر لیں۔"

ایسی ہی بات آج کے ادیب کے ساتھ روا رکھی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ادیب اس کے متعلق سوچنے لگے ہیں کہ کیوں ناقدین ان کے بارے میں چپ ہیں۔ اسی سلسلے میں سلیمان اریب صاحب، اقبال متین اور جوگندر پال نے ایک سوال نامہ تیار کیا تھا تاکہ اس مسئلے پر مکمل کر بحث ہو اور کچھ روشنی اس مسئلے پر پڑ سکے۔ معلوم نہیں بعد میں وہ شائع ہوا یا نہیں۔ بہرکیف یہ سوال اکثر ذہنوں میں اٹھتا ہے کہ کیوں ناقدین کسی بھی کسوٹی پر آج کے ادب کو کس کر دیکھتے نہیں ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ اس سوال کا جواب ناقدین ہی دیں لیکن یہ ایسا سوال ہے جس پر ادب کا ہر طالب علم غور کر سکتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ادب میں ایک مدت گزرنے کے بعد ہی کسی کو کوئی مقام ملتا ہے۔ بعض وقت تو ادیبوں کی موت کے بعد ہی ان کے مقام کا تعین ہوتا ہے۔ "لذت زخم جگر" آج ہی میسر نہیں آسکتی نیش عشق کو گوارا کرنے کے لیے ایک مدت ضروری ہے۔ اکثر یہی ہوا کہ ادیب و شاعر یا تو بڑھاپے میں توقیر حاصل کر سکے یا پھر اپنی زندگی کے بعد لیکن اس کے خلاف بھی ہوا، مگر ایسا اسی وقت ہوا ہے جب کہ کوئی تحریک ان کی پشت پناہ تھی۔ کوئی بھی تحریک ادیب کو سامنے لانے اور نمایاں کرنے کے لیے ایک زبردست قوت ہوتی ہے۔ سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک اس کی سب سے روشن مثالیں ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ صرف تحریک کے بل بوتے پر کوئی ادیب زندہ نہیں رہ سکتا۔ ادیب کو زندہ جاوید بنانے کے لیے اس کا اپنا جوہر ہی سب کچھ ہوتا ہے لیکن ادیب کو وقتی طور پر ابھار کر سامنے لانے میں تحریک غیر معمولی کام

انجام دیتی ہے۔ بعض وقت صرف تحریک کے بل پر بعض ایسے ادیب بھی کافی چمک اٹھتے ہیں جن کے پاس تحریک کی قوت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ موجودہ ادیبوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ان کو آپس میں متحد یا ایک دوسرے کے قریب لانے والی کوئی قوت نہیں ہے۔ آج کے ادیب شاید ایک دوسرے کو سمجھنے کی بھی زیادہ کوشش نہیں کرتے۔ یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ ایسا ہے بھی یا نہیں اگر ایسا ہے تو اس کے اسباب کیا ہیں؟ پھر یہ کہ مستند نقاد کیوں آج کے ادب کو سمجھنا اور اس پر اظہار خیال کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اس کا سبب ایک تو یہی ہے کہ وہ گزشتہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان میں اتنی امنگ اور تجسس نہیں رہ گیا ہے کہ وہ پہلی جیسی محنت اور انہماک سے موجودہ ادب کا مطالعہ کر سکیں، دوسرے یہ کہ زندگی کی موجودہ الجھنوں اور پیچیدگی سے دلچسپی لینا اب ان کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ نئے ادب سے بھی دلچسپی نہیں لیتے۔ اس وجہ سے انھوں نے چپ سادھ لی ہے۔ حالانکہ وہ ادب کی آفاقی اقدار ہی کو سامنے رکھ کر نئے ادب کے بارے میں کوئی حکم لگا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نئے ادب کے لیے پرانے ناقدین کا کیوں منہ دیکھا جائے۔ نئے ناقدین کیوں نہیں اس کام کو اپنے سر لیتے ہیں؟ کیا نئے ادب کے ساتھ نئے نقاد پیدا نہیں ہو رہے ہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ کیوں نئے ادب کو جانچنے یا اس پر اظہار خیال کرنے سے کتراتے ہیں۔ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ کیوں نیا ادب اپنے نقاد پیدا نہیں کر سکا ہے؟ کیوں کہ ہر دور کا ادب اپنے ساتھ اپنے نقادوں کو بھی لاتا ہے۔ ان باتوں کا جواب پانے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ نقاد کو بنانے والی کونسی چیزیں ہیں؟ نقاد کو نقاد بنانے میں سب سے اہم اور نمایاں غالباً دو چیزیں ہوتی ہیں۔ پہلی ذوقِ صحیح دوسری وسعتِ مطالعہ۔ اور یہ دونوں باتیں جامعات کی تعلیم سے بڑی حد تک حاصل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے موجودہ نقادوں میں سے بڑی تعداد انھیں کی ہے جو جامعات کے فارغ التحصیل ہیں۔ جامعات کی تعلیم فطری ذوق کو نکھارنے اور ان کی تربیت کرنے میں بڑا اہم رول انجام دیتی ہے اس کے ساتھ ہی وسیع مطالعہ کی طرف بھی راغب کرتی ہے اور مجبور بھی۔ جامعات میں ان ہی ادیبوں کی کتابوں کو رکھا جاتا ہے جو اپنی حیثیت بنا چکے ہیں جو ہر لحاظ سے مستند ہیں۔ پھر یہ کہ ہم عصر شعرا و ادبا کے متعلق ایک آدھ ہی پرچہ ہوتا ہے باقی پرچے کلاسیکل شعرا اور ادیبوں کے متعلق ہی ہوتے ہیں۔ جامعات کا ایسا کرنا ضروری بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ پھر یہی فارغ التحصیل لوگ جب تنقید کے میدان میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں پہلے قدیم اور کلاسیکل شعرا کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے کچھ اس لیے کہ وہ ان کا کافی مطالعہ کر چکے ہوتے ہیں اور بہت کچھ اس لیے بھی کہ ایک نئے نقاد کے لیے اپنے کو روشناس کرنے کے لیے مشہور اور پرانے ہوئے ادیبوں اور شعرا پر لکھنا بہت سہولت بخش ہوتا ہے کیوں کہ نئے نقاد اگر نئے لکھنے والوں پر لکھیں تو سب کو اپنی طرف کم ہی متوجہ کر سکتے ہیں۔ مستند نقاد انھیں اس لیے نہیں پڑھتے کہ خود لکھنے والا بھی نیا ہوتا ہے، اور موضوع بھی نیا۔ خود نئے ادیبوں اور شعرا میں بھی مقبولیت حاصل کرنا ان کے لیے مشکل اس لیے ہو جاتا ہے کہ معاصرانہ چشمکیں کام کرتی ہیں۔ اسی طرح کی اور چھوٹی بڑی باتیں

کہی جا سکتی ہیں یہ باتیں سامنے کی ہیں شاید اس سے بھی زیادہ اور اہم باتیں ممکن ہے اس سلسلہ میں کارفرما ہوں۔ بہرکیف یہ مسئلہ کافی بحث طلب ہے اس پر پوری سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے اور اس کے ہر پہلو کو دیکھ کر اس انتقادی جمود کو دور کرنے کی عملی کوشش کی جانی چاہیئے۔

راہی صاحب کے مضمون کے متعلق دوسری بات یہ کہنی ہے کہ انھوں نے اپنے مضمون کے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے انھوں نے اس کے سر ایسا الزام تھوپ دیا ہے جس کا ارتکاب اس بیچارے سے ہوا ہی نہیں یعنی انھوں نے اپنے مضمون کا عنوان "نیا ادب اور پرانی کسوٹی" رکھ دیا ہے۔ حالانکہ مضمون "قدیم ادب[1] اور نئی کسوٹی" کی اب کیا کہوں کسی مثال بن کے رہ گیا ہے۔ راہی صاحب نے خود ساختہ کسوٹی پر سوفاکلیز سے لے کر مجروح سلطان پوری تک سبھی کو کس کے پھینک دیا ہے۔ یہ مضمون ادب کے تعلق سے غیر واضح تصورات رکھنے کے باوجود اس کے بڑے بڑے مسائل سے الجھنے پر جو حشر ہوتا ہے اس کی بڑی عمدہ تصویر پیش کرتا ہے۔ راہی صاحب نے اپنے مضمون کے تیرہ صفحات میں ادب کے اہم ترین مسائل کو چھونے کی کوشش کی ہے لیکن وہ سب کے سب ان کی دسترس سے دور نظر آتے ہیں۔ راہی صاحب نے بے شمار ادبی مسائل کا جال پھیلا دیا ہے وہ کبھی نقاد کے فرائض کے بارے میں کچھ کہتے ہیں، کبھی آفاقی اقدار کو بھول بھلیاں قرار دیتے ہیں، کبھی ادب کیا ہے کا سوال اٹھاتے ہیں، کبھی معنی اور صورت کی بحث میں پڑ کر درزی اور فنکار کی مماثلت ڈھونڈ نکالتے ہیں، کبھی ناول کی ایجاد کے متعلق کچھ "ایجاد" سرزد کرتے ہیں کہیں نئی قدروں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور اس صحرا نوردی کے بعد بڑے اطمینان اور سکون سے فیصلہ صادر فرما دیتے ہیں کہ اردو کے تنقیدی سرمایہ میں سوائے دو مضامین کے کچھ ہے ہی نہیں۔ فرماتے ہیں "خورشید الاسلام کے امراؤ جان ادا" والے مضمون اور ممتاز حسین کے مقدمہ باغ و بہار کے علاوہ اب تک ادبی تخلیقات میں جھانکنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ چلیے قصہ ختم۔ ہم بھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں چلو قصہ ختم ہو گیا۔ جو جان چھوٹی کیونکہ انھوں نے یہ کہہ کر بات شروع کی تھی "اب صرف ایک سوال رہ جاتا ہے"۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھیں یکایک یہ خیال آ گیا کہ کلیم الدین احمد صاحب نے حالی کو نقاد جیسی کوئی چیز قرار دیا تھا اگر میں بھی حالی کی عظمت کا ذرا سا بھی اعتراف کر دوں تو کیا نئی بات ہوگی اس لیے وہ حالی کی خبر لیتے ہیں حالانکہ وہ یہ کہہ چکے تھے کہ "ہماری تنقید اب تک اردو ادب کو تاریخ پہناتی رہی ہے"۔ اس بدنصیبی کا آغاز سید سے ہوتا ہے اور حالی نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اس تابوت میں پہلی کیل ٹھونکی تھی۔ لیکن راہی صاحب اردو تنقید کا جو تابوت بنا رہے تھے اس کے لیے پہلی کیل کیا کافی ہو سکتی تھی اس لیے وہ مسلسل کیل پر کیل ٹھونکتے رہے۔ ملاحظہ فرمایئے "مقدمہ شعر و شاعری ایک غیر فطری عمل ہے"۔ "سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ" اس مقدمے نے تذکروں کے تسلسل کو توڑا اور نتیجے کے طور پر اردو تنقید پیدا ہی نہ ہو سکی۔"

---

[1] یہاں میں نے پرانے کا لفظ خاص طور پر استعمال نہیں کیا ہے کیونکہ اس لفظ سے فرسودگی بے مصرفی اور از کار رفتگی کی حالت بھی مترشح ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف "قدیم" کا لفظ اب منفی انداز نہیں رکھتا۔ (یوسف)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: "یہی حال ناولوں کا ہے۔ ہم نے داستانوں کو نظر انداز کر کے ایک فارم درآمد کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں کوئی قابلِ قدر ناول نہ لکھا جا سکا۔ امراؤ جان ادا ایک اکیلا ناول ہے بس۔"

سمجھ میں نہیں آتا کہ راہی صاحب کے اس ذہنی تضاد اور انتشار کا کیا علاج کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف تو وہ ادب میں نئے پن کی اہمیت کو جانتے ہیں اور اس کی اہمیت کے آگے ماضی کے اہم ترین ورثہ کو بھی بچکانہ اور ماضی کی قد آور شخصیتوں کو بھی "بچوں" جیسی قرار دیتے ہیں ۔۔۔ دوسری طرف وہ سرسید، حالی وغیرہ پر صرف اس لیے خفا ہوتے ہیں کہ کیوں وہ لکیر کے فقیر بنے نہ رہے کیوں انھوں نے ادب میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی، کیوں انھوں نے زندگی کے نئے تقاضوں کے مطابق ادب کو ڈھالنے کی جسارت کی۔ حالانکہ راہی صاحب بڑے طمطراق سے یہ بھی فرماتے ہیں "میں اس ادب کو نیا ادب کہتا ہوں جو سماج میں کسی بنیادی یا انقلابی تبدیلی کے نتیجے کے طور پر وجود میں آیا ہے۔" راہی صاحب نے یہ بات تو کہہ دی لیکن سرسید اور حالی پر اعتراض کرتے وقت انھیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس زمانے کا ادب بھی سماج میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا نتیجہ تھا۔ اب رہا کسی بھی چیز کے "درآمد" کرنے کا سوال تو یہ انتہائی جاہلانہ اور حد درجہ رجعت پسندانہ بات ہوگی کہ ہم ہر اس بات کو بری نگاہ سے دیکھیں جو درآمد کی گئی ہو۔ زندگی میں ترقی کے راستے کو مسدود کرنے والا یہی سب سے بڑا رجحان ہوتا ہے۔ شاید راہی صاحب کو پتہ نہیں ہے کہ ان کی اپنی زندگی میں درآمد کی ہوئی چیزوں کا کتنا بڑا ہاتھ ہے اگر وہ ان سے پرہیز کرنا چاہیں تو پھر کسی سنسان جنگل میں ہی انھیں پناہ مل سکے گی۔ اگر راہی صاحب "تلاش" میں چھپی ہوئی تصویر ہی کو ملاحظہ فرما لیں تو انھیں پتہ چل جائے گا کہ ہماری زندگی میں درآمد کس حد تک ناگزیر بن چکی ہے وہ جو عینک لگائے ہوئے ہیں وہ بھی پہلے پہل درآمد کی گئی تھی جس کیمرہ سے انھوں نے تصویر لی ہے وہ بھی یا تو درآمد کیا ہوا ہے یا اس کے مختلف حصے درآمد کیے گئے ہیں اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم درآمد کیے ہوئے اصولوں ہی پر بنایا جا سکا ہے۔ پھر وہ جس طرح چھپی ہے وہ بھی درآمدی انداز ہے۔ پھر اس سلسلے میں حمل ونقل کے جو سارے ذرائع استعمال ہوتے ہیں وہ بھی تمام کے تمام درآمد کیے ہوئے ہیں۔ نہ تو ان درآمد کی ہوئی چیزوں اور اصولوں سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ایسی کوشش عقل مندی پر مبنی سمجھی جا سکتی ہے۔ یہاں اس کا موقع ہے اور نہ گنجائش کہ راہی صاحب کی تمام معصومانہ باتوں کا جواب دیا جا سکے۔ میں صرف دو ایک اہم باتوں کا ذکر کروں گا۔

راہی صاحب خود شاعر ہیں لیکن ادب کے تعلق سے وہ عجیب و غریب خیالات رکھتے ہیں۔ وہ ادب کیا ہے کا سوال چھیڑتے ہیں اور ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "ادب معنی اور صورت کے اچھے امتزاج کا نام ہے"۔ خیر یہاں تک غنیمت تھا لیکن خود مواد اور ہیئت کے تعلق کو سمجھنے سے وہ قاصر ہیں وہ ان دونوں میں جسم اور شیروانی کا سا تعلق سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فن (ART) اور کاری گری (CRAFT) میں جو فرق ہے اس کو بالکل ہی نہیں سمجھ سکے ہیں۔ انھوں نے کرافٹ کو آرٹ سمجھ لیا ہے اس لیے تخلیق کے بارے میں وہ کہتے ہیں "فنکار پیکر طرازی کے

لیے جن چیزوں کو استعمال کرتا ہے وہ بھی پہلے سے موجود تھیں، رنگ موجود تھے لکیریں موجود تھیں، پتھر موجود تھا، کاغذ موجود تھا، الفاظ موجود تھے، آواز موجود تھی، ساز موجود تھے اور خود فنکار موجود تھا، یعنی صورت بھی موجود اور معنی بھی موجود۔ پھر آخر کیا خلق کیا گیا؟ خلق ہوا معنی و صورت کا وہ امتزاج جو پہلے موجود نہیں تھا۔" چونکہ راہی صاحب کے نزدیک درزی اور فنکار میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے وہ کہہ گئے صرف امتزاج کا نام فن ہے گویا ان کے الفاظ میں جسم موجود تھا، کپڑا موجود تھا ان دونوں کے امتزاج کا نام تخلیق ہوا۔ حالانکہ تخلیق بڑی پیچیدہ چیز ہوتی ہے۔ عضب یہ ہے کہ شاعر ہونے کے باوجود وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر چیز پہلے سے موجود تھی امتزاج نہیں تھا۔ حالانکہ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ فنکار معنی کو بھی خلق کرتا ہے اور صورت کو بھی اور امتزاج کو بھی۔ پھر یہ کہ یہ تینوں چیزیں الگ الگ نہیں ہوتیں بلکہ یہ تینوں چیزیں آپس میں ترکیب پاتی ہیں۔ یہ مرکب ایسا نہیں ہوتا جس کو جسم اور شیروانی کے آمیزے سے تعبیر کر سکیں۔ بلکہ اس کو کسی حد تک وہ کیمیاوی عمل کہنا ٹھیک ہوگا جس میں کئی چیزیں کچھ اس طرح ملتی ہیں کہ ایک بالکل نئی چیز پیدا ہوتی ہے جو اپنے خواص کے اعتبار سے پہلی کی تمام چیزوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے کاریگر اور فنکار میں یہی فرق ہے کہ ایک کاریگر دوسرے کاریگر کی پوری پوری نقالی کرتا ہے اور کر سکتا ہے یا کم از کم وہی کاریگر بالکل ایک جیسی بے شمار چیزیں بنائے گا۔ یعنی راہی صاحب کے الفاظ میں ایک درزی دس بیس تیس شیروانیاں ایسی سی سکتا ہے جن میں سر مو فرق نہیں ہو سکتا لیکن ایک مصور ایک جیسی دو تصویریں بھی نہیں بنا سکتا۔ مونا لیزا کو دوبارہ بنانا خود لیونارڈو ڈاونچی کے بھی بس کی بات نہیں تھی، اور یہ کہ آج تک کوئی مصور مونا لیزا جیسی تصویر نہیں بنا سکا ہے۔ جو ایسی کوشش بھی ہوتی ہے تو بھی اصل اور نقل میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ راہی صاحب کے ہاں خود معنی اور صورت کے امتزاج کا کوئی متعین مفہوم نہیں ہے وہ ادب میں معنی کو اہمیت بھی نہیں دینا چاہتے بلکہ زیادہ اہمیت دینے کو اپنی دانست میں غلطی گردانتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے "یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ ادب میں صورت کی حیثیت اضافی ہے لیکن یہ ثابت نہیں ہوتا کہ معنی ہی فن ہے۔ سرسید کی تحریک اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے یہی غلطی ہوئی تھی۔" اس میں شک نہیں کہ صرف معنی فن نہیں ہے، اور میں نہیں سمجھتا کہ آج تک کسی نے صرف معنی ہی کو فن قرار دیا گیا ہو۔ البتہ معنی کی اہمیت سے انکار کرنا ادبی بے بصیرتی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راہی صاحب ناسخ اور داغ کو اچھا شاعر نہ سمجھتے ہوئے بھی ان کا اچھا نہ ہونا ثابت نہیں کر سکتے ہیں داغ کے متعلق انھوں نے لکھا ہے "داغ کی ساری شاعری یہی ہے یعنی فن نہ معنی اور نہ صورت، فن نام ہے ان دونوں کے امتزاج کا اور فن ان دونوں کی اچھائی یا برائی سے متاثر نہیں ہوتا۔" جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ہمارے فاضل مقالہ نگار کے ہاں ادب کا کوئی راسخ تصور نہیں اس کا بہترین ثبوت ان کا یہ بیان بھی ہے ایک جگہ تو وہ یہ فرماتے ہیں کہ فن اور معنی اور صورت کے امتزاج کا نام نہیں خواہ معنی اور صورت کیسے بھی ہوں۔ بس ایک خیال ہونا چاہیئے بس ایک فارم ہونا چاہیئے فن اسی خیال اور اس فارم کے امتزاج کا نام ہے۔" غور فرمایئے کہ اب بیچارے داغ پر غیر فنی ہونے کا الزام کس حد تک درست ہے دنیا کا ہر شاعر اس لحاظ سے فنی ہے ہر ایک کے پاس خیال ہوتا ہے فارم ہوتا ہے اور اس کا امتزاج بھی۔ لیکن اس کے ساتھ

راہی صاحب ادب کی تعریف ہی یہ فرماتے ہیں کہ "ادب معنی اور صورت کے امتزاج کا نام ہے"۔ اس تعریف کے لحاظ سے ناسخ کی شاعری ادبی حیثیت سے بلند ہو جاتی ہے اور راہی صاحب کو بھی اگر وہ اپنی تعریف کو صحیح سمجھتے ہیں تو ناسخ کی عظمت کا اعتراف کرنا چاہیے کیونکہ معنی اور صورت کا یہ بہترین امتزاج ہے لیکن راہی صاحب جانے کیوں ناسخ کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں حالانکہ وہ معنی پر اہمیت دینے کو "غلطی" سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اب کیا کہا جا سکتا ہے سوائے اس کے کہ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔

راہی صاحب نے کلاسیکل ادب کے متعلق جو گل افشانیاں کی ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ پہلے تو فرمایا ہے "ماضی کا ادب عالیہ کوئی چیز نہیں ہوتا"۔ افسوس ہے کہ راہی صاحب کو اس کا شعور ہی نہیں ہے ماضی کی زندگی میں کتنی اہمیت ہے بغیر اس کی بصیرت کے نہ تو حال کچھ ہے نہ مستقبل کچھ بن سکتا ہے۔ اگر راہی صاحب سے ان کا پورا ماضی چھین لیا جائے تو وہ کچھ بھی نہ رہ جائیں۔ بغیر ماضی کے شعور کے وہ پاگل ہو جائیں، اور لوگوں سے پوچھتے پھریں کہ "میں کون ہوں؟"

انسانی زندگی کی طرح ادب میں بھی ماضی کی اہمیت مسلم ہے اس کی اہمیت سے انکار کرنا قطعی ہوشمندی کی دلیل نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بڑی مضحکہ خیز بات انھوں نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہی ہے کہ "ماضی کے ادب کا وہ حصہ جو آج اچھا لگ رہا ہے وہ کیوں اچھا لگ رہا ہے؟"

فرماتے ہیں "جناب ایک تو وہ اختصاراً اچھا لگ رہا ہے دوسرے یہ کہ اس میں معنی و صورت کا اچھا امتزاج نظر آتا ہے۔ تیسری وجہ ہے کہ بچوں کے منہ سے دانائی کی باتیں کسے اچھی نہیں لگتیں"۔ ان تمام باتوں کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی عاقل و بالغ "کسی بچہ" کی بچکانہ حرکت کو اعتراض کے طور پر بچکانہ کہے تو اس کی طفلانہ حماقت کے متعلق کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ راہی صاحب ماضی کی عظیم شخصیتوں کو بچے قرار دیتے ہیں لیکن ان پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ان کے کارنامے بچکانہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "ایڈیپس کی دکھ بھری کہانی نہایت بچکانہ ہے۔ یہ کہہ کر میں مونالیزا کی اہمیت سے انکار نہیں کر رہا ہوں۔ اس کی اہمیت مسلّم لیکن کہانی پھر بھی بچکانہ ہے"۔ راہی صاحب نے اپنے مقالہ میں یہاں سے وہاں تک یہ واویلا مچائی ہے کہ نئے ادب کو پرانی کسوٹی پر کس کے پرکھا جا رہا ہے لیکن انھوں نے خود شروع سے آخر تک نئی کسوٹی پر پرانے ادب کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ماضی کو نہ سمجھ سکنا بے عقلی کی دلیل ہے کیوں کہ ماضی سے گزرنے کے بعد ہی ہم حال تک پہنچ سکے ہیں۔ حال کو ماضی کو ذریعہ جانچا سکتا ہے یہ بڑی حد تک درست بھی ہو سکتا ہے لیکن ماضی کو حال کو ذریعہ جانچنا قطعی جہالت کی بات ہے۔ اس لیے کہ ماضی کے لوگوں کو حال کا کوئی شعور نہ تھا وہ جانتے ہی نہیں تھے کہ حال کیسا ہوگا۔ غالب یا میر بیسویں صدی کے شعر گوئی کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتے تھے لیکن بیسویں صدی کے شعرا کے سامنے میر و غالب کی شاعری موجود ہے۔ غالب اگر راہی صاحب کی بات نہ سمجھے تو غالب پر کوئی حرف نہیں آئے گا لیکن اگر راہی صاحب غالب کو نہ سمجھ سکیں تو ان کی سمجھ بوجھ مشتبہ ہو جائے گی۔

راہی صاحب نے حد کر دی ہے کہ وہ ماضی کے ادب عالیہ کو ایک ہی سانس میں "احتراماً" پسند فرماتے ہیں اور بچوں کے منہ سے نکلی ہوئی دانائی کی باتیں بھی قرار دیتے ہیں۔ اگر وہ بچوں کے منہ سے نکلی ہوئی دانائی کی باتیں ہیں تو پھر احترام کے جذبے کے پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں، اور اگر احترام کا جذبہ پیدا کرنے والی باتیں ہیں تو پھر وہ بچوں کی سی باتیں نہیں کہی جا سکتیں ان باتوں کا تضاد ظاہر ہے۔ شاید راہی صاحب نے زندگی میں کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ ایک ملک کا ادب دوسرے ملک میں کیوں پسند کیا جاتا ہے۔ ادب میں وہ کون سی چیز ہوتی ہے جو اسے زمان و مکان کی قیود سے بالاتر کر دیتی ہے۔ ہم اپنے ملک کے قدیم ادبی کارناموں کو احتراماً پسند کر سکتے ہیں لیکن دوسرے ملکوں کے قدیم ادبی کارنامے ہمارے لیے کیوں قابل توجہ ہیں۔ کیوں عمر خیام، سعدی اور کالی داس مغرب میں آج بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں کیوں مشرق میں بھی گوئٹے اور شیکسپیر کا اتنا چرچا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں راہی صاحب جیسے "معصوم" لوگ بہت کم ہیں جو صرف انھیں احتراماً پسند کرنے لگیں۔ ان کارناموں میں لازمی طور سے کوئی ایسی بات ہے جو انھیں زمان و مکاں کی حد بندیوں سے آزاد کر دیتی ہے اور وہ ہیں آفاقی اقدار سب سے بڑی اور اہم آفاقی قدر جو ادب کو زندہ و جاوید بناتی ہے۔ وہ اپنی سادہ ترین صورت میں انسانی زندگی کی پیش کشی سے تعبیر کی جا سکتی ہے جہاں کہیں اور جس کسی ادیب اور شاعر نے انسانی زندگی کے کسی پہلو، کسی بھی رخ کو اپنے فن کی گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی ہے اس نے ہمیشگی حاصل کر لی ہے۔ ہم ماضی کے اسی ادب کو قابل توقیر سمجھنے پر مجبور ہیں جس کے فن کے آئینہ میں ہم نے اپنا منہ دیکھ لیا ہے۔ انسانی احساسات و جذبات ہر زمانے میں ایک رہے ہیں۔ اور ان ہی کی تصویر کشی اور عکاسی ہر زمانے کے ادب کا موضوع رہی ہے ہر ملک کے ادب کا موضوع رہی ہے۔ اس لیے جب ہم کسی بھی زمانے اور کسی بھی ملک کے ادب کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس کرتے ہیں "گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" تو پھر ہمارے لیے وہ ادب عظیم بن جاتا ہے۔ اور ہم اسے دل و جان سے پسند کرنے لگتے ہیں۔ افسوس ہے کہ راہی صاحب شاعر ہوتے ہوئے بھی اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے۔

راہی صاحب کے مقالہ میں ایسی بے شمار باتیں ہیں جن کے متعلق کچھ لکھنا بیکار ہے۔ آخر میں صرف ایک بات ضرور کہوں گا کہ اگر راہی صاحب مجروح کے شعر پر تنقید نہ فرماتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ انھوں نے مجروح کے شعر پر تنقید کر کے اپنا سارا بھرم کھو دیا ہے۔

راہی صاحب نے مجروح کے شعر کے متعلق لکھ کر جو تنقید فرمائی ہے اس سے مجروح کا تو کچھ نہیں بگڑا لیکن اس سے یہ ضرور اندازہ ہو گیا کہ خود راہی صاحب کتنے پانی میں ہیں۔ مجروح کا شعر اور راہی صاحب کی تنقید ملاحظہ کیجیے۔

فرازِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

"جو لوگ ستم کی اس سیاہ رات ہی سے ناواقف ہیں وہ اس شعر سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے کیوں کہ ان میں

علامتوں میں کوئی توسیع (؟) نہیں کی گئی ہے۔ آج کی دنیا میں یہ شعر اجنبی ہے لیکن یہ شعر کل کی محفل کی جان ہوگا۔ راہی صاحب آج آپ کی یہ تنقید اجنبی ہے لیکن یہ شعر نہ آج اجنبی ہے نہ آنے والے کسی زمانے . . . . میں اجنبی ہوگا جب کبھی ستم کی سیاہ رات آئے گی سروں کے چراغ جلانا ہی پڑیں گے۔ شعر میں صرف ستم کی سیاہ رات کہہ کر مجروح نے بڑی ہی جامعیت اور بلاغت پیدا کردی ہے۔ یہ ستم کی سیاہ رات عشق حقیقی میں بھی پیش آسکتی ہے، عشق مجازی میں بھی اور غم روزگار میں بھی ——— جہاں کہیں اور جب کبھی ستم کی سیاہ رات درپیش ہوتی تھی یا اب کبھی ہوتی ہے یا جب کبھی ہوگی تو سرفراز دار پر سروں کے چراغ رکھنا پڑیں گے۔ لیکن راہی صاحب کی خوش ذوقی کو کیا کیجئے کہ شعر کی اس جامعیت کو نہیں دیکھ سکے۔ یہ میں نہیں کہتا کہ مجروح کے پاس ایسے شعر نہیں ہیں جو وقتی اور ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن شعروں کا انتخاب آسان کام نہیں ہے۔ اگر راہی صاحب شعر کا انتخاب نہ کرتے تو پھر رسوائی کی شہرت کیسے حاصل ہوتی؟

تبصرے

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

نظم جدید کی کروٹیں

مصنف ڈاکٹر وزیر آغا۔

مجلد قیمت ۵۰-۲۔ صفحات ۲۴۰۔ ناشر ادارہ ادبی دنیا لاہور۔

ڈاکٹر وزیر آغا ایک نقاد، انشائیہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے خاصے مشہور ہیں۔ ادب کے میدان میں ڈاکٹر صاحب کی ہمہ جہتی دلچسپی ان کی بے پناہ لگن اور ادب سے غیر معمولی شغف کی آئینہ دار ہے۔ "نظم جدید کی کروٹیں" ان کے ان عددی مضامین کا مجموعہ ہے جو "ادبی دنیا" میں سلسلہ وار چھپ چکے ہیں۔ وزیر آغا نے اپنے ان مضامین میں ہر شاعر کے ان بنیادی محرکات کو کھوج نکالنے کی کوشش کی ہے جنھوں نے اسے شعر کہنے پر اکسایا ہوگا اور اسی وسیلے سے ڈاکٹر صاحب نے شاعر کے مزاج شعری کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے ابتدائی دو مضامین "نظم اور اس کا پس منظر" اور "اردو نظم ــــ ایک جائزہ" کتاب کے پیش لفظ کا کام دیتے ہیں اور شعر کے ساتھ نقاد کے رویّہ کی وضاحت بھی کرتے ہیں کسی شاعر کا "مکمل کام" سامنے رکھ کر اس کے مزاج کا تعین کرنا بڑا اہم اور نازک مسئلہ ہوتا ہے اور اس میں اختلاف رائے کی کافی گنجائش ہے (شاید اسی لیے اردو تنقید میں اس انداز کے مضامین شاذ و نادر ہی ملیں گے) ممکن ہے کہ بعض قارئین کو ڈاکٹر صاحب کے بعض مضامین سے اختلاف ہو لیکن ان کے اس رجحان اور محنت اور خلوص کے ساتھ مسائل پر نظر ڈالنے کے انداز کو یقیناً سبھی اہل نظر سراہیں گے۔ اقبال، فیض اور اختر الایمان کے تعلق سے لکھے ہوئے مضامین اختلافی نوعیت کے حامل ہیں۔ اقبال کی شاعری مختلف ادوار سے گزری ہے اس لیے انھیں صرف ایک نیچر پرست شاعر کہنا زیادہ مناسب نہیں زیادہ سے زیادہ ہم اس عنوان کے تحت ان کے ایک دور شاعری کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فیض والے مضمون پر "شعر کیا ہے اور شعر کیوں کہا جاتا ہے" کی بنیادی بحث اٹھ سکتی ہے۔ ویسے بھی تنقیدی نظریوں میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور یہ ناگزیر ہے "دھرتی پوجا کی مثال" میراجی کے تعلق سے بڑا عمدہ اور کارآمد مضمون ہے۔ اس مضمون سے میراجی اور ان کی شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ میراجی پر بہت کم کام ہوا ہے جب کہ ان پر اس قسم کے کام کی بڑی ضرورت ہے مقالہ نگار نے میراجی کو جس انداز سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے اس کی مثال اس سے قبل کہیں نہیں ملتی۔ اسی طرح

مجید امجد، یوسف ظفر اور قیوم نظر پر لکھے ہوئے مضامین بھی خاصے کی چیز ہیں۔

راجہ مہدی علی خاں کو مضمون نگار نے بڑے اچھے ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے "آزادروی کی مثال" البتہ جلدی میں لکھا ہوا مضمون معلوم ہوتا ہے۔ ہر مضمون میں صاحبِ مضمون نے شعر و ادب کے تعلق سے ذیلی مسائل پر بھی بحث کی ہے جو اس کے وسیع مطالعہ اور شعری ذوق کا پتہ دیتی ہے۔

بہرحال "نظم جدید کی کروٹیں" اردو تنقید میں ایک خاص رجحان کی نمائندگی کرنے والی اہم کتاب ہے۔ ممکن ہے اس کے بعد نقاد اس انداز کی تنقید کی طرف راغب ہوں اور شاعر کے ساتھ زیادہ انصاف کر سکیں۔

اردو نظم اور خصوصاً جدید اردو نظم کے مطالعہ میں یہ کتاب کافی اہم مددگار ثابت ہوگی۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ادارہ "ادبی دنیا" اس کتاب کی اشاعت پر قابلِ مبارک ہیں۔ اچھی لکھائی چھپائی، عمدہ گردپوش کے ساتھ ساتھ عمدہ مواد کے لحاظ سے اس کتاب کی قیمت ڈھائی روپے کچھ کم ہی معلوم ہوتی ہے۔ (بشر نواز)

ملاقاتیں

مصنف الطاف حسن قریشی

قیمت پانچ روپے۔ ناشر: اردو ڈائجسٹ پبلیکیشنز لاہور

"ملاقاتیں" مجموعہ ہے ان انٹرویوز کا جو پاکستان کی اہم اور بقول مصنف عظیم شخصیتوں سے وقتاً فوقتاً لیے گئے ہیں۔ ابتدا میں قریشی صاحب نے بڑے تیکھے اور واضح انداز میں بڑے اور عظیم آدمی کے فرق کو ظاہر کیا ہے۔ یہ بات واقعی قابلِ تعریف ہے کہ مصنف نے کسی شخص کو عظیم اس کے موجودہ بڑے عہدے، سماجی پوزیشن، ظاہری عزت اور رکھ رکھاؤ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی ذاتی صلاحیتوں، کردار اور علمیت کی وجہ سے مانا ہے۔ ان ملاقاتوں میں اس بات کو بھی خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ ہر مکتبۂ خیال اور ہر پیشے کے اہم اشخاص سے تبادلۂ خیال کیا جا سکے۔ ان دنوں انٹرویو لینا اور اسے شائع کروا دینا ایک فیشن سا بن گیا ہے لیکن اکثر انٹرویو اس قسم کے ہوتے ہیں کہ نہ ان میں انٹرویو لینے والے کی شخصیت اور مقصد نمایاں ہوتا ہے اور نہ اس شخص کے خیالات اور شخصیت کا پتہ چلتا ہے جس سے انٹرویو لیا گیا ہے لیکن زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اگر ملاقات کرنے والا شخص ذہین اور سمجھدار ہے تو وہ اپنی ملاقات میں مخاطب شخصیت کے ہر ہر پہلو کو نمایاں کر سکتا ہے۔ سولہ شخصیتوں سے لیے گئے ان انٹرویوز میں یہ خوبی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ قریشی صاحب نے ہر شخص سے اس کے خاص رجحانات و میلانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوالات کیے ہیں۔

مثلاً "زندگی مسلسل متحرک ہے۔ یہ بڑھتی گھٹتی اور پھیلتی ہے اس کے خول میں بے پناہ لچک ہے اگر اسلام ایک نظامِ حیات ہے تو اس میں بھی لچک ہے۔" (ابوالاعلیٰ مودودی۔ صدر جماعت اسلامی پاکستان)

"ہم مغربی پاکستان کے لوگوں کو ایک دوسرے سے زیادہ قریب کیوں کر لا سکتے ہیں؟"

(اے۔ کے بروہی۔ وزیر قانون پاکستان)

ایک ایڈیٹر سے انٹرویو لینے کا یہ انداز۔

"آپ نے قانون پڑھا لیکن آپ کی زندگی کا بڑا حصہ ادب و صحافت کے گرد گھومتا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟"
(میاں بشیر احمد مدیر "ہمایوں")

اس خیال کی تائید کرتا ہے۔
زیر نظر کتاب میں جیسا کہ ابھی کہا جا چکا ہے ہر پیشے، طبقہ، اور مکتبۂ فکر کے لوگوں کے خیالات معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس لحاظ سے ہم اسے پاکستان کے اہم اشخاص کا ذہنی سروے بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس دور میں اس قسم کے سروے کی سخت ضرورت ہے تاکہ یہ پتہ چلا سکیں کہ مختلف شعبوں کے ذہین اور سوچنے والے اصحاب اپنے ملک و قوم کے تعلق سے کیا سوچتے ہیں۔ وہ موجودہ معاشرے میں کونسی کمی پاتے ہیں کیا خامی پاتے ہیں اور کونسی اچھائی دیکھتے ہیں
سید ابوالاعلیٰ مودودی، اے کے بروہی، میاں بشیر احمد، مولوی تمیز الدین خاں، پروفیسر حمید احمد خاں، ڈاکٹر خدیجہ جسٹس رحمن، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر، غلام رسول مہر، جسٹس کیانی، جسٹس شریف چودھری نذیر احمد، اور حکیم نیر واسطی سے لیے ہوئے یہ انٹرویوز پاکستان کے متعلق بہت کچھ معلومات فراہم کرتے ہیں۔
حسن عسکری کے دیباچے کے ساتھ ۱۷۲ صفحات کی یہ کتابت و طباعت کے اعتبار سے کافی دیدہ زیب ہے اور اپنی معنویت اور مقصدیت کے لحاظ سے بھی اس لیے اہم ہے کہ اس میں کہ تمام خاکے ایسی شخصیتوں کے تجربات خیالات اور احساسات کا مجموعہ ہیں جو درد مند دل اور سوچنے والا دماغ رکھتے ہیں۔ جو صاحب نظر بھی ہیں اور صاحب بصیرت بھی۔
کتابی شکل میں آنے سے پہلے یہ ملاقاتی خاکے "اردو ڈائجسٹ" میں شائع ہو چکے ہیں۔ (بشر نواز)

برگِ نوخیز
مصنف ڈاکٹر عزیز تمنائی
قیمت ڈھائی روپے۔ ناشر دارالتصنیف مدراس ۱۴

جدید اردو شاعری نے جیسے مغرب سے بہت ساری چیزیں لی ہیں ویسے سانیٹ بھی مغربی اثرات ہی کی دین ہے اردو میں اختر شیرانی اور ن، م راشد نے اس صنف سخن کو کافی اہم بنا دیا ہے گو ان سے پہلے بھی کچھ شعراء اس طرف متوجہ ہوئے تھے لیکن ان کی مساعی اتنی کامیاب نہیں رہیں۔ نوجوان شعراء میں عزیز تمنائی نے اس طرف مکمل توجہ دی ہے اور اس نسل کے پہلے شاعر ہیں اور جن کا پورا مجموعہ سانیٹس، پر مشتمل ہے اور یہ ایک سو نو سانیٹس پر مشتمل مجموعہ "برگ نوخیز" شاعر کے مزاج اور اس کے فن کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ سانیٹس اپنے قریبی پیش روؤں سے بڑی حد تک مختلف ہیں۔ راشد اور اختر شیرانی نے اس صنف سخن کو "عشقیہ" جذبات و مضامین کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور مغربی زبانوں میں اس قسم کے مضامین باندھے جاتے تھے لیکن عزیز تمنائی نے سانیٹ میں عہد حاضر کے مسائل، انسانی کامیابیاں، جنگ و امن کے موضوعات بھی کچھ سمونے کی کوشش کی ہے اور بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں "ہتھیار بندی" "ستاروں کی گلی" اور "امن" اس سلسلے کے کامیاب سانیٹ ہیں۔

نئی نظم کہنے والے اچھے شعرا کی طرح عزیز تمنائی نے سیدھے سادے عشقیہ جذبات کے بجائے بعض سانیٹس میں عشق و محبت کی نفسیات کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کو جو سانیٹ کو صرف "لیرکل پوئٹری" کی حد تک محدود رکھنا چاہتے ہیں یہ بات ناگوار ہو لیکن بہت سارے لوگ اسے ایک نیک قدم مانیں گے۔ جب غزل جیسی کٹر صنفِ سخن حالات کے ساتھ ساتھ اپنا مزاج بدل سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دیگر اصنافِ سخن میں ان بندھنوں کو نہ توڑا جائے۔ "فرہاد سے" "مسیحی" "ندا" "نئی نسل" "جوہرِ تخلیق" "اک سنگِ گراں اور سہی" وغیرہ اس مجموعے کے خوبصورت سانیٹس ہیں۔ ہیئت کی سخت پابندی، مصرعوں کی خاص ترتیب، اور محدود تعداد بعض جگہ شاعر کی فکر و اظہار کی راہ میں دیوار ہو گئی ہے اور کچھ سانیٹس ان پابندیوں کی نذر ہو گئے ہیں تاہم خاص تعداد میں عمدہ سانیٹس بھی مل جاتے ہیں اور کتاب پڑھنے والے کو مایوسی کا شکار نہیں ہونا پڑتا۔ ابتدا میں پروفیسر احتشام حسین کے دیباچہ کے علاوہ خود شاعر نے بھی سانیٹ کے بارے میں ایک معلومات افزا مضمون تحریر کیا ہے۔ یہ دونوں مضامین ایک عام قاری کے لیے اس لیے کافی اہم ہیں کہ اکثر لوگ ابھی سانیٹ کی ہیئت و روح اور اس کی تاریخ سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے

(بشر نواز)

پیاسی بیل مصنف مانک ٹالہ

"پیاسی بیل" مانک ٹالہ کے افسانوں کا غالباً پہلا مجموعہ ہے۔ اٹھارہ افسانوں والی اس صاف ستھری خوبصورت کتاب کا مصنف ایک دھیمی لیکن متوازن شخصیت کا مالک ہوگا (میں مانک ٹالہ سے کبھی نہیں ملا۔ اس کی شخصیت کا اندازہ اس کے افسانوں سے قائم کر رہا ہوں) اس کے افسانوں میں ایک دم چھوٹ بہنے والی کیفیت یا قاری کو دفعتاً مبہوت کر دینے والی صلاحیت نہیں ملتی مانک ٹالہ کا فن رفتہ رفتہ اپنے پڑھنے والے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی کہانی بڑے دھیمے لہجے میں شروع ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے اس کا (VOLUME) بڑھتا ہے اور ایک مناسب سطح پر کہانی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد بھی پڑھنے والا کہانی کے ماحول میں بڑی دیر تک گھومتا رہتا ہے یہی اس کے فن کی کامیابی ہے۔ جزئیات نگاری اور ہلکا ہلکا طنز پیاسی بیل کی کامیاب کہانیوں کی خصوصیت ہے۔

کہیں کہیں جزئیات نگاری اکتاہٹ کا باعث بن جاتی ہے (گو یہ بہت کم ہوا ہے) البتہ دبے دبے انداز میں طنز نے مانک ٹالہ کے اکثر افسانوں کو بڑا تیکھا اور دلکش بنا دیا ہے اگر وہ اپنے اس انداز کو اور مانجھیں، اس تلوار کو جلا دیں، اس کی دھار کو اور تیز کر دیں تو یہ بات نہ صرف ان کے بلکہ اردو کے جدید افسانے کے حق میں بھی بڑی مفید ثابت ہوگی مانک ٹالہ پر منٹو کا اثر نمایاں ہے۔ بطور خاص "منا" میں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مصنف کا اپنا کوئی انداز یا لب و لہجہ نہیں ان کی خصوصیت کا تذکرہ ابتدا ہی میں کر دیا گیا ہے۔

"ست یگ کا انسان"، "ایک چیخ ایک گونج" "پیاسی بیل" "زبانِ خاموشی" اور "معجزہ" بڑی پراثر اور جاندار کہانیاں ہیں جو مانک ٹالہ کے ایک بہتر فنکار ہونے اور بہترین فنکار بننے کا یقین دلاتی ہیں۔

افسانوں سے قبل مصنف نے "اپنی کہانی" کے عنوان سے اپنا تعارف خود کرایا ہے۔ "حرف اول" مشہور نوجوان افسانہ نگار جوگندر پال سے لکھوایا گیا ہے، اور یہ ایک نیا قدم ہے کیوں کہ اس نسل کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے اسی نسل کا کوئی ذہین فنکار موزوں ہو سکتا ہے۔ پال نے بڑے خوبصورت اور افسانوی انداز میں مصنف کی شخصیت اور اس کے فن کے خدوخال اجاگر کیے ہیں۔

جیوپیٹر پبلشرز بمبئی کی جانب سے شائع ہونے والی یہ کتاب معنوی اور صوری اعتبار سے کافی کامیاب ہے اور ہر کتب خانے کی زینت بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ البتہ پونے دوسو مجلد صفحات کی قیمت چار روپے کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

(لیث نواز)

چاند کی بستی مجموعہ ہے داؤد چغتائی ایم اے کی نظموں، غزلوں، قطعات اور گیتوں کا جس کا تعارف، تقریظ اور تبصرہ بالترتیب ڈاکٹر شوکت سبزواری، شاہد احمد دہلوی، اور سلیم احمد نے لکھا ہے۔

شوکت صاحب کا بیان ہے کہ "داؤد چغتائی کی زبان ان کے خیالوں کی طرح چاند کی مانند دھلی ہے" پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب کا اس سے کیا مفہوم ہے کیوں کہ مجموعہ میں کئی جگہ زبان کی غلطیاں موجود ہیں، اور بعض مصرعے بحر سے خارج بھی ہیں۔ مثلاً

'زلبت کا خواب جو تو نے کبھی دیکھا تھا' (یہاں "تو" کے بعد "اگر" ہوتا تو مصرعہ موزوں ہوتا)

'میں نے مانا کہ رنگ و روپ کی رانی' (رانی کا "ی" وزن سے خارج ہے اگر مصرعہ وزن میں پڑھیں تو یوں ہوگا "میں نے مانا کہ رنگ و روپ کی ران"، اس کے علاوہ رنگ و روپ کی ترکیب بھی محل نظر ہے (ممکن ہے ڈاکٹر صاحب اسے کسی پرانے استاد کی مدد سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کریں) ایک مصرعہ ملاحظہ فرمایئے ع

"نہ مرنے سے مطلب ہے نہ زندگی سے"

اس کے علاوہ بعض اشعار میں ردیف حاضر قافیہ غائب اور لطف یہ ہے کہ نظم پابند اور روایتی انداز کی ہے ؎

چاند کو دیکھ کے خاموش رہا ہوں اکثر   بزم انجم میں بھی مہمان رہا ہوں اکثر

ان خامیوں سے قطع نظر یہ بات طے ہے کہ شاعر کے پاس کہنے کے لیے کچھ اور نہ سہی اس کی اپنی واردات ہے اور وہ اس کا اظہار بھی چاہتا ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے شاعری کرنے کے لیے صرف واردات کافی نہیں ہوتی۔ بعض اشعار جہاں شاعر کا ساتھ زبان و بیان و فن دے سکے ہیں گوارا ہو گئے ہیں۔

مثلاً

گیتوں میں ترے مکر کا احوال نہ ہوگا
لفظوں میں کبھی خون کا دعویٰ نہ کروں گا

ہوش نے جس کا احترام کیا   بے خودی نے اسی کو پیار کیا

نہ کوئی نقش جبیں تھا نہ کوئی نقش قدم یہ کیسی راہ گزاروں پہ چل رہے تھے ہم

مجموعہ پڑھ کر کچھ اور ہو نہ ہو اس کی اطلاع ضرور مل جاتی ہے کہ شاعر نے تین عورتوں سے محبت کی (جن میں سے دو کے نام سلطانہ ہیں) اور چوتھی سے شادی کر لی۔ نظموں میں روایتی انداز نمایاں ہے اور کہیں کہیں تو بعض مشہور و مقبول فلمی گیتوں کی آواز بازگشت تک سنائی دیتی ہے۔ مثلاً

میں نے زلفوں کی گھٹاؤں کی تمنا کی تھی ہائے افسردہ جوانی کے سوا کچھ نہ ملا

پڑھ کر ساحر کے گیت : میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہ ملا

کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

کم و بیش یہی کیفیت پوری نظم کی ہے اسی طرح "تیرے کوچہ سے جب گزرتا ہوں" پڑھ کر سیف الدین سیف کے "جب ترے شہر سے گزرتا ہوں" کی یاد آ جاتی ہے۔ اس کے باوجود "پیاسی مٹی"، "اپنی سلطانہ کے نام" اور "معصوم بغاوت" میں بڑا پیار اور سیدھا سادا جذبہ موجود ہے جو انھیں کسی قدر کامیاب نظمیں بنا دیتا ہے۔ گیتوں نظموں غزلوں اور قطعات کا یہ مجموعہ شاید وقت سے کچھ پہلے چھپ گیا اور بقول جوش ملیح آبادی "نظر ثانی کی بھٹی" سے بھی نہیں نکل سکا۔ آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے مقدمہ نگار سلیم احمد کی رائے نقل کر دی جائے۔ "ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ اپنی واردات کو تخیل اور حسن بیان کی مدد سے شعر بنا نا سیکھ لے گا۔"

اس کے آگے مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ "چاند کی بستی" ۳ روپے پچاس پیسے میں مرکز انوار کراچی سے خریدی جا سکتی ہے۔

(بشر نواز)

آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی کی اردو مطبوعات

۱	حیدرآباد کے شاعر (جلد اول)	مرتبہ: خواجہ حمید الدین شاہد	قیمت غیر مجلد چار روپے
۲	حیدرآباد کے شاعر (جلد دوم)	مرتبہ: سلیمان اریب	قیمت غیر مجلد پانچ روپے
۳	حیدرآباد کے ادیب (دو جلدوں میں)	مرتبہ: زینت ساجدہ	قیمت چار روپے فی جلد
۴	تلگو افسانے	مترجم: دانشور تھی	قیمت تین روپے
۵	شیشہ و تیشہ (طنز و مزاح)	شاہد صدیقی	قیمت تین روپے

سب

R.N. 3461/57 SABA-MONTHLY REGD. NO. A. 2


ماہنامہ
صبا
حیدرآباد

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

زر سالانہ ہندو پاک سے ۱۰ روپے
ششماہی ۶ روپے
بیرون ہند سے ۲۰ شلنگ

ایڈیٹر :-
سلیمان اریب
فون (۳۲۴۰۳)

ماہنامہ صبا

حیدرآباد دکن

جلد ۱۰
شمارہ ۹
ماہ ستمبر
سنہ ۱۹۶۳ء
قیمت ایک روپیہ

دہلی آفس :- ۷۰۹۱ ترکمان گیٹ دہلی ۶

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :- ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۷۳۰۲) کراچی ۳

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب، ۱۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد، مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان

مان لیجئے آپ بارہ برس تک، ہر مہینے ایک سو روپے کی مالیت کا ۱۲ سالہ نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ خریدتے ہیں۔ بارہ برس بعد ہر مہینے ایک سرٹیفکیٹ کی میعاد پوری ہوگی اور اس طرح ہر مہینے آپ کو ۱۵۵ روپے ملیں گے۔ بڑھاپے میں ٹیکس سے بری یہ آمدنی آپ کے بڑے کام سنوار سکتی ہے۔ اس آمدنی کی حیثیت باقاعدہ پنشن کی سی ہوگی نا!



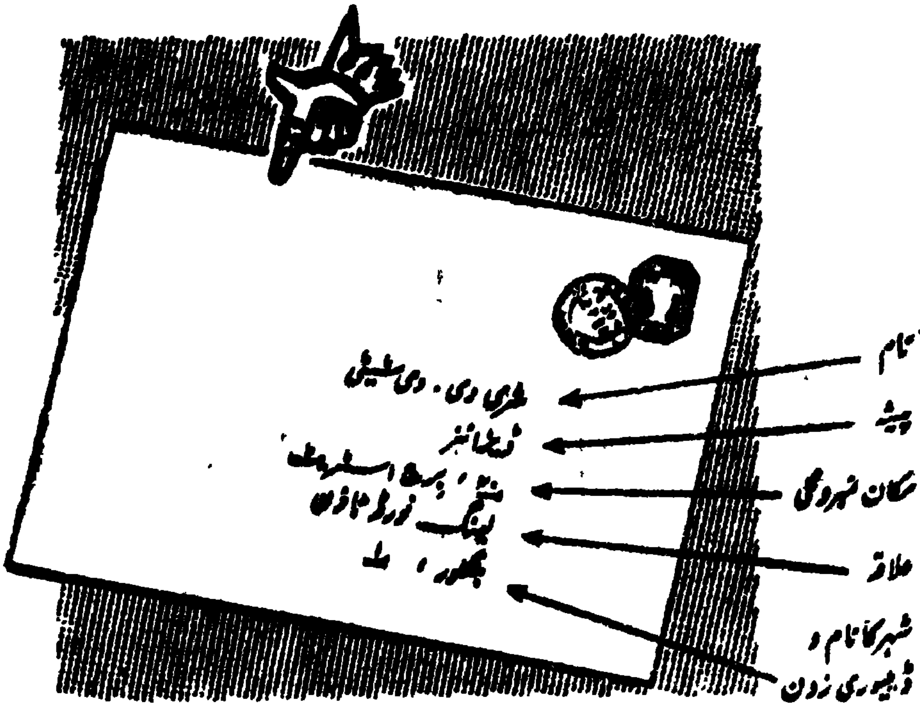
آپ کے لئے ماہانہ پنشن

سرٹیفکیٹوں کی میعاد پوری ہونے پر اگر آپ چاہیں تو ۵۵ روپے اپنے پاس رکھ کر، باقی یعنی ایک سو روپے کی اصل رقم سے پھر ہر مہینے نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ خرید سکتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر رقم لگانے کی نئی تاریخ کے بارہ برس بعد سے، مزید عرصہ بارہ برس کے لئے آپ یا آپ کے متعلقین کو باقاعدہ ماہانہ آمدنی ہوگی۔ نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ اقتصادی سلامتی کی ضمانت ہیں، جو آپ اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے مہیا کر سکتے ہیں۔

نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ خریدیئے

قومی بچت آرگنائزیشن

چٹھیوں پر
پتہ لکھنے کا
صحیح طریقہ یہ ہے



پتہ پورا ہو تو ڈاک
ٹھیک جگہ پر اور جلدی پہونچتی ہے

(محکمہ ڈاک و تار)

اس شمارے میں

حق مغفرت کرے

حق مغفرت کرے ۲۵ ستمبر کو مولوی نصیر الدین ہاشمی کا انتقال ہوگیا۔ ہاشمی صاحب عمر طبعی کو پہنچ کر مرے اور عزت و شہرت پا کر مرے پھر بھی ان کی موت کی خبر سن کر ایک دھکا سا لگا۔ ابھی ڈاکٹر زور کا غم تازہ ہی تھا کہ ایوان اردو کے دو اور ستون (مولانا صلاح الدین احمد اور پروفیسر حامد حسن قادری) منہدم ہو گئے اور اب ہاشمی صاحب ہم سے بچھڑ گئے۔

ہاشمی صاحب بہت سیدھے سادے بزرگ تھے اور اردو کے ایک محنتی اور خاموش خدمت گزار۔ انھوں نے ادیب اور محقق ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا حالانکہ ان کی بیسیوں کتابیں اور سینکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ نیز انھوں نے سالار جنگ لائبریری اور کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات کی جو فہرستیں مرتب کی ہیں سو وہ الگ۔

دکن کی تاریخ اور دکنی ادب کی تحقیق کے لیے ہاشمی صاحب نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی اور ان کا جمع کیا ہوا مواد باوجود بعض تحقیقی کوتاہیوں کے دکنی ادب پر کام کرنے والوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ ثابت ہوگا۔ ہاشمی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھوں نے نام و نمود کی خواہش، ستایش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر اردو زبان و ادب کی خدمت کی اور یہ بڑی بات ہے۔ اب اردو کو ایسے سرپھرے، دھن کے پکے اور مخلص لوگ کہاں ملیں گے اور بقول ڈاکٹر مسعود حسین خاں:

اب فقط رہ گئے ہم پیشہ وران اردو

اظہر علی فاروقی

اردو زبان اور شاعری میں

ویدک دھرم کی اساطیری جھلکیاں

بنی نوع انسان کی زندگی میں کچھ ایسی مخصوص باتیں کچھ ایسے طور طریقے، کچھ ایسی قدریں اور ایسے طور طریقے: کچھ ایسی قدریں اور ایسے تصورات نظر آتے ہیں جن پر سب لوگ بنیادی طور پر اتفاق کر لیتے ہیں اور اس قسم کے افراد ان کو اپنا نصب العین اور آدرش بنا لیتے ہیں۔ یہی تصورات اور اقدار رجحانات روایات کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔ یہی روایات مجموعی طور پر کلی تہذیب، تمدن اور ثقافت بن جاتی ہیں۔ یہ سب باتیں کسی قوم کی جغرافیائی حالات، فطری میلانات اور ذہنی رجحانات کے اثرات سے صورت پذیر ہوتی ہیں اور ان میں وہ صحت مندی اور ہمہ گیری تسلیم کی جاتی ہے جو ریاضی کے علوم متعارفہ اور اصول موضوعہ سے کسی طرح کم نہیں سمجھی جاتی۔

یہ روایات کسی ایک مخصوص وقت میں تعمیر نہیں ہو جاتیں بلکہ زمانے کے ہاتھوں ایک طویل وقت تک جنم لیتی اور پروان چڑھتی رہتی ہیں جن کی ایک مستقل ہیئت بن جاتی ہے۔ شاعر اپنی فطری اپج سے مجبور ہو کر جو کچھ کہتا ہے اس میں بظاہر ایک قسم کی انفرادیت معلوم ہوتی ہے لیکن سچ پوچھئے تو یہ اپج ان تمام خارجی حالات اور اسباب کا نتیجہ ہے جس کو مجموعی طور پر سماجی ہیئت اجتماعی یا تمدن کہا جاتا ہے۔ شاعر براہ راست سماجی قدروں سے متاثر ہوتا ہے اور انھیں روایات کے سہارے اپنے تاثرات ذرا تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح روایات کی وہی حیثیت ہو جاتی ہے جو کسی عمارت میں ان ستونوں کی ہوتی ہے جن کے سہارے اس عمارت کی بنیادیں استوار کی جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ کسی زبان کا ادب ایک ایسا تاریخ بن جاتا ہے جس میں اس زبان کے بولنے والوں کی روایات اور اساطیر کی بڑی نورانی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

اردو زبان اور شاعری نے عوام اور فقرا اور درویشوں کی گود میں آنکھ کھولی۔ شاہی درباروں اور اراکین دولت اور امرا کی محفلوں میں پروان چڑھی جنھوں نے ہندو روایات اور اساطیر کو زبان، ادب اور اشعار میں داخل کر کے اپنی فراخ دلی اور آزاد خیالی کا ایک زبردست ثبوت دیا۔ مصری، اسرائیلی، یونانی، نصرانی اور اسلامی روایات کے مثل ہندو روایات اور اساطیر کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ پایا جاتا ہے اردو شاعروں اور ادیبوں نے انھیں اپنی روایات کے مثل اپنایا اور اپنے تخیل کی بنیادیں ان پر قائم کیں۔

یوں تو یہ سب کچھ اس فطری اصول کے تحت وجود میں آیا کہ جب دو مختلف الخیال قومیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور ان میں ربط و ضبط پیدا ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے کی تہذیب سے تاثر قبول کرتی ہیں بشرطیکہ ان میں عصبیت اور تنگ نظری نہ ہو۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا اور بہت بڑھ چڑھ کر ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ مسلمان صوفیوں اور درویشوں۔ ہندو سادھوؤں اور سنت رشیوں کے ارتباط سے ایک نے دوسرے کے مذہبی اثرات قبول کرنا شروع کر دیے۔ چنانچہ حضرت داتا گنج بخش گیارھویں صدی عیسوی میں لاہور تشریف لائے اور اس کے بعد ۱۱۰۰ء میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیر میں قیام فرما ہوئے جن سے ہزاروں لاکھوں ہندو عقیدت رکھتے تھے اور آج بھی ارادت مند ہیں۔ خواجہ بختیار کاکی دہلی تشریف لائے اور وہاں بھی یہی حال رہا۔ پاک پٹن کے بابا فرید شکر گنج حضرت بو علی شاہ قلندر، حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو شمالی ہند میں۔ سید محمد گیسو دراز دکنی ہندوستان میں مرنجاں مرنج قسم کے پاک نفس درویش اور صوفی ہوئے۔ ان صوفیائے کرام سے جس طرح مسلمان عقیدت رکھتے تھے اسی طرح ہندو بھی ان کے بھگت اور پرستار رہتے۔ ہندوؤں میں سوامی رامانج، ولبھ آچاریہ، سوامی چیتنیہ دیو نے ذات پات کے بندھن توڑنے کا درس دیا اور ان سے ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر متاثر ہوئے۔ ان تاثرات کا نتیجہ اردو شاعری کی صورت میں نمودار ہوا، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکجہتی کی ایک بہترین نمائندہ زبان ہے۔ امیر خسرو کے یہ بول سنیے اور اردو زبان بولنے والوں کی فراخ دلی کی داد دیجیے:

حضرت کھاجا سنگ کھیلے دھمال   بائس کھاجا مل بن بن آیو تال

حضرت رسول صاحب جمال

حضرت کھاجا سنگ کھیلے دھمال

اور سنیے: عرب یار تیرا بسنت منایو   سدا رکھ لال گلال

حضرت رسول صاحب جمال

حضرت کھاجا سنگ کھیلے دھمال

آئیے سر دست ان مذہبی اساطیر اور روایات کی وہ تصویریں دیکھیں جن کا تعلق ویدک دھرم سے ہے۔ تفصیل میں جانے سے بیشتر یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ ادیب اور شاعر روایات اور اساطیر جوں کی توں نہیں رکھتے بلکہ ان کے تصورات میں تلمیحی طور پر ان کی روح جاری و ساری رہتی ہے۔ الفاظ، محاورات، ضرب الامثال میں ان کی اسپرٹ موجود رہتی ہے اور ادیب اور شاعر محض اشاریت سے کام لیتے ہیں۔

ویدک دیوتاؤں میں برہما، اندر، وشنو، شیو اور مہیش ایک امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں۔ اردو میں ان سے وابستہ واقعات کی روح کہاں تک حلول کر چکی ہے اس کا اندازہ آپ ان فقرات سے لگا سکتے ہیں۔

اندر کا اکھاڑا، اندر سبھا، راجا اندر، اندر کی پریاں وغیرہ۔ اندر دیوتا سورگ پتی مانے جاتے ہیں اور ان کی حیثیت ہندوؤں میں وہی جو رضوان کی مسلمانوں میں۔

بھیرو ناچنا اردو میں ایک محاورہ ہے جس کے معنی غصہ ہونا. آپے سے باہر ہونا ہیں اس محاورے میں ایک ویدک اساطیری روایت کی جو روح پائی جاتی ہے وہ صاف ظاہر ہے. شیوجی جب غصہ ہوتے تھے تو بھیروں ناچ ناچتے تھے جس سے زمین پر زلزلہ آ جاتا تھا اس ناچ کے وقت ان کی ہئیت کیا ہوتی تھی اور اس کی نوعیت کیا ہے ؟ اس کا جواب نظیر اکبرآبادی کے یہ شعر دیں گے :

آنکھوں میں چھا رہا ہے تیرا سروپ کالا
تن میں بھبھوت مل کر گل بیچ سند ڈالا
ماتھے پہ تیرے ٹیکا سیندور کا براجے
ترشول کاندھے اور بھیرو کی گت بھی باجے
غصے میں تو جو آ کر اپنی جٹا ہلاوے
دھرتی اکاش پربت پاتال دہل جاوے

اسی ناچ کی بدولت شیوجی نے دکھو راکششش کو بھی مارا تھا.

شری کرشن جی بچپن سے ترکال درشی مانے جاتے تھے. اس کی ترجمانی نظیر اکبرآبادی نے اس طرح کی ہے :

اک روز منہ میں کانھ نے ماکھن چھپا دیا
پوچھا جسودا نے تو وہیں منہ بنا دیا
منہ کھول تین لوک کا عالم دکھا دیا
اک آن میں دکھا دیا اور پھر بھلا دیا

رادھا کی یاد کرنا، نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی، کنھیا بنے پھرنا جیسے محاورات میں ویدک دھرم کی اس روایت کی جو روح پنہاں ہے، صاف ظاہر ہے.

اردو شاعروں نے نہ صرف رام اور سیتا پر اور ان کے حالات سے وابستہ واقعات اور سانحات پر نظمیں لکھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا، بلکہ ان کی مدد سے یہ کہاوتیں اور محاورے بنائے جو اردو روزمرہ میں داخل ہو گئے.

رام کہانی سنانا، رام راج ہونا، لنکا میں آگ لگا، لنکا میں جو ہے سو باون گز کا، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے. آخری کہاوت میں راون کے بھائی بھبھیشن کے اس کام کی طرف اشارہ ہے جس کی بدولت لنکا میں آگ لگی اور تباہی بربادی آئی.

اسی روایت سے وابستہ ایک محاورہ بنا یا ستی بننا جس کے معنی ہیں پریشانیوں اور تکلیفوں میں گھبرا کر ایک جگہ کا ہو جانا. اودھ کے قصبات میں مسلمان عورتیں آج بھی اس طرح بولتی ہیں "کیا کروں بہن اپنے کی بیاری سے کہیں نکلنے کو رہی اس نے تو مجھے ستی بنا دیا." اس محاورے میں ایک دوسری اساطیر کا جذبہ پنہاں ہے اور وہ اس طرح ہے کہ ستی کے پتا دکشن نے ان کے شوہر کو ایک تقریب پر مدعو نہیں کیا اس کا انھیں بے حد قلق ہوا. بیمار ہو گئے اور جاں بر نہ ہو سکے اور ستی دیوی ان کی لاش کے ساتھ جل کر خاک ہو گئیں.

گوبر گنیش ہونا۔ ایک محاورہ ہے جو بھدّی شکل و صورت والے انسان یا کاہل الوجود شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے بولتے ہیں وہ تو پورا گوبر گنیش ہے۔ اب ذرا اس کی اصلیت پر غور فرمایئے اور دیکھئے کہ اس میں ایک مکمل اساطیری روایت پنہاں ہے۔
ہوا یہ کہ ایک دن پاروتی جی نہا رہی تھیں اور اپنے بیٹے گنیش کو دروازے پر بٹھا دیا اور تاکید کر دی کہ کسی کو اندر آنے نہ دینا۔ اسی اثنا میں پاروتی جی کے شوہر شیوجی آ گئے اور گنیش جی نے انھیں بڑی سختی سے روکا۔ شیوجی ترنگ میں تھے آپے سے باہر ہو گئے اور گنیش کو اس بری طرح دھکا دے کر گرا دیا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔ پاروتی جی کو بڑا صدمہ ہوا، اور گنیش جی کو زندہ کرنے کی منّت کی۔ شیوجی نے اپنا دوت یہ کہہ کر بھیج دیا کہ جو جانور سب سے پہلے مل جائے اُسے مار کر لے آئے دوت نے حکم کی تعمیل کی اور ہاتھی کے بچّے کا سر کاٹ کر حاضر کر دیا، جو اسے پہلے پہل ملا تھا۔ شیوجی نے وہی سر گنیش کے لگا دیا اور دوبارہ زندہ کر دیا۔ بیچارے گنیش جی کو یہ ہیئت کذائی اس حادثے کی بدولت نصیب ہوئی اور اس طرح ایک محاورہ بن گیا۔
پاتال یا پیال کی خبر لانا۔ یہ محاورہ بھی ایک اساطیری روایت کا ترجمان ہے۔ کہا جاتا ہے کوئی دَیت (راکشش) وید چرا لے گیا اور اسے زمین کے اندرونی طبق میں چھپا دیا۔ وشنو بھگوان نے وید واپس لانے اور دیت کو مارنے کے لیے کچھوے اور مچھلی کا چولا بدلا۔ اس طرح یہ زہریلا کانٹا مار کر اسے ختم کر دیا اور پاتال (تحت الثریٰ) سے وید واپس لائے۔ اس کے علاوہ نظیر اکبرآبادی نے وشنو کے بارہ روپوں اور اوتاروں کو اس طرح نظم کیا ہے:

ہیں کہیں رام اور کہیں لچھمن — کہیں کچھ مچھ اور کہیں براہ ن
کہیں بامن کہیں مدن موہن — کہیں بلدیو اور کہیں سری کشن
سب سروپوں میں ہیں اسی کے چلن — کہیں نرسنگھ ہے وہ نارائن

لکشمی دیوی، سرسوتی دیوی اور کالی ماتا کے نام بھی اردو شاعری میں آتے رہتے ہیں۔ نورس کا مصنف سرسوتی دیوی سے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔
"سرسوتی کا شبھ نام لینے سے اب جس پاک لطف بھری لطیف تصنیف کی توفیق ہوئی۔ ابراہیم سرسوتی دیوی کو ہاتھ جوڑ کر ڈنڈوت کرتا ہے جس سے اس کے روم روم میں جوش پیدا ہو جاتا ہے۔"
ایک دوسرے دوہے میں سرسوتی دیوی کی منظر کشی اس طرح کی ہے۔
"سرسوتی دیوی بڑی گوری چٹّی اور بڑی سندر ہے۔ اس کے چہرے پر بلا کا نور ہے۔ ایک ہاتھ میں کتاب دوسرے میں مالا تیسرے میں سنکھ (ناقوس) اور چوتھے میں کنول کا پھول ہے۔"
ان کے علاوہ وہ توہمات بھی اردو زبان اور شاعری میں داخل ہوئے جن کا مذہب سے واسطہ نہیں ہے مگر عوام ہندوؤں نے انھیں مذہب کا جز لاینفک قرار دے لیا ہے۔ توہم پرست ہندو خیال کرتے ہیں کہ بیر اور پَوَن دو خبیث روحیں ہیں جن کو جادوگر کسی شخص کو نقصان پہنچانے کے لیے کام میں لاتے ہیں۔ پَوَن ہوا کو کہتے ہیں اور اسی سے ہوا لگنا اردو میں ایک محاورہ بن گیا۔ پَوَن بٹھایا۔ بیر بٹھانا دوسرے محاورے ہیں جو اسی مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔

پچھل پائی (چڑیل) اس کا استعمال اس روایت کی یادگار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چڑیلوں کے پیر پیچھے کی طرف
لے مڑے ہوتے ہیں۔ نورمن توہم پرست بھی ایسا ہی خیال کرتے رہے ہیں کہ چڑیلوں کے پیر پیچھے مڑے ہوئے اور بکری کے
سے ہوتے ہیں۔ میر امن نے باغ و بہار میں یہی بیان دیا ہے۔

پری، لال پری، سبز پری وغیرہ ہندوانہ روایات کی دین ہے۔ پریوں کے بارے میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ وہ
بی شوخ، چنچل، گھاتک اور بار پرواز ہوتی ہیں۔ گھوڑے کی شوخی اس روپ میں دیکھیے:

یہ گھات، یہ چنچل پن کب باد پری کی ہو
زمین گاؤ کے سینگ پر رکی ہے
ساتوں طبق جو ہلتے تھے خون درشت سے
گاؤ زمین لپٹی تھی ماہی کی پشت سے

سانپ کی منڑی۔ سانپ کے سر میں ایک چیز ہوتی ہے جو سونے کی طرح چمکتی ہے۔ اردو شعرا نے اسے گنجینہ مار
سے تعبیر کیا ہے:

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

ہندو سماج میں تیوہاروں کو جو مذہبی اہمیت حاصل ہے وہ صاف ظاہر ہے۔ دسہرا، ہولی، بسنت، دیوالی
شابندھن، رام نومی، وغیرہ ہندوؤں کے مشہور تیوہار ہیں۔ یوں تو ان سب پر اردو میں بکثرت نظمیں ملتی ہیں لیکن فراغ دلی
یہ عالم ہے کہ ان سے وابستہ جزئی جزئی باتوں کی بھی وضاحت کی گئی ہے جو کسی نہ کسی مذہبی یا عمرانی روایت پر مبنی ہے۔

ہجوم رکھتے ہیں جانبازیوں ترے آگے
جواریوں کا دوالی میں جیسے جمگھٹ ہو

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ دیوالی میں چراغاں ہوتا ہے، جوا کھیلا جاتا ہے، مگر یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں جس
نظیر اکبرآبادی نے اپنی وسیع معلومات اور رنگین مشاہدے کا سہارا لے کر اور اس سے زیادہ جذبہ یک جہتی سے
در ہو کر نظم کیا ہے جو ایک ہندوا ساطیر پر مبنی ہے:

مکان لیپ کے ٹھلیا جو کوری رکھوائی
جلا چراغ کو کوڑی وہ جلد جھنکائی

دیوالی میں لکشمی دیوی کی پوجا ہوتی ہے، جو دولت و ثروت کی دیوی ہیں۔ یہ پوجا بھی گھڑا اور سانجھی کے ناموں سے مشہور
ہے زمین لیپ کر کوری ٹھلیا میں پانی بھرا جاتا ہے۔ اس پر چھوٹا سا ایک برتن رکھ کر دیا جلایا جاتا ہے۔ شام کے وقت یہ
پوجا ہوتی ہے ٹھلیا کو گوبر اور کھیلوں (لاوا) سے مزین اور آراستہ کیا جاتا ہے۔ اعتقاد یہ ہے کہ ایسا کرنے سے لکشمی جی

خوش ہوتی ہیں، اور مال و دولت میں برکت ہوتی ہے۔ چاری کوڑی پھینک کر شگون لیتے ہیں اور پاپ کرنے کو نیک فال تصور کرتے ہیں۔

راہو اور کیتو چاند کے دشمن ہیں اور اعتقاد یہ ہے کہ جن لوگوں کی راس شکر ہوتی ہے اور ان پر جب راہو یا کیتو کی گرہ لگ جاتی ہے تو وہ پریشان حال اور ناکام رہتے ہیں۔ اس عقیدے کی ایک تصویر اس شعر میں دیکھیے:

کیوں شوق لگد کوب حوادث سے ہو نالاں
لپکیں مہ تاباں کی طرف راہو و کیتو

اس قسم کی ویدِ دھرم کی روایات اور اساطیر کی روح امیر خسرو، فائز دہلوی (شمالی ہندوستان کا پہلا صاحب دیوان شاعر) قلی قطب شاہ (اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر)...... سودا، انشا، ناسخ اور آتش کے کلام میں اردو مثنویوں اور دوسرے منظوم افسانوں اور سب سے زیادہ نظیر اکبرآبادی کے کلام میں ملے گی۔

ان مختصر بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ اردو ادیب اور شاعر ابتدا ہی سے بڑے فراخ دل اور وسیع النظر رہے ہیں انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن، یہاں کی مذہبی روایات اور اساطیر بلکہ ہر چیز کو اپنا سمجھا ہے اور اسی لیے اپنے کلام، اپنی شاعری اور اپنی داستانوں میں اسے سمونے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر سید محمد عقیل

اقبال اور ان کی وطنیت

جدید دور میں بھی شعرائے اردو کی عظمت اور ان کے افکار کا محاسبہ کیا جائے گا تو اقبال ہمیشہ اس دور کے سب سے بڑے شاعر اور ایک عظیم مفکر کی شکل میں ابھریں گے۔ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کو عظمت کا تاج عطا نہیں کیا گیا بلکہ ان کی تہہ دار شخصیت نے لوگوں کو اس طرح اسیر کر رکھا ہے کہ نظر انتخاب ان کے سوا اور کہیں ٹھہرتی ہی نہیں۔ تہہ دار شخصیت میں نے اس لیے کہا ہے کہ ہر شخص اپنے ذوق اور مقدرت کے مطابق اقبال کو ایک خاص رنگ میں دیکھتا اور ان سے استفادہ کرتا ہے۔ کوئی انھیں شاعر نہیں فلسفی سمجھتا ہے، کوئی دین مبین کا سب سے بڑا مبلغ، کوئی خودی کے اچھوتے اور عجیب غریب تصور کا بانی مبانی۔ کسی کو ان میں پیمبرانہ شان نظر آتی ہے، کسی کو تضاد۔ کوئی انھیں اشتراکی سمجھتا ہے تو کسی پر ان کی وطن پرستی کا جادو گہرا ڈالے ہے اور کوئی ان کو تمام جھگڑوں سے الگ کر کے صرف اللہ کی رحمت سمجھتا ہے جو صرف مسلمانوں کے لیے اتری ہے۔ غرض کہ بقول عبادت بریلوی ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھا ہے اور بزعم خود یہ سمجھتا ہے کہ وہ اقبال کے فکر و فن کا ماہر ہے۔

اقبال نے اس وقت آنکھ کھولی جب علم و ادب کی دنیا میں پرانی شمعیں ایک ایک کر کے گل ہوتی جا رہی تھیں اور جدید علوم و فنون کی روشنی نے عروق مردہ، مشرق میں ایک نئی روح پھونکنی شروع کر دی تھی۔ حالی، آزاد اور شبلی نے انگریزی ادب سے ناواقف ہونے کے باوجود اس کی کیف سامانیوں سے متاثر ہو کر اردو ادب میں نئی نظموں اور نئے خیالات کا پرچار شروع کیا۔ شاعری نے نظم نگاری اور نظم نگاری نے منظر نگاری کی طرف توجہ کی جو رفتہ رفتہ ملکی مناظر کی پیش کش کے ساتھ وطن دوستی کے راستے اختیار کرنے لگی جس کی نکھری ہوئی شکل حالی کی حب وطن، شبلی کی ملکی متعلق سیاسی نظمیں، مثنوی صبح امید اور مشرقی ادب کا وہ بسیط جائزہ ہے جو شعر العجم کے صفحات پر بکھرا پڑا ہے۔ دوسری طرف انگریزوں کے تعلقات نے سیاسی طور پر اس گہری وطنیت کو بھی آشکار کیا جس کے لیے انگریز قوم ملک گیری اور نیشنلزم کے زور میں سات سمندر پھاند کر تمام دنیا میں اپنا پرچم بلند کر رہی تھی۔ ملک کے لیے جان دینے کی روایتیں ڈریک اور ہاکنس کے کارناموں، جون آف آرک اور منکنس کے کار... کے لیے جنگ کی شکل میں ہندوستان پہنچی رہیں اور جنھوں نے تانتیا ٹوپے، بہادر شاہ ظفر اور جھانسی کی را... نام پایا۔ یہ حکمت عملی
ن کا زہر آج بھی وقتاً فوقتاً
۔ ا متحول کر ہندوستانیوں کو وطن کی بے پایاں محبت کے لیے اکسایا۔ اور جب ۱۸۸۵ء میں انڈ...

صبا

میں آئی تو ہندوستانیوں نے یہ محسوس کیا کہ جس آزادی کے لیے ۱۸۵۷ء کے بعد سے ان کی روح میں ایک خلجان بپا تھا اس کا راستہ انھیں مل گیا۔ درآنحالیکہ اس وقت جو راستے اپنائے جا رہے تھے وہ میانہ روی کے راستے تھے۔ حکومت کے زبردست ہاتھ نے ان پر اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کی کم مائیگی کو واضح کر دیا تھا۔ سماجی حالات اور معاشی ممکنات سب انتہائی منتشر صورت میں تھے اور غدر نے انگریزوں پر یہ اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں اگر افتراق پیدا کر دیا جائے تو اسے بخوبی اپنے قبضہ میں رکھا جا سکتا ہے جس کا ہلکا پھلکا تجربہ انھوں نے غدر کے زمانے میں کیا تھا۔ اور جسے اب نفاق، باہمی آویزش اور مذہبی عصبیت کی صورتوں میں وہ برابر استعمال کر رہے تھے۔

اقبال نے روایات شاعری سے پہلے فائدہ اٹھایا اور سیاست کی طرف بعد کو متوجہ ہوئے۔ حب وطن اور مناظر فطرت کی تقلید میں انھوں نے مخصوص ہندوستانی جگہوں اور منظروں کا تعین کیا اور اس طرح ہمالہ، ابر کہسار، گل رنگیں، آفتاب صبح، جیسی نظمیں لکھیں جنھوں نے غالباً شعوری طور پر سب سے پہلے ہمیں یہ سوچنا سکھایا کہ ہندوستان کی گل زمیں اور یہاں کے پہاڑ اور جنگل ایسے ہیں کہ ان میں ہمارے دل کی بے تابیوں کے واسطے سکون مل سکتا ہے۔ ایسا تو نہیں تھا کہ ان کا تذکرہ ہندوستان کی شاعری میں پہلے کبھی نہ کیا گیا ہو کیوں کہ کالی داس سے لے کر دکن کے قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں تک ہندی اردو شاعری میں ہر جگہ اس کی مثالیں ملتی ہیں۔

اقبال نے یہ کیا کہ نظموں میں ایسے تذکرے ایک خاص نقطۂ نظر سے محسوس کر کے شامل کیے۔ ہمارے مناظر جن پر اب دوسروں کا قبضہ تھا۔ ہمارے جنگل جن کی بہاریں دوسرے لوٹتے تھے۔ کاش ہماری آزادی کے دن پھر واپس آجائیں۔

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا   مسکن آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا   رنگ جس پر غازۂ رنگ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو   دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو
آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ   وہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی   اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا

میں ایک طرح کی YEARNING ہے جس میں وطن پر دوسروں کے قبضے کے احساس کی پرچھائیاں دیکھی جا سکتی ہیں کوئی چاہے تو یہاں مصحفی اور جرأت کے ان متفرق اشعار کی طرف اشارہ کر سکتا ہے جو۔

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی   ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر لوٹ لی   (مصحفی)
کہیے نہ انھیں امیر اب اور نہ وزیر   انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر   (جرأت)

کی شکل میں ملتے ہیں لیکن واقعہ یہی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر سے پہلے حب وطن نے تحریک کی صورت اختیار

دہلی ، کاش زاد نظمیں نہیں ماخوذ خیالات ہیں تاہم اسی طرح کے خیالات ایک خاص وقت میں سوچنے کے سبب کو اس طرح

نہیں کی تھی اور اقبال سے پہلے اسے شعوری شکل حاصل نہیں ہوئی تھی۔

ہندوستانی سیاست کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سماجی، معاشی اور معاشرتی بحران بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ کانگریس نے سماج سدھار، اخلاقی پستی سے نکالنے کی تدبیروں کے ساتھ ملک میں تھوڑے بہت سیاسی مسائل بھی اٹھائے۔ سوامی رام کرشن پرمہنس، وویکانند، رام تیرتھ، دیانند سرسوتی کی شکلیں بھی ابھریں اور انھیں کے ساتھ راجہ رام موہن رائے، برہمو سماج، سرسید احمد خاں، نواب محسن الملک، علی گڑھ تحریک، دادا بھائی نوروجی اور گاندھی جی کے نقوش بھی واضح ہوئے۔ عملی سیاست کے پلیٹ فارم پر مسز اینی بسنت، گوکھلے، تلک اور نہرو خاندان کے دوش بدوش مولانا محمد علی جوہر، شوکت علی، اور ابوالکلام آزاد جیسے وطن پرست نمودار ہوئے اور اب وطن پرستی واضح طور پر ایک نیم سیاسی اور نیم رومانی انداز میں آگے بڑھنے لگی۔ اقبال کے گرد وپیش جو لوگ جمع ہوئے ان میں چکبست، مولانا ظفر علی خاں، نادر کاکوروی اور درگا سہائے سرور تھے۔ اقبال نے ترانۂ ہندی میں سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، کا نعرہ لگایا تو نہ صرف شعرا و سیاست داں بلکہ ہندوستان کے سارے عوام ان کے ساتھ تھے۔ شاید ہی کوئی جگہ ہندوستان میں ایسی رہ گئی ہو جہاں اقبال کے اس ترانہ کی للکار نہ گونجی ہو، گویا اس ترانے سارے ہندوستان کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کی دعوت دی۔ اقبال سرگرم سیاست داں تو نہ تھے لیکن اشعار اور الفاظ کا جادو دلوں کو گرما کر کس طرح عملی سیاست کے لیے تیار کر سکتا ہے اس سے وہ اچھی طرح باخبر ہو چکے تھے۔ ان کی تصویر درد، ہندوستانی بچوں کا گیت، شعاع امید، ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی، نیا شوالہ، صدائے درد اور

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے

ہے لے یک رنگی کے نا آشنائی ہے غضب ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

تعصب چھوڑ ناداں دہر کے آئینہ خانے میں یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

پتھر کی مورتی میں سمجھا ہے تو خدا ہے خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

رمز الفت سے مرے اہل وطن غافل ہوئے کارزار عرصۂ ہستی میں ناقابل ہوئے

بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے اس عبادت کو کیا سرا ہوں میں

دکھاؤں گا میں اے ہندوستاں رنگ وفا سب کو کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا

جیسے اشعار اس بات کو اچھی طرح واضح کرتے ہیں۔

حب وطن کی تحریک ہندوستانی سیاست میں جس منزل سے گزر رہی تھی اس میں ہندو مسلم اتحاد کی کوشش بہت نمایاں تھی۔ اس سرزمین پر جب سے انگریزوں نے قدم رکھا آپس کا نفاق منظم فتنے کی شکل میں نمودار ہوا کیوں کہ یہی ملک کو قابو میں رکھنے کے لیے عملی سیاست ہو سکتی تھی۔ اسی سیاست نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کا نام پایا۔ یہ حکمت عملی ہندوستان کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئی اور یہاں کے باشندوں میں یہاں تک گھر کر گئی کہ اس کا زہر آج بھی وقتاً فوقتاً

پھوٹ نکلتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مہذب سے مہذب قومیں بھی تاریخ عالم میں کبھی کبھی اس کا شکار ہوتی رہی ہیں، لیکن ہندوستانی قوم اور قبیلے جو آپس میں ایک دوسرے کا گوشت پوست ہیں کبھی رنگ و نسل یا مذہب کے نام پر جنگ و جدل کے لیے اس طرح تیار نہیں ہوتے تھے۔ یہاں ایک خاص طبقے میں ہمیشہ اعتقادات کی لڑائی رہی ہے جس کی نفی بار بار یہاں کے تمام مذہبی رہبر، پیشوا، اور وسیع النظر سیاست داں کرتے رہے ہیں۔ ہاں جب کبھی تنگ نظر سیاست نے چاہا ہے تو اس جذبے کو اپنے مفاد کے لیے غلط طور پر ابھار کر استعمال کیا ہے جس کا شکار انھیں حاکم کے ہاتھوں میں کھیلنے والے ہوتے رہے ہیں۔ ایک سادہ لوح اور عام ہندوستانی نے کبھی اس سے ملوث ہونے کی کوشش نہیں کی جس کا ایک معمولی نمونہ آج بھی ہندوستان کے دیہات میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں ہندو مسلمان سب لوگ ایک دوسرے کی شادی اور غم میں بڑے انہماک سے شریک ہوتے ہیں اور اپنے اپنے مذہبی امور کی پابندی کے ساتھ ایک دوسرے کے مذہب اور معتقدات کا احترام بھی کرتے ہیں۔ اقبال نے بھی دوسرے بلند مفکرین کی طرح اس بات کی وضاحت اپنی نظموں میں کی۔ ہندو مسلمان سب کو ایک ہی تسبیح کے دانے، ایک ہی گلشن کے پھول کہا — ایسا گلشن جہاں مذہب اور سماج دونوں سرحدوں پر ہندو مسلمان ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں۔ نانک، چشتی اور رام چندر جی کی مقدس بانیوں نے دونوں کا تزکیۂ نفس کیا ہے۔ سوامی رام تیرتھ نے لا کے دریا سے الا اللہ کا موتی تلاش کر کے نقطۂ کلمہ سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ رام چندر جی نے چراغ ہدایت دکھا کر اہل نظر کی نگاہ میں امام ہند کی حیثیت اختیار کی اور گرو نانک نے مذہب و ملت کے رشتوں کو توڑ کر حقیقت محض پر یقین رکھنے کا راز بتایا جس میں برہمن، شودر اور غیر ہندو کی کوئی تخصیص باقی نہ رہ گئی۔ اقبال کی نظموں، نانک، رام، اور رام سوامی تیرتھ میں یہ خیالات بہ آسانی تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں یہ بھی واضح کیا گیا کہ اگر مذہب بالفرض تمھیں ملنے میں مدد نہیں دیتا تو انسانی برادری کے ناتے تم سب ایک ہو جاؤ اور اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہو کر غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کرو۔ یہ غلامی عصبیت کی ہو یا سیاست کی یا غیر ملکی قوم کی۔

آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر — غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی — قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں — شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

(نانک)

اقبال کا یہ نظریہ تھوڑے سے بہت اختلاف، تغیر اور ان کی متضاد طبع کے ساتھ (جو اکثر ان کے سبھی نظریات کے ساتھ ظاہر ہوتی رہتی ہے) قائم رہا۔ اپنے آخری وقت میں انھوں نے جو خط مولانا حسین احمد مدنی کو لکھا تھا اس میں وطنیت کے نظریے کی وضاحت یوں کی ہے۔

"ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں کیوں کہ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصے میں بود و باش

رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ . . . . ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بعض اوقات اپنی جان تک اس کے لیے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے۔ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لیے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں۔"

۱۔ جاوید نامہ اقبال کا آخری کلام ہے اس میں جس طرح افلاک کا سفر کرتے ہوئے انھوں نے وشوامتر یا شیو جی کا ذکر کیا ہے وہ محض رسمی اور روایتی نہیں ہے۔ اقبال اپنے پیر رومی کے ساتھ سفر کرتے ہوئے جب اس منزل پر پہنچتے ہیں تو انھیں ایک عارف ہندی چاند کے ایک غار میں بیٹھا نظر آتا ہے۔ یہ شیوجی ہیں۔ جن کے جلال کا تذکرہ اقبال اس طرح کرتے ہیں۔

زیر نخلے عارف ہندی نژاد — دیدہا از سرمہ اش روشن سواد
موئے برسر بستہ و عریاں بدن — گرد او مارے سفید حلقہ زن

شیوجی کے وجود سے گرد و پیش اس طرح نورانی ہے کہ بغیر آفتاب کے روز روشن کا گمان ہوتا ہے۔ پھر وہ رومی سے اقبال کے متعلق استفسار کرتے ہیں اور جب رومی اقبال کی کیفیت بیان کرتے ہیں تو شیوجی انھیں یہ راز تعلیم فرماتے ہیں۔

کافر بیدار دل پیش صنم — بہ ز دیندارے کہ خفت اندر حرم

اور یہی ہندوستانی فلسفے کا جوہر ہے جو اقبال شیوجی کی زبان سے ادا کرتے ہیں۔ اس کے بعد اقبال وادی طواسین میں قدم رکھتے ہیں۔ جہاں مسیح اور محمد کے ساتھ انھیں گوتم بدھ بھی نظر آتے ہیں جن کا روشن کرما کا عقیدہ ایک رقاصہ سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

دانش مغربیاں، فلسفہ مشرقیاں — ہمہ بت خانہ و در طوف بتاں چیزے نیست
آن بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ — تا جزائے عمل تست، جناں چیزے نیست

پھر یہیں تک نہیں ان کی وطن پرستی ایسے لوگوں کو عقوبت کے جہنم میں بھی دیکھنا چاہتی ہے جنھوں نے وطن کے ساتھ غداری کی تھی۔ اسی خیالی سفر میں گھومتے پھرتے اقبال ساتویں آسمان پر پہنچتے ہیں جو زحل ستارے کی منزل ہے جہاں انھیں وہ غدار روحیں بھٹکتی ہوئی مل جاتی ہیں جنھیں دوزخ تک نے اپنانے سے انکار کر دیا تھا اسی لیے کہ انھوں نے وطن کے ساتھ غداری کی تھی گویا وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وطن کے غدار کا ٹھکانہ جہنم میں بھی نہیں۔

منزل ارواح بے یوم النشور — دوزخ از احراق شان آمد نفور
جعفر از بنگال و صادق از دکن — ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن

جس طرح ان دونوں نے اس ہندوستان جنت نشان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا اس جرم کی سزا سن کر دل لرز اٹھتا ہے۔ اقبال نے دیکھا کہ ایک خون کا دریائے ناپیدا کنار ہے جس میں ہر طرف طوفانی کیفیت نظر آتی ہے

جس کے اندر ہزاروں نہنگ خون آشام تیر رہے ہیں اور جس کی فضا سانپوں سے پُر ہے۔ اس دریائے خون میں یہ دونوں غداران وطن ٹکریں کھاتے پھر رہے ہیں۔

اندراں ذوق دو مرد تند در وئے — زرد رو، عریاں بدن، آشفتہ موئے

پھر ان روحوں کی الحاح وزاری کا طویل نقشہ ہے جس کے درمیان ہندوستان کی غلام روح بھی فریاد و فغاں میں مشغول نظر آتی ہے کہ افسوس اہل ہند کیسے بے حس ہو گئے ہیں۔ پھر بھرتری ہری سے ملاقات ہوتی ہے اور یکایک ٹیپو کی زخمی روح دنیائے کاویری کے نام ایک پیام لے کر نمودار ہوتی ہے اور سرنگاپٹم کی معرکہ آرائیوں کی کہانیاں اقبال سے کہتی ہے۔

یہ ہے اقبال کی آخری عمر کا جذبۂ وطنیت جو ظاہری شکل وصورت کو چھوڑ کر روحانیت کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔ اس لیے یہ سوچنا کہ اقبال بعد کو وطنیت کے نظریے سے پھر گئے تھے صحیح محاسبہ نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ انھوں نے وقتی سیاست اور ناآسودگی سے متاثر ہو کر جو ملت اسلامی اور اخوت اسلامی کے نعرے لگائے ہیں ان سے ضرور کبھی کبھی علیٰحدگی کا احساس ہوتا ہے۔ ہندوستانی سیاست بھی ۱۹۱۰ء سے لے کر تقریباً ۱۹۲۰ء تک اسی طرح کے تضاد اور علاحدگی کی جست وخیز سے معمور رہی ہے۔ کبھی مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ اجتماع کی کوشش ہے اور کبھی بال گنگادھر تلک اور گاندھی جی کے سناتنی ہونے کا اعلان جس کا تذکرہ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب تلاش ہند میں بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال نے سفر یورپ میں جو وطنیت اور قومیت کے نام پر انسانوں کی خوں ریزی اور کسی حد تک درندگی کا مطالعہ کیا ان تجربوں نے بھی انھیں وطنیت کے ایسے نظریات میں مشکوک کر دیا۔ اقبال کی یہ آوازیں انھیں تجربات کی بازگشت ہیں۔

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا — بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے ہے خالی — فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام

بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں — قبول دین مسیحی سے برہمن کا مقام

اور یہیں سے انھوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اخوت انسانی کی تلاش ہی صحیح تلاش ہے لیکن اس کے لیے میڈیم انھوں نے اسلام کو بنایا کیوں کہ اسلام دنیا کے بڑے حصے میں کسی نہ کسی طرح موجود ہے اور اسلام کا دعویٰ بھی ہے کہ وہ ہر سرزمین کے لیے ہے اور ہر زمانے کے لیے اور اس طرح وطنیت کی مخصوص اور محدود حدوں سے کسی قدر آگے بڑھنے کا موقع مل سکتا ہے (حالانکہ دوسرے مذاہب نے بھی اس کا ادعا نہیں کیا کہ وہ دوسری سرزمینوں کے لیے نہیں ہیں پھر عیسائیت تو تقریباً دنیا کے ہر گوشے میں موجود بھی ہے) اس طرح ایشیا اور پھر مشرق کا درد ان میں بیدار ہوتا ہے تاہم انھیں نہ اپنے ہندی ہونے سے انکار رہا اور نہ ہندوستان کی خستہ حالی سے وہ کبھی نظریں چرا سکے۔

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو   اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی، یہ افغانی وہ تورانی   تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی *   کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے   تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

یہ نوعِ انسان کو بے کراں بنانے کی خواہش ہے جس سے اقبال محبت اور انسانی برادری کے چراغوں کی لویں بلند رکھنا چاہتے ہیں۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام مشرق کو غلامی سے آزاد کرانے کا خواب دیکھتے ہیں جس کا محرک مسلم ہوگا اور ہندوستان، مسلم اور اسلامی حقائق کے نقشِ قدم پر چل کر گوتم، اور نانک کی محبت اور روحانی چارہ کے ساتھ غلامی سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ جب تک یہ صورت پیدا نہیں ہوتی مشرق کی نجات ممکن نہیں ارضِ مشرق کو اسی طرح آزاد کیا جا سکتا ہے کہ یہاں لوگ متحد ہو کر اپنے فرنگی دشمن کا مقابلہ کریں اور ساتھ ہی ساتھ اقبال کے افکار سے فائدہ اٹھائیں ورنہ فرنگی اسی جھگڑے کو بہانہ بنا کے ہمیشہ اس قوم کے درمیان قائم رہے گا۔

تیرہ خاکم را سراپا نور کن   در تجلی ہائے خود مستور کن
تا بہ روز آرم شب افکار شرق   بر فروزم سینۂ احرار شرق
فکر شرق آزاد گردد از فرنگ   از سرودِ من بگیرد آب و رنگ
اے ہمالہ، اے اٹک، اے رود گنگ *   زیستن تا کے چنیں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب   نوجواناں از محبت بے نصیب
ہندیاں با یک دگر آویختند   فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں   ثالث آمد در نزاعِ کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب سراب   انقلاب اے انقلاب اے انقلاب
گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو *   تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو کا رنگ و بو
ضربتِ پیہم سے ہو جاتا ہے آخر پاش پاش   حاکمیت کا بتِ سنگیں دل و آئینہ رو

(ارمغان حجاز)

جیسے اشعار ان کے خیالات کی وضاحت کرتے ہیں جو زیادہ تر آخری دور کے اشعار ہیں۔ اسی طرح ضربِ کلیم میں بھی شعاعِ امید، مشرق، نگاہ، مسولینی، اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے، نصیحت، غلاموں کی نماز، اقوامِ مشرق ہندی مکتب، ہندی مسلمان، اقبال، نفسیاتِ غلامی جیسی نظموں سے بہت سارے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔ انسانی فلاح و بہبود کی یہی تلاش انھیں اشتراکی فلسفے کی طرف بھی لے جاتی ہے لیکن وہاں وہ کشمکشِ حیات کی جہد کو شاید برداشت نہیں کر پاتے کیونکہ اقبال حرکت اور عمل کے تو بڑے مبلغ ہیں تاہم وہ ان راستوں کو . . . نہیں چاہتے جن سے

حرکت اور عمل مادی طور پر وجود میں آتے یا آسکتے ہیں۔ یا پھر وہ ان نتائج سے خائف ہیں جو حرکت، عمل اور کشمکش
حیات سے پیدا ہوسکتے ہیں اور اس طرح کی تعلیمات اور افکار کا مجموعی تاثر تصوریت سے آگے نہیں بڑھنے پاتا۔ اس طرح
برکلے اور افلاطون کے جس فلسفے کی انھوں نے مخالفت کی اسی جال میں خود بھی اسیر ہو جاتے ہیں۔ اقبال اس سے
بے خبر تو نہیں ہیں کہ کشمکش خلا میں نہیں ہوسکتی لیکن مردِ مومن کو وہ کسی طبقاتی کشمکش سے گزارنا پسند نہیں کرتے
تقدیریں صرف نگاہِ مردِ مومن سے نہیں بدلا کرتیں بلکہ اس کے لیے کسی ملت یا قوم کو مادی سماجی کشمکش اور حالات کا مقابلہ
کرنا پڑتا ہے۔ وطن کی فکر کرنے میں ان حقائق کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا جو راستے میں حائل ہوسکتے ہیں لیکن خودی کی
پرواز ان حالات سے بہت آگے ہے۔ اس کے وجود کا مادہ سے کہیں ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ اسی لیے اس کا راستہ بہت روشن
اور خوشنما ہے۔ آفاقی انسان ایسے تمام دشوار گزار راستوں کو خودی کی مدد سے پار کر لیتا ہے جنھیں غیر اللہ اور حوادثِ
زمانہ نے بنا رکھا ہے۔ وطن پرستی بھی انھیں راستوں سے گزرتی ہے لیکن چونکہ وہ جذبے کی شاعری ہے اس لیے اس سے
ہم ایسی کشمکش اور رنگینی یا کیسے کا تقاضہ نہیں کرسکتے۔ بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہندوستانی جغرافیائی حدود کو پار کرکے
ایشیائی بنتی ہے اور پھر انسانوں کی خیر و برکت بن کر ساری دنیا کے انسانوں پر منطبق ہوسکتی ہے۔ کم از کم اقبال نے
نیک نیتی سے اسی طرح سوچنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جو راستے اس کے لیے انھوں نے اختیار کیے ان راستوں نے
کچھ تو انھیں اپنے مشن سے دور کر دیا کیونکہ اس میں چند خاص مذہبی اور اخلاقی اصولوں کے ماننے والوں کے
ساتھ مراعات خصوصی کا تقاضہ تھا اور کچھ ان کی اپنے طور پر تشریح کرنے والے انھیں محدود سمجھ کر ان سے بیگانگی برتنے
لگے۔ آفاقی انسان تسخیرِ فطرت کے لیے بھی تیار ہوتا ہے لیکن اقتدار کی لگام پکڑ کر ایک غلبے کے ساتھ۔ اب غلبہ جس کا
زمانہ اب باقی نہیں رہا۔ آج اقتدار، معاشی اور پیداواری رشتے اور سائنسی برتری میں ہے جن کا رشتہ مادی
حقائق سے ہے رومانیت اور تصوریت سے نہیں۔ اقبال نے وطن پرستی اور انسان دوستی کے لیے بہت سے
بت توڑے۔ خانقاہوں کے بت، بے عمل تصوف کا بت اور مذہب کا وہ بت جو آپس میں نفاق اور منافقت پیدا کرے
انھوں نے اوہام پرستی کے خلاف جنگ کی، خواجگی اور مزدوروں کی آویزش میں مزدوروں کا ساتھ دیا۔ سرمایہ داروں
کا بھید کھولا لیکن ان رشتوں کو نہیں سمجھ سکے جو معاش، سائنس اور پیداوار سے ہوتا ہوا بھٹکا کر ملوکیت، خواجگی
اور وطنیت تک آپہنچا ہے۔ اول الذکر وطن کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا جاتا ہے اور آخر الذکر ان مضبوط دیواروں میں
رخنہ پیدا کرکے انھیں ڈھا دیتا ہے۔ آفاقی انسان یا عام انسانوں کی خیر و برکت اور نیکیوں کا ادراک بھی اقبال کے
یہاں مقدری نہیں ہے جس طرح شیکسپیر نے انھیں پیش کیا تھا مقدر سے ٹکراؤ کے وہ قائل نہیں اور یہ ٹھیک بھی ہے اس لیے کہ
تقدیر پرستی مجبولیت پیدا کرتی ہے گو کہ شیکسپیر کے یہاں ڈنکن کا قتل میکبتھ کی بدقسمتی اور ڈنکن کی تقدیر ہے۔ ڈسڈمونا
کا زوال کرنا اوتھیلو کی تقدیر ہے جس سے چھٹکارا ممکن نہیں لیکن اقبال زمانے سے لڑ کر اپنا راستہ الگ بنانا چاہتے
ہیں تاہم محبت، رقابت اور قوت کے وہ مظاہرے جو شیکسپیر نے عام انسانی حیات کے تجربوں سے کیے وہ بھی اقبال

کے یہاں وجدان، جذبات اور مشاہدوں کی تمثیل سے ادا ہوتے ہیں جن میں بڑی لچک ہے اور عملی دشواریاں بے اندازہ
وجدان کا تصور برگساں نے بھی کیا تھا۔ زندگی کو وہ بھی ایک تغیر اور انقلاب کا سلسلہ مانتا ہے۔ زمانہ اس کے نزدیک
آفات سے آزاد ہے یعنی اسے حال، مستقبل اور ماضی میں اسیر نہیں کیا جا سکتا وہ بس ایک لمحہ ہے جسے مستقل اپ
گر سکتے ہیں۔ اقبال بھی کچھ اسی طرح کا تصور رکھتے ہیں اور زندگی کو فقط ذوقِ پرواز سے گل اس شاخ سے ٹوٹتے
بھی رہے اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے' اور کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون' ہر لحظہ شانِ وجود کی پیدائش
سے ظاہر کرتے ہیں اور اس کی تغیر کا احساس دلاتے ہیں۔ ازل سے ابد تک رم یک نفس' نہ دو اس کے پیچھے نہ دو سامنے'
کہ کر اسے ماضی، حال اور مستقبل سے آزاد بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن حقیقی سماجی زندگی اپنی تاریخ رکھتی ہے اور اگر
تاریخ رکھتی ہے تو حال اور ماضی سے آزاد کرالینا بہت مشکل ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وطنیت کے آئینے اشوک
چندر گپت۔ اکبر اور انگریزی حکومت سب سے جھوٹ اور بے بنیاد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نسلی اور حیاتیاتی سلسلہ یقیناً اسی
طرح جاری و ساری ہے لیکن اس پر بھی ماضی، ، حال اور مستقبل کی معاشی، تہذیبی، معاشرتی اور ارتقائی تغیرات
کی پرچھائیاں ہیں جنھیں قدیم تمدنی دور سے لے کر عہد زریں، اور عہد غلامی تک بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

وجدان پرستی کا یہی اثر اقبال کے یہاں تضاد پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ جہاں ساقی نامہ، لینن خدا کے حضور میں
خضرِ راہ اور مسجدِ قرطبہ جیسی عہد آفریں نظموں میں انسان کے لیے رجائیت، سامراجی داؤں پیچ سے ہوشیار رہنے اور
ہر تا نہیں کاروانِ وجود، جیسی نکتہ سنج باتیں ہیں وہیں ان تجربوں کا بطلان بھی ہے۔ آج کی دنیا نے مستقل تجربوں کے
بعد جن چیزوں کو حیاتِ انسانی کے لیے بے حد مفید پایا ہے اقبال ان کے چند خراب اثرات کو پیش کر کے ان چیزوں
کا انکار کرتے ہیں جس جمہور کے نغمے گاتے ہیں جس آزاد زمانے کے آنے کی انسان کو بشارت دیتے ہیں اسی نظام
کو مغز و مصدر' دیوِ استبداد' 'بے ذوقِ صبا' بتاتے ہیں اور مشینیں جو سوشلسٹ نظام میں انسان کے عظیم خوابوں کی
تعبیریں پوری کرنے میں سرگرم کار ہیں ان کی خرابی یہ ہے کہ ان سے ترقی تو ہو سکے گی لیکن انسانی اخوت اور مروت باقی
نہ رہ جائے گی۔ شاید یہ تجربہ پرشکوہ مشغلہ اور گلاسن گو کے مشینی نظام سے حاصل کیا گیا تھا جہاں استحصال کار فرما ہے
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان جس غلامی کے دور سے گزر رہا تھا جمہوریت کے علمبردار جس طرح غیر جمہوری طریقے . . .
حکمرانیوں کے لیے استعمال کر رہے تھے ان طریقوں نے اقبال کا اعتقاد ایسی نام نہاد جمہوریت پر سے اٹھا دیا تھا
اقبال کو سمجھنے والوں کے لیے ایسے تضاد بہت پریشان کن ہوتے ہیں۔ وطن پرستی کی سب سے بلند منزل انسان
دوستی ہے جسے ایک طرح عالمی وطنیت سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کا نمائندہ ایک انسانِ کامل ہے جو اقبال کے الفاظ
میں مردِ مومن بنتا ہے۔ اس کی تکمیل قہاری، جباری، قدوسی اور جبروت جیسے چار عناصر سے ہوتی ہے لیکن مادی رشتوں
کا یہ محبِ آدم دنیاوی علائق سے تقریباً بے بہرہ رہ جاتا ہے۔ وہ کوکبی ہے، مہتابی ہے، خاکی ہے لیکن خاک سے اس کا
پیوند نہیں ہوتا مولی صفات ہے لیکن بندگی بھی قائم رکھتا ہے کیونکہ اگر بندگی ہاتھ سے گئی تو ضبطِ نفس کا فقدان

ہو جائے گا اور اس طرح بے راہ روی کی منزل میں پڑ کر، تخریب کا شکار بن کر وہ شیطان ہو سکتا ہے اور بجائے انسان دوستی کے مردم آزاری کو اپنا شیوہ بنا لے گا۔ پھر ایسے انسان سے کسی خیر و برکت کی توقع کرنا بے سود ہو گا لیکن یہ ساری صورتیں سماجی اور مادی کشمکشوں میں پڑ کر انسان میں واقعی قائم رہ سکیں گی؟ کیا انسان اپنی جبلت یا ساری جبلی خواہشات کو اور اپنے مزاج کی سفلی کیفیات کو اس حد تک ختم کر سکتا ہے یا کر سکے گا۔ صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ کاش اقبال کی خواہشات یہ مادی انسان اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود پوری کر سکتا۔ پھر یہ بھی سوچنا ہے کہ اتنی پابندیاں اور اتنی آزادی ایک صالح اور مکمل انسان کو کس حد تک متوازن رکھ سکیں گی۔ تاہم اقبال کی انسانی بہی خواہی اور ان کی اس معاملے میں ایمانداری پر شبہ نہیں کیا جا سکتا اور اس رشتے سے وطن پرستی پر بھی فکری تضاد ان کے یہاں الجھنیں پیدا کرتا ہے۔ الجھنیں جب انھیں بندش معلوم ہونے لگتی ہیں تو وہ پھر ایک نئے تصور کو جنم دے لیتے ہیں اور اسی لیے اتنے بڑے عالمگیر اخوت اور برادری کے تصور کے بعد مومن کی آفاقیت کو چند مخصوص حدود میں اسیر کرنا چاہتے ہیں جہاں "ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے / نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر" کا تصور بھی پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔

اقبال نے قوت اور اقتدار کا تصور، جس کے متعلق کچھ اشارے اس مضمون میں کیے جا چکے ہیں، اس لیے بھی پیدا کرنا چاہا ہو گا کہ یورپی قومیں اپنے اقتدار اور اپنی طاقت کے زور پر ایشیا والوں اور ہندوستانیوں کو خصوصیت کے ساتھ غلام بنائے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس قوم کو جو ایسی زبردست طاقت سے مقابلہ کی خواہش رکھتی ہے خود بھی خود اعتمادی اور اپنی طاقت پر بھروسہ کرنا چاہیے ورنہ تاب مقاومت کہاں ہو گی۔ شاید اسی لیے اقبال ہر طاقت حاصل کرتی ہوئی قوم کی طرف جھکتے۔ مسولینی کے وہ اسی لیے معترف ہیں کہ اس نے ایک نظام قائم کر کے شہنشاہیت کے خلاف صف آرا ہونے کی صلاحیت پیدا کر لی تھی۔ روس کی ترقی سے خوش ہوتے کیوں کہ یہ سب متحد ہو کر استحصال کرنے والی مغربی طاقتوں کے لیے درد سر تھے لیکن جب وہ یہ محسوس کرتے کہ ان طاقتوں میں دین و دل یا انسانی ہمدردی کے لیے کوئی جگہ نہیں تو اس منزل پر ان کے مخالف بھی بن جاتے ہیں۔ ضرب کلیم کی چھوٹی سی نظم "قوت اور دین" میں وہ ایسے نشہ قوت کو خطرناک بتلاتے ہیں کیوں کہ اس سے: سکندر، چنگیز اور ہلاکو وجود میں آتے ہیں۔ ہاں اگر رومی کی تعلیمات پر عمل کر کے دین کی حفاظت کے لیے قوت حاصل کرے تو ایسی قوت ایشیا اور ہندوستان دونوں کو آزاد کرا سکتی ہے۔ لیکن اقبال کا بتایا ہوا راستہ ہر مذہب و ملت کا آدمی کیوں اختیار کرے گا اس کا خیال انھیں نہیں آتا۔ اسلام خواہ کتنا صحیح نظام کیوں نہ ہو لیکن سب کا اسی نظام میں بندھ جانا بھی تقریباً اسی جبر کا شکار ہو جانا ہے جو مغربی تہذیب اور فکر و خیال کی صورت میں اس وقت موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اقبال سے بے انتہا متاثر ہونے کے باوجود ان کے معتقدات سے متفق نہ ہو سکی۔ ایشیا کا اتنا بڑا شاعر عالمگیر محبت کیسی خود مسلمانوں میں بھی عملی طور پر کامیاب نہ ہو سکا جس کا احساس اقبال کو آخری عمر میں خود ہو گیا تھا۔ چنانچہ ارمغان حجاز میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

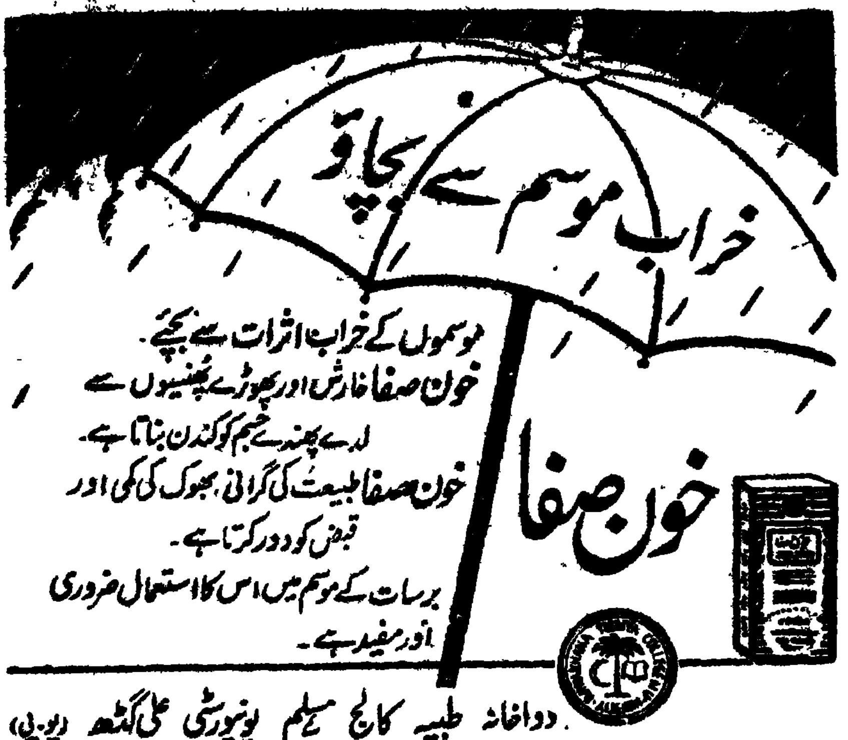
شریک درد و سوز لالہ بودم ضمیر زندگی را وا نمودم

ندانم با کہ گفتم نکتۂ شوق | کہ تنہا بودم و تنہا سرودم
غریبم درمیان محفل خویش | تو خود گو با کہ گویم مشکل خویش
ازاں ترسم کہ پنہانم شود فاش | غم دل را نگویم با دل خویش
چو رخت خویش بربستم ازیں خاک | ہمہ گفتند با من آشنا بود
ولیکن کس نداند ایں مسافر | چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

یہ تنہائی کا احساس کیوں؟ ساری عمر کی جانفشانی اور جاں سپاری کا کیا یہی بدلہ ہے جو اقوام مشرق نے اس دانائے راز کو دیا؟ لیکن ہوا ایسا ہی۔ یہ شاعرانہ ناآسودگی نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ زندگی کی جلائی ہوئی شمعیں نہ خودی سے فروزاں ہو سکیں اور نہ طاقت کے اس تصور سے عملی زندگی آج بھی اسی کشمکش میں گرفتار ہے۔ ایشیاء آج بھی بظاہر سیاسی طور پر نہ سہی لیکن معاشی طور پر اقوام مغرب کے ہاتھوں میں گرفتار ہے۔ یہاں تک کہ علامہ کے بعد کے نظریات کا مرجع یعنی پاکستان بھی اسی سامراجی جال میں اسیر ہے جس کی کڑیوں کو علامہ خودی، عمل ربط و ضبط ملت بیضا اور عالمگیر انسانی اور اسلامی اخوت سے توڑنا چاہتے تھے۔ علامہ آج اگر زندہ ہوتے تو اپنے خوابوں کی یہ تعبیر دیکھ کر کس قدر مغموم ہوتے اور متحیر بھی کیونکہ سارے نظریات اور سارا فلسفہ مادی اور عملی محک پر کھرا نہ اتر سکا۔ اقبال کی وطنیت ہندوستان میں بھی مجروح ہے اور پاکستان میں بھی۔ ہم نے جو کچھ بھی ترقی کی ہے اس میں مادہ کی رفتار بہت سست ہے اور تصوریت کی بہت بہت تیز اور ہم اس حقیقت سے منہ نہیں چرا سکتے کہ معاشی مدد کے طور پر ہمیں جو کچھ ملتا ہے اس سے علامہ کے فلسفۂ خودی کا بھی بطلان ہوتا ہے اور ہماری آزادی کا بھی۔ ایشیائی ممالک اس وقت تک اپنے کو آزاد نہیں کہہ سکتے جب تک ان کے معاشی اور پیداواری رشتے اس قدر وسیع نہ ہو جائیں کہ وہ اپنے ملک کے زیادہ سے زیادہ خود کفیل ہوں جب تک ایشیائی ذہن سائنسی دنیا میں اتنی ترقی نہ کر لے کہ مغربی قوموں کا ہم قدم بن سکے۔ اس وقت تک اقبال کی شعاع امید میں کھائی ہوئی قسمیں، تاسف اور یقین دہانیاں؛

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو | جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز | اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن | تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

ہم کو جھنجوڑتی رہیں گی۔ اب یہ ہماری مقدرت پر منحصر ہے کہ اس باہمی منافرت اور آویزش، اس محرومی اور پسماندگی کے چیلنج کا مقابلہ کس تندہی کے ساتھ کر کے ہم اقبال کے ان تصورات کو عملی شکل دے سکیں گے — تاہم ان کی وطن پرستی کا جذبہ، مشرق کی نجات کی خواہشیں، انسانی اخوت، محبت اور بہبود کی کوششیں ان سے بہت سارے اختلافات کے باوجود ہمارے لیے مشعل راہ کا کام کرتی رہیں گی۔


خراب موسم سے بچاؤ
موسموں کے خراب اثرات سے بچئے۔
خون صفا خارش اور پھوڑے پھنسیوں سے
لڑ کے چمکتے جسم کو کندن بناتا ہے۔
خون صفا طبیعت کی گرانی، بھوک کی کمی اور
قبض کو دور کرتا ہے۔
برسات کے موسم میں اس کا استعمال ضروری
اور مفید ہے۔
خون صفا
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (یو۔پی)

ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی

روس کا ایرانی شاعر

ابوالقاسم لاہوتی

انسانی ارتقاء کی تاریخ ایک درد بھری داستان ہے جس میں برابر چند لوگوں کو خاندان و شرافت ثروت و دولت اور علم و ہنر کے بہانے سے طرح طرح کے حقوق حاصل رہے ہیں اور دوسری طرف کروڑوں، اربوں کسانوں، مزدوروں اور جفاکشوں کو مسلسل ظلم و تعدی، محرومی، بھوک اور برہنگی کا شکار ہونا پڑا ہے۔ رہبروں پیغمبروں اور مجددوں کی لگاتار آمد جاری رہی اور رکھوا جیسے انسانوں نے کوشش بھی کی کہ کسی طرح مایہ الاشتراک انسانیت کا احترام کرتے ہوئے اخوت، مساوات اور برادری کے رشتہ کو مضبوط کیا جائے لیکن بے رحم انسانوں نے کسی ایسی تحریک کو ٹھکرانے میں تامل نہیں کیا جس سے زیادہ سے زیادہ آدمی راحت و آرام سے رہ سکیں اور لاچاری کسمپرسی اور بے کسی سے نجات پا سکیں۔ یہ طبقاتی کشمکش عوام کو سسکاتی اور زندہ درگور کرتی رہی یہاں تک کہ بیسویں صدی کے انقلاب نے کچلے ہوئے مزدوروں، غریبوں اور برہنہ انسانوں کو نجات کے راستے پر لگا کر ایک ممتاز صف میں کھڑا کر دیا ہے اور ادب بھی جو پہلے برائے ادب ہوتا تھا، آج برائے زندگی کا علمبردار نظر آتا ہے اور روس کو فخر حاصل ہے کہ وہ ہر قسم کے سیاسی معاشرتی اور ادبی انقلاب کا منبع بنا ہوا ہے وہ روس جہاں پہلے ادبی سرمایہ کا بے حد قحط تھا سیاست کے ساتھ ادبی دنیا میں بھی یک بیک اس قدر آگے ہو گیا کہ لوگ متحیر ہو کر رہ گئے۔ اٹھارھویں صدی سے پہلے سوائے مجلی ترانوں اور بعض بے اہمیت کتابوں کے اس ملک کے ادبیات میں اور کوئی چیز نہیں ملتی لیکن اٹھارھویں صدی کے آخر میں ایک فکری انقلاب پیدا ہوا اور انیسویں صدی میں پشکن (۱۷۹۹ء – ۱۸۳۷ء) لیرمنتیف (۱۸۱۱ء – ۱۸۴۱ء) گوگول (۱۸۰۹ء – ۱۸۵۲ء) تورگنیف (۱۸۱۸ء – ۱۸۸۳ء) داستایوسکی (۱۸۲۱ء – ۱۸۸۱ء) اور ٹالسٹائے (۱۸۲۸ء – ۱۹۱۰ء) جیسے ہنرمند اور فنکار پیدا ہوئے اس کے بعد بیسویں صدی کے خلاقوں اور شاعروں میں جہاں میکسم گورکی (۱۸۶۸ء – ۱۹۳۶ء) کورولنکو (۱۸۵۳ء – ۱۹۲۱ء) سولوگوب (۱۸۶۳ء – ۱۹۲۶ء) پاسترناک (۱۸۹۱ء – ۱۹۶۰ء) جیسے صاحبانِ فن و ہنر دکھائی دیتے ہیں وہاں ایک آوارہ دشت غربت اور غریب الوطن لاھوتی کا نام بھی لیا جائے گا، جو کبھی ایران کا سب سے بڑا غزل گو سمجھا جاتا تھا اور جس کی

غزلیں ایران کی ادبی محفلوں میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھیں لیکن جب مجبوراً ایران کو ترک کرکے اس ہنر پرور ملک میں پناہ لینی پڑی اور آخر مارچ ۱۹۵۷ء میں اس نے وہیں انتقال کیا۔ سعید نفیسی لکھتے ہیں :

"میں لاہوتی کے شاہکاروں کو دوست رکھتا ہوں اور انھیں فارسی شاعری کا اچھا نمونہ سمجھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ دوسرے شعرا کو اس کے مضامین اور معانی کی، اس کے لہجہ اور آہنگ کی پیروی کرنی چاہیے۔ میری اس پسندیدگی کے کئی اسباب ہیں۔ ہمارے آج کے شعرا ابھی تک شعر کے حقیقی معنی کو نہیں سمجھے اور خیال کرتے ہیں کہ شعر کا مقصد یہی ہے کہ اس میں ظاہری خوبیاں، لفظی صنعتیں، شاعرانہ دور از کار تکلفات، کنایات و استعارات اور فارسی شعرا کے وزنوں، قافیوں اور ردیفوں کی پیروی کی جائے . . . . . . ایرانی شعرا خواہ کتنی ہی کوشش کریں . . . . . . وہ فردوسی، عمر خیام سعدی اور حافظ کے درجہ کو نہیں پا سکتے۔ اس لیے چاہیے کہ دوسرے راستہ کو اختیار کریں نئے مضمونوں میں طبع آزمائی کریں۔ تازہ وزنوں کو پیدا کریں۔ قافیہ میں تصرف کریں اور زیادہ کھلے ہوئے میدانوں میں داخل ہوں۔

پچھلے زمانہ میں شاعر آج کی طرح سیاسی اور معاشرتی ذمہ داری نہیں رکھتا تھا . . . . آج شاعر اور لکھنے والے تمدن کے تازہ ترین افکار کے تند رو راہنما اور پیش آہنگ ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ شاعر اور لکھنے والے لڑائی کی پہلی صف میں دوسرے جانبازوں کے پیش رو بنیں۔ یہ لاہوتی کی شاعری کا سب سے اہم پہلو ہے . . . . . لاہوتی وہ شاعر ہے جس نے شمشیر کھنچی تیغ کھینچے ہوئے اور سینہ سپر کیے ہوئے شاعری کے میدان میں قدم رکھا ہے . . . جنگجو شعر نہیں کہتے لیکن شاعروں میں سے بہتوں نے جنگ کی ہے انھیں میں سے ایک لاہوتی بھی ہے۔

لاہوتی میں ایک جذبہ یہ بھی ہے کہ جو افکار اور عقیدے وہ شعر میں بیان کرتا ہے اس سے پوری وابستگی رکھتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ دوسرے ایرانیوں میں ایران کے اس بڑے شاعر کا جوش و خروش اور اس کی گرمی پیدا ہوگی اور وہ دلیر اور دلاور روح . . . ایران کے پرشور جوانوں کی جنبش کا سبب بنے گی"[1]

فارسی کے نئے ادب میں لاہوتی کا بہت بڑا درجہ ہے جسے کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ لاہوتی کے غیر معمولی ہنر میں اس کی صداقت اور صمیمیت کو بہت بڑا دخل ہے جس نے اس کو اس قدر رائج اور جاذب بنا دیا ہے۔ وہ تمام عوامی لڑائیوں میں قلم اور شمشیر دونوں سے شریک رہا۔ اس لیے اس کے اشعار کا اثر دو گنا ہو جاتا ہے :

ملا کی اذان اور مجاہد کی اذان اور

لاہوتی کی اذان اور پکار نکمے ملاؤں کی سی آواز نہیں ہوتی جس میں عمل اور زندگی کی بو تک نہیں پائی جاتی بلکہ اس سچے مجاہد کی اذان ہوتی ہے جس کے لب و لہجہ میں زندگی اور صداقت سمائی ہوئی ہوتی ہے اور جسے خون کے قطروں سے تر و تازہ بنایا جاتا ہے۔

---

[1] پیام نو (ص ۴۷-۴۹) تہران شہریور ماہ ۱۳۲۵ھ

ابوالقاسم لاہوتی کرمانشاہی ۱۸۸۵ء میں کرمانشاہ میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام الٰہی تھی اور اس کا خاندان بڑا دولتمند اور صاحب املاک تھا۔ لاہوتی کی تعلیم حسب معمول ہوئی اور اسے بچپنے ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ شاعرانہ تخیل اور وارستگی میں پڑ کر اس نے اپنی آبائی شان و شوکت بھلا دی اور اسی وجہ سے اس نے اپنا تخلص لاہوتی رکھا۔ شعر کہتے کہتے لاہوتی ۱۹۰۹ء ـ ۱۹۱۰ء میں اس قابل ہو گیا کہ اس کے اشعار "ایران نو" میں چھپنے لگا۔

لاہوتی کو مذہبی تعلیم کا کافی شوق تھا اور غالباً اسی کو وہ اپنی زندگی کا مشغلہ بنانا چاہتا تھا لیکن گھر والوں نے ۱۹۰۴ء میں اسے مسلح پولیس میں داخل کر دیا اور ۱۹۱۲ء میں وہ قم کی پولیس کا افسر ہو گیا۔ وہاں اختلافات کی وجہ سے لاہوتی نے کسی کو قتل کر دیا اور اسی جرم میں مرکزی حکومت نے اسے گرفتار کر لیا۔ لیکن وہ حراست سے کسی طرح موقع پا کر بغداد فرار ہو گیا اور وہاں سے ۱۹۱۴ء میں استنبول پہنچا اور مہاجرانہ زندگی بسر کرنے لگا۔

استنبول میں لاہوتی نے "پرنس ارفع" کی مدد سے کتاب فروشی کا سلسلہ شروع کیا۔ جب پہلی جنگ عظیم کے بعد اس کے ساتھی لوٹنے لگے اور وہ واپس نہ ہو سکا تو اس موقع پر وطن کی یاد میں اس نے بڑی پُر درد نظم کہی:

بستند همرهان سوی یار و دیار بار	میرے تمام ساتھی ملک وطن کی طرف روانہ ہو رہے ہیں
جز من که دور مانده ام از یار و از دیار	سوائے ایک میرے کہ عزیزوں اور وطن سے دور پڑا ہوا ہوں
ای کاروان که بار دل جان گرفته ای	اے قافلہ جس میں میرا دل اور میری جان ہے
خوش میروی برو که خدایت نگاهدار	تو خوش قسمت ہے کہ جا رہا ہے، خدا حافظ، جا
راه وطن بگیر که این منزل غریب	اور وطن کا راستہ لے اس لیے کہ اس اجنبی جگہ
آب و هوای آن نبود بر تو سازگار	کی آب و ہوا تیرے راس آنے والی نہیں ہے
ای بلبلان عاشق و ای طوطیان مست	اے عاشق بلبلو، اور اے مست طوطیو
آنجا که یافتید بسند وصال یار	جب تمہیں اپنے محبوب کا وصال حاصل ہو جائے
یادی کنید از من گم کرده آشیان	تو مجھ جیسے بے گھر کو بھی یاد کر لینا
نامی برید از من دلخون و اغدار	اور میرے جیسے دلخون اور داغدار کا بھی نام لینا

۱۹۲۱ء میں لاہوتی ایران واپس آیا اور دوبارہ مسلح پولیس میں کام کرنے لگا۔ ۱۹۲۲ء میں اس نے تبریز میں ترقی پسند جماعت سے لگاؤ پیدا کیا جس کے نتیجے میں ایک مسلح شورش کا آغاز ہوا لیکن اس میں لاہوتی اور اس کے ساتھیوں کو شکست ہوئی اور آخرکار اسے ہمیشہ کے لیے اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا، اور اس وقت سے وہ برابر روس میں اپنی زندگی گزارتا رہا۔

لاہوتی کا ایک مجموعہ "چکامہ لاہوتی" کے نام سے استنبول میں چھپا تھا اس کے بعد اس کا دیوان ۱۹۳۹ء میں ماسکو میں چھپا جس پر بہت بڑے مستشرق برٹلس نے دیباچہ لکھا اور آخر میں تبصرہ بھی کیا ہے اس کے علاوہ لاہوتی کے

دوسرے مجموعے "سرودہای آزادی وصلح" (۱۹۵۲ء) اور ترجمۂ آثار پشکن (۱۹۴۷ء) بھی ماسکو سے طبع ہوئے ہیں۔ لاہوتی کا دیوان کئی مرتبہ چھپا اور چند حصوں میں تقسیم ہوا ہے۔

ایران۔ جہاجستر۔ اتحاد شوروی۔ ناتمام غزلیں۔ بیتیں اور رباعیاں۔

لاہوتی ایک غزل گو شاعر ہے اور اس کی غزلیں عشق و محبت کی منزلیں اور باریکیوں کو بیان کرتی ہیں نیز الفاظ و معنی کی لحاظ سے اس طرز کی حامل ہیں جو انقلاب مشروطیت کے بعد ایران میں رائج ہوا، اور اس کی زبان مکالمہ اور گفتگو سے بہت زیادہ قریب ہے۔

نشد یک لحظہ از یادت جدا دل
زہی دل، آفرین دل، مرحبا دل
من بیچارہ آن روزی بقتل خود یقین کردم
کہ دیدم تازہ با گرگ الفتی باشد شبانم را
عاشقم، عاشق بروی تو گر نمیدانی بدان
سوختم در آرزویت، گر نمیدانی بدان
سینہ ام تنگ بر آنسان کہ رہ آہ نداشت
ہمدمی آمد و در من نفسی پیدا شد
خندہ میکرد دل واز "خطر و محنت عشق"
عقل چون پیرزنان فلسفہ سازی میکرد
تو رو گردانیدی و در چشم من تاریک شد دنیا
چہ کردی بی مروت، آفتابم را کجا بردی

ایک لحظہ کے لیے بھی دل نے تجھے فراموش نہیں کیا
کیا کہنا اس دل کا اس پر آفرین اور مرحبا ہے
مجھ بے کس کو اسی روز اپنے قتل کا یقین ہو گیا تھا
جب میں نے یہ دیکھا کہ میرے چوپان کو بھیڑیے سے محبت ہو گئی ہے
میں تیرے چہرے کا عاشق ہوں اگر نہیں جانتا ہے تو جان لے
اور میں تیری آرزو میں جل گیا، اگر پتہ نہیں ہے تو سن لے
میرا سینہ اتنا تنگ تھا کہ آہ کے لیے بھی راستہ نہ تھا
مگر ایک ساتھی کے آنے سے میری سانسیں چلنے لگیں
دل ہنس رہا تھا اور عشق کے رنج و غم اور اس کے خطرے کے متعلق
عقل بوڑھی عورتوں کی طرح فلسفیانہ باتیں کر رہی تھی
تو نے منہ موڑ کر میری آنکھوں میں دنیا تاریک کر دی
اے بے مروت تو نے یہ کیا کیا اور میرے آفتاب کو کہاں لے گیا

لاہوتی ان غزل گو شاعروں میں سے نہیں ہے جو صرف ہجر و وصل اور گیسو و رخسار محبوب کی باتیں کرتے ہیں اور جن کے اندر کوئی سوز و درد اور محیط کا اثر نہیں ہوتا۔ لاہوتی اپنے ماحول اور سماج کی زبوں حالی سے اس قدر متاثر ہے کہ غزل کو بھی اس نے انھیں جذبات اور تاثرات کے اظہار کا آلہ بنایا ہے۔

زفقر زارع و دل سختی مالک بود روشن
کہ ایران می شود ویران ز استبداد و می نالم
خیانتہای شاہ و جہل ملت را چو می بینم
از آن ترسم کہ این کشور رود برباد و می نالم
ہمچو گل بیرون بیا از جلد ننگین نقاب
پیچہ و چادر بسوزان ترک این خاری بکف

زارع کے فقر اور مالکوں کی دل سختی سے یہ بات روشن ہو گئی ہے
کہ ایران استبداد سے ویران ہو کر رہے گا اور اسی وجہ سے میں نالہ کر رہا ہوں
جب میں بادشاہ کی خیانتیں اور قوم کی جہالت دیکھتا ہوں
تو مجھے یہ ڈر ہوتا ہے کہ یہ ملک برباد ہو رہا ہے اور اس ڈر سے رونے لگتا ہوں
تو پھولوں کی طرح بے رنگ نقاب سے باہر نکل آ
برقع اور مقنع کو جلا دے اور اس ذلت کو دور کر دے

دروگوہر زینت زنہای استعمار چی است	جواہرات اور موتی سامراجیوں کی بیویوں کی زینت کے لیے ہوتے ہیں
گر ز زحمت غازۂ روی نگار ما برد	میرے معشوق کے چہرے کا غازہ تو رنج وغم کی گرد سے تیار ہوتا ہے
تورا روحیت پاک ای زنجیر در جامہ تقویٰ	اے زحمت کش تیری روح بالکل پاک ہے، تجھے کیا پتہ
فا دزاہد آلودہ داماں را چہ می دانی	کہ گنہگار زاہد تقویٰ کے لباس میں کیا کیا فساد کیا کرتے ہیں
ترا با نام دین خوابانده در گہوارۂ غفلت	دین کے نام سے تجھے غفلت کے گہوارے میں سلادیا ہے
تقلبہای این شیخ مسلمان را چہ دانی	تجھے کیا پتہ کہ یہ مسلمان شیخ کتنا مکار اور دھوکہ باز ہے
ویران تر از ایران بود امروز دل من	آج تو میرا دل ایران سے بھی زیادہ ویران ہے
ای وای بایں خانۂ ویراں چہ توان کرد؟	اب اس ویران گھر کا کیا علاج کیا جاسکتا ہے
دانم کہ خیانت بوطن راہ ترقیست	مجھے خوب معلوم ہے کہ لوگ وطن کے ساتھ خیانت کرکے ترقی کا راستہ
اما جلوگیری وجدان چہ تواں کرد؟	پیدا کرتے ہیں لیکن اس کو کیا کروں کہ میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا۔
قانون نوی میطلبد ۔ لائق وکامل	یہ نیا دور، نئی ہستی اور نئی نسل
این دور نو این ہستی نو این بشر نو	ایک نئے اور مکمل قانون کی طالب ہے
آہنگ نو وجوش نو و رقص نو آورد	یہ تازہ اشعار، نئی شراب اور نئی خبر
این شعر نو، این بادہ نو، این خبر نو	نئے نغموں، نئے جوش وخروش اور نئے رقصوں کو پیدا کررہی ہے

لاہوتی کی غزلوں میں سیاسی اور اجتماعی مضامین کافی ملتے ہیں، لیکن ان مطالب کو بیان کرنے کا انداز پرانا ہے مشروطیت کے پرانے شعرا فانی عقیدہ اور محدود اجتماعی مقاصد کے حامل تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ نظریے جاتے رہے اور نئے اجتماعی سیاسی اور وطنی افکار نے ان کی جگہ لے لی۔

فارسی شاعری کو کمال تک پہنچانے میں جو اہمیت لاہوتی کو حاصل ہے وہ نئے اسلوبوں اور سبکوں کی وجہ سے ہے جو شاعری میں داخل ہوئے ہیں اور تازہ راستے ہیں جو وزن، قافیہ اسلوب بیان اور معانی کے لحاظ سے فارسی ادب میں نکالے گئے ہیں۔ اس قسم کی نظموں کو لاہوتی نے اپنے روس کے قیام کے زمانہ میں لکھا ہے ان میں سے بعض نظموں میں وزن اور قافیہ کی باریک تکنیک سے کام لیا گیا ہے۔ اس قسم کا عمدہ نمونہ "وطن شادی ہے" شاعر پہلے خوشی اور شادمانی کی تعریف کرتا ہے۔

روی خوش وبوی خوش وموی خوش ودلکش	وہ کتنا خوش رو، خوشبو، خوش مو دلکش
خنداں وغزلخواں	اور خنداں و غزلخواں ہے
از آمدنش در بدن مردہ دمد جان	اس کے آنے سے مردہ جسم میں روح پڑ گئی
فتان و پریوش	وہ بڑا ہی فتان اور پریوش ہے

موعنبر و لب شکر و رو مجمر آتش	اس کے بال عنبر جیسے لب شکر جیسے اور چہرہ مجمر آتش
یا مہر فروزان	یا مہر فروزان ہے

خوشی و مسرت دنیا کے گوشہ گوشہ کو دیکھتی ہے مگر اسے کوئی جگہ ایسی نہیں ملتی جہاں وہ سکونت اختیار کر سکے۔ نہ تو دولت مندوں اور راجاؤں میں اسے سکون ہے اور نہ غریبوں اور ناداروں میں وہ ٹھہر سکتی ہے۔ اگرچہ مفلوک الحال لوگوں سے اسے ہمدردی ضرور ہے:

پرواز کند شادی با شہپر زیبا	خوشی اپنے خوبصورت شہپروں کے ساتھ
بر قلۂ کہسار و بہ آبادی و صحرا	پہاڑوں کی چوٹیوں، آبادیوں اور صحراؤں میں پرواز کرتی ہے
پرواز کند بر زبر خشکی و دریا	وہ خشکی اور دریا
در خاور و در باختر و در ہمہ دنیا	مشرق اور مغرب سبھی جگہ اڑتی ہے
جا جوید و جا لائق او ہیچ کجا نیست	اور اپنے لیے ایک جگہ تلاش کرتی ہے مگر کوئی جگہ ایسی جہاں وہ رک سکے۔

...

پرواز کند بر سر دربار امیران	وہ امیروں کے درباروں
پرواز کند بر در سردار و وزیران	اور سرداروں اور وزیروں کے دروازوں پر جاتی ہے
ہر جا کہ رسد بر سر اینگونہ شریران	لیکن وہ جہاں کہیں بھی ان جیسے شریروں کے پاس پہنچتی ہے
گوید کہ درین جای ملوث نتوان زیست	یہی کہتی ہے کہ یہ گندی جگہ رہنے کے قابل نہیں ہے
گوید کہ من این راز نہفتن نتوانم	وہ کہتی ہے کہ اس راز کو چھپایا نہیں جا سکتا۔
قتلست درین جامعہ رفتن نتوانم	اس سماج میں قتل کا بازار گرم ہے اس لیے (وہاں) میں نہیں جا سکتی
ننگست درین عائلہ خفتن نتوانم	اہل و عیال ذلت کی زندگی بسر کر رہے ہیں جس سے نیند حرام ہے
مرگست درین نغمہ شنفتن نتوانم	اور ہر وقت موت کا نغمہ گایا جا رہا ہے جسے سنا نہیں جا سکتا
این دزدی و خونریزی و بیدادگری چیست؟	تف یہ کیسی دزدی، خونریزی اور ظلم ہے؟

آخر میں اسے ایک ہی جگہ ایسی ملتی ہے جہاں رک کر وہ دم لے سکے اور اپنا گھر بنا سکے اور وہ جگہ سرزمین روس ہے۔

گوید زہی آن مرد کہ این خانہ بمن داد	پھر کہتی ہے کیا کہنا اس شخص کا جس نے مجھے رہنے کے لیے یہ گھر دیا ہے
حرمت بہ کسی کو بمن اینگونہ وطن داد	جس نے مجھے ایسا وطن دیا وہ ہمیشہ عزت و آبرو کی زندگی بسر کرے
قربان رفیقی کہ بمن باغ و چمن داد	میں اس دوست پر قربان ہو جاؤں جس نے مجھے باغ و چمن
جا داد بمن، راہ بمن داد، ثمن داد	منزل اور دولت و ثروت دی ہے۔

معانی کے لحاظ سے لاہوتی کے کلام کو ایک اور طریقہ سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک تو لاہوتی کا وہ کلام ہے

جس کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے سرزمین ایران سے ہے۔ اس میں ایک تو وہ حصہ ہے جس نے ایران کے قیام کے زمانہ میں کہا تھا اور دوسرا وہ حصہ ہے جو ایران سے دور رہ کر وطن کی ہمدردی اور یاد میں کہا گیا ہے۔

"دختران ایران" میں لاہوتی ایرانی عورتوں کی محرومی اور ذلت کو بیان کر کے ان کو آگے بڑھنے کے لیے برانگیختہ کرتا ہے۔

"ایران من" میں اپنے وطن سے نکالا ہوا شاعر جو حب وطن سے مجبور ہو کر ایران کو یاد کرتا اور اس سے اظہار ہمدردی کرتا ہے اور چوں کہ یہ نظم دوسری جنگ عظیم میں رضا شاہ کے تخت سے ہٹائے جانے کے بعد لکھی گئی تھی اس لیے اس میں ایران کی خوشحالی اور خوش بختی کی امیدیں پائی جاتی ہیں۔

"فریاد ملت" میں اپنی مادر وطن کو امید دلائی جاتی ہے کہ اس میں سعادت مند فرزند اس کی حرمت اور عظمت کو قائم رکھنے کے لیے کوشاں ہیں اور اس سے غافل نہیں ہیں۔

"کودکان قالیباف ایران" میں ان غریب اور کم عمر بچوں کی ذلیل حالی اور مردہ زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے جن کی بے اجرت زحمت کے عوض میں امیروں اور ثروت مندوں کے مکانوں کی زینت اور آرایش ہوتی ہے۔ لاہوتی خود بچوں کی زبان سے کہتا ہے۔

سن ما شش بود یا کمی بیش از ین	جب ہم چھ برس یا کچھ زیادہ کی عمر کے ہو جاتے ہیں
تا بدست آید این قالی دل نشین	تب یہ دل نشین قالین ہاتھ آتا ہے
شد خزان برنا شد کمان پشت ما	ہماری جوانی خزاں رسیدہ اور ہماری کمریں خمیدہ ہو گئیں
خون دل میچکد از سر انگشت ما	اور ہماری انگلیوں سے ہمارا خون جگر ٹپک رہا ہے
سرخی رنگش از خون هر فرد ماست	ان قالینوں کی سرخی ہمارے خون
زردیش عکس از چهره زرد ماست	اور زردی ہمارے زرد چہروں سے پیدا ہوتی ہے
هر کبودی بر آن آیت درد ماست	اور ان کا ہر نیلا رنگ ہمارے درد کی علامت ہے

خصم ما چون بر این فرش پا می نهد	جب ہمارا دشمن ان قالینوں پر قدم رکھتا ہے
پای خود بر سر عمر ما می نهد	تو وہ گویا ہماری زندگی کو اپنے پیروں سے کچل دیتا ہے

نوشیروان کی عدالت کے کتنے قصے زبان زد خلایق ہیں اور طاق کسریٰ سے ہر حساس گزرنے والا اس کی پرانی عظمت کو یاد کر کے دو آنسو ضرور بہا دیتا ہے۔ خاقانی جب اس طرف سے گزرا تو اس سے رہا نہ گیا اور اس نے بے حد پر درد لہجے میں اس عبرت خیز منظر کو یاد کیا ہے۔

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں	اے عبرت بین دل ذرا آنکھ کھول کر دیکھ

ایوان مدائن را آئینہ عبرت دان ۔ اور ایوان مدائن سے سبق لے

لیکن آج کا سماجی شاعر اس نکتہ کو بھی یاد رکھتا ہے کہ یہ وہی قصر ہیں جن کے بنانے میں ہزاروں مزدوروں نے ہاتھ لگایا ہے اور ان برہنہ انسانوں کے بنائے ہوئے محلوں میں مطلق العنان بادشاہ عیش و عشرت کے مزے لوٹا کیے ہیں۔ لاہوتی "کرملن" کو دیکھ کر ایوان کسریٰ، نیز دنیا کے دوسرے مشہور قصروں کو یاد کرتا ہے جو انسانی مظالم اور غریبوں اور بے نواؤں کی ہڈیوں سے بنائے گئے ہیں۔

تا چند کنی گریہ بر مسند نوشیرواں	تو کب تک نوشیرواں کے تخت پر آنسو بہاتا رہے گا
در قصر کرملن اے دل، اسرار نہاں برخوان	اے دل اب ذرا تو کرملن کے قصر میں پوشیدہ رازوں کو بھی معلوم کر لے
اینجا و مدائن را مزدور بپا کردہ است	چاہے یہ جگہ ہو یا مدائن دونوں کو مزدوروں نے بنایا ہے
این قصر را الف آن مسند بی ساماں	یہ قصر رو الف ہو اور وہ آں سامان بنا مسند
مستند برایں منوال دارند ہمیں احوال	یہی حال تمام قصروں کا ہے
بنگر قصر بریطانیت یا قلعۂ واتیکان	چاہے وہ برطانیہ کا قصر ہو یا ویٹیکن محل ہو
در نقشۂ این ابنیہ مرگ فقرا شد طرح	جب ظلم کے معماروں نے ان عمارتوں کو بنایا
معمار ستم چوں ریخت شالودۂ ایں بنیاں	تو ان کے نقشوں میں فقیروں کی موت کا انتظام کیا گیا
ہر شب تن صد مظلوم آغشتہ بخون می شد	ہر شب سیکڑوں مزدور خون آلودہ ہوتے تھے
تا آں کہ در ایں ایوان صد حور شود رقصاں	تب جا کر ان محلوں میں حوریں رقص کیا کرتی تھیں

"بازگشت بوطن" میں وہ وطن کی واپسی پر اشتیاق ظاہر کیا گیا ہے۔ مگر وطن پہنچ کر محسوس ہوتا ہے کہ جس کا اتنا عشق تھا وہ تو زندان نکلا۔

"اعلامیہ ہا بموقع رسیدند" میں ایک نوجوان اشتراکی کی داستان ہے جسے پولیس والے گرفتار کرنا چاہتے ہیں اور ایک بوڑھا اسے نصیحت کرتا ہے کہ وہ اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالے۔ لیکن وہ نوجوان اپنے ارادہ میں اس قدر مستقل ہے کہ وہ اس بڈھے سے کہتا ہے "میں اس قدر زحمتیں تم جیسے زبوں حال اور بخت لوگوں کے لیے اٹھا رہا ہوں"

"در مرگ رفیق تجارتی" میں اس ساتھی کی داستان ہے جسے مردم کش نظام کے خلاف بغاوت کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے اور "زندگی پیروز مندی ہو" میں مفلوک الحال بھوکے اور ننگے ایران کی حالت زار پر آنسو بہا کر لوگوں کو جنگ اور انقلاب کے لیے برانگیختہ کیا گیا ہے۔

لاہوتی کے دیوان میں بہت سی بیج اور دلکش نظمیں ہیں جو گیلان، کردستان اور آذربائیجان کے انقلاب پر کہی گئی ہیں۔

دوسرا حصہ وہ ہے جس میں لاہوتی نے اپنی ہجرت کے زمانے اور قیام روس کا ذکر کیا ہے۔ اس

حصہ میں امید اور عشرت اور خوش بختی کی پوری تصویر کشی کی گئی ہے۔ روس کے مزدوروں کا جوش و خروش، وہاں کے کاشتکاروں کی غیر معمولی دلچسپی، صلح جہاں کی انتھک کوششیں وہاں کے رہبروں کا ایثار او بے غرض خدمت اور انبساط کی ایک عام لہر لاہوتی کے اشعار میں ان سب چیزوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ "داس و چکش" میں کاشتکاروں کی خوشحالی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

لشکر زمستاں رفت	جاڑے کا لشکر گیا
دولت بہار آمد	اور بہار کی حکومت آگئی
دستہ دستہ گلخوزچی	دہقانوں کے دستے کے دستے
سوی کشت و کار آمد	کھیتوں اور کاموں پر لگ گئے
چین نکسدہ بر ابرو	ابروؤں پر شکن ڈالے
بستہ دور سر گیسو	سروں کو گیسوؤں سے سجائے
بیل نو بدست او	اپنے ہاتھ میں بیلچہ لیے ہوے
یار ضربدار آمد	ضرب لگانے والا معشوق آگیا
یار پنبہ کار ما	ہمارا پنبہ کار معشوق
گشتہ آبیار ما	ہمارا آبیار بن گیا ہے
سرو گلعذار ما	اور ہمارا گلعذار سرو
سوے جویبار آمد	جویبار کی طرف آگیا ہے
پہلوان با ادراک	باشعور بہادروں نے
زد کلند را بر خاک	زمین پر کلنگ مارا
سینۂ زمین شد چاک	جس سے زمین کا سینہ چاک ہو گیا
گل از آں ببار آمد	اور پھول کھلنے لگے
این گل امید ماست	یہ ہماری امیدوں کا پھول
این زر سفید ماست	ہماری دولت
طالع سعید ماست	اور ہماری روشن تقدیر
بین چہ جلوہ کار آمد	اور دیکھو کیسا پر رونق دکھائی دے رہا ہے

لاہوتی کی اس قسم کی نظموں میں "زندہ است لینن" "ماکسیم گورکی" "ما ظفر خواہیم کرد" "ایک دستہ بر قبر لینن" "باغبان" "آدم آہن پا" "گفتگو دو شہر" "شیر آزاد" "حکایت از خروا ز تر اکتور" "اکتبر بیست

ص

"بہ شامر بی چشم" اور "پیرزدی غزل" جیسے شاہکار ہیں۔

سب سے نمایاں فرق جو لاہوتی کے قیام روس کے زمانہ کے کلام اور اس کے قبل کے اشعار میں پایا جاتا ہے ہے کہ ایران اور ترکی کے قیام کے زمانے میں اس کے کلام میں وہی حسرت و نا امیدی، ہیجان اور غم والم ہے جو تقریبًا ہر ایشیا کے حساس شاعر میں ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ مگر اس کے مقابلہ میں وہ کلام بھی ہے جو روس کی سرزمین اور ماحول کی پیداوار ہے۔ اس میں شگفتگی تروتازگی، خوشی و مسرت اور امید کی ایک دنیا دکھائی دیتی ہے۔ جہاں ناامید حسرت و یاس اور غم کو جگہ نہیں مل سکتی۔ سعید نفیسی لکھتے ہیں:

"جو کچھ ترکی اور سفر مہاجرت میں کہا ہے وہ شکایت اور حسرت و ناکامی سے پُر ہے۔ . . . لیکن جو کچھ روس میں کہا ہے وہ شور و نشاط . . . . . سے بھرا ہوا ہے . . . . . اس لیے کہ اس ملک میں اس کے تمام عقیدے اور دلی آرزوئیں . . . عملی ہوگئیں . . . اور اس کے اشعار کا وجد و سرور یہیں سے پیدا ہوتا ہے۔"

لہ پیام نو (ص ۹۴) شہریور ۱۳۲۵ھ

سلام مچھلی شہری

نئے دورِ عالم کے اے رہنماؤ!

ہمیں کچھ خوشی دو
ہمیں روشنی دو
ہمیں زندگی دو
نئے دورِ عالم کے اے رہنماؤ!
خداؤ!

غریبوں میں روٹی کے ٹکڑے نہیں ہیں
بدن ڈھانکنے کو بھی کپڑے نہیں ہیں
سبب اس کا یہ ہے کہ پیسے نہیں ہیں
یہ کچھ شعلہ پرور
یہ پُر ہول منظر
بدل دو تو بہتر
ہمیں کچھ خوشی دو
ہمیں زندگی دو
نئے دورِ عالم کے اے رہنماؤ!
خداؤ!

بہت خوبصورت ہیں وعدے تمھارے
مگر ہم نہ لیں گے یہ جھوٹے سہارے
کہ ہم ہیں غریبوں کی لعنت کے مارے
اداسی نہ لیں گے
غریبی نہ لیں گے
تباہی نہ لیں گے
ہمیں کچھ خوشی دو
ہمیں روشنی دو
ہمیں زندگی دو
نئے دورِ عالم کے اے رہنماؤ!
خداؤ!

کہاں تک سنیں گے یہ خوابوں کے نغمے
اثر کھو چکے ماہتابوں کے نغمے
ہمیں چاہییں انقلابوں کے نغمے

جو دل شادماں ہے
تو دنیا جواں ہے
مگر یہ کہاں ہے

ہمیں کچھ خوشی دو
ہمیں روشنی دو
ہمیں زندگی دو
نئے دورِ عالم کے اے رہنماؤ
خداؤ!

چلو مانتے ہیں زمانہ حسیں ہے
ہماری زمیں رشکِ خلدِ بریں ہے
مگر زندگی میں سکوں کیوں نہیں ہے
پریشان انساں
سکوں کا ہے خواہاں
ابھی تو ہے امکاں

ہمیں کچھ خوشی د
ہمیں روشنی د
ہمیں زندگی د
نئے دورِ عالم کے اے رہنما
خدا

ہمارا بھی ایمان ہے روشنی پر
ہمارا بھی کچھ حق ہے اس زندگی پر
کہاں تک رہیں گے تمہاری خوشی پر
پیالہ بھرا ہے
چھلکنا بُرا ہے
ابھی التجا ہے

ہمیں کچھ خوشی دا
ہمیں روشنی دا
ہمیں زندگی دا
نئے دورِ عالم کے اے رہنما
خداؤ

حبیب تنویر

نظر اور نظّارہ

کتنے دریاؤں کے اژدر کو اٹھا لیتی ہے آنکھ
اور کبھی قطرۂ شبنم سے چھلک جاتی ہے
کبھی دہر اک گلِ نازک سا ہی نظر آتا ہے
کبھی ذرے سے بھی کم تر نظر آتی ہے زمیں

کل وہ چھوٹا سا ستارہ نظر آتا تھا مجھے
پاس پہنچا تو یہ عالم کہ نظر بھی گم ہے
کونسی شے کو بڑا کہیے کسے کہیے حقیر
کیا ہیں کیا کہیے نظر اور نظارے کی حدیں

ماپیے دہر کو یا اپنی نظر کو صادق

آسماں بھی نہ ہو اک سلسلۂ تارِ نظر
میری کوتاہ نگاہی جسے کہتی ہے خلا
جگمگاتے ہیں نگاہوں کے سلاسل شاید
جن سے میں ہجر کی راتوں کو سجا لیتا ہوں
ایک دن جاگے ان آنکھوں میں ان آئینوں میں
دیکھو کیسی نظر آتی ہے بشر کی صورت

راہی معصوم رضا

ابلاغ

تلمیحوں، تشبیہوں اور الفاظ کے
اک مقتل میں، میں اک شرمیلی سی
بات کو اپنے ساتھ لیے حیران کھڑا یہ
سوچ رہا ہوں کس سے پوچھوں
آخر اس کو منزل تک کس رستے سے
میں لے کر جاؤں

ایک پل ایک صدی

پور پور میں مہندی کی میٹھی خوشبو کے چھلّے پہنے
بال سنوارے
چنچل آنکھوں کے پیروں کا جل کی زنجیر ڈالے
وہ جب دروازے تک آئی
دروازے پر کوئی نہیں تھا —
دھول کسی کے نقشِ قدم سے کھیل رہی تھی

اکیلا دوکیلا

ابھی ابھی کچھ دن پہلے تک —
میں بالکل تنہا رہتا تھا
اب تو میری بدنامی بھی
میرے ہی دو کمروں کے چھوٹے سے گھر میں اٹھ آئی ہے

اَن پڑھ

بڑی بڑی ہرنی جیسی دو پاگل آنکھیں
مجھ سے کچھ کہتے کہتے کیوں رک جاتی ہیں
یا شاید میں ہی یہ زباں اب بھول گیا ہوں

رفعت سروش

لمحۂ آرزو

شامِ کل اک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں ہم
بہت دیر بیٹھے رہے وقت کی سانس روکے
زمیں نے ہی چھیڑے محبت کے نغمے
زماں نے سنائی جنوں کی کہانی
یونہی بے تعلق سی باتیں ہوا کیں

"سہانا ہے موسم، گھٹا چھا رہی ہے
چٹکتے ہیں غنچے، ہوا گا رہی ہے
مگر وقتِ رخصت تمھاری نگاہیں
زباں بن کے بولیں
ابھی اور ___ کچھ اور کہنا ہے تم سے
ابھی دل کے تاروں کو چھیڑا کہاں ہے

مری خامشی کے لبوں پر بھی شاید یہی بات ہوگی
مری چشمِ نم نے
سنایا تو ہوگا
تمھیں بھی مری تشنگی کا فسانہ

گریزاں ہے ہر لمحۂ زندگانی
جو کل تھی حقیقت، ہے اب وہ کہانی
بس اک لمحۂ آرزو ہے میسر

کبھی پھر گزر ہو جو اس شہرِ ہنگامۂ خیر و شر سے
تو اے موجِ نکہت، تو اے روحِ نغمہ!
قیودِ تکلف سے آزاد ہو کر
گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر دل کی باتیں کریں گے

قمر ساحری

جہانِ ناتمام

کٹ نہ سکے آج تک خوف و جہالت کے دام کوئی کسی کا اسیر کوئی کسی کا غلام
سر بگریباں دماغ ششدر و مرعوب دل کس کو مکمل کہیں کس کو کہیں ناتمام
کوئی فریس و حکیم کوئی جلیل و کلیم کوئی زمانہ شناس کوئی ستارہ بدام
کوئی سمندر بکیف کوئی کہستاں بدوش کوئی گلستاں بلب کوئی سراپا پیام
کتنے چراغوں کا نور پی لیا ظلمات نے وقت نے جلا دیے کتنے خدا ازل کے نام
پھر بھی مگر گامزن سلسلۂ رہرواں دردِ تمنا لیے محوِ تلاشِ مقام
عقل بھی سرخرو جہل بھی ہے سرخرو کس کے لہو سے ہوا دشتِ وفا لالہ فام
جس سے جہاں تک بنا جس سے جہاں تک ہوا اپنی زباں میں کیا حرفِ تمنا کو رام
حرفِ تمنا ہے کیا اصلِ تمنا ہے کیا وحشتِ گزرگاہ میں خوابِ دلِ تشنہ کام
دائرۂ جہل میں دائرہ پیما ابھی نور پرستانِ صبح نجم شمارانِ شام
اپنی نواؤں میں گم اپنے خیالوں میں گم صوفیٔ سادہ نوا فلسفیٔ نو کلام
کوئی سنے بھی تو کیا کوئی کہے بھی تو کیا حرف ابھی بے صدا لفظ ابھی ناتمام
علم ابھی نوزباں عقل ابھی نوبیاں فکر و عقیدہ ابھی مبتدیٔ تازہ گام
آگ ابھی تک ہے نم شعلہ ابھی تک ہے خام
تو بھی ابھی ناتمام میں بھی ابھی ناتمام

زبیر رضوی

ستم ناآشنا

تم بہت سادہ، بہت بھولی، بہت سیدھی بھی ہو
اور کچھ دور ابھی تم مرے ہمراہ چلو
راستے شہرِ تمنا کے ہیں پر پیچ بہت
خود کو یوں تیزیٔ رفتار پہ مائل نہ کرو

زندگی مصر کا بازار ہے جس کے تاجر
حسنِ بے مثل کو بے دام اٹھا دیتے ہیں
شہرِ بغداد کے عیار لٹیرے گاہک
کھوٹے سکوں میں کھرا مال چکا لیتے ہیں

یاں ہر اک راہ، ہر اک موڑ پہ خضرِ منزل
قافلے والوں کو گمراہ بنا دیتے ہیں
یاں الٰہ دین کا بہروپ بدل کر کتنے
جا کے گلیوں میں چراغوں کی صدا دیتے ہیں

یاں ہر اک شاہ، ہر اک شیخ کا ایوانِ طرب
شب کے شانوں پہ کوئی زلفِ پریشاں مانگے
باندیاں پیش ہوا کرتی ہیں نذرانوں میں
خلوتِ خاص سدا عیش کے ساماں مانگے

تم ابھی پھول، تمہیں رنگِ شفق ساماں ہو
تم ابھی کیا ستمِ گردشِ دوراں جانو
تم نے رکھا نہ کبھی دشت و بیاباں میں قدم
تم ابھی کیا خلشِ خارِ مغیلاں جانو

اور کچھ دور مرے ساتھ ہی رہنا تم نے
زندگانی کو ابھی پاس سے دیکھا بھی نہیں
یہ جہاں کارگہِ شیشہ گراں ہے تم نے
سانس لینے کا قرینہ ابھی سیکھا بھی نہیں

تم بہت سادہ، بہت بھولی، بہت سیدھی ہو
یوں مجھے چھوڑ کے تنہا نہ تمہیں جانا تھا
زندگی مصر کا بازار ہے جس کے تاجر
حسنِ بے مثل کو بے دام اٹھا دیتے ہیں

شوؔر مینائی

الوداع

الوداع! تم کو مبارک ہو تمھاری محفل
میں چلا جاؤں گا الفت کا جنازہ لے کر
اور تم فرض کی دنیا میں بسو، پھولو، پھلو
دل کے تاریک ترین گوشوں سے باہر کر دو
ایسی ہر یاد جو وابستہ محبت سے ہے

روک لو بڑھ کے اگر ذہن کبھی چل نکلے
پھر اسی کوچہ و بازار کی جانب کہ جہاں
داغِ دل شمع سر راہگزار رہیں اے دوست!
وقت جو حال بھی ہے، ماضی بھی، مستقبل بھی
مندمل کرتا ہے ہر زخم کو رفتہ رفتہ
وہ شب و روز بھی آئیں گے کہ جب
تم کو ہر لمس محبت میں نہ ہوگا محسوس
میرے ترسے ہوئے ہونٹوں کا تقاضہ اے دوست!

گر کبھی زیست کی راہوں میں تمھیں
درد کا بارِ گراں سر پہ اٹھانا ہی پڑے
(راحت و رنج تو انسان کے ساتھی ہیں یہاں)
بھول جاؤ گی کہ اک دستِ طلب
منتظر تا دمِ آخر ہے تمھارے غم کا

اور جب ذہن میں کچھ مٹتے ہوئے نقش ابھریں
(کس کی محکوم ہوئی فکر کی بے راہ روی)
زندگی، فرض، محبت، غمِ دل ان کا مآل
سوچتے سوچتے بھر آئیں تمھاری آنکھیں
چشمِ نم پونچھ کے کہہ دوگی "یونہی کچھ بھی نہیں"

شہریار

ایک دو جام اور....

ایک دو جام اور آج کی شام
دیکھو وہ سامنے کھڑی ہے رات
اے اسیرانِ گردشِ ایام

رات کے بعد صبح آئے گی
صبح کے بعد دوپہر اور شام
اور پھر رات
اک بھیانک رات
ایک دو جام اور آج کی شام!

یہ مکاں

یہ مکاں
یہ خواہشوں اور آرزوؤں کے مکاں
دل کے اس اجڑے ہوئے سونے نگر میں
آج پھر جن کو
سلگتی دھوپ میں
تعمیر ہے ہم نے کیا
یہ مکاں
رات کے ہوتے تلک ڈھ جائیں گے
نیند کے سیلاب میں بہہ جائیں گے!!

صدا دی

صدا دی
ان آنکھوں نے ہونٹوں نے
اور اس دھڑکتے ہوئے دل نے میرے
صدا دی
اداسی کے صحرا سے، تنہائی کے دشت سے
ناامیدی کی چٹانوں سے، بے حسی کے پہاڑوں سے
اکثر صدا دی
کبھی بیتے لمحوں کو، بچھڑے ہوئے ساتھیوں کو
کبھی نیند کی سبز پریوں کو، خوابوں کی
معصوم پرچھائیوں کو
کبھی دن کے ہنگاموں کو، رات کی خامشی کو
کبھی تیرگی کو
کبھی روشنی کو

صدا دی
کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا
ان آنکھوں کا، ہونٹوں کا
اور اس دھڑکتے ہوئے دل کا
کوئی سہارا نہیں تھا!!

صب

عادل منصوری

اُسے تم نے سایہ سمجھ کر نہ روکا

اسے تم نے سایہ سمجھ کر نہ روکا
وہ سورج کے ماتھے کی شکنیں لیے
خالی کمروں میں کب سے تمھیں ڈھونڈتا تھا
وہ لمحوں کے چہروں پہ مرتی ہوئی
چاندنی چاٹتا تھا
اسے کاٹنے کے لیے
چھ دِشا کالا کُتا بڑھا تھا مگر
اپنے ہی دانت کے زہر کی دلدلوں میں
وہ دھنسنے لگا تھا۔
اسے تم نے سایہ سمجھ کر نہ روکا۔
اسے آخری مرتبہ
آسمانوں نے دیکھا تھا
تالاب میں پیر لٹکائے بیٹھا ہوا
سے تیرگی کے جزیرے پہ بسنے کی تم نے سزا دی
مگر اب وہ دریا کی منہ میں پڑا
سینوں کو جلانے لگا ہے۔
سے تم نے سایہ سمجھ کر نہ روکا۔

افق کی ہتھیلی سے سورج نہ ابھرے

اُسے گنبد کی نرم گولائی
اپنی طرف کھینچتی تھی
وہ پیدا ہوا تھا تو
میں نے ہی کانوں میں دی تھی اذاں
وہ پہیوں کی گولائیاں
ناپنا چاہتا تھا
اسے ہسپتالی فرشتوں نے
سٹریچر سے نیچے اتارا۔
میں لمحوں کو آنکھوں سے ٹھنکے لگانے میں مصروف
کرسی میں بیٹھا ہوا تھا
ادھر پیر سے خون کی کسنی پھوٹتی تھی
آپریشن تھیٹر میں ـــ
چیخوں کے سایوں کے ملبوس اترے
افق کی ہتھیلی سے سورج نہ ابھرے

عادل منصوری

ماری جوانا کا شیدائی

اور بنارس کی گلیوں میں
کھدّر کے ملبوس میں لپٹا
"ماری جوانا" کا شیدائی
جو دلی کھوج میں گھوم رہا تھا
لہاسٹ پہ بیٹھے
کچی پکی دھوپ چبلتے سارے سادھو
اس کے ساتھی
"ماری جوانا" کے بل کھاتے مرغولوں میں
ٹوٹ ٹوٹ کے پھیل رہا تھا اس کا جادو
لمبے بالوں اور ڈاڑھی میں
دھنسی آنکھوں کا تیکھا پن جاگ رہا تھا
پیچھے پیچھے کالا کتا بھاگ رہا تھا
چھوٹی سی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے
آنکھیں نفرت سے تھوک رہی تھیں
تالو اور دانتوں کے بیچ میں

گندی گالی گھوم رہی تھی
"گوتم" کی رانوں سے رستے پیلے ٹھنڈے خون کے قطرے
پیپل کی پھیلی شاخوں پر رینگ رہے تھے
ٹھہرو ۔ ٹھہرو
امریکہ جانے سے پہلے اپنے انگوٹھے کٹواؤ
فانی کیا؟ لافانی کیا؟

لال رنگ کا پانی کیا؟
وٹ پا تھوں پہ کویتا پڑھنے والا آیا
اپنے سایوں کی لاشوں کو روند کے بڑھنے والا آیا

چھایا کی دیوار کے پیچھے
"ماری جوانا" کا شیدائی
چند ڈبل روٹی کے سوکھے ٹکڑے لے کر
سورج کے سوراخ سے سب کو گھور رہا ہے
دوڑو دوڑو
بھاگو بھاگو

عادل منصوری

نروان

ہونٹ کھل نہیں سکتے
داغ دھل نہیں سکتے
سانپ، سنترہ، سورج

کنوارا پن

مچھر غل کرتے ہیں
اڑ رہی ہے چمگادڑ
نیند بھی نہیں آتی

ادھورا خواب

نیند کے سمندر میں
کوئی جل پری چمکے
اور آنکھ کھل جائے

تنہائی

رات میں نے بستر میں
چاندنی کی کرنوں کو
اوڑھنے کی کوشش کی

ارتقاء

اب تو آئینے میں بھی
خود کو غیر لگتا ہوں
کانچ کی یہ مصنوعات

رات

شام ڈھلے اک کالی بلی
کمرے میں آجاتی ہے
اور خرگوش کو کھا جاتی ہے

تخلیق

رنگوں کے سوکھے ساحل پر
خوشبو کی گیلی موجوں نے
یادوں کے موتی بوئے ہیں

تاج مہجور

جہنم

یہ رات پھر برف بن گئی ہے
یہ چاند پھر زرد ہو گیا ہے
فلک کا اک اک چمکتا تارا کہر کے پردوں میں کھو گیا ہے
یہ دودھیا چاندنی کی بانہیں بھی جیسے مفلوج ہو گئی ہیں
سڑک کے پہلو میں سمٹے سمٹے ہوئے سے بجلی کے سرد کھمبے
دھواں دھواں روشنی کی چادر میں سر چھپائے کھڑے ہوئے ہیں
کہ جس طرح سنتری کھڑے ہوں
خیال کی وادیوں میں گم سم
ٹھٹھرتے اشجار کی قطاروں پہ نرم پتے لرز رہے ہیں
کہ جس طرح دانت بج رہے ہوں
یہ شور کرتی ہوئی سڑک بھی پڑی پڑی اونگھنے لگی ہے
ہر ایک شئے جیسے سو گئی ہے
حیات خاموش ہو گئی ہے
اور ایک سوئی ہوئی سی ہوٹل کے پاس کوڑے کے ڈھیر میں کچھ
کریدتا ہے
سڑک کا خارش زدہ بھی لپٹا کتا — اور
اس کے پہلو میں ہے خمیدہ
تھکا تھکا آدمی کا سایہ
خیال کی وادیوں میں گم سم
خدا کی مانند بے نیازی سے اپنے دوزخ کو بھر رہا ہے
ٹھٹھرتی یخ بستہ شب میں جس کے
مہیب شعلے بھڑک اٹھے ہیں
اور ایک عالم سلگ رہا ہے

محمد اسحاق ایوبی

(انشائیہ)

شاہدِ غزل

اردو غزل میں حسن و عشق کی چاشنی زبان و بیان کا شہرہ اور جمالیاتی کیفیات و وارداتِ قلبی کی راب کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ اس کے انفرادی اشعار بغیر ساس کی بہوؤں کے جیسے آزاد، اور ادارۂ اقوام متحدہ کے ارکان کی طرح خودمختار اور وٹامن کی گولیوں کی طرح کارگر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی غزل میں قطعہ بھی کہہ جاتے ہیں یہ قطعہ مشترکہ خاندان، مختلف ملکوں کے وفاق اور کثیر الحیاتین قرص کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزل میں "حسن" پری وشیا" کا ذکر ہوتا ہے اس سے جوان کھلم کھلا، ادھیڑ، بڈھے اور بوڑھے ڈر ڈر کر عشق لڑاتے ہیں۔ غزل میں جتنی شوخی اور حلاوت ہے اتنی کسی اور صنفِ سخن میں نہیں۔ نرم گرم کیک اور جلے بھنے توس کا کیا مقابلہ!

جہاں تک اردو کی دیگر اصنافِ سخن کا تعلق ہے قصیدہ بوڑھی نائکہ کی حیثیت رکھتی ہے جب کہ مثنوی اس کی حوالہ کنواری بیٹی ہے زورِ بیان، شکوہِ الفاظ اور تخیل کی متانت کے باوجود قصیدہ عموماً بناوٹ، تصنع اور جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے۔ قصائد کے صنائع و بدائع بالوں کا خضاب، برتنوں کی قلعی، زیوروں کا ملمع، جوتوں کی پالش، فرنیچر کا وارنش دیواروں کی سفیدی اور عورتوں کا میک اپ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ مثنوی میں چھوٹی بڑی کہانیوں، قصوں اور داستانوں کو عروسِ نظم کا منقش جامہ پہنایا جاتا ہے اس کی بحر بھی ننھی منی، چھوٹی موٹی اور پیاری پیاری سی ہوتی ہے۔ رباعی مثانی جوگن ہے۔ عمر کے لحاظ سے یہ چاہے کمسن ہو، چاہے جوان، چاہے ادھیڑ ـــــ تاہم اس کی فکر و نظر کا انداز قطعی بڑھا ہوتا ہے۔ رباعی عموماً دل و دماغ "قبل از وقت پختگی" کا دوسرا نام ہے۔ ع کہ اے آدمی و کے پیر شدی" یا یہ "بعد از وقت" سوجھ بوجھ کے مترادف ہے۔ مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلہ خود باید زد ـــ نظم معریٰ ٹیڈی گرل کی حیثیت رکھتی ہے جس کا سب سے بڑا نصب العین مروجہ رسوم، گزشتہ روایات اور پرانے نظامِ معاشرہ سے بغاوت ہے۔ ٹیڈی گرل مادی حسن قبیح، جسمانی ظاہر و باطن اور بدنی نشیب و فراز کو ویسے ہی نمایاں کرتی ہے جیسے شوروم میں خواتین کے ملبوسات پورے اتار چڑھاؤ کے ساتھ جاذبِ نظر شکل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ گیت برہا کی ماری، سندر ناری ہے، جس کا سیاں برٹش گیانا، ٹمبکٹو جزائر ہوائی، ٹانگانیکا یا موزمبیق روزی کمانے گیا ہے۔ گیت کا فارم، اگریکلچرل فارم، ڈیری فارم اور پولٹری فارم کی طرح دیہی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ان اصناف سے ہٹ کر نظم کا دائرہ شیطان کی آنت ہے جس کا کوئی اور

نہیں۔ اس کے ڈھانچے کا گھیرا اتنا ہی وسیع ہے جتنا حیات، ممات اور کائنات کا ــــ یہاں اگر لنگور، لگڑبگا، نو ہر سنی، کرہی، کیا، آنکھ مچولی، ایڑھی بیڑھی اور غزالہ ان کا موضوع بن سکتے ہیں تو زمین و آسمان، انسان و شیطان اور اہرمن و یزداں کو بھی "صید زبوں" بنایا جا سکتا ہے۔

چڑھانے والے دیہاتیوں کے الگ ــــ محلّے، مچھلی پکانے کے خاص خاص مصالحے اور عورتوں کی ان کی اپنی بولی ہوتی ہے، اسی طرح غزل کی بھی مخصوص زبان ہے۔ شاہ غزل کے حرم میں نامحرم الفاظ کا گزر نہیں۔ اس کے مزاج کی نزاکت طبعت کی نفاست اور ذوق کی لطافت ثقیل الفاظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ کلا اگر ونڈی ہو تو پھول سے بدن والی پنہاری کمر لچک ہی جاتی ہے۔ اور تو اور پھول کا نازک ڈنٹھل بھی ہلکی پھلکی تتلی کے وزن سے جھک کر فرشی سلام کرنے لگتا ہے۔

عام بھڑکتی ہوئی غزل میں ایک پوّا "دارو" کا نشہ ضرور ہوتا ہے۔ شراب غزل مزید تند و تیز ہو تو اس میں دو آتشہ کی مستی پائی جاتی ہے۔ اخلاقی غزلوں میں بھی تلخ چائے کی سی تیزی ہوتی ہے۔ عاشقانہ غزل کے ہر مصرعے کو بھر برانڈی کا گھونٹ اور رسیلے سجیلے الفاظ کو قلقل مینا سمجھیے۔ ترنم سے پڑھنے والے شعرا اور محرّا یا تاڑی "سرو" کرنے والے ساقی ہم پلہ ہوتے ہیں۔ اساتذۂ سخن جتنی بلند فنی صلاحیت کے حامل ہوں گے اتنی ہی اچھی شراب کشید کر سکیں گے۔ شعر و شاعری کی بھٹیاں شہر شہر، محلہ محلہ اور گلی گلی میں موجود ہیں۔ انتخابی حلقے، پوسٹل ڈسٹرکٹ اور پولیس تھانے کی طرح ان کلالوں کا حیلہ بھی مدار بھی مقرر ہوتا ہے۔ ان کی تجارتی رقابت جسے وہ "شاعرانہ چشمک" کا معصوم سا نام دیتے ہیں بھونڈی سے بھونڈی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے۔ ویسے ہی جیسے طہارت خانے کے چکنے چکنے فرش و دیوار پر ناچتے مور، نغمہ سرا بلبل اور تازہ گلاب کے نقوش بنے ہوں۔

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ اردو غزل، فارسی غزل کی "پر روف کاپی" ہے۔ لیکن آگے چل کر ان دونوں میں وہی فرق ہو گیا جو پانی اور پتھر میں ہے۔ یوں تو غزل کے معنے عورتوں سے بات چیت کرنے کے ہیں، لیکن دورِ جمہوریت کی آمد آمد سے سیکڑوں برس پہلے ہی غزل گو شاعر کو مکمل آزادیٔ تحریر و تقریر حاصل رہی۔ اس نے اظہار خیالات کی آزادی سے بھرپور استفادہ کیا۔ ویسے ہی جیسے کسی قوّالی نے ہر فن بجھکڑ صاحب کی ٹکیہ خریدی اور منع کرنے پر بھی ادا شدہ قیمت کا پورا پورا مزہ اٹھانے کے لیے سالم ٹکیہ کو نوش جان فرما لیا۔ غزل میں شاعر نہ صرف معشوقہ سے مخاطب ہوتا ہے بلکہ رقیب روسیاہ، واعظ، زاہد خشک، ناصح مشفق، ہمدم دیرینہ، شیخ جی، ہمنشین، ہم صفیر، باغبان، گلچین، صیاد، پیر مغاں، ساقی، رند، محتسب ــــ ہر کسی سے گفتگو فرماتا ہے۔ ان میں سے بعض پر وہ چلتے ہوئے فقرے کستا ہے اور بعض کی عزت و احترام پرستش کی حد تک کرتا ہے۔ چند کرداروں کو وہ کبھی کبھی دولتی جھاڑتا ہے تو گاہے گاہے ان کے پاؤں دھو دھو کر پیتا ہے۔ اسی طرح جیسے بعض امیدوار الکشن کے دوران میں ووٹروں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں اور بعد میں ان کو پہچانتے تک نہیں۔

پرانے دور کے بہت سے شعرا چونکہ تصوف میں درک رکھتے تھے، اس لیے ان کے نزدیک غزل کا محبوب خدا کی

ات تھا کیونکہ صوفیہ کی رائے میں عشقِ حقیقی کے فلک نما محل کی آخری منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے عشقِ مجازی کا "الف" زیر تھا۔ عشقِ مجازی نے کئی قسم کی محبت کے دروازے کھول دیے۔ اسی دور میں امرد پرستی کو بھی بڑھاوا ملا۔ کیوں کہ ہر ان میں اصلی سکے کے ساتھ جعلی سکے بھی بازار میں آجاتے ہیں۔ چہار دیواری میں مقید پردہ نشین بتوں کے ساتھ ساتھ کھلے کوٹھوں طوائفیں بھی غزل کی ہیروئن بنیں۔ چند مقامات پر ناچنے گانے والیاں پاندان، گھنگرو اور پشواز کے ساتھ شعراء کے خیمہ ہائے میں آن دھمکیں۔ پھر تو اردو شاعری میں اسٹنٹ فلموں، عریاں فوٹو گرافی اور کوک لٹریچر کا مزہ آگیا۔ ریختی نے بھی برسرِ عام ربند ریا کا تماشہ دکھایا۔ جاگیرداری تہذیب کا شعر و سخن اور رقص و موسیقی کا شعبہ جو دراصل مگنو، آلو اور چپاڈر کی ثیت رکھتا تھا۔ اس کی آن بان، جاہ و جلال چمک دمک صرف رات کے وقت مجرے اور مشاعرے میں دیکھی جا سکتی تھی۔

صوفیائے کرام نے شاہدِ حق کی گفتگو میں شراب و مینا اور ساقی و میخانہ کا استعمال کیا ہے۔ اس نہج پر جدید دور شعرا بھی غزل کو نئے مادی تقاضوں کی تکمیل کے لیے بروئے کار لانے لگے ہیں۔ ویسے ہمارے ملک میں عورتیں اسمگلر غنڈے بھی "کوڈ" زبان رکھتے ہیں۔ مثلاً رات کے وقت عورت سانپ کو "رسی" کہے گی، جیب کترا اپنے دھندے کو ٹرٹ ایکسپورٹ کا نام دے گا، جب کہ اسمگلر سونے کی ہری کی گانٹھ کے نام سے پکارے گا۔ نئے دور کے شاعروں کے نزدیک جانان کا مطلب غمِ دوراں ہوتا ہے۔ غمِ دوراں سے مراد سامراجی سازشیں، جمہوری حقوق کی پامالی دولت کی غلط تقسیم یہ داروں کی لوٹ کھسوٹ، ناکافی تنخواہیں مکانوں کی قلت، پگڑی کا چلن، بے کاری و نیم بیروزگاری، اناج کا گھٹیا ن اور اشیائے لازمی کی مہنگائی وغیرہ ہے۔ پچھلے زمانے کا شاعر عموماً گونگے کی طرح اپنے خول میں بند تھا (ویسے عطرِ شیشی افیون ڈبیا میں اور مے بوتل میں محسوس ہوتی ہی ہے۔) اس ملا کی مسجد کوچۂ یار اور در میکدہ تھی۔ اگرچہ غزل گو شاعروں دوست و احباب کی بے وفائی دنیا کی بے ثباتی اور کہنہ حیات پر "نظرِ خوش گزرے" بھی ڈالی ہے۔ تاہم عوام کی مشکلات ائب اور مسائل سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ شاعر انعام و اکرام، وظیفہ و مشاہرہ اور رتبہ و عہدہ اکرنے کے لیے کبھی کبھی اپنی غربت و افلاس کا چلتے چلتے ذکر بھی کر دیتا تھا۔ ویسے ہی جیسے "بڑا صاحب" اچھے موڈ وتو روا روی میں چپراسیوں کی خیریت بھی پوچھ لیتا ہے۔ ماحول کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ شریفوں اور رذیلوں کے درمیان خلیج بدستور حائل رہے۔ ہر جگہ امیروں کے "شان نگر" اور غریبوں کے "سیوا نگر" کا فرق باقی تھا۔ درحقیقت اس دور مایہ، کم درجہ اور کم زور طبقوں کے حق میں آواز بلند کرنے مشرومی ہوتا جو آج کل اہلِ دول کی وکالت کا ہو سکتا ہے سکا ایک طور ہوتا ہے اور ہر عہد کا عہد ولحد بھی۔ پانچ برس کے بچے کو سیاسی لیڈر، بیس برس کے کالج اسٹوڈنٹ اور اسی برس کے بوڑھے کو دولہا بنانے کے کیا معنے!

غزل کے میدانِ کارزار کے ہیرو مسٹر عاشق بیگ، ہیروئن مس حسینہ جہاں اور ولین مسٹر مدو خاں ہیں۔ ویسے نظر میں ہیرو بھی ولین ہی ہوتا ہے۔ ہیروئن بہر حال ہیروئن ہی رہتی ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ ایک طرف مکڑی جالا تنتی ارے کیڑے کو پھانسنے کی ترکیبیں سوچتی ہے اور دوسری طرف چھپکلی غریب کیڑے پر دانت تیز کیے موقع کی

تاک میں بیٹھی رہتی ہے۔ گل وبلبل، شمع وپروانہ، لیلیٰ ومجنوں اور شیریں وفرہاد کے قصے کتنے ہی پرانے کیوں نہ ہو جائیں مگر وہ بڑھیا والی تی سوٹ کی طرح ہمیشہ نئے ہی لگتے ہیں۔ کیوں کہ مادی نقطۂ نظر سے عشق ومحبت اور حسن وجمال کی اصطلاحات دراصل جنسی وشہوانی جذبات کی ارتقائی شکلیں ہیں۔ جن والنس نے جنیات ہی کی کوکھ سے جنم لیا ہے . . .

. . . .

. . . تعلیم یافتہ، شائستہ اور بلند مرتبہ ہو جانے کے بعد جمّن میاں جمیل الرحمٰن، بدھو میاں بدیع الزماں اور کلّن میاں کلیم السبحان کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ دراصل مذہب، کلچر، اور اخلاق نے جنسیات کو "پلے بیک سنگر" کا درجہ دے کر پوری طرح زیر کر رکھا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب کسی غیر آباد علاقے میں آدمیوں کا قافلہ نیا نیا رہنے بسنے آتا ہے تو پہلے پہل جنگلوں کو صاف کرتا، پہاڑیاں کھودتا، اراضی پر ہل چلاتا، چھوٹی بڑی بستیاں بساتا اور سڑکیں کنوئیں اور تالاب بھی تیار کرتا ہے۔ اسی طرح مختلف مکاتب شاعری نے مختلف علاقہ جات میں اور مختلف نقاط نظر سے اردو غزل کے الفاظ محاورات اور تراکیب کی کانٹ چھانٹ، درستی وصفائی اور ساخت ومرمت کا کام بھی انجام دیا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہماری نائی کا استرا حجامت بناتے بناتے سر گردان اور چہرے پر زخم لگا دیتا ہے، دولت مند ماں باپ کے لاڈ پیار کے کمسن بچے کے چھوٹے سے پیٹ میں وقت بے وقت مرغن غذائیں بھرتی رہتی ہے اور ہندی کا پاٹھ شالہ، عربی مکتب یا انگریزی اسکول میں پڑھنے والا طالب علم اپنے ہی ادارے کے ماحول میں ڈھل جاتا ہے۔ چنانچہ تدریجی طور پر اس صنف شاعری میں ہندی کا رنگ ہلکا، فارسی کا آہنگ تیز اور استادی کی آواز رباب وچنگ بلند ہوتی گوکہ آج اردو غزل نے ایک نئی کروٹ لی ہے۔ اب "ترنگ نامے غزل" میں عوامی مسائل، طبقاتی کشمکش اور سماجی ناہمواری وغیرہ کا ذکر جمیل بھی ہونے لگا ہے۔ چہ پیسے ہی جیسے آوارہ لڑکا دولت مند بن جاتا ہے تو ماں باپ، بھائی بہن، سالے، بہنوئی سبھی اس کا ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔

المیہ ڈراموں، داستانوں اور فلموں میں مزاحیہ کردار ضرور رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح غزل جیسی متانت سنجیدہ صنف میں شیخ حرم، فقیہ دہر، واعظ، زاہد، ناصح، محتسب اور میر شہر جیسی ہستیاں بھی مذاق کا مضمون بنتی گئیں اور ہدف لعن طعن بنائی جاتی رہی ہیں۔ فقیہ دہر، میر شہر، شیخ، واعظ، زاہد اور محتسب تو خیر حق دشمنی، ریاکاری اور دوغلی پالیسی کے لیے بدنام تھے اور شاعروں نے انھیں جو چرکے دیے ہیں وہ حق بجانب تھے۔ مگر غریب ناصح تو گیہوں کی طرح گھن کے ساتھ بیچارہ پس گیا کیوں کہ دراصل غزل گو شاعر کلی آزادروی کا خواہاں پرانی روایات سے نفرت اور ہر قسم کی پابندیوں سے نالاں رہتا ہے۔ آبائی اعتقادی اور معاشرتی بندشیں اقتناعات اور زنجیریں اسے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ اسی طرح جیسے مینوں ایک ہی قسم کے کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے بچے کا جی اوب جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے جذبات، خیالات اور احساسات کو باغیانہ انداز

صب

میں پیش کیا اور خیر و شر کے مسلمہ نظریات پر گہری چوٹ بھی کی ہے۔ عدم تسکین کا احساس بغاوت کا جذبہ، خدا داد صلاحیت اور برتری کا تصور کسی کو غنڈہ، کسی کو ڈکٹیٹر اور کسی کو شاعر بنا دیتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ غنڈے کا دل اور قسمت دونوں تاریک ہوتے ہیں، جب کہ ڈکٹیٹر کا دل سیاہ مگر قسمت روشن اور شاعر کا دل روشن مگر قسمت گہنائی ہوئی ہوتی ہے۔

گزشتہ اور موجودہ دور میں اردو غزل پر کئی مرتبہ کڑے دن آئے اور ایسا لگا کہ وہ بہت جلد اللہ کو پیاری ہو جائے گی مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے، گینڈے اور مگرمچھ کی پیٹھ پر بھی کبھی گولیوں کا اثر ہوا ہے! جب تک عورت مرد ایک دوسرے کی طرف کشش محسوس کرتے رہیں گے اس وقت تک ان کے دل بھی محبت کے گیت گائیں گے۔ جب من کے ڈھول پر پیار کی چوٹ پڑے گی، ایک دل کی جانب دوسرے دل کی جانب سے ٹکرائے گی اور جفا پیشہ محبوب کے قلب کی چٹان کو عاشق صادق چاہت کے بارود سے بھک سے اڑا دے گا تب آواز بلند ہوگی ہی۔ جس وقت یہ زوردار دھماکہ، رگڑ یا ٹکراؤ ہوتا ہے تبھی غزل بھی وجود میں آتی ہے۔

قصہ کوتاہ اردو شاعری اور غزل میں ویسا ہی اٹوٹ رشتہ قائم ہے، جیسا تنے اور چھال، بدن اور کھال، تجارت اور مال، مہینے اور سال، مچھیرے اور جال، چڑیا اور بال، سیاست اور چال، طبلے اور تال، قوالی اور حال کے درمیان موجود ہے۔

فی الحال سنجیدہ ماڈرن غزل میں کئی ارباب ذوق نئے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس صنف سخن میں فلاں پارک، فلاں مارکیٹ اور فلاں پل کے ساتھ ساتھ کتے کی بھوں بھوں، کوے کی کائیں کائیں اور گدھے کی ڈھینچوں ڈھینچوں جیسے الفاظ بھی استعمال ہونے لگیں تو دیکھ لینا ایک نہ ایک دن یہ ذرہ کندن بن کر رہے گا۔

اختر سعید

یہ ہم سے پوچھتے ہو رنجِ امتحاں کیا ہے
تمھیں کہو صلۂ خونِ کشتگاں کیا ہے

اسیرِ بندِ خزاں ہوں نہ پوچھ اے صیّاد
بہار کیا ہے، صبا کیا ہے، گلستاں کیا ہے

یہ اور بات ہے ہم تم کو بے وفا نہ کہیں
مگر یہ جانتے ہیں جورِ آسماں کیا ہے

نظر اٹھے تو نہ سمجھوں جھکے تو کیا سمجھوں
سکوتِ ناز یہ پیرایۂ بیاں کیا ہے

نگاہِ یاس ترے ہاتھ ہے بھرم دل کا
کہیں وہ جان نہ لیں عشق کی زباں کیا ہے

ہوئی اک عمر کہ دل کو نظر سے ربط نہیں
مگر یہ سلسلۂ چشمِ خونفشاں کیا ہے

بہیں نہ آنکھ سے آنسو تو تشنگی بے سود
کھلیں نہ پھول تو رنگینیٔ فغاں کیا ہے

مظہر امام

ساتھ بہتے ہوئے دھارے کے نہیں بہہ سکتے
میر کے رنگ میں ہم شعر نہیں کہہ سکتے

وحشتِ احساس کی زنجیر لیے پھرتے ہیں
ہم کسی شہر میں آزاد نہیں رہ سکتے

نبضِ ہستی میں ابھی تھوڑی دھمک باقی ہے
ہائے ہم لاش کو بھی لاش نہیں کہہ سکتے

جانتے ہم بھی ہیں کیا چیز ہیں احبابِ عزیز
لیکن افسوس، سرِ عام نہیں کہہ سکتے

دورِ جمہور میں ہر اک کا برابر حق ہے
ہم تری بزم میں تا دیر نہیں رہ سکتے

کیا گلستاں کو نکھاریں گے نقیبانِ بہار
اپنے گھر میں سلیقے سے نہیں رہ سکتے

شان سے چاہتے ہیں جس کو مدیرانِ شہیر
کاش ہم ایک بھی ویسی ہی غزل کہہ سکتے

سعید شہیدی

بے سبب کوئی مجھ سے خفا ہو گیا
اے خدائے محبت یہ کیا ہو گیا

دفعتاً آپ کا سامنا ہو گیا
جو نہ ہونا تھا وہ حادثہ ہو گیا

چارہ گر خود بھی محوِ دعا ہو گیا
درد شاید مرا لا دوا ہو گیا

آشیاں بن چکا بجلیاں گر چکیں
جو بھی ہونا تھا اچھا ہوا ہو گیا

جان دے دی بہر حال بیمار نے
ایک فرضِ محبت ادا ہو گیا

کون میری طرح دل میں دیتا جگہ
غم مرے بعد بے آسرا ہو گیا

کوئی میرے تصور میں آکر سعید
یہ سمجھتا ہے وعدہ وفا ہو گیا

میرزا عزیز جاوید

مفلس ہے یہ شخص کہ عاشق بجلی کے فانوس تلے
جانے کیا سوچا کرتا ہے تنہا بیٹھا رات گئے

تنہائی نے رنگ بکھیرے کیسے کیسے شام ڈھلے
تاریکی کے دشت و جبل میں اجیالوں کے پھول کھلے

کچی نظروں والے گاہک یوں تو ہر ہر گام ملے
ہم نے خود اصنامِ ہنر پر (چپ) کے پردے ڈال دیئے

دل کے کان کے پردے سُن ہیں بیٹا آنکھیں کھل کے بند
اپنا حال دکھائیں کس کو اپنی باتیں کون سُنے

رنگِ حنا شرمائے جس سے سورج اپنی آنکھ چرائے
ایسے دیپ جلائے ہم نے دل کے وہ وہ رنگ گئے

دل کی دھڑکن کا ساز ہوئی ہے رات کے سناٹے نغمے
یادِ کسی کی چھب دکھلائے سانسوں کے گھنگرو بجے

ہاں وہ دامن نور لٹائے رہتی دنیا تک یارو
دکھ سکھ کی یادوں کے موتی ہم نے جس میں ٹانک دیئے

لہجے اور الفاظ کا جادو ہو جاتے مسحور عزیز
تنہائی میں خاموشی سے خاموشی جب بات کرے

اقبال ماہر

محفل کاہکشاں ہو تو غزل ہوتی ہے
چاندنی رات جواں ہو تو غزل ہوتی ہے

نغمۂ عصر رواں ہو تو غزل ہوتی ہے
عشق روداد جہاں ہو تو غزل ہوتی ہے

خود پرستی تو بڑی چیز ہے لیکن اے دوست
غم حدیث دگراں ہو تو غزل ہوتی ہے

آرزو جب دل نازک کی سبک ترین کر
صنعت شیشہ گراں ہو تو غزل ہوتی ہے

دور اک گوشۂ گردوں سے ابھرتا ہو ہلال
دل میں ابرو کی کماں ہو تو غزل ہوتی ہے

رت میں برسات کی جب قوس قزح پر لے دل
شورش آنچل کا گماں ہو تو غزل ہوتی ہے

دل ہو یا دل میں مچلتی ہوئی امید وفا
آتش غم میں تپاں ہو تو غزل ہوتی ہے

میرا موضوع سخن رنگ بہاراں ہی نہیں
گل بھی تاراج خزاں ہو تو غزل ہوتی ہے

دل جواں ہو تو مچلتی ہے تمنا دل میں
جب تمنا بھی جواں ہو تو غزل ہوتی ہے

آنکھ میں خواب لیے لب پہ بے تاب لیے
حسن مائل بہ فغاں ہو تو غزل ہوتی ہے

حسن نازک بدناں لالہ رخاں سیم تناں
پرتو ماہ وشاں ہو تو غزل ہوتی ہے

مرغزاروں میں سبک گام ندی کا سنگیت
جل پری زمزمہ خواں ہو تو غزل ہوتی ہے

وصل تو دور کی آواز ہے شاید ماہر
ہجر میں یاد بتاں ہو تو غزل ہوتی ہے

شارق میرٹھی

جب فروزاں ہوئے اشکوں کے چراغ
مل گیا منزل جاناں کا سراغ

دیر تھی ان سے نظر ملنے کی
جل اٹھے دل میں مرے لاکھوں چراغ

پھونکنے والے نشیمن میرا
کہیں اس آگ سے جل جائے نہ باغ

کوئی کیا جانے تری محفل میں
دل سلگتے ہیں کہ جلتے ہیں چراغ

خیر ہو تیرے کرم کی ساقی!
ابھی خالی ہیں غریبوں کے ایاغ

زندگی کیا ہے یہ اس سے پوچھو
جس نے آندھی سے جلائے ہیں چراغ

غم کے جھونکوں سے کہیں اے شارق
بجھنے والا ہے محبت کا چراغ

صابر شاہ آبادی

راحتِ جاں کا وعدۂ مبہم
شوق کو ترسانے کا عالم
جانِ حیا سے شوخیٔ موسم
جسمِ جواں پیراہن پُرنم
دیکھ رہا ہے کفِ تبسّم
بہکے ہوئے ایمان کا عالم!
پیشِ تصوّر۔ جانِ حیا کا
دعویٰ پروا، درہم برہم
چست قبا میں حُسنِ فراواں
روکے ہوئے طوفان کا عالم
غنچہ و گُل کی پردہ دری کیا!
"ذوقِ صبا" ہر چند مسلّم
ہوش کی قیمت پوچھ رہا ہے
جام بکف وہ شعرِ مجسّم
زلف کی گستاخی سے نمایاں
عارض کی وہ سرخیٔ کم کم
"موسمِ گُل" صابر کی نظر میں
ایماں کی تعطیل کا موسم

شکیب ایاز

اے شبِ ہجر! تری راہ میں ہم کیا نہ بنے
حسن کی شمع بنے، عشق کا پروانہ بنے

زندگی اتنی زیاں کار ہے معلوم نہ تھا
سیکڑوں شہرِ تمنّا تھے جو ویرانہ بنے

ظلمتِ شب میں جلاتے رہے زخموں کے چراغ
صبح آئی تو ہم ہی رات کا افسانہ بنے

کتنے شعلے تھے جو دل ہی میں ہوئے سرد شکیب
کتنے آنسو تھے جو قطرہ رہے دریا نہ بنے

رشید اثر

ہر طرف گلستاں میں چھایا ہے سناٹا
شبنمی گلابوں کو ڈن کے ناگ نے کاٹا

خامشی کے پردے میں رحمتوں سے کہتا ہوں
زندگی کے سودے میں مجھ کو اس قدر گھاٹا

شہر بس تو سکتے ہیں زیست ہنس تو سکتی ہے
لیکن اس کا حاصل بھی اک مہیب سناٹا

سرخیٔ شفق یارو، لعل اگلنے والی ہے
غم نہیں جو تاروں کا، صبح نے لہو چاٹا

شب یہ زہر پی لے گی چھپ کے میری نظروں سے
چاند کی شعاعوں میں گھل رہا ہے سناٹا

غرق ہو گئے ہوتے راستوں میں یہ رہبر
ہم نے اپنی لاشوں سے ہر خلیج کو پاٹا

واحد پریمی

راہرو چپ ہیں راہبر خاموش
کیسے گزرے گا یوں سفر خاموش

کوئی ہنگامۂ حیات نہیں
رات خاموش ہے سحر خاموش

کیسی بیمارِ غم کی حالت ہے
کیوں کھڑے ہیں یہ چارہ گر خاموش

زندگی کو کہاں تلاش کریں
کوچہ کوچہ نگر نگر خاموش

بزم میں وہ خموش کیا ہوں گے
ہو سکے جو نہ دار پر خاموش

کیا پرستارِ حسن کوئی نہیں
کس وجہ سے ہیں بام و در خاموش

زخم پھولوں کے کون اب دیکھے
اہلِ دل چپ ہیں دیدہ ور خاموش

کس سے دادِ سخن ملے واحد
ہوں اگر صاحبِ نظر خاموش

احمد رئیس

پھول مانگے ہے نہ یہ شمس و قمر مانگے ہے
آدمی نانِ جویں کے لیے زر مانگے ہے

تو کہاں ہے مرے معبود مری بھی سن لے
دل کی ہر ایک دعا اپنا اثر مانگے ہے

دل کو تسکیں ہے ترے سایۂ گیسو میں مگر
دیدۂ شوق تو رخسارِ سحر مانگے ہے

جگمگاتا ہے پھر آنکھوں میں سوادِ محبوب
زندگی مجھ سے نیا عزمِ سفر مانگے ہے

چاند تاروں سے پرے ہے مرے خوابوں کا جہاں
وہ حسیں دیس جو ہر نوعِ بشر مانگے ہے

ضوفگن ہے رخِ ہستی میں ہمارا پرتو
تابشیں ہم سے زمانے کی نظر مانگے ہے

مجھ سے ملتا ہے مرا یار کچھ اس طور سے اب
جیسے وہ پیار کا قرضہ مرے سر مانگے ہے

زاہد کمال

شعورِ درد نہ بڑھے، حسنِ کائنات بڑھے
رہِ حیات میں دنیا جو مرے ساتھ بڑھے

الجھ رہے ہیں فسانوں کے پیکروں میں دماغ
بڑھے تو کیسے بھلا رونقِ حیات بڑھے

فصیلِ ظلم نہ ڈھا دیں کہیں، اسی ڈر سے
ہمارے تیشوں کی جانب ہزاروں ہات بڑھے

چمک سی آگئی یادوں کے آبگینوں میں
یقینِ صبحِ سلامت، کچھ اور رات بڑھے

مٹانے "دیر و حرم" کا اثر دماغوں سے
تری گلی کی طرف ہم جنوں صفات بڑھے

لہو ٹپکنے لگا آبلوں کی چھاگل سے
رہِ حیات میں کچھ اتنے حادثات بڑھے

اسی لیے ترے جلووں کا ذکر چھیڑا ہے
کہ اہلِ فکر کا ذوقِ جمالیات بڑھے

سکندر محسن

زلفِ پیچاں کی بات نکلی ہے
پھر کہ زنداں کی بات نکلی ہے

آؤ اے اہلِ غم ادھر آؤ
مہرِ تاباں کی بات نکلی ہے

جب بھی ٹوٹا ہے آس سے رشتہ
یاس و حرماں کی بات نکلی ہے

ہم سے شورش ہے موجِ دریا میں
ہم سے طوفاں کی بات نکلی ہے

ذکر آیا ہے جب بھی پھولوں کا
روئے جاناں کی بات نکلی ہے

چاند تاروں کی بزم میں محسن
صبحِ خنداں کی بات نکلی ہے

ساحل مانک پوری

زندگی ایک خطا ہو جیسے
موت جینے کی سزا ہو جیسے

یوں گلستاں میں دھواں اٹھتا ہے
آشیاں کوئی جلا ہو جیسے

آپ کے عارضِ تاباں کا جمال
کوئی غنچہ سا کھلا ہو جیسے

موسمِ گل میں بہاروں کا سماں
تیری معصوم ادا ہو جیسے

کیفیت دل کی نہ پوچھو ساحل
کوئی بجھتا سا دیا ہو جیسے

ہریشچندر دکھیؔ

یہ ہے آئینِ محبت نہ بیاں تک پہنچے
راز وہ راز نہیں ہے جو زباں تک پہنچے

توڑ کر ضبط کی دیوار کہاں تک پہنچے
راز جو دل میں نہاں تھے وہ زباں تک پہنچے

رسم کہنہ ہی سہی دار و رسن کی لیکن
چاہنے والے ترے دیکھو کہاں تک پہنچے

چشمِ بینا جو پریشاں ہے حیراں دانش
زخم کھا کھا کے یہ دل والے کہاں تک پہنچے

فہم سے دور ہے اندازِ مشیت ناداں
فلسفی تری نظر چاہے جہاں تک پہنچے

یوں تو ہر چیز کی دنیا میں حدیں قائم ہیں
حدِ تخیل کی نہیں چاہے جہاں تک پہنچے

ہو گیا حل مری ہستی کا معمہ دکھیؔ
جب ملا اپنا نشاں اس کے نشاں تک پہنچے

فیض الحسن خیالؔ

تلاشِ نور میں شمعیں بجھائے بیٹھے ہیں
کرم کی آس میں ہم غم چھپائے بیٹھے ہیں

کسے خبر تھی کہ بجلی کی تھی اسی پہ نظر
وہ شاخ جس پہ نشیمن بنائے بیٹھے ہیں

یہ دل زدوں کا مذاقِ نیازمندی ہے
جہاں ملے وہیں دعوے بنائے بیٹھے ہیں

فغاں نصیب مزاجوں کا حوصلہ ہی کیا
وہ اہلِ ظرف ہیں جو غم چھپائے بیٹھے ہیں

ہمارے ظرف سے شرما نہ جائیں سنگ گراں
دلِ شکستہ کو شیشہ بنائے بیٹھے ہیں

زمیں کوئی بھی مشکل نہیں غزل کے لیے
ہر اک زمیں کو گلستاں بنائے بیٹھے ہیں

سخن شناس نہیں ہے خیالؔ جانِ غزل
وگرنہ ہم بھی وہ طوفاں اٹھائے بیٹھے ہیں

سومرسٹ ماہم
ترجمہ:- کرنل حمایت علی بیگ

دعوت

کھیل زوروں پر چل رہا تھا کہ میری نگاہ اس پر پڑی۔ اس نے اشارے سے مجھے بلایا۔ جب کھیل تھوڑی دیر کے لیے رکا تو میں جا کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ مجھے اس سے ملے ہوئے کئی سال ہو چکے تھے اور اگر اس کا نام بتایا جاتا تو شاید میں اسے پہچان بھی نہ سکتا۔ وہ بڑی مسرت سے مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"کہیے کیا حال ہے۔ کتنے برس ہو گئے ہم کو ملے۔ کیسے دن گزر جاتے ہیں۔ اب ہم دونوں کو ہی دیکھیے کیا حال ہو گیا ہے ہمارا۔ ہماری پہلی ملاقات یاد ہے آپ کو؟ آپ نے مجھے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی تھی۔"

ہاں صاحب! مجھے خوب یاد تھی وہ دعوت میں بھلا اسے بھول سکتا ہوں!

یہ بیس برس پہلے کی بات ہے، ان دنوں میں پیرس میں چھوٹے چھوٹے دو کمروں میں رہا کرتا تھا، کمروں کی کھڑکیاں کھولتا تو سامنے قبرستان ہی قبرستان نظر آتا تھا۔ کماتا اتنا تھا کہ بمشکل خرچ پورا ہوتا تھا۔ اس نے میری ایک کتاب پڑھی تھی اور کتاب کے بارے میں مجھے لکھا تھا۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے خط کا جواب دیا۔ تھوڑے دنوں بعد اس کا ایک اور خط آیا کہ وہ پیرس سے گزر رہی ہے اور مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے لیکن جمعرات کے روز دوپہر میں ہلکا سا دوپہر کا کھانا میں اسے "فیوٹ" ریستوران میں کھلا دوں، کھانے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوں گی۔ خط پڑھ کر میں تھوڑی دیر کے لیے جھجکا۔ "فیوٹ" وہ ریستوران ہے کہ جس میں پیرس کے رئیس کھانا کھاتے ہیں۔ وہاں کھانا کھانا تو کجا میں نے کبھی اس طرف سے گزرنے کا خیال بھی نہ کیا۔ لیکن اب کیا کرتا۔ میری عمر اس وقت ایسی تھی کہ جس عمر میں عورت کی کسی بات کا انکار نہیں کیا جاتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ عورتوں کی باتوں کا انکار کرنا لوگ اس عمر میں سیکھتے ہیں کہ جب ان کا عورت کو کچھ کہنا نہ کہنا دونوں برابر ہیں! میرے پاس اس وقت اسی فرانک تھے جو مہینے بھر کے لیے بمشکل کافی تھے۔ پھر بھی میں نے خیال کیا کہ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے اور ایک ہلکے دوپہر کے کھانے پر زیادہ سے زیادہ پندرہ فرانک خرچ ہوں گے۔ اگر میں دو ہفتے کے لیے کافی پینا چھوڑ دوں تو کام چل جائے گا۔

میں نے اس کے خط کے جواب میں لکھا کہ میں اس سے جمعرات کے روز دوپہر میں ساڑھے بارہ بجے "فیوٹ" رستوراں میں ملوں گا۔ میں نے جو اندازہ لگایا اس سے اس کی عمر زیادہ نکلی۔ دیکھنے میں بھی اس کا اثر تو پڑتا تھا لیکن وہ کچھ خاص دیدہ زیب دل فریب نہیں تھی بظاہر اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ عورت اس عمر میں ایک خاص کیفیت تو پیدا کر سکتی ہے لیکن ایسی بھی نہیں کہ کوئی اس کو دیکھ کر وارفتہ ہو جائے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے منہ میں چوڑے چوڑے سفید دانت ذرا ضرورت سے زیادہ ہیں۔ وہ باتیں بہت کر رہی تھی لیکن چونکہ زیادہ تر وہ میرے ہی بارے میں باتیں کر رہی تھی تو ظاہر ہے مجھے اچھا معلوم ہو رہا تھا۔

جب کھانوں کی فہرست سامنے آئی تو میں چونک پڑا۔ کھانوں کی قیمتیں میری توقع سے زیادہ درجے کی ہوتی تھیں لیکن فوراً اس نے ایسی بات کہی جس سے مجھے قدرے اطمینان ہو گیا۔

"میں دوپہر میں کچھ کھاتی ہی نہیں۔"

"ارے ایسا: کہیئے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کچھ تو شوق فرمائیے"

"میں ہمیشہ صرف ایک چیز کھاتی ہوں۔ لوگ آج کل خواہ مخواہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھاتے ہیں۔ ہاں تھوڑی سی مچھلی اگر ہو۔ ۔ ۔ کیا ان کے پاس سامن مچھلی ہوگی۔"

سچ پوچھیے تو سامن کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا تھا غالباً اسی وجہ سے کھانوں کی فہرست میں اس کا کہیں ذکر نہیں تھا پھر بھی میں نے اتفاقاً ویٹر سے پوچھا۔

"کیوں بھئی سامن مچھلی مل سکے گی؟"

"اتفاق کی بات ہے صاحب ابھی ابھی ایک تازہ سامن مچھلی آئی ہے۔ یہ اس موسم کی پہلی مچھلی ہے۔

"ہے تو پھر لاؤ" میں نے ویٹر سے کہا۔

اس پر ویٹر نے پوچھا مچھلی پکنے تک کیا آپ کچھ کھائیں گے

"نہیں" میرے مہمان نے کہا "میں ہمیشہ صرف ایک چیز کھاتی ہوں۔ ہاں اگر یہاں کیویار ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "کیویار" سے میں انکار نہیں کر سکتی۔"

یہ سن کر دل کے پاس مجھے دو ایک جھٹکے سے محسوس ہوئے۔ مجھے معلوم تھا کہ کیویار کے دام ادا کرنا میرے بس کی بات نہیں لیکن میں اسے یہ کیسے بتاتا۔ میں نے ویٹر سے کہا کہ کیویار ضرور لائیے۔ میں نے اپنے لیے فہرست پر جو چیز سب سے زیادہ سستی تھی یعنی مٹن چاپ منگوایا۔ ۔ ۔ !

"آپ گوشت نہ کھایا کریں۔" اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حکم دیا۔ "ایسی دیر ہضم چیزیں کھانے کے بعد آپ کام کیسے کر سکتے ہیں۔ معدہ پر زیادہ بار ڈالنا اچھا نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کھانے کے ساتھ پیا کیا جائے۔

"میں دوپہر کے کھانے کے ساتھ کچھ نہیں پیتی۔" اس نے کہا۔

"میں بھی نہیں پیتا" میں نے جلدی سے کہا

"ہاں سفید وائن اگر ہو" اس نے اس طرح بات کو جاری رکھا کہ جیسے میں نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔ "یہ فرانسیسی وائن بڑی ہلکی ہوتی ہے اور ہاضمہ کے لیے بہت اچھی ہوتی ہے۔"

"تو پھر کیا پیجیے گا؟" میں نے میزبان کا فرض ادا کرتے ہوئے پوچھا۔ لیکن ایسا محسوس ہوا کہ الفاظ برابر ادا نہیں ہو رہے ہیں۔ اس نے تقریباً اپنے پورے کے پورے سفید سفید چوڑے دانت دکھا کر کہا۔

"میرے ڈاکٹر کا حکم ہے کہ میں سوائے شامپین کے اور کچھ نہ پیوں۔"

میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگی تارے ناچنے لگے میں نے آدھی بوتل شامپین لانے کے لیے کہا اور ساتھ ہی ساتھ بمشکل اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس کو بتایا کہ میرے ڈاکٹر نے شامپین پینے کی سخت ممانعت کی ہے۔

"تو پھر کیا پئیں گے آپ؟"

"پانی"

اس نے کیویار کھایا، سامن کھائی اور بڑے اطمینان سے آرٹ اور ادب پر گفتگو شروع کر دی اور میں یہ سوچتا رہا کہ مجھے بل کتنے کی ادا کرنی پڑے گی۔

جب میرے لیے مٹن چاپ آیا تو اس نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ دوپہر کو کھانا زیادہ کھاتے ہیں۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ آپ میری طرح صرف ایک چیز کھانا شروع کر دیجیے، پھر دیکھیے آپ اپنے کو کیسا ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہیں۔ ذرا بھی گرانی نہیں ہوتی۔"

"دیکھ لیجیے میں بھی تو صرف ایک ہی چیز کھا رہا ہوں" اتنے میں وہ کمبخت ویٹر پھر کھانوں کی فہرست سامنے لایا۔

میری مہمان نے بڑی بے پرواہی سے اس کو ایک طرف ہٹا دیا۔

"نہیں نہیں میں دوپہر میں کچھ نہیں کھاتی۔ بس ایک دو نوالے اور وہ بھی محض اس لیے کہ اس بہانے بیٹھ کر آپس میں باتیں کی جائیں۔ نہیں جی میں اب کچھ نہ کھاؤں گی۔ ظاہر ہے کہ تمھارے پاس بڑی سائز کے "اسپیرے گس" تو نہ ہوں گے بغیر وہ کھائے پیرس سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

میرا دل بیٹھ گیا۔ میں نے یہ "اسپیرےگس" دکانوں میں دیکھے تھے۔ بہت مہنگے تھے۔ انھیں دیکھ کر اکثر میرے منہ میں پانی آیا کرتا تھا اور ان کے لیے میں ترستا تھا۔

"میڈم پوچھ رہی ہیں کہ تمھارے پاس بڑی سائز کے اسپیرےگس ہیں؟"

میں نے اپنی پوری ذہنی قوت اس سوال پر صرف کر دی کہ اس کا جواب انکار میں ملے۔ بجائے انکار کے ویٹر کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ نہ صرف بڑی سائز کے "اسپیرے گس" ہیں بلکہ وہ اتنے بڑے اتنے ملائم اور

ایسے مزے دار ہیں کہ پیرس بھر میں کہیں اور نہ ملیں گے۔"

"مجھے بالکل بھوک نہیں ہے" میرے مہمان نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر آپ کا اصرار ہے تو میں تھوڑے سے کھا لوں گی۔"

میں نے ویٹر سے صرف اپنے مہمان کے لیے "اسپیرگس" لانے کے لیے کہا۔

"آپ نہیں کھائیں گے؟"

"نہیں۔ میں کبھی اسپیرگس نہیں کھاتا۔"

"ہاں بعض لوگ ہیں جو یہ پسند نہیں کرتے۔ بات یہ ہے کہ آپ نے گوشت اور جانے کیا کیا الابلا کھا کر اپنے منہ کا مزہ خراب کر لیا ہے۔"

ادھر اسپیرگس تیار ہو رہے تھے اور ادھر میری حالت دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اس کی فکر نہیں تھی کہ مہینہ بھر مجھ پر کیا گزرے گی بلکہ وحشت اس سے ہو رہی تھی کہ بل بھی ادا کر سکوں گا یا نہیں۔ فرض کیجئے دس فرانک کم پڑے تو میں کروں گا کیا۔ اپنے مہمان سے مانگ کر ذلیل ہوا۔ یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے پاس جتنی رقم تھی اس کا علم تو مجھے پوری طرح سے تھا اور اگر بل اس سے زیادہ کی آئی تو میں نے تہیہ کر لیا کہ جیب میں ہاتھ ڈال کر تعجب سے کہوں گا کہ "ارے! کسی نے میری پرس اڑا دی!" اور اگر اس کے پاس بھی بل ادا کرنے کو رقم نہ ہوئی تو؟ اب اس کے سوا چارہ ہی نہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو میں اپنی گھڑی ریستوران میں یہ کہتے ہوئے چھوڑ دوں کہ میں رقم ادا کر کے گھڑی لے جاؤں گا۔

"اسپیرگس" پک پکا کر آئے۔ میں نے غلط کہا پہلے ان کی خوشبو آئی۔ گرم گرم پگھلے ہوئے مسکے کی سوندھی سوندھی خوشبو جس سے میرے منہ میں پانی آنے لگا اور جیسے ہی ویٹر نے ڈش لا کر میز پر رکھی میرے منہ میں اتنا پانی بھر گیا کہ مجھے اپنا رومال منہ سے لگا لینا پڑا۔ پھر صاحب میں نے اپنے اب بالکل بے پرواہ مہمان کو وہ لذیذ ترین "اسپیرگس" کھاتے ہوئے دیکھا۔ ایک ایک کر کے وہ اتنی آسانی سے اس عورت کے منہ میں داخل ہو کر حلق سے نیچے اتر رہے تھے کہ میرے لیے اس عورت کے چہرے پر پیدا ہونے والے لذت کے آثار اور خود اپنی جانکنی کی کیفیت بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ لطف یہ کہ اس دوران میں مجھے کچھ نہ کچھ تو باتیں کرنا ہی تھیں اس لیے میں پیرس میں ڈرامے کے عنوان پر رک رک کے گفتگو کرتا رہا۔ بالآخر وہ سارے "اسپیرگس" میرے مہمان کے پیٹ میں پہنچ گئے۔

"کافی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں صرف ایک آئسکریم اور کافی"

میں نے کہا اب جو ہو سو ہو اس لیے اپنے لیے بھی کافی منگوائی اور مہمان کے لیے آئسکریم اور کافی۔

"میں ہمیشہ ایک بات کا ضرور خیال رکھتی ہوں" اس نے آئسکریم کھاتے ہوئے کہا۔ "کھانے کے بعد اس طرح اٹھنا چاہیے کہ تھوڑی سی بھوک باقی رہے۔"

"ابھی آپ کو بھوک ہے؟" میں نے کمزور آواز میں پوچھا۔

"نہیں نہیں مجھے بالکل بھوک نہیں ہے اس لیے کہ میں دوپہر کا کھانا کھاتی ہی نہیں۔ میں صبح ایک کپ کافی پیتی ہوں اور پھر صرف رات کو کھانا کھاتی ہوں۔ دوپہر میں صرف ایک چیز بالکل ہلکی سی اور بس۔ میں آپ سے یہی کہہ رہی تھی۔"

"اچھا تو میری بات کہہ رہی ہیں آپ میری بالکل فکر نہ کریں۔"

میں نے یہ کہا ہی تھا کہ ایک عذاب نازل ہوا۔ ہم کافی کا انتظار کر رہے تھے کہ ویٹر ایک بڑی ٹوکری میں بڑی بڑی "پیچز" لے کر آیا۔ ان پر ایک معصوم لڑکی کی گلابی رنگت تھی اور نظر پڑتے ہی جی چاہتا تھا کہ ایک کر اٹھا لوں۔ مگر یہ "پیچز" کا موسم ہی نہیں تھا۔ خدا جانے ان کی قیمت کیا تھی۔ مجھے ان کی قیمت فوراً معلوم ہو گئی کیوں کہ باتیں کرتے کرتے میرے مہمان نے ایک "پیچ" اٹھا لی "آپ نے خواہ مخواہ کیا کیا کھا کر اپنا پیٹ بھر لیا" . . . . . یہ اشارہ تھا میرے اس چاپ کی طرف . . . . اور اب آپ کچھ نہیں کھا سکتے لیکن میں نے چونکہ ہلکا سا کھانا کھایا ہے اس لیے اب بڑے مزے سے "پیچ" کھا رہی ہوں۔"

ویٹر بل لے کر آیا۔ میری اوپر کی سانس نیچے اتری اور اپنی پوری پرس خالی کرنے پر ایک معمولی سی "ٹپ" میں ویٹر کو دے سکا۔ جب اس "ٹپ" پر میرے مہمان کی نظر پڑی تو اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ مجھے بڑا کنجوس خیال کرتی ہے۔ جب میں ریستوران کے باہر نکلا ہوں تو پورا مہینہ میرے سامنے تھا اور میری جیب — خالی!

"آپ میرے اصول پر عمل کیجیے" اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "اور دوپہر کے کھانے میں صرف ایک چیز کھایا کیجیے۔"

"میں اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہوں" میں نے جل کر جواب دیا "میں آج رات کو کچھ نہیں کھاؤں گا"

"بڑا مزاح ہے آپ کے مزاج میں" اس نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا "بڑی شگفتہ طبیعت پائی ہے آپ نے۔ اچھا پھر ملیں گے۔"

لیکن آخر مجھے بدلہ مل گیا۔ میں کینہ پرور آدمی نہیں ہوں لیکن جب ہم سے بالاتر قوتوں کو مذاق سوجھتا ہے تو لطف اٹھانے میں کیوں تامل کریں۔

آج اس کا وزن کم سے کم چار من ہوگا۔

قیصر تمکین

ان کہی

روہنی جب اسکول سے واپس آئی تو اس نے دونوں بھائیوں کو چپ اور گم سم بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کو ان دونوں کی اسی حالت پر بڑا ترس آیا اگر کوئی اور وقت ہوتا تو وہ جا کر دونوں کے گلے لگ جاتی اور پوچھتی کہ آخر کیا وجہ ہے۔ چپ کیوں ہو بھئی "۔ مگر اس وقت ان دونوں کی خاموشی کی وجہ وہ سمجھ گئی۔

پھر کہیں سے کوئی رشتہ نامنظور ہو گیا ہوگا۔

بابڑی بدقسمت میں پیدا ہوتے ہی مرکیوں نہ گئی، کتنی محبت اور مشکل سے دونوں بھائیوں نے اس کو پالا تھا وہ ہی دونوں اس کے لیے ماں باپ کے برابر تھے کیوں کہ اس نے کبھی اپنے ماں باپ کی صورت نہ دیکھی تھی۔

وہ دونوں بڑی محبت اور ارمان سے روہنی کی ہر خواہش پوری کرتے دونوں بھائیوں میں اکثر اس بات پر جھگڑا بھی ہوتا کہ بہن پر کس کا حق زیادہ ہے اگر کبھی وہ بیمار ہوتی تو دونوں بڑی تندہی سے اس کی تیمارداری کرتے اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے۔

لیکن اب وہ دونوں بھائیوں سے دور ہو چکی تھی وہ بہت بڑی ہو گئی تھی اور خود اپنے ہی سے شرماتی رہتی تھی۔ بھائیوں سے لپٹ کر ہنسی مذاق کرنے کا زمانہ جیسے بالکل ہی بھولی ہوئی بات بن چکا تھا۔ وہ اب سر جھکا کر آنگن میں چلتی اور بڑے خلوص سے بھائیوں کی خدمت کرنا چاہتی اب سمجھ آنے پر اس کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو یہی تھی کہ کسی طرح بھائیوں کو اس کی وجہ سے کوئی تکلیف نہ ہو۔ بہن کے ساتھ دونوں بھائیوں کی اس بے پناہ محبت پر روہنی کی سہیلیاں اکثر اس پر رشک بھی کیا کرتیں۔

لیکن روہنی کی کوششوں کے باوجود دونوں بھائی اب ہر وقت صرف اسی کی وجہ سے فکرمند رہا کرتے تھے اور وہ سمجھ گئی تھی کہ جان سے زیادہ پیار کرنے والے بھائی اب اس کو جلدی سے جلدی گھر سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے تھے۔ پر میں کیوں جاؤں کسی کے گھر "۔ میں تو دونوں بھیّن کی سیوا کروں گی "۔ اور جب وہ یہ سب باتیں نہ سمجھ سکتی تو پھر بیاہ کی رسم ہی کو برا سمجھنے لگتی۔

دنیش اور رمیش دونوں بہن کو اپنی اوقات سے بڑھ کر جہیز دینے کو تیار تھے ایک ہی آدھی تھی وہ

یہی دونوں کی دعا ہے۔ مگر لڑکا کوئی ہاتھ ہی نہیں آتا۔

بڑا بھائی دنیش کوآپریٹو بنک میں کلرک تھا اور چھوٹا بھائی رمیش ایک اخبار کے دفتر میں پروف ریڈر۔ دونوں نے کبھی اپنے کوئی شوق پورے نہیں کیے۔ دونوں کی عمریں اچھی خاصی تھیں مگر دونوں کو کبھی اپنی شادی کا خیال نہ آیا محض اس وجہ سے کہ بہن موجود تھی۔

روشنی اب بارھویں درجے میں پڑھ رہی تھی۔ شادی کے قابل تھی اور دونوں بھائی اس کے لیے بر کی تلاش میں تھے۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ ایک اچھا لڑکا ہاتھ آگیا۔ اس نے دونوں کے گھر میں آکر چائے پی اور بڑی ناقدانہ نگاہوں سے روشنی کو دیکھا۔ یہی صرف ایک ایسا لڑکا ملا تھا جو زیادہ پڑھا لکھا نہ ہونے کے سبب بھاری جہیز اور نقدی نہیں مانگ رہا تھا۔ مگر وہ بھی نہ پھنسا۔ اس نے ایک عجیب بات بتائی۔

"ویسے تو سب ٹھیک ہے۔ مگر بچی او سب معاملہ ڈھیلا ہے۔"

دونوں بھائیوں نے جب ایک تیسرے آدمی کے ذریعہ یہ جملہ سنا تو سن سے رہ گئے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کچھ عجیب بات تھی کہ کچھ کہہ بھی نہ سکے۔

روشنی کا جسن کمی کی طرف سے اس لڑکے نے اشارہ کیا تھا اس پر ابھی تک دونوں نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

"اچھا کیا ہوتا" انھوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کیا اور چپ ہو گئے۔

جو بات کہی نہیں جاتی شاید وہی سب سے زیادہ آسانی سے عام ہو جاتی ہے۔ روشنی کے بارے میں بھی اس کے رشتے سے پہلے یہ بات کسی نہ کسی طرح انجانے اندان کے لفظوں میں لڑکے والوں تک پہنچ جاتی۔

رمیش نے اپنے اخبار کے دفتر میں ایک کم عمر اور ہم ذات لڑکے برجو ناتھ کے بارے میں بات چیت کی۔ برج موہن جو شخص گفت و شنید کر رہا تھا اس نے لڑکے کی آمادگی کا اظہار کیا۔ لڑکا انٹرمیجیٹ پاس اور بی ایس سی فیل تھا اس کی تنخواہ صرف ایک سو بیس روپے تھی اس لیے اس نے صرف ایک اسکوٹر سائیکل اور ریڈیو کی فرمائش کی۔ دونوں بھائی فوراً اس خواہش کی تکمیل پر رضامند ہو گئے۔

پھر برجو ناتھ نے روشنی کا فوٹو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

دنیش بہت بگڑا مگر رمیش کے سمجھانے بجھانے پر رضامند ہو گیا اس نے تصویر دینے میں کوئی خاص وجہ دیکھا سے وہ تصویر کی اچھی تھی۔

اب برجو ناتھ خود وہاں آنے والا تھا۔

وہ شام کو آئے گا اور لڑکی کو اچھی طرح دیکھے گا۔ جس طرح سے بھری منڈی میں قصائی جانور خریدتے وقت پہلے اس کو اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد ایک قطعی طور پر برجو ناتھ تعریفی یک ساتھ بیاہ پر آمادگی ظاہر کرے گا۔

لیکن وہ معاملہ تو ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ دونوں بھائی اس بارے میں فکرمند تھے کہ اب کیا ہوگا۔

دنیش نے سوچا کہ آج کل تو پلاسٹک کی بوڈیز بکتی ہیں کیوں نہ ایک لاکر بہن کو پہنا دے۔ لیکن یہ خیال خود اسے اتنا شرمناک محسوس ہوا کہ وہ اپنے پر لعنت کرنے لگا۔ پھر سوال یہ تھا کہ وہ رمیش سے یہ بات کس طرح کرتا۔

رمیش بھی اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کاش آج اس گھر میں کوئی دوسری عورت ہوتی تو شاید اس بارے میں ان دونوں کی مدد کرتی۔

دنیش نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا۔ وہ باپ کی بہن ہے شہر میں رہتی ہے مگر اس سے تو یہ کہنا گویا ناک دینے کے برابر تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ آج اگر میری بیوی ہوتی تو شاید اس کے ذریعے میں روہنی سے پلاسٹک بوڈیز خریدنے کو کہتا۔

اتنے میں روہنی دونوں کے پاس چائے کے پیالے رکھ کر چلی گئی۔ دونوں کی نگاہیں غیر شعوری طور پر اس کے سینے پر اٹھیں اور پھر وہ دونوں خود ہی نادم ہو کر ایک دوسرے سے اپنے چہرے کی کیفیت چھپانے لگے۔ دنیش نے سوچا کہ پھر وہی خود ہمت کر کے اس بارے میں گفتگو کرے مگر تھوڑی دیر میں اس کی سمجھ میں ایک اور بات آئی۔

اس نے چائے پی اور پھر خاموشی سے اٹھ کر الماری سے پرانے انگریزی رسالے نکالنے لگا۔ وہ پلاسٹک بوڈیز کا اشتہار ڈھونڈ رہا تھا۔

اس کی نظر اشتہار پر پڑی۔ تھوڑی دیر بعد وہ روہنی کے کمرے میں گیا روہنی اب کھانا بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ دنیش نے اشتہار والا صفحہ کھول کر روہنی کی میز پر رکھ دیا۔ وہ چلنے لگا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ شاید روہنی اسے نہ دیکھے اس نے پلٹ کر کچھ سوچا اور پھر اشتہار پر قلم سے ایک بڑا سا نشان بنا دیا۔

وہ یہ کام کر تو آیا مگر دیر تک سوچتا رہا کہ اس نے ٹھیک کیا کہ نہیں۔ وہ بار بار اپنے آپ پر لعنت بھیجتا اور پھر سوچتا کہ وہ پرچہ روہنی کے کمرے سے اٹھا لائے۔ مگر پھر اپنے دل پر جبر کر کے وہ اپنے دل کو بہلاتا۔ آخر اس میں کیا برائی ہے یہ تو میں نے روہنی کی اچھائی کے لیے کیا ہے۔

دنیش تھوڑی دیر گھر کے باہر چبوترے پر ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ کیوں نہ ایک بوڈیز خرید ہی لائے۔ پہلے ناتھ صبح آئے گا تب تک وہ ایک بوڈیز خرید کر روہنی کی میز پر لا کر رکھ دے۔ وہ خود سمجھ جائے گی اور جب لڑکا آئے گا تو وہ پہن کر اس کے سامنے آ جائے گی۔

دنیش اندر آ گیا اس نے دیکھا رمیش کچھ جھنجلاہٹ کے ساتھ باہر کا کمرہ صاف کر رہا تھا اور جھاڑ پونچھ میں لگا تھا۔ دنیش نے سوچا کہ پہلے چھوٹے بھائی سے اس بارے میں بات کرے۔ مگر یہ سوچتے ہی اس کو پسینہ آ گیا۔ پھر وہ بھی جھنجلا گیا کہ آخر کیا کرے۔ اس کی جھنجلاہٹ بڑھ گئی اور بڑھتی گئی کہ رات ہوتے وقت لوا آ گئی۔ اس نے آتے ہی روہنی کو گلے لگا کر اور سوئی گھر میں وہ غدر مچایا کہ دنیش اگر کچھ کر بھی سکتا تھا تو اب وہ کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔

دنیش رات بھر اپنی دونوں بھائیوں کی زندگی اور روہنی کے مستقبل کے بارے میں سوچتا رہا۔ بازار جا کر لونڈیا لانے کا خیال اس کے دماغ سے بالکل اترا نہیں — وہ چپ چاپ پڑا ہوا بظاہر سو رہا تھا مگر دراصل تمام مسئلے پر سوچ رہا تھا۔ اس کو آج پہلی مرتبہ بہن پر غصہ آیا۔ "آخر وہ اتنی معصوم کیوں ہے۔ وہ خود یہ سب باتیں کیوں نہیں جانتی ہے — کسی سے کچھ پوچھتی کیوں نہیں ہے۔"

مگر ہوا یہ کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

پریوناتھ آیا — اس کے ساتھ دو آدمی اور تھے اور شاید اس کے عزیز رہے ہوں گے۔ دونوں بھائیوں نے بڑے تپاک اور محبت سے ان لوگوں سے باتیں کیں دونوں کا لہجہ خوشامدانہ اور کچھ کچھ معذرت آمیز سا تھا کہ لڑکے والے بھی کچھ زیادہ مغرور یا خود پسند نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ مگر وہ جلد سے جلد لڑکی کو دیکھنے کے خواہش مند تھے۔

رمیش نے روہنی کو اس طرح آواز دی کہ وہ سمجھ گئی — اور تھوڑی دیر بعد وہ بہت سلیقے اور قاعدے سے چائے کی کشتی لے کر کمرے میں آگئی۔

دنیش نے فوراً ہی کہا: "روہنی یہ لوگ ہیں ہمارے دوست۔ دفتر کے ساتھی۔"

روہنی نے بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھال کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر جلدی سے ان تینوں کو نمستے کیا۔ رمیش نے کہا "چائے تم ہی بنا دو نا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ "یہ سب بھی کانگریس کی اپنی پالیٹکس ہے ہم تو ٹھہرے سرکاری نوکر۔ ہم کو کیا لینا ان باتوں سے۔"

"ہاں وہ تو ہے ہی وہ تو ہے ہی" ایک نے جواب دیا۔ مگر وہ تینوں بڑی ناقدانہ نگاہوں سے روہنی کی ایک ایک حرکت دیکھ رہے تھے شاید اگر روہنی لوہے کے کپڑے پہنے ہوتی تو ان تینوں کی نگاہیں اس لوہے کو بھی براتی ہوئی نکل جاتیں۔

رمیش نے کچھ کہنا چاہا — مگر پھر عجیب گھبراہٹ میں بولا "بھئی — چینی ذرا مجھے بڑھا دو۔"

وہ چند منٹ بڑی سخت تشویش اور بحران میں گزرے۔ روہنی ایک نیم مردہ کیفیت میں کھڑی تھی۔ پھر اچانک وہ وہاں سے چل دی۔

رمیش اور دنیش نے اطمینان کی سانس لی۔ اور پھر باتیں کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد وہ تینوں آدمی چلے گئے۔

دوسرے دن بڑی کشمکش اور پریشانی کے عالم میں رمیش دفتر پہنچا وہ لڑکے کا فیصلہ جاننے کے لیے بیتاب تھا اس نے ریڈنگ کے کمرے میں الماری کھولی اور کچھ مسودے نکالنے لگا لیکن اس اثنا میں اس نے کچھ لوگوں کو باتیں کرتے سنا — پریوناتھ اپنے ایک ساتھی سے کہہ رہا تھا: "ہاں یار — مگر مجھے پسند نہیں آتی۔ بڑی فلیٹ سی لونڈیا ہے۔"

رمیش سمجھ گیا — اس کے اوپر بجلی سی گری۔

اپنے کو سنبھالتا ہوا وہ چپ چاپ میز پر بیٹھ گیا۔ اس نے کسی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ پریوناتھ سمجھ گیا کہ رمیش نے اس کی بات سن لی ہے۔ اسے عجیب اطمینان سا محسوس ہوا جیسے وہ خود بخود کسی بڑی آفت سے بچ گیا ہو۔

جاوید لطیفی

اولاد

بیگو بی ایک سیاہ رنگ اور بھدے نقوش والی بڑھیا تھی، اس کے سر کے بال بھی تقریباً سفید ہو گئے تھے، منہ میں دانت بھی پورے نہیں تھے، صحت دیکھنے میں اچھی تھی لیکن بیگو بی اب اٹھتے بیٹھتے تکلیف محسوس کرتی تھی، وہ کہتی —

"ظاہر میں تو میں ہٹی کٹی دکھائی دیتی ہوں لیکن دراصل میرے جسم میں جان نہیں ہے — کچھ دم نہیں ہے بس اب تو دنیا سے چلے جانے کا زمانہ آ رہا ہے وہ تو میں کبھی کی مر چکی ہوتی اگر مجھے اپنی اولاد کا سہارا نہ مل جاتا"

بیگو بی اپنے وقت کی نہایت بے باک اور لڑاکو عورت مشہور تھی، اس کا شوہر رحمٰن ایک تانگہ والا تھا جسے مرے کچھ عرصہ ہو گیا تھا۔ بچپن ہی سے بیگو شریر، کھلنڈری اور تیز مزاج تھی، جوانی میں تو اس کی شعلہ مزاجی عروج پر تھی، بات بات پر جھگڑا کرنا اور گالیاں بکنا اس کا معمول بن گیا تھا، گھر کا باہر کا کوئی بھی اس کے منہ لگنا پسند نہیں کرتا تھا سب ہی اس سے ڈرتے تھے اور سامنے آنے سے کتراتے تھے۔

اس کا شوہر رحمٰن بھی کچھ کم غصہ والا نہیں تھا، خوب اچھی جوڑی ملی تھی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد ان میں جھگڑے شروع ہو گئے، لڑتے وقت دونوں میاں بیوی اتنی زور سے چیخ و پکار کرتے کہ گھر تو گھر پورا محلہ سر پر اٹھا لیتے۔ بیگو بی اس طبقے سے متعلق تھی جہاں عورتوں میں پردہ کا رواج نہیں ہے وہ اپنے شوہر رحمٰن سے برابر کی لڑائی لڑتی تھی — محلے والوں کو پتہ تھا کہ لڑائی کے وقت ان دونوں کے بیچ میں نہ آنا چاہیئے اور جب تک ان میں مار کٹائی نہ ہو جائے وہ چپ نہیں ہوتے تھے۔ بے خبری میں یا جوش میں آ کر کوئی آدمی ان کے درمیان بیچ بچاؤ کرنے آ جاتا تو گویا اس کی شامت ہی آ جاتی تھی۔ بیگو اور رحمٰن چکی کے دو پاٹ تھے، دونوں ہی سے بچاؤ کرانے والا گالیاں سنتا، پٹتا اور اپنی جان کی خیر مناتا بھاگ کھڑا ہوتا، میاں بیوی تیسرے آدمی کو بھگا کر پھر آپس میں لڑنے لگتے اور اس لڑائی کا خاتمہ یوں ہوتا کہ مارے غصے کے رحمٰن بیگو کو خوب ہی پیٹتا جو بھی اس کے ہاتھ آتا اس سے اتار اتار کر مارتا آخر بیگو ہر طرف سے چھپتی اور روتی سسکتی کسی کونے میں جا کر بیٹھ جاتی۔ مگر اس پر بھی اس کی گالیاں اس کے منہ سے نکلے بغیر نہیں رہتی تھیں سلگتی ہوئی بھٹی کی طرح جلتی ہی رہتی تھی۔

اب ہمیشہ ہوتا تھا۔ محلے والے کہتے تھے کہ جس دن جمن پیٹ بھر کے گالیاں نہ سنے اور بگو جی بھر کے نہ پیٹے ان کی روٹی ہضم نہیں ہو سکتی۔ ان جھگڑوں کا عجیب ترین لیکن خوشگوار پہلو یہ بھی تھا کہ لڑائی جھگڑے گالی گلوچ اور مار دھاڑ کے بعد تھوڑا وقت گزرتے ہی بگو اور جمن پھر آپس میں ایک ہو جاتے تھے، جیسے ان دونوں میں کبھی کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ ایسے عالم میں اگر کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ بڑی محبت والے میاں بیوی ہیں ـــــ دیکھو تو کس پیار سے بگو جمن کا بدن داب رہی ہے، اسے پانی پلا رہی ہے یا کھانا کھلا رہی ہے۔ اور جمن ـــــ جمن بھی نہایت میٹھی میٹھی نظروں سے بگو کو دیکھ رہا ہے۔ مار کے نشانوں پر ہلدی چونا مل رہا ہے اسے بازار سے لایا ہوا مٹھائی کا دونا دے رہا ہے، کاجل کی ڈبی یا مہندی کی پڑیا نذر کر رہا ہے . . . . . .

نامعلوم طور پر ان کی روزمرہ کی لڑائیاں ہی ان کی محبت کو پختگی بخشتی تھیں جس کا لوگوں کو احساس نہیں تھا۔ بعض کہتے ـــــ قدرت نے عجیب میل ملایا ہے۔ بعض یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتے کہ خدا جانے کیسے جورو مرد ہیں ابھی لڑتے ہیں اور ابھی ایک ہو جاتے ہیں ـــــ عورتیں کہتیں کہ ـــــ یہ بگو بی بڑی ہی بے شرم و بے حیا ہے کمبخت مرد سے اتنا پٹتی ہے اور پھر بھی اسی کے گن گائے جاتی ہے۔ اگر ہمیں ایسا مرد ملتا تو ہم اسے کبھی کا چھوڑ دیتے اور مرتے دم تک اس کا نام بھی نہ لیتے . . . . . اور بعض مرد یہ سوچتے کہ ـــــ یہ جمن کا بچہ واقعی بڑا ہی بے غیرت ہے: حد ہو گئی بے غیرتی کی کہ عورت کی گالیاں کھاتا، کوسنے سنتا اور بعض اوقات مار بھی کھاتا۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر، سارا محلہ تھوکتا ہے ہمیں ایسی عورت ملتی تو ایک ہی دن میں اس کی چوٹی پکڑ کر باہر نکال دیتے اور پھر کبھی گھر میں قدم نہ رکھنے دیتے . . . . . .

مرتے دم تک جمن اور بگو کی لڑائیاں ہوتی رہیں، آس پاس کے رہنے والے بھی ان کی دن رات کی دانت کل کل کے عادی ہو چکے تھے ـــــ اب دونوں بڈھے ہو چلے تھے بال بچوں والے بن چکے تھے لیکن ان کی یہ لڑائیاں بند نہیں ہوئی تھیں جمن روز رات کو سستی اور بازاری شراب پی کر آتا، بگو لڑائی کی کوئی بات چھیڑ دیتی اور پھر ایک لمبی اور اکتا دینے والی تکرار شروع ہو جاتی۔ ان دونوں میں سات کی لڑکی اور لڑکے ان کو لڑتا جھگڑتا چھوڑ کر اپنے اپنے کاموں میں معروف ہی رہتے . . . . . .

لیکن جب جمن بیمار ہوا تو بگو بی نے اس کی بڑی خدمت کی آخری بار وہ کئی دن بیمار پڑا رہا ـــــ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ بیمار ہوا تھا لیکن دو چار آٹھ دن کی بیماری کے بعد ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا ـــــ پر اب کے اسے ایسا روگ لگا تھا کہ وہ تو کیا اٹھتا اس کی میت ہی اٹھی، بگو اسے ہمیشہ منع ہی کرتی کہ دیکھو یہ دارو پینا چھوڑ دو، کلیجے کو خراب کرتی ہے لیکن جمن اس کی نصیحتوں پر اسے خوب ہی دھنکتا تھا . . . . . . کہتا کمین کی بچی . . . کل کو تو کہے گی کہ کھانا کھانا بھی چھوڑ دے . . . دھت، ہٹ . . . بیچ . . !!

بازار کی غیر قانونی اور تیز و تلخ شراب نے واقعی جمن کو اندر ہی اندر کھا لیا، وہ بیمار پڑ گیا اور پھر نہ اٹھ سکا بگو نے اپنے تینوں بیٹوں کو جو نہایت آوارہ اور نافرض شناس تھے جمن کے علاج معالجے کے لیے کچھ کام کر کے پیسے کما لانے کو

بات کہی لیکن وہ آوارہ بیگو بی کی بات کہاں سنتے تھے دن بھر نہ جانے کہاں غائب رہتے۔ نہ جانے کیا کرتے اور کیسے کھاتے پیتے اور رات کو نہ جانے کب آکر گھر کے کونے کھدرے میں پڑ کر سو جاتے تھے ان کو نہ اپنی ماں کے کہنے کی کچھ پرواہ تھی اور نہ ہی اپنے باپ کی بیماری کا کچھ خیال ـــ بیگو بی کی ایک بڑی لڑکی بھی تھی جو بیاہی جا چکی تھی وہ اپنے غریب شوہر کے ساتھ کسی دوسرے شہر میں رہتی تھی۔

جب تک جمن کا تانگہ چلتا تھا بیگو کا گھر بھی چلتا تھا اور جب سے جمن بیمار پڑا بیگو بی کے لیے گھر کا خرچ چلانا دشوار ہو گیا۔ اس نے تینوں بیٹوں کو خوب پھٹکارا گھر کے خرچ اور جمن کے علاج کے لیے پیسے طلب کیے لیکن بدچلن لڑکے ٹس سے مس نہیں ہوئے، ایک تو نہ جانے کہاں فرار ہو گیا دوسرے نے سائیکل رکشا چلانا شروع کر دیا اور اپنی پیٹ پوجا کا سامان کر لیا اس لیے کہ اب گھر میں ایک وقت کی روٹی ملنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ تیسرے لڑکے نے بہ جبر تانگہ چلانا شروع کر دیا لیکن وہ اپنی ماں کو برائے نام خرچ دیتا تھا جس سے بیگو کے لیے جمن کی دوا دو وقت کی ہانڈی اور گھوڑے کا دانہ چارہ بھی پورا نہیں ہو پاتا تھا ـــ وہ کہتی۔

ابے وہ بنے کے بچے یہ دن رات تانگہ چلا کے ساری کمائی آخر تو کہاں غارت کر دیتا ہے، کمینے دیکھتا نہیں کہ تیرا باپ بیمار پڑا ہے گھر میں کھانے پینے کی بھی تنگی ہے اور تو بے شرم تو جانور کو اس کا دانہ بھی پورا نہیں کرتا دیکھ تو سہی گھوڑا کتنا دبلا ہو گیا ہے۔ ۔ ۔ کیا کروں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر سرکار مجھے تانگہ چلانے کا لائسنس دیتی تو میں خود ہی تانگہ ہانک کے گھر بار چلاتی، تو مرد ہو کے اپنے ماں باپ کو مصیبت میں دیکھتا ہے اور کچھ بھی اثر نہیں لیتا۔ ۔ ۔ ڈوب مر نکمے ۔ ۔ ۔ ۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مر۔ ۔ ۔

وہ اسی طرح بیٹے کو خوب ہی گالیاں دیتی، جمن بستر پر پڑا کراہتا اور کہتا ـــ

بیگو۔ ۔ ۔ اری او بیگو۔ ۔ ۔ اتنا شور نہ کر، میرا دل گھبراتا ہے، لڑکے سے مت لڑ ـــ ہائے خدا یہ بیٹے کتنے نالائق اور پاجی نکلے۔ ۔ ۔ اری ان میں سے ایک بھی تو کام کا نہ نکلا ـــ خیر اب تو میری دوا کی فکر مت کر مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے، بس اب میرے لیے دعا کر کہ میں جلدی سے ٹھیک ہو جاؤں پھر۔ ۔ ۔ پھر تجھے تکلیف نہ ہوگی۔

بیگو نے جمن کے علاج اور دوسری ضرورتوں کی خاطر اپنے بچے ہوئے ایک دو گہنے بھی فروخت کر دیئے گھر کے کچھ برتن بھانڈے رہن رکھ دیئے لیکن روگ اچھا نہیں ہوا۔ ۔ ۔

ایک دن اس کے لڑکے شبے نے تانگہ گھوڑا اونے پونے فروخت کر دیا اور خوب شراب پی کر گھر آ گیا۔ ۔ بیگو نے اس دن اس کی خوب ہی خبر لی اسے اتنا مارا اتنا مارا کہ اس کے بوڑھے ہاتھ درد کرنے لگے، اس کی کلائیوں میں بچی کھچی کانچ کی چوڑیاں بھی سب پھوٹ گئیں۔ شبے نشہ میں مست و مدہوش کونے میں جا کر سو گیا۔ بیگو نے اس سے وہ تمام روپے چھین لیے جو اس کے خرچ سے بچ رہے تھے ـــ پھر وہ جمن کی چھاتی پر سر رکھ کر رونے لگی جو دو دن سے نہ جانے کیوں چپ ساتھا اور بیگو کو نہ جانے کیسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا ـــ

دوسرے دن تیّے بھی گھر سے غائب ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ نہ جانے ادھر کو نکل گیا اور اسی دن جمن بھی چلا گیا۔ بیگو کو چھوڑ کر ساری دنیا کو چھوڑ کر ۔ ۔ ۔ مر گیا ۔ ۔ ۔ ۔

اب بیگو میں وہ پہلی سی سکت نہیں رہی تھی دیکھنے میں تو وہ تندرست اور موٹی نظر آتی تھی لیکن اندر ہی اندر وہ کھوکھلی ہو چکی تھی اب بھی اس میں بے باکی اور لڑاکا پن تھا لیکن بڑھاپے کی کمزوری سے کچھ ٹھنڈا ٹھنڈا سا تھا جب کبھی کسی بات پر اس کی کسی سے تکرار ہو جاتی تو بیگو بی کے طیش و جلال اور اس کی گالیوں کو ۔ ۔ ۔ ۔ سن کر پرانے لوگوں کو وہ پرانی بیگو بی یاد آجاتی جو غصہ میں آگ بگولہ جمن سے جھوم جھوم کر لڑتی تھی اور پھر جمن کے گھونسوں اور لاتوں سے ادھ موئی سی ہو کر سسکتی نظر آتی تھی، لوگ بھی بیگو بی سے ڈرتے ہی تھے اور کہتے تھے:

"کون منہ لگے اس بڑھیا کے یہ تو شیطان کی خالہ ہے جسے بازار میں بے عزتی کر دیتی ہے۔"

جمن کے مرنے کے بعد سے بیگو بی تنہا رہ گئی تھی، کچھ دن تو اس کے نہایت تکلیف میں اور اس سوچ بچار میں گزرے کہ وہ اب کیا کرے؟ اپنی آئندہ زندگی کس کے سہارے گزارے اس کے ماں باپ بھی اب اس دنیا میں نہیں تھے بھائی بھی کوئی نہیں تھا، دور کے عزیز و اقارب اس لائق ہی نہیں تھے کہ وہ بیگو بی کو سہارا دے سکیں، خود بیگو بی بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ کسی کے لیے بوجھ بنے اور لوگوں کے طعنے تشنے سہے، تینوں لڑکے پہلے ہی جہاں ان کے سینگ سمائے چلے گئے تھے

لیکن پھر بیگو بی کو اس کی اولاد نے سنبھال لیا ۔ ۔ ۔

وہ اپنی اولاد سے بہت محبت کرنے لگی تھی، اس کے ایک ہی اشارے پر اس کے بچے اس کے قدموں میں چلے آتے تھے اور وہ انہیں دیکھ کر خوش ہو جاتی —

اب وہ بڑے فخر سے کہتی کہ — "حقیقت میں اولاد اسے کہتے ہیں، یہ ہیں میرے بچے جو مجھے اس بڑھاپے میں پال رہے ہیں اور میرا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ صحیح معنوں میں مجھے اب اولاد کا سکھ حاصل ہوا ہے۔

اور وہ پکارتی ۔ ۔ ۔

آؤ آؤ میرے بچو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے مٹھو آؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لو یہ دانہ کھالو۔ جلدی چگ لو پھر میں تمہیں ڈربے میں بند کر دوں گی — ایرانی ہوٹل والے سیٹھ سے مجھے تمہارے انڈوں کے پونے دو روپے وصول کرنا ہیں، اس وقت وہ آرام کرنے چلا جاتا ہے، کہیں وہ اپنے گھر ہی چلا نہ جائے — آؤ آؤ ۔ ۔ ۔ ۔ لوگ لاکھ تمہیں جانور سمجھیں لیکن تم میری اولاد ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیٹا بیٹی ہو، لو دانہ چگ لو جلدی آؤ ۔ ۔ آؤ آؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

قدیر زماں

مُشتِ خاک

ماں ۔۔۔ !

تم کیسی عورت ہو۔ تم نے اپنی بیٹی پر بھی بڑے ظلم ڈھائے ہیں۔ انتہا ہو گئی کہ تم نے مجھے اپنا دودھ تک نہیں پلایا۔

نہیں ماں، میں اب سیانی ہو گئی ہوں ۔۔۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں ۔۔۔ اب میں بہت کچھ سمجھتی ہوں۔

تمھیں تو اپنے شوہر کی بھی پرواہ نہ تھی۔ تم میری کیا پرواہ کرتیں۔

دیکھو ماں! تمھیں یاد کر کر کے میرا باپ اب بھی آنسو بہاتا ہے۔ تنہا تنہا اس نے کئی بار سسکیاں بھری ہیں۔ مجھے اپنے کلیجے سے لگا کر وہ دیوانہ وار اب بھی ٹہلتا ہے۔

دیکھو! ان ماؤں کو دیکھو! . . . اپنی بچیوں کو کس طرح للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔ وہ یوں ہی اپنی بچیوں کو دیکھتی رہتی ہیں اور ہر شام دیا جلا کر صدقہ اتارتی ہیں کہ کہیں ان کی اپنی ہی نظر نہ لگ گئی ہو۔

کل ہی میں نے ثمینہ کی ماں کو دیکھا۔ ابھی ثمینہ ایک سال کی بھی نہیں ہوئی کہ اس کی ماں نے اس کے پاؤں میں گھنگرو باندھے اس کی انگلیوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامے "پاؤں پاؤں" کر رہی تھی۔

اور اس ذکیہ کی ماں کو دیکھو۔ ایک ہی دن میں اس نے اپنی بیٹی کے لیے کتنے کھلونے لا دیے۔ ذکیہ کھلونوں کو لے کر ایک ایک کر کے توڑتی تھی اور اس کی ماں ہنس ہنس کر نئے نئے کھلونے دیتی جاتی تھی۔

"لے ذکی لے ۔۔۔ ہا ہا ۔۔۔ یہ دیکھو منّی ۔۔۔ یہ دیکھو۔ چھن چھن، چھنا چھن چھن ۔۔۔ ہوں ہماری بیٹی کو کوئی کھلونا پسند ہی نہیں"

ماں میرا دل تو امڈ آیا کہ میری ماں اتنی کٹھور کیوں ہے ۔۔۔ مجھے خوب یاد ہے ماں۔ تم نے مجھے ایک بھی کھلونا نہیں لے دیا۔ تم نے میرے بچپن کی طرف کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ پھر تم مجھے "پاؤں پاؤں" کیا چلاتیں۔

لو دیکھو، رخسانہ کی گڑیا دیکھو، اسے اس کی ماں نے رات رات بھر جاگ کر بنایا ہے۔

"نا میں امّی نا میں، مجھے اتنی چھوٹی گڑیا نا میں ہونا"

"اچھا بھائی ہم تمھاری گڑیا ادھیڑ دیتے ہیں۔ گڈے کو رہنے دو، خوب اونچا پورا ہے"

"نہیں امی جی۔ گڑیا تی ہوگی تو گڈا بھی آتا ہوگا"

جانتی ہو ماں پھر کیا ہوا۔

رخسانہ نے گڑیا اور گڈے کے قدنا پنے بھی نہیں پائے اور اس کی ماں نے دونوں کو ادھیڑ دیا اور پھر سے کپڑے کے لیے لیے ناپ لینے لگی۔

"ہاں بھی رخسے کی گڑیا سب سے بڑی ہوگی"

ماں ۔۔! تم نے نہ تو میرے لیے گڑیا ہی بنائی نہ ہی کوئی کھلونا بازار سے خرید کر دیا ۔۔۔ تم سب ماؤں سے اس قدر مختلف کیوں ہو؟ آخر تم بھی ماں ہو!

یہاں آؤ ماں ۔۔۔ شمسہ کو ہلکا سا ٹمپریچر ہے، اس کی ماں کو دیکھو۔ دو راتوں سے وہ سوئی نہیں ہے۔ ہر گھڑی بے چین ہے۔ گھر گھر ماری ماری پھر رہی ہے کہ کوئی آکر اس کی بچی کا بخار کم کر دے۔ ڈاکٹر کی دوا سے بخار نہیں اترا تو کسی سادھو سنت ہی کو بلایا جائے۔

"خداوندا، ننھی سی جان ہے۔ تو اس پر رحم کر، شامو کا بخار تو مجھے دے دے"

لیکن تم ۔۔۔ تم نے تو میری بیماریوں میں بھی میری طرف پلٹ کر نہ دیکھا ماں۔

وہ دیکھو، شہناز ابھی اسکول سے لوٹی نہیں ہے۔ کتنی دیر سے دروازے پر کھڑی اس کی راہ تک رہی ہے۔ ذرا سی دیر ہوگئی تو اس عورت کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے ہیں۔ اب وہ محلہ کے ایک ایک بچے سے منت سماجت کر رہی ہے کہ کوئی اس کی شہناز ڈھونڈ لائے۔ لیکن تمھیں تو میرے اسکول سے بھی کوئی سروکار نہ تھا۔ میں کن کن باتوں کی تم سے شکایت کروں۔

کوثر امتحان میں پاس ہوگئی تو اس کی ماں نے اسے گجرے پہنائے۔ گھر گھر مٹھائی بانٹی، اور میں پہلے درجہ میں کامیاب ہوئی تو ماں تو نے مبارک باد کا ایک لفظ تک نہ کہا۔

میرے دل میں ہوک سی اٹھتی ہے ماں۔ میں کہاں تک صبر کروں۔ کیا تم نے کبھی یہ بھی نہ سوچا کہ تمھارے جسم سے علیحدہ ہوکر گوشت پوست کا یہ لوتھڑا ازل سے تمھارے پیار کو ترس رہا ہے ۔۔ اُفوہ ۔۔ !!

تم مجھے کوستیں بھی نہیں ۔۔ ماں کے کوسنے کہ کر بیٹی کی حیات لمبی ہوتی ہے"

عارفہ کی ماں تو ہی جان کر دن دن بھر کوستی رہتی ہے اور رات رات بھر دامن پھیلا کر دعا مانگتی ہے۔

"پروردگار تو میری عارفہ کی حیات لمبی کر، تو اسے میری عمر بھی دے دے"

مگر ماں تمھیں تو میری حیات کی بھی فکر نہیں۔

ذرا دیکھو ماں! اپنی بیٹیوں کو بڑی ہوتی دیکھ کر مائیں کس قدر خوش ہوتی ہیں۔ یہ ابھی بچیاں ہی رہتی ہیں اور مائیں سمجھتی ہیں کہ یہ بڑی ہوگئیں اور ان کی محافظ بن جاتی ہیں۔

"ارجمند اوڑھنی ٹھیک کرلو۔"
پیارجمند کی ماں کو کیا ہوگیا ہے۔ ابھی تو اسے اوڑھنی کی ضرورت ہی نہیں ہے ملا۔
لیکن میں ارجمند سے بہت بڑی ہوں۔
تم نے کبھی نہیں کہا ماں۔
"ساڑی اس طرح سے باندھو"
"چوٹی یوں گوندھو"
"کاجل ایسے لگاؤ"
اوروں کی مائیں تو یہ سب کچھ بولتی ہیں ماں ——— لیکن — تم — تم تو ایک بات بھی نہیں کہتیں۔
شاہدہ تو میرے سامنے کی بچی ہے۔ اس کی ماں کو دیکھو کتنی ڈینگیں مارتی ہے۔
آخر ماں جو ٹھہری۔
"میری بیٹی کا دولہا یوں ہوگا۔ میں اپنی بیٹی کو سر پاؤں تک گہنوں میں سجاؤں گی۔ دیکھنا اس کا جہیز اس شان کا ہوگا کہ لوگ دنگ رہ جائیں گے۔ شہر بھر کے لیے دسترخوان بچھے گا۔"
میں بھی ایک دن دلہن بنوں گی ماں۔
میرے ہاتھوں میں بھی مہندی رچے گی۔
میری مانگ میں بھی افشاں بھری جائے گی۔
ایک دولہا مجھے بھی لینے آئے گا۔
جانے کتنے مہمان ہوں گے!
لیکن ماں مجھے یہ خوف کھائے جاتا ہے کہ تم وہاں موجود نہ ہوگی۔
میرا دل ڈوب رہا ہے ماں،
تم میرے ہاتھوں کی مہندی نہیں دیکھو گی۔
تم میری مانگ میں افشاں نہیں بھرو گی، تم میرے دولہے کو دیکھنے نہیں آؤ گی۔
گھونگٹ اوڑھے میں تمہاری صورت کو ترس جاؤں گی، دلہن اپنے سسرال جانے سے پہلے اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر خوب جی بھر کر رونا چاہتی ہے ماں ——— لیکن تم ——— تم ———
کاش تم زندہ ہوتیں ماں ———!

انور معظم

تبصرے

(تبصرے کے لیے دو کتابیں بھیجی جائیں)

آبِ خضر

مولفہ: کرامت علی کرامت۔ اڑیسہ اردو پبلشرز۔ دیوان بازار کٹک ۱۔ قیمت تین روپے

ہندوستان میں اچھے اردو رسائل کی کمی نے نہ صرف ادبی تخلیقات کی اشاعت اور نئے ادیبوں، شاعروں کے ذریعہ ادبی روایت کے جاری رہنے میں رکاوٹ پیدا کی ہے بلکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے ادیبوں، شاعروں کے تعارف سے بھی محروم رکھا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ ملک میں اردو کے چند گنے چنے مراکز کے ساتھ ساتھ دور افتادہ مقامات پر اردو دوست اپنے وسائل کے مطابق رسائل شائع کریں جو علاقائی طور پر ہی سہی اپنے لکھنے والوں کی موثر نمائندگی کر سکیں۔ وسائل کی غیر موجودگی اور رسائل کی کمی اگر ان باتوں کی اجازت نہ دے تو "آب خضر" جیسے انتخابات اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کر سکتے ہیں۔ غالباً یہ پہلا انتخاب ہے جو ہم سے اڑیسہ کے شاعروں کا بھرپور تعارف کراتا ہے۔ اس انتخاب میں اڑیسہ کے مرحوم اور موجودہ شعرا کے علاوہ ان شاعروں کا کلام بھی شائع کیا گیا ہے جو وہاں کے ادبی ماحول سے وابستہ رہے ہیں۔ ان شعرا میں اکثر نام جانے پہچانے ہیں۔ ان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اگر اڑیسہ کے شاعروں کا ہندوستان کے اردو مراکز سے ربط قائم رہتا تو اکثر شعرا آفتاب نہیں تو ماہتاب ضرور بن جاتے۔ مولف نے اپنے فاضلانہ مقدمے میں شعرا کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ آخر میں شعرا کی زندگی کے حالات کے اندراج نے کتاب کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ مولف کا یہ خیال درست ہے "آب خضر کے مطالعے کے بعد اڑیسہ کے باہر اردو کے پرستاران شعر و ادب کو اس بچھڑے ہوئے کارواں کی سرگرمیوں سے متعلق ایک مجموعی طور پر سرسری اندازہ ہو جائے گا۔"

نوائے کفر

منور لکھنوی۔ آدرش کتاب گھر۔ فیض گنج۔ دریا گنج۔ دہلی۔ قیمت:۔ ۲٫۷۵

جناب منور لکھنوی سے اردو کے پڑھنے والے ان کے گیتا، کمار سمبھو اور کلام حافظ کے منظوم ترجموں کے ذریعے بخوبی واقف ہیں، اور ان کا یہی کام اردو ادب میں ان کا نام باقی رکھنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن ترجموں کے علاوہ ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "کائنات دل" بھی زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ اور اب یہ مجموعہ جو ان کی ۷۰ غزلوں پر مشتمل ہے ہمارے پیش نظر ہے۔ اس میں منور لکھنوی کا ذوق حسن کی پاکیزگی کے ساتھ ان کی نظر کی رواداری، فکر کی پہلوداری اور زندگی بنیادی المیہ

...یقت کے ساتھ ایک دردمندر ویہ ملتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک نمایاں خصوصیت ان کی انسان دوستی اور انسان
...عظمت کا احساس ہے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:—

خدا کی شان بتاتے ہیں تیرہ دل مجھ کو — وہی چراغ جو لیتے تھے روشنی مجھ سے
سر ساحل بھی لرزتا ہے سفینہ دل کا — اور ٹکرا کے یہ کشتی جو بھنور تک پہنچے
مجبوری ہے قیامت کے تیر نفس نفس میں — وہ اک ادا جو نگاہوں نے منتخب کی ہے
رہ گیا کعبۂ دیں اس سے منّور محروم — دلبری حلقۂ اصنام سے آگے نہ بڑھی

...ج نرائن راز کا ایک مبسوط تعارفی مضمون منّور لکھنوی کی غزلوں کے مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

پوسٹ مارٹم (طنزیہ و مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ)

عبدالاحد تخلص بھوپالی۔ قصر ادب پبلیکیشنز، پیرگیٹ بھوپال۔ قیمت: 2.75

...پابندان وہ لی خالہ کے ذریعہ اردو ادبی حلقے تخلص بھوپالی کے شگفتہ مزاج سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ ان کے
...س مجموعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف طنز کے میدان میں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ طنز جیسی دو دھاری تلوار کا
...ستعمال ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ خصوصاً شخصیت نگاری کے میدان میں اس تلوار کو اٹھانے سے پہلے
اپنا سر ہتھیلی پر لے کر اترنا ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادیبوں اور سیاسی اور سماجی کارکنوں کو (جن
میں اکثر بھوپال ہی سے تعلق رکھتے ہیں) اپنے طنز کا نشانہ بنا کر جناب تخلص نے بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔
ویسے کہیں کہیں شبہ ہوتا ہے کہ یہ سب نیک نیتی سے کیا گیا ہے۔ خلوص کی کمان سے چھوٹے ہوئے یہ طنز کے تیر اپنے
نشانے پر پہنچ کر قاری کو مسکرانے کی بجائے سنجیدہ ہو جانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بعض بعض جگہ اس میں صحافتی رنگ
بھی آگیا ہے۔ اس خامی کی وجہ شاید یہ ہو کہ یہ خاکے "بھوپال پنچ" کے لیے لکھے گئے تھے اور اخبار کا کالم نگار
اپنے مختلف المذاق قارئین کی خاطر سہل نگار بننے پر مجبور ہوتا ہے۔ جن بائیس شخصیتوں کو موضوع بنایا گیا ہے
ان میں کنہیا لال کپور، شعری بھوپالی، نادم سیتاپوری، "انجینئر" سعید خاں، سید ظہور ہاشمی، شاکر علی خاں،
بابو کانتا پرشاد وغیرہ شامل ہیں۔

461/57 SABA-MONTHLY REGD. NO. A. 219

کمانِ ابروئے خوباں کا بانکپن ہے غزل

مخدوم محی الدین کا دوسرا مجموعۂ کلام

گلِ تر

قیمت:- ایک روپیہ ۵۰ پیسے

ناشر:- مکتبۂ صبا

۱۷ امجد گاہ حیدرآباد

پاسِ داماں نہ سہی پاسِ گریباں ہی سہی

تجھ پہ لازم نہیں اے دستِ جنوں جامہ دری

سلیمان اریب کا پہلا مجموعۂ کلام

پاسِ گریباں

قیمت:- دو روپے ۵۰ پیسے

ناشر:- انجمن ترقی اردو

حیدرآباد دکن

کہانی بھی روداد جہاں معلوم ہوتی ہے

اقبال متین کا پہلا افسانوی مجموعہ

اجلی پرچھائیاں

قیمت:- چار روپے ۵۰ پیسے

ناشر:- مکتبۂ صبا

امجد گاہ، حیدرآباد دکن

نئی نسل کے

ذہین شاعر

زبیر رضوی

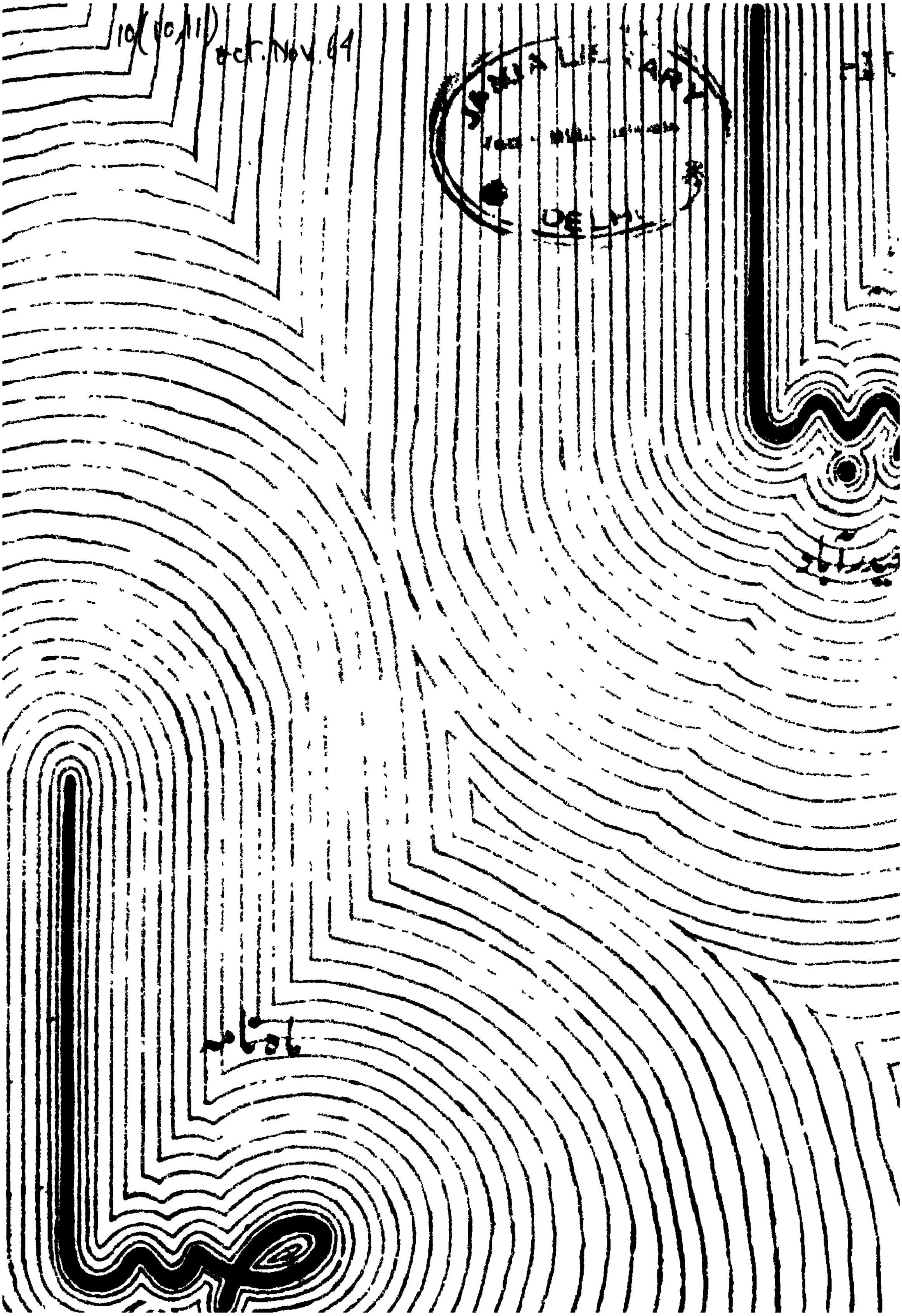
کی غزلوں، نظموں اور گیتوں کا مجموعہ

لہر لہر ندیا گہری

قیمت تین روپے

ناشر:- مکتبۂ صبا، امجد گاہ

حیدرآباد دکن


10 (No 11) Oct. Nov. 64

منظورشدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

ماہنامہ

صبا

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر:
سلیمان اریب

فون (۴۲۳۰۲)

مجلسِ مشاورت
حبیب الرحمٰن
فضل الرحمٰن
ڈاکٹر طاہر علی خاں مسلم
رائے جانکی پرشاد
ڈاکٹر حفیظ قتیل
عالم خوندمیری
دلاور علی خاں
رضیہ بیگم
سعید بن محمد (آرٹسٹ)
سرورق - محمد غوث کتابت محمد مظہر

زرِ سالانہ ہند و پاک سے	۱۰ روپے
ششماہی	۶ روپے
بیرونِ ہند سے	۲۰ شلنگ

جلد	۱۰
شمارہ	۱۰-۱۱
ماہ	اکتوبر، نومبر
سنہ	۱۹۶۲ء
قیمت	ایک روپیہ

دہلی آفس: ۱۹۵۰ ترکمان گیٹ دہلی ٦
پاکستان میں ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۲۰۳۰۲) کراچی ۳

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب، ابجودگاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چارکمان حیدرآباد

اس شمارے میں

شمیم احمد نے اپنے مضمون فسادات احمد آباد کے رپورتاژ میں کہیں لکھا ہے کہ ابراہیم جلیس ابتداً کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک اہم اور سرگرم رکن تھے۔ شمیم صاحب کی اطلاع کے لیے یہ لکھنا ضروری ہے کہ جلیس کبھی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ نہیں رہے۔ (ادیب)

سرور ڈنڈا کی اچانک موت نے حیدرآباد کی بساطِ شاعری سے ایک ایسے مُہرے کو اٹھا لیا جس کی جگہ کسی اور شاعر سے پُر نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنی شاعری سے ہنساتے ہنساتے دل میں چٹکی بھر لینے کا کام لیا۔ وہ دکنی زبان کا آخری عوامی شاعر تھا۔

ڈنڈا کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی میں جہاں اس کی عام فہم مزاحیہ، دلچسپ اور سیاسی شاعری کا حصہ تھا، وہیں اس کی انسان دوستی، ہمدردی، خلوص، شرافت اور خاکساری کو بھی بڑا دخل تھا۔

ڈنڈا صحیح معنوں میں باغ و بہار آدمی تھا۔ یاروں کا یار، دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا بھی بہی خواہ۔ پرانی تہذیب اور روایات کا حامل اور نئی دنیا کے خواب دیکھنے والا۔ اب حیدرآباد کو ایسا شاعر جو یکساں طور پر ہر طبقہ کے لوگوں اور مردوں اور عورتوں کو پسند ہو شاید ہی نصیب ہو سکے گا۔

ڈنڈا کی ایک مشہور نظم ہے "سنجیوا ریڈی ماما" اس نظم کی آخری لائنیں ہیں!

پولیس کی ڈائری میں
ڈنڈے کی شاعری میں
نہ فل اسٹاپ نہ کاما۔ سنجیوا ریڈی ماما

لیکن ۲۰ نومبر کی شام نے جو اس کی زندگی کی آخری شام ثابت ہوئی۔ اس کی شاعری میں بھی فل اسٹاپ لگا دیا اور اس کے ہاتھ سے قلم چھین لیا۔

سوگوار
اریب

آٹھ برس گزرے ــــــ اور اب

آٹھ برس کی عمر کو پہنچ کر لڑکی کنیا کہلاتی ہے...

لیکن وہ دور گزر چکا جب کہ بچپن کی شادی کا رواج تھا۔ آج کل آٹھ برس کی ذہین لڑکی تحتانی تعلیم مکمل کر لیتی ہے۔ ریاست آندھرا پردیش کی عمر بھی آٹھ برس کی ہو چکی ہے اور اب یہ منصوبہ بندی کا ابتدائی مرحلہ طے کر چکی ہے، اس مرحلے میں داخل ہو رہی ہے جسے ہم "وسطانی درجہ" کہہ سکتے ہیں اس عزم کے ساتھ کہ آئندہ منصوبوں کے تحت اعلیٰ سے اعلیٰ تر مدارج طے کر لے۔ لیکن آیئے اس وقت ہم اس کی پچھلی کامیابیوں پر بھی ایک نظر ڈال لیں:-

	یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو	۸ سال بعد
ریاست کی آمدنی	(۵۷٫۶۱) کروڑ روپے	(۱۳۲٫۳۰) کروڑ روپے
فی کس آمدنی	(۲۵۵٫۸۵) روپے	(۳۵۴٫۳۱) روپے
منصوبے کے تحت رقمی خرچ	(۱۰۰٫۵۹) کروڑ روپے	(۲۱۲٫۹۹) کروڑ روپے
ریاستی موازنہ	(۶۱٫۸) کروڑ روپے	(۱۳۹٫۰۰) کروڑ روپے
اناج کی پیداوار	(۵۴٫۹) لاکھ ٹن	(۷۶) لاکھ ٹن
برقی قوت سے مستفید ہونے والے دیہات اور قصبوں کی تعداد	(۶۸۵)	(۴۴۲۶)
تعلیمی اداروں کی تعداد (عام اور پیشہ وری)	(۳۰۰۷۵)	(۴۸۰۳۷)
کالجوں کی تعداد	(۹۸)	(۱۳۲)
پرائمری ہیلتھ سنٹروں کی تعداد	(۳۶)	(۲۸۵)
کمیونٹی ڈیولپمنٹ بلاکوں کی تعداد	(۵۵)	(۳۲۱)
دیہات میں نصب شدہ کمیونٹی ریڈیو سٹوں کی تعداد	(۱۷۶۲)	(۱۰۶۴۹)

۱۹۶۴ء میں ایک زرعی یونیورسٹی قائم ہو گئی ● نظم و نسق میں کارکردگی کو برقرار رکھتے ہوئے خرچ میں کفایت کی خاطر یکم جولائی ۱۹۶۴ء سے ترقیاتی بلاکوں کی جدید تنظیم عمل میں لائی گئی ● پنچایت راج کے شعبے میں جو نمایاں ترقی ہوئی ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ (۱۵۲۴۴) پنچایتوں میں (۷۷۱۸) پنچایتوں کے انتخابات بلا مقابلہ عمل میں آ گئے یہ تعداد پنچایتوں کی مجموعی تعداد کی (۴۷) فی صد ہے ● (۱۱) پنچایتیں صرف خواتین پر مشتمل ہیں جو بلا مقابلہ منتخب ہوئی ہیں ● (۱۳۹) کروڑ روپے کے خرچ سے تعمیر ہونے والے ناگ ارجن ساگر پروجکٹ پر تیزی کے ساتھ مسلسل کام جاری ہے اور بند کی تعمیر کا (۶۲) فیصد کام مکمل ہو چکا ہے ● صنعتی شعبے میں بھاری برقی آلات اور دوا سازی کے کارخانوں کے علاوہ ہندوستان میں ٹیلیفون کا پانچواں یونٹ بھی حیدرآباد کے قریب قائم کیا جا رہا ہے ● آپ ممکن ہے کہ اس کو نمایاں ترقی کہیں لیکن یہ ابھی تو ابتدا ہے۔

● آیئے ہم سب مل کر پانچ سالہ منصوبوں کے تحت اس سے بہتر اور بڑھ چڑھ کر کارگزاری کا پیش کریں۔

(جاری کردہ:- ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ۔ آندھرا پردیش)

ابوہاشم سید یوشع

خواجہ حافظ کے عنفوانِ شباب کا ایک ماجرا

گزشتہ چالیس سال کی مدت میں ایرانی ادیبوں نے خواجہ حافظ پر متعدد کتابیں لکھیں ان سے حافظ کے احوال زندگی پر اس سے پہلے قابل قدر اضافہ نہ ہوسکا کہ فراہمی مواد کی جستجو میں زیادہ تر بیرونی ماخذوں سے کام لینے کی ناکام کوششیں کی گئیں اور کلام حافظ کی طرف توجہ سطحی و سرسری رہی۔ دیوان حافظ سرگزشت حیات حافظ کا گویا ایک دیباچہ ہے اور جا بجا ان کی غزلوں اور اشعار سے ان کی زندگی کے مختلف احوال پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی سخن سرائی ان کی زندگی سے علیحدہ کوئی دماغی صنعت گری نہیں بلکہ ان کی شاعری ان کی ہستی کا ساز اور ان کے اشعار ان کی زندگانی کے مترنم ارتعاشات ہیں۔

اساساً حافظ کی شاعری غزل سرائی ہی سے وابستہ رہی ہے۔ زبان عربی میں عورتوں سے بات چیت، چھیڑ چھاڑ اور شوخی کرنے کو غزل کہتے ہیں۔ نیز صنف شعر کا نام بھی غزل ہے جس میں بالخصوص شعرائے عرب صنف نازک سے عشق بازی اس کے حسن و جمال کی توصیف اپنے جذبات عشق و محبت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ غزل بھی اور اصناف شاعری کی طرح عرب ہی سے ایران آئی۔ یہاں بھی پہلے پہل غزل کا موضوع یہی رہا پھر اس میں دوسرے موضوعات داخل کیے گئے مثلاً رموز تصوف و عشق الٰہی، خیالات رندانہ، افکار سیاسی و معاشرتی وغیرہ۔ اس طرح غزل بتدریج ہر قسم کے افکار و خیالات کا وسیلہ بنی۔ حافظ کی غزل سرائی بھی متعدد موضوعات پر مشتمل ہے۔

خواجہ حافظ کے کلام سے نہ صرف ان کی بہت سی خصوصیتیں مترشح ہوتی ہیں بلکہ ان کی شخصیت اور ان کے نجی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے اشعار سے بتایا جا سکتا ہے کہ ان کا رنگ روپ کیسا تھا، لباس کس طرح کا پہنا کرتے تھے، مکان شیراز میں کس مقام پر اور کس نوعیت کا تھا، ان کی رفیقۂ حیات بلحاظ صورت و سیرت کیسی تھی، متاہلانہ زندگی کیسی گزری، کس پادشاہ اور کس وزیر سے ان کے روابط کیسے تھے، ان کی زندگی کس دور میں کیسی رہی وغیرہ وغیرہ۔ ان کیفیتوں اور ان کے زمانے کے تاریخی واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے استنباط

صبا

قیاسی او اختیار تمیزی سے کام لے کر حافظ کی غزلیں بہ ترتیب سنین مدوّن کی جا سکتی ہیں اور اس تدوین کے ذریعے ان کی زندگی کے مختلف پہلو اجاگر کیے جا سکتے ہیں۔

میں نے ۱۹۳۲ء میں خواجہ حافظ کی غزلوں کو بہ ترتیب سنین آٹھ دوروں میں تقسیم کیا تھا۔ اب اسے اپنی تصنیف حافظ شیرازی کے حالیہ ایڈیشن میں شامل کیا ہے۔ اسی جرات رندانہ نے ایک اور اقدام پر آمادہ کیا جو زیر عنوان بالا پیش ہے۔ دیوان حافظ کی یہ نئی تدوین مبنی بر وقائع تاریخ ہونے کے سبب ایک حد تک لائق اعتماد ہو سکتی ہے لیکن اس قصے کو جو بیان پیش کیا جائے گا قرین قیاس و ممکن الوقوع تصور کیا جا سکتا ہے۔

حافظ کے تعشق کے افسانے کئی تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں۔ بعضوں نے اس غزل کی بنا پر انھیں "فرخ" کا عاشق ٹھہرایا ہے۔

دل من در ہوای روی فرخ ۔۔۔ بود آشفتہ ہم چون موی فرخ

(میرا دل فرخ کے دیدار کی آرزو میں ۔۔۔ فرخ کے کاکلوں کی طرح پریشان رہتا ہے)

ممکن ہے حافظ اپنی محبوبہ کو یہ فرضی نام (فرخ) دیا ہو۔ بعضوں نے "شاخ نبات" کو ان کی معشوقہ قرار دیا ہے۔ یہ اسم مرکب دیوان حافظ میں غالباً تین جگہ آیا ہے۔ ہر جگہ اس سے مراد ہری بھری پتوں والی شاخ (یعنی کلک ساحرانہ شاعری) جس سے لذیذ میوے ٹپکتے ہیں لی گئی ہے، مثلاً:

حافظ چہ طرفہ شاخ نبات است کلک تو ۔۔۔ کش میوہ دلپذیر تر از شہد و شکر است

(یعنی حافظ کے دست شاعری میں معمولی قلم بھی آکر ایک عجیب سرسبز و شاداب شاخ بن جاتا ہے اور اس میں سے شہد و شکر سے بھی زیادہ لذیذ میوے ٹپکنے لگتے ہیں)

حافظ اپنے عنفوان جوانی میں "چناں کہ افتد و دانی" عاشق مزاج تھے۔ خود بھی فرماتے ہیں۔

حافظ چہ شد ار عاشق و رند است و نظرباز ۔۔۔ بس طور عجب لازم ایام شباب است

(اگر حافظ بھی عاشق و رند و نظرباز ہے تو کیا ہوا ایام شباب میں لازمی طور پر سبھی کے رنگ ڈھنگ الو کھے ہوا کرتے ہیں)

ایک غزل سے جو ابتدائے جوانی کی معلوم ہوتی ہے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک کمسن ماہ پارہ حافظ کی منظور نظر تھی۔ شاید اسی غزل کے مقطع کو نظر میں رکھ کر ایک اور تذکرہ نویس نے ان کی معشوقہ کا نام "دردانہ" بتایا ہے۔ فرخ کی طرح دردانہ بھی محض گمان و قیاس کی اختراع معلوم ہوتی ہے۔ غزل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

مجمع خوبی و لطف است عذار چو مہش ۔۔۔ لیکنش مہر و وفا نیست خدایا بدہش

(اس کا چاند سا چہرہ لطف و خوبی کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے لیکن ایک چیز کی کمی ہے ۔۔۔ مہر و وفا اس میں نہیں۔ یا رب یہ کمی بھی پوری ہو جائے!)

چاردہ سالہ بتے چابک و شیرین دارم ۔۔۔ کہ بجاں حلقہ بگوش است مہ چاردہش

(چودہ سال کی ایک ایسی پیاری چست و چالاک نازنین میری منظور نظر ہے کہ چودھویں کا چاند بھی اس کی سج دھج کا غلام ہے)

دلبرم شاہد طفل است و بہ بازی روزے　　بکشد زارم و در شرع نباشد گنہش

(میری محبوبہ ابھی کمسن ہے، ایسا نہ ہو کہ کسی دن کھیل کھیل میں وہ تڑپا تڑپا کر مجھے مار ڈالے اور کمسنی کے سبب شرعاً خطاوار بھی نہ ٹھہرے)

بوئے شیر از لب ہمچوں شکرش می آید　　گرچہ خوں می چکد از شیوۂ چشم سیہش

(اس کے شیریں لبوں سے ابھی بوئے شیر آ رہی ہے۔ اگرچہ اس کی چشم سیہ کے تیور آمادۂ خونریزی نظر آتے ہیں)

من ہماں بہ کہ از و نیک نگہدارم دل　　کہ بد و نیک ندیداست و ندارد نگہش

(حزم و احتیاط کا مشورہ یہ ہے کہ اس سے اپنے دل کی بخوبی نگہداشت کرلوں کیوں کہ اچھا برا ابھی اس نے دیکھا نہیں ہے اور اچھے برے کی پرکھ بھی ابھی اس میں پیدا نہیں ہوئی ہے۔)

در پے آں گل نو رستہ دل ما یارب　　خود کجا شد کہ ندیدیم دریں چند گہش

(یارب اس نوخیز نازنین کی دھن میں ہمارا دل کیا جانے کدھر کو نکل گیا کہ بڑی دیر سے دکھائی نہیں دیتا)

جاں بہ شکرانہ کنم صرف گر آں دانۂ در　　صدف دیدۂ حافظ شود آرامگہش

(اگر صدف دیدۂ حافظ اس دُر گراں مایہ کی آرام گاہ بن جائے تو میں اس شکرانہ میں اپنی جان بھی لٹا دوں گا۔)

آخر کار حزم و احتیاط کے سارے منصوبے دھرے رہ گئے اور وہ ماہپارہ ان کا دل چھین لے گئی۔ فرماتے ہیں:

دلبر جانان من بردہ دل و جان من　　بردہ دل و جان من دلبر جانان من

حافظ کے ایام شباب کی متعدد غزلیں وفور اشتیاق و تمنائے محبوب میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مثلاً (۱) ہلے ہمہ شکل تو مطبوع و ہمہ جائے تو خوش۔ (۲) ہر نکتہ کہ گفتم در وصف آں شمائل۔ (۳) حسن تو ہمیشہ در فزوں باد۔ (۴) ببرد از من قرار و طاقت و ہوش۔ (۵) دل شوق لبت مدام دارد۔ (۶) زلفیں سیہ خم بہ خم اندر زدہ باز۔ (۷) لعل سیراب بخوں تشنہ لب یار من است۔ (۸) اے غایب از نظر بہ خدا می سپارمت۔ (۹) اے باد نسیم یار داری۔ (۱۰) بہ فراغ دل زمانے نظرے بہ ماہ روئے۔ وغیرہ۔ ممکن ہے کہ یہ غزلیں اسی نازنین دلربا کی محبت نے لکھوائی ہوں۔ مثالاً دو نمونے یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

(۱)　یارب آں شمع شب افروز ز کاشانہ کیست　　دل ما سوخت بپرسید کہ جانانہ کیست

(یارب وہ شمع شب افروز۔ اندھیرے کو اجالے سے بدل دینے والی نازنین۔ کس گھر کا اجالا اور کس خاندان کی رونق ہے؟ ہمارے دل میں اس نے ایک آگ سی لگا رکھی ہے، ذرا پوچھو تو کس کی قرۃ العین اور کس کے دل و جان کی ٹھنڈک ہے؟)

یارب آں شاہ وشے ماہ رخ زہرہ جبیں　　دُر یکتائے کہ و گوہر یکدانۂ کیست

(یارب وہ شاہانہ انداز رکھنے والی نازنین کہ جس کا چاند سا چہرہ مہ کامل سے ملتا ہے جس کی پیشانی کی چمک دمک ستارۂ زہرہ جیسی ہے کس گھر کی چشم و چراغ اور کس خاندان کی فرد فرید ہے؟)

(۲) عاشق روے جوانے خوش نو خاستہ ام وز خدا صحبت او را بہ دعا خواستہ ام

(ایک نوعمر خوبرو نازنین کو میں نے دل دیا ہے اور درگاہ الٰہی میں دست بہ دعا ہوں کہ یہ میری رفیقِ حیات ہو جائے۔)

عاشق و رند و نظر بازم و می گویم فاش تا بدانی کہ بہ چندیں ہنر آراستہ ام

(عاشق بھی ہوں اور رند و نظر باز بھی، اور یہ علی الاعلان کہتا ہوں تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ اتنے ہنروں سے آراستہ ہوں)

(خواجہ حافظ کے ایام شباب میں ... شاہ شیخ ابو اسحٰق اینجو شیراز کا بادشاہ اور حاجی قوام الدین حسن (حاجی قوام) اس کی سلطنت کے وزیر تھے۔ حاجی قوام ایک نہایت متمول، دریادل و پاکیزہ صفات انسان تھے۔ حافظ پر ان کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ ان کی مجلسوں میں حافظ کو امتیازی خصوصیت حاصل تھی اور وہاں وہ اپنی لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی کے جوہر دکھایا کرتے۔ شعراے دربارِ شاہی سے منسلک تھے۔

حاجی قوام ایک عالیشان قصر میں رہتے تھے جس کے گرداگرد ایک پرفضا باغ تھا۔ قصر کے سامنے ایک وسیع چبوترہ زیرِ سما بنا ہوا تھا جس پر موسمِ گرما میں شام کو ان کی نشست ہوا کرتی اور شام کا کھانا بھی اپنے احباب کے ساتھ وہیں کھایا کرتے تھے۔ ان کے خوان سالار کو روزانہ حاضری دینے والے احباب کی تعداد کا کافی اندازہ تھا اور اسی حساب سے کھانا تیار کرایا جاتا۔ اقسام کی نعمتیں بھی دسترخوان پر چنی جاتیں لیکن غذا کا دار و مدار تمام تر روٹی اور شوربے پر ہوتا۔ اتفاقاً ایک دن شام میں احباب کی تعداد بڑھتے بڑھتے عین کھانے کے وقت معمول سے دگنی ہو گئی حاجی قوام نے ماحضر طلب کیا۔ روٹیاں تو دسترخوان پر حسبِ ضرورت لائی جا سکتی تھیں، لیکن عین وقت پر بازار سے گوشت لا کر شوربا تیار کرنا ممکن نہیں تھا۔ خوان سالار کو اس موقع پر اور تو کچھ نہ سوجھی، کافی مقدار میں پانی جھونک شوربا بڑے بڑے پیالوں میں دسترخوان پر چن دیا۔ اتفاق سے اس وقت پانچویں یا چھٹی کا چاند آسمان میں ٹھیک سر پر نمودار تھا۔ حافظ اپنے آگے رکھے ہوئے پیالے سے شوربا لینے کو جو جھکے تو شوربا بہت پتلا ہونے کے سبب پیالی میں انھیں آسمان اور چاند کا عکس صاف نظر آنے لگا۔ فی البدیہہ انھوں نے یہ شعر موزوں کر کے سنایا:

دریاے اخضرِ فلک و کشتیِ ہلال ہستند غرقِ نعمتِ حاجی قوامِ ما

(آسمان کا یہ سبز سا سمندر اور اس کے ساتھ ہلال کی کشتی دونوں ہمارے حاجی قوام کی نعمت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں)

اس شعر پر حاجی قوام اور اہلِ مجلس پھڑک گئے اور اس بذلہ سنجی اور بدیہہ گوئی کی خوب داد دی۔ اس سے حاجی قوام و حافظ کے باہمی روابط کا بھی کافی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ کو اپنی ظرافت و شوخی کے جوہر دکھانے کی کس قدر آزادی حاصل تھی۔ (یہ قصہ ضمناً ایک قضیۂ معترضہ کے طور پر بیان کیا گیا۔ اب پھر اصلی قصہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔))

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ حافظ نے جوشِ عشق و آرزوئے محبوب میں بہت سی غزلیں لکھی ہیں۔ اب ایک غزل ذیل میں پیش کی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آرزوئیں ساحلِ مراد کو پہنچ چکی ہیں اور اب "ہدفِ دیدۂ حافظ" اسی

"دانہ ور" کی آرام گاہ بنی ہوئی ہے یعنی اسی لڑکی سے حافظ کا عقد ہوا، اور اب اسی کے حسن و جمال کے پرتو سے ان کا گھر روشن ہے۔ یہاں حافظ کو اپنی محبوبہ کے حسن صورت و جمال سیرت کے دیکھنے کا کافی موقع ملا ہے اس ضمن میں اپنے تاثرات کا یوں اظہار فرماتے ہیں:

مرا در خانہ سروی ہست کاندر سایۂ قدش فراغ از سرو بستانی و شمشاد چمن دارم

(میرے گھر میں ایک نہایت حسین و جمیل سرو ہے جس کے سایہ تلے مجھے ہر طرح کی آسودگی حاصل ہے۔ اب میری نظر نہ سرو بوستانی کی طرف اٹھتی ہے نہ شمشاد چمن کی طرف اور نہ اب ان کے سایہ تلے بیٹھنے ہی کو جی چاہتا ہے)

گرم صد لشکر از خوباں بہ قصد دل کمیں سازند بحمد اللہ والمنۃ بتی لشکر شکن دارم

(اگر حسینوں کے سو لشکر میرے دل پر قبضہ کرنے کی خاطر گھات میں بیٹھیں بھی تو انہیں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اللہ کے فضل و کرم سے مجھے ایسی محبوبہ ملی ہے جس کا حسن و جمال ایسے سیکڑوں لشکروں کو شکست دے سکتا ہے۔)

صفائے خلوت خاطر از اں شمع چگل جویم فروغ چشم و نور دل از اں ماہ ختن دارم

(محبوبہ کے حسن ظاہری سے میرے چشمۂ دل کو نور و رونق حاصل ہے۔ مجھے امید واثق ہے کہ اس کے حسن باطنی کا پرتو ہمیشہ میری خلوت گاہ خاطر کو روشن و پاکیزہ رکھے گا۔)

چو در گلزار اقبالش خرامانم بحمد اللہ نہ میل لالہ و نسرین نہ شوق یاسمن دارم

(بحمد اللہ اس کے وجود سے میرا گھر ایک بہارستان حسن و جمال بنا ہوا ہے اور میں ہر وقت اسی میں مشغول سیر و تماشہ رہتا ہوں۔ اب میرا دل نہ لالہ و نسرین کی طرف مائل ہے نہ یاسمن کی طرف)

شرابے خوشگوارم ہست و یارے مہرباں ساقی ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

(ایک ایسی پیکر خوبی مجھے ملی ہے کہ اس کا وجود میرے لیے ایک شراب نشاط آور بنا ہوا ہے اور اس کی دلداری و نظر التفات ساقی بن کر اس شراب خوشگوار کے جام پر جام مجھے پلا رہی ہے۔ ایسی رفیقۂ حیات نہ کبھی کسی کو ملی اور نہ مل سکتی ہے۔)

اس طرح حافظ کی ازدواجی زندگی کے ابتدائی چند روز انتہائی مسرت و شادمانی کے ساتھ گذرنے پائے ہوں گے کہ بعض شریر النفس لوگوں نے اس میں خلل ڈالنے کے لیے طرح طرح کی تہمتیں ان پر لگانی شروع کیں۔ حافظ اس پر یوں روشنی ڈالتے ہیں:

بہ کام و آرزوئے دل چو دارم خلوتے حاصل چہ باک از خبث بدگویاں میان انجمن دارم

(جب کہ دلی آرزوئیں بھی پوری ہو گئیں اور جائز طور سے اپنی محبوبہ کے ساتھ لطف یکجائی بھی میسر ہے، بدگویوں کی تہمتیں نہ میرا کچھ بگاڑ سکتی ہیں نہ معاشرہ میں اپنی بدنامی ہی کا مجھے کچھ اندیشہ ہو سکتا ہے۔)

سزد کز خاتم لعلش زنم لاف سلیمانی چو اسم اعظمم باشد چہ باک از اہرمن دارم

(اگر یہ دعویٰ کروں کہ سلیمان وقت ہوں تو بیجا نہ ہوگا، اور جب کہ یہ اسم اعظم جیسی چیز میرے پاس ہے، شیطانوں

توثیق اور الزامات کی تردید ہونے کے بعد وہ پیر فرزانہ مطمئن ہو کر لوٹتے اور گھر پہنچ کر سارا ماجرا سناتے ہیں۔ (غ
حافظ نے مذکورۂ بالا غزل اس واقعے کے بعد لکھی ہے۔) افرادِ خاندان میں سے شاید کسی کی رسائی حاجی قوام کے یہا
نہیں تھی۔ وزیرِ سلطنت جیسی بڑی ہستی سے اس بارے میں پوچھ گچھ کرتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ کسی نے نہ وزیرِ سلطنت
یہاں جانے کی جرأت کی اور نہ لڑکی کے بیان کو باور کیا۔ باہمی مشورے کے بعد غالباً سب کی یہ رائے ہوئی کہ فی
لڑکی کو حافظ کے گھر سے اپنے یہاں لے آنا چاہیے۔ دوسرے امور کی طرف بعد کو توجہ کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ذکورِ والا
میں سے کسی بزرگِ خاندان کو بھیج کر حافظ سے درخواست کی گئی ہوگی کہ چند روز کے لیے لڑکی کو اس کے میکے بھیج
دیں۔ حافظ نیک نہاد، پاکیزہ صفات آدمی تھے اور اپنی بیوی سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ اس درخواست کو بطیبِ خاطر منظور
کر لیا۔ لڑکی کو اپنے یہاں لانے کے بعد سسرال والوں کے تیور بدل گئے۔ ممکن ہے خلع و علیحدگی کے مشورے کیے جانے لگے۔
حافظ نے جب یہ دیکھا ہوگا کہ ان کو سسرال والے لڑکی کو ان کے گھر بھیجنا نہیں چاہتے تو اپنی محبوبہ کے پاس یہ غزل لکھ بھیجی:

ازمن جدا مشو کہ توام نورِ دیدۂ — آرامِ جان و مونسِ قلبِ رمیدۂ

(مجھ سے جدا نہ ہو جانا کہ تم ہی میری آنکھوں کا نور، جان کا آرام اور میرے وحشت زدہ دل کی مونس ہو۔)

پایم نمی رسد بہ زمیں دیگر از نشاط — تا سوئے من بہ لطف و عنایت تو دیدۂ

(انتہائے مسرت سے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹھہرتے جب اس کا خیال آتا ہے کہ (چلتے چلتے) تم نے مجھے کس محبت کی نظر سے دیکھا تھا۔)

از دامنِ تو دست ندارند عاشقاں — پیراہنِ صبوریِ ایشاں دریدۂ

(حافظ کو اپنی ماں اور بہن سے بڑی محبت تھی اور یہ دونوں انھی کے یہاں رہتی تھیں۔ حافظ کی دلہن کے حسن و جمال
صفات پسندیدہ کو دیکھ کر وہ دونوں ان کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔ اسی لیے حافظ کہتے ہیں، تم نے ان کو اس طرح اپنا
گرویدہ بنا رکھا ہے کہ تمھاری کنارہ گیری ان پر بے انتہا شاق گزر رہی ہے اور اب اس سے زیادہ تمھاری جدائی
ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔)

از چشمِ زخمِ دہر مبادت گزند، زانک — در دلبری بہ غایتِ خوبی رسیدۂ

(تمھارا حسن و جمال ظاہری و باطنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے، اس لیے مجھے اندیشہ ہونے لگا ہے کہ کہیں تمھیں زمانے کی نظر نہ لگ جائے۔)

منعم کنی زعشقِ وے اے مفتیِ زماں — معذور دارمت کہ تو او را ندیدۂ

(فراقِ محبوبہ میں حافظ کی بری حالت دیکھ کر ان کے دوستوں میں سے کسی غمخوار نے انھیں مشورہ دیا ہوگا کہ
اس لڑکی کے پیچھے اپنی زندگی کیوں تباہ کرتے ہو۔ اس کا خیال چھوڑو اور کسی اور لڑکی سے عقد کر لو۔ "شیراز
معدنِ لبِ لعل است و کانِ حسن"، یہاں خوبصورت لڑکیوں کا کال نہیں، اس سے بہتر لڑکی مل سکتی ہے۔ حافظ اس

کی شیطنت کا مجھ تک رسائی کیا ہو سکتا ہے۔ کنایتہً خاتمِ لعل کہہ کر لبِ لعلِ محبوبہ کو پیش کیا ہے کہ اس کے ذریعہ ان تہمتوں کی پوری طرح تکذیب ہو سکتی ہے۔)

غالباً بعض فتنہ انگیزوں نے حافظ کو ان کے سسرالی بزرگوں کے آگے ان کی رندانہ شاعری کو پیش کر کے انھیں رند و شراب خوار ٹھہرایا تھا، اور ان بزرگوں نے ان کی بدگوئیوں کو باور بھی کر لیا تھا۔ عجب نہیں کہ یہ لوگ اپنی بدگمانیوں کے سبب حافظ کے مخالف ہو گئے ہوں۔ حافظ نے اسی غزل کے مطلع میں اس مخالفت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے:

مرا عہدیست با جانان کہ تا جاں در بدن دارم ہواداران کویش را چو جان خویشتن دارم

(اپنی محبوبہ سے میرا یہ عہد و پیمان ہے کہ جب تک میرے جسم میں جان ہے اس کے عزیز و اقارب کو (خواہ میرے مخالف ہی کیوں نہ ہو جائیں) اپنی جان کی طرح عزیز رکھوں۔)

اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے سسرال سے ایک بزرگ خاندان حافظ کے گھر آ کر اپنی بدگمانیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ حافظ اس کا یوں جواب دیتے ہیں:

الا اے پیر فرزانہ مکن عیبم ز میخانہ کہ من در ترک پیمانہ دلے پیماں شکن دارم

(بزرگوار محترم، شراب پینے کا بہتان مجھ پر نہ باندھیے۔ تعجب ہے کہ آپ جیسا عاقل و معتبر بزرگ بھی یہ عیب مجھ پر لگاتا ہے۔ آپ بزرگوں کی بدگمانیوں کا حال سن کر میں نے فی الحال اس رنگ میں غزل کہنا ترک کر رکھا ہے مگر رندانہ رنگ کی غزل سرائی مجھے اس قدر پسند ہے کہ جی چاہتا ہے پھر اسے اختیار کر لوں۔)

خدارا اے رقیب امشب زمانے دیدہ بر ہم نہ کہ من با لعلِ خاموشش نہانی یک سخن دارم

(رقیب کے معنی ہیں "نگہبان" "محافظ، ولی و سرپرست"۔ شاید یہ "پیر فرزانہ" لڑکی کے ولی و سرپرست بھی تھے۔ حافظ ان سے درخواست کرتے ہیں: "خدا کے لیے آپ ذرا اپنی آنکھیں بند کر لیجئے"۔ یعنی مجھے اپنی بیوی سے تخلیہ میں بات کرنے کی اجازت دیجئے۔ "اس کے خاموش لبوں سے مجھے ایک بات تنہائی میں سننی ہے"۔ مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ناحق مجھ پر اتنے عیب لگائے گئے اور میری بیوی حیا و ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے خاموش بیٹھی سنتی رہی۔ مجھے یقین ہے کہ موقع دیا جائے تو وہ ان الزامات کی تردید کر دے گی۔ تاہم تنہائی میں اس کی رائے دریافت کرنا چاہتا ہوں۔)

بہ رندی شہرہ شد حافظ پس از چندیں ورع اما چہ غم دارم چو در عالم قوام الدین حسن دارم

(اس قدر پرہیزگاری کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود مجھ پر رندی و شراب خواری کی تہمتیں لگائی جا رہی ہیں اور اس طرح ناحق مجھے بدنام کیا جا رہا ہے۔ مجھے کیا پروا ہو سکتی ہے جب کہ وزیر سلطنت خواجہ قوام الدین حسن ان الزامات کی بخوبی تردید و تکذیب فرما سکتے ہیں۔)

غرض حافظ کے معقول و شائستہ طریقے پر اپنی برأت پیش کرنے اور ان کی بیوی کی طرف سے اس کی

کے جواب میں فرماتے ہیں، بڑے مفتی زماں بن کر مجھے مشورہ دینے آئے ہو کہ اس کا خیال چھوڑ دوں۔ تمہارا اس میں کیا قصور ہے۔ تم اگر اس سے واقف ہوتے تو ہرگز ایسا مشورہ نہ دیتے۔)

فتنہ انگیزوں کی بدگوئیاں اور حافظ کے سسرال والوں کی بدگمانیاں بدستور جاری و باقی رہتی ہیں۔ ایک عرصے تک لڑکی کو حافظ سے جدا رکھا جاتا ہے۔ اس مدت فراق میں حافظ نے متعدد غزلیں یکے بعد دیگرے لکھ کر بطور نامہ و پیام کے اپنی رفیقۂ حیات کے پاس بھیجی ہیں۔ ان میں سے چند غزلوں کے منتخب شعر پیش کیے جاتے ہیں:

باز آے و دل تنگ مرا مونس جاں باش　　ویں سوختہ را محرم اسرار نہاں باش

(واپس چلی آؤ اور میرے دل و جانِ حزیں کی پھر مونس بن جاؤ، اور پہلے کی طرح اس سوختہ دل کی محرم راز بنی رہو)

آں یار کہ گفتا بہ توام دل نگراں است　　گو می رسم اکنوں بہ سلامت نگراں باش

(میری محبوبہ نے میرے پاس کہلا بھیجا ہے کہ تیری طرف دل لگا ہوا ہے اور منتظر آمد ہوں۔ اے نامہ بر اس سے کہنا کہ اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ لائے، میں ابھی آتا ہوں۔)

تا بر دلش از غصہ غبارے ننشیند　　اے سیل سرشک از عقبِ نامہ رواں باش

(اے آنسو سیلاب بن کر میرے نامے کے پیچھے رواں ہو جاؤ، اور کسی طرح کا غبار رنج و ملال اس کے دل پر نہ آنے دو)

اے خرم از فروغِ رخت لالہ زارِ عمر　　باز آ کہ ریخت بے گلِ رویت بہارِ عمر

(تمہارے چہرے کی بہار سے میری عمر کا لالہ زار تر و تازہ ہو گیا تھا۔ پھر میرے یہاں چلی آؤ کہ تمہارے پھول سے چہرے کے بغیر میری عمر کی بہار خزاں زدہ سی ہو گئی ہے)

از دیدہ گر سرشک چو باراں رود رواست　　کاندر غمت چو برق بشد روزگارِ عمر

(تمہاری جدائی کے غم میں میرے آنسو مینھ کی طرح برسنے لگیں تو نا روا نہیں، کیوں کہ "روزگارِ عمر" یعنی زمانۂ وصال گویا بجلی جیسا تھا ایک آن کی آن میں آیا اور گزر گیا۔)

بے عمر زندہ ام من و ایں بس عجب مدار　　روز فراق را کہ نہد در شمارِ عمر

(اب میں عمر کے بغیر زندہ ہوں، اس پر تعجب نہ کرو۔ زمانۂ فراق کو کون عمر میں شمار کرتا ہے)

ایں یک دو دم کہ وعدۂ دیدار ممکن است　　دریاب کام دل کہ نہ پیدا است کارِ عمر

(یہ جو چند سانسیں مجھ میں رہ گئی ہیں اس میں بھی تیرے دیدار کا امکان ہے۔ کچھ ایسی تدبیر کرو کہ دلی مراد بر آئے، ورنہ جینے کا بھروسہ کیا ہے۔)

از خونِ دل نوشتم نزدیکِ یار نامہ　　إِنِّي رَأَيْتُ دَهْرًا مِنْ هَجْرِكَ الْقِيَامَة

(میں نے اپنے خون دل سے اپنی محبوبہ کو نامہ لکھا، اور اس میں یہ لکھا کہ تیری جدائی مجھے ایک قیامت نظر آ رہی ہے)

پرسیدم از طبیبے احوالِ دوست گفتا　　فِي بُعْدِهَا عَذَابٌ فِي قُرْبِهَا السَّلَامَة

(میں نے ایک طبیب عشق سے اپنی محبوبہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا اس کی دوری میں عذاب اور قربت میں ندامت ہے)

گفتم ملامت آرد گر گرد دوست گردم　　　واللہ ما رأینا حبًّا بلا ملامہ

(میں نے کہا کہ محبوبہ کے گھر کے چکر لگاؤں تو لوگ ملامت کریں گے۔ اس نے کہا واللہ ہم نے محبت کو بلا ملامت نہیں دیکھا!)

از غم خویش چناں شیفتہ کردی بازم　　　کز خیال تو بہ خود نیز نمی پردازم

(تمہارے غم جدائی نے مجھے کچھ ایسا دیوانہ بنا رکھا ہے کہ بس تمہاری ہی طرف خیال لگا ہوا اور کسی بات کی سدھ بدھ نہیں)

گفتہ بودی کہ خبر دہ کہ بہ ہجرم چونی　　　آں چناں ام کہ ببینی و ندانی بازم

(تم نے کہلا بھیجا تھا کہ بتاؤ میری جدائی میں اب تمہارا کیا حال ہے۔ حال کیا بتاؤں، میری کیفیت اب یہ ہے کہ تم مجھے دیکھو بھی تو پہچان نہ سکو۔)

ان کے سوا اور بھی کئی غزلیں ہیں۔ مثلاً (۱) مبادکس چو من خستہ مبتلائے فراق (۲) گل بے رخ یار خوش نباشد (۳) دی شب بہ خیال اشک رہ خواب می زدم۔ (۴) دیدہ دریا کنم و صبر بہ صحرا فگنم۔ (۵) صبا وقت سحر بوئے ز زلف یار می آورد۔ (۶) دلم بے جمالیت صفائے ندارد۔ وغیرہ۔ لیکن بخوف طوالت ان سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک خاصی مدت گزرنے کے بعد سسرال والوں پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حافظ پر جھوٹے بہتان جوڑے گئے تھے وہ ایک متقی پرہیزگار آدمی ہیں۔ وہ سب اپنے کیے پر نادم ہو کر مصالحت کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ حافظ کو ان کی طرف سے یہ خبر ملتی ہے اور مشورہ دیا جاتا ہے کہ کسی معقول آدمی کو بھیجیں تو آپس میں میل ملاپ ہو جائے گا۔ حافظ ایک معتبر و سنجیدہ شخص کو بھیجتے ہیں اور وہ وہاں سے مصالحت کی خوشخبری لے کر آتا ہے۔ اس پر حافظ یوں غزل خواں ہوتے ہیں

مژدہ اے دل کہ دگر باد صبا باز آمد　　　ہدہد خوش خبر از طرف سبا باز آمد

(اے دل تجھے خوشخبری سناتا ہوں کہ ہمارا قاصد نوید مصالحت لے کر وہاں سے واپس آ گیا۔ گویا کہ ہدہد سبا کی سرحد سے خوشخبری لے کر آیا ہے۔)

غالباً اسی دن حافظ کو شام میں سسرال آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ جب یہ وہاں پہنچتے ہیں تو ساز و سرود سے ان کا خیر مقدم کیا جاتا اور بڑے تکلف کے ساتھ ان کی ضیافت کی جاتی ہے۔ اس طرح آپس میں روابط دوستی و محبت دوبارہ مربوط ہو جاتے ہیں۔ ضیافت سے فارغ ہونے کے بعد حافظ زنانہ خانہ میں بلائے جاتے اور مراسم جلوہ کی از سر نو ادائیگی کے بعد اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ خلوت گاہ میں آتے ہیں۔ حافظ نے ذیل کی غزل میں ان باتوں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

مراد دنیا و عقبیٰ بہ من بخشید روزی بخش　　　بہ گوشم قول چنگ اوّل بہ دستم زلف یار آخر

(دنیا کے معنی ہیں: قریب کی چیز، شروع میں آنے والی چیز، موجودہ زندگی، عالم ہستی، جہان۔ عقبیٰ کے معنی ہیں: پیچھے آنے والی یا آخر میں آنے والی چیز، آخر میں آنے والی زندگی، عالم آخرت۔ حافظ فرماتے ہیں۔ ربّ العالمین

صب

نے اپنے فرماں بردار بندوں کے لیے جس طرح دنیا میں کھانے پینے اور آرام و آسائش کے ساتھ زندگی گزارنے کے اسباب و وسائل اور آخرت میں حور و قصور کے ساتھ جنت میں اعلیٰ پیمانے پر عیش و عشرت کے سامان مہیا فرمائے ہیں، اسی طرح ان ضیافت کرنے والوں نے بھی اوّل ساز و سرود اور پُر تکلف کھانوں سے میری ضیافت فرمائی اور آخر میں میری حور لقا محبوبہ سے ملاقات بھی کرا دی۔ اللہ کے فضل و کرم سے اس طرح میری دنیوی مراد بھی بر آئی اور اُخروی مراد بھی۔)

دلا چندم بریزی خوں ز دیدہ شرم دار آخر تو نیز اے دیدہ خوابی کن مراد دل بر آر آخر

(حافظ خلوت گاہ میں آکر فرماتے ہیں، اے دل آخر کب تک تو میری آنکھوں سے خون کے آنسو جاری کرتا رہے گا۔ تجھے کچھ تو شرم آنی چاہیے۔ اے میری آنکھو، تم بھی مراد پوری کر لو اور پھر آرام کی نیند لو۔)

منم اے دل کہ جاناں را ز عارض بوسہ می چینم تو عاے صبحدم دیدی کہ چوں آمد بہ کار آخر

(اے دل، ایک زمانہ وہ تھا کہ میں مہجوری کی مصیبت و پریشانی میں مبتلا تھا۔ آج وہی میں ہوں کہ دولتِ وصال میسّر ہے۔ تو نے دیکھا کہ میری دعائے سحری کیسی کام کی ثابت ہوئی۔)

بتے چوں ماہ زانو زد مئے چوں لعل پیش آورد تو گوئی تائبم حافظ ز ساقی شرم دار آخر

(ایک چاند سی نازنین روبرو آ بیٹھی اور دو زانو ہو کر شراب لعل رنگ جیسا شربت پیش کیا۔ حافظ تم کہتے ہو میں نے توبہ کر لی ہے۔ آخر ذرا تو شرم کرو، کیا ایسے ساقی کا بھی کچھ پاس خاطر تمھیں نہیں؟ — یہاں شراب خواری کے بہتان کی طرف لطیف پیرایہ میں کنایہ کیا ہے۔)

دوسرے دن صبح حافظ نے سسرال میں اس مسئلے کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا کہ ان کی بیوی کب ان کے گھر بھیجی جائیں گی اور وہاں سے تنہا گھر آکر مصلحتاً وہ صبر و ثبات سے کام لیتے رہے۔ اس طرح چند ہی روز گزرنے پائے ہوں گے کہ ایک دن رات کے وقت بے اطلاع یکایک ان کی محبوبہ ان کے گھر بھیج دی گئیں۔ اس پر انتہائے حیرت و مسرت سے یوں غزل سرا ہوتے ہیں:

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب کہ آمد ناگہاں دلدارم امشب

(آج کی رات کیسی مبارک ہے اور میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ بفضلہ تعالیٰ میری محبوبہ آج رات یکایک میرے گھر آ گئی۔)

چو دیدم روئے خوبش سجدہ کردم بحمد اللہ نکو کردارم امشب

(اس کی پیاری صورت دیکھتے ہی میں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ بحمد اللہ آج سے پھر میرا شمار نیکوکاروں میں ہو گیا ہے)

نہالِ عیشم از وصلش بر آورد ز بختِ خویش برخوردارم امشب

(اس کے آملنے سے میرا نہالِ زندگانی سرسبز و بارآور ہو گیا۔ آج سے میں بہرہ مند و کامیاب ہو گیا ہوں۔)

برات لیلۃ القدرے بہ دستم رسید از طالع بیدارم امشب

(آج رات میرا نصیبہ جاگا، اور شبِ قدر کی دستاویز میرے ہاتھ آ گئی۔ یعنی اس کا گھر آنا گویا شبِ قدر کی دستاویز ہاتھ آنا ہے۔)

تو صاحب نعمتی من مستحقم زکوٰۃِ حسن دہ مقدارم امشب

(تو دولت (حسن و جمال) کی مالک ہے اور میں ایک درویش بے نوا و مستحق ہوں۔ آج رات اس دولت کی زکوٰۃ مجھے ملنی چاہیے)

کشد نقش انا الحق بر زمین خوں چو منصور ار کشی بر دارم امشب

(آج کی رات میری یہ کیفیت ہے کہ اگر تو مجھے منصور کی طرح دار پر کھینچے تو میرا خون بھی زمین پر انا الحق کے نقوش بنائے گا)

برآں عزمم اگر خود می رود سر کہ سرپوش از طبق بردارم امشب

(میں نے آج یہ ٹھانی ہے کہ اپنے سر پر سے سرپوش اٹھا کر رہوں گا خواہ اس میں میرا سر ہی کیوں نہ اڑا دیا جائے)

ہمی ترسم کہ حافظ محو گردد ازیں شورے کہ در سر دارم امشب

(یہ ہیجان جو حافظ کے سر میں اس وقت جوش زن ہے مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ کہیں اسے ملیامیٹ نہ کر ڈالے)

غالباً حافظ اپنے زمانۂ شباب یعنی دورِ وزارتِ حاجی قوام میں کافی مرفہ الحال تھے، اپنے لیے ایک چھوٹا سا خوشنما قصر تعمیر کرایا تھا اور اسے پرفضا باغ سے زینت بھی دے رکھی تھی۔ شاید اسی بنا پر فرماتے ہیں:

آمرزشِ نقد است کسے را کہ درینجا یارے است چو حورے و سرائے چو بہشتی

(جس شخص کی محبوبہ ...... حور جیسی اور گھر بہشت جیسا ہو، یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی بخشائش قبل از آخرت یہیں دنیا میں ہو چکی ہے۔)

حافظ کی غزلوں کی سال وار ترتیب (مبنی بر استنباطِ قیاسی) اور ان کے اشعار کے مطالب کے تار و پود سے زیرِ عنوان شباب کا یہ دلچسپ ماجرا منسوج ہوا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کو ممکن الوقوع تصور کرنے کے لیے کافی قرائن موجود ہیں۔ عجب نہیں کہ یہ سرگزشت ہو، لیکن اس پر اب تقریباً چھ سو چھتیس سال گزر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی مدت گزرنے کے بعد اب اس کے بارے میں کوئی محققانہ اور قطعی رائے نہیں دی جا سکتی۔ اس امر کا فیصلہ کہ یہ سرگزشت ہے یا محض ایک افسانہ آپ پر چھوڑا جاتا ہے۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است

صراحیِ مئے ناب و سفینۂ غزل است

(حافظ)

شمیم احمد

فسادات اور اردو کے رپورتاژ[1]

ہندوستان کی تاریخ میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء اس لحاظ سے بڑا دن ہے کہ صدیوں کی غلامی کے بعد ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی لیکن اس آزادی نے ایک وسیع ملک کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ ہندوستان اور پاکستان۔ ہندوؤں کی اکثریت کے تمام علاقوں پر مشتمل ہندوستان بنا اور مسلمانوں کی اکثریت کے علاقوں کی بنا پر پاکستان ایک قومی نظریے کی بجائے دو قومی نظریے نے عملی شکل اختیار کی۔ ایک ملک سے دو ملک بنے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلمان کے درمیان منافرت اور زیادہ بڑھی اور یہ منافرت اپنی بھیانک شکل میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ کلکتہ اور نواکھالی سے فرقہ وارانہ فسادات کی آگ شروع ہو کر پنجاب، دہلی، یوپی، بہار، بمبئی، حیدرآباد وغیرہ سبھی جگہوں تک جا پہنچی قتل و غارت گری، عورتوں کی عصمت دری، مکانوں اور جائدادوں کی آتش زنی، لوٹ مار، دن دھاڑے ڈاکے غرض چو طرفہ مار دھاڑ، غیر اخلاقی اور انسانیت سوز حرکات کا گویا بازار گرم ہو گیا۔ کتنے ہی بچے یتیم ہوئے اور نیزوں پر لٹکا دیئے گئے۔ کتنے ہی بھائی اپنی لاڈلی اور چہیتی بہنوں سے بچھڑ گئے، کتنی ہی سہاگنوں کے سہاگ اجڑ گئے، کتنی ہی دوشیزاؤں کی عصمت و عفت کو لوٹا گیا، کتنی ہی ماؤں کی گودیں ممتا کی دہائی دے دے کے سونی ہو گئیں، کتنے ہی لوگ گھر سے بے گھر، وطن سے بے وطن ہو گئے۔ ایک ایسا طوفان اٹھا، ایک ایسا سیلاب آیا، ایک ایسی آگ پھیلی کہ جس کی مثال تاریخ کے خونیں صفحات بھی پیش کرنے سے قاصر رہے۔

تقسیم سے یہی سب کچھ نہیں ہوا بلکہ ایک اقتصادی مسئلہ بھی سامنے آیا اور وہ تھا تبادلۂ آبادی کا پیچیدہ اور سنگین مسئلہ، فسادات کے نتیجے میں ایک نیا ماحول بن گیا کہ "مہاجرین اور شرنارتھیوں" کے قافلے کے قافلے آنے اور جانے لگے۔ یہ کوئی معمولی نوعیت کا کام نہیں تھا۔ آبادی کے اس تبادلے میں جہاں بے شمار الجھنیں اور مصیبتیں تھیں وہاں ان کی آباد کاری کا ایک اہم ترین مسئلہ تھا جس سے دونوں ملکوں کا پورا معاشی نظام نہ صرف متاثر ہوا بلکہ دونوں ملکوں کے لیے یہ مسئلہ خاصا دردِ سر بن گیا۔

---

[1] تحقیقی مقالہ "صنف رپورتاژ اور اردو" کا ایک حصہ

باتے نے غیر معمولی اور اہم واقعات تھے کہ ادب پر ان کا بہت شدید اور گہرا اثر پڑا، اور ادیبوں کی سوجھ بوجھ، ان کے عمل و کردار اور ان کے نظریات و خیالات کے لیے ایک زبردست آزمائش کا وقت آن پڑا کچھ ادیب ایسے تھے جو تمام مشکلات اور مصیبتوں کے باوجود اپنے صحت مند اور افادی نقطہ نظر پر جمے رہے اور وقتی ہیجان کی رو میں نہ بہ کر فرقہ پرستی کے زہر سے محفوظ رہے کچھ اس طوفان کا شکار ہوئے اور اپنی تمام گزشتہ اچھی اور اعلیٰ خدمات پر پانی پھیر کر فرقہ وارانہ ذہنیت کے مبلغ بن گئے۔ اس کے علاوہ ان فسادات کے متعلق بھی، ادیبوں میں مختلف نظریات ابھرے۔

> "انحطاط پسندوں اور جنس پرستوں نے سیاسی اور سماجی اسباب کی طرف سے آنکھیں بند کر کے فسادات کا تجزیہ فرائڈ کی تحلیل نفسی کے ذریعے سے کرنا چاہا اور اسے عوام کی تشدد پسند جبلت اور جنسی گھٹن کا نتیجہ قرار دیا۔ . . . . ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے ان فسادات کا خیر مقدم کیا اور خونریزی کو اس خون سے تعبیر کیا جو بچے کی ولادت کے وقت ماں کے رحم سے جاری ہوتا ہے (ممتاز شیریں) بعض لوگوں نے فسادات کا فرقہ وارانہ تجزیہ کر کے کسی ایک فرقے یا مذہب کے لوگوں کو مورد الزام قرار دے دیا (ایم۔ اسلم)، کسی نے ان ہولناک واقعات میں بھی جنسی لذت کا سامان فراہم کیا (سعادت حسن منٹو[1])، لیکن ترقی پسند ادیبوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات کے سیاسی اور سماجی اسباب دریافت کرنے کی کوشش کی اور درندگی کے اس اندھیرے میں بھی انسانیت کی ٹمٹماتی ہوئی لو ڈھونڈھ لی[2]۔"

تقسیم کے بعد عملی طور پر ادیب جہاں ان خانوں میں بٹے، وہاں حسن عسکری نے ایک اور ایسا سوال کھڑا کر دیا جس سے ادب میں ایک بے راہ روی پیدا ہو جانے کے خدشات ابھرے۔ انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ادیبوں اور شاعروں کو حکومت اور ریاست کا وفادار ہونا چاہیے۔ اس سوال نے ادیبوں اور شاعروں کو ایک نئے مخمصے میں ڈال دیا۔ وہ حکومت اور ریاست کا آلۂ کار ہو کر رہتے ہیں، تو اس ادب کی تخلیق نہیں ہو سکتی جو عوام کی ترجمانی کا بار اٹھا سکے، اور اگر عوامی جد و جہد اور عوامی مسائل کو اپنی تخلیقات میں دردمندی کے ساتھ پیش کرتے ہیں تو ان کی وفاداری پر شک کیا جا سکتا ہے۔ اس مبہم اور متزلزل مسئلے پر ترقی پسند ادیبوں نے بھی کمال سنجیدگی کے ساتھ غور کیا اور اس سوال کا جواب یوں دیا کہ ادیبوں اور شاعروں کی دونوں حیثیتیں اپنی جگہ مجروح ہوئے بغیر برقرار رہ سکیں۔

---

[1] یہاں تجزیہ میں سردار جعفری نے منٹو کے ساتھ صریحاً زیادتی سے کام لیا ہے۔

[2] سردار جعفری (ترقی پسند ادب ص ۲۰۳)

"ترقی پسند ادیب عوام کے وفادار ہیں۔ ملک اور قوم کے وفادار ہیں۔ وہ اتنے ہی ذمہ دار ادیب ہیں، جتنے ذمہ دار شہری ہیں۔ ان کی ادبی اور شہری زندگی میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے اگر ریاست اور عوام کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے، اگر حکومت عوام کی ہے اور ملک اور قوم کی بہتری کے لیے ہے، تو ترقی پسند ادیب ریاست اور حکومت کے وفادار ہیں ورنہ نہیں، اس کا نچوڑ احتشام حسین نے دو سطروں میں پیش کر دیا۔ اچھے ادیب کا انسان دوست ہونا ضروری ہے، حکومت دوست ہونا ضروری نہیں ہے۔ وہ حکومت سے غداری کر سکتا ہے عوام سے غداری نہیں کر سکتا۔"[1]

ان تمام مسائل کی روشنی میں جب ہم ان نثری اور شعری تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں، جو فسادات کے نتیجے میں اور تقسیم کے بعد منظر عام پر آئیں تو ترقی پسند ادیبوں کا لہجہ سنبھلا ہوا اور متوازن نظر آتا ہے۔ اس میں نہ انحطاط کی سی جنسی لذتیت، کشش اور تحلیل نفسی ہے، نہ فسادات کا فرقہ وارانہ تجزیہ کر کے کسی ایک فریق کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے اور نہ عوامی مسائل کو پس پشت ہی ڈال دیا گیا ہے۔ نظم و نثر کی عام تخلیقات تو علیحدہ، ان تخلیقات میں جو خاص فسادات سے متعلق ہیں، یہ بے راہروی کہیں نظر نہیں آتی۔ فسادات کی بہیمیت کا پردہ فاش، جہاں بے شمار افسانوں اور نظموں کے ذریعے کیا گیا ہے وہاں ان موضوعات پر کئی اچھے رپورتاژ بھی لکھے گئے ہیں۔ رپورتاژ جس صنف کا نام ہے اس میں کسی مفروضے کو نہیں بلکہ صرف اس صداقت کو پیش کیا جاتا ہے جو ہمارے معاشرے میں وقوع پذیر ہوئی ہو، ایسے سنگین حالات میں جب کہ خود ادیب بھی عام انسانوں کی طرح کانٹوں کی شاہراہ سے گزر رہے تھے، صحت مند اور ہمدردانہ فضا قائم رکھنا نہ صرف مشکل کام ہے بلکہ ایک تعجب خیز بات بھی ہے۔ ان تلخیوں کو پیش کرنے میں ادیبوں کے صالح، سنجیدہ اور غیر فرقہ وارانہ نظریات نے ایسی تمام تخلیقات کو کسی کجروی کا شکار نہیں ہونے دیا، بلکہ ان کو بہت سنبھالا دیا ہے اور بے جھجک بغیر حقائق کی دردمندانہ لہجے میں تصویر کشی کی ہے۔ اور یہ سب کچھ ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ اردو کے رپورتاژوں کے صفحات پر جو لرزہ خیز کہانیاں بکھری پڑی ہیں، ان کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ان کے لکھنے والوں کے قدم ڈگمگا جاتے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ مگر خوشی کی بات ہے کہ ان کے لکھنے والے ایک دردمند انسان اور حساس فنکار کا دل رکھتے ہیں جنھیں صرف اس بات کا غم ہے کہ دوشیزۂ انسانیت سر بازار لوٹی جا رہی ہے۔ جس ادب میں ہنگامی حالات کے غین بیچوں بیچ اس صاف دل کے فنکار موجود ہوں۔ کیا اس ادب کا سر غرور سے اونچا نہ ہو جائے گا۔ اور اردو ادب اس معاملے میں خوش نصیبی کی معراج پر نظر آتا ہے۔

---

[1] سردار جعفری (ترقی پسند ادب ص ۲۰۳)

فسادات کے روح فرسا سانحات پر کئی رپورتاژ اردو میں لکھے گئے ہیں — لائل پور کے فسادات اور تبادلۂ آبادی کے سنگین اور مجنونانہ مسائل پر تاجور سامری نے "جب بندھن ٹوٹے" لاہور کے فسادات پر فکر تونسوی نے "چھٹا دریا" اور جمنا داس اختر نے "اور خدا دیکھتا رہا" دہلی کے فسادات پر شاہد احمد دہلوی نے "دلی کی بپتا" محمود ہاشمی نے کشمیر کے فسادات پر "پیر پنجال کے قیدی" اور "کشمیر اداس ہے" لکھے۔ حیدرآباد کے سیاسی انتشار، رضاکار تحریک کی سرگرمیوں اور پولیس ایکشن پر ابراہیم جلیس نے "دو ملک ایک کہانی" اور انور عنایت اللہ نے "قلعہ مضبوط تھا" لکھے۔

"پیر پنجال کے قیدی" کو ممتاز شیریں نے اردو کا سب سے اچھا رپورتاژ مانا ہے۔[1] بدقسمتی سے مجھے نہ تو یہ رپورتاژ ہی دستیاب ہو سکا اور نہ ممتاز شیریں کا اس پر تبصرہ اس لیے اس وقت اس رپورتاژ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے قاصر ہوں۔ البتہ ذیل کے اقتباس سے اس کے بارے میں کچھ اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے:

"یہ رپورتاژ اس وقت لکھا گیا جب کشمیر جل رہا تھا۔ محمود صاحب خود ان شعلوں کی لپک سے بال بال بچے ہیں۔ اس رپورتاژ میں معصوم بچوں کی چیخیں، عورتوں اور بوڑھوں کی خوف زدہ اور لرزہ براندام کر دینے والی ہیبت آوازیں بھی ہیں۔ یہ کافی گہرے اور تاثراتی رنگ کا ہے جس کی وجہ سے خاص و عام میں کافی مقبول ہے۔"[2]

اگر مجھے یہ رپورتاژ دستیاب ہو گیا تو کسی علیحدہ مضمون میں اس پر تبصرہ کر کے اپنے خیالات پیش کروں گا۔

تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات پر لکھے گئے ان مشہور رپورتاژوں میں فکر تونسوی کا رپورتاژ "چھٹا دریا" کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اولاً یہ ۹ اگست تا ۸ نومبر ۱۹۴۷ء کے ان ہولناک اخلاق سوز اور شرمناک واقعات کی زندۂ جاوید تاریخ ہے جو لاہور میں پیش آئے۔ اس کے مطالعے سے انسانیت کے اس وحشت ناک دور سے نہ صرف نفرت ہوتی ہے بلکہ عبرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ فکر تونسوی نے بڑے شدید جذباتی اور تلخ ترین لہجے میں پوری نفرت انگیزیوں اور کربناکی کے ساتھ ان واقعات کو پیش کیا ہے۔ اس وقت فرقہ پرستی کے زہریلے نشے میں چور ہو کر ظالموں نے تو صرف اتنا ہی کیا تھا کہ خون کے دریا بہا دیے تھے لیکن فکر نے ان واقعات کو لکھ کر نہ صرف خون کے آنسو بہائے ہیں بلکہ قلم کی روشنائی میں انسانیت کے خون کی آمیزش سے ایک "چھٹا دریا" کی تخلیق کی ہے۔ ثانیاً یہ کہ اس کتاب میں فکر نے بے پناہ توازن برقرار رکھا ہے اس کے باوجود اس کا انداز

---

[1] بحوالہ حسن امینی (ماہنامہ کردار بھوپال بابت ماہ فروری ۱۹۵۶ء)

[2] حسن امینی (ماہنامہ کردار بھوپال بابت ماہ فروری ۱۹۵۶ء)

انتہائی جذباتی اور تلخ ترین ہے۔ لیکن واقعات کو پیش کرنے میں وہ کسی قسم کی خطرناک جذباتیت کا شکار نہیں ہے بلکہ اس کی جذباتیت بڑی متنوع اور متوازن ہے۔ ثالثاً یہ کہ فکر نے محض ان واقعات کی تصویر کشی ہی نہیں کی بلکہ ان کے پس پشت جو سماجی سیاسی اور اخلاقی کج روی کے اسباب تھے انھیں پوری دیانت داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خود غرض سیاست دانوں اور چالاک سامراجی ذہنیت کا پردہ فاش کیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ان سے نفرت کم ہوتی ہے جو خونریزی کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ بلکہ ان سے بہت زیادہ نفرت ہوتی ہے جنھوں نے ان تخریبی کارروائیوں کی پشت پناہی کی اور اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر ایسے حالات پیدا کر دیے تھے رابعاً یہ کہ فکر نے بعض اہم مسائل جیسے تبادلۂ آبادی پر بھی پوری شدت کے ساتھ اپنے صحت مند خیالات کا اظہار کیا ہے اور اسے پاگل سیاست دانوں کا جنون قرار دیا ہے۔

تبادلۂ آبادی کے علاوہ مقامی زندگی کے بڑے سے لے کر چھوٹے سیکڑوں مسائل ہیں جو فسادات کی بدولت وجود میں آئے، ان فسادات نے روزانہ کی سماجی زندگی کو معطل کر دیا تھا قتل و غارت گری لوٹ مار آتش زنی اور ان سب کے سدباب کے لیے کرفیو کا نفوذ جس کی وجہ سے انسان اپنی زندگی کی معمولی معمولی ضروریات کے لیے دل مسوس کر رہ گئے۔ لاہور کے بارونق گلی کوچے اور بازار سنسان اور ویران نظر آتے تھے۔ ان فسادات نے انسانوں کا اعتماد تک چھین لیا تھا، وہ سڑکوں اور گلیوں میں نکلتے تو ڈرتے، جھجکتے ادھر ادھر چونک چونک کے دیکھتے ہوئے، کوئی کسی کا دوست نہیں تھا اور اب لگتا تھا جیسے ہر شخص ایک دوسرے کا جانی دشمن بن گیا ہے ان سارے واقعات کو ان کی معمولی کیفیات کے ساتھ فکر نے بڑی خوبی سے اس رپورتاژ میں پیش کر دیا ہے اور اس پر مستزاد اس کا تیکھا اور چبھتا ہوا طنز ـــ جو کم از کم قاری کے سراپا کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

یہ سارے واقعات فکر کی آنکھوں سے گزرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اسے اپنے جذبات پر قابو ہے حالانکہ اس رپورتاژ میں وہ جگہ جگہ جذباتی باتیں کرتا ہے۔ قدم قدم پر جذباتیت کا شکار نظر آتا ہے، لیکن یہ خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ جذبات نہیں ہیں، تخریب پسند اور نفرت انگیز جذبات نہیں ہیں بلکہ نہایت حسین اور پائیدار پاکیزگی اور پیار و محبت کے جذبات ہیں۔ انسانیت کے لیے درد، کرب، تڑپ اور اٹوٹ پیار کے جذبات ہیں اسے اپنے وطن لاہور کی گلیوں سے والہانہ عشق ہے، وہ بے خوف و خطر ان گلیوں میں گھومتا ہے جان کی پرواہ کیے بغیر اس یقین کے ساتھ کہ اسے کوئی نہیں مارے گا کیوں کہ وہ لاہور کا باسی ہے اور سارے لاہور کے لوگ اس کے دوست ہیں اور دوست کبھی دوست پر ہاتھ نہیں اٹھاتا، وہ تو اسے گلے سے لگاتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ فکر ان جذبات کے ساتھ ہی لاہور میں گھومتا پھرتا ہے، جہاں وہ دیکھتا ہے کہ نلوں سے پانی کی سفید سفید دھاریں جاری ہیں، اور ان کو کوئی پینے والا نہیں۔ وہ مہاجرین کے کیمپوں اور اسٹیشن پر پڑے ہوئے لوگوں کی کسمپرسی کے دل دوز نظارے کرتا ہے، وہاں کی گندگیوں، غلاظتوں اور تعفن کی بو سونگھتا،

بدعنوانیوں اور بداخلاقیوں اور آپسی جھگڑوں اور نفسی کی عبرت خیز تصاویر دیکھتا ہے اور ان سب پر دل کڑھاتا ہے اور جان جلاتا ہے اور اسٹیشن پر ایک پندرہ سالہ دوشیزہ کا احساس شرم و حیا مرتا دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

اسی طرح کے سیکڑوں روح فرسا اور رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات ہیں جو یہ انسانیت سوز اور ننگ تہذیب و اخلاق فسادات اپنی زہر کی پوٹلی میں باندھ کر لائے۔ فکر تونسوی نے ان کا بڑا گہرا جائزہ لیا ہے۔ فکر کی روح ان واقعات کو دیکھ کر کانپ اٹھی ہے، اس کے دل و دماغ بے چین ہو گئے ہیں، اس نے ان کا ہمدردی کے ساتھ اصلاحی جذبے کے ساتھ اور تکلیف دہ احساس کے ساتھ جائزہ لیا ہے، وہ ان واقعات سے لطف اندوز نہیں ہوتا، اسے پندرہ سالہ دوشیزہ کی برسرِ عام برہنگی میں جنسی لذت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ تڑپ تڑپ اٹھتا ہے اور اس کے دماغ میں ایک نامعلوم سی لیکن انتہائی اذیت ناک شے ہے جو ٹوٹ سی جاتی ہے۔

فکر تونسوی نے "چھٹا دریا" کو ڈائری کی صنف میں رکھا ہے۔ اس کے دیباچے میں سہیل عظیم آبادی نے بھی اسے ڈائری ہی کہا ہے، لیکن یہ بالکل غلط ہے، یہ ایک اچھا اور نہایت مکمل رپورتاژ ہے، اس ڈائری کے اوراق فکر کی اپنی نجی زندگی اور شخصیت سے متعلق نہیں بلکہ ان میں ایک پورے سماج کے اجتماعی مسائل کی ترجمانی کی گئی ہے، جس میں خارجیت اور داخلیت کا بے حد پیارا اور حسین امتزاج ہے جو ایک اچھے رپورتاژ کی ایک اہم خوبی ہے جب کہ ڈائری خالص اور محض داخلی جذبات، تاثرات اور کیفیات کی ہی ترجمانی ہوتی ہے۔ اس لیے "چھٹا دریا" ایک ڈائری کسی طرح نہیں بلکہ مکمل اور جامع رپورتاژ ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اعجاز حسین نے جن چند اچھے رپورتاژ کے نام گنائے ہیں ان میں چھٹا دریا بھی شامل ہے[1]۔ اور یہی بات درست ہے۔

لائل پور کے فرقہ وارانہ فسادات اور تبادلۂ آبادی کے غیر دانشمندانہ مسائل پر تاجور سامری نے ایک خوبصورت رپورتاژ "جب بندھن ٹوٹے" لکھا ہے۔ فکر کے "چھٹا دریا" اور اس رپورتاژ میں یہ بات مشترک ہے کہ دونوں رپورتاژ نگاروں نے ان فسادات کے اسباب و علل کو تلاش کیا ہے، اور ان کی شدت سے مذمت کی ہے۔ فسادات کے شعلوں سے جب دونوں ملک جھلس رہے تھے، تو اس کی لپٹیں لائل پور میں بھی محسوس ہوئیں۔ وطن دشمن اور تخریب کار عناصر نے وہاں کی فضا بھی خراب کر دی تو بے گناہ اور معصوم لوگوں کے سامنے ترکِ وطن کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ گیا۔ آنے والوں میں تاجور سامری بھی تھے، اور انھوں نے اس سفر کی داستان "جب بندھن ٹوٹے" کے خونیں اوراق پر ٹانکی ہے۔ اس رپورتاژ کے مطالعے سے بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ فسادات کے جاں گسل ماحول کے باوجود تاجور سامری نے اپنے صحت مند خیالات اور نظریات کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور کسی وقتی جذبے کے

---

[1] اردو ادب آزادی کے بعد (ص ۲۸۴)

تحت فرقہ پرستی کے زہر کو قبول نہ کیا۔ انھوں نے سارے دل دوز واقعات کو پوری صداقت کے ساتھ ایک اصلاحی جذبے کے تحت قلمبند کر دیا ہے۔ اس رپورتاژ میں تبادلۂ آبادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ساری دشواریوں اور مصیبتوں کا بڑی گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اس کا تعلق دونوں ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی کشمکش سے ہی نہیں بلکہ اس برصغیر کی تہذیبوں اور ان تہذیبوں کی ختم نہ ہونے والی روایات سے ہے، تاجور سامری نے اس رپورتاژ میں ان تہذیبی رشتوں پر ہی سوال اٹھایا ہے اور ناعاقبت اندیش سیاستدانوں سے جواب طلب کیا ہے کہ کیا تقسیم کے ذریعہ تم ان تہذیبی رشتوں اور جذبات کو بھی بانٹ سکتے ہو؟ اس رپورتاژ پر تبصرہ کرتے ہوئے سید احتشام حسین نے لکھا ہے کہ:

> "کیا وہ مسلمان جو ہندوستان کے مختلف حصّوں سے پاکستان گئے ہیں وہاں کی زندگی میں صرف اس لیے کھپ جائیں گے کہ ان کا مذہب اسلام ہے؟ کیا وہ سارے ہندو اور سکھ جو پاکستان سے ہندوستان آئے ہیں یہاں وہی سکون پائیں گے جو انھیں اپنے گھروں میں حاصل تھا؟ کیا مذہب، تہذیبی یگانگت کی روح بھی پیدا کر سکتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب ہر شخص مختلف دے گا۔ تاجور سامری کے خیال میں یہ مسئلہ بہت گہرا ہے اور ظاہری ہمدردیوں اور مذہبی یکسانیت سے حل نہیں ہو سکتا۔ یگانگت کی روح کہیں اور بستی ہے۔"[1]

تاجور سامری نے اس رپورتاژ میں لٹے پٹے اور پریشان انسانوں کی کسمپرسی اور ناگفتہ بہ حالتوں کی محض تصویر کشی ہی نہیں کی ہے بلکہ بعض ایسی کیفیات کو بھی دکھایا ہے جنھیں پڑھ کر خود انسانیت دہائی دینے لگتی ہے۔ جب مصیبتوں کی بلائیں نازل ہوتی ہیں، تو کس طرح افراد اجتماعی مسائل اور پریشانیوں کے باوجود خود غرضی اور انفرادی فائدوں کی دلدل میں پھنس جاتے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے لڑتے اور جھگڑتے ہیں، فکر کے چٹیل رہیا میں بھی یہی کیفیات نظر آتی ہیں، اور اندازہ ہوتا ہے کہ فسادات نے وہ شدید صورت حال اختیار کر لی تھی، کہ لوگ جو سماجی اور تہذیبی رشتوں میں جڑے ہوئے تھے ان سب رشتوں کو توڑ کر صرف ایک اپنی ذات کے رشتے میں منسلک ہو گئے تھے۔ سماجی زندگی کا شعور اسی وقت ختم ہوتا ہے جب انسان کے ہوش و حواس جاتے رہیں۔ ان فسادات نے انسانی ہوش و حواس چھین لیے تھے اور ان کے ذہنوں سے سماجی شعور کا نور چرا لیا تھا، ان کے سامنے اندھیرا تھا اور غیر یقینی مستقبل۔ تاجور سامری نے ان کے احساسات اور ان کی نفسیاتی الجھنوں کا بہت گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ ان حالات میں کسی ایک انسان کا کامل ہوش مندی اور پورے شعور سے سماج کے ناسوروں کو دیکھنا پرکھنا ان کی جراحت کا کام انجام دینا اور رائے صالح اور صحت مند نقطۂ نظر پر قائم رہنا بہت بڑی بات ہے۔ تاجور سامری کے بارے میں یہی رائے قائم کرنی پڑتی ہے۔

---

[1] ماہنامہ افکار بھوپال بابت ۱۹۴۹ء (رسالہ پر مہینہ درج نہیں ہے)

فسادات سے متعلق ان دو رپورتاژوں کے مطالعے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں جو صورت حال پیدا ہوئی اس سے ادیبوں اور شاعروں کا غیر متوازن ہو جانا بھی فطری تھا لیکن زیادہ تر ادیبوں اور شاعروں نے توازن اور صحت مند خیالات کو برقرار رکھ کر نہ صرف ادب کی قدروں کو تباہی سے بچایا ہے بلکہ انسانیت کی بھی لاج رکھ لی۔ اور اس سلسلے میں کوئی بھی اس روشنی کو فراموش اور نظر انداز نہیں کر سکے گا جو ترقی پسندی کے دریچے سے چھن کر ان تک آ رہی تھی۔

آزادی کے بعد جہاں ہندوستان اور پاکستان کا دو علیحدہ مملکتوں کی شکل میں قیام عمل میں آیا، اور ان کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ چاروں اطراف پھیلی وہاں ریاستوں کی حیثیت کا بھی ایک سنجیدہ اور پیچیدہ مسئلہ سامنے آیا۔ سردار پٹیل نے ہندوستانی علاقے کی تمام ریاستوں کو الٹی میٹم دیا کہ وہ اپنے آپ کو انڈین یونین میں ضم کر دیں۔ اس سلسلے میں بڑی الجھنیں کھڑی ہوئیں کیوں کہ بعض ریاستیں خود مختار اور آزادانہ حیثیت کی مالک رہنا چاہتی تھیں۔ جنوبی ہند میں حیدر آباد کی وسیع ریاست تھی، وہاں کے نظام نے ہند یونین میں شامل ہونے میں پس و پیش کیا۔ اس زمانے میں ہی قاسم رضوی کی قیادت میں ایک رضاکار فورس تنظیم دی گئی، جس نے آزاد حیدر آباد اسٹیٹ کے تصور کو نہ صرف عام کیا بلکہ اس کے لیے انتہائی سرگرمی سے کام بھی کیا۔ حکومت ہند نے جب یہ صورت حال دیکھی تو پوری ریاست کی ناکہ بندی کر دی۔ سامان خورد و نوش سے لے کر زندگی کی چھوٹی چھوٹی اشیا کی درآمد تک حیدر آباد میں بند ہو گئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر نفع اندوزوں نے بازار کی تمام اشیا کا اسٹاک تہ خانوں میں پہنچا دیا۔ گرانی اس حد تک بڑھی کہ سگریٹ اور بلیڈ جیسی معمولی چیزیں بہ انتہا مہنگے داموں فروخت ہوئیں۔ اس پر بھی جب رضاکار تحریک کا زور نہ ٹوٹا تو حیدر آباد کو انڈین یونین میں شامل کرنے کے لیے حکومت ہند نے پولیس ایکشن کیا۔ اس سے بھاری جانی و مالی نقصان ہوا۔ ادھر رضاکار تحریک کے قائدین نے اب تک لوگوں کو طفلی تسلیاں دے رہے تھے، ان کے ہاتھ سے سارے علاقے نکلتے جا رہے تھے اور وہ اعلان کر رہے تھے کہ ان کی فوجیں بڑی دیدہ دلیری اور جانفشانی کے ساتھ لڑ رہی تھیں۔ آخر لوگ حقیقت حال سے اس وقت آگاہ ہو ہی گئے جب اورنگ آباد ریڈیو اسٹیشن کے اناونسر نے اعلان کیا کہ "یہ آل انڈیا ریڈیو اورنگ آباد ہے۔" حیدر آباد کے اس سیاسی انتشار پر دو رپورتاژ لکھے گئے ہیں، ایک ابراہیم جلیس نے "دو ملک ایک کہانی" اور دوسرا انور عنایت اللہ نے "قلعہ مضبوط تھا" لکھے۔

ابراہیم جلیس نے "دو ملک ایک کہانی" میں حیدر آباد کی اس صورت حال کو بڑے حسین اور جذبات انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ اس میں انھوں نے رضاکار تحریک سے اپنی وابستگی کی وجوہات، اس تحریک کی بعض کمزوریوں اور شاہ عثمان کی کچھ لغزشوں پر بڑی سخت تنقید کی ہے۔ اس میں جلیس نے قدم قدم پر طنز کے تیر و نشتر چلائے ہیں ان کے لہجے میں کوٹ کوٹ کر تلخی اور ترشی بھری ہوئی ہے۔ موضوع کے بے پناہ تنوع اور ہمہ گیری اور بے مثل فنکارانہ خوبیوں کے سبب یہ رپورتاژ ایک ادبی شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے "دو ملک ایک کہانی" کو

صبح

صنفِ رپورتاژ کے ارتقا میں ایک ستھرا معیار بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

"دو ملک ایک کہانی" میں ابراہیم جلیس نے حیدرآباد کے اس سیاسی بحران کا پورا محاکمہ کیا ہے۔ ابراہیم جلیس اس میں خود ایک اہم اور مرکزی کردار کی حیثیت سے موجود ہیں۔ ابتداً وہ کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک اہم اور سرگرم رکن تھے، لیکن تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں مختلف مقامات پر جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور جن کے نتیجے میں جو لوٹ مار قتل و غارت گری اور عورتوں کی بے حرمتی ہوئی اور ابراہیم جلیس کی " بہن کی گرہ کی تشنہ کام محبت بلقیس جہاں کو کٹڑہ جیمل سنگھ امرتسر کے چوک کے بیچوں بیچ مادرزاد ننگا[1]" کر کے اس کی عصمت لی گئی تو ابراہیم جلیس اس حادثے کو برداشت نہ کر سکے اور ان کے ذہن پر ایک زبردست چوٹ پڑی۔ وہ اپنے دل و دماغ پر قابو نہ رکھ سکے۔ اور کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے استعفیٰ دے کر انجمن اتحاد المسلمین اور رضا کار تحریک میں شامل ہو گئے۔ جس سے انھیں کبھی نفرت تھی اور جن کی وہ کھل کر مخالفت کرتے اب ان کے ہی زبردست حامی اور موئید بن گئے۔

"دو ملک ایک کہانی" ابتدا سے لے کر آخر تک کئی مسائل اور مختلف نظریات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس میں جو کہانی پیش کی گئی ہے وہ تین بڑے بڑے حصّوں میں بانٹی جا سکتی ہے۔ ہر حصہ کئی مختصر ابواب پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد جو حالات حیدرآباد میں رونما ہوئے انھیں ابراہیم جلیس نے ایک محب وطن اور ترقی پسند ادیب کی نظر سے پیش کیا ہے۔ ان کے بیان میں اپنا نقطۂ نظر نہایت واضح صحت مند اور ترقی پسندانہ ہے۔ ابراہیم جلیس کا یہ انداز کہانی کی تمہید اور پہلے باب بعنوان "ہر جگتی یار وفادار" سے شروع ہو کر نصف باب بعنوان "زہر کے تاجر" تک برقرار رہتا ہے۔ اس حصے میں ابراہیم جلیس کا طرزِ فکر و عمل صحت مندی اور وطن دوستی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے وہ ہندوستان کی آزادی کا خلوصِ دل سے استقبال کرتے ہیں، جشنِ آزادی کا بڑا حسین نقشہ کھینچتے ہوئے آزادی کے حصول کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں اور دکھاتے ہیں کہ کس جد و جہد اور جانفشانی کے بعد ایک طویل المدت غلامانہ زندگی کا خاتمہ ہوا ہے۔

انھوں نے جا بجا انگریز سامراجیت پر طنز کیے ہیں اور آزادی کی دیوی کو خوش آمدید کہا ہے۔ عثمان شاہی شہنشاہ پرست ذہنیت، رضا کار تحریک، قومی تفرقوں، حیدرآباد کی خود مختارانہ اور آزادانہ حیثیت اور عوام کی معصومیت اور بھولے پن جس نے کہ ان کے ذہنوں میں ایک جنوبی پاکستان کا تصور پیدا کر دیا تھا، پر خوب طنز کیے ہیں اور جی بھر کے مذاق اڑایا ہے اور اس کے ساتھ ہی ملکی وحدت فرقہ وارانہ اتحاد، بھائی چارے اور سنگٹھن اور ایک قومی نظریہ کی تبلیغ خوب خوب کی ہے، لیکن اسی باب (زہر کے تاجر) کے نصف آخر سے ان کا ذہن ایک دم تبدیل ہو جا

---

[1] دو ملک ایک کہانی (ص ۲۸)

ان کے بارے نظریات بدل جاتے ہیں۔ وہ کمیونسٹ پارٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کو چھوڑ کر مجلس اتحاد المسلمین اور رضاکار تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب کا ایک زبردست موڑ ہے۔ یہاں تک فرقہ پرستی، رضاکار تحریک، حیدرآباد کی خودمختارانہ حیثیت، جنوبی پاکستان کے تصور اور دو قومی نظریات کے خلاف نفرت کا جو جذبہ تھا، وہ اب بدل جاتا ہے کیونکہ ان کی "بلقیس" کو امرتسر میں ننگا کر کے اس کی عصمت دری کی گئی تھی۔ اس مرحلے پر رضاکار ابراہیم جلیس کا جنم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ سب باتیں ان کی ذہنی ساخت کے قطعی برعکس ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک شدید ذہنی خلفشار اور کرب نفسیاتی الجھن اور چپقلش میں مبتلا نظر آتے ہیں اور ان کے سامنے زندگی کا کوئی واضح اور روشن راستہ نہیں رہتا، کوئی منزل نہیں رہتی، وہ راہ کی پیچیدگیوں اور اندھیروں میں ہاتھ پاؤں مارتے نظر آنے لگتے ہیں جس کا اظہار وہ خود جا بجا کرتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں ایک رسہ کشی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ایک طرف وہ ان تمام باتوں سے متنفر اور بدظن نظر آتے ہیں تو دوسری طرف عملی طور پر ان کو سپورٹ بھی کرتے اور ان کے ساتھ ساتھ چلتے بھی نظر آتے ہیں۔ بہرحال یہ حصہ نہ صرف ابراہیم جلیس کی ذہنی تبدیلیوں کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی نہایت اہم اور غیر معمولی ہے کہ یہ اس کتاب کا زبردست موڑ بھی ہے — اور پوری کتاب کی قدر و قیمت کا انحصار اسی حصے پر ہے۔ یہاں ابراہیم جلیس نے کچھ چھپایا نہیں ہے بلکہ خود تنقیدی کا وہ اعلیٰ معیار پیش کیا ہے جو اردو ادب میں خال خال ملتا ہے۔

'دو ملک ایک کہانی' کا یہ دوسرا حصہ بعنوان "سرخ ستارہ" تک جاری رہتا ہے جس میں انھوں نے حیدرآباد کی رضاکار تحریک، معاشی ناکہ بندی، پولیس ایکشن اور حیدرآباد کی انڈین یونین میں شمولیت کے واقعات کی تفصیل پیش کی ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصے کے درمیان "خوش رہو اہلِ وطن" اور "ارتھ انڈیا سے ایرانڈیا میں" اس کتاب کے دو باب ہیں جو ابراہیم جلیس کی چوتھی حیدرآباد سے بمبئی کے لیے روانگی اور وہاں سے پاکستان کے لیے ہجرت کے بیانات پر مبنی ہیں ان دونوں ابواب کا تعلق خاص ان کی ذات سے ہے۔ ان ابواب میں وہ فراریت کے شدید شکار نظر آتے ہیں کیونکہ انھوں نے ایرانڈیا کی ہوسٹس مس جروس کی دلکش مسکراہٹ اس کی گھنیری زلفوں اور اس کی آنکھوں کی چمک میں اپنی ذہنی کشمکش، اپنی پریشانیوں اور اپنی الجھنوں کا مداوا تلاش کرنا چاہا۔ انھیں زمین اور زمین کے حسن وہاں کی دلکشی اور وہاں کی ہنگامہ خیز زندگی سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ خلا میں ابدی سکون اور قرار کے متلاشی نظر آتے ہیں انھیں اب ارتھ انڈیا" کے بمقابلہ "ایرانڈیا" زیادہ پرسکون خوشگوار، دلفریب اور انسانی جگہ نظر آتی ہے، جہاں مسجد و مندر، محل اور جھونپڑی، قوم پرستی اور فرقہ پرستی دکھائی نہیں دیتی بلکہ صرف مس جروس ہی نظر آتی ہے جو فضاؤں کی ملکہ، پون رانی ہے، اور کوئن آف دی ایر ہے — حالات کی سخت کوشی اور بہیمیت کے احساس کے باوجود قاری اس فراری جذبے کو ہرگز پسند نہیں کرے گا۔

'دو ملک ایک کہانی' کا تیسرا حصہ آخری دو ابواب بعنوان "اسلامی مملکت کے دروازے پر" اور "ایک جلوس"

پاکستان پہنچنے کے بعد وہاں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں پاکستان کے ادیبوں کی حالت اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور خود اپنی متزلزل اور غیر ہموار شخصیت کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ یہاں بھی ان کی شخصیت بڑی الجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کے درمیان معلق نظر آتے ہیں، وہ لاہور کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتے اور ترقی پسند ادیبوں سے ملتے ہیں لیکن جھجکے جھجکے اور پشیماں پشیماں سے عبداللہ ملک سے نظر ملانے میں بری طرح جھینپتے ہیں اور ذہنی الجھن اور نفسیاتی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان دو ابواب میں انھوں نے اپنی پچھلی غلطیوں اور کمزوریوں کا کھل کر اعتراف کیا ہے اور ان پر کھل کر پشیمان اور شرمندہ نظر آتے ہیں، اور یہ احساس پشیمانی انھیں ضرورت سے زیادہ صاف گو بنا دیتا ہے — اور یہ ایک اچھا جذبہ ہے۔

مجموعی اعتبار سے 'دو ملک ایک کہانی' حیدرآباد کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اخلاقی انتشار، پولیس ایکشن، عوام پر مظالم اور ان کی زبوں حالی، رضاکار تحریک اور انجمن اتحاد المسلمین کی کمزوریوں، اپنی ذہنی کشمکش اور نفسیاتی خلفشار، پاکستان کی ابتری اور اپنے غلط اقدامات اور سرگرمیوں پر اظہار پشیمانی اور شرمندگی کے اعتبار سے ایک مکمل رپورتاژ ہے۔ جس میں ابراہیم جلیس کی صاف گوئی، صداقت اور حقیقت نگاری، اور گہرے اور جذبات انگیز تاثرات، طنز کے اچھوتے نوکیلے اور چبھتے ہوئے نشتر اور ستھری رنگین، دلچسپی اور معیاری زبان موجود ہے۔ ان تمام عناصر نے مل کر دو ملک ایک کہانی کو اردو کا ایک اہم اور معیاری رپورتاژ بنا دیا ہے۔

فسادات پر لکھے گئے ان رپورتاژوں کو ان کی صحت مندی اور غیر فرقہ وارانہ فضا اور ادیبوں کے سنبھلے ہوئے اور متوازن اندازِ فکر کے باعث اردو کے افادی اور بے داغ ادب کی صف میں ایک بلند مقام دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند

گلگشتِ کشمیر

چار درویش میں ایک کردار ہے نعمان سیّاح۔ نام کے ساتھ یہ لاابالی لقب کتنی رومانی دنیاؤں کے نقشے نظر کے سامنے گزار دیتا ہے۔ کسی استاد نے بھی یہی ترغیب دی ہے:

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں   زندگانی بھی رہی تو نوجوانی پھر کہاں

ایک طرف یہ اکساہٹیں دوسری طرف اپنا یہ حال کہ نوجوانی تو گئی گزری ہوئی جوانی بھی چل چلاؤ کے عالم میں ہے طے کیا کہ اس سے قبل کہ زندگانی ترکِ سوالات کرے ہری بھری دنیا کی کچھ ہری بھری جھلکیاں دیکھ لی جائیں۔ ٹیکسیوں کی ارزانی اور سامان کی گرانی کے اس دور میں یہ حماقت لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے کے برابر ہے لیکن ان دیکھے کو دیکھنے کا لپکا نچلا بیٹھنے بھی دے۔

پچھلے سال میسور واوٹی کی گلگشت کی تھی مدراس کی پٹاروں سے پاؤں تر کیے تھے اس سال کشمیر وڈلہوزی کی پہاڑیوں کو جنت نگاہ بنانے کا قصد کیا چنانچہ مئی کے آخر میں رختِ سفر باندھ کر اہل و عیال کے ساتھ چل کھڑا ہوا جموں سے گزرتے ہی پہاڑوں کے نشیب و فراز شروع ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ بلندیاں زیادہ بلند اور پستیاں زیادہ پست ہوتی چلی گئیں۔ نیچے کھڈ یا گھاٹی میں دیکھیے تو کم ہمتی کو پسینے آنے لگیں لیکن یہی اونچ نیچ تو انسان کو محبوب ہے۔ ہموار میدان میں سہولت ہے افادیت ہے لیکن دلکشی نہیں۔ اس کے برعکس زمین جتنی ناہموار ہو اونچائی اور گہرائی میں جتنا تفاوت ہو نظر کو اتنا ہی سہانا معلوم ہوتا ہے۔ تہذیب نے انسان کو ہزاروں سال اپنا دودھ پلایا لیکن یہ غار کا باسی اب بھی اپنی فطرت میں بن مانس ہے۔ اب بھی جب اسے موقع ملتا ہے شہروں سے بھاگ کر جنگل میں پناہ لیتا ہے اس کی آنکھوں کو بلند و بالا آراستہ و پیراستہ عمارتوں کے دیکھنے سے وہ فرحت نہیں ہوتی جو باغ و راغ کی ہریالی سے اس حسنِ فطرت کی معراج دیکھنی ہے تو پہاڑوں پر دیکھیے۔

پہاڑ اکثر سرسبز و شاداب تو ہوتے ہی ہیں کشمیر میں یہ حسن مستزاد ہے کہ یہاں پانی کی بہتات ہے۔ قدم قدم پہ چشمے اور جھرنے ہیں۔ سبزے کے ساتھ آبِ رواں بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔

پہاڑی سڑکیں تنگ ہوتی ہیں لیکن پٹھان کوٹ سے سری نگر کا راستہ دوہری گاڑیوں کے گزرنے کے لائق ہے

ایسے تنگ دامن موڑ بہت شاذ ہیں جہاں آمنے سامنے کی گاڑیاں گزر سکیں۔ ان مقامات پر پل بنا کر گزرگاہ کو چوڑا کیا جا رہا ہے۔ پہاڑوں کو تراشا جا رہا ہے۔ یہ کام فوج کے جوان مستعدی سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کی لگن اور تن دہی سے اپنے ملک کا عزم بالجزم ٹپکتا ہے۔

پہاڑی راستے کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ ہر قدم پر پیچ و خم، موڑ توڑ، اتار چڑھاؤ۔ کشمیر کو جانے والی بسیں نہایت آرام دہ اور ڈرائیور نہایت کار آزمودہ ہوتے ہیں۔ بعض مرتبہ بس بالکل سڑک کے کنارے سے گزر جاتی ہے نیچے سینکڑوں گز گہرا کھڈ ہوتا ہے یعنی زندگی اور موت کے درمیان ایک دو بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے لیکن زندگی ہمیشہ فاتح اور نامور رہتی ہے۔ سفر میں قریب شام ہم سے بہت نیچے دور تک ایک پہاڑی نالہ ہمارا ساتھ دیتا رہا۔ پتھروں کے بیچ تیزی سے رواں دواں۔ بے صبر و بے قرار۔ منہ میں سفید کف لیے۔ دھارے جگہ جگہ چرتے پھٹتے مجروح ہوتے اور اس کے بعد پھر مل جاتے۔ معلوم ہوا کہ یہ دریائے چناب ہے جو اس مقام پر ایک وحشی نالے سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا۔

رات چھ سات ہزار فٹ اونچے بانہال میں گزری۔ صبح جواہر سرنگ کو پار کیا۔ گیارہ ہزار فٹ اونچے پیر پنجال پہاڑ کے سینے کو چھیدنے والی یہ سرنگ ہمارے اور کشمیر کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ سرنگ سے نکلتے ہی پہاڑ کا دامن پیڑوں سے لدا دکھائی دیتا ہے جس کے چند میل آگے وادی کشمیر نظر کے سامنے پھیلی دکھائی دیتی ہے۔ سرنگ سے تھوڑی دور راستے سے ہٹ کر ایک مقام ہے ویری ناگ جہاں میدان میں ایک چھوٹے سے تال سے دریائے جہلم نکلتا ہے۔ ایک حلقہ ہے جیسے باولی کنوں کہ تالاب۔ چاروں طرف پکی دیواریں ہیں۔ تہ سے پانی ابلتا ہے لیکن اوپر کی سطح بالکل ساکت ہے۔ اس میں ایک طرف سے پانی کا راستہ کھول دیا گیا ہے جس سے زور و شور کے ساتھ باغ کے بیچ ایک نہر بہتی ہے یہی جہلم ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اتنا بڑا دریا مٹی کی ہموار زمین سے برآمد ہو رہا ہے۔

وادی کشمیر پانچ چھ ہزار فٹ بلند ہے لیکن ایسی ہموار جیسا گنگا کا میدان۔ زمین زرخیز مٹی کی۔ فرق یہ ہے کہ ہر طرف کثرت سے قدرتی سبزہ اور پانی ہے۔ جا بجا طویل قامت سفیدے کے پیڑ آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔

۲۷ مئی کو ہم لوگ سری نگر میں داخل ہوئے۔ چند گھنٹے بعد پنڈت نہرو کے انتقال کی منحوس خبر آگئی۔ جی چاہا کہ کشمیر سے بھاگ کر واپس اپنے وطن چلا جاؤں لیکن ممکن نہ تھا۔ سری نگر نے اپنے محبوب لیڈر کا جو سوگ منایا اس سے زیادہ کسی شہر میں ہوا ہوگا۔ دن میں کئی بار سڑکوں پر ماتمی جلوس نکلتے تھے۔ کئی بار تعزیتی جلسے ہوتے تھے۔ صبح اس پارٹی کی طرف سے شام اس گروہ کی جانب سے ہفتہ بھر تک یہی سلسلہ رہا۔

فلموں میں دیکھا کرتے تھے لوگوں سے سنا کرتے تھے کہ ڈل لیک میں کشتیوں کے گھر ہیں سائبان دار تکیہ و توشک والے بجرے ہیں۔ اب بچشم خود دیکھا۔ ہاؤس بوٹ میں بود و باش کی لیکن یہ محسوس ہوا کہ ہاؤس بوٹ ایک آدھ دن گزارنے کے لیے تو سہاونی ہے زیادہ قیام میں دم رکنے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جزیرے میں مقید ہیں۔ ہر بار خشکی پر جانے

کے لیے کشتی والے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس سے قطع نظر شام کے وقت ہاؤس بوٹوں کی مسلسل روشنی پانی میں اس کا جھلملاتا عکس۔ بجروں پر گھومتے ہوئے خوش باش و خوش پوش سیلانیوں کی ٹولیاں سامنے سڑک پر سفید بجلی کی روشنی، طلسم ہوشربا کا کوئی قلعہ معلوم ہوتا تھا۔

ڈل لیک کے علاوہ سری نگر کا دوسرا گل پوش منظر تین مغل باغات یعنی چشمۂ شاہی، نشاط اور شالیمار ہیں ان تینوں کے بیچوں بیچ اوپر سے پانی کا ایک چشمہ آتا ہے جسے نہر کی صورت میں مختلف چبوتروں پر نیچے اتارا گیا ہے۔ پھولوں کی کھیتی میرا بھی مشغلہ ہے لیکن نشاط باغ کے تختے پھولوں سے جس قدر لدے ہوئے ہیں میدانوں میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزی پھول ادھر بھی ہوتے ہیں لیکن کشمیر میں وہ جتنے شاداب و توانا ہوتے ہیں انھیں دیکھ کر جی چاہتا ہے کہ ہم کشتِ گل کا نام لینا چھوڑ دیں۔

مجھے کشمیر میں سب سے زیادہ جو منظر بھایا وہ گلمرگ کی ایک پہاڑی کے عقب پر تھا۔ بلند و بالا پہاڑی سڑک کے نیچے بہت نیچے۔ ایک گھاٹی تھی کتنی طویل کتنی عریض۔ اس کی پہنائی میں نیروز پور نالہ بہہ رہا تھا۔ برسات کی وجہ سے اس کی دھار میں ٹوٹ پھوٹ کر سارے میدان میں بکھر گئی تھیں جو ایک قدم پر ایک دوسرے کے گلے مل رہی تھیں اور اگلے قدم پر بچھڑ جاتی تھیں۔ دور کشمیر کی وادی دکھائی دیتی تھی۔

گل مرگ کے تین میل اوپر کھلن مرگ ہے، کھلنے کی وادی جہاں دور تک تاحدِ نظر پہاڑوں پر سفید برف جا تھا اور ہم اس برف کے اوپر چل پھر رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار قدرتی برف دیکھا۔ نہ زیادہ سخت نہ زیادہ نرم کمال یہ ہے کہ یہ مصنوعی برف کی طرح ٹھنڈا نہیں ہوتا اسے کتنی بھی دیر ہاتھ میں لیے رہیے تکلیف نہ ہوگی۔ دوسرا گلیشیر ایک اور مقام سون مرگ میں دیکھا لیکن اس میں کھلن مرگ کا شکوہ نہ تھا۔ برف کے پہاڑ ایک جہانِ دیگر ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہم شند۔ ایں پہنچ گئے ہوں۔

پہلگام میں گلمرگ کی نسبت زیادہ چہل پہل ہے۔ بازار بارونق ہے۔ پتلون پوش خواتین زیادہ دکھائی دیتی ہیں فطری حسن میں بھی یہ کسی مقام سے کم نہیں۔ اس کا حسن لِڈر کی پہاڑی ندی کی وجہ سے ہے۔ اس کے ساتھ شیش ناگ چشمے کا سنگم پہلگام ہی میں ہوتا ہے۔ ان دونوں میں پہاڑی ندیوں کا پورا جلال و جمال ہے۔ ان کا سماں بیان سے نہیں مشاہدے سے تعلق رکھتا ہے۔ میری رائے میں اگر پہلگام سے انسانی بستی، عمارت و بازار اٹھا لیے جائیں تو حسنِ فطرت میں یہ مقام بے نظیر ہو جائے گا۔ تنگ وادی کے بیچ ندی زور و شور سے بہتی ہے۔ دونوں جانب ہرے بھرے پہاڑ ہیں جن پر چیڑ اور فر کے فلک پیما درختوں کا لامتناہی سلسلہ چلا گیا ہے۔

کشمیر چشموں کی وادی ہے اور ان میں سب سے زیادہ قابلِ قدر چشمہ ککر ناگ کا ہے جو ایک پہاڑ کی تلہٹی میں بہہ رہا ہے۔ چشمے کا پانی ہاضمے کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ سامنے ڈاگ بنگلے کا باغ ہے۔ سبزہ زار فطرت نے بنا کر دیا ہے۔

کشمیر صناعوں کی بستی ہے۔ دست کار فن کار ہیں۔ شال اور ساڑیوں کا تو ذکر ہی کیا لکڑی اور کاغذ کی لُگدی کے حسن پارے دیکھیے حیرت ہوتی ہے کہ اتنے سڈول اتنے باریک کام والی چیزیں چند روپیوں میں کیوں کر دے دی جاتی رہی ہیں۔ سری نگر کا گورنمنٹ ایمپوریم کیا ہے جدید مصنوعات کا ایک عجائب گھر ہے۔ چاندی کے برتنوں پر دستِ نقاش نے کیا کیا کمال دکھایا ہے نظر چکا چوند ہو جاتی ہے۔ یہ اشیا قیمت میں گراں ہیں لیکن ہر طرح اس قابل ہیں کہ باہر کے والیانِ ملک کو تحفۃً دی جائیں تو ملک کی ناک رہ جائے۔

کشمیری عوام چاہتے ہیں کہ وہاں کثرت سے سیاح آئیں تاکہ انھیں فراغت سے روزی مل سکے۔ وہاں سرکار کی جانب سے چاول پانچ آنے سیر اور گیہوں کا آٹا چھ آنے سیر بکتا ہے۔ ہم میدانیوں کو یہ ارزانی خواب و خیال کی بات معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود سری نگر کے باہر قلی اور گھوڑے والے کتنے غریب ہیں کتنے نیک اور منکسر ہیں۔ ان کا افلاس دل میں ایک مستقل کرب بن کر رہ جاتا ہے۔ کشمیر سے میں جو یادیں لایا ہوں ان میں سب سے زیادہ دل نشیں کشمیر کا حسنِ فطرت نہیں بلکہ کشمیر کے دیہاتی مزدوروں کا افلاس ہے گو میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ نظاروں کی خوبی کے معاملے میں کشمیر کا ہر مقام ایسا ہے جس کے لیے کہا جا سکے:

"ایک بار دیکھا ہے۔ دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے"

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو بھوپال)

سردار جعفری

پانچ نظمیں

ترے پیار کا نام

دل پہ جب ہوتی ہے یادوں کی سنہری بارش
سارے بیتے ہوئے لمحوں کے کنول کھلتے ہیں
پھیل جاتی ہے ترے حرفِ وفا کی خوشبو
کوئی کہتا ہے مگر روح کی گہرائی سے
شدتِ تشنہ لبی بھی ہے ترے پیار کا نام

جب ترا نام لیا

جب ترا نام لیا دل نے تو دل سے میرے
جگمگاتی ہوئی کچھ وصل کی راتیں نکلیں
بھیگی پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے چراغ
سر جھکائے ہوئے کچھ ہجر کی شامیں گزریں
قافلے کھو گئے پھر درد کے صحراؤں میں
درد جو تیری طرح نور بھی ہے نار بھی ہے
دشمنِ جاں بھی ہے، محبوب بھی دلدار بھی ہے

درد اک چاند ہے

درد اک چاند ہے ہوتا ہے جو سینے میں طلوع
غم ہے اک نشترِ نور
جو دل و جاں کے اندھیرے میں اتر جاتا ہے

غم کا ہیرا

غم کا ہیرا
دل میں رکھو
کس کو دکھاتے پھرتے ہو
یہ چوروں کی دنیا ہے

شعلہ لبی

یہ میری شعلہ لبی تشنہ لبی کی تکمیل
اور تری شعلہ لبی آتشِ سیال کا رنگ
کر دیا جس نے حریفِ لبِ پیمانہ مجھے

قمر ساحری

عصرِ حاضر

وہی فضائے چمن ہے وہی ہے گرد و غبار
کہاں ہیں سب سفیرانِ موسمِ گلبار
سکونِ قلب و شکم آج بھی ہے خواب و خیال
وہی عذابِ شبِ کرب ہے وہی آزار
کس آفتاب کے دھوکے میں رقص فرما ہیں
ترانہ خوانِ سحر طالبانِ روزِ شمار
یہ دور چیخ رہا ہے کہ گنگناتا ہے؟
ذرا بتا ہیں تو خنیا گرانِ لیل و نہار
نئے سروں پہ چمکنے لگے ہیں تاجِ شہی
نئی ادا سے سجائے گئے ہیں ناصیہ زار
صدائے حق کے تعقب میں کل بھی تھے بلا!
صدائے حق پہ لپکتی ہے آج بھی تلوار
کہاں ہے غزنوئ سومنات سلطانی
نئے بتوں کی پرستش ہوی ہے سر پہ سوار
قدم قدم پہ خراجِ خوشامد و سجدہ
عوام بن گئے جمہوریت کے باج گزار

بانو طاہرہ سعید

پھولوں کے درمیاں

سال بھر کے بعد پھر آئے ہیں ملنے مجھ سے پھول
نیلے نیلے، پیلے پیلے، اودے اودے پیرہن"
دل میں دھڑکن آنکھ میں آنسو، لبوں پہ زمزمہ
کیا کروں روکے سے بھی رکتی نہیں آشفتگی!
پرزے پرزے ہو رہی ہے پھر مری سنجیدگی!
چاک دامن کیوں نہ ہو جاؤں کہ اب ضبط و قرار
مجھ پہ کچھ سجتا نہیں۔ شوریدہ سر، شوریدہ بادا
یہ ہوائیں، یہ فضائیں، رنگ و نکہت الاماں
رنگ بھی کیا رنگ ہیں قوسِ قزح ٹھہری ہوی
کیف میں ڈوبا ہوا ہے ذرہ ذرہ دہر کا
زندگی کی تلخیاں سب بن گئیں رنگینیاں!
زخمِ دل، حرماں نصیبی، حسرتیں، ناکامیاں
الجھنیں، آہیں، غمِ دوراں کے جانے کتنے روپ
یوں نظر آتے ہیں جیسے اڑ رہی ہوں تتلیاں!
پھر رنگ و بو نے پھر سے کر دیا زندہ مجھے
آرزو یہ ہے کہ میں زندہ رہوں کچھ دیر اور
سال بھر کے بعد پھر آئے ہیں ملنے مجھ سے پھول

احمد ہمیش

ربوبیت

خدا لگتی کہو، تم نے بھی دیکھا ہے انھیں حیرت کدہ میں!

ضرور

ضرور۔۔۔ اس موڑ سے دنیا کے الہامی سواروں کا بھی کوئی قافلہ گزرا تھا۔ جن کو راستے میں نیند نہ آتی تھی
اور یوں لگتا تھا گویا پیٹھ پر بھاری ہوا کا بوجھ لادے ٹوٹتے جاتے ہوں اپنے آپ ہی۔۔
کچھ بولنا چاہیں تو اک اک لفظ کی آمد پہ اندیشہ۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو۔۔۔ ایسا نہ ہو۔ ایسا نہ ہو۔۔۔
کچھ سوچنا چاہیں تو اپنے آپ سے کترائیں۔۔۔ کہ وہ قصہ تو کوئی اور تھا اور یہ قصہ بھی کوئی اور
ہے شاید!
کوئی کنکر، تماشے کی سطح پر پھینک کر دیکھیں تو کیا ہوگا۔۔۔ اور آنکھیں کیا اٹھائیں گی وہاں سے!

گماں یہ ہو کہ مل جائے کہیں ایسا عجوبہ جس میں ڈھل جائیں
سراپا، حیرتیں اقلیم کی

وہ سب کچھ کیا تھا۔ ہم تھے یا وہ آنگن تھا جہاں صدیوں پرانی عورتیں، مٹی کی کوری ہانڈیوں
میں پھول اور شیرینی لے کر آئی تھیں اور قہقہے گونجتے تھے ان کے۔ کہ اچانک کوئی بے آواز
اور ان دیکھا جہاز اترا وہاں۔۔۔ بارات آئی۔۔۔ بارات آئی" عورتیں خوش ہو کے
چلّائیں "بارات آئی۔۔۔ لوگو جاؤ، دولہے کو اتارو" عجب آواز تھی!
۔۔۔ وہ کوئی شخص تھا۔۔۔ پاؤں کسی
چیونٹے کے پاؤں تھے اور سر سے ناف تک سہرے میں گرہیں تھیں تھکا دینے والی دماغوں
کو۔۔۔۔۔
خدا لگتی کہو، اس سے بھی آگے دیکھنے کی تاب ہوگی!

صہ

کرشن موہن

دلدل

مرا ذہن بنتا چلا جا رہا ہے خیالاتِ فاسد کی دلدل
کہ نس نس میں بہنے لگا ہے
مری زندگی میں ہمیشہ رہے گی ہوس کارفرما
ہوس رہا کہ گرما
کبھی پیاس بجھتی نہیں ہے
پیوں جتنی بھی مے
فسونِ ملاقات ہے باعثِ بے قراری
جنونِ ملاقات سے رہتا ہے طاری
کرا کثر ملاقات ہوتی ہے لیکن ملاقات کو جی ترستا ہے ہر دل
کئی بار اس کیفیت پر ہنسا ہوں
ہے یہ کیسی دلدل کہ جس میں پھنسا ہوں
ابھرتا ہوں میں اس کی گہرائی سے بھی
مگر جیسے پھر ڈوب جانے کی خاطر
غضب ہے ہوس کا یہ کس بل
مرا ذہن بنتا چلا جا رہا ہے خیالاتِ فاسد کی دلدل

امیر عارفی

شکست

دل کا سورج ڈوب رہا ہے
پھر بھی چمک کچھ باقی ہے
گیت سہانے ختم ہوئے سب
گونج ابھی تک باقی ہے!
اک اک وادی پوچھ رہی ہے؟
کون گھمنڈی دل کا ہے؟
صحراؤں کی خاموشی ہر راہ گزر کو تکتی ہے!
کس میں اتنی ہمت ہے جو اپنے دل کی بات کہے؟
دل کا شیشۂ نازہ ہجومِ شیشہ گراں میں
مدت گزری ٹوٹ گیا؟
کون یہ کہہ کر
اپنے ہاتھوں اپنا دل بدنام کرے!

ندا فاضلی

نئی کھڑکیاں

آمنے سامنے دو نئی کھڑکیاں
جلتی سگرٹ کی لہراتی آوازمیں
سونی ڈوری کے رنگین الفاظ میں
مشورہ کر رہی ہیں کئی روز سے

شاید اب بوڑھے دروازے سر جوڑ کر
وقت کی بات کو وقت پر مان لیں
بیچ کی ٹوٹی پھوٹی گلی چھوڑ کر
کھڑکیوں کے اشاروں کو پہچان لیں
آمنے سامنے دو نئی کھڑکیاں

پردے کے پیچھے

پڑوسی کے بچے کو کیوں ڈانٹتی ہو
شرارت تو بچوں کا شیوہ رہا ہے
بچاری راجی کا کیا دوش اس میں
کبھی تازہ پانی بھی ٹھنڈا ہوا ہے
سہیلی سے بے کار ناراض ہو تم
دوپٹے پہ دھبہ توکل کا پڑا ہے
رسالے کو جھنجلا کے کیوں پھینکتی ہو
بنا دھیان کے بھی کوئی پڑھ سکا ہے

کسی جانے والے کو آخر خبر کیا!!!!
کھلے بال آنگن میں تم بھاگتی تھیں
تمھیں رات کو دیر تک جاگتی تھیں
پڑوسی کے بچے کو کیوں ڈانٹتی ہو

اختر راہی

نقشِ پا

آگ، پانی اور ہوا
چاند، سورج، آسماں
گردشِ ایام، فصلِ گل، خزاں
زلزلے طوفانِ باراں اور برقِ بے اماں
کل تلک تھے مظہرِ جاہ و جلالِ کبریا
آج ہیں سب کاروانِ شوق کے یہ نقشِ پا
مسجدوں کے سربلند مینار و گنبد، بام و در
محراب و ممبر
بتکدوں کے بت، کلیسا کی صلیبیں
مندروں کے خوشنما زریں کلس
کل تلک تھے عظمتِ رب کے نقوشِ جاوداں
آج ہیں سب ارتقائے ذہنِ انساں کے نشاں
کس سے پوچھوں، کون ہوں میں کون ہے میرا خدا
ہیں سبھی اپنے ہی دردِ زندگی میں مبتلا

طالب رامپوری

احساسِ ندامت

بے خبری میں، لاعلمی میں
اُف یہ کیا کر ڈالا میں نے
گلدستے سے پھول اٹھا کر
ہاتھوں سے مل ڈالا میں نے
اے میری معصوم تمنا حسرت سے کیا دیکھ رہی ہے
گم صم کیوں خاموش کھڑی ہے؟
سچ مچ میں نے خون کیا ہے
سچ مچ مجھ سے بھول ہوئی ہے
میں بھی کیسا دیوانہ ہوں
لیکن اب یہ بھول ذرا سی
مجھ کو چین نہ لینے دے گی
اب یہ بیٹھا سوچ رہا ہوں
مجھ کو خونی کون کہے گا
مجھ کو قاتل کون کہے گا
پھول مسلنا جرم نہیں ہے
پھول کی قیمت کچھ بھی نہیں ہے
کوئی بھی قانون نہیں ہے
آہ مگر اس خون کا بدلہ
اندر کا انسان تو لے گا
وہ جو اب تک جاگ رہا ہے

رؤف خلش

روشنی کا غم

بہت تیری نگری کے چرچے سنے تھے
ہر اک موڑ پر جنتوں کا سماں ہے
قیامت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں
مگر آج دیکھا تو کچھ اور ڈھب تھا
دمکتی فضاؤں میں رنگ فسردہ
سویرے میں بھی ڈوبتے دن کا عالم
ہر اک شام جیسے دھواں بادلوں کا
ہر اک رات جیسے ٹھٹھرتے ہوں لمحے
کچھ اس طرح کی سوگواری تھی ہر سو
مسرت میں غم جیسے گھل مل گیا ہو

مرا وقت بکھرے ہوئے خواب چننے
کٹا، آئینے آرزو کے دکھانے
بڑے چاؤ سے شہر کی ہر سڑک نے
مرا تیری نگری سے تھا ایسا رشتہ
دورا ہے پہ جیسے کوئی بھولا بھٹکا

کبھی دھوپ سنولا گئی حادثوں کی
کبھی بڑھ گئے تیری زلفوں کے سائے
بناتا رہا نقش قدموں کے یوں ہی
خراماں خراماں، گریزاں گریزاں

خرد آزمانے سے بنتی تو بنتی بات
مگر غم نئے تھے ترے اجنبی کے
وفا بیچ دوں تو گنہ گار ٹھہروں
ہجوم ستم کا سزاوار ٹھہروں
جنوں بار سرشاریوں کا برا ہو
سنبھلنے کی مہلت نہ گرنے کا یارا
یہی دل جلوں کا وطیرہ ہے شاید
کہانی لکھی جائے تاریکیوں کی
گلی اور کوچوں کا قصہ رقم ہو
ترے شہر یاروں کو غم روشنی کا
ستاتا رہا ہے ستاتا رہے گا

حسن فرخ

پگھلتی ساعتیں

مہکتی شب کے لیے جاگتی سحر کے لیے
بھٹک رہے ہیں رہِ جستجو میں اہلِ نظر
اور اہتمام ہے یہ زندگی کی راہوں میں
کہ گام گام پہ رہزن بھی ہوں شریکِ سفر

کرن کرن سے ٹپکتا ہے سرد سرد لہو
روش روش پہ نگاہوں کو ہے تلاشِ گہر
سبو سبو سے چھلکتی ہے سرخ سرخ شراب
یہ اور بات کہ پیاسے ہیں میکدے کے در
چمن چمن میں بہاروں کا رقص ہوتا ہے
یہ اور بات کہ دل کے کنول نہیں کھلتے؛
ہر ایک موڑ پہ رائج ہے رسمِ بخیہ گری
یہ اور بات کہ زخموں کے لب نہیں سلتے
سنا ہے سب کو خلوص دوام ملتا ہے
مجھے تو پیار کے دو لفظ بھی نہیں ملتے

جنونِ شوق کو سر پھوڑنے کا سودا ہے
میں کوہکن ہوں مرے پاس دل کا شیشہ ہے
بصد خلوص کوئی کاش اس کو توڑ ہی دے
کہ نقشِ عہدِ محبت بہت ہی گہرا ہے
کوئی ستارہ سرِ راہ جھلملاتا نہیں
قدم قدم پہ یہاں کس قدر اندھیرا ہے
بس ایک پل کو شعاعِ امید پھوٹی ہے
وہ ایک پل ہی ہے اس تیرگی کا سرمایہ
بس ایک پل کو یقیں جاگتا ہے فردا کا
وہ ایک پل ہی ہے اب زندگی کا سرمایہ

غیاث متین

صدائے جرس

یہ جگ تو سارگہِ درد ہے یہاں ہمدم
ہر ایک سانس ہے شعلہ ہر ایک آہ دھواں
ہر ایک آنکھ میں آنسو ہر ایک لب پہ فغاں
ہر ایک پاؤں ہے زخمی ہر ایک دل ویراں
نظر اٹھا کے جدھر دیکھیے ادھر یوں تو
ہزار راہ گزاراں ہزار سنگِ میل
مگر خیال یہ ہوتا ہے ہم اکیلے ہیں
غمِ حیات کی پُرپیچ و تیرہ راہوں میں
بنامِ عیسیٰؑ دوراں بغرضِ چارہ گری
ہزار وقت شعاراں ہزار اہلِ خرد
چلے ہیں روشنی لے کر مگر اندھیرے میں
حیاتِ آدم و حوّا کہاں ملے لوگو
ادھر ہے دیر میں ناقوس کی صدا پیہم
جو کہہ رہی ہے کہ مکتی ہے نام پوجا کا

اُدھر حرم میں موذن کی گونجتی ہے صدا
"نماز نیند سے بہتر ہے" آخرت کے لیے
سبھی کے پاس ہیں مرنے کے بعد کی باتیں
کوئی نہیں کہ جو سمجھے حیات کی باتیں
کسی کے پاس غمِ آدمی کا پاس نہیں
کسی کے پاس غمِ زیست کا علاج نہیں
مسافرانِ جنوں بھی عجیب راہی ہیں
نہ راستوں کا تعین نہ منزلوں کے نشاں
چلے ہیں وقت کے دھارے کو موڑنے دیکھو
نہ زادِ راہ ہے کوئی نہ اور کچھ ساماں
بس اک امید کی دیوی گزیں ہے سینوں میں
شعور و فکرِ غمِ آدمی جبینوں میں
دلوں میں دیپ ہیں جلتے خلوص و الفت کے
جو کہہ رہے ہیں کہ ایسے حیات ہوتی ہے
اُدھر وہ دور سے آتی ہوئی صدائے جرس
یہ کہہ رہی ہے بشر سے بصد نشاط کہ اب
"سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے"

خورشید احمد جامی

دل کے شعلے ہیں نہ دلدار سے پیماں کوئی
آج ہم سا بھی نہیں بے سروساماں کوئی

صبح کے پاس تو زخموں کے سوا کچھ نہ ملا
مانگ لو رات کے خوابوں سے گلستاں کوئی

جگمگاتے ہیں امیدوں کے شکستہ زینے
مدتوں سے ہے خیالوں میں زرافشاں کوئی

چاہتیں ہیں کہ کھلتی ہوئی زنجیریں ہیں
زندگی ہے کہ سلگتا ہوا ارماں کوئی

دل کے نزدیک تری یاد کا سایہ ہوگا
یا شب و روز کا ٹھہرا ہوا طوفاں کوئی

ہم بہاروں کو سجاتے ہیں نئے پھولوں سے
تم بناتے ہو روایات کا زنداں کوئی

ڈوبتے چاند کی مٹتی ہوئی تصویروں میں
رنگ بھرنا ہے تجھے اے غمِ دوراں کوئی

روح آوارہ کی مانند بھٹکتا ہے ابھی
تیری محفل سے نکالا ہوا ارماں کوئی

یوں ملا ہے کوئی بچھڑا ہوا الغمر جامی
جیسے لوٹ آئے کہیں زود پشیماں کوئی

نور محمد نور

اٹھ کر جو بزمِ ناز سے مقتل میں آئے ہم
کیا کہیے کون راز ان آنکھوں سے پائے ہم

مشعل بنے ہیں آج وہ سب راہِ شوق میں
دل نے جو زخم پائے ہیں جو داغ کھائے ہیں

آئے نوردِ شوق میں گو سخت مرحلے
ایسا نہیں ہوا کہ قدم ڈگمگائے ہیں

دامن ہے پاک صورتِ موجِ صبا ہنوز
الزام کتنے اہلِ ہوس نے لگائے ہیں

خوں دے کے آبیاریِ نخلِ حیات کی
سر کاٹ لائے ہیں تو کبھی سر کٹائے ہیں

تطہیرِ زندگی کی حسیں آرزو لیے
سو بار اہلِ شوق لہو میں نہائے ہیں

دار ایک چوبِ خشک تھی بے برگ و بار نور
ہم سرکشوں نے اس پہ بھی کیا گل کھلائے ہیں

علی احمد جلیلی

جادۂ شوق میں دل مچلتا رہا آس لٹتی رہی پاؤں تھکتے رہے
رہبروں کی کچھ ایسی عنایت رہی کارواں منزلوں پر بھٹکتے رہے

یوں ترے بھی گزر ہی گئی ساقیا، فرق آیا نہ مستی میں اپنی ذرا
میکدہ دل کا اک دن نہ ویراں ہوا تیری یادوں کے ساغر چھلکتے رہے

ہم نے آس کا اک سہارا لیا ان دیوں نے بھلا ساتھ کس کا دیا
زندگی نے وہیں تک اُجالا کیا، غم کے شعلے جہاں تک بھڑکتے رہے

وہ بہار تبسم کی کھلتی کلی گلشنِ تازگی، حاصلِ شاعری
زلف کھولے ادھر سے جو گزرا کبھی مدتوں دل کے رستے مہکتے رہے

یہ نہ پوچھو علیؔ سے خدا کے لیے جینے والے گلستاں میں کیسے جئے
موسمِ گُل نے کچھ ایسے دھوکے دیئے پھول بھی خار بن کر کھٹکتے رہے

ہینس ریحانی

آج سودائے محبت کی یہ ارزانی ہے
کام بیکار جوانوں کا غزل خوانی ہے

غم کی تکمیل کا سامان ہوا ہے پیدا
لائقِ فخر مری بے سروسامانی ہے

سنگِ آہن تو بنے آئینے ان کی خاطر
دل نہ آئینہ بنا سخت یہ حیرانی ہے

مجھ سے اس درجہ خفا کیوں ہو کوئی پردہ نشیں
آرزو دید کی جب فطرتِ انسانی ہے

فیصلہ دل جبت میں ہے رہبر اپنا
فکر کیا منزلِ جاناں اگر انجانی ہے

وہ کریں یا نہ کریں اپنی جفا سے توبہ
میرے دل کو مگر احساسِ پشیمانی ہے

دشت و گلزار برابر ہیں نشیمن کے لیے
برق سے ربط ہر اک جا و ہی ریحانی ہے

میر ہاشم

غم امروز بھی ہے، دہشتِ فردا بھی ہے
زیست وہ زہرِ ہلاہل جو گوارا بھی ہے

زخم پر زخم ملا، زخم کا مرہم بھی ملا
وقت قاتل بھی اور وقت مسیحا بھی ہے

یوں نہ ہوتا تو نہ یہ کرب مسلسل ہوتا
دل میں اک تو ہی نہیں تیری تمنا بھی ہے

تیرے انکار میں اقرار کی خوشبو کیوں ہے
یہ تامل ترا ہمرنگ تمنا بھی ہے

یوں تو ہاشم میں برائی کی کئی باتیں ہیں
لوگ کہتے ہیں کہ اچھا ہے وہ جیسا بھی ہے

راہی قریشی

نہ شہریاروں سے ہے اور نہ بادشاہوں سے
زمیں کا حسن ہے ہم جیسے کج کلاہوں سے

خدا گواہ! مری سادگی ہوئی رسوا
قدم قدم پہ خود اپنے ہی خیر خواہوں سے

بپا ہے چار سو اک شورِ تشنگی ساقی
خدا بچائے تجھے میکشوں کی آہوں سے

زمانہ کیسے مرا غم گسار ہو اے دوست
سرور و عیش کو نسبت نہیں کراہوں سے

زمامِ عدل جو رکھتے ہیں اپنے ہاتھوں میں
نہیں انھیں بھی سروکار داد خواہوں سے

تمھاری چشمِ توجہ کا شکریہ لیکن
لرز رہی ہے مری روح ان نگاہوں سے

جو ملک و قوم کے خدمت گزار تھے راہی
وہ لوگ بڑھ گئے رتبے میں بادشاہوں سے

امام الدین یقین

نہ پوچھ کیوں ہے دل کی ہر اک آرزو فسانہ
کہیں پھر نہ زلف الجھے نہ الجھ پڑے زمانہ

ہے مری نظر کی زد میں وہ نظامِ آشیانہ
جو تڑپ کے برق آئے بنے چراغِ خانہ

مری تشنگی کو ساقی تری اک نگاہ بس ہے
مجھے کیا مری بلا سے نہ کھلے شراب خانہ

تری آنکھ جب سے نم ہے مجھے اعتبارِ غم ہے
کہ نشاطِ زندگی کا یہی غم تو ہے بہانہ

جنھیں ذوقِ رہبری ہے مرے ساتھ ساتھ آئیں
مرا ہر قدم ہے منزل مری ہر نظر زمانہ

یہ کمالِ گمرہی ہے کہ خرد کی محفلوں میں
نہ مذاقِ آگہی ہے نہ شعورِ والہانہ

وہ پڑا ہے سر بسجدہ مری عظمتوں کے آگے
جسے کہہ رہی ہے دنیا ترا سنگِ آستانہ

شمس الدین تاباں

زیبِ محفل ہوے وہ مہ پیکر قریں آج کی رات
عرش آغوش ہے یہ فرشِ زمیں آج کی رات

ان سے تھا کتنا طرب کوش و جواں آج کا دن
ان سے ہے کتنی دلآویز و حسیں آج کی رات

ماہ وش اور شبِ ماہ میں۔ اے طائرِ دل
خیر ہو دام ہے ہم رنگِ زمیں آج کی رات

یوں شبِ غم مری تقدیرِ محبت جاگی
دیدہ و دل میں ہیں وہ صدر نشیں آج کی رات

ساتھیو! رات ہے تاریک تو چمکاؤ ابھی
داغِ دل، داغِ جگر، داغِ جبیں آج کی رات

صبح تو دور نہیں، دور نہیں، دور نہیں
ہاں ذرا اور بڑھے عزم و یقیں آج کی رات

بام پر آ گئے وہ سن کے صدائے تاباںؔ
نذرِ نظارہ ہیں جان و دل و دیں آج کی رات

شمس الرحمٰن فاروقی

ذوقِ نفاست اللہ اللہ داغ کو دی ہے پھول کی رنگت
زخم ہرے ہیں سبزے کی مانند درد بڑھے ہے چاند کی صورت

آپ پہ ہم نے تن من دھن سب وار دیا ہے رفتہ رفتہ
پھر بھی ذرہ مشکل ابھی ہے باقی کیسے ادا ہو نظر کی قیمت

آنکھ سے شب کی نیند کا کاجل لوٹ گیا ہے سورج سارا
چاند بھی جاگے تارے بھی جاگیں سونے کی کس کو کہاں ہے مہلت

دل کی جلن یوں آج ہے مدھم سوتے ہیں جیسے سانس ہو دھیمی
فیض ہے تیرا اے غم گیتی اس کو خدا را رکھیو سلامت

ہائے وہ دن جب ہم نے کہا تھا ناسمجھی میں نادانی میں
تو بھی فسانہ اے غم جاناں اے غم دوراں تو بھی حکایت

ممتاز راشد

پھر تصور ان کی جلوہ گاہ تک پہنچا تو ہے
ذہن و دل کی تیرگی میں چاند اک ابھرا تو ہے

سولیوں کے لب سے ہو یا ہو گلوئے دار سے
ہم نے اس کے عشق کا نغمہ مگر گایا تو ہے

ساعتوں کی دھوپ گھڑیوں کی تپش لمحوں کی آنچ
تیری زلفوں سے بچھڑ کے ہم نے یہ پایا تو ہے

رنگ لائی کشتگانِ زندگی کی خامشی
شہر میں ہر سمت اس کے ظلم کا چرچا تو ہے

کھو گئے یادوں کے آہو دشتِ ماہ و سال میں
اب بھی لیکن سنگِ ماضی سے لہو رستا تو ہے

کیا ہوا گر اس کا پیراہن نہ رنگیں کر سکے
خونِ دل کو صرف کرنے کے لیے صحرا تو ہے

ہر نفس زہراب، ہر لمحہ بلائے جاں سہی
اے نگارِ زندگی پھر بھی تجھے چاہا تو ہے

احسن جعفری

نہ ابھرے چاند یادوں کے نہ غم کی دھوپ چمکی ہے
تمناؤں کے آنگن میں ابھی تک تیرگی سی ہے

کنول لہرائے ہیں کیا کیا نہ جانے آرزوؤں کے
تمہارے پیار کی شبنم کبھی جب دل پہ برسی ہے

امید سایۂ گیسو میں ہر اک گام پر یارو
غموں کے تپتے صحرائے حیات شوق گزری ہے

مری تنہائیوں کی بزم میں ہے اک اجالا سا
افق پر دل کے جب سے چاندنی یادوں کی پھیلی ہے

تمہارے شہر میں اک ایک دیوانے کے چہرے پر
جدھر بھی دیکھئے رسوائیوں کی گرد ملتی ہے

ملی ہے آرزوئے قرب کو تابندگی احسن
کسی کے ہجر کے لمحوں سے جب بھی آنچ اٹھی ہے

کیف احمد صدیقی

وقت کی شاخ پہ مرجھا گئے لمحات کے پھول
دل میں تازہ ہیں مگر تیری ملاقات کے پھول

اب کہاں دل میں وہ آغاز محبت کی بہار
وقت کی دھوپ سے کمھلا گئے جذبات کے پھول

گلشن دل سے جو گزری تری یادوں کی صبا
شاخ در شاخ کھلے تیرے خیالات کے پھول

تیری آنکھوں میں جھلکتی ہیں غزل کی کلیاں
تیرے ہونٹوں سے برستے ہیں خطابات کے پھول

آج یوں غرق ہیں اشکوں میں مرے زخم جگر
جیسے دریا میں بہکتے ہوئے برسات کے پھول

شام غم کانپ اٹھی شمع کی لو تھرّائی
مرقد صبح میں جب دفن ہوئے رات کے پھول

کیفؔ بننا ہے اگر شاعر کامل تجھ کو
فن کی دیوی پہ چڑھا تازہ خیالات کے پھول

عادل رفیق

لطافتوں کے تصور کی ابتدا ہے غزل
نزاکتوں کے تخیل کی انتہا ہے غزل

کئی جوان امنگوں کا دلفریب آغاز
کسی حسین ارادے کی ابتدا ہے غزل

کسی کی آنکھ کی شبنم کسی کے غم کی بہار
کسی کے دل کی تڑپتی ہوئی صدا ہے غزل

خیال و فکر و تجسس کا بادۂ پرکیف
حسین و اجنبی یادوں کا راستا ہے غزل

گلوں کا رنگ ستاروں کا حسن مے کا خمار
بہارِ حسن دو عالم کا مجموعہ ہے غزل

کسی امیر کی ٹھکرائی ایک نعمت غم
کسی غریب کی مانگی ہوئی دعا ہے غزل

زمانہ اس کو جفا جو کہے مگر عادل
مرے خیال میں اک پیکرِ وفا ہے غزل

قمر اقبال

ترے جمال کی اہلِ قلم نے کی تعریف
ترے ستم کی مگر صرف ہم نے کی تعریف

وہی تو جانِ غزل تھا وہی تو روحِ غزل
وہ شعر جس کی سرِ بزم کم نے کی تعریف

دیارِ ظلم و تشدد میں دوستو! اکثر
ہمارے ضبط کی اہلِ ستم نے کی تعریف

ہم اہلِ کفر کا جب بھی کسی نے ذکر کیا
خدا گواہ کہ اہلِ حرم نے کی تعریف

مری حیات کے پُرپیچ راستوں کی قمر
کسی کی زلف کے ہر ایک خم نے کی تعریف

ابوالخیر صہبا

قطعات

کیا بتاؤں راستوں کے پیچ و خم
اور اپنی زندگی کے بیش و کم
پھول مجھ کو دیکھ کر ہنسنے لگے
بڑھ کے کانٹوں نے مرے چومے قدم

❖

وہ سنوارا کیے بہت زلفیں
پر وہ زلفوں کے پیچ و خم نہ گئے
زندگی بھر اسی طرح صہبا
چھوڑ کر مجھ کو میرے غم نہ گئے

❖

کھیل جس کو سمجھ رہے تھے ہم
بڑھتے بڑھتے وہ اک فسانہ ہوا
اب تو آنکھیں بھی خشک ہیں صہبا
ہم کو روئے ہوئے زمانہ ہوا

❖

چن رہا ہوں تری ہنسی کے پھول
میرے دامن میں ہیں خوشی کے پھول
تیری محفل کے چند لمحوں سے
کھل گئے میری زندگی کے پھول

❖

تم سے تسکین دل سکون جگر
تم سے روشن ہیں میرے شام و سحر
تم مرے ساتھ ساتھ ہو پھر بھی
ہر گھڑی تم کو ڈھونڈتی ہے نظر

❖

جلوہ گاہیں ہیں آپ کی مشہور
اک مرا دل ہے ایک کوہِ طور
طور جلوے کی تاب لا نہ سکا
دل ابھی تک ہے نور سے معمور

❖

صرف اک آپ کے حضور سے
درد میں بھی سکون ملتا ہے
جیسے کانٹوں کے درمیاں رہ کر
صحنِ گلشن میں پھول کھلتا ہے

❖

سوچتا ہوں کہ بہہ نہ جائے کہیں
میرا ہر اشک میری دولت ہے
لیکن اس درد و غم کی دنیا میں
مسکرانا بھی اک قیامت ہے

قطعات

ظفر احمد نظامی

بارہا ایسا اتفاق رہا
مدتوں صدمۂ فراق رہا
تجھ سے ملنے کے بعد بھی اے دوست
تجھ سے ملنے کا اشتیاق رہا

جگمگاہٹ ہی جگمگاہٹ ہے
زندگی میں خوشی کی آہٹ ہے
اچھا اچھا سمجھ رہا ہوں میں
تیرے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ہے

دل میں نشتر چبھو گیا ہوں میں
کتنا افسردہ ہو گیا ہوں میں
ہو سکے تو تلاش کر لینا
تیری آنکھوں میں کھو گیا ہوں میں

دل شکستہ رباب ہیں شاید
کچھ ادھورے سے خواب ہیں شاید
چند لمحوں میں ٹوٹ جائیں گے
ہم سوارانِ آب ہیں شاید

جاوید حیدرآبادی

شامِ غم اشک جو آنکھوں سے بہائے میں نے
کتنے موتی تری فرقت میں لٹائے میں نے
یادِ ماضی کی گراں بار تو بہت تھی تلخی
پھر بھی فردا کو ترے خواب دکھائے میں نے

ولولے شوق و جنوں اور یہ تمنا یہ امنگ
قافلہ تیری ہی جانب یہ رواں ہوتا ہے
یاد اے دوست جب آجاتی ہے مجھ کو تیری
تیرے آجانے کا رہ رہ کے گماں ہوتا ہے

آپ کی یاد کی دنیا ہے جو دل میں آباد
یہ وہ دنیا ہے جو دنیا سے مٹائی نہ گئی
آپ کی یاد میں دنیا تو بھلا دی ہم نے
آپ کی یاد مگر دل سے بھلائی نہ گئی

میرے جذبات کی، احساس کی پروا نہ کرو
میری جانب کبھی الطاف سے دیکھا نہ کرو
تم مجھے بھولنا چاہو تو بھلا دو لیکن
شرط یہ ہے کہ مجھے یاد بھی آیا نہ کرو

الکزینڈر بیرن

کرنل حمایت علی بیگ

ذلیل کُتّے

بار میں کافی خاموشی تھی، اور ہم لوگ بار کی میز کے قریب کھڑے ہوئے پی رہے تھے۔ اچانک قریب سے بڑی کرخت اور غصہ میں بھری ہوئی آواز آئی۔

"کتے! ذلیل کتے!"

ہم سب نے پلٹ کر دیکھا کہ ایک شخص میز پر دونوں ہاتھ رکھے جھکا ہوا ہے اور ہماری طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہا ہے جیسے وہ ہم سب سے لڑنا چاہتا ہو، اس کے قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور سینہ کے بھورے سخت بال صاف نظر آرہے تھے۔ اس کی توند معلوم ہوتا تھا کہ پتلون کے بٹن توڑ کر باہر ابل پڑے گی۔ اس کے چہرے پر کرختگی تھی اور اس کی چھوٹی سی ناک کے اوپر ہلکی نیلی آنکھیں سب کو گھور رہی تھیں۔ بیر کا گلاس وہ بار بار منہ سے لگاتا تھا اور بڑے بڑے گھونٹ پیتا جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ اور اس کی حرکتیں ظاہر کر رہی تھیں کہ اس نے ضرورت سے زیادہ پی لی ہے۔ "میں نے کہا نا.... کتے ذلیل کتے.... سب کے سب ذلیل کتے!"

اس کو دیکھ کر ہنسی بھی آ رہی تھی اور ناگوار بھی ہو رہا تھا کہ یہ کیا رنگ میں بھنگ پڑنے والا ہے۔

"تم جانتے ہو میں نے ان کو کیا کرتے ہوئے دیکھا؟ کوڑے میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر چن چن کر وہ کھا رہے تھے۔ ذلیل کہیں کے!"

اس نے غصے میں ہم سب کی طرف دیکھا جیسے اس نے بڑی اہم اور راز کی بات بتا دی ہو۔ اس نے ایک اور بیر سے بھری ہوئی گلاس اٹھالی اور جب وہ پینے لگا تو بیر کے ریلے اس کے منہ سے بہنے لگے۔ اور کف دار بھرے ہوئے گلاس اس کے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ہماری نظریں جب اس کی آستین پر پڑیں تو ہم نے دیکھا کہ وہ کوارٹر ماسٹر سارجنٹ کی پٹیاں لگائے ہوئے ہے۔

"تم لوگ دیکھ کیا رہے ہو۔ تم جب تک ایک سگریٹ پیو گے میں یہ سارے گلاس خالی کر دوں گا۔ اسی لیے تو میں نے سامنے ان کی لائن لگا دی ہے۔ کہتے ہیں کہ بیس گلاس بیر کے کوئی پی لے تو وہ بڑا مرد میدان ہے۔ بیس گلاس

تو میں پی چکا ہوں۔ یہ دس گلاس اور نہ پی لوں تو تھوک دینا میرے منہ پر سمجھے ؟" اس نے ڈانٹ کر ہم سے کہا۔ "گندے غلیظ کہیں کے . . . جو چربی کے ٹکڑے ہم چبا کر تھوک دیتے ہیں۔ انھیں یہ گندے اطالوی اپنے ہاتھوں سے چن چن کر کھا جاتے ہیں ـــ آخر تم کو ایسے ہوتے ہیں اطالوی ـــ تم نے ؟"

اس نے اپنے برابر کھڑے ہوئے ایک کمزور آدمی کی طرف دیکھا۔

"کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں ؟" اس غریب نے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ "میں جانتا ہوں مجھے معلوم ہے"۔ اس نے گرجتے ہوئے کہا۔ "میں دو سال تک وہاں رہا ہوں۔ دو سال اسی سڑی ہوئی بدبو دار ہوا میں میں نے زندگی گزاری ہے۔ جدھر دیکھو اطالوی ہی اطالوی . . . . . . مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہوئے۔ میں وہاں اتحادی فوجوں کے ہیڈ کوارٹر میں تھا اور تم لوگ یہاں بیٹھے مزے اڑا رہے تھے۔"

"سنو ! میں کہتا ہوں کان کھول کر سنو۔ میں رات کو اپنے ڈیرے کے باہر آیا۔ میرے کان بجنے لگے جیسے کوڑے کے ڈھیر کے پاس کوئی کھسر پھسر کر رہا ہے میں نے خیال کیا چوہے ہوں گے۔ ایک پڑی ہوئی لکڑی اٹھالی اور دیکھنے کے لیے آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس نے اپنا سر نیچے جھکا لیا۔ جیسے سوچ رہا ہو اور آگے کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ سر اوپر اٹھا کر اس نے بیر کا گلاس اٹھایا اور غٹ غٹ پورا گلاس پی گیا۔ اور پھر قدرے دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ "جانتے ہو کوڑے کے ڈھیر کے پاس کیا تھا ؟ میں بتاتا ہوں۔ ایک لڑکی تھی۔ پندرہ برس کی عمر ہو گی اس کی۔ پندرہ برس سے ایک دن بھی زیادہ نہیں اور وہ ایک سور کی طرح کچرے میں ہاتھ ڈال ڈال کے کچھ نکال رہی تھی سنا تم نے ؟ ایسا بھی ملک ہے دنیا میں جہاں بچوں کی اس طرح دیکھ بھال ہوتی ہے میں تھوڑی دیر تک کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ ہم نے سڑی ہوئی پنیر پھینک دی تھی۔ سڑ کر اس کا رنگ ہرا ہو گیا تھا۔ بدبو آنے لگی تھی اس میں سے۔ اور وہ لڑکی دونوں ہاتھوں سے وہ سڑی ہوئی بدبو دار پنیر اٹھا اٹھا کر اپنے منہ میں ٹھونس رہی تھی۔ اس کے پاس ایک تھیلی تھی وہ کھاتی بھی جا رہی تھی اور تھیلی میں بھی پنیر ڈالتی جا رہی تھی۔ گندی، غلیظ، بدبو دار سڑی ہوئی پنیر اس کے خیال ہی سے متلی ہونے لگتی ہے۔"

تھوڑی دیر ٹھہر کر اس نے اور بیر پی جیسے اپنے منہ کا مزہ بدل رہا ہو۔ سامنے کے آئینہ میں اس کو اپنی شکل نظر آئی تو وہ ہنسا اور ہم کو اس کے پیلے پیلے سڑے ہوئے دانت نظر آئے۔

میں نے ایک دم بڑھ کر اس لڑکی کو پکڑ لیا وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ کیا کر رہی ہے یہاں ؟"

وہ ڈر کے مارے سفید ہو گئی اور تھر تھر کانپنے لگی۔ اس نے جلدی جلدی ہکلا کر کچھ کہنا شروع کیا۔

"نکل یہاں سے ـــ بھاگ ! اس نے اپنی تھیلی زمین پر ڈال دی، اور بڑی لجاجت سے کچھ کہنے لگی۔ بڑی ہوشیار ہوتی ہیں یہ بدذات اطالوی لڑکیاں۔ میں ان سے خوب واقف ہوں۔ یہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے جو نہ کریں کم ہے۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ "مجھے چھوڑ دیجیے۔

وہ رو رو کر کہنے لگی 'میری ماں کے لیے اور چھوٹے بھائی کے لیے کھانے کو لے جانے دیجئے۔ اس قسم کی بک بک میں خوب سمجھتا تھا۔ دو برس جو میں اس منحوس ملک میں گزار چکا تھا تو اس کی باتیں کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ 'چل یہاں سے' میں نے کہا 'نکل جاتی ہے یا۔۔'۔ اور میں نے زور سے تھپڑ مارا۔ ان اطالویوں کا یہی علاج ہے اور کوئی زبان ان کی سمجھ میں آتی ہی نہیں۔ لاتوں کا بھوت بھلا باتوں سے مانتا ہے۔

لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ مجری کی ذات جب اڑ جائے تو پھر کوئی چارہ نہیں۔ میں نے کہا 'نا کتے۔ ذلیل کتے!' پھر میں نے اس سے کہا 'تجھے کھانا چاہیے نا؟' اس نے جلدی سے اپنا سر ہلا کر ہاں کہا۔ 'آ پھر، آمیرے ساتھ' اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو ڈیرے میں گھسیٹ لیا۔

"پتہ نہیں میں نے کیوں خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کیا۔ ایسی جگہ تو اچھی سے اچھی لڑکی ایک گوشت کا ٹن دینے سے مل جاتی ہے۔ کئی لڑکیاں اسی طرح میرے ڈیرے میں آ چکی تھیں۔ مگر یہ لڑکی اس کے پاس ہڈی اور چمڑے کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ دبلی سی کمزور شاید وہ دیا سلائی جلانے کی بھی طاقت نہ رکھتی ہوگی۔۔۔ پھر میں نے اس کی خبر لینی شروع کی۔ چوری کی سزا دینی شروع کی۔ بستر پر میں نے اس کو چپکا دبا اتنا کہ اس کی آنکھیں نکل آئیں۔ میں نے اپنے ان ہاتھوں سے اس کو ایک بھیگے ہوئے رومال کی طرح نچوڑ دیا۔ میں نے اس کو ایسا سبق دیا جو اس کو زندگی میں اب تک نہ ملا ہوگا۔

"کیا سمجھتے ہو کہ اس نے ذرا بھی مجھے روکنے کی کوشش کی ہوگی۔ بالکل نہیں۔ خودداری، عزت نفس؟ ان باتوں کا ان ذلیل کتوں نے نام بھی نہیں سنا۔ اس نے کیا کیا مجھے کرنے کی اجازت دی۔ گندی کہیں کی، بے حیا، بے غیرت۔ جو بھی میں نے اس سے کہا اس نے کیا۔ نہ چوں چرا کچھ بھی نہیں اس کے بعد میں نے۔۔۔ اس کی گٹھڑی بنادی، جوڑ جوڑ ڈھیلے کر دیئے۔ جب میں فارغ ہوا ہوں تو وہ ہل تک نہ سکتی تھی۔ تب مجھے اس کو اٹھا کر ایک گندی غلیظ بلی کی طرح ڈیرے سے باہر پھینک دینا پڑا۔ کیا کہا؟ نہیں جی۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا اسکو۔ شروع سے اس کا یہ حال ہے۔ جانوروں اور ان میں کچھ فرق نہیں۔ ان کو تکلیف ہوتی ہی نہیں۔ بچپن سے وہ اس کے عادی ہیں۔ وہ آہستہ سے کھسک کر وہاں سے چلی گئی۔۔۔۔ اب سنو، اب پتہ چلے گا کہ اس کا کیا حال ہوا۔"

اس نے ایک گلاس اور بیئر پی کر زور سے ڈکار لی۔

"جانتے ہو کیا ہوا؟" اب اس کی آواز اور تیز ہو گئی تھی "دوسرے روز اسی وقت رات کو وہ پھر آئی۔ اپنے آپ سے۔ میں نے کیا بلایا تھا اسے؟ کہا نا میں نے، ذلیل کتے، کمینے ذلیل کتے بے شرم بے حیا ذلیل کتے۔ وہ سیدھے میرے ڈیرے کے اندر چلی آئی، آتے ہی اس نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور ہم پھر شروع ہو گئے پھر وہی پہلی رات کی بے حیا، بے شرم حرکتیں اور اس کے بعد۔ جلدی سے کپڑے پہن کر کوڑے کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے اس نے پوچھا اب میں وہاں جا سکتی ہوں؟"

اس نے ایک اور گلاس بیر پی اور تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگیا۔ وہ بار بار اپنا سر اوپر اٹھانے کی کوشش رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا سر بہت وزنی ہوگیا ہے۔ اس کا نچلا ہونٹ لٹک گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں پوٹے شراب کے نشے سے بوجھل ہوگئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں اب چمک باقی نہ رہی تھی اس کے الفاظ صاف نہیں نکل ے رہے تھے پھر بھی وہ بات کرنے کی بار بار کوشش کر رہا تھا جب کبھی وہ کسی طرف مڑتا تو تھوڑا سا میز پر پھسل جاتا تھا۔ اپنا لن برقرار رکھنے میں اس کو مشکل ہو رہی تھی۔ پھر وہ عام شرابیوں کی طرح لکچر دینے لگا۔ "دیکھو۔ . . اب دیکھو۔ نری گلاس ہے۔ ہے کوئی میرا مقابلہ کرنے والا؟ میں اول ہوں، ابھی نہیں . . . ٹھیرو۔ میں نے ابھی وہ واقعہ ختم نہیں ہے۔ یہ آوارہ بدمعاش بے شرم لڑکی ہر رات اپنی تھیلی لیے آتی رہی۔ میرے ڈیرے میں آتی اور پھر وہاں سے کوٹرے کی ھر چلی جاتی۔ . . . مگر میں بھی جب تک اس سے پوری قیمت وصول نہ کرلیتا اس کو ڈیرے کے باہر جانے نہ دیتا تھا۔" وہ بڑبڑانے لگا تھا۔ بولنے میں اسے مشکل محسوس ہونے لگی اور سچی بات تو یہ ہے کہ اب کسی کو اس واقعہ سے دلچسپی بھی باقی ی تھی۔ اس کا سر آہستہ آہستہ ادھر ادھر جھومنے لگا۔ پھر اس نے ایک دم سے اپنی آنکھیں پوری کھول دیں جیسے اسے آ ری کی پھر یاد آگئی ہو۔ "ہاں میں نے قیمت وصول کی اس سے پوری قیمت . . . وہ سب یہ چاہتے ہیں کہ ان کو ہر چیز مفت مل جائے ری قیمت ادا کیے . . مگر میں بھلا اس کی اجازت کیسے دے سکتا تھا۔ کیا میں بھی کوئی اطالوی ہوں؟ . . نہیں . . . میں ز ہوں انگریز ہوں! سمجھے؟ . . . ذرہ ذرہ کے لیے اس لڑکی کو محنت کرنی پڑی۔ میں نے اس کو طرح طرح کی ترکیبیں نا ئیں جیسے کوئی کتے کے چھوٹے بچے کو سکھاتا ہے۔ دونوں ہاتھ کی انگلیاں اس کی کمر کے اطراف آجاتی تھیں۔ وہ اتنی دبلی تھی اس کو خوب محسوس کراتا تھا کہ میرا اپنا وزن کتنا ہے۔ مجھے دیکھتے ہو نا؟ میرے ہاتھ پاؤں، اور سینہ دیکھو۔ . . یہ سارے بارا وزن اس کو سہنا پڑا۔ جو میں نے چاہا اس سے کروایا۔ بے شرم، بے حیا، گندی، غلیظ لڑکی اس کو جو میں چاہوں ہو میں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔ بڑی فحش ہوتی ہیں وہ عورتیں۔ سب کی سب بے حیا بیسوائیں ہیں، بے شرم رنڈیاں ہیں . . ."۔ اس کے آگے کہتے کہتے وہ رک گیا۔

پھر اس نے وہ بیر کا آخری گلاس بھی پی لیا۔ "سنا تم نے۔ کیا کہا تھا میں نے؟ . . . جانوروں سے بدتر . . . . . لو اپنی جگہ پر رکھنا چاہیے . . . سمجھے؟ . . . ذرا بھی آگے نہ بڑھنے دینا . . ."۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا اور پھر ڑ کہنے لگا۔ "کتے ذلیل کتے . . . میں ان سب کو جانتا ہوں . . . یہ اطالوی . . . حبشی . . . چینی . . . یہ سب کے سب ذلیل کتے۔" اس کے بعد وہ کھڑا نہ رہ سکا اور وہ آہستہ سے زمین پر بیٹھ گیا۔ کسی نے اس کو اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ ا بیٹھے بیٹھے اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ہاتھوں اور گھٹنوں پر کھڑا وہ جانور معلوم ہو رہا تھا، بالکل جانور۔ بات کرنے لیے اس نے اپنا منہ کھولا۔ اور پھر ایک مکروہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ بدبودار، متعفن قے کا فوارہ ا کے منہ سے نکل کر بار کے فرش پر پھیل گیا۔

———— ∴ ∴ ∴ ————

عفت موہانی

ہم تو جیے بس تیرے لیے

"سال بیتے بچے بھی جی کا جنجال ہو جاتے ہیں۔" اماں بی نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ کنکھیوں سے بھابی کو دیکھتی گئیں۔ اب بھلا بچوں کو کون روکے۔ اللہ میاں جب کیڑے کھائے دینے پر تل جائیں۔ بھابی چوری چھپے آموں کے پیڑ کو دیکھنے لگتیں۔ جو ادھ پکے آموں سے لدا پھندا آنگن میں جھوم رہا تھا۔ ہزار بار جل کر اماں بی نے پیڑ کو کاٹ دینے کی دھمکی دی جیسے اس پیڑ کا بھابی کے بچوں سے خاص ربط ہو۔ لیکن ہر بار بھابی کی لبسوانی شکل سامنے آ گئی آپ ہی آپ ان کا جی خراب رہتا۔ سلمیٰ کے گالوں سے پانی چھوٹ جاتا۔ اللہ ایک — دو ہیں۔ بقول اماں بی کے ایک سال میں ایک۔ اب ایک کرنے والی جان ہی جائیں۔ دن تمام ہو جاتا، رات آدھی ہو جاتی۔ مگر ان چاروں کی وجہ سے بھابی کو نہ دن چین تھا نہ رات نیند۔ دن بھر چیخا کرتیں اور پھر تھک ہار کر سر تھامے چوکھٹ پر بیٹھ جاتیں۔ چاروں لڑتے، کھیلتے، گرتے پڑتے، مگر کیا مجال جو بھابی کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔

"ارے مارے بیٹو، گروگے، مر جاؤگے!" وہ رو رو پڑتیں۔

"اے دلہن۔ ایسے بےسرے منہ نہ کوسا کرو۔" آخر اماں بی کھانس کراہ کر اٹھتیں۔ چاروں کو بھیڑوں کی طرح کھینچ گھسیٹ کر اکٹھا کرتے منہ دھلانے کی مہم میں گھنٹوں لگ جاتے۔ کتنا ارمان تھا سلطان بھائی کو ایک بیٹی کا۔ جیسے ہی بھابی بیمار پڑ آتیں وہ لڑکیوں کے پیارے پیارے نام سوچنے لگتے! مگر جیسے ہی لیڈی ڈاکٹر بند کمرے سے نکل کر صاحبزادے کی خوشخبری سناتی۔ ان کا چہرہ اتر جاتا۔

یہ ایک وہ تھی۔ ہرا بھرا گھنا درخت۔ مگر پھلوں سے محروم۔ کیسے کیسے جتن نہ کیے۔ اللہ میاں نے ایک نہ سنی اماں بی بھی آخر کار ہار گئیں۔ کیسے چاؤ سے اماں بی اسے بیاہ کر لائی تھیں۔ احسان میاں تو شروع ہی سے جدا تھے۔ اپنی پڑھائی پوری نہ کی۔ اور نہ سلمیٰ کو گریجویٹ ہونے دیا۔ اماں بی کے ایسے حواس گم گئے کہ دھوم دھام سے بیاہ کر کے لے آئیں . . . .

ان بڈھیوں کو اب کام ہی کیا رہ گیا تھا۔ دنیا بھر کی چرخی بڑھیاں اکٹھا ہوتیں اور بہوؤں کا رونا رونے لگتیں ایسے وقتوں میں سلمیٰ سامنے ہی نہ آتی۔ وہ تڑپ جاتی۔ اماں بی کی گود میں کندھوں پر آس پاس بھابی کے چاروں

نٹ کھٹ اودھم مچاتے ہوتے۔ ہائے۔ ان میں ایک اس کا بھی ہوتا۔ تمام کھوسٹ بڑھیوں کی نظریں اس پر پڑنے لگی تھیں۔ کوئی کب تک صبر کرے۔ پُرارماں ساسیں تو چھ ماہ بھی صبر نہیں کر سکتیں نہ کہ پورے چھ سال۔ سلمیٰ کے ہوش اڑنے لگتے۔ اگر احسان میاں طبیعت کے ایسے سیدھے نہ ہوتے تو ابھی تک کب کی اماں بی نے دوسری شادی کر دی ہوتی! اس کے لرزتے کانپتے ہاتھ اللہ میاں کی طرف اٹھ جاتے۔ جیسے بھابی کو بخشے دیتے ہیں ویسے ہی ایک اسے بھی دے دیں! کیسا بھی ہو۔ پر لوگ انگلیاں نہ اٹھائیں۔ بھابی نے کون سے نیک کام کیے تھے جو ان کی گود میں پھول کھلا رکھے ہیں۔ ایک وہ بد نصیب کیوں رہ گئی ہے!

اور اسے دن رات آہیں بھرتے دیکھ کر احسان میاں چڑ گئے۔

"آخر یہ ہے کیا مصیبت؟ میں اب گھر ہی میں نہیں رہوں گا۔ نہیں برداشت ہو سکتا یہ سب کچھ!

اور جواب میں سلمیٰ سسکیاں لینے لگی۔

میں اماں بی کو آواز دیتا ہوں۔

سنیے تو۔ بھابی کے ہاں اب پانچواں ——

احسان میاں نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ سلمیٰ دہل گئی۔

قربان آپ کی عقل کے۔ بھابی کے پانچواں بچہ ہو رہا ہے تو آپ کے حواس کیوں گم ہو رہے ہیں۔

آپ نہیں سوچتے کہ آپ کے ہاں بھی ——

نہیں۔ میں نہیں سوچتا۔ احسان میاں لاپرواہی سے بولے۔ "سنو۔ جب بھابی کی شادی ہوئی تھی تو وہ اتنی پیاری تھیں کہ دیکھے دیکھتے جی نہ بھرے۔ اب دیکھو جیسے سو سال کی بڈھی۔

سلمیٰ صفا جھوٹ پہچان گئی۔ بھابی ویسی ہی چنچل اور پیاری تھیں۔ تیس سال کی عمر میں بھی پچیس سے زیادہ کی نہ لگتیں۔ بڑا منّو تو ان کا بھائی لگتا!

بس —— تو جیسے ہی آپ ایک سے ڈیڑھ ہوئیں۔ یہ آپ کا چاند سا مکھڑا گہنا جائے گا۔ جب تک جان کو بکھیڑا کوئی نہ لگے تبھی تک اچھا۔"

سلمیٰ غور سے ان کا چہرہ تکنے لگی۔ بھلا جھوٹ تو نہیں بولتے۔ اب وہ ایسی پری زاد بھی نہیں تھی۔ کھلتا ہوا رنگ تھا، لمبی سی ناک پتلے پتلے ہونٹ، نازک نازک سا بدن۔ خوبی ہی کون سی تھی۔ وہ چڑ گئی۔

"آپ مجھے الّو نہ بنایا کیجیے۔ موئی کوہ قاف کی پریاں دھری رہ گئیں۔ جو پھل نہ دے وہ درخت! اپنے حسن سے الی کلوٹیوں نے دل جیتے ہیں۔ ہاں۔"

ہائیں ہائیں۔ . . . یہ کیسے جاہل الفاظ بولنے لگی ہو۔ موئی۔ کالی کلوٹیاں۔ انٹر فیل ہو کر جھک مارا تم نے۔

آپ مجھے بہلاتے ہیں۔ کون ایسا ہوگا بھلا جسے بچے کی تمنا نہ ہو۔ ننھا منا سا چاند ہوا پنا بھی۔ روئے مچلے

کھیلے کودے۔ اللہ میاں نے مجھے ایسا بدنصیب کیوں بنایا۔ میں نے کونسا قصور کیا تھا۔ ! وہ منہ ڈھانپ کر رونے کے لیے پھر اسٹارٹ لینے لگی۔

بھئی پاگل نہ بنو۔ مجھے کوئی ایسی واہیات تمنا نہیں ہے۔ بھابی جان کی کیسی درگت بنی ہے۔ ادھر سے منو ادھر سے چنو۔ بیچ میں اماں بی۔ اللہ پناہ میں رکھیو۔ مجھے بچے کچے نہیں چاہئیں۔ ایمان سے ! اب کی اگر آنسو سے بہائے تو پھر دیکھنا ــــ !

میں اب زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس جینے سے مرنا بھلی۔ آپ کسی دن دوسری لے آئیے گا۔ گھر تو بھرے گا۔

اچھا ــــ میں دیتا ہوں آوازیں اماں بی کو ــ وہ اتنی زور سے دھاڑے کہ اماں بی آٹا گوندھتے گوندھتے بھاگی آئیں ــــ

اے ہے بچے۔ کلیجہ دہلا دیا تو نے تو۔ ہوا کیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگیں۔

اماں بی، اپنے پاس زہر ہو گا تھوڑا سا !

وہ دہل کر احسان میاں کو دیکھنے لگی۔ اماں بی الگ لرز گئیں۔

دور پار دشمن زہر کا کیا کرو گے !

چوہے رات کو کھڑ بڑ کرتے رہتے ہیں۔ نیند حرام ہو کر رہ گئی ہے ! احسان میاں نے مسمسی صورت بنالی۔

اے۔ تو ایسا کرو نا۔ چوہے دان میں لکڑی کا ٹکڑا پھنسا کر ــ ! اماں بی ترکیبیں بتانے لگیں !

اماں بی۔ احسان میاں نے برا سا منہ بنایا۔ یہ بھابی تھکتیں نہیں۔ بچے دیتے دیتے !

ہنھ ! اماں نے ہنکار بھری۔ اور یہ ہنھ ایک چھری تھی جو سلمیٰ کے کلیجے میں اتر گئی۔

بچے نہ ہوں تو گھر گورستان ہے۔ پاک بے نیاز تجھے بھی نواز دے۔ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ ! جاتے جاتے اماں بی نے گمنام آنسو پونچھے۔

احسان میاں شرمندہ ہو گئے۔ مذاق میں بات ذرا بگڑ گئی تھی۔

سن لیا آپ نے۔ اماں بی سلگ رہی ہیں۔ خدا مجھے موت بھی نہیں دیتا۔ یہ پاپ کٹے۔

احسان میاں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

سدا کا روگ دیکھ کر بھابی نے اپنا چھوٹا منو اس کے حوالے کر دیا۔ جو چاند کے لیے مچلے وہ بھلا چاند کے عکس سے کیسے بہلے۔

سلمیٰ بہن۔ تمہارا احسان مانوں۔ لے لو تم سب کے سب۔ سکھ کی نیند تو جیسے اجڑ ہی گئی ! بھابی نے اسے چمکارا۔

ائے کیوں ننھے ! سلمیٰ سارا دن سار ملی۔

اللہ۔ میں تو شادی نہیں کر رہی تھی۔ بھابی کی زبان ٹھیٹھ کالجی تھی۔ بی اے بھتیاں ”بتی ــــ تم یقین

لڑو یا نہ کرو۔ معلوم ایک عورت تھی ہمارے پڑوس میں۔ اس کے ایک دم سترہ بچے تھے۔ سب سے بڑا لڑکا اٹھارہ انیس برس کا۔ سچی اللہ۔ سترہویں بچے پر نامراد پاگل ہو گئی۔ کمرے میں بند کر دی گئی۔ مرد بے چارے کی مٹی خراب ہوئی۔

اونہہ۔ آپ کی گپ ـــ سلمیٰ ہنسی۔

اللہ قسم۔ میں گپ کیوں اڑاؤں گی۔ امی جان سے پوچھ لینا۔ ابھی آئیں تو۔!

آپ نے بھی سترہ اٹھارہ کی ٹھانی ہے کیا؟ پٹارہ خانم۔ بھابی کو دیکھ کر سلمیٰ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

دعا کرو۔ اب کے لڑکی ہو۔ ورنہ وہ تو کہہ رہے تھے کہ پھر وہی لڑکا ہوا تو طلاق دے دیں گے۔

خاک تھوڑی سی بھلی ری طلاق۔ کیسے نصیب ہوتے ہیں۔ لڑکے۔ ایک پہ ایک۔! دل ہی دل میں وہ للچا گئی۔

سلمیٰ۔ اب بس ہے تو لے لے۔ میری منی۔ میں تو جی جان سے تیرے لیے دعا کروں۔ بھابی بولیں۔ سچ تو۔ بے ٹرک زچگی سجا کر فراکیں رکھی ہیں۔ ایک سے ایک پیارا نام سوچا ہے مگر وہی منحوس بھرا بچہ۔ بھابی نے ننھی منی سی توند پر ہاتھ پھیرتے ہو کہا۔

"آپ کونسی سکھی ہیں جو مجھے دعا دینے چلی ہیں۔

میں سکھی نہیں ہوں! بھابی بھی عجیب تھیں۔ واہ ری پگلی۔ چاہنے والا شوہر۔ آگے پیچھے ہونے والے بچے۔ ساس ہواری۔ اور پھر سکھی کسے کہتے ہیں۔

یا خدا۔ اسے بھابی کے گرگٹ پن پر حیرت ہی ہو گئی۔ ابھی ابھی بچوں کا رونا رو رہی تھیں۔ مگر کیسی جھوٹی نکلیں۔ ۔: ہ ہی اتر آگئی۔

میں نے بہت چاہا تھا۔ ان سے کئی بار کہا تھا۔ مگر ان کو تو بچوں کے نام ہی سے نفرت ہے!

ارے۔ اس بھروسے میں نہ رہنا۔ یہ مردوئے شکر چڑھی گولیاں ہوتے ہیں۔ منہ سے لاکھ نہیں نہیں کریں گے مگر دل ہی چاہے گا۔

ڈراتے مت! میرے میاں ایسے نہیں ہیں۔ سلمیٰ اٹھلائی۔

یہ احسان میاں۔ بھابی یک لخت ہنسیں۔ کون جانے۔ وہ ہنس کر چپ ہو گئیں۔

بولیے نا۔ وہ مشکوک ہو گئی۔

اماں بی اچانک آواز دینے لگیں۔ بھابی جاتے جاتے پھر ہنسیں۔

اللہ کہہ کے جائیے نا۔

برا مان جاؤ گی۔

نہیں مانوں گی۔

احسان میاں باپ نہیں بن سکتے۔

سلمٰی پر اتیم بم گر پڑا۔
اونچا پورا قد۔ کسرتی جسم۔۔۔ رگ رگ سے لہو ٹپکتا ہوا۔ کیا وہ ــــ اس کے آگے وہ نہ سوچ سکی۔
بڑی آپا سسرال سے آئی ہوئی تھیں۔ اچانک ہی سہ پہر کی گاڑی سے اتر پڑی تھیں۔ ان سے سلمٰی کا دم نکلتا۔ ایسے پائے پسند بھی نہیں کیا تھا۔ چیڑی کیا صاف تھی کہ سالوں کو خطرے ہی میں نہ لائیں۔ بیٹھی شکل تو بے شک تھی پر مان میٹھی نہ تھی۔
آپا آئی ہیں۔ چائے بناتے بناتے وہ بولی۔ احسان میاں لیٹے ٹائمز پڑھ رہے تھے۔ پھڑپھڑا کر ورق الٹا۔
آئی ہیں تو رہیں خوشی خوشی۔ ہمارا کیا؟ ذرا ترشی سے بولے۔
مجھے کچھ کہیں گی تو نہیں؟
اف فوہ۔ کہیں گی تو ایک کی دس تم بھی سنا دینا۔
آپ مجھے امی کے ہاں بھجوا دیجئے۔
کیوں؟
ڈر لگ رہا ہے
ہشت پاگل نہ بنو سلمٰی! آپا کہیں گی نہیں۔ ادھر ہی آئی۔ ادھر دلہن بیگم میکے سدھار گئیں۔
آپ کو پتہ نہیں۔ اوروں پر رکھ کر مجھے کیسی جلی کٹی سناتی ہیں۔
ہمارا ناک میں دم آگیا ہے سلمٰی۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کیا کروں۔
ہائے اللہ۔ آواز اونچی نہ کیجئے۔ وہ ڈر گئی۔
آپا اندر آتیں۔ دونوں لوٹ لوٹا سے گئے۔ سلمٰی کا رنگ اڑ گیا۔ کہیں آپا نے کچھ سن نہ لیا ہو۔
چلتے چلتے سر چکرا گیا۔ ایک جھٹکا ارادہ کے ساتھ وہ بڑے پلنگ پر سما گئیں۔ اب میں مری رہیں گی۔ وہ چل گئی تو بکرہ۔ کل صبح بیٹھے تھے دن بھر چلے پھر رات بھر۔ وہ بکواسنے لگیں۔
آپا سنا۔ میری ترقی ہو گئی ــــ! احسان میاں نے موضوع بدلا۔
ترقی پر پتھر پڑیں۔ ویسے ہی کاغذوں پر رات دن سر اوندھائے رہتے ہو۔ اب تو اور مصیبت ہے۔ اماں بی بیسے ہی پیچھے دھاڑ مچائے رکھتیں۔ مگر احسان میاں کا قدم دس بجے رات سے ادھر گھر میں نہیں آیا۔ یہ کیسی نوکری تھی بھلا۔ گریڈ تھا۔ نوکری اچھی مگر سبھی دفتر پانچ بجے بند ہو جاتے ہیں۔
اوور ٹائم۔ احسان میاں نے سمجھانا چاہا۔
چولھے میں جائے۔ آپا بھڑک اٹھیں۔ ارے بیٹے دوستوں کے ساتھ سینما بازی ہوتی ہوگی۔
لاحول۔ میں کوئی بچہ ہوں سینما دیکھتا پھروں گا۔

آخر سبھی ملازمت کرتے ہیں۔ تمھاری طرح نہیں کہ دس گیارہ بجے سے پہلے گھر میں نہیں آتے۔

وہ بھی حیران تھی۔ اب احسان میاں تھوڑے سے بہت چڑچڑے بھی ہو گئے تھے۔ بات بے بات کڑوے ہو جاتے۔ نوکروں سے سیدھے منہ بولتے ہی نہیں تھے۔ وہ بھی ڈرا ہی کرتی۔

کل ہی شوپنگ کرنے گئے تھے۔ بھئی سلمٰی۔ آپا کو وہ چیزیں دکھاؤ نا!

آپا بھلا کون سے لاڈ میں اترنے والی تھیں۔ الٹا جل مریں گی۔ وہ جھلا کر اٹھی اور الماری کھولنے لگی۔ اسے کچھ شبہ سا ہوا۔ آپا نے کوئی اشارہ کیا تھا۔ احسان میاں نے نفرت سے منہ سکوڑ کر چہرہ پھیر لیا۔ ساڑیاں، بلاوز کے پیس اور ہلکا پھلکا زیور تھا۔ جھٹ آپا کے سامنے رکھ کر کسی کام کے بہانے باہر نکل گئی۔

آپا نے کیا کہا تھا؟ اسے کرید سی لگ گئی۔ رات کو نہائی دھوئی پاک رنگ ہلکے نیلے لباس میں ملبوس وہ اچھوتی لگ رہی تھی۔ جانے کیوں احسان میاں کچھ بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ پیار سے وہ ان کے سخت گھنگھریالے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کرنے لگی۔

واہیات۔ احسان میاں بڑبڑائے۔ ان عورتوں کے مارے چین نہ مرے چین۔

کچھ آپ کو کہا تھا۔ اسے قرار نہ آیا۔

کہہ دیا کہ سب لغو۔ بکواس۔ یہ اماں بی ایک ہی ہیں۔ وہ گرجے

شام ہی کو آپا کچھ بڑبڑا رہی تھیں۔ وہ تو ازل ہی سے دل کی چور تھی۔ جہاں کھسر پھسر ہوئی اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

انھوں نے بھابی کے بچوں کو بھینچ کر پیار کیا تھا کھلونے اور مٹھائیاں دی تھیں۔ بھابی گلنار بنی ہوئی تھیں اماں بی کے پاس وہ بھی تھی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اگر آپا نے کچھ کہہ دیا تو کیا ہوگا۔ آخر آپا نے کہہ دیا۔

"اللہ میاں۔ میرے احسان کے گھر ایک بچہ دے دے۔ میں نیاز دلاؤں گی۔ کب سے آس لگائے ہوں۔ خدا جانے کوئی بدروح کا سایہ ہے۔ گود ہری ہونے نہیں پاتی۔

اماں بی نے سرد آہ بھر کر پاندان گھسیٹا۔ دھیمے سے بولیں۔ تقدیر کی بات ہے۔ زاہدہ کو دیکھو۔ بچوں کے مارے حیران ہے۔ دوائیں پرہیز کر رہی ہے۔ یہاں آس ہے تو زمین بنجر۔

اماں بی۔ پھر کسی سیانے کو دکھائیں۔

اری بیٹی۔ کیا سیانے کیا دیوانے۔ اللہ کی مرضی نہ ہو تو سب بیکار ——

تو پھر اب کیا ہوگا۔ آپا نے بڑے کرب سے پوچھا۔

جو احسان چاہے گا وہ ہوگا۔ اماں بی نے کہا۔

کیا چاہے گا۔ وہ بڑے آس بھرے انداز سے احسان میاں کو دیکھنے لگی۔

دلہن۔ تم ذرا جمو سے کہہ کر سامنے چائے دم کرا دیں۔ اماں بی نے کہا۔ اب وہ اتنی نا سمجھ بھی تو نہ تھی کہ اتنا نہ جانتی۔ اماں بی اسے بھگا رہی تھیں۔ وہ فوراً اٹھ کر چل دی۔

احسان سے کہیے۔ اب برداشت نہیں ہو سکتا۔ میں اسی لیے آئی ہوں۔ اب یہ کام کر ہی جاؤں گی۔

کیسا کام۔ بھابی بھونچکا رہ گئیں۔

بنجر زمین کوئی کب تک سینچے۔ دلہن بیگم۔ نہ پھل پھول کی آس، نہ چھاؤں کا دلاسہ۔ اسے کاٹ ڈالنا بھلا ٹھونٹھ درخت۔

آپا۔ بھابی کو ایسا لگا۔ سارا جسم جل گیا۔ دلہن کو بے حد چاہتی تھیں۔ چھوٹی بہن کی طرح۔ جن کے ہر دکھ کی سلی راز دار تھی۔ جس نے بیماری میں جاگ جاگ کر خدمت کی تھی۔ ان کے بچوں کے پیچھے سکھ چین گنوا دیا تھا۔ بے زبان، صابر شاکر، تقدیر پر قانع۔ یہ آپا اب اسے جان سے مار ڈالنے کی ترکیبیں کر رہی ہیں۔ یہ آپا اب اسے ان لگنے لگیں۔ وہ بڑی راز داری اور جاں سوزی سے اماں بی سے کہہ رہی تھیں۔

"عمرانہ بے حد پیاری بچی ہے۔ اے بیوی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ رسوں انگلیاں رسوں چراغ۔ اور پھر آپا کبھی عورتوں کی طرح بکواس کرنے لگیں۔ اماں کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ عمرانہ کو خود بھی دیکھا تھا۔ الٹا توا۔ بھینس بھینس۔ مگر وہ بانجھ تو نہ ہوگی۔

تم طے کرا دو بیٹی!۔ اماں روسی دیں۔

ہے وہ کلوٹی۔ مردار۔ بھابی نے ہنسنا چاہا۔ احسان میاں کی لونڈی سے بھی بدتر لگے گی۔۔۔ چاہے کچھ ہو تو رانی بن کر رہ لوں گی۔

بلا سے۔ لونڈی لگے چاہے باندی۔ مگر اب کیا کیا جائے پھر۔ آپا بولیں۔ گھر میں چراغ جلے۔ کالا ہو چاہے سفید ہو تو دے۔ احسان کی مجال ہے جو بکے۔ کاٹ کے نہ پھینک دوں۔

اور پھر اماں اور آپا میں لمبے لمبے مشورے ہونے لگے۔

اس کے ہاتھ جہاں تہاں رک گئے۔ تو اب احسان کی دوسری دلہن آئے گی۔ وہ تو پرانا لباس ہے۔ جس سے گرمی نہ دی مجھے۔ اس کا گھوڑے پر پھینک دینا ہی بھلا۔ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ کہاں کی چائے کی کہاں کی۔ باورچی خانے کے کالے کالے دھوئیں لگے ستونوں سے لگی سوچتی رہی۔ سوچتی ہی رہی۔ اماں بی۔ آپا۔ بھابی اور احسان میاں سبھی سب غیر دکھائی دیتے جن کا ساتھ بس اب چھوٹنے ہی والا تھا!!

کیا بات ہے دلہن بی۔ کریمن بوا نے اس کے یکساں بہتے ہوئے آنسو دیکھ لیے!

وہ بس روتی ہی رہی۔

اے ہے جان نہ ہلکان کرو دلہن بی۔ پرانا سودا۔ کسی کا گھر اجاڑ کر تمہاری نند بھی سکھی نہ رہیں گی۔ دیکھ لینا۔

کریمن بوا کو سن گن مل گئی تھی۔ بڑبڑاتی گئیں۔

جانے کیسے احسان میاں کو خبر لگ گئی وہ تو پہلے ہی رسّیاں تڑا رہے تھے۔ اب تو بپھرا اٹھے۔

اماں۔ میں آپ سے پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں۔ مجھے دوسری شادی پر مجبور نہ کیجئے۔ مجھے بچے وچوں کی کوئی آرزو نہیں ہے۔ اب زیادہ زور دیجئے گا تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

چپ بکواس۔ بھائی جان غرّائے۔ دوسری شادی۔ ارے بھئی۔ گھر میں ایک دو نہیں پورے چار پانچ چراغ روشن ہیں۔ احسان اور اسی کی دلہن سب لے لیں۔ کیوں جی۔ وہ بھابی سے مخاطب ہوئے۔

ہاں۔ ہاں۔ کوئی مجھے انکار ہے! بھابی بولیں۔ دینے والوں کے دل کتنے بڑے تھے۔ مگر اس کی جھولی کتنی ذرا سی تھی۔ کیسے لے لیتی۔ ان سبھوں کو۔ لینے کا حوصلہ کیا تھا؟ بھابی تو یہ سوچ سوچ کر کڑ رہی تھیں کہ وہ نصیبوں جلی سب دس رہی تھی!

اب زیادہ بک بک نہ کرو۔ سنا کر نہیں۔ آپا نے دھونس جمائی۔ میں سب طے کر آئی ہوں۔ مجھ سے یہ ورنہیں سہا جاتا۔ میرے بھائی کا گھر ــ

کچھ نہیں۔ احسان میاں نے سر ہلا دیا۔ یہ میری مرضی کا سوال ہے۔ میں نہیں چاہتا۔ میں سلمیٰ سے علیحدہ یں ہوں گا ــ

خدا نہ کرے۔ علیحدگی کیوں چاہ رہا ہے۔ آپا بی نے کہا۔ جو میاں بیوی کو الگ کرے۔ اسے مرتے وقت نہ نصیب ہو۔ وہ بھی رہے گی اور عمرانہ بھی۔

تو سلمیٰ پر سوکن آئے گی؟ بھابی سے نہ رہا گیا۔

پھر وہی سوکن۔ اماں بی نے ماتھا کوٹ لیا۔

اچھا پھر۔ اس کے بچہ ہونے کے بعد کیا اسے طلاق دے دی جائے گی! بھائی جان طنزیہ ہنسے۔ ان کا ہرگز نہ چاہتا تھا سلمیٰ پر سوکن آئے۔ وہ اسے بہت چاہتے تھے۔ اس کی تائید کرنے لگے۔ وہ بے چاری بے اولادی کے ساتھ ساتھ سوکن کا بھی غم اٹھائے۔ سوکن صاحبہ کے بچے ہوں تو ان کی خدمت کرے۔ اس کمبخت کے دھونس سہے! اور پھر سارے دکھ سمیٹے قبر کا پیوند ہو جائے!

ایسی محبت پھٹ پڑی ہے تم کو ان سے! آپا کا بس نہ تھا جو سب کے ٹینٹوے چبا ڈالتیں۔

یقیناً ہے۔ احسان میاں ہنسے! آپا اپنے اپنے نصیبے کا سب سے بگتان ہے۔ میں تو دوسری شادی پر راضی نہیں۔ بچوں کی ایسی آرزو ہے تو میں سلمیٰ کو طلاق دے دوں۔ وہ بے شک دوسری شادی کر لیں۔

احسان! بھائی جان کڑکے۔

ہائے غضب۔ بھابی نے دانتوں تلے انگلی دبا لی۔

اور آپا کو کاٹو تو لہو نہیں۔ منہ دیکھتی رہ گئیں۔ کیا خبر تھی۔ ان کے خلاف یہاں پورا محاذ بنا رہا ہے! وہ تو یہی سمجھ رہی تھیں سلمٰی کے لیے ہر ایک کے دل میں زہر بھرا ہو گا۔

اگر میری زندگی گوارا ہے تو آئندہ سے دوسری شادی کا تذکرہ نہ کیجئے گا۔ یہ کہہ کر احسان میاں کھٹ پٹ کرتے یہ جا وہ جا۔ بھائی جان بھی بحث کو بیل سمجھ کر چل دیئے۔ اماں کے تو آنسو ہی نہ رکے۔ آپا لڑ جھگڑ کر چلی گئیں۔ بھائی جان اور بھابی البتہ بے حد خوش تھے۔ ارے میکے بچے کیا۔ احسان کے کیا۔ لے لے سب۔ میں تو یوں ہی ناہنجاروں سے تنگ آ گیا ہوں۔ بھائی جان بولے اور بھابی نے چاروں کا ریوڑ اس کے کمرے میں ہنکا دیا۔ چھوٹے ٹوٹو کو وہ گدے سمیت احسان میاں کی مسہری پر ڈال آئیں!

احسان میاں اُس سے ایسی محبت کیوں کرتے ہیں۔ اس نے بھلا کیا کیا ہے، وہ تو خود کو خطاکار سمجھتی ہے۔ وہ اماں بی کے سائے سے بھی کتراتی ہے۔ احسان میاں سے نظریں چار کر کے شرماتی۔ جی چاہتا چھت سے چھلانگ لگا دے۔ گلے میں پھندا کس لے۔ مر جانے پر تو احسان میاں دھونی رمائے بیٹھے نہ رہیں گے! ہر وقت خودکشی کی ترکیبیں سوچا کرتی۔ احسان میاں کے اس احسان پر اسے اپنی ہی بے کار معلوم ہونے لگی تھی!! اس کے رُکے رُکے کھچے کھچے رہنے پر احسان میاں افسردہ ہو گئے۔

پہلے تو تم ایسی نہیں تھیں سلمٰی تم نے مجھے بھی فراموش کر دیا۔ دفتر سے آؤ تو تمہیں دیکھ کر سارے دن کی تھکن مٹ جاتی ہے۔

وہ خاموش رہی۔ انھوں نے بڑے پیار سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اٹھایا۔

سلمٰی ہنس دو۔ سچ سچ ... جس تمنا میں تم خود کو گھلائے دیتی ہو۔ اس کی مجھے بالکل پرواہ نہیں ہے۔ اگر تم کو اماں بی کا خیال ہو تو چلو۔ الگ گھر بسائیں۔ بھابی کے ساتھ رہنا نہ چاہتی ہو۔ تو کبھی ان سے نہ ملنا۔ میں ہر گز اصرار نہ کروں گا جس میں تم خوش ہو اسی میں، میں بھی خوش۔

میں نے کیا دیا ہے آپ کو۔ مجھ سے ہمدردی کر کے آپ کیوں سب کے برے بنتے ہیں۔ اماں بی اور آپا جو کچھ چاہتی ہیں۔ وہ کیجئے۔

پاگل ہو تم تو۔ سلمٰی۔ زندگی میری ہے۔ جیسی چاہے گزاروں۔

میری بھی خوشی نہ کیجئے گا۔

دوسری شادی کے علاوہ دنیا کی ہر خوشی پوری کر سکتا ہوں۔

اور سلمٰی اس محبت پر پھوٹ پڑی۔ اگر ایسا نہ چاہتے ہوتے تو بھلا دوسری شادی سے کس نے روکا تھا۔ آئینہ گواہ تھا۔ اسے اپنی صورت سے نفرت ہو گئی۔ وہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں ہے۔ اسے کتنا ارمان تھا صرف ایک بچے کا۔ وہ ماں بن جائے۔ اللہ۔ کتنے ننھے منے فراک قمیضیں، سویٹر پاجامے اس نے سب سے چرا چھپا کر الگ ٹرنک میں سجا رکھے تھے۔ الماری پر کھلونے رکھے تھے۔ کون پہنے یہ کپڑے۔ کون کھیلے یہ سب کچھ۔ اف۔ کیا انسان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے؟!

احسان میاں کی بے چارجیت نے اسے تقدیر پر قانع کر دیا۔ مگر وہ اپنے طور پر خاموش نہ تھیں۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے وہ دعائیں مانگا کرتی جس نے ایک درخت اگایا ہے۔ کیا وہ اس درخت میں پھل پھول نہیں پیدا کر سکتا۔

اماں بی نے اس سے بات چیت بند کر دی۔ گھر کے آخری کمروں میں وہ بھابی کے بچوں میں گھری رہتی۔ بھابی کے ہاں ان ہی دنوں پانچواں ننھا ہوا تھا۔ وہ دن بھر اپنے کمرے میں رہتیں۔ بھائی جان دورے پر جا چکے تھے۔ احسان میاں صبح کے نکلے دس بجے رات کو گھر میں قدم رکھتے۔ ! دن یوں ہی پھیکے سیٹھے بے مزہ سے گزر رہے تھے۔ نہ دن میں کوئی دلکشی تھی نہ راتوں میں کوئی حسن۔ جیسے اس کی زندگی بے کیف تھی ویسے ہی یہ صبح و شام ——— اب تو کھانے پینے میں بھی لطف نہ تھا۔ انڈوں کی بو ناک میں جاتی تو اس کی سیک سے ابکائی آتی۔ ! کچے پکے آموں پر نظر جاتی تو ڈھیروں رال بہہ جاتی جسم سنسنا جاتا اور آنکھوں میں تاریکی اٹھ آتی ——— ! وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔ کیریاں کھاتی بھابی تصور میں ابھریں ——— میرے خدا ——— کیا سچ مچ ——— دھڑ دھڑ کرتے سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

اے اللہ شکر تیرا ہزار ہزار ——— میرے پروردگار ——— !! لرزتے کانپتے ہاتھ اس نے اللہ میاں کی طرف پسار دیئے۔ اس کی خوشی احسان میاں سے چھپی نہ رہی۔

کیا بات ہے ؟ وہ خود بھی ہنسنے لگے !

کیا بات ہوتی ؟ ! وہ یک بیک گلابی ہو گئی، اور بیانہ بنانے کو ان کے جوتوں کی ڈوریاں کھولنے لگی !

نہیں ——— ! احسان میاں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ پہلے بتاؤ۔ تم آج اتنی خوش کیوں ہو ؟ !

وہ بے اختیار ہنس دی۔ آپ ہی تو کہتے تھے ہر وقت منہ لٹکائے رہتی ہو۔ اب پوچھتے ہیں۔ خوش کیوں ہو ! عجیب مصیبت میں جان ہے !

" یونہی رہا کرو۔ میری سلمی۔ انھوں نے اسے کھینچا اور وہ گرتے سے سنبھلتی ہوئی ان کے مجت بھرے سینے سے لگ گئی۔

ابھی تو نہیں بتاؤں گی۔ چاہے کچھ ہو۔ یکایک جان جائیں گے تو کتنے خوش ہوں گے !

سنو سلمی۔ آج آفس میں ایک نجومی صاحب نے میرا ہاتھ دیکھا۔ کہنے لگے کہ آپ کے گھر میں خوشی ضرور ہو گی۔ لہذا اب تم مایوس نہ رہا کرو۔ ... آج نہیں تو کل ——— کل نہیں تو پرسوں۔ تم ماں ضرور بنو گی۔ دیکھ لینا !

سچ ؟ ! وہ اندر ہی اندر ہنس رہی تھی !

بالکل سچ !! احسان میاں ہنسے۔

چوری پکڑلی آپ کی۔ آخر آپ کے دل کی بات زبان پر آ ہی گئی ! وہ بھی ہنسی۔

تمھارے لیے ——— ! احسان میاں بے حد خوش تھے۔ ورنہ مجھے تو نہ پہلے کوئی تمنا تھی اور نہ اب ہے !!

بھابی کے سب بچے اُسی کی جان کو آ گئے تھے۔ جی جان سے ان کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس رات سب کے سب ڈپٹی صاحب کے ہاں کسی تقریب میں جا رہے تھے۔ بھابی جا نہ سکتی تھیں ... وہ تنہا اپنے دالان میں ننھے کو سلا رہی تھی ! بھابی لوری گنگنا رہی تھی

سلمیٰ تم نہیں جا رہیں ؟! احسان میاں بولے۔

نا ۔ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

چلی جاؤ نا۔ دل بھی بہل جائے گا ذرا۔ اتنے دنوں سے نہ کہیں آئیں نہ گئیں۔ میں تو ہوں گھر پر۔ ننھے کو دیکھ لوں گا۔ انھوں نے اصرار کیا۔

ننھے کو دیکھ لیجئے گا۔ وہ حیران رہ گئی۔

تمہاری خاطر۔ وہ ایثار پر آمادہ نظر آئے۔

ہاں، سلمیٰ جاؤ۔ اپنی تفریح مت غارت کرو۔ اندر سے بھابی بولیں۔

اب اسے کوئی کھٹکا نہ تھا۔ چار پانچ مہینے کی تو بات تھی۔ وہ بھی ماں بننے والی تھی۔ اب اسے مضبوطی تھی۔ بیچوں بیچ لڑکیوں میں چہک رہی تھی۔ اماں بی کو بھی حیرت تھی۔ یہ آخر اسے ہوا کیا ہے ؟!

اچانک اس کی نگاہیں سامنے اٹھیں۔ رضیہ کی شادی ہوئے مشکل سے سال بھر ہوا ہوگا۔ مگر وہ اب ساڑی کے آنچل میں ایک گول سا ہوا چھپائے تھی۔ اس کا چہرہ شرم سے لال ہو رہا تھا۔

یک لخت اس کے دل کی رگیں کھنچنے لگیں۔ . . . سارے جسم میں نامعلوم سی آگ بھر گئی۔ خود پر قابو رکھنا دشوار ہوگیا۔ اپنے پر لعنت بھیجنے لگی . . . بھلا احسان میاں سے چھپانے کی کونسی بات تھی۔ اس سے ضبط مشکل ہونے لگا۔ احسان میاں سے اتنی بڑی خوشخبری کہنے کے لیے وہ باغ کی راہ گھر کو چل دی۔

بھابی جانے کب کی سو گئی تھیں۔ بچے بھی خراٹے لے رہے تھے . . .

اس کے کمرے میں البتہ روشنی تھی۔ باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں . . . کوئی بچہ بھی رو رہا تھا!

ڈوٹو تو نہیں جاگ گیا۔ وہ لپکی ۔

مگر ایک دم ٹھٹک گئی۔

آپ اس قدر ڈرتے کیوں ہیں۔ کوئی عورت بھاری آواز میں کہہ رہی تھی۔ ہم نے نکاح کیا ہے کوئی چوری تو نہیں کی ہے آخر کب تک ایسی ڈھکی چھپی زندگی گزرے گی۔ اب مجھ سے ضبط نہیں ہوتا۔ یا تو اپنے گھر رکھیے۔ نہیں تو میں آپ کی اماں بی سے سب کہہ دوں گی۔

ایسا غضب نہ کرنا زہرہ بی۔ احسان میاں کی لجاجت بھری آواز سنائی دی۔ چند روز اور صبر کر لو۔ پھر میں خود تمہیں یہاں لے آؤں گا۔ ویسے بھی تو میں روزانہ ایسی پر پانچ چھ گھنٹے تمہارے ہاں گزارتا ہوں۔

میں اب کچھ نہیں سنتی۔ زہرہ بی بولیں۔ آپ دراصل اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں۔ یوں کیوں نہیں کہتے کہ ان سے محبت زیادہ ہے۔ میں تو فقط بچے پیدا کرنے کی مشین ہوں۔ اور کیا۔

نہیں نہیں۔ زہرہ اتنی خفا نہ ہو۔ احسان میاں جیسے رو دیتے تھے۔ تم میری ہو۔ یہ ننھا سا گڈا میرا ہے۔ کیا تم

دونوں کو یوں ہی چھوڑ دوں گا۔ مرغ منّے کے لیے تو یہ باپ بیٹے ہیں۔ تم مجھ کو تو بہت ملامت نہیں ہوں۔ مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ وہ مجھ پر جان دیتی ہیں۔ اگر ان کو پتہ چل گیا کہ میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ اور میرا بچہ ہے تو وہ خدا جانے کیا کریں گی۔ اف فوہ۔ سوچو زہرہ میں ان سے کیسے کہوں گا۔

دنیا اس کی نظروں میں اندھیری تھی! چند لمحے پہلے وہ کتنی خوش تھی۔ اپنی خوشی میں احسان میاں کو شریک کرنے بھاگی بھاگی آئی تھی۔ مگر احسان میاں — دوسری شادی سے انکار — سلمیٰ سے بے پناہ محبت۔ دفتر کا اوور ٹائم کام . . . سب کچھ سمجھ میں آ گیا۔ سلمیٰ کے پاؤں کانپنے لگے۔ دل دھڑکنے لگا۔ بہتیرا سنبھالا۔ مگر ایک درد آور تڑپتی ہوئی چیخ اس کے منہ سے نکلی، اور اندھیرے میں دروازے سے سہارا لیتے لیتے دھڑام سے گر پڑی۔

دروازہ کھلا۔

احسان میاں جھپٹے۔ ان کے شانے پر ایک کالی کلوٹی عورت کا کرخت چہرہ جھانک رہا تھا۔ احسان میاں کی پیشانی پسینے سے بھیگ رہی تھی۔

سلمیٰ! سلمیٰ۔ وہ بوکھلا کر چلائے۔

آپ نے دھوکا دیا — آپ نے دھوکا دیا — وہ ہانپتی ہوئی کہہ رہی تھی — میں نے شروع ہی سے — آپ کو شادی کے لیے کہا تھا۔ مجھ سے چھپایا کیوں — میں . . . میں بھی تو آپ کے بچے کی . . . ماں . . . ماں بننے والی تھی۔ جہاں اتنا صبر کیا تھا تھوڑے دن — اور کر لیتے۔ آپ کو بتانے کے لیے۔ دوڑی دوڑی . . . آئی تھی . . . اللہ۔ یہ کیا سنا ہے۔ آپ کا بچہ — !!

احسان میاں تو گونگے ہو گئے۔

اے ہے تو کون سا غضب ٹوٹ پڑا تم پر — ! کلوٹی نے منہ بنایا۔

اب تاب نہیں ہے۔ سلمیٰ سسکنے لگی۔ اب کس کے سہارے۔ آخری سہارا بھی چھوٹ گیا — !

روتے روتے اس کی بے جان سسکیاں ختم ہو گئیں! برآمدے میں خاموشی چھا گئی!

احسان میاں نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ اور سلمیٰ پر جھک گئے!!

معاف کر دو — معاف کر دو!!

اور پھر ان کی چیخیں نکل گئیں!!!

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

غالب

اعظم راہی

اپنی آگ اپنا دامن

شام ہو رہی تھی۔

جب وہ میٹرنٹی ہوم میں داخل ہوا تو اسے کچھ عجیب عجیب محسوس ہوا۔ درد سے تڑپتی ہوئی عورتوں کی کراہیں، دوائیوں کی غیر مانوس سی بو۔ اسے وحشت ہونے لگی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر سامنے کے بڑے ہال سے ہوتا ہوا سیدھی جانب کے وارڈ میں داخل ہو گیا۔

وارڈ کی فضا تقاموش خاموش تھی۔ تاجور بیڈ پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ ناتوانی اور نقاہت کی وجہ سے اسکا حسن کچھ اور نکھر گیا تھا وہ سوچنے لگا کہ پہلے بچے کو جنم دینے کے بعد عورت کتنی حسین اور ملائم ہو جاتی ہے۔ تاجور کو اس عالم میں دیکھ کر اس کے دل میں بے پناہ پیار امڈ آیا، اور وہ دبے قدموں سے چلتا ہوا اس کے بیڈ تک پہنچ گیا، اور جھک کر اس کی خوبصورت پیشانی چوم لی۔ تاجور نے آنکھیں کھول دیں۔

رضوان کو اپنے قریب پا کر اس نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کب آئے ؟"

"بس ابھی ابھی" وہ اس کے پہلو میں بیٹھ گیا، اور پیار سے اس کے بال سنوارنے لگا۔

"ڈیڈی نہیں آئے؟"

"وہ صبح سے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں بس آتے ہی ہوں گے۔" پھر اس نے تاجور کے گال سہلا دیے۔ سامنے جھولے میں پڑا بچہ یکلخت اس کے جلانے کے باوجود اس کی آواز تیز ہوتی گئی۔ وہ اٹھا اور بڑھ کر جھولے میں پڑے لوتھڑے کو اٹھا لیا۔ سفید کپڑوں میں لپٹا ہوا سرخ سرخ سا ننھا اسے بہت پیارا لگا اور اس نے اس کے ملائم گال چوم لیے۔ اتنے میں باہر سے نرس آ گئی اور رضوان کی گود سے ننھے کو لے لیا وہ پھر تاجور کے پاس بیٹھ گیا۔ تاجور اس کا خوبصورت ہاتھ سہلانے لگی۔

"کیا تمہیں اس پر بہت پیار آتا ہے ؟" اس نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"بہت زیادہ۔" رضوان اس کے گالوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہیں اس پر پیار نہیں آتا؟"

"اوں، ہونہہ" تاجور نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیسی ماں ہو تم؟ اتنی تکلیفوں سے جنم دینے کے بعد بھی تمہارے دل میں اس کے لیے تھوڑا سا پیار نہیں۔"

رضوان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی ساتھ میں تاجور بھی مسکرا پڑی لیکن اس کے ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ میں ملاوٹ کی کمی تھی۔ رضوان اس کو غور سے دیکھنے لگا۔ آنکھوں میں نقاہت ڈول رہی تھی۔ چہرہ روز زرد سا ہو رہا اس کیفیت کو دیکھ کر اچانک رضوان کو وہ دن یاد آ گیا جب وہ صبح صبح تاجور کے ہاں کار سے اترا تھا۔ وہ لان میں افسردہ سی بیٹھی تھی، بکھری بکھری زلفیں، پریشان پریشان سی نظریں۔ ان نظروں میں کتنی اداسی تھی جیسے دنیا بھر کی محرومیاں اسی کے حصے میں آ گئی ہوں۔ اس نے جھک کر تاجور کو سلام کیا لیکن وہ دوسری طرف منہ پھیر کر اندر چلی گئی۔

ناشتے کی میز پر رضوان نے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ کیا دشمنوں کی طبیعت خراب ہے؟"

"جی نہیں" اس کی آواز میں افسردگی تھی۔ اس پر رضوان کو تعجب بھی ہوا لیکن اس نے موقع کی نزاکت دیکھ کر بات کا رخ بدل دیا۔

"ریاض انکل کہاں گئے ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں۔"

"کب تک ـــــ واپس آئیں گے؟"

"میں کہہ نہیں سکتی۔"

ناشتے کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیئے۔ رضوان تو بات کرنا چاہتا تھا لیکن تاجور کے موڈ کو دیکھ کر خاموش رہ گیا۔ رات بھر کے سفر کی وجہ سے وہ کافی تھک بھی گیا تھا اس لیے کچھ دیر آرام کرنا اس نے مناسب سمجھا۔

شام کی چائے پر دونوں ساتھ تھے۔ تاجور شفق کی سرخی کو دیکھ رہی تھی اس کے بال ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے بکھر گئے تھے۔ پھولوں سے ہو کر آنے والی معطر ہوا بھی اس کی افسردگی کو دور نہ کر سکی تھی۔ رضوان چائے کی چسکیاں لیتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا، اور وہ سوچ کی وادیوں میں گم تھی۔

"تاجور تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی کیوں ہیں؟ معلوم ہوتا ہے تم رات بھر سوئی نہیں۔"

"آپ کو اس سے کیا ـــ؟"

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔"

"تم غلط کہہ رہی ہو تاجور۔ میں خود دیکھ رہا ہوں تم افسردہ اور پریشان سی ہو۔ جب میں پہلی بار آیا

تھا تو تم کچھ اور ہی تھیں۔ وہ بے نیازی اور بے فکری جو تمھاری ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی آج وہ بات تم میں نہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ تمھاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم آج روتی ہو" تاجور ساکت بیٹھی زمین تک رہی تھی۔ اس کے دل کا درد آنکھوں میں چھلکنے لگا تھا۔ رضوان اس کے قریب آ گیا۔

"تاجور میں تمھارا دوست ہوں۔ مجھ سے اپنے دل کی بات کہو میں شاید تمھاری پریشانیوں کا حل تلاش کر سکوں۔" رضوان کی ہمدردی کے دو بول اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا بند توڑ گئے۔ وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔

"تاجور... " رضوان پکارتا رہ گیا۔

جب وہ تاجور کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ مسہری پر پڑی سسکیاں بھر رہی تھی۔ قریب پہنچ کر رضوان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ..." وہ اس کے مقابل کھڑی ہو گئی۔ رضوان نے دیکھا اس کی آنکھیں گلابی گلابی ہو رہی تھیں، گال تمتما رہے تھے۔

"تاجور" رضوان کی آواز میں خلوص تھا، ہمدردی تھی "تمھیں کیا دکھ ہے مجھ سے کہو شاید میں تمھارے کسی کام آ سکوں۔"

وہ خاموش رہی۔

"کچھ تو بولو تاجور... تم نہیں جانتیں تمھیں اداس دیکھ کر میرا دل کتنا بے چین ہے؟" رضوان کا یہ جملہ سن کر اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"مردوں کا دل اسی طرح بے چین ہو جاتا ہے" اس کے لہجے میں نہ جانے کہاں سے اتنی سختی آ گئی تھی۔ "آپ سے پہلے بھی ایک مرد اسی کمرے میں ایسی ہی نام نہاد ہمدردی کا ڈھونگ رچا چکا ہے۔ تم بھی میرا دکھ جاننے کے بعد چلتے بنو گے۔"

"سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے تاجور... تم جس کا ذکر کر رہی ہو اس میں اور مجھ میں فرق ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ تم مجھے اپنی زندگی سے زیادہ عزیز ہو یہ تو میری بدقسمتی تھی جو میں تمھارا دل جیت نہیں سکا۔ میرے دل میں آج بھی تمھارے لیے جو جذبے ہیں ان کا کوئی شریک نہیں، جانتی ہو میں یہاں دوبارہ کیوں آیا ہوں؟"

"نہیں"

"میں صرف تمھیں دیکھنے آیا ہوں۔ تاجی صاف صاف کہہ دو تمھیں کیا دکھ ہے؟" رضوان کے لہجے میں بے پناہ درد امڈ آیا اور آنکھیں دھندلا گئیں۔

"رضوان" تاجور نے پہلی بار اسے نام لے کر پکارا اور اس کے قریب پہنچ گئی۔ "سچ سچ تم مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے ہو؟"

"ہاں تاجی" رضوان نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔
رضوان ـــ کیا تم مجھ سے شادی کرو گے ؟"
"میری ایسی قسمت کہاں" رضوان نے افسردگی سے کہا۔
"میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ رضوان، سچ تو یہ ہے کہ میں اب بظاہر کلی ہوں لیکن میری حیثیت ایک مسلے ہوئے پھول کی ہے۔
"میں سمجھا نہیں۔"
"رضوان ـــ میرا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ اب میں ایک ویرانی ہوں۔ تمہیں مجھ سے شادی کرکے ویرانیوں اور بربادیوں کے سوا کچھ نہیں مل سکتا۔
"تاجی، عارف ایسا تو نہیں تھا۔ تم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ پھر یہ سب کچھ ہوا کیسے ؟"
"نہیں رضوان، عارف کو الزام نہ دو۔ اس حادثے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"
"پھر ـــ پھر ـــ کون ہے وہ ؟"
"مجھے خود بھی معلوم نہیں ؟ مجھے وہ تاریک اور سرد رات اچھی طرح یاد ہے میں اس رات کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ ـــ میں گھر لوٹ رہی تھی کہ میری کار فیل ہو گئی میں بہت پریشان ہوئی، کچھ دیر بعد اس تاریکی میں کچھ سائے نظر آئے میں نے انھیں مدد کے لیے پکارا ـــ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ میں اپنے ہاتھوں اپنی بربادیوں کو دعوت دے رہی ہوں ـــ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں رہا ـــ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنی کار میں تھی اور ـــ اور میرا سب کچھ لٹ چکا تھا۔"
کمرے میں سناٹا چھا گیا۔
شام کی سرخیاں تاریکی میں ڈھلنے لگی تھیں۔ رضوان چلتا ہوا کھڑکی تک آیا۔ باہر اندھیرا پنا ڈیرا ڈال چکے تھے۔ اس نے گمبھیر آواز میں پوچھا۔
"کیا ریاض انکل کو اس واقعے کی اطلاع ہے ؟"
"نہیں میں نے ڈیڈی کو کچھ نہیں بتایا۔"
"تم مجھ سے اب شادی کے لیے تیار ہو" رضوان نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔
"رضوان ـــ" تاجور اس کے قریب پہنچ گئی ـــ "تم چاہو تو مجھے زندگی دے سکتے ہو، میری لاج رکھ سکتے ہو ورنہ میں۔۔۔۔ دنیا میں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہوں گی۔ پھر میرے لیے دنیا میں سوائے موت کے کوئی چارہ نہیں رہے گا۔" اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ بہت سے لوگ چاند کو تو چاہتے ہیں لیکن اس کے داغوں سے نفرت کرتے ہیں۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

"تاجی" رضوان نے بڑھ کر اسے اپنی باہوں میں بھینچ لیا۔ میں تمہاری خوشی کے لیے سب کچھ کرنے تیار ہوں مجھے ان لوگوں میں مت شامل کرو میں تو تم کو بہت پہلے سے چاہتا تھا اور اب بھی چاہتا ہوں ۔۔۔ اور رضوان تاجور کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"آپ کیا سوچنے لگے تھے" تاجور خیالوں کی دنیا سے اسے باہر لے آئی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس نے پیشانی صاف کی اور ہاتھ کر تپائی پر رکھے تھرماس سے پانی کا ایک گلاس اپنے حلق میں انڈیلا۔ جھولے میں پڑے ننھے پر ایک نظر ڈالی اور تاجور کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ تاجور نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبا دیا۔

"میں نے آپ کی زندگی میں کانٹے بھر دیئے ہیں۔ میں کتنی خود غرض ہوں۔ اپنی عزت اور ناموس کے لیے آپ کی خوشیوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے ہمیشہ آپ کو دکھوں میں گھسیٹا ہے" اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ رضوان اس پر جھک گیا۔

"نہ رو میری تاجو، میری زندگی" رضوان نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا، اور پیار سے اس کے ماتھے پر اپنے جلتے ہونٹ رکھ دیئے۔

"تاجی"

"ہوں" وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"جانتی ہو، جھولے میں پڑے اس ننھے "ٹاڈیڈی" کون ہے؟"

"رضوان" تاجور تڑپ اٹھی اس کی نظروں میں شکایت کا بے پناہ طوفان سمٹ آیا" اس ذکر کو نہ چھیڑو تو اچھا ہے رضوان" اس کی آنکھیں بھر آئیں اور سسکیاں فضا میں بکھر گئیں۔

"نہیں تاجی تم سن لو اس رات میں نے ہی تم پر ڈاکہ ڈالا تھا کیوں کہ تم میرے لیے ناقابل تسخیر تھیں"

"تم ——— .... وہ تم تھے رضوان" تاجور کا سارا بدن لرز کر رہ گیا، اور رضوان تیزی سے وارڈ کے باہر نکل آیا۔

یوسف ناظم

دن منانا

اگر آدمی اپنی مرضی سے بیکار رہنا چاہے تو اور بات ہے ورنہ دنیا میں کئی شریفانہ کام ایسے ہیں جن میں آدمی اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتا ہے۔ بیکار رہنے میں آدمی کو جتنا لطف آتا ہے اتنا ہی لطف اُسے دن منانے میں حاصل ہو سکتا ہے اور دن منانا بیکار رہنے سے یقیناً بہتر ہے۔ دن منانا نام بھی ہے اور تفریح بھی۔ آپ کے بیکار رہنے کی اطلاع کسی کو ملتی ہے اور کسی کو نہیں مثلاً چھٹی کے دن آپ کیا کر رہے ہیں۔ گھر میں بیوی سے لڑ جھگڑ رہے ہیں بچوں پر اپنے اقتدار کا سکہ جما رہے ہیں، بستر میں پڑے پڑے جاسوسی ناول پڑھ رہے ہیں۔ آپ کی ان مصروفیات کا علم کسی کو نہیں ہوتا لیکن اگر آپ دن منانے پر تل جائیں تو کوئی شخص بھی مطلع ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس خوشخبری سے کسی شخص کا بچنا محال ہے۔

دن کئی طرح کے منائے جا سکتے ہیں ان میں بعض دن انفرادی اور نجی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مثلاً جنم دن۔ اگر آپ اپنا جنم دن منانے میں کسی خاص وجہ سے شرم محسوس کرتے ہوں تو کوئی شخص آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ یہ دن منائیں۔ لیکن آپ اپنے بچے کا جنم دن بلا تکلف منا سکتے ہیں۔ کیوں کہ بچے کا جنم دن منانا ابھی والدین کے لیے شرم کی بات نہیں ہوئی۔ اور بچہ بیچارہ ابھی کو کیا معلوم کہ آگے چل کر اسے ولادت کے بارے میں کس قدر شرمندہ ہونا پڑے گا۔ گھر طویو ماہرِ ... پر گہری نظر رکھنے والوں کا خیال ہے کہ بچہ کا جنم دن منانا مہنگا نہیں پڑتا۔ اس لیے اکثر زندہ دل لوگ اپنے ایک ہی بچہ کا جنم دن سال میں دو دو تین تین مرتبہ منانے میں قباحت نہیں سمجھتے۔ بچے کی سالگرہ منانے کے دن والدین کا ہاتھ دھونا اور نئے کپڑے پہننا، اچھے کھلاڑی کی نشانی ہے۔ اس دن اگر بچے کے والدین خود گانا نہ گا سکیں تو انھیں مندرجہ ذیل ریکارڈ بجا کر سننا اور مہمانوں کو سنانا چاہیے۔

ہم بھی اگر بچے ہوتے نام ہمارا ہوتا ببلو ببلو
کھانے کو ملتے لڈو
اور دنیا کہتی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو

بچے کے جنم دن کے علاوہ آپ نہایت مہذب طریقے سے اپنی شادی کی سالگرہ بھی منا سکتے ہیں۔ اس دن میاں بیوی

صبح سویرے ایک دوسرے سے مسکرا کر بات کر سکتے ہیں۔ سال میں ایک آدھ مرتبہ آپس میں مسکرا لینے میں کوئی حرج نہیں اس دن میاں بیوی ہوٹل میں کھانا بھی کھا سکتے ہیں۔ دونوں کو خوشی ہوگی۔ بیوی کو اس لیے کہ چلو اسی بہانے ایک دن تو چولہا جھونکنے سے نجات ملی اور میاں کو اس لیے کہ قیمتاً ہی سہی، ایک دن تو بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے کی مصیبت سے چھٹکارا ملا۔ کھانا کھانے اور صورتیں بنا کر بل ادا کرنے کے بعد یہ دونوں اس دن سینما بھی دیکھ سکتے ہیں۔ شوہر کو ہیروئن کی خوبصورتی اور بیوی کو ہیرو کی دلیری اور خوش مزاجی ضرور پسند آئے گی۔ شادی کی سالگرہ ایسی ہی منانی چاہیے۔ دوست احباب کو دعوت دے کر گھر پر بلانا اور اعلان کرنا کہ یہ ہماری شادی کی سالگرہ کا دن ہے۔ دوسروں کو خواہ مخواہ عبرت دلانا ہے عبرت دلانے میں کوئی مضائقہ تو نہیں لیکن صرف عبرت دلانے کی خاطر زیر بار ہونا منصفی نہیں۔ یوں جی چاہے تو میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے کو تحفہ دے سکتے ہیں۔ تحفہ البتہ ایسا ہونا چاہیے کہ جلد ٹوٹ پھوٹ جائے یا خرچ ہو جائے۔ مثلاً پانی پینے کا ٹمبلر یا سگریٹ کا ڈبہ (شوہر کے لیے) اور خوشبودار سینٹ یا منہ دیکھنے کا آئینہ (بیوی کے لیے)۔ تحفہ میں دی ہوئی چیز اگر زیادہ عرصہ تک کام دیتی رہے تو میاں بیوی دیر تک وہی بات پر کڑھتے رہیں گے کہ کیا لغو تحفہ ملا ہے۔ تحفہ کی بات جتنی جلد بھلائی جا سکے اچھا ہے اور پھر شادی کی سالگرہ تو ہر سال منائی جا سکتی ہے۔ ہم نے کہا نا کہ سال میں ایک آدھ مرتبہ میاں بیوی کا ہنس بول لینا مضر نہیں۔

شخصی اور خانگی خوشیاں کسی اصول یا قانون کی پابند نہیں ہوتیں اور ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے آپ کو خوش اور زندہ رکھے۔ بعض لوگ خاموش رہنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ایسے شریف لوگ گنتی کے ہوا کرتے ہیں ایسے لوگ جب شرافت کی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو ہر ہفتہ "یوم خاموشی" مناتے ہیں۔ یوں ان کی خاموشی ایک دن ہی کی ہوتی ہے لیکن حساب سے دیکھا جائے تو وہ ایک دن کے علاوہ دو راتیں بھی خاموش رہتے ہیں (بظاہر ایسا ہی ہونا چاہیے) خاموشی کے دن وہ صرف سنتے ہیں بولتے ہیں۔ ان پڑھ لوگوں سے وہ اشاروں میں بات کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنے دونوں ہاتھ دور تک پھیلائیں، تو مطلب ہوتا ہے کہ انھیں اخبار چاہیے۔ اپنے منہ تک ایک ہاتھ لے جا کر منہ ذرا اوپر اٹھائیں تو انھیں پانی پلانا چاہیے۔ پڑھے لکھے لوگوں سے وہ لکھ کر بات کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی ملاقاتی آ کر کہے کہ شاہنواز کی فیملی آج عراق جا رہی ہے تو آپ فوراً کاغذ پر لکھ دیں گے تم میری طرف سے جا کر خدا حافظ کہہ دینا اور بچوں کے لیے پیپرمنٹ کا پیکٹ پہنچا دینا ۔۔۔ کسی اور کو لکھ کر ہدایت دیں گے کہ روئی کے سٹّے کے لیے موتی لال سیٹھ سے کہہ دینا کہ میں نے جو بھاؤ کل کہا تھا اس پر تین ہزار گانٹھیں لے لیں۔ شکر کے لیے ہدایت لکھی جائے گی کہ دو سیر شکر بلیک سے منگوا لو اور پندرہ روپے دکان کے حساب میں لکھ دو یوم خاموشی منانے والوں کی گفتگو کا سلسلہ دوسرے دن صبح سویرے ہی شروع ہو جاتا ہے اور پھر وہ مسلسل چھ دن بولتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یوم خاموشی منانے والے اصل میں چھ دن کا مسلسل بولنے کی وجہ سے تھک کر یوم خاموشی منانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کاش یہ بات صحیح ہوتی اور عورتیں بھی یوم خاموشی منا سکتیں ۔۔۔ لیکن ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔

انہونی باتیں سوچنے سے فائدہ کیا ہے اگر عورتیں یوم خاموشی منائیں تو ہر مرد ایک دن کا بادشاہ بن جاتا۔

یہ تو ہوئے وہ دن جن کی قومی یا بین قومی کوئی اہمیت نہیں لیکن جب اجتماعی شعور بہت زیادہ بلند ہو جاتا ہے اور زندگی کا ثبوت دینا فرض ہو جاتا ہے تو ملک کے سارے باشندے مل جل کر دن منانے کا نیک کام انجام دیتے ہیں۔ دن منانا ایک اضطراری فعل ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے یا کھڑے کھڑے کسی بھرے آدمی کے ذہن میں یہ بات آجاتی ہے کہ فلاں دن منانا چاہیے۔ بس ایک مرتبہ کوئی دن منا لیا جائے تو پھر وہ "کینسر" بن جاتا ہے۔ یہ دن منانا ہر قوم اور ہر ملک کے لیے بے حد ضروری ہے۔ جن قوموں نے دن منانے میں غفلت کی وہ زیادہ دن تک پنپ نہیں سکیں۔ جب قوم کسی اہم اور دشوار مرحلے سے دوچار ہوتی ہے تو صرف دن منانے سے کام نہیں چلتا ایسے نازک موقعوں پر پورا ہفتہ منانا پڑتا ہے۔ مثلاً ہفتہ حفظانِ صحت، ہفتۂ خوش اخلاقی، ہفتہ قومی بچت، مطلب یہ ہوتا ہے کہ کم سے کم اس ہفتہ کے دوران میں شہر کے گلی کوچے صاف رہیں۔ تعفن ہو لیکن کم۔ اس ہفتہ کے دوران میں مختلف پروگرام ہوتے ہیں جن میں لوگوں کو ان امراض کے نام بتلائے جاتے ہیں جن میں وہ آسانی سے گرفتار ہوتے ہیں۔ ایسی تقریریں سن کر عوام میں جلد بیمار پڑنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ ہفتہ خوش اخلاقی کبھی کبھی منایا جا سکتا ہے۔ اس ہفتہ میں ہر شخص کے چہرہ پر بناوٹی مسکراہٹ نظر آتی ہے خواہ مخواہ کی مسکراہٹ بڑی دلچسپ چیز ہوتی ہے اور بعض وقت تو آپ شرمندہ ہو جاتے ہیں کہ آپ کے سامنے کھڑا ہوا شخص مسکرا کیوں رہا ہے۔ اور آپ سوچتے ہیں کہ یا تو آپ کا شیو ٹھیک نہیں ہوا ہے یا آپ کپڑے ٹھیک نہیں پہن رکھے ہیں۔ آپ سمجھ ہی نہیں سکے کہ یہ مسکراہٹ ہفتہ خوش اخلاقی کی مرہونِ منت ہے۔ ورنہ لوگ جانتے ہیں کہ ہمیں مسکراہٹ سے کیا واسطہ اور وہ بھی مسلسل ایک ہفتہ کی مسکراہٹ۔ خوش اخلاقی کے مظاہرے کا یہ طویل سلسلہ سات دن کی خوش اخلاقی قید بامشقت نہیں تو اور کیا ہے۔ آدمی کو جو کام بھی اپنی مرضی کے خلاف کرنا پڑے یقیناً سزا ہے۔

ہفتہ قومی بچت میں سوائے بچت کے ہر چیز ہوا کرتی ہے۔ نمائش، تفریح، اہل و عیال کے ساتھ بھیل پوری، بٹاٹا وڑا، اور آئسکریم کھانا، قومی بچت کے ہفتہ کے ضروری مشاغل ہیں۔ اس ہفتہ میں اگر کوئی شخص معمول سے زیادہ خرچ نہ کرے تو وہ مجرم سمجھا جاتا ہے۔

ہفتہ دودھ بھی اسی قماش کا ہفتہ ہوا کرتا ہے۔ اس ہفتہ میں پانی کا خرچ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اس ہفتہ میں جن لوگوں کو خالص دودھ مل جاتا ہے وہ بڑے خوش نصیب سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دودھ فروشوں کے سسرالی عزیز ہوتے ہیں۔

دن تو ہر قسم کے منائے جا سکتے ہیں۔ سب سے اچھا دن وہ ہوتا ہے جس دن کسی خوشی میں مدرسوں میں مٹھائی اور محلوں میں کپڑا تقسیم کیے جانے کا اعلان ہوتا ہے۔ اس دن صبح سے لے کر رات تک جہاں بھی ذرا سی جگہ ہو جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ جنہیں کبھی اپنے گھر میں بات کرنے کا موقع نہیں ملتا اس دن مجمع عام میں تقریر کرنے کا موقع مل جاتا ہے شاعروں کو تو لوگ اس دن اغوا کر کے اپنے اپنے مشاعرہ میں لے جاتے ہیں۔

یوم والدین بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا اونچا دن مانا گیا ہے۔ یہ ایسے موقعوں پر منایا جاتا ہے جب کہ

مدرسوں کے شاندار نتیجے شائع ہو چکتے ہیں. اس روز عصرانہ بھی ترتیب دیا جاتا ہے جس کے اخراجات کی پابجائی پورنٹ سے کی جاتی ہوگی. جلسہ میں شامل ہونے والے لڑکوں کے بلند حوصلہ والدین شریک ہوتے ہیں. اس روز انھیں بتایا جاتا ہے کہ مدرسہ کا نتیجہ پچھلے سال ۲۰ فیصد تھا لیکن اس سال ۱۶ فیصد رہا. یہ سنتے ہی حاضرین جلسہ دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا دیتے ہیں کیوں کہ تالی ایک ہاتھ سے بجتی نہیں. ہیڈ ماسٹر کی تقریر اور ڈرل ماسٹر کے شکریہ پر یہ محفل برخاست ہو جاتی ہے.

موجودہ دور میں ہماری ذمہ داریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ہر دن کوئی نہ کوئی یادگار دن ہوتا ہے بلکہ بعض موقعوں پر تو قوم ایسے نازک موقف میں آ جاتی ہے کہ ایک ہی دن میں کئی کئی دن منانا پڑتے ہیں. مثلاً صبح سات بجے سے دس بجے تک یوم والدین منایا گیا تو ۱۱ بجے سے ۲ بجے تک یوم بے روزگاران اور سہ پہر ۳ بجے سے یوم سیاسی بحران، اور رات میں کہیں جاکر یہ دن علمی فقدان پر ختم ہو جاتا ہے لیکن ایسے موقعے کبھی کبھار ہی آتے ہیں. ورنہ عام طور پر ہر مسئلہ کے لیے ایک علیحدہ دن مقرر ہے اور آپ بڑے اطمینان سے وہ دن منا سکتے ہیں.

فاطمہ عالم علی

شاعر کے خواب اور تصورات

عرفِ عام میں شاعر کی تعریف کچھ یوں ہے کہ شاعر اس کو کہتے ہیں جو شعر کہے لیکن میری ناچیز رائے یہ ہے کہ جن و بشر کے درمیان بھی ایک مخلوق ہے جس کو شاعر کہتے ہیں!! اب کوئی یہ بحث کرنے پر ہی تل جائے کہ صاحب! کسی آسمانی کتاب میں ایسی مخلوق کا ذکر نہیں ہے۔ آخر آپ نے کس بنا پر اس کو مخلوق جانا؟ تو میں دست بستہ عرض کروں گی کہ قبلہ! جہاں اللہ پاک نے کائنات کی بہت چیزوں کو پوشیدہ رکھا ہے ہو سکتا ہے کہ "مخلوق شاعر" کا ذکر بھی مصلحتاً نہ کیا ہو اور یہ بھی کوئی راز ہو!!

جہاں تک ظاہری شکل و صورت کا تعلق ہے بھلا ان کے انسان ہونے سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن ان کی شاعرانہ فطرت اور مزاج معاذ اللہ! یہی وہ مقام ہے جہاں سے حضرت شاعر جن و بشر کی درمیانی زنجیر نظر آتے ہیں۔ مزاج کا تو یہ عالم ہے کہ ذرا میں تولہ ذرا میں ماشہ کسی کل قرار نہیں کسی بات میں اعتدال نہیں تعریف کرنے پر آئیں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیں ہجو پر اتر آئیں تو ساری دنیا پر تھکوا دیں زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ان کا دخل نہ ہو۔ رہا فن سو شاعر خود کہتا ہے کہ "ہر فن میں ہوں طاق مجھے کیا نہیں آتا" عاشقی کا کیا کہنا یہ تو ان کا اوڑھنا بچھونا ٹھیرا۔ غرض ان کی دنیا خواب و خیال کی دنیا ہے اور اس دنیا میں جو کچھ ہے تصور ہے۔ یہ تصورات کی بنیاد پر ایسے ایسے محل تعمیر کرتے ہیں کہ انگشت بدنداں رہ جائیے۔ خواب کون نہیں دیکھتا!؟ ہوائی قلعے سبھی لوگ تعمیر کر ہی لیتے ہیں لیکن شاعر کا کیا مقابلہ یہ تو تصوّرات کو الفاظ کا کچھ ایسا جامہ پہناتا ہے۔ جو کبھی آپ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آیا ہوگا۔ دور کیوں جائیے حکیم مومن خاں مومنؔ ہی کو لیجئے۔ جی ہاں وہی مومن خاں جو آخری عمر میں مسلماں ہوتے ہوتے رہ گئے اور محض اتنی سی بات پر کہ ساری عمر بت پرستی کرتے رہے مسلماں . . . ہونے میں کچھ فائدہ نہ دیکھا بات یہ ہے کہ مومن صاحب حکیم ہی نہیں نجومی بھی تھے حکمت سے صحت کا حال اور نجوم سے عمر کا حساب لگا لیا ہوگا جب ہی تو مسلماں ہونے کا خیال ترک کر دیا ورنہ اگر کچھ اور عمر کٹنا ہوتی تو بس سمجھئے کہ مسلمان ہو ہی گئے تھے! دیکھئے میں کوئی نئی بات تھوڑی بتا رہی ہوں یہ راز خود مومن خاں بتا گئے ہیں آپ بھی سن لیجئے تاکہ مجھ پر کوئی الزام نہ رہے کہتے ہیں ؎

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

حضرت مومن بھی آخر عالم خواب و خیال کے باسی ہیں سیدھی اور صاف بات بھلا کاہے کو کرتے جو بات ہے ایک معمہ نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا! خیر صرف معمہ ہی ہوتا تو صبر آجاتا کہ بیٹھے حل کیا کرتے لیکن یہ شاعر تو مجموعۂ اضداد ہوتے ہیں!! کسی بات کا ٹھکانا نہیں خود ہی ایک خیال پیش کرکے تائید کریں گے اور دوسرے ہی لمحے تردید فرمادیں گے۔ کہ کس بات کو مانیں اور کس بات کو نہ مانیں یہ فیصلہ کرنا ہی مشکل ہے ذرا یہ معمہ نما شعر ملاحظہ فرمایئے۔ کہتے ہیں ؎

تھے بے گناہ جرأت پابوس تھی ضرور
کیا کرتے وہم خجلت جلاد آگیا

یہ بھی کوئی بات ہوئی ہے ناصح والی بات!؟ ارے صاحب جب آپ بے گناہ تھے تو جلاد صاحب کیوں نازل ہوئے اور کس قدم چومنے کی ضرورت پیش آئی اور پھر یہ "وہم" کیا بات ہوئی بھئی ہم تو ایک ہی "وہم" سمجھتے ہیں جس کے کہا جاتا ہے کہ اس کا علاج لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔ گویا حکیم صاحب نے الفاظ کا معجون مرکب تیار کیا ہے۔ اس کی تاثیر بعد استعمال ہی ظاہر ہوگی۔ . . . ہماری سمجھ میں تو اتنا ہی آتا ہے کہ محبوب صاحب جلاد کے بھیس میں میاں عاشق کو قتل کرنا چاہتے تھے اور عاشق صاحب کو قتل ہونا گوارہ نہ تھا انھوں نے سوچا چلو جلاد کے پاؤں چوم کر کم از کم گستاخی ہی کر لو تاکہ دل کو یہ تسلی رہے کہ بے گناہ قتل نہیں ہوئے اور اگر جلاد سے باز پرس ہو تو وہ بھی صفائی پیش کر سکے کہ اس نے گستاخی کے جرم میں قتل کیا ہے ورنہ سچ پوچھئے تو ہم نے کبھی اس قسم کی انوکھی واردات ہی نہیں سنی!! اب ذرا یہ ادا ملاحظہ فرمایئے فرماتے ہیں ؎

کس صنم سے چھڑا دیا واعظ
لے خدا تجھ سے انتقام میرا

صرف باتیں بنا رہے ہیں ورنہ ان کو دیکھئے اور صنم کو چھوڑ نہ دیکھئے۔ کھسیانے ہوئے معلوم ہوتے ہیں! ضرور صنم ہی نے چھوڑ دیا ہوگا کسی پر بس نہ چلا تو لگے گڑگڑا گڑگڑا کر واعظ کو کوسنے۔!! کہ بیچارے واعظ نے میرا خراب کیا خدا اس کے آگے لائے۔ ظاہر ہے کہ واعظ کی ساری عبادت کا حاصل حوریں ہی تو ہیں!! کون جانے کہاں تک اس خیال میں صداقت ہے ورنہ سچ تو یہ ہے کہ شاعر کی باتیں تمام خواب و خیال کے قصے ہیں۔ ورنہ کہاں کا صنم اور کیسا واعظ جو جی میں آیا فرض کر لیا اور لگے واویلا کرنے!

کدھر شاعری اور کدھر نجوم مگر مومن خاں نجوم کو بھی یوں کھینچ لائے جیسے یہ بھی شاعر کا لوازمہ ہو! کہتے ہیں:

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا؟

نجومی نجوم کو ذریعہ معاش بناتے تو چین کی بنسی بجاتے لیکن شاعر تو اپنے تخیلات کے ہاتھوں تباہ ہے۔ جس طرح ان کے یہاں واعظ، ناصح، رقیب اور محبوب وغیرہ خیالی ستم گر ہیں اسی طرح ان کو یہ بھی خیال ہے کہ وہ آسمان سے کتنی ہی رحمتیں نازل ہوں ان کے حق میں وہ ستم ہی ثابت ہوتی ہیں۔ اب اس خیال کو ان کے دل سے کون نکال سکتا ہے۔ کیونکہ حضرت مومن

سے ذرا یہ پوچھے کہ جب آپ کا نجوم ہی اس کی بدنصیبی کی گواہی دے رہا ہے تو بلا وجہ غریب آسمان کو کیوں بیچ میں لاتے ہیں. لیکن سوال تو یہ ہے کہ پوچھے کون؟ ایک جگہ فرماتے ہیں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

خدا جانے کس نیکی کی دھن میں تھے کہ ایسا صاف شعر کہہ دیا. اگر کسی نے اردو کی دو چار کتابیں پڑھیں اور جاسوسی ناولوں کا مطالعہ کر لیا تو سمجھے کہ بیڑا پار ہے. اگر آپ اس سے اس شعر کا مطلب پوچھیں تو وہ فوراً تشریح کر یگا کہ حضرت مومن نے گویا کا لفظ عادتاً لکھ دیا ہے، کیوں کہ یہ ان کا تکیہ کلام تھا. ورنہ شاعر اپنے ایک مخلص دوست سے کہتا ہے کہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں یعنی گھر والے باہر چلے جاتے ہیں تو آپ میری تنہائی دور کرنے کے لیے آ بیٹھتے ہیں. یوں مومن کیا کہنا چاہتے ہیں اس کی بحث بے کار ہے ظاہر ہے کہ کوئی خواب بیانیہ کیا ہوگا، یا تصور میں محبوب کو قریب پایا ہوگا ورنہ اگر سچا عاشق ہوتا تو عاشق ہرگز یہ نہ کہتا کہ "صاحب میں ایسا نکما عاشق تو ہوں نہیں کہ بس سارے کاروبار کو ایک طرف کر کے آپ کے دھیان میں رہوں. آخر مجھے بھی دوسرے کام ہیں. ملنا جلنا بھی چلتا ہی رہتا ہے. البتہ یہ ضرور ہے کہ جب دوسرے مشاغل سے فرصت پاتا ہوں اور آپ کا دھیان آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ میرے قریب ہی موجود ہیں." ذرا غور تو کیجئے "جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا" کہہ کر محبوب کی کس قدر ہتک کی ہے. بہرحال ہم کو ان معاملات سے کیا غرض اب حضرت مومن کا ایک شعر اور پیش کروں گی ذرا توجہ سے سنیے فرماتے ہیں.

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

خدا جانے مومن خاں کے تصور میں کیا ہے کہ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مخاطب کون ہے نہ ہی خواب عدم کی بات کھلتی ہے پھر ہم جیسے لوگ جو ہمیشہ مادی چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں بھلا ان کا شعر کیا سمجھ پائیں گے؟ ہماری سمجھ میں جو بات آئی اس کا خلاصہ بیان کرتی ہوں. ہوا یہ کہ مومن مرض موت میں مبتلا ہو گئے جینے کی آس نہ رہی سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ آپ نجومی بھی تھے اختر شماری سے یہ اندازہ کر لیا کہ کل یعنی آنے والا کل زندگی کا آخری دن ہے. طبیعت دور اندیش پائی تھی خیال آیا کہ میرے بعد "بوا شب ہجراں" کا کیا ہوگا. ساری عمر تو میری خدمت میں گزار دی اور بڑی وفاداری سے ساتھ دیا. اس کے لیے کچھ نہ کرنا چاہیے. بس یہ خیال آتے ہی بوا کو سامنے بلا کر اس کا حساب کتاب بے باق کیا ہاتھ پر تنخواہ دھری اور نہایت مخلصانہ اور دوستانہ مشورہ دیا کہ وہ کوئی گھر دیکھ لے تاکہ گزر بسر کے لیے بعد میں پریشانی نہ اٹھانی پڑے." اب اگر اصل مطلب پر آیئے تو وہی خواب و خیال والی بات ہو جائے گی. کیوں کہ ظاہر ہے کہ "شب ہجراں" انسان تو کیا کسی مادی شکل میں بھی موجود نہیں اس کے لیے "ٹھکانے" کا مشورہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں لیکن بہرحال یہ شاعر اپنی دنیا کی بات کرتے ہیں اگر ہم ان کی زبان نہ سمجھیں تو بیچارے شاعر کا کیا قصور!

یہ تو تھے حضرت مومن اب ذرا چچا غالب سے ملاقات کیجئے۔ یہ دونوں ہم عصر تھے ایک ہی آب و ہوا سے ان کا خمیر تیار ہوا ہے اسی لیے خواب و خیال کی بلندی میں غضب کی یکسانیت ہے۔ وہی نخرے اور پہیلیاں یہاں بھی موجود ہیں مزاج کا وہی عالم ہے۔ خودداری پر اتر آئیں تو دنیا ٹھوکر میں آجائے بے اختیار ہوں تو ایسے جیسے لفظ "ضمیر" ان کی لغت میں کبھی تھا ہی نہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانے میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کی روزمرہ زندگی اور اشعار کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ غالب صاحب کے اشعار کچھ شرط بھی چاہتے ہیں۔ مثلاً جب آپ شعر پڑھیں تو وہ کیفیت بھی اپنے پر طاری کیجئے جو چچا جان بیان فرماتے ہیں۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے چچا جان پر کبھی وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی جو اکثر و بیشتر ان کے اشعار میں پائی جاتی ہے مثلاً اس شعر کی کیفیت ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں:

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ غالب کے اجداد فن سپہ گری کے ماہر تھے لیکن جہاں تک مرزا صاحب کا تعلق ہے تیر تو چھوڑیے شاید سوئی بھی نہ چھوئی ہو اور بات اتنی بڑی کہہ دی میرا خیال یہ ہے کہ اتفاق سے انگلی میں پھانس لگ گئی ہوگی اور جب تک نہ نکلی کھٹک ہوتی رہی ذرا تصور کی پرواز دیکھئے کہ ذرا سی پھانس نے تیر نیم کش کی شکل اختیار کرلی اور کس نے جگر میں خلش پیدا کردی ورنہ آپ ہی انصاف سے کہئے کہ جگر میں تیر پیوست ہونے کے بعد کیا زخمی کو موت اتنی مہلت دیتی کہ وہ خلش سے لطف اندوز ہوتا!؟ دیکھیے خدا نہ کرے میری نیت گستاخی کی نہیں بھلا میں اور ادب سے مذاق توبہ! میں تو صرف ان تخیلات کی طرف اشارہ کررہی ہوں جو شاعر کو رائی کا پہاڑ بنانے پر مجبور کردیتے ہیں۔ شاعر خواب نہ دیکھے تو زندگی کا مقصد ہی کیا رہ جائے۔ یہ شعر سنیے ارشاد ہوا ہے:

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

گویا جناب ساقی کے ساتھ نخرے فرما رہے ہیں یہ اتنا نہ بنتے تو اچھا تھا میخانہ اور وہ بھی اس شان کا کہ جس کا ساقی بھی ہو۔ پھر ایران کی بات ہندوستان میں اس طرح کر رہے ہیں جیسے بزم مے کا اہتمام خاص ہند کی چیز ہو۔ اس پر اترانا دیکھیے۔ ان سے کوئی پوچھے کہ بھلے آدمی جب توبہ کر چکے تھے تو میخانہ گئے ہی کیوں تھے گئے تھے تو پی بھول کر آجاتے یہ کیا زبردستی ہے کہ آپ توبہ کریں اور ساقی اصرار کرے کہ آپ کو ہماری جان کی قسم آج تو پینی ہی پڑے گی بھلا قرض کی پینے والے میخانے میں کاہے کو گئے ہوں گے۔ لیکن وہی مثل ہوئی کہ صبح نہ ہوئے پورے پیتے اور بہتے آئی کرتے! نہ جانے زندگی میں کتنی بار پتہ بتانے کی نوبت آئی ہوگی لیکن ذرا غالب صاحب کو دیکھیے کس انداز سے پتہ بتا رہے ہیں۔ کہتے ہیں:

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

ابھی خاصی پہیلی ہے پتہ بتاتے وقت قاعدہ تو یہ ہے کہ لوگ گلی یا سڑک کا نام اور پھر مکان نمبر وغیرہ بتاتے ہیں آپ کو دیکھیے فراق اور مخیر کی بات شروع کر دی اب ان کے تصورات کو کوئی کہاں تک ٹٹولے اس کا مطلب غالب صاحب سمجھیں یا پھر ان کا خدا ورنہ ہو سکتا ہے کہ گھر کا پتہ نہ پوچھا ہو بلکہ یہ پوچھا ہو کہ حضرت آپ کی تعریف !! اور تعریف میں حضرت نے دست بستہ عرض کی کہ غالب ہی وہی ہے جس پر کبھی آپ نے تیر اندازی کی مشق فرمائی تھی یہ کہنا مشکل ہے کہ گفتگو کس کے درمیان ... ہوئی تھی. قیاس کہتا ہے کہ عاشق و معشوق ہی ہوں گے. مختلف حضرات نے مرزا غالب کے حالات زندگی قلمبند کیے ہیں جہاں تک خودداری اور نفاست پسندی کا تعلق ہے سب کا یہی خیال ہے کہ یہ خوبیاں محترم میں بدرجہ اتم موجود تھیں. غالب صاحب کا قول تھا کہ جان جائے پر آن نہ جائے اس خیال کو شعر میں کچھ اس طرح واضح کرتے ہیں کہ:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

جو کچھ آپ فرماتے ہیں بجا ہے کیونکہ ایک مرتبہ آپ ملازمت کے لیے اسکول گئے اور جب وہاں کا پرنسپل آپ کی پالکی تک استقبال کو نہ آیا تو آپ یہ کہہ کر الٹے پھر آئے کہ "ایسی نوکری کو دور سے سلام جس میں بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں" اچنانچہ حضرت غالب کی بندگی میں بھی ایک آن بان ہے حج کی نیت سے در کعبہ بند ملا تو اتنا گوارا نہ کیا کنڈی کھٹکھٹا دیتے بلکہ بغیر فرض ادا کیے پلٹ آئے. گستاخی معاف آپ کی نیت ہی صادق نہ ہوگی جو در کعبہ خود بخود نہ کھلا خیر یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے اس میں ہم کو دخل دینے کا کیا حق ! لیکن اتنا ضرور ہے کہ جناب کے اشعار سے خودداری کا بھرم ہر صورت کھل جاتا ہے یا تو خودداری کا یہ عالم کہ کعبہ سے پلٹ آئے یا جو بے اختیار ہوئے تو عجیب حرکت کر بیٹھے خیر ایسی حرکت کی بھی تھی تو خاموش رہتے جی نہیں بڑے فخر سے فرماتے ہیں:

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ باہر لگن کے پاؤں

بھلا بتلایئے انتہا ہو گئی خدانخواستہ کہیں "سیم تن" پاؤں سے کوئی بیجا حرکت کر بیٹھتا تو کیسی بے عزتی ہوتی. افسوس نہ خودداری رہی نہ نفاست سب شاعری کی بھینٹ چڑھ گئی. لیکن پھر بھی دل کو یہ تسلی ہے کہ یہ خواب و خیال کی باتیں ہیں ان کے لیے سب جائز ہے.

غریب شاعر کی جان کو سیکڑوں روگ ہیں اس کے باوجود اپنی دنیا سے باہر نہیں آتے. رقابت اندیشہ، رشک اور حسد یہ ایسی بلائیں ہیں جو ان کی جان کو جونک کی طرح لپٹی ہوئی ہیں مثلاً کہتے ہیں:

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

خود ہی پہیلی کہی اور خود ہی بوجھی جب ہر بات فرض کر لی تو اب آتش رشک میں سلگ رہے ہیں. اگر ہم ان کا خیال واضح

ہو جاتا تو ضرور دلجوئی کی کوشش کرتے۔ مگر میاں تو لفظ "یوں" کے چکر میں آ گئے۔ غالباً غالب صاحب یہ دعا کر رہے ہیں کہ محبوب شراب پی کر ان کے گھر آئے لیکن "پر نہ کرے خدا کر یوں" کی بات پتے نہیں پڑتی دونوں میں سے ایک بات ہے یا تو یہ کہ شراب پی کر نہ آئے دوسری بات یہ کہ پی کر آئے لیکن رقیب ساتھ نہ ہو۔ دیکھئے تو شاعر کس قدر خود غرض ہے آپ ہی سوچئے کہ شراب پی کر تنہا گھر سے نکلنا کس قدر خطرناک حرکت ہے۔ مستی کے عالم میں راستہ بھٹک جائے یا خدا نہ کرے کوئی حادثہ پیش آ جائے تو کس قدر پریشانی ہو ظاہر ہے ایسی صورت میں با وفا ملازم تنہا کیوں نکلنے دے گا ضرور ساتھ ہو جائے گا لیکن حضرت شاعر اپنی رقابت کو کیا کریں کہ اوفا ملازم پر بھی رقیب ہی کا گمان ہوتا ہے۔ اب غالب صاحب عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ محبوب بغیر پئے آئے تو ان سے کھل نہ سکے گا اور اگر پی کر آئے تو رقیب ضرور ساتھ ہوگا دیکھئے یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔ لیکن جناب یہ ہماری آپ کی دنیا تو ہے نہیں یہ تو شاعر کی دنیا ہے وہاں کے آداب عاشقانہ کو ہم کیا سمجھیں! اور ایمان کی بات تو یہ ہے کہ خود شاعر بھی کبھی کبھی اپنا کہا نہیں سمجھ پاتا خود غالب صاحب بھی اس بات کا اظہار ڈنکے کی چوٹ کر چکے ہیں۔ کہتے ہیں،

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

یہ واقعہ ہے کہ خدا نے ان کی التجا سن لی۔ اگر غالب صاحب ہمارے درمیان موجود ہوتے تو ہم ان سے کہتے کہ ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں اور جا جان کو اطمینان دلاتے ہیں کہ آپ کا جو جی چاہے کہتے رہیے ہم کچھ نہیں سمجھتے!! (بشکریہ اے۔ آئی۔ آر حیدرآباد)

تبصرے

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

اداس نسلیں

لالٹین کی مدھم روشنی میں کٹھ پتلی والے نے تماشہ شروع کر دیا ہے۔ وہ اداس چہرے والا بوڑھا راجستھانی ہے۔ اس نے بانس کے دو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے درمیان ربر کا باریک تار رکھ کر بنائی گئی سیٹی کو اپنے پوپلے منہ میں دبا رکھا ہے اور اپنی ہم عمر اور شکستہ کٹھ پتلیوں کو نچاتے ہوئے وہ بہت ہی غیر صاف اور ناگوار غیر انسانی آواز میں بدی پر نیکی کی ایک پرانی داستان بیان کر رہا ہے۔

ہلکی ہلکی ہوا میں لالٹین کی ننھی سی لو کانپ کانپ جاتی ہے۔ پتلی والے کا جھریوں بھرا چہرہ بڑا عجیب نظر آ رہا ہے اس کے ہاتھ مسلسل لرز رہے ہیں۔ اچانک دھاگے کا ایک سرا اس کی انگلیوں سے پھسل جاتا ہے اور کٹھ پتلی والے کو کوئی دھیان نہیں کیونکہ اب اس کی انگلیوں میں کسی اور کٹھ پتلی کے دھاگے کا سرا ہے، جسے وہ اپنے مخصوص بے ہنگم طریقے سے ہلا رہا ہے۔

بچپن میں دیکھا ہوا یہ تماشا اپنی تمام تر مضحکہ خیزیوں کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہے جبکہ میں نے عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" پڑھا ہے، جس کا میں نے لفظ لفظ پڑھ ڈالا ہے۔ ساڑھے چھ سو صفحات پر پھیلا ہوا یہ بیمار ناول ایک آگ کا دریا ہے، جسے مجھے ڈوب کر عبور کرنا پڑا ہے اور جس سے آپ میرے صبر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

یہ ناول چار ابواب پر مشتمل ہے۔ برٹش انڈیا، ہندوستان، بٹوارہ، اختتامیہ۔ مصنف کی کوشش یہی رہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح چند اہم واقعات کی مدد سے اس ناول کو تاریخی اور سیاسی حیثیت دے کر اس کے کینوس کو وسیع کر دے۔ اور یہی بیکار کوشش اس کی عبرتناک ناکامی کا باعث بن گئی ہے۔ چند تاریخی واقعات کو سمیٹنے کے لالچ میں اس نے ناول کے سب سے اہم کردار نعیم کو جس قدر پریشان کیا ہے اور اسے دنیا کے ہر کام میں ماہر دکھانے کی جو سعی کی ہے اور اسے بیک وقت طالب علم، کسان، مزدور، سپاہی، شکاری، قیدی، باغی، سیاسی لیڈر، انڈر پارلیمنٹری سکریٹری اور ستم بالائے ستم سب سے آخر میں نیم فلسفی بنا کر اس سے جو کرتب کروائے ہیں اس کی مثال یا تو ہندوستانی اور پاکستانی

قلموں میں مل سکتی ہے یا پھر کسی میں۔

لیکن ایک نعیم پر ہی کیا موقوف عذرا، نجمی، علی، بانو جیسی کٹھ پتلیاں ہیں جو عبداللہ حسین کی لرزیدہ انگلیوں کے اشاروں پر عجیب و غریب حرکتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ ساڑھے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی اس بے ربط کہانی میں زمانے بھر کا کوڑا کرکٹ جمع کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے مصنف نے اپنی مختصر زندگی میں جس کسی سے جو کچھ سنا ہے یا اچھی بری کتابوں میں جو کچھ بھی پڑھا ہے وہ اسے ہضم نہیں کر سکا اور نتیجتاً بدہضمی کا شکار ہو کر ایک ہی جھٹکے میں سب کچھ اگل بیٹھا ہے۔

مصنف کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اس نے بڑے سے بڑے واقعہ کو بھی بہت ہلکے طور پر لیا ہے۔ مثال کے طور پر جلیان والا باغ کا دردناک منظر جس کے متعلق سنتے ہی ہر ہندوستانی اور پاکستانی لرز جاتا ہے، اس نے محض نیچے درجے کی زبان سے کہلوا کر اسے بالکل بے اثر بنا دیا ہے یہاں تک کہ مچھلیوں کی بارش میں یہ تمام منظر بڑا ہی مضحکہ خیز ہو گیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ انگریز سامراج کے خلاف دل میں کہیں کوئی جذبہ نہیں ابھرتا، اور جنرل ڈائر کے متعلق بھی مندرجہ ذیل قسم کے الفاظ ملتے ہیں۔

۱۔ وہ شخص جلیان والا باغ کا فاتح بریگیڈیر جنرل ڈائر تھا۔

۲۔ عذرا اس کی شاندار شخصیت اور جارحانہ انداز سے مرعوب ہوئی۔

اور جنرل ڈائر کی زبان سے۔

میں ہندوستانیوں کے اس مقدس شہر کو جلا کر راکھ کر سکتا تھا۔ اور ان کا طرز عمل دیکھ کر میرے جی میں آیا کہ اس قانون شکن اور باغی ہجوم کو نیست و نابود کر دوں۔ اور ان کے بچوں اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں لیکن محض انسانی رحم و کرم اور خدا ترسی کے جذبے نے مجھے روک لیا۔

میں نے ایک لاقانون قوم کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ پر انکوائری بٹھائی گئی۔

قسم کے جملے سن کر مسٹر جنرل ڈائر سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے لیکن ساتھ ہی لاقانون ہندوستانی قوم کے لیے دبی دبی نفرت کا جذبہ بھی ابھرتا ہے، جو قابل مذمت ہے۔

مجموعی طور پر کٹھ پتلیوں کا یہ تماشا شروع سے آخر تک انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ زبان کا مسئلہ میرے نزدیک اتنا اہم مسئلہ نہیں، ظاہر ہے ہم کسی افسانہ نگار یا ناول نگار سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ماہر لسانیات بھی ہو۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ زیر نظر ناول میں کہیں بھی صحت زبان کا خیال نہیں رکھا گیا۔ نمونے کے طور پر چند جملے نقل کر رہا ہوں۔

۱۔ ایک تنہا اور بے خطر پرورش کے طفیل یہ اس کا قدرتی بے زبان انداز گفتگو بن چکا تھا۔	خدا جانے یہ تنہا اور بے خطر پرورش، کیا بلا ہوتی ہے، اور پھر یہ بے زبان انداز گفتگو — تو گویا بازبان انداز گفتگو بھی کوئی چیز ہوا۔
۲۔ سودائی آنکھوں میں سہم آگیا تھا۔	سہم جانا تو ہم نے اور پڑھے آئے ہیں لیکن یہ سہم آگیا

	ایک نئی دریافت ہے۔
۳۔ اور لڑکیاں بحث میں غریب ہوگئیں	اس جملے کے معنی کیا ہیں؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں مصنف سے رجوع کرنا پڑے گا۔
۴۔ ان کی روحیں آسان ہوگئی تھیں	تو کیا روحیں مشکل بھی ہو جاتی ہیں؟
۵۔ اس نے بہت دل میں گالی دی۔	'دل میں بہت گالیاں دیں'۔ لکھنے میں کیا قباحت تھی؟

لیکن صفحہ ان چند جملوں پر ہی کیا موقوف لطف یہ ہے کہ یہ تمام کا تمام ناول اسی طرح کی ناہموار اور انتہائی لطہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ناول لکھنے سے پہلے ہی مصنف نے قسم کھائی تھی کہ وہ ایک بھی جملہ صحیح نہیں لکھے گا۔ اگر واقعی بات کچھ ایسی ہی ہے تو مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

ناول کی پبلسٹی کے لیے میں نیا ادارہ سے کسی قسم کی شکایت نہیں کروں گا، اس لیے بھی کہ ہر پبلشر اپنی ہر ی بری کتاب کے اشتہار میں اسے دنیا کی بہترین تخلیق قرار دیتا ہے تاکہ وہ بازار میں گرم بسکٹ کی طرح بک سکے۔ لن ان لوگوں کی کیا کہیے، جو اشتہارات سے مرعوب ہوکر کسی کتاب پر اپنی غیر ذمہ دارانہ رائے کا اظہار کر بیٹھتے ہیں۔ مثلاً اس ناول کے متعلق کرشن چندر کی یہ سطریں:

"اداس نسلیں" سے یہ امر ظاہر ہے کہ نیا ادارہ نے اردو ادب کے لیے ایک بے حد حساس فنی طور پر پختہ کار، قدر اوّل کا جوہر دریافت کیا ہے۔ ایک دن ساری دنیا اس جوہر کو دیکھے گی، مانے گی اور اس پر فخر کرے گی۔ 'اداس نسلیں' پڑھنے سے پہلے ہی میں عبداللہ حسین کا معترف ہو چکا تھا۔ ان کی ایک بے حد خوبصورت کہانی 'ندی' میں نے پڑھی تھی۔

کرشن چندر .... اردو کے معروف اور مقبول ترین افسانہ نگار ہیں۔ اور ان کی زود نویسی سے ن واقف نہیں؟ وہ روز ایک نیا افسانہ لکھتے ہیں اور ساتھ ہی ناول کا کوئی باب بھی۔ اس کے علاوہ ان کی کئی ی اور غیر فلمی سرگرمیاں الگ ہیں جو ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ناول کے متعلق ان کی رائے پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ ول نے (مصروفیت کے باعث) ناول نہیں پڑھا، بلکہ اشتہارات سے مرعوب ہوکر، اور مصنف کی ایک اچھی کہانی ن کا خاص طور پر ذکر کر کے انھوں نے اپنا پول کھول دیا ہے) پڑھ کر ہی یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ یہ ناول بھی اسی ے کا ہوگا۔

اسی طرح ایک اور صاحب ہیں جنھوں نے اپنے ایک مضمون میں (مطبوعہ سریتا دہلی، جنوری ۶۴ء) ۶ کی بہترین تخلیقات کا جائزہ لیتے ہوئے "اداس نسلیں" کے بارے میں مندرجہ ذیل تعریفی جملے لکھے ہیں:

ہمارے دور کے پیچیدہ ذہن کی فنکارانہ عکاسی 'اداس نسلیں' کا موضوع ہے۔ جسے مصنف نے بہ کمال ہنرمندی پیش کیا ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے اس کا درجہ 'آگ کا دریا' سے بھی بلند ہے۔

یہ وہ غیر ذمہ دار شخص ہیں جنھوں نے اپنے اسی مضمون میں ایک جگہ سلیم احمد کی کتاب "ڈاکٹر جانسن اور مولانا حالی" کی بہت تعریف کی ہے اور اسے ۱۹۶۳ء کی بہترین تنقیدی کتابوں میں شمار کیا ہے۔ جب کہ یہ کتاب شائع ہی نہیں ہوئی محض کسی پرچے میں اس کا اشتہار دیکھ کر انھوں نے یہ اندازہ کر لیا کہ یہ چھپ چکی ہے اور اب جب کہ میں ۱۹۶۳ء کی بہترین کتب کا جائزہ لینے بیٹھا ہوں تو اس کا ذکر ناگزیر ہے۔

اب آپ ہی کہئے میں کیسے یقین کر لوں کہ انھوں نے "اداس نسلیں" کا ایک بھی صفحہ پڑھا ہوگا؟

وہ اگر سلیم احمد کی کتاب کی طرح اداس نسلیں پڑھے بغیر اس کی تعریف کر کے رہ جاتے تو انھیں معصوم سمجھ کر معاف کیا جا سکتا تھا۔ لیکن قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" سے اس کا موازنہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو کیا وہ قاری پر یہ بات بھی ثابت کرنا چاہتے تھے کہ انھوں نے آگ کا دریا بھی نہیں پڑھا؟

میں 'اداس نسلیں' کا موازنہ 'آگ کا دریا' سے نہیں کرنا چاہتا، اس وجہ سے بھی کہ اگر آگ کا دریا ایک نئی نویلی اور سجی دھجی دلہن کی طرح ہے تو 'اداس نسلیں' اس کے پیروں کا ناخن بھی نہیں۔

ناانصافی ہوگی اگر میں ناول کی چند خوبیوں کا ذکر نہ کروں۔ عبداللہ حسین کا یہ پہلا ناول (پورے کا پورا) بڑھیا موٹے کاغذ پر (پروف کی لاتعداد غلطیوں سے قطع نظر) خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا گیا ہے جس کی جلد بڑی مضبوط اور قیمتی کپڑے کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس کا دیدہ زیب ٹائٹل ہے جسے چغتائی نے بنایا ہے لیکن اس کی مضبوط جلد اور خوبصورت ٹائٹل کے لیے ۱۵ روپے بہت زیادہ ہیں۔ (کمار پاشی)

ترانے

مرزا شکور بیگ

مرزا صاحب کے نام پر آندھرا پردیش کے مشاعروں کے سامعین مسکرا اٹھتے ہیں۔ وہ اکبر الہ آبادی کے قبیلے کے آدمی ہیں۔ مرزا صاحب نے بقول ان کے بڑی حماقتوں اور بڑی کمزوریوں کو اپنی ظرافت کا موضوع بنایا ہے۔ یہ ان کے اشعار کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ اکبر الہ آبادی کی طرح وہ شریر معصومیت اور انگریزی الفاظ کے برجستہ استعمال سے اپنے مصرعوں پر دھار رکھتے ہیں۔ لیکن اس میدان میں وہ ظرافت کے سہارے اپنے ماحول کے تضادات سے نقاب اٹھاتے ہیں اور اپنی حماقتوں پر خود ہنسنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ انسانی اخلاق کی پستی، غربت، بھوک، سماجی معاش، لیڈری، چندہ، عشق، عاشق، معشوق، ہجر، وصال غرض مرزا صاحب کی ظرافت نے زندگی کے ہر اس پہلو پر تراش دی جو انفرادی یا اجتماعی اعتبار سے قابل اعتنا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جو ستم تھا وہی کرم نکلا — حاصل زیست ان کا غم نکلا
دل لگایا تھا جہیز کی خاطر — دل لگی دل لگی میں دم نکلا

میرے لڑکے کو حقارت سے نہ دیکھو صاحب — کیا عجب ہے کہ یہی آپ کا داماد بنے

ملی فرصت نہ اپنے عقد کی بیچارے قاضی کو مگر یہ کام کیا کم ہے کہ وہ اوروں کے کام آیا

بقول شاہد صدیقی مرحوم شکور بیگ کی شاعری میں "زندگی کے ساتھ ایک بے پایاں خلوص ہے"۔ کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ کتاب دفتر انجمن ترقی اردو، عابد نگر حیدر آباد ملہ سے مل سکتی ہے۔

زخم تمنّا

مظہر امام کی غزلوں اور نظموں کا یہ مجموعہ ان کی تقریباً بیس سالہ شعری ریاضت کا نتیجہ ہے جو ۴۸ء اور ۶۲ء کے درمیانی دور پر محیط ہے۔ یہ دور ترقی پسند تحریک کے عروج، اس کے بعد چھانے والی خاموشی اور پھر اس خاموشی کے بطن سے پیدا ہونے والے انتشار کا نمائندہ ہے کسی ادبی تحریک کے لیے وہ دور بڑی آزمائش کا ہوتا ہے جب اس کے ہاتھوں سے کوئی "نظریہ" کوئی ایقان چھین جائے۔ چنانچہ ۴۸ء اور ۵۲ء کے درمیان اپنے قدموں سے پیدا ہونے والے غبار میں منزلوں کی گم شدگی نے راہ راست پر چلنے کے عادی ادیبوں شاعروں میں ایک ایسی بددلی اور مایوسی پیدا کر دی جس کے شکنجے سے وہ اب بھی اپنے کو آزاد نہیں کر سکے ہیں۔ غالباً اس دور کے مزاج سے بھی وابستگی ہے جس نے مظہر امام کو بھی چند ایسی نظمیں (پھیلے ہوئے ہاتھ رات گزرنے والی ہے، ایں چہ دوریست وغیرہ) شامل رکھنے پر آمادہ کیا ہے جو شاعر کے اپنے شعری مزاج کی نمائندہ ہونے سے زیادہ اپنے ماحول کے چند موضوعات پر فوری ردعمل کا نتیجہ ہیں۔ یہ ۱۹۴۸ء اور ۵۲، ۵۳ء کے درمیان کے احتجاجی دور کی پیداوار ہیں، جب کہ آزادی کے ثمرے کا مزہ کڑوا کیے دیے رہے تھے۔ اس احساس نے شعراء سے اچھی نظمیں اور غزلیں بھی کہلوائی تھیں لیکن اکثریت ایسی تخلیقات کی تھی جن کا خمیر جذباتیت، وقتی جھنجلاہٹ اور ذہنی شکست خوردگی سے اٹھایا گیا تھا۔ یہ رجحان آگے مل کر جذباتی ناآسودگی، تنہائی اور بے بسی کے شدید احساس میں متشکل ہوا۔ مظہر امام کی بیشتر نظموں پر یہی کیفیت چھائی ہوئی ہے (شمع خاموش ہے، برف میں آگ، ایں چہ دوریست وغیرہ) اور اس کے ساتھ ساتھ اس دور کا مقبول اور مانوس نعرۂ امید (صبح ہونے والی ہے، مثلاً) بھی گونج جاتا ہے۔ ارباب سیاست کے ہاتھوں اپنی مجبوری، حالات کے شکنجے میں اپنی بے بسی مظہر امام کے اشعار میں ایک "شکایت" بن کر رہ گئی ہے۔ شکایت ارباب سیاست سے، حالات سے، احباب سے، محبوب سے۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے شاید اس لیے کہ اس کی ان میں سکت نہیں۔ کہیں کہیں وہ زندگی کے تضادات اور آلام کے سرچشمے کو کھوج کرتے نظر آتے ہیں لیکن محض چند سوالات کر کے رہ جاتے ہیں۔ ایسا کرنے کی خواہش بے شک صادق ہے۔ اور اسی صداقت نے ان کے شعر کو بناوٹ اور بلند آہنگ نعروں کی لپیٹ میں آجانے کے اس رجحان سے بچا لیا جس نے اس دور کے بعض اچھے شاعروں کو تباہ کر دیا (بے چارے جاں نثار اختر) مظہر امام کی شعری شخصیت نظموں سے زیادہ غزلوں میں نکھر کر آتی ہے۔ اور بعض شعر پڑھ کر شاعر سے شکایت کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے اس سمت اپنے قدم کیوں نہیں بڑھائے مثلاً

موسم گل کی لاج رکھ لیں گے شکر ہے بادہ خوار ہیں ہم تم

اس کو منظرِ خزاں نہ ہونے دیں — چار دن کی بہار ہیں ہم تم
مری حیاتِ پریشاں کو کیا ملا آخر — کسی نے زلف کو اپنی ہزار سلجھایا!
دردِ عالم بھی کہیں دردِ محبت ہی نہ ہو — دل کے بہلانے کی یہ بھی کوئی صورت ہی نہ ہو
تو اپنے پھولوں کو سرخ کر لے سوال ہے تیری آبرو کا — قبول کر اے زمینِ گلشن! حقیر تحفہ مرے لہو کا!
مرے روکے نہ رکا وقت کا طوفاں نہ سہی — اک دیا میں نے سرِ راہ جلایا تو سہی

ملنے کا پتہ: اڑیسہ اردو پبلشرز۔ دیوان بازار۔ کٹک ملہ۔ قیمت تین روپے۔

تین کتابیں

محبوب خزاں، محب عارفی، اور قمر جمیل کا مجموعہ کلام۔ پتہ نہیں کیا مصلحت تھی جس نے ان تینوں مجموعوں کو ایک جلد میں بند کروا دیا۔ مزاج موضوع، اظہار تینوں کے اعتبار سے ان شعرا میں بہت کم باتیں مشترک ہیں۔

محبوب خزاں: انھوں نے موضوعات کے توسط سے زیادہ اظہار کے نت نئے طریقوں سے اپنی شخصیت کو بے نقاب کرنے پر توجہ دی ہے۔ بحروں کا تنوع خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بحر کا فنکارانہ استعمال اکثر اوقات موضوع میں دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر نظم "اکیلی بستیاں" میں محسوس ہوتی ہے۔ بحر الفاظ اور تراکیب کے سلیقہ مندانہ استعمال کی ضرورت سے انکار نہیں۔ یہ بات جانے پہچانے موضوعات کو انوکھا دکھانے کا دھوکا تو ضرور پیدا کر دیتی ہے لیکن شاعر کے اپنے زاویۂ نظر کو متعین کرنے میں زیادہ مددگار ثابت نہیں ہوتی۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ محبوب خزاں نے عشق اور کائنات کے مطالعے کے لیے دوسروں کے استعمال کیے ہوئے عدسے ہاتھ میں نہیں اٹھائے ہیں۔ لیکن نئے آئینوں کا انتخاب بھی کوئی آسان کام نہیں۔ اس نے نئے پن کے دلدادہ کئی شاعروں کو محض الفاظ کی گونج، تراکیب کے جوڑ توڑ، مصرعوں کی جمع تفریق اور خیالات کے خلا میں پھنسا کر رکھ دیا ہے۔ شکر ہے کہ محبوب خزاں گہرائیوں میں جانے کا رجحان نہیں رکھتے۔ انھوں نے اکیلی بستیاں بسانے ہی تک اپنے کو محدود رکھا ہے۔ ان میں سے چند بستیوں میں اداس پگڈنڈیاں، درختوں کے سائے اور ان کے سائے ہی کہیں سرگوشیاں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ چند اچھے شعر سنیے۔

آنسو اب اس سے کیا چھپانا — جو دامن بھی ہے آستیں بھی
اب اس قدر ستم و جور کے لیے بھی نہیں — یہ زندگی جو کسی اور کے لیے بھی نہیں
ارادہ ہے کہ دنیا کو بھی دیکھیں — تجھے ہر چیز میں دیکھا بہت ہے
منزلِ صبح آ گئی شاید — راستے ہر طرف کو جانے لگے

نظموں میں سیال جذباتیت اور حیاتی ادا پرستی نے بعض جگہ خوبصورتی پیدا کر دی ہے۔ لیکن محبوب کے موضوع سے ہٹ کر جہاں انھوں نے محسوس کرنے کی بجائے سوچنے کی کوشش کی ہے وہ لڑکھڑا گئے ہیں۔ اگر وہ اس طرف

توجہ نہ دیں تو وقت ان کی حسن پرستی پر مسکرا کر آگے گزر جائے گا۔

محب عارفی :- محب عارفی کے اشعار کے اس مختصر سرمائے میں جو چیز متوجہ کرتی ہے وہ سوچ کا عنصر ہے۔ میں فکر کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کر رہا ہوں کہ آج کل ہر برس دو برس عمر رکھنے والی شاعری میں فکر اور فن دیکھا اور دکھایا جانے لگا ہے اور یہ نہ صرف ایجان قارئین کے ساتھ بلکہ خود لکھنے والے کے ذہنی ارتقا کے حق میں زیادتی ہے۔ محب عارفی مختلف مسائل پر سوچتے رہے ہیں۔ ہر منظر کے پیچھے چھپی ہوئی حقیقت کے طوفان کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان پر اپنا کوئی ایسا جچا تلا ردعمل پیش نہیں کر پاتے جسے ہم "فکر" کے لفظ سے موسوم کر سکیں۔ "جراثیم کی مناجات" ان کی نمائندہ نظم کہی جا سکتی ہے۔ اس پر انھوں نے کافی محنت کی ہے لیکن نظم کسی منزل یا سمت کے تعین کے بغیر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ شاعر نے سوچا ضرور ہے لیکن سوچ اس شاعرانہ عمل سے نہیں گزری جو اسے ایک شخصی اور شعری حقیقت میں تبدیل کر سکے۔ ان کی شاعری کی نوعیت کچھ کچھ ان کے الفاظ کے انتخاب سے بھی واضح ہوتی ہے۔ وہ دل، خاکستر، شبنم، پنکھڑی جیسے نازک حسین الفاظ کی جگہ خرد، تعین، جنون، ہستی، مثبت، مغز، سرو برہمن، استخواب جیسے ٹھوس اور "فکر آلود" الفاظ کے شائق ہیں اسی لیے ان کی نظموں اور غزلوں میں عشق کے کھیلنے کے مضامین ... کی جگہ حیات و کائنات کے حقائق سے چھیڑ چھاڑ ملتی ہے۔ یہ بڑی دشوار گزار راہ ہے تازہ افکار کا اضافہ بڑی جگر سوزی اور جرات کی بات ہے اس کے لیے شاعر کو شاعری کی سطح سے بلند ہونا پڑے گا۔ پھر بھی زیر نظر اشعار میں ان کے زاویہ نظر نے چند آشنا گوشوں کو دلکش انداز میں دکھایا ہے۔

خطا چمن کی کہ ہے مبتلائے لالہ و گل — بہار صرف خس و خار کی تلاش میں ہے
حاصل سیر چمن ہو نہ سکے نہ ہی گل بوٹے — جو مری حسرت گل گشت نظر آتی ہے
لے اڑا ہے جو مجھے ذوق تماشا میرا — تھامنے مجھ کو مری حد نظر آتی ہے
باختگی میں عشرت ساحل ہے موج کو — واماندگی کی تہہ سے ابھرتی ہیں منزلیں
دھوپ میں زندگی کی چلے ہیں بہت — لے چلو دوستو سائے سائے ہمیں
پالا تھا اسے باد سے باراں سے بچا کر — جب آگ سے اسے شمع بچانے نہ گئے ہم

جہاں وہ کائنات کے بارے میں بے باک ہو کر کچھ کہنا چاہتے ہیں اقبال کی گونج صاف سنائی دیتی ہے اور مطالعۂ ذات اور غم ذات کے حامل اشعار میں غالب کے مصرعوں کی سی بندش اور بیان کا بالواسطہ انداز مزہ دے جاتا ہے۔

قمر جمیل : ان کی نظمیں پڑھ کر کسی ایسے شخص سے ملاقات کا احساس ہوتا ہے جو دکھ کو نہ صرف سہہ چکا ہے بلکہ اسے بیان کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ یہاں ایک ایسی اداسی ہے جو تپتی دھوپ، ویران راہوں اور منزل گم کردہ راہی کی قدموں کی چاپ سے مل کر تشکیل پاتی ہے۔ قمر جمیل نے ماضی سے جو کچھ سیکھا اسے چند زاویوں کی شکل دی اور پھر ان سے دوبارہ اپنے ماضی اور ماضی کے توسط سے حال اور مستقبل کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی باتوں اور ... کرنے کے

انداز میں توازن کا حسن ہے ان میں یار بھی ہے ذکرِ یار بھی، خواب بھی ہیں اور پرچھائیاں بھی، تنہائی بھی اور گنگناہٹ بھی (ملاقات، ویرانی، دعا، سرگزشت) لیکن "دجلہ کے خواب"، "نیل کا سیلاب"، "چار خوابے"، "طوفان سے پہلے" میں وہ تاریخی تہذیبی موضوعات کو اٹھاتے ہیں اگرچہ ان میں فضا کی تعمیر اور ڈرامائی تاثر اپنی جگہ مکمل ہے لیکن ایسا ہی جیسے کوئی کسی طویل فلم کے چند درمیانی مناظر کو اجاگر کر دے۔ مطلب یہ کہ ان موضوعات کے لیے طویل نظموں کی ضرورت ہے۔ بحالت موجودہ وہ کسی داستان کا ایک ایک ورق معلوم ہوتی ہیں۔ شاعر سے بھرپور تعارف ان آٹھ دس نظموں میں ہوتا ہے جو شخصی نوعیت رکھتی ہیں یا پھر غزلوں سے۔ غزلوں میں قمر جمیل نے بڑی اپنائیت کے درد کے ساتھ دنیا کو اپنا ہمراز بنایا ہے۔ بڑے بڑے دکھ درد، محبوب سے زیادہ مسرتوں کے لیے وخایلاں، اچھا لا پر دیے دیے اسرار، دل کی ویرانی کا بیان . . . . . . یہ سب شکوہ زیرِ لب کے انداز میں سنائی دیتا ہے۔ اور پھر محبوب . . . . . ایک سراپا ہیں ان کے لیے ایک جھلکی یاد ہے۔

یوں دل میں ترا خیال آیا
صحرا میں کھلے گلاب جیسے

کون یاد آگیا کس کی یاد آ گئی
عمرِ رفتہ نگاہوں میں لہرا گئی

دور تک تیری یاد کے سائے
یہ چمن، یہ خنک ہوا، یہ سماں

میں سوچ رہا ہوں کہ تری یاد سے پوچھوں
یہ پھول یہ شاخوں پہ دیے کس نے جلائے

کچھ اور اشعار سنیے:

دن رات چراغاں ہے مگر شہر کے سائے
گلیوں میں اسی طرح سے تنہا نظر آئے

یہ پیالہ ہے کہ دل ہے، یہ شراب ہے کہ جاں ہے
یہ درخت ہے کہ سائے کسی دستِ مہرباں کے

مجھ میں ہے بند میری ویرانی
کوئی زنجیر ہے کہ رشتۂ جاں

ہم نشیں دل کے قریب اور نہ آ
یہ کلی سائے سے گھبراتی ہے

ہم ستاروں کی طرح ڈوب گئے
دن قیامت کے انتظار میں ہے

ڈھائی روپے میں تین شاعروں کے یہ مجموعے قطعی مہنگے نہیں خریدنے والوں کے لیے، اور ذوق رکھنے والے انہیں دعائے خیر سے یاد کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں۔ ملنے کا پتہ ہے۔ مکتبۂ آسی ۱۹۳۵ جوہر آباد۔ فیڈرل بی ایریا ایم ۱۹ کراچی ۱۹

شبِ چراغ

قادر نوری۔ مغل اکاڈمی۔ ۲۱-۳-۴۹۹-۳۹ ہندی کا محبوب حیدرآباد

ممکن ہے آج کا مذاق جو غزل میں نئے استعاروں اور علامتوں کو ڈھونڈتا ہے قادر نوری کی غزلوں کے اس مجموعے میں گل و بلبل، قفس و آشیاں اور واعظ اور میکدے کے علائم اور استعارے دیکھ کر بے تعلق بن جائے لیکن رواداری کا تقاضہ یہ کہلواتا ہے کہ شاعر نے اپنے دل کی بات کہنے کے لیے شعر کو سنجیدگی سے اپنا وسیلہ بنایا۔

اچھی بات یہ ہے کہ شاذ نوری صرف محسوس ہی نہیں کرتے بلکہ سوچتے بھی ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ اگر وسیع نہیں تو محدود بھی نہیں۔ وہ الفاظ سے محض کھیلتے نہیں بلکہ حتی الامکان ان میں کوئی بات کہنے کی بھی پرخلوص کوشش کرتے ہیں انھوں نے عشق کی کیفیات بیان کرنے کے ساتھ محبوب کو قریب سے دیکھنا اور دکھانا چاہا ہے۔ اگرچہ ایسا کرتے ہوئے وہ رسمی آداب اور روایتی مضامین باندھنے کے لالچ سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ اکثر شعرا کے برخلاف انھوں نے عشق کی آسانی سے طاری ہوجانے والی کیفیات سے نظر ہٹا کر اپنے گرد و پیش کا بھی جائزہ لیا ہے اور جب بھی ان کی نظر نے یہ سفر کیا ہے وہ غم لے کر لوٹی ہے۔

لیکن ماہوسی کا بوجھل احساس ان کے لب و لہجے کی اس تہذیب کا رنگ پھیکا کر دیتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ایک حساس شاعر کی طرح زندگی کے جذباتی اور سماجی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے اور پورے خلوص اور درد مندی کے ساتھ ان کے باہمی ربط کو ٹٹولا ہے۔ پھر بھی ان کی سوچ میں مرکزیت نہیں ملتی۔ اگر وہ اپنے بکھرے خیالات کو کسی نقطے پر مرکوز کر سکیں اور روایتی استعاروں اور علامتوں سے نہ سہی روایتی مضامین کو باندھنے کے رحجان سے اپنے کو بچائیں تو یہ ان کی شاعری کے حق میں مبارک ثابت ہوگا۔ ان کے چند اشعار سنیئے۔

ابد ترے نقشِ قدم پہ ہیں مرے نقشِ قدم — تجھ کو پائے گا کہاں ڈھونڈنے والا کوئی
اڑاؤ گے ہنسی پھولوں کی کب تک — بڑھا کر دام اپنے خار و خس کے
زنداں سے چھوٹتے ہوئے کیا یاد آ گیا — کچھ کہتے کہتے رہ گئے دیوار و در سے ہم
قدموں پہ ان کے گر کے ہر اک پھول نے کہا — آزاد کیجئے مجھے قیدِ بہار سے
ہم نے قفس سے چھوٹ کے دیکھا یہ انقلاب — انداز ایک ہی قفس و آشیاں کے ہیں

غم ساتھ ہو تو میری طرح سب یہی کہیں — کتنی طویل زندگیٔ مستعار ہے
ستم ہے لوٹ لیا ان کو راہزن کہہ کر — تمھاری راہ سے ہٹ کر جو اپنی راہ چلے

(انور معظم)

L. 3461/57 SABA-MONTHLY REGD. NO. A. 215

10(12) Dec 64

ماہنامہ

صبا

حیدرآباد

منظور شدہ محکمۂ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

ماہنامہ

صبا

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر:- سلیمان اریب

فون (۴۲۴۰۲)

کتابت:- محمد مظہر
ٹائیٹل:- محمد غوث

جلد ۱۰
شمارہ ۱۲
ماہ دسمبر
سنہ ۱۹۶۴ء
قیمت ایک روپیہ

زرِ سالانہ ہند و پاک سے ۱۰ روپے
ششماہی ۶ ر
بیرونِ ہند سے ۲۰ شلنگ

دہلی آفس:- ۱۵۰۷ ترکمان گیٹ دہلی ۶

پاکستان میں ترسیلِ زر کا پتہ:- ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۴۲۰۲) کراچی ۳

ایڈیٹر پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب ۱۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان

اس شمارے میں

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار

پہلے بات

"صبا" کا یہ شمارہ ۶۴ء کا آخری شمارہ ہے۔ جنوری ۶۵ء سے "صبا" کی زندگی کا گیارہواں سال شروع ہوگا۔ پچھلے ایک دہے میں "صبا" نے ادب کی جو بری بھلی خدمت انجام دی۔ آزادیٔ تحریر کی جو شمع جلائے رکھی۔ نئے لکھنے والوں کو کسی تعصب کے بغیر روشناس کرانے اور آگے بڑھانے میں جو حصہ لیا اور اس کے ساتھ جس بےجگری سے یہ دس سال بتائے وہ اہلِ نظر اور اہلِ کرم سے پوشیدہ نہیں گو اب بھی "صبا" کے سامنے وہی مسائل و مشکلات ہیں جو آج سے دس برس پہلے تھے اور آج بھی ہمارے پاس ان کا کوئی حل موجود نہیں ہے سوائے سعیِ لاحاصل کے لیکن صرف اس امید میں کہ کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم (صبا) چلی جا رہی ہے۔

جنوری ۶۵ء سے ہم "صبا" میں کچھ تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں اس کی انفرادیت، کردار، معیار اور ظاہری خد و خال کو اور ابھارنا چاہتے ہیں لیکن اگر آپ کا تعاون حاصل نہ رہا اور حالات نے ساتھ نہ دیا تو؟ —


دن کافی سے شروع ہوتا ہے
نیند کا خمار ابھی بھی اس کی آنکھوں میں ہے۔ اس کے ہاتھوں میں اخبار تو ہے، لیکن اس کی موٹی موٹی سرخیاں تک دھندلی دھندلی سی دکھائی دیتی ہیں۔
ایسے میں کافی کیا آئی کہ دل اچھل گیا۔ اس کی خوشبو دماغ میں بسنے لگی اور ہاتھ پیالہ کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ ہے تازہ پسی ہوئی خوشبودار کافی کا جادو۔
اس کا ہاتھ بڑھتا ہے اور وہ خوشبو سے بھرپور کافی کا پیالہ اپنی بیوی کے ہاتھ سے لیتا ہے۔ ایک چسکی لیتے ہی اطراف کی دنیا میں جان آگئی ــــ صحیح معنی میں صبح گویا اب شروع ہوئی ہے۔
پینے کی کسی اور چیز سے آپ کو زندگی کا ایسا لطف نہیں آتا، جیسا کہ کافی کے ایک اچھے بلکہ شاندار پیالہ سے آتا ہے۔
دیکھئے کیا کیا ہیں کافی کے مزے .. ہر جگہ ... ہر وقت
کافی بورڈ، بنگلور

صفیہ اریب

سرور ڈنڈا

ڈنڈا کے فن کے متعلق مختلف رائیں ہو سکتی ہیں۔ مگر اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ عوام کے بہت زیادہ چہیتے شاعر تھے۔ مجھے متعدد ایسے مشاعرے یاد ہیں جہاں عوام نے انھیں اسٹیج پر پا کر پھر کسی بھی بڑے سے بڑے شاعر کو سننے سے انکار کر دیا۔ ان کا نام اناؤنس کیے جانے پر لوگ تالیوں سے سارا ہال یا سارا میدان سر پر اٹھا لیا کرتے تھے۔ لیکن ان کی زندگی ہی میں ایک ایسا گروہ بھی موجود تھا جو انھیں سرے سے شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ میں ان کے فن کے متعلق زیادہ نہیں کہوں گی مگر اتنا اشارہ ضرور کروں گی کہ ہر ملک کا FOLK LITERATURE اس ملک کی تہذیب، رسم و رواج اور عوام کے دل کی دھڑکنوں کا علمبردار ہوتا ہے۔ ڈنڈا کی شاعری صرف ان کے دل کے نہاں خانوں کی گونج نہیں ہے۔ وہ اس دور، اس معاشرہ کے انسانوں کے دلوں کے دریچوں سے چھن کر آنے والی صاف و شفاف روشنی ہے۔ انھوں نے اس ازلی، ابدی تنہائی کے نغمے نہیں گائے جسے صرف ہر سماج کے گنتی کے INTELLECTUALS ہی محسوس کرتے ہیں۔ ان کی شاعری نذر انسان ہے ان لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی نذر جنھیں پیٹ کی جلا دینے والی آگ اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ اپنی ذات کے اندر بھی جھانک سکیں یا دشت جنوں کی آبلہ پائی ان کو ارزانی ہو۔

رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ اچھے فنکار کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ اچھا انسان ہو۔ پتہ نہیں رشید صاحب کی نظروں میں اچھے فنکار اور اچھے انسان کی پہچان کیا ہے؟ اور مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ ڈنڈا کو کتنے نقاد اچھا فنکار کہیں گے مگر انھیں اچھا انسان کہنے اور لکھنے میں ان کے کسی دوست اور کسی جاننے والے کی نہ تو زبان ہی رکے گی اور نہ ہی قلم جھجکے گا۔ ڈنڈا کے فن کے بارے میں مختلف رائیں ہو سکتی ہیں مگر ان کی شخصیت کے بارے میں ایک ہی رائے ہو سکتی ہے۔ دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔

وہ اپنے ماں باپ کے انتہائی اطاعت گزار اور فرماں بردار بیٹے، اپنے بچوں پر جان نثار کرنے والے باپ، یاروں کے یار، محتاجوں اور بے سہاروں کے مددگار، زندہ دل، خوش اخلاق اور منکسر المزاج انسان تھے۔ اچھا انسان ہونے کے لیے ان میں سے صرف چند خوبیاں ہی کافی ہیں، مگر وہ تو ان تمام خوبیوں کا مجسمہ تھے۔ ان تمام صفات کے مقابلے میں ان کے مزاج کی چند کمزوریوں کا پلڑا بہت ہلکا تھا۔ وہ ضدی، زود رنج اور متلون المزاج آدمی تھے۔ آخری زمانے میں مذہب کی طرف ان کا رجحان بہت بڑھ گیا تھا۔ مذہبی ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن وہ توہم پرست اور ضعیف الاعتقاد تھے

ان کی شخصیت کا بڑا گہرا پہلو تھا۔ جس بات کو بھی سوتے جاگتے [illegible] کے [illegible] تھا۔ وہ سینا بنی
سگریٹ نوشی، اور اس سے زیادہ تیز اور اہم نوشیں ہیں۔ سے بہت آشنا تھے۔ مگر [illegible] نے انھیں وقت
سے پہلے بوڑھا بنا دیا تھا۔ اسی نے ان کے دل کو کمزور کر دیا تھا اور اسی نے میں سمجھتی ہوں آخر کار انھیں موت کی وادی
میں پھینک دیا۔ موت کے حضور میں پیش ہونے کے لیے تو سب کی باری لگی ہوئی ہے اور یہاں اپنی باری پر سبھی کو جانا ہے
مگر علت و معلول کی زنجیروں میں جکڑا ہوا یہ ذہن موت کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔

وہ اپنے ماں باپ کے ضرورت سے زیادہ ہی فرمانبردار بیٹے تھے۔ میں نے ان کی فرمانبرداری کے کئی مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اپنی بیماری کے آخری دنوں میں وہ زندگی اور موت کی اذیت ناک کشمکش میں مبتلا تھے۔ اس حالت میں کوئی ان سے دوا پینے کو کہتا تھا تو وہ سختی سے انکار کر دیتے تھے۔ مگر جب کوئی ان سے یہ کہہ دیتا کہ یہ دوا "میاں" (وہ اپنے والد کو میاں کہتے تھے) لے کر آئے ہیں تو وہ اسے بخوشی پی لیتے تھے۔ آج کل کے زمانے میں ماں باپ سے محبت تو نہیں ہاں ان کی فرمانبرداری گزری ہوئی صدیوں کا اخلاق معلوم ہوتی ہے اور اب گزری ہوئی صدیوں کے اخلاق کے یہ بچے کھچے چند نمونے بھی تیزی سے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

ڈیڈا پچھلی صدی ہی کے آدمی تھے۔ ان کی بے غرضانہ محبت اور بے لوث خلوص ان کی خوش اخلاقی زندگی کے اکثر معاملات میں عام الفاظ میں ان کا "غیر ترقی پسندانہ رویہ" یہ سب پچھلی صدی ہی کی باتیں ہیں اور اسی لیے میں سمجھتی ہوں وہ جتنے اچھے بیٹے اور باپ تھے شاید اتنے اچھے شوہر نہیں تھے۔ وہ عورت کو ماں، بہن اور بیٹی کے روپ میں بہت مقدس سمجھتے تھے۔ اس کے سوائے عورت کو وہ ہر حیثیت میں "جنور" کہتے تھے کسی میدان میں بھی انھوں نے عورت کی برتری یا اس کی مساویانہ حیثیت کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ ان کی بیوی بہت اچھی لیڈی ڈاکٹر ہیں۔ وہ خود ان کی بہت تعریف کرتے تھے اور مجھ سے ہمیشہ ان کا علاج کروانے کو کہتے تھے مگر جب کبھی وہ خود بیمار پڑتے اور ادیب ان سے اپنی ہی بیوی سے علاج کروانے کو کہتے تو وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے تھے "بنے بھائی! (ادیب کو وہ بنے بھائی پکارتے تھے) اپنا ہی جنور بھلا اپنا کیا علاج کرے گا!"

ان کے اخلاق کا یہ عالم تھا کبھی کسی چھوٹے یا بڑے کو انھوں نے پہلے سلام کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جو بھی ان سے ملتا خود پہلے سلام کر کے اس کی خیریت پوچھتے۔ حد تو یہ ہے کہ مرنے سے کچھ ہی دیر پہلے چند عورتیں ان کی مزاج پرسی کو آئیں۔ ڈیڈا کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ زبان میں لکنت آ گئی تھی مگر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں انھوں نے ان عورتوں کو سلام کیا اور خیریت دریافت کی۔

دوستوں سے ڈیڈا کی غیر معمولی محبت، خلوص اور پیار کو بیان کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ وہ ادیب کو اور مجھے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ وہ ادیب کے ان دوستوں میں نہیں تھے جن کو "یار غار" کہا جاتا ہے اسی لیے کہ وہ ان راہوں سے ناآشنا تھے جن پر ادیب نے اپنی ساری زندگی بسر کی ہے۔ مگر زندگی میں جب کبھی ہم کو کسی پریشانی یا مصیبت کا سامنا

کرنا پڑا ہے اس وقت ڈنڈا نے ہمارا اس طرح ہمارا ساتھ دیا ہے کہ جیسے یہ پریشانی ہماری نہیں بلکہ ان کی اپنی ہے اس سلسلہ میں ایک دو واقعات بیان کرنا چاہوں گی۔

چند برس پہلے ہم نے ایک کل ہند مشاعرہ کیا تھا جس وقت یہ پروگرام ہم نے بنایا اس وقت ابتدائی اخراجات کے لیے روپے کی فراہمی کا خیال پیدا ہوا۔ یہ بات ڈنڈا کو بھی معلوم ہوئی۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو جن سے اس وقت تک ہم واقف نہیں تھے اس کے لیے تیار کیا۔ یہی نہیں بلکہ مشاعرہ ہونے تک انھوں نے چین کا سانس نہیں لیا۔ وہ اپنا موٹر کے ساتھ ہر وقت موجود رہتے اس وقت ان کے پاس ایک پرانی اور بڑی دلچسپ قسم کی موٹر تھی جو بعد میں کسی نے ان سے ہتیا لی۔

ایسے ہی ایک بار بڑے نازک وقت پر ڈنڈا نے عجیب انداز سے ہماری مدد کی تھی۔ مسئلہ ایسا تھا کہ خود ڈنڈا اپنی ذات سے اسے حل نہیں کر سکتے تھے اس دفعہ بھی اپنے ایک اور دوست کے پاس وہ ادیب کو لے گئے۔ ان صاحب سے ملنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ ادیب کے بچپن کے ساتھی ہیں۔ دونوں کو اس سلسلے میں ان کے گھر کے چکر کرنے پڑے۔ ڈنڈا علی الصبح اپنی موٹر لے کر آجاتے تھے کبھی کبھی ضد کر کے مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے وہ ایسا کر کے ان کو ناشتہ کرواتے میں ان کو بھی گھر ہی پہ ناشتہ کرنے کو کہتی تو بہت ناراض ہو جاتے اور کہتے "کیا مجھے رشوت میں ناشتہ کروانا چاہتی ہو؟ یہ نہیں ہو سکتا۔" بہر حال کئی دن کی کوششوں کے بعد بھی جب کام نہ بنا تو ایک دن ڈنڈا نے ان صاحب کے پیر چھو لیے "بھائی آپ کو یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ یہ ادیب کا نہیں میرا کام ہے۔" اور اس طرح ڈنڈا کے دوست کو ان کی بات ماننی ہی پڑی۔ اب اس زمانے میں کون کسی دوست کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے۔

ڈنڈا نے شاید ہی کبھی ہمارے گھر کھانا کھایا ہو۔ بہت مجبور کرنے پر وہ کوئی دن مقرر کر کے چلے جاتے اور پھر اس دن مرغ، مٹھائی یا کھانے کا کچھ سامان لے کر آجاتے۔ اگر ان کی اس حرکت پر کوئی کچھ کہہ دیتا تو وہ ناراض ہو جاتے تھے کتنی ہی پُر لطف شامیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں جب ڈنڈا نے ہمارے گھر میں بہترین دعوتوں کے انتظامات کیے۔ وہ سیروں گوشت، روٹی، مصالحے یہاں تک کہ کوئلہ بھی لے آتے تھے۔ رات میں صحن میں سعید بن محمد گوشت دم دیتے تھے اور پھر آدھی رات تک شاعری ہوتی، ہجویں لکھی جاتیں۔ ڈنڈا کبھی کسی کو چھیڑتے، ستاتے کبھی لہک لہک کر شعر سناتے اور کبھی ہم لوگوں کی اس طرح خاطریں کرتے کہ جیسے ہم سب مہمان ہیں۔ ایسی کئی محفلوں میں سعید بھائی، عزیز قیسی، زبیر رضوی اور ابن احمد تاب شامل رہے ہیں۔

ادیب پچھلے چند برسوں میں کئی بار ڈنڈا کے ساتھ بمبئی گئے جاتے وقت میں ہمیشہ ڈنڈا سے کہتی تھی کہ ذرا ادیب پر نگرانی رکھنا اور ادیب کا بیان ہے کہ وہ ان کی اس طرح نگرانی کرتے تھے کہ ان کا چلنا پھرنا اور لوگوں سے ملنا مشکل ہو جاتا تھا۔

مظلوموں، غریبوں اور بے سہاروں سے محبت اور ہمدردی انسانی فطرت کا خاصہ ہے مگر ضروری نہیں کہ یہ محبت اور ہمدردی عملی بھی ہو۔ ڈنڈا اپنی شاعری میں ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ان لوگوں کا ساتھ دیا جو پریشانیوں

اور مصائب کا شکار رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان رجحانات اور طاقتوں کے خلاف بھی انھوں نے کبھی طنز کیا ہے اور کبھی غصہ کا اظہار جو ان حالات کو پیدا کرتے ہیں۔ مگر یہ ان کی شخصیت کا صرف ایک رخ ہے۔ ان کی یہ طبیعت اور ہمدردی صرف دلی ہی نہیں بلکہ عملی بھی تھی۔ وہ ہر طرح محتاجوں اور غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔

ہر بھابی بتا رہی تھیں کہ یرقان ہونے کے بعد شاید بخار کی حالت میں بھی وہ بجائے اپنے علاج کی فکر کرنے اور آرام کرنے کے سارا دن یتیموں، بیواؤں کو وظیفہ کروانے کے لیے رکشاؤں میں مختلف دفتروں کے چکر لگاتے رہتے تھے۔

ڈنڈا کلام بہت خوش ہو کر بڑی ادا کے ساتھ سناتے تھے۔ مشاعروں ہی میں نہیں بلکہ نجی محفلوں میں بھی۔ حج کرنے کے بعد ادھر کچھ عرصے سے وہ مستقلاً رنگین گول ٹوپی پہننے لگے تھے۔ کبھی پتلون پہنتے تھے تو کبھی بڑے پائنچوں کا پاجامہ اور سفید کرتا۔ سر کو نیچے جھکا کر اور ہاتھوں کو خاص انداز سے حرکت دیتے ہوئے بڑی اچھی آواز میں کلام سناتے تھے۔ ایک نظم یا غزل سنا کر بیٹھ جاتے تھے۔ مزید سنانے کے لیے لوگ اصرار کرتے۔ اصرار بہت بڑھ جاتا تو پھر اٹھتے اور پہلی ہی حرکت دہراتے یعنی ایک ہی چیز سنا کر بیٹھ جاتے۔ لوگوں کا اشتیاق بڑھتا جاتا۔ ڈنڈا سناتے سناتے تھک جاتے تھے مگر لوگ سنتے نہ تھکتے تھے۔

چند ماہ قبل جب ڈنڈا ہمارے گھر آئے تو کہنے لگے "میں اب شاعری چھوڑ رہا ہوں" میں نے وجہ پوچھی۔ جواب دیا "اس شاعری کی وجہ سے ... دنیا میں بڑا ذلیل ہونا پڑ رہا ہے۔ لوگ مجھے گالیاں دینے لگے ہیں۔" میں نے کہا، "دنیا ہر حالت میں کچھ نہ کچھ کہتی ہی رہتی ہے۔ تم شاعری چھوڑ دو گے تو اس پر بھی لوگ کچھ کہیں گے ہی۔ اب کیا تم دنیا ہی چھوڑ دو گے؟ تم ہزارے پٹھان آدمی ہو۔ ایسی کم ہمتی کی باتیں تمھیں زیب نہیں دیتیں۔ اب کی بار جب تم آؤ گے تو میں تم سے کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور سنوں گی۔"
اور پھر ایک دن ڈنڈا کچھ نئے اشعار سنانے کے لیے گھر پہنچ ہی گئے۔ اشعار سنانے سے پہلے کہنے لگے "میری آخری آرزو ہے کہ میں ارض مدینہ میں دفن ہوں۔" پھر یہ کہہ کر اشعار سنائے کہ "یہ شعر میں نے صرف تمھارے کہنے پر لکھے ہیں۔" مجھے یقین تھا کہ ڈنڈا شاعری نہیں چھوڑیں گے۔ مگر اس کا علم کسی کو بھی نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا کہ وہ بہت جلد مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی دنیا چھوڑنے والے ہیں۔

شاہ پور واڑی سے پہاڑی
میری چلی رے گھوڑا گاڑی

بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر
باشا ہو جانا فٹ پاتھ پر
راجا ہو جانا فٹ پاتھ پر

فاطمہ عالم علی

ڈنڈا صاحب ہماری یادوں میں

شاہد صدیقی نے صریحاً فریب دیا۔ سن گن تک نہ دی، اور رحلت فرما گئے۔ ان پر غصہ تھا اور آج تک ہے ابھی تک مشاعروں میں نظریں انھیں کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ ڈنڈا صاحب رخصت ہو گئے۔ انھوں نے جانے سے پہلے اعلان کر دیا تھا کہ "دیکھو ہم جا رہے ہیں پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی"۔ لیکن نہ جانے کیوں ہم اس اعلان کو بھی ان کا ایک مذاق ہی سمجھتے رہے انتقال سے آٹھ دن پہلے اخبار میں دیکھا کہ سرور ڈنڈا شدید بیمار ہیں لیکن یقین مانیے ذرا بھی تو شدت کا احساس نہ ہوا بس یہی سوچا کہ بیمار ہونے کی ان کو عادت ہے اور جب لیٹتے ہیں تو انداز شدید ہی اختیار کرتے ہیں۔ اب کے بھی ٹھیک ہو جائیں گے لیکن افسوس ایسا نہیں ہوا مذاق نے وحشت ناک سنجیدگی اختیار کر لی۔

مجھے ڈنڈا صاحب کی کیفیت برابر معلوم ہوتی رہی اور میں خود کو مجبور کرتی رہی وہاں جا کر ان کی عیادت کرنے کے لیے! لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی پھر بھی میری ہمت نہ ہوئی۔ سوچتی تھی اس قدر زندہ دل انسان کو کرب میں مبتلا کیسے دیکھوں یہ میری کمزوری ہے، اور بہت غلط قسم کی کمزوری ہے کہ میں ایسے وقت دور بھاگتی ہوں جب واقعی اس کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے قریب ہوں۔ چنانچہ میں بھی اپنے آپ کو تیار ہی کر رہی تھی کہ ۲۰ نومبر کی شام کو مجھے فون سے اطلاع ملی کہ ڈنڈا صاحب چل بسے میں تو سے بس ارے کہا!! میں اس خبر کے لیے . . . . تیار نہ تھی۔ نہ جانے کتنی راتیں گئے تک انھیں کے بارے میں سوچتی رہی۔ رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ چالیس سال کی عمر میں تو مرد جوان مرد ہوا کرتا ہے یہ عمر تو پختہ عمر کہلاتی ہے اس عمر کو پہنچ کر ہی انسان اپنے مقصد حیات سے آگاہ ہوتا ہے اور ڈنڈا صاحب سے ایسے ہی وقت حیات لے لی گئی آخر وجہ؟ کیا انھوں نے وہ سب وقت سے پہلے حاصل کر لیا جو ان کو اب کرنا تھا؟ ہو سکتا ہے اللہ کے بھید انسان سمجھنے سے قاصر ہو انسان کچھ سوچتا ہے اور ہوتا کچھ ہے ڈنڈا کی موت میں کیا مصلحت ہے اللہ بہتر جانے!!

سرور ڈنڈا محض شاعر ہی نہ تھے وہ فن کار بھی تھے انھوں نے فائن آرٹ کالج سے پینٹنگ اور کمرشل آرٹ میں ڈپلوما بھی لیا تھا۔ اس فن میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ اگر بجائے شاعری کے مصوری کو اپناتے تو اس میں بھی اتنا ہی نام کماتے جتنا کہ بحیثیت شاعر کے کمایا۔

کمرشیل آرٹ کو کچھ دن معاش کا ذریعہ بھی بنایا لیکن شاید ڈنڈا کو فنون لطیفہ سے روزگار حاصل کرنا پسند نہ آیا اور

حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر آرٹ تجارت کی منڈی میں آ جائے تو پھر وہ آرٹ نہیں رہتا محض ٹھوس شہ پاس رہ جاتی ہے!!۔
سید ڈنڈا حقیقی معنوں میں آرٹسٹ تھے چنانچہ انھوں نے آرٹ کی لطافتوں کو آٹے دال کے بھاؤ فروخت کرنے کے بجائے ٹھیکہ داری شروع کردی اور یہ کاروبار ان کے لیے بہت مہنگا ثابت ہوا۔ ڈنڈا صحت کے اعتبار سے کبھی بھی تندرست توانا نہ تھے چھوٹی چھوٹی بیماریاں چلتی ہی رہتی تھیں ٹھیکہ داری کا بار ان کا نازک جسم برداشت نہ کرسکا وہ تو ایک حساس فنکار تھے (فنکار کے لیے حساس ہونا پہلی شرط ہے) بھلا ٹھیکہ داری سے ان کو کیا مناسبت جب سابقہ پڑا جسم و جان دونوں جواب دے گئے۔

ڈنڈا کا کلام پڑھنے سے میں ہمیشہ قاصر رہی کیونکہ دکنی زبان کا تلفظ صحیح ادا نہیں کر پاتی اس لیے میں ان کا کلام انھیں کی زبانی سننے کی مشتاق رہتی تھی۔ ایک مرتبہ کلام شائع کرنے کی بات چھڑی تو میں نے کہا خدا کے لیے ڈنڈا صاحب آپ اپنا کلام کتاب کی شکل میں کبھی نہ چھپوائیے کیونکہ کیوں کر یہ نہ پڑھ سکوں گی اور یوپی والے کلام کی رٹیرھ لگا کر رکھ دیں گے میری رائے میں آپ اپنا کلام اپنی ہی زبانی ریکارڈ کرائیے۔ ایک ریکارڈ بازار میں آ جائے پھر تماشہ دیکھئے کیسی مانگ ہوتی ہے۔ میرے اس خیال پر اچھل ہی تو پڑے کہنے لگے کیا صحیح بات بولے فاطمہ صاحب چلیے ریکارڈ کی بات طے"

میں ڈنڈا صاحب کے ساتھیوں سے درخواست کرونگی کہ جہاں جہاں بھی ڈنڈا صاحب کی آواز ریکارڈ کی ہوئی ملے اسے یکجا کر کے ریکارڈ تیار کروا کر بازار میں لائیں تاکہ دکنی . . . . زبان کے عوامی شاعر کی آواز دکن کے باہر بھی سنی جا سکے۔

ڈنڈا کے پڑھنے کا انداز بڑا نرالا تھا۔ جیسا انداز تھا ویسی ہی خوبصورت آواز بھی تھی۔ گردن کو ایک طرف جھکا کر جب وہ ترنم سے اپنا کلام سنانے اور ہاتھوں سے ترنم کے آثار چڑھاؤ کو ظاہر کرتے تو کلام میں چار چاند لگ جاتے۔ ڈنڈا صاحب مشاعروں میں بہت کم آتے تھے میں نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے " کیا بولوں پاشاہ شاعراں میرے سے خفا ہو جاتیں اس واسطے اپن دور رائچ اچھے " اور یہ واقعہ ہے کہ بڑے مشاعروں میں جب کہ ہندوستان بھر کے مشہور شعراء جمع ہوتے، عوام کی نظریں ڈنڈا کی متلاشی رہتیں ایک دوسرے سے پوچھتے " یارو اپنا ڈنڈا ابھی ہے کیا ؟"

اور اگر ڈنڈا نظر آ جاتے تو لوگ دوسرے شعراء کو زیادہ دیر صبر کر کے سن سکتے، ایک پرچہ جاتا پہلے درخواست کی جاتی" جناب ڈنڈا صاحب سے سنوائیے اور جب درخواست بے اثر ہونے لگتی تو پبلک حکم صادر کرنے لگتی۔ مختلف گوشوں سے مطالبہ شروع ہو جاتا " ڈنڈا کو بلاؤ، ڈنڈا وانٹڈ وغیرہ وغیرہ " اور مجمع کو قابو میں کرنے کے لیے ڈنڈا صاحب لائے جاتے اس وقت ان کی عجیب کیفیت ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہو۔ فرمائشوں کی بوچھار ہوتی ڈنڈا صاحب کی آواز بانسری کی لَے کی طرح گونجتی سامعین پر جادو سا ہو جاتا آخری شعر ختم کرتے کرتے بھاگ کھڑے ہوتے لیکن گرفتار کر لیے جاتے ایک آدھ چیز سنا کر ڈنڈا صاحب کو کبھی رہائی نہ ملی یہی وجہ تھی کہ ڈنڈا کو عام طور پر مشاعروں میں آخر میں سنوایا جاتا یعنی اکثر صحت کی خرابی کا عذر بھی پیش کرتے لیکن عوام کا اشتیاق اور خلوص سے سنانے پر مجبور ہو جاتے یہاں جب کہ یہ سطریں لکھ رہی ہوں ڈنڈا صاحب کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے اور میں سوچتی ہوں کہ انسان کس قدر کمزور ہے نہ ہی آج ڈنڈا صاحب کو عوام کی آواز واپس بلا سکتی ہے

اور نہ ہی ڈنڈا صاحب اپنے خالق کے بلاوے کو ٹال سکے۔ یہ ہے انسان کی حقیقت۔

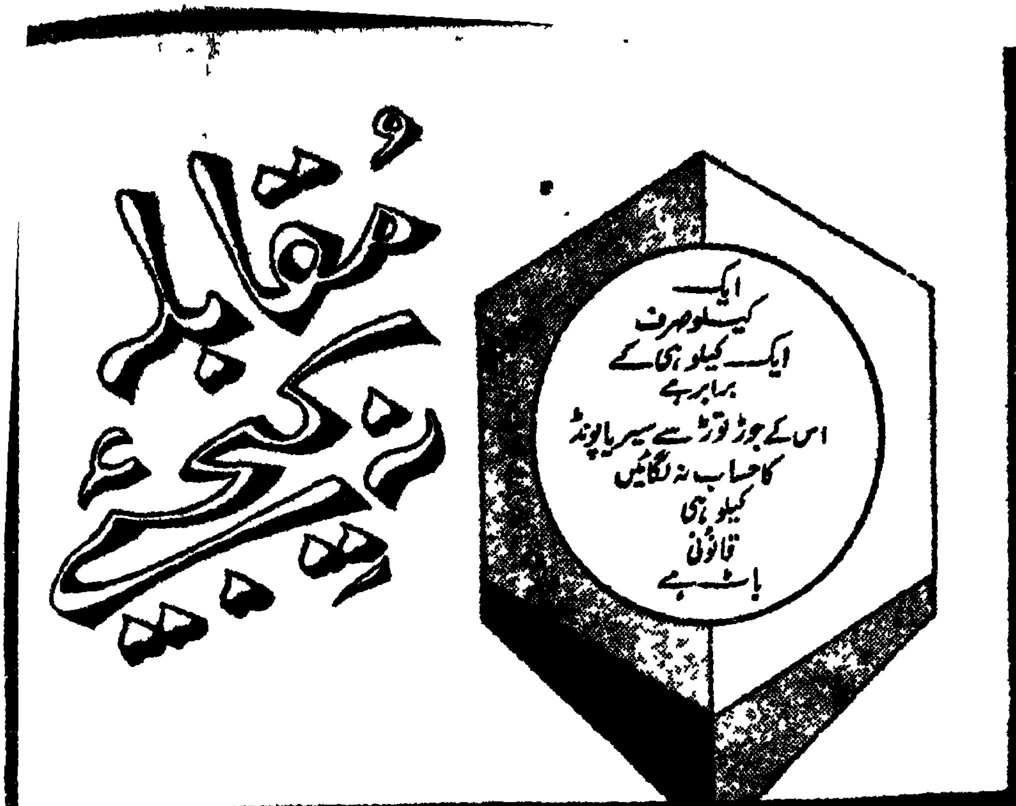
جب سے میں حیدرگوڑہ آگئی تھی سال چھ مہینے میں ڈنڈا صاحب میرے یہاں کبھی بھولے بھٹکے پہنچ جاتے کچھ کلام سناتے۔ کچھ گپ شپ ہوتی اور جب چائے ان کے سامنے آتی تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے " ہاں اک بس گرم پانی اپنی قسمت میں ہے" میں کیا جانتی تو کہتے " آپ شکر بچوا کر فیرنی پکوا کر مٹی کے پیالوں میں جما دو۔ کون کون آ نا ہے میں دیکھ لوں گا" قصہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ آپا کے پاس کی دعوت میں ڈنڈا صاحب کو فیرنی بہت پسند آگئی تھی۔ بس جب ہی سے صورت دیکھتے ہی طرح طرح سے اس کی فرمائش کیا کرتے۔ اور دو چار میں مل جاتے تو وہاں بھی نہ چھوڑتے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہتے " ہمارے فاطمہ صاحبہ کے گھر ملو تو گرم پانی پلا کر بہت خوش۔ ایک پیالہ فیرنی کا نہیں نکلتا آخر وہ کیا بات ہوگی" میں کہتی کہ بھئی ایسی جلدی کیا ہے کھلاؤں گی اور ضرور کھلاؤں گی آپ اس قدر مایوس کیوں ہیں۔ "کیا ہے جی" کہہ کر ہنس پڑتے۔ میں نے کہا آپ کو معلوم نہیں۔ قاضی کے گھر چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں میں تو ان کی لڑکی ہوں۔ آپ بھری محفل میں فیرنی کا تقاضا کرتے ہیں اور یہاں سبھی اپنے ہیں۔ اپنوں کو کھلانا کچھ آسان ہے ؟ ایک دن آپ کو چپکے سے کھلا دوں گی۔

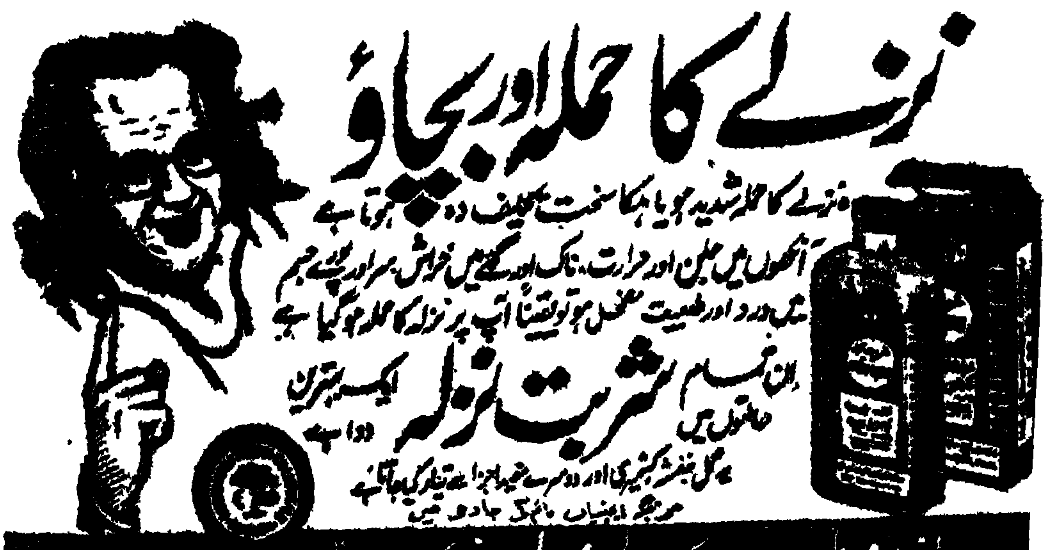
غرض فیرنی کا مذاق چلتا ہی رہتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ واقعی ان کو جانے کی اتنی جلدی ہے سچ مچ اس شخص نے مذاق ہی مذاق میں وہ حرکت کی ہے جو بیان سے باہر ہے

ڈنڈا کی شخصیت بھی اس کی آواز ہی کی طرح پرکشش تھی۔ ایثار وانکساری اُن کی فطرت تھی شہرت ان کا پیچھا کرتی رہتی تھی ورنہ ڈنڈا ہر ایسی جگہ جانے سے گھبراتے تھے جہاں ذرا بھی شہرت کا امکان ہو۔ ڈنڈا صاحب مع اہلیہ کے فریضۂ حج ادا کر چکے تھے اور اب ہجرت کرنے والے تھے۔ سفر سے متعلق تمام مراحل طے ہو چکے تھے ملازمت بھی تیار تھی صرف روانگی کا دن آنا تھا کہ خدا کے پاس سے بلاوا آگیا سچ تو یہ ہے کہ ڈنڈا صاحب کے مرنے کے دن نہ تھے اور نہ ہی وہ اتنا جلدی مرنا چاہتے تھے ابھی ان کو بہت سے کاموں اور ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا تھا لیکن اللہ کی مصلحت وہی جانے جو کام ڈنڈا کو کرنا تھے وہ احباب کریں گے اور جن ذمہ داریوں سے ان کو سبکدوش ہونا تھا وہ اب ان لوگوں کے کاندھوں پر پڑ گئیں جو یہ سمجھ رہے تھے کہ ساری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکے ہیں اور اب اللہ اللہ کرنے کے دن ہیں۔

ڈنڈا صاحب جو تھے سو تھے۔ ان کو ٹٹولنے کی ضرورت نہ تھی وہ تو ایک کھلی کتاب تھے جس کا جی چاہے پڑھ لے اب یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ کترا کر نکل گئے۔ نہ جانے کیوں پڑھنے کی کوشش نہ کی! جنھوں نے پڑھا ان میں سے کچھ سمجھ نہ پائے اور جو سمجھ سکے وہ کچھ کر نہ سکے۔ غرض سرور ڈنڈا کا بھی وہی انجام ہوا جو ہر بڑے فنکار کا ہوا کرتا ہے۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں


مقابلہ نہ کیجیے
ایک
کیلو صرف
ایک کیلو ہی کے
برابر ہے
اس کے جوڑ توڑ سے سیر یا پونڈ
کا حساب نہ لگائیں
کیلو ہی
قانونی
باٹ ہے


نزلے کا حملہ اور بچاؤ
نزلے کا حملہ شدید ہو یا ہلکا سخت تکلیف دہ ہوتا ہے
آنکھوں میں جلن اور حرارت، ناک اور گلے میں خراش، سر اور پورے جسم
میں درد اور طبیعت مضمحل ہو تو یقیناً آپ پر نزلہ کا حملہ ہو گیا ہے
ان تمام حالتوں میں شربت نزلہ ایک بہترین دوا ہے
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی

ملک اسماعیل حسن خاں

حفیظ کی شاعری

تشکیل و تکمیلِ فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں
(حفیظ)

حفیظ جالندھری بیسویں صدی کے بہت پرانے شاعر ہیں۔ ان کا سن پیدائش ۱۹۰۰ء ہے۔ ان کی ابتدائی نظمیں امید مرحوم آواز بھی اردو کے مشہور شاعروں (مثلاً جوش، اختر شیرانی، ساغر نظامی، فراق، جگر وغیرہ) کے ساتھ ابھری۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام (نغمۂ زار) ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ لیکن اس وقت کی اردو دنیا نے ان کی آواز پر کان لگا کر غور نہیں کیا۔ شاید اس میں اسے کوئی نئی بات یا نیا مزہ نہیں ملا، لیکن حفیظ اسی طرح شاعری کرتے رہے اور مشاعروں میں اپنی آواز اور ترنم کی وجہ سے انھوں نے مقبولیت حاصل کی، لیکن کسی نے ان کے کلام کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔
میری نظر سے ابتدا سنہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۲ء تک کے متعدد رسائل و جرائد کے جتنے فائل گزرے ہیں ان میں حفیظ پر برائے نام تنقیدی مضامین پائے۔ لوگوں نے اس طرف توجہ نہیں کی، ان کی شاعری کو غالباً درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ مولانا عبدالمجید سالک کی طرح بیشتر اصحاب یہی سمجھتے رہے ہوں گے کہ "حفیظ محض اپنے گلے کے باعث مشاعرہ لوٹ لیتا ہے۔"

اس کے بعد حفیظ نے "شاہنامۂ اسلام" لکھنا شروع کیا، شاہنامہ کی پہلی جلد غالباً ۱۹۲۸ء کے آخر میں شائع ہوئی۔ لوگوں میں ایک دھوم مچ گئی، حفیظ نے گھر گھر اور ہر محفل و مجلس میں اپنے مخصوص انداز و لہجہ میں شاہنامہ سنانا شروع کیا، عوام میں اس کا بڑا شہرہ رہا، لیکن تنقید و تبصرہ کی میزان پر اس کو اس وقت تولنے کی زحمت کسی نے گوارا نہیں کی، اس کی ہزاروں جلدیں چھپیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئیں، ۱۹۴۷ء تک "شاہنامۂ اسلام" مکمل ہو گیا، یعنی اس کی چوتھی اور آخری جلد چھپ گئی اور اس طرح اسلام کی وہ تاریخ جو دفتروں پر پھیلی ہوئی ہے ان چار جلدوں میں سما کر ختم ہو گئی۔

حفیظ کا آخری مجموعۂ کلام "تلخابۂ شیریں" ہے جو ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا، اس کے علاوہ حفیظ نے بچوں کے لیے بھی بعض نظمیں لکھی ہیں، مثلاً "حفیظ کے گیت اور نظمیں"، "بہار کے پھول"، "پھول مالا" وغیرہ —— ان مختصر و اجمالی جائزہ (پس منظر) کی روشنی میں حفیظ کی تخلیقات کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی جائے گی، مجھے اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی یوں اور بھی ضرورت پیش آئی کہ ابھی دو تین ماہ کی مدت ہوئی کہ رسالہ "افکار" کراچی نے ایک بڑا موٹا تازہ

صب

حفیظ نمبر" نکالا ہے، اس میں اگرچہ متعارف و مقتدر اور ممتاز اہلِ قلم نے حصہ نہیں لیا، لیکن آخر میں" نذرانے" کے عنوان کے ذیل میں بعض حضرات نے اپنے خطوط میں حفیظ کے متعلق جو تاثرات لکھے ہیں ان کو پڑھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا اگر یہ "اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے" کے نظریہ کے تحت لکھے گئے ہیں تب بھی ٹھیک نہیں، اس لیے کہ نقاد ان سب باتوں سے اونچا ہوتا ہے، اس کو کسی کی محبت و عداوت سے کیا سروکار؟ اس کو صاف دل، صاف دماغ اور صاف گو ہونا چاہیئے۔ ورنہ پھر وہ ایمانداری کے ساتھ کسی فن پارے کا صحیح تعین نہ کر سکے گا، اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر "نذرانے" کے ذیل میں شامل خطوط میں جو تاثرات بیان کیے گئے ہیں انھیں "تحسینِ ناشناس" کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں پروفیسر آل احمد سرور اور جوش ملیح آبادی نے جو اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں وہ انتہائی موزوں و مناسب اور غیر جانبدارانہ ہیں، سرور صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ:۔

" حفیظ کے متعلق مجھے ذاتی واقفیت زیادہ نہیں ہے، صرف چند بار ملا ہوں، ہاں ان کا کلام پڑھا ہے اور اس کی قدر کرتا ہوں "۔ جوش صاحب نے کیا خوب لکھا ہے۔

" حفیظ صاحب ایک ایسے شیریں مقال شاعر ہیں جو دلوں میں گھر کر چکے ہیں، ان کی شاعری، لطافت، سلاست، شماس، شگفتگی، روانی، رنگینی اور راگنی کی لپٹوں سے چکی ہوئی ہے، ان کے رسیلے گیت فضا میں ساون کے بادلوں کی طرح جھوم رہے ہیں، اور ان کا دلنشیں و سامعہ نواز ترنم ادب کی محراب میں وہ جھنکار پیدا کیے ہوئے ہے کہ زہرہ آسمان پر رقص کر رہی ہے "

احتشام صاحب نے بھی اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے یہ ناقابلِ تردید باتیں کہی ہیں :۔

" حفیظ نے اس جادو بھری سرزمین سے شاعری کا رس پیا، نغمہ سرائی کی، جھومے اور اپنی آواز سے دوسروں کو مست کرنے لگے۔ . . . . انھوں نے اردو شاعری کو تازگی بخشی، ازسرِ نو اسے قلبی واردات اور دیہاتی جذبات سے آشنا کیا، یہ ایسی باتیں ہیں جن کو اردو شاعری کا مورخ یا نقاد نظر انداز کر سکے گا"۔

لیکن آگے چل کر احتشام صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

" میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو انھیں صرف شاہنامۂ اسلام کا شاعر سمجھتے ہیں، ایسے لوگ بھی ملے ہیں جنھیں حفیظ کا نام صرف ایسی نظموں کے ساتھ یاد ہے۔ جیسے " اپنے من میں پریت بسا لے"۔ "رقاصہ" اور "ابھی تو میں جوان ہوں"۔ کچھ ان کے طرزِ شعر خوانی ہی کو ان کا سب سے بڑا کمال قرار دیتے ہیں، کچھ ان کی غزلوں میں جذبات کی عمومیت اور اظہار کی برجستگی پر فریفتہ ہیں، میں سوچتا رہا کہ اور کچھ نہیں اگر صرف ان تمام پسندیدگیوں ہی کو جمع کر دیا جائے تو کیا ایک بلند پایہ شاعر کی بہت سی خوبیاں یکجا نہیں ہو جاتیں "

مجھے احتشام صاحب کے اس دعوے میں کلام ہے، میں حفیظ کو بلند پایہ شاعر کبھی نہیں کہہ سکتا، احتشام صاحب

نے دیگر حضرات کے حوالے سے ان کی جن تخلیقات کا ذکر کیا ہے بس یہی اجزا حفیظ کی شہرت کا سبب ہیں، اور ان میں خصوصاً ان کے "طرزِ شعر خوانی" کو نمایاں وجہ حاصل ہے، آیئے احتشام صاحب کی بیان کی ہوئی حفیظ کی تخلیقات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ کیا ان کی وجہ سے ان کی بنیاد پر ان کو "بلند پایہ اور کامیاب" شاعر کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟

یہاں پہلے ان نظموں کی مقبولیت سے بحث کی جائے گی کہ ان نظموں کی بنا پر وہ کیوں مشہور ہوئے، اور ان نظموں میں کیا خاص اور نئی بات ہے؟ پھر ان کے "شاہنامہ" کی شہرت پر ایک نظر ڈالی جائے گی، اور بعد میں ان کی غزل گوئی کا تجزیہ کیا جائے گا۔

ان کی مشہور نظمیں "ابھی تو میں جوان ہوں۔ رقاصہ، جاگ سوزِ عشق جاگ۔ پریت کا گیت۔ میرا اسلام، فرشتہ کا گیت" ہیں، ان کی مقبولیت کے اسباب ان کا موضوع یا مواد نہیں بلکہ ان کی ٹکنیک، موسیقی اور حفیظ کی آواز ہیں، خیالات کے لحاظ سے ان میں کوئی جدت، اور نیا پن نہیں ان میں وہی پرانے خیالات ہیں، نئی لے میں پرانا راگ ہے ان میں تازگی نہیں، ان میں ندرت نہیں، ہاں ان کے اسلوب میں ضرور نیا پن ہے، ہیئت کے لحاظ سے وہ ضرور نئی ہیں، ویسے اس قسم کے اور اس سے ملتے جلتے تجربے عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی، ساغر اور حامد اللہ افسر کے یہاں بھی ملتے ہیں اور جدید شعرا بھی اس رنگ میں رنگے ہیں، لیکن محض ہیئت پرستی اور "نظم کی نئی شکل پیدا کرنے" سے بڑی یا اعلیٰ شاعری ہاتھ نہیں آجاتی، اگر THOUGHT CONTENT کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان نظموں اور گیتوں میں خیال کی جدت نہیں، رفعت نہیں، گہرائی نہیں، یہ سطحیت اور جذباتیت سے معمور ہیں، حفیظ نے ان نظموں کی ہیئت کو اپنی بیسیوں نظموں میں برتا ہے اور ہر جگہ اپنی مخصوص آواز اور موسیقی سے تازگی، خوبصورتی اور رنگینی پیدا کرنے کی کوشش ہے، ان کے "جذبات جوان" ہیں، لیکن ان کا اثر پائیدار نہیں، وہ سوڈے کے ابال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "ابھی تو میں جوان ہوں" کا یہ بند دیکھئے۔

یہ عشق کی کہانیاں   یہ رس بھری جوانیاں
ادھر سے مہربانیاں   ادھر سے لن ترانیاں
یہ آسمان، یہ زمیں
نظارہ ہائے دلنشیں
انھیں حیات آفریں
بھلا میں چھوڑ دوں یہیں
ہے موت اس قدر قریں   مجھے نہ آئے گا یقیں
نہیں، نہیں ابھی نہیں
ابھی تو میں جوان ہوں

ان میں ترنم و موسیقی کا ایک آبشار ہے جو قاری کو اپنی موجوں میں بہا لے جاتا ہے اور ان کی نظر اس کے نفسِ مضمون پر کم جاتی ہے، وہ اس کے نفسِ مضمون میں کم ڈوبتا ہے وہ اس کے ساز کی موسیقی و غنائیت کے سروں میں کھو جاتا ہے محو ہو جاتا ہے، لیکن یہ لطف و لذت کم ہونے پر، اس خمار کے اترنے پر جب وہ چونکتا ہے، جاگتا ہے تو یہ سب اثر "خواب پریدہ" ہو جاتا ہے، سنجیدگی و تجسس کا گزر موسیقی و رنگینی کے اس "سحر سامری" کو توڑ دیتا ہے، اب وہ مسحور نہیں رہتا اور جب نکل کر اس طلسم سے باہر آکر نظم کے نفسِ مضمون پر غور کرتا ہے تو اسے کچھ ہاتھ نہیں آتا، بجز اس کے کہ ترانہ ریز آواز کی کچھ لرزشیں اس کے کانوں میں گونجتی رہتی ہیں، "اور ابھی تو میں جوان ہوں" کا نشہ یاد رہ جاتا ہے، نظم ہیئت کے لحاظ سے بڑی پیاری اور دل موہ لینے والی ہے، اس میں روانی ہے، شگفتگی ہے، مٹھاس ہے، نغمگی و سلاست ہے، لیکن نفسِ مضمون میں کچھ جان نہیں، کوئی اونچی بات نہیں، کچھ نہیں!

اصل میں یہ تکنیک "گانوں" سے ملتی جلتی ہے، اور گانوں کا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کتنا فوری اثر ہوتا ہے کہ زبان زدِ خلائق ہو جاتے ہیں، ایک زمانے میں یہ گانا "پانی بھرنا کا دکھو ابھار" ہر ایک کی زبان پر چڑھا ہوا تھا، جب اس کی کمان اتری تو متعدد گانے مقبولِ عام ہوئے۔ ابھی تین چار سال ہوئے کہ یہ گانا "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا" جتنا مشہور تھا آج تک کسی شاعر کو اس کے پاسنگ بھی شہرت نصیب نہ ہوئی ہوگی، ہر نوجوان تنہائیوں میں سڑکوں پر محفلوں میں اجتماعوں میں ان کو گنگناتا ہوا ملتا تھا لیکن اب وہ بھلائے جا چکے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے دلچسپ گانے نوجوانوں کا آلۂ تفریح بنے ہوئے ہیں۔ ان نظموں کی فضا ترنم ریز اور موسیقیت سے لبریز ہے، ان کو پڑھ کر طبیعت کو لطف حاصل ہوتا ہے، ذرا دیر کے لیے مزہ ملتا ہے لیکن ان میں کوئی گہرائی اور گیرائی کوئی سنجیدہ سوجھ بوجھ نہیں، ان میں ایک ذہنی بچپن ہے ان میں نوجوانی کا نشہ ہے، جو وقتی ہوتا ہے، ان کو اس شاعری کے مقابل کیسے لایا جا سکتا ہے، جس میں شاعر حیات و کائنات کے مسائل کا تجزیہ پیش کرتا ہے، اس کا مقابلہ اس شاعری سے کس طرح کر سکتے ہیں "جس میں صرف شاعر کی زندگی اور اس کے ارد گرد کا ماحول سمٹ آتا ہے بلکہ اس کی گرفت میں پوری کائنات اور زمان و مکاں کی حدیں آ جاتی ہیں" یہ زندگی کا ہلکا پھلکا اور سطحی سا ایک رخ ہے، اس کو عظمت اور بلندی سے کیا واسطہ؟ اس کو سماجی شعور، کشمکشِ زندگی سے کیا تعلق؟ ہاں یہ "آلامِ روزگار" یا کشاکشِ حیات کو بھلانے یا اس سے تھوڑی دیر کے لیے رستگاری حاصل کرنے کا ایک بہانہ ضرور ہے، لیکن اس میں وہ لطافت اور لذتیت بھی نہیں، وہ نور و نغمہ کی فضا بھی نہیں جو اختر شیرانی کے یہاں شروع سے آخر تک ہر جگہ ملتی ہے، یہاں رنگ ہلکے ہیں پھیکے ہیں، ان میں جاذبیت نہیں، ان کی نوعیت دوسری ہے، یہ انسان کو بالکل محو اور گم نہیں بناتے، اس دنیا میں پہنچ کر انسان کشمکشِ حیات کو بالکل نہیں بھولتا، احساسِ زیاں اس کے دل سے فراموش نہیں ہوتا، وجہ یہی کہ ان جیسی نظموں میں خلوص نہیں، لطافت کی انتہا نہیں، تاثیر کی دولت نہیں، جو ہمیں اختر شیرانی کے یہاں اپنی بھرپور اور انتہائی حسین شکل میں ملتی ہے، جس سے بہتر کا شاید ہی تصور کیا جا سکے، یہ نظمیں ایک رومانی شاعر کے تجربات سے آگے نہیں بڑھتیں، کہیں کہیں کوئی نگینہ ان میں بھی جھلکتا اٹھتا ہے لیکن ایسے مقامات بہت کم آتے ہیں، اس قسم و قبیل کی تمام نظموں میں سطحیت، ہلکا پن، اور ذہنی بچپن ہے، نفسِ مضمون

میں کوئی جدت، کوئی نیاپن نہیں، خلوص کی روح نہیں، زندگی کا عرفان نہیں، یہ ہلکی پھلکی رومانیت اور نوجوانی کی سستی جذباتیت کی مثالیں ہیں اور بس۔

یہی تکنیک اور یہی ہیئت ان کی دوسری بہت سی نظموں میں ملتا ہے مثلاً جلوۂ سحر۔ فرصت کی تمنا میں، چاندنی سیر، برسات، کرشن کنہیا، طوفانی کشتی، بسنتی ترانہ، تاروں بھری رات وغیرہ (نغمہ زار میں) شہسوار کربلا، جاگ سوز عشق جاگ، پرانی بسنت، پریت کا گیت، سپنا، اندھی جوانی، نیندوں کی بستی، موت کا قافلہ، ہلال عید، میرا اسلام لے جا، (سوز و ساز میں) رت سنگیت، منجدھار، درشن درشن، اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے وغیرہ (تلخابۂ شیریں میں) یہی رنگ و آہنگ کارفرما ہے، ان کی ہیئت اور ان کی فضا گیتوں کی سی ہے، یہ عظمت اللہ خاں کے تجربوں کا ارتقائی مگر کچھ بدلا ہوا روپ ہے، ان میں غنائیت ہے، مدھرتا ہے، شیرینی ہے لیکن گمبھیرتا نہیں، نہ ان سے اس کی توقع کرنی چاہیے، بعض بعض مقامات دلپذیر و دلکش ہیں، ان میں محض رواں دواں موسیقی نہیں تاثیر کی آنچ بھی ہے ؎

قسمت کے آسماں پر سینائے کہکشاں پر
چمکا ترا ستارہ
اس در پہ حاضری کا تجھ کو ہوا اشارہ
اے بختیار بندے
اے کامگار بندے
تیرا مراد مندی تقدیر کی بلندی
تجھ کو پکارتی ہے
آبار یاب ہو جا
اے ذرۂ محبت جا آفتاب ہو جا
دربار میں چلا ہے
سرکار میں چلا ہے
رخت سفر اٹھالے اللہ کے حوالے
یثرب کے جانے والے
بس اک پیام لے جا میرا اسلام لے جا

لیکن ایسے مقامات بہت کم ہیں، زیادہ تر گانوں والا انداز ہے، مثلاً ان کی نظم "پریت کا گیت" گو نفس مضمون کے لحاظ سے اچھی کہی جا سکتی ہے لیکن اس کو گیت ہی کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں، کہیں کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ کی نظر محض قافیہ اور الفاظ پر رہتی ہے اور نفس مضمون یا موضوع کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

غالباً وہ قافیوں اور ہم آواز الفاظ کے ذریعے سے موسیقی پیدا کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس سے نظم یا گیت کے نفسِ مضمون کو صدمہ پہنچتا ہے، مثلاً۔

لباس ہے پھٹا ہوا غبار میں اٹا ہوا
تمام جسمِ نازنیں چھدا ہوا کٹا ہوا
یہ کون ذی وقار ہے، بلا کا شہسوار ہے
کہ ہزاروں قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہوا

پھٹا ہوا، اٹا ہوا، ڈٹا ہوا، سے نظم میں خوبصورتی اور خوشگوار فضا پیدا نہیں ہوتی، قاری کا ذہن قافیہ پیمائی کی طرف جاتا ہے اور زیادہ لطف حاصل نہیں ہوتا۔

حفیظ کے یہاں دو ایک ایسی نظمیں بھی ملتی ہیں جن میں سنجیدگی ہے، گہرائی ہے، فکر و خیال کی ندرت ہے، ایسی نظموں میں "تین نغمے" کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم ہر لحاظ سے اردو کی اچھی نظموں میں شمار ہو سکتی ہے، لیکن ارباب بصیرت نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، ان کی نظر میں وہ حفیظ کا رنگ نہیں، ان کا اصل رنگ گیتوں یا اس سے ملتی جلتی نظموں میں جھلکتا ہے لیکن میرے خیال میں اس قسم کی نظمیں بھی حفیظ کے زندہ رہنے میں بہت مدد دیں گی۔ لوگ ان کو پڑھیں گے، ان پر سر کم دھنیں گے واہ واہ اور سبحان اللہ کم کہیں گے، غور و فکر زیادہ کریں گے، لیکن ایسے مقامات حفیظ کے یہاں گنتی کے ہیں۔ اس کے ساتھ دو ایک نظموں کو اور شامل کر لیجئے، گیتوں نے غالباً انھیں مہلت ہی نہ دی کہ وہ ادھر متوجہ ہوتے اور اس قسم کے سنجیدہ اور بصیرت افروز نظمیں بھی لکھتے، یہی حفیظ کی فکری شاعری کی کل کائنات ہے باقی سب سیر و تفریح اور تفننِ طبع کا ذریعہ ہے، دل بہلانے کا سہارا ہے، "مجلس جمشید" کا "سرود" ہے۔

حفیظ کی ایک دوسری نظم "رقاصہ" بھی ایک زمانے میں بڑی مشہور تھی اور اب بھی لوگ اس کی طرف اشارے کرتے ہیں لیکن اس نظم میں وہ پُر لطف فضا اور موسیقی کا وہ آبشار نہیں جو ان کی دوسری نظموں اور گیتوں میں ملتا ہے، یہاں شاعر کا لہجہ تلخ ہے، اس کی آواز کڑوی اور بھرائی ہوئی ہے، وہ نظم میں جگہ جگہ بہکتا ہے۔ لیکن اس کے بہکنے میں مزہ نہیں، وہ اس میں واعظ اور ناصح بننا چاہتا ہے، وہ حالی کی طرح طنز و تلقین کا قدم اٹھاتا ہوا ملتا ہے اور ادب کو اخلاق پر قربان کر دیتا ہے نظم کی پوری فضا طنزیہ ہے، اس پر پند و موعظت کا رنگ مسلط ہے۔

اس میں شاعر نے ایک رقاصہ کی اس کے پیشہ کی وجہ سے مذمت کی ہے، وہ اس کو جلی کٹی سناتا ہے، اس کو للکارتا ہے، لیکن اس کے اسباب پر غور کرنے کی کوشش نہیں کرتا، وہ اس سے ہمدردی و محبت نہیں رکھتا وہ اس کی اصلاح نہیں چاہتا اس کو ذلیل و خوار سمجھتا ہے، اس کے زخموں کو بیدردی سے چھیڑتا ہے، اس کے زخموں پر نمک چھڑکتا ہے، وہ کہتا ہے ؎

سچ سچ بتا تو کون ہے او بے حیا تو کون ہے
احساس ماموستہ کیوں نہیں شرم اور غیرت کیوں نہیں

یہ پُرفسوں غمزے ترے نامحرموں کے سامنے
ہٹ سامنے سے دور ہو مردود ہو مقہور ہو
تقدیر کی ہیٹی ہے تو شیطان کی بیٹی ہے تو
جس قوم کی عورت ہے تو اس قوم پر لعنت ہے تو

وہ اس پر اور قوم تک پر لعنت بھیجتے ہیں، لیکن پھر وہی بات کہنا پڑتی ہے کہ وہ یہ نہیں سوچتے کہ وہ ایسی کیوں ہے، اس کے معاشی و معاشرتی اور تہذیبی اسباب کیا ہیں؟ وہ کس معاشرہ کی عورت ہے؟ کون سے اسباب اس کو ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں؟ بلکہ وہ اس کو سب و شتم کا نشانہ بناتے ہیں اور جذبات کی رو میں دشنام طرازی سے کام لیتے ہیں وہ اس کو تقدیر کی ہیٹی اور شیطان کی بیٹی کہتے ہیں، اس کو مردود و مقہور کہہ کر سامنے سے بھاگ جانے کی نصیحت کرتے ہیں، وہ اپنی نفرت کو محبت میں نہیں بدلتے، وہ اس کا حل دریافت نہیں کرتے، وہ قوم پر لعنت تو بھیجتے ہیں لیکن اس لعنت کو دور کرنے کی تدبیریں نہیں سوچتے۔ اس کے برخلاف قاضی عبدالغفار اور جذبی کے یہاں یہ جذبہ نہیں یہ انداز نہیں، وہ معاشرے کے اس زخم کو اس بے دردی سے نہیں چھیڑتے وہ اس کے مرہم کی تلاش کرتے ہیں، اس سے ہمدردی کی کوشش کرتے ہیں اس کے اسباب پر ان کی نظر پڑتی ہے اور پھر اس کی فلاح و بہبود کی راہیں بتاتے ہیں۔ قاضی عبدالغفار کی طوائف (لیلیٰ) اپنی زبان سے اپنی بربادیوں، عصمت فروشیوں اور غلط کاریوں کی ساری داستان بیان کرتی ہے، اس کے اسباب سے بحث کرتی ہے، مرد کی چیرہ دستیوں اور مذہبی ٹھیکیداروں یعنی گندم نما جو فروشوں کی کہانی سناتی ہے، وہ اپنے پیشے سے متنفر ہے لیکن ماحول سے مجبور ہے اس کی گمراہیوں اور غلط روی میں اس کے معاشرہ کا ہاتھ ہے، وہ سماج اور معاشرہ کا ایک زخم ہے، اس کو خود اس زخم کا احساس ہے وہ اپنے ماحول کے غول یا شکنجہ سے باہر آنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن آ نہیں سکتی۔ جب تک کہ معاشرہ اور سوسائٹی میں ترمیم و تنسیخ اور تغیر نہ ہو، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عورت کو اس کے وہ جائز حقوق دیئے جائیں جو اب تک سفاک دست مرد نے غصب کر رکھے ہیں، اور عورت کو چار دیواری کے بے رنگ و نور پنجرہ میں بند کر کے باہر کی ہر روشنی اور ہر برکت سے محروم کر دیا ہے۔ وہ حفیظ کی "رقاصہ" کی طرح ہی "مشرقی عورت" ہے، لیکن انتہائی روشن دماغ اور صاحب فراست حفیظ کہتے ہیں ؎

کیا مشرقی عورت ہے تو ہرگز نہیں، ہرگز نہیں
تیری ہنسی بے باک ہے تیری نگاہ چالاک ہے
اُف کس قدر دل سوز ہے تقریر بازاری تری
کتنی ہوس آموز ہے یہ سادہ پرکاری تری

لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے نہ اس کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "اس کی ہنسی کیوں بے باک ہے اور اس کی نگاہ کیوں چالاک ہے اور اس کی "تقریر بازاری" دل سوز کیوں ہے اور اس کی "سادہ پرکاری" کے "ہوس آموز" ہونے کی آخر وجہ کیا ہے؟"

جذبی نے بھی طوائف پر ایک چھوٹی سی خوبصورت نظم لکھی ہے ملاحظہ ہو۔

اپنی فطرت کی بلندی پہ مجھے ناز ہے کب — ہاں تری پست نگاہی سے گلا ہے مجھ کو
تو گرا دے گی مجھے اپنی نظر سے ورنہ — تیرے قدموں پہ تو سجدہ بھی روا ہے مجھ کو

تو نے ہر آن بدلتی ہوئی اس دنیا میں — میری پائندگیٔ غم کو تو دیکھا ہوتا
کلیاں بیزار ہیں شبنم کے تلون سے مگر — تو نے اس دیدۂ پُرنم کو تو دیکھا ہوتا

ہائے جلتی ہوئی حسرت یہ تری آنکھوں میں — کہیں مل جائے محبت کا سہارا تجھ کو
اپنی ہستی کا بھی احساس ہے اتنا احساس — کہ نہیں میری محبت بھی گوارا تجھ کو

اور یہ زرد سے رخسار پہ اشکوں کی قطار

مجھ سے بیزار، مری عرض وفا سے بیزار

لیکن یہاں فضا دوسری ہے۔ یہاں طوائف کا وہ تصور نہیں جو عام طور سے ملتا ہے۔ شاعر کی نظر میں طوائف حقیر نہیں بلکہ لائق ہمدردی و عزت ہے۔ شاعر دوسری نظر سے طوائف کو دیکھتا ہے، ہوس اور نفرت کے جذبے سے بلند ہو کر۔ کیوں کہ اس کے سامنے اس کے وجوہ اور نتائج ہیں، وہ بے سوچی سمجھی باتیں نہیں کرتا، طوائف کو معاشرہ یا سوسائٹی کا داغ نہیں بتاتا۔ اس کی قدر کرتا ہے، اس کے پیشے کی نہیں۔ لیکن حفیظ نے رقاصہ کی بے باکی اور بے حیائی کا سبب سماج کے نظام میں تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، اخلاقی گراوٹ کو اگر حفیظ دوسرے سماجی مسائل سے الگ تھلگ مسئلہ تصور کرتے ہیں تو یہ محض کوتاہ بینی ہے۔

"رقاصہ" کے متعلق حفیظ کا نظریہ (CONCEPTION) از اول تا آخر مولویانہ ہے جو نئی روشنی اور جدید دور کے سماج میں عورت کے حقوق اور مقام سے قطعاً ناواقف اور نابلد ہونے کا نتیجہ ہے، جوش کی "خاتونِ مشرق و خاتونِ مغرب" نظموں کی روشنی میں (جو بقول خود ان کے میرے ایام جاہلیت کی پیداوار ہیں، جب میں عورت کو محض جوانی کی نظر سے دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اب عورت کے متعلق میرا نظریہ وہ نہیں) ان پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ عورت ان کے یہاں محض مرد کی لذت اندوزی کا ایک ذریعہ ہے اور وہ اس کی تعلیم کو اس کے نرم و نازک شانوں پر ایک بار تصور کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ علم کی وجہ سے اس کے سینہ میں "محبت کا چراغ" گل ہو جائے گا وغیرہ۔ لیکن حفیظ تو مشرقی عورت کے باب میں جوش سے کئی قدم اور آگے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ؂

وہ حسن کی شہزادیاں — پردے کی ہیں آبادیاں
چشم فلک نے آج تک — دیکھی نہیں ان کی جھلک

سرمایۂ شرم و حیا — زیور ہے ان کے حسن کا
شوہر کے دکھ سہتی ہیں وہ — منہ سے نہیں کہتی ہیں وہ
کب سامنے آتی ہیں وہ — غیروں سے کٹ جاتی ہیں وہ

اعزاز ملت ان سے ہے — نام شرافت ان سے ہے
اسلام پر قایم ہیں وہ — پاکیزہ و صائم ہیں وہ

عورتوں کے متعلق ان کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ مشرقی عورت کو پردے میں رہنے کی اس حد تک کہ "چشم فلک" بھی ان کی جھلک نہ دیکھ سکے اور وہ گھر کی چہار دیواری میں بند رہیں اور منہ سے اُف بھی نہ کریں، تلقین کرتے ہوئے حفیظ اور مسجد کے ملا میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ مشرقی عورت کے متعلق ان کے خیالات اور ایک رجعت پسند مولوی کے خیالات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حفیظ صاحب کو شاید علم نہیں کہ زمانہ کتنا آگے بڑھ چکا ہے اور مشرقی عورت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے، پھر لطف یہ کہ ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ ؎

چشم فلک نے آج تک — دیکھی نہیں ان کی جھلک
لب سامنے آتی ہیں وہ — غیرت سے کٹ جاتی ہیں وہ

اور دوسری طرف اپنے اور اپنے خاندان کی ہر طرح کی کھلی ڈھکی تصویریں بھی طشت از بام فرما دیتے ہیں۔ "افکار" کے "حفیظ نمبر" میں جیسی تصویریں شامل ہیں ان کو دیکھ کر اس دلچسپ تضاد کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

غرض کہ اس نظم میں کوئی خاص بات نہیں، کوئی نئی بات نہیں، بلکہ یہ نظم حفیظ کے رجعت پسند خیالات کی ترجمان ہے، اس میں وہ موسیقی اور ترنم کا آبشار بھی نہیں جس کی وجہ سے حفیظ ہمیشہ مشاعرہ لوٹ لیتے تھے۔ اس نظم کے مطالعے سے ان کے سماجی شعور پر روشنی پڑتی ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نظریات و تصورات کیا ہیں؟ ان کے نظریات میں جامعیت اور تنوع نہیں، بلندی و گہرائی ناپید ہے۔

مختصر یہ کہ حفیظ اپنے نظریات اور تصورات کے لحاظ سے دوسرے گروپ کے شعراء سے بھی پیچھے ہیں، نظریات و تصورات میں جو کچھ تغیر ہوا ہے وہ اس سے یا تو واقف نہیں ہیں یا ان پر غور نہیں کرتے، ان کا مطالعہ نہ وسیع ہے نہ گہرا، انھوں نے اپنے ذہن کی کھڑکیوں کو زمانہ کی تازہ ہواؤں کی رو پر کھلا نہیں رکھا، سماجی شعور کی جھلکیاں ان کے یہاں بس کہیں کہیں ہی ملتی ہیں وہ بھی انتہائی مبہم و غیر متعین و غیر منظم۔ وہ اپنے گیتوں اور اپنی مخصوص غنائیت و موسیقیت کے باوجود نفس مضمون و مواد کے اعتبار سے جوش، سیماب اور جمیل مظہری کجا، احسان دانش کے مقام تک بھی نہیں پہنچے۔ ان کے یہاں نہ موضوعات کا تنوع ہے نہ مشاہدات کی رنگارنگی و بوقلمونی۔ حیات و کائنات کے مسائل نے انھیں پریشان نہیں کیا ہے کیوں کہ وہ ان کے موضوعات میں نہیں جھلکتے۔ ان کے یہاں زندگی اور اس کے مسائل کی کشمکش شاذو نادر ہی ملتی ہے۔ وہ ایک ہلکے پھلکے رومانی یا غنائی شاعر ہیں۔

حفیظ کے "شاہ نامہ" کا بھی ایک زمانہ میں بڑا چرچا اور دھوم دھام رہی ہے، اور آج بھی حفیظ کا نام آتے ہی ان کے گیتوں کی طرف پہلے دھیان نہیں جاتا بلکہ "شاہ نامہ" کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے، بعض لوگ "شاہ نامہ" کو حفیظ کا بڑا کارنامہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے اسلام کی تاریخ کو اشعار کا جامہ پہنایا ہے، یا اشعار میں محفوظ کر دیا

ہے، جوشؔ نے اس سے بہت پہلے ہی کہا تھا ؎

واقف بھی ہے آئینِ تعمق کیا ہے — دستورِ تناسب و تطابق کیا ہے
اسلام کا شاہنامہ لکھنے والے — اسلام کو شاہی سے تعلق کیا ہے

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہنامہ میں کون سی خاص بات یا کون سی ایسی خصوصیت ہے جس سے شاعری کو فائدہ پہنچا ہو، یہ ضرور ہے کہ اسلامی تاریخ کے بہت سے گوشے اور بہت سے پہلو نظم ہو گئے لیکن اس سے شاعری میں کون سا اضافہ ہوا اس کو منظوم کلام کہا جا سکتا ہے، اس میں شعریت کا فقدان ہے اور ظاہر ہے کہ محض کسی واقعہ کو نظم کر دینے سے "شاعری" ہاتھ نہیں آجاتی، یہ تو ہر تک بند اور معمولی درجے کا شاعر بھی کر سکتا ہے کہ واقعات کا نقشہ اس کے سامنے ہو، اور وہ اس میں اشعار سے رنگ آمیزی کرتا جائے، یہ کوئی بڑی یا قابلِ ذکر بات نہیں، اگر یہ معیار رکھا جائے تو پھر شاہ نصیر، ذوق، اور ناسخ کے کلام کو یا اس کے علاوہ اردو کے ہزاروں اشعار کو پسندیدگی کا فتویٰ کیوں نہیں دیا جاتا؟ اس لیے کہ ان میں بھی وزن ہے، قافیے کی پابندی ہے، محاورات اور روزمرہ کا ذخیرہ ہے، مترادفات کا انبار ہے، رعایت لفظی ہے۔ وغیرہ — اقبال نے ایک جگہ کہا ہے کہ ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر — نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

"خونِ جگر کی نمود" شاعری میں مشکل سے پیدا ہوتی ہے۔ "شاہنامہ" میں "خونِ جگر کی نمود" نہیں ملتی، مجنوں صاحب کے بقول "اس میں مصرعے گنے ہوئے ہیں"۔ شاہنامہ میں سر تا سر آورد ہے۔ وہ اول سے لے کر آخر تک ایک کاوش ہے اور کاوش بھی ایسی جو ہر جگہ نمایاں ہے، حفیظ شاہنامہ میں ایک COMPOSER کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ ان کو "ادبی شاعر" (LITERARY POET) کہا جا سکتا ہے، نگارشِ سخن اپنے صناع کے لیے شاعر کے خونِ دماغ سے زیادہ "خونِ دل" کا خراج مانگتی ہے، اسی لیے ملٹن نے کہا تھا کہ "ہر اچھا ادب کسی بڑے فنکار کا خونِ جگر ہوتا ہے" شاعری احساسات و جذبات کی زبان ہے لیکن شاہنامہ میں جذبات کی دھمک محسوس نہیں ہوتی۔ شاہنامہ کے اشعار میں نہ تازہ کاری پیدا کر سکا ہے اور نہ لالہ کاری۔ یہاں وہ موسیقیت اور شیرینی نغمگی بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے جو ان کی بعض نظموں اور گیتوں کو تازہ کاری اور دلآویزی عطا کرتی ہے۔ یہاں موسیقی کا آہنگ نہیں بلکہ نثر کا سپاٹ پن اور خشکی و بے کیفی غالب ہے، وہی بے کیفی جو نثر میں سرسید کے یہاں ملتی ہے، جیسے ڈاکٹر عبداللہ نے ان کی نثر کو "بدویانہ نثر" کہا ہے، اس نسبت سے حفیظ کی شاہنامہ والی نظم کو "بدویانہ نظم" کہہ سکتے ہیں، اس میں تاثر نہیں شعریت نہیں۔ تخیل، فکر اور جذبہ کی ہم آمیزی کے بغیر شعریت پیدا نہیں ہو سکتی، بات کو بعض خاص تفصیلات کے ساتھ سوچ سمجھ کر پہلودار انداز سے کہنا ہوشیاری یا فنکاری کی دلیل ہو سکتی ہے لیکن اس سے وہ کیفیت نہیں پیدا ہو گی جس کے لیے کہا گیا ہے کہ "از دل خیزد و بر دل ریزد" — یا

"کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست"

شاہ نامہ کے اشعار میں نہ "از دل خیزد و بر دل ریزد" کی خصوصیت ہے، نہ وہ (باشتنائے چند) "دامنِ دل" کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، ایسے مقامات بس دو چار ہی ملتے ہیں جن کو پڑھ کر دل کی محفل سے صدائے تحسین بلند ہو، مثلاً "سلام اے آمنہ کے لال اے محبوبِ سبحانی" الخ یا "سلام اس پر بریں کو بھی کہا جس نے کہ سب تیرا ہیں" الخ یا دو چار دوسرے مقامات۔ لیکن مجموعی تاثر قاری کے ذہن پر اچھا قائم نہیں ہوتا۔ اس قسم کے حصّوں یا بعض اشعار کے علاوہ شاہ نامہ عموماً شعریت سے معرا ہے اور اس کا عام رنگ و انداز تقریباً کچھ ایسا ہے ؎

صف آرا تھے احد میں آج تین اقسام کے انساں — شریف انسان، خبیث انسان، نمود و نام کے انساں
بظاہر تو یہ انساں ایک ہی آدم کے پوتے تھے — مگر ان سب کے باطن تین پر تقسیم ہوتے تھے
عجب اعمال تھے ان کے عجب تھیں نیتیں ان کی — اثر انداز ہیں تاریخ پر شخصیتیں ان کی
یہی طبقہ ہے آزادی پسند انساں کا دشمن — یہی ایمان کا لاگو، یہی ہے جان کا دشمن
تپاک باہمی ان کا برائے خواجہ تاشی ہے — کہ یہ سب ایک ہیں، مقصود سب کا بد معاشی ہے
یہ جس قریے میں، جس خطے میں، جس مملکت میں ہیں — تمنائے حصولِ اقتدار و سلطنت میں ہیں
بناتے ہیں یہ مل جل کر ادارہ خانہ دز دی کا — مہیت بھاری عظیم الشان بے باکانہ دز دی کا

یہ چند اشعار ہیں لیکن شاہ نامہ کا عام رنگ یہی ہے، یہی طرز ہے، یہی لے ہے جو شروع سے آخر تک جاری و ساری ہے، یہ منظوم کلام ہے، اس کو شعریت سے کوئی علاقہ نہیں، اس میں "تاثیر" نہیں "خونِ جگر" کی نمود نہیں۔ اس میں ذہنی ورزش ہے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ شاہ نامہ دل سے نہیں دماغ سے لکھا گیا ہے۔ یہاں مثالوں سے قطع نظر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انیس کے مرثیوں، اقبال کے شکوہ، جواب شکوہ اور جوش کی "حرفِ آخر" کے ساتھ "شاہ نامہ" کا مطالعہ کیجیے، شعریت و غیر شعریت کا فرق اور معیار آئینہ ہو جائے گا۔ غالباً اسی وجہ سے مولانا ضیا احمد [illegible] نے اس کو "اردو کی دوم درجے کی نظم" کہا ہے۔ مولانا نے مروّت سے کام لیا ہے ورنہ یہ "دوم درجے کی نظم" بھی نہیں۔ اقبال سے کسی نے شاہ نامہ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ "ہاں بچوں کے لیے اچھی ہے۔" اسی سے ملتی جلتی ایک بات اور سن لیجیے، ایک زمانے میں حفیظ صاحب اقبال کی تقلید و تتبع میں مراق کی حد تک مبتلا تھے اور یہ تقلید شاعری کے سلسلے کر ان کے بود و ماند پر بھی حاوی ہو گئی تھی، انہی کی طرح رہتے تھے، ویسا ہی پہنتے اوڑھتے تھے، وہی انداز و وضع اختیار کی تھی جو اقبال سے مخصوص تھی، اپنی کتابیں بھی اقبال کی کتابوں کی طرح اسی سائز میں اور اسی طرز پر چھپواتے تھے اور سر عبدالقادر سے ان پر مقدمے بھی لکھواتے تھے، گویا ان کو بالکل اقبال بننے کا شوق تھا، اسی اثنا میں ایک بار وہ بیمار ہوئے، مرض کی تشخیص و تدارک کے لیے اقبال کے معالج شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی سے رجوع کیا، انھوں نے نسخہ لکھ دیا، حفیظ صاحب نے کہا کچھ پرہیز بتا دیجیے، انھوں نے کہا "زیادہ دماغی کام نہ کیجیے گا۔" حفیظ صاحب نے کہا "میں تو شاہ نامۂ اسلام لکھ رہا ہوں۔" اس پر انھوں نے فرمایا کہ "خیر اب ہلکا پھلکا کام کرتے رہیے۔ کوئی فلسفیانہ کام نہ کیجیے گا۔"

شعریت کے فقدان کے ساتھ "شاہنامۂ اسلام" فنی نقائص اور معنی و بیان کی غلطیوں سے بھی مبرا اور پاک نہیں ہے، غلطی کس سے نہیں ہوتی، غلطی ہونا لازمۂ بشریت ہے، لیکن شاہنامہ میں اغلاط کی افراط کی وہی حالت ہے جو دبستانِ لکھنؤ کے ایک دور میں خصوصاً امانت وغیرہ کے یہاں ایہام و ضلع جگت کی تھی، ہر قسم و قبیل کی اس قدر غلطیاں ملتی ہیں کہ بعض اوقات ان کو پڑھ کر انتہائی کوفت ہوتی ہے۔ لہٰذا فنکاری و صناعی کے لحاظ سے بھی اس نظم کا کلمہ نہیں پڑھا جا سکتا، اس میں "گلزارِ نسیم" کی طرح اگر یہی خوبی ہوتی تو شاید یہ ادب میں زندہ رہ جاتی۔

پھر ایک بات اور ہے جو بہت اہم ہے ـــــ اور وہ یہ کہ "شاہنامۂ اسلام" کی مکمل و مفصل تاریخ نہیں، اس میں خاص خاص گوشوں اور پہلوؤں کو لیا گیا ہے، بعض جگہ بات ادھوری اور بے ربط رہ گئی ہے، بعض بیانات تشنہ ہیں اگر کوئی غیر مسلم اس کا مطالعہ کرے تو وہ بعض غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتا ہے، بعض باتیں مبہم ہیں، اجمال و اختصار نے شاعر کو تاریخ نویسی کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے نہیں دیا، وہ تفصیلات میں نہیں جاتا، سیدھا سا آسان راستہ.. (SHORT CUT) اختیار کرتا ہے، لیکن اس سے تاریخ نامکمل رہ جاتی ہے، زنجیر کی بہت سی کڑیاں غائب ہو جاتی ہیں، ابہام اور دھندلکے کی فضا پیدا ہوتی ہے، جا بجا ذہن تشنگی محسوس کرتا ہے ـــــ فردوسی نے رستم و سہراب کی اتنی مختصر سی داستان کو اتنا پھیلا کر بیان کیا ہے کہ ایران کی تہذیب و معاشرت سوسائٹی و حکومت، رزم و بزم کا شاید ہی کوئی پہلو اور گوشہ چھوٹا ہو، اگرچہ فردوسی کو بہت سے واقعات و حادثات خود ذہن سے گڑھنا پڑے ہیں، اس کے سامنے لکھا لکھایا تاریخ کا دفتر موجود نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے جزئیات کو نہیں چھوڑا، جتنا مواد اور ذخیرہ فراہم کر دیا ہے اس کو دیکھ کر حیرت اور تعجب ہوتا ہے ـــــ لیکن "شاہنامۂ اسلام" کے مولف کے سامنے تو یہ دقت بالکل نہ تھی، موافقین و مخالفین و صحابہ و ائمہ کی لکھی ہوئی سیکڑوں تاریخیں، تذکرے، حدیثیں، خطبات اور دوسری کتابیں ملتی ہیں جن میں واقعات آئینہ کی طرح صاف اور واضح ہے، ہر گوشہ، ہر پہلو، ہر موڑ بے نقاب ہے، کہیں ابہام یا گنجلک نہیں ہر چیز موجود ہے، پھر اس اختصار و اجمال کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ضروری امور کو تشنہ و نامکمل اور بے ربط چھوڑ کر آگے بڑھ جانے کا سبب معلوم نہیں ہوتا ـــــ فردوسی نے قطرہ کو بہ بسط دریا کر قلزم کر دکھایا ہے لیکن حفیظ صاحب نے قلزم کو وہ اختصار عطا کیا کہ کوزے میں بند کر دیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ فردوسی کے پاس مواد کم تھا مگر اس نے اپنی قوت اختراع زورِ بیان اور قادر الکلامی سے اسے بڑھا چڑھا کر اتنے وسیع پیمانے پر پیش کیا ہے کہ پایدو شاید۔ اور ہمارے "شاہنامہ" کے مصنف نے اسلام کی اتنی وسیع اور طویل و عریض تاریخ کو اپنی کم گوئی کے باعث اتنا گھٹا کر پیش کیا کہ بعض ضروری اور اہم پہلوؤں کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور ان سے صرفِ نظر کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مذہب پر ان کی کوئی نظر نہیں ہے، ان کے مذہبی معلومات برائے نام ہے، انھوں نے کچھ کتابیں اس سے متعلق دیکھی ہوں گی، ظاہر ہے کہ اسلام کی مفصل تاریخ نظم کرنے کے لیے یہ چند (؟) کتابیں کام نہیں دے سکتیں، اس کے لیے مذہبیات کا عالم ہونا ضروری ہے، مذہبیات کا مکمل و مستقل مطالعہ درکار ہے۔ عربی، انگریزی، اردو وغیرہ میں جتنی کتابیں مذہب پر لکھی گئی

ہیں یا جتنی کتب احادیث وغیرہ موجود ہیں ان سب پر یا بیشتر پر گہری نظر ہونا ضروری ہے، اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ حفیظ نہ تو عالم ہیں، نہ ان کا مبلغ علم وسیع اور گہرا ہے، ان کی تعلیمی حیثیت بھی کچھ نہیں، اس کے علاوہ ان کا ذاتی مطالعہ (؟) بھی قابل اعتبار نہیں، پھر جہاں تک مذہب کے مطالعہ کا تعلق ہے یہاں ان کا مطالعہ اتنا بھی نہیں جتنا شعر و شاعری کا ہے لہٰذا فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ "شاہ نامہ اسلام" کی ترتیب و تصنیف کے وقت ان کو کیا دقتیں نہ پیش آئی ہوں گی، اور ان کی "شاہ نامہ کی شاعری" نے کن سرچشموں سے غذا حاصل کی ہوگی؟ مجنوں صاحب کے بقول "انھوں نے ایسی چیز کو ہاتھ لگایا جس میں مطالعہ کی ضرورت تھی مگر شاہ نامہ میں صرف سنی سنائی باتیں ہیں۔"

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ شاعر میں قادر الکلامی اور زور بیان کی کمی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زیادہ طویل و بسیط واقعات کے لکھنے پر قادر نہیں، اس کو اتنی قدرت نہیں کہ وہ اس کو طویل نظم میں ادا کر سکے اور شعریت بھی قائم رہے، اس سے اس کے پیدائشی شاعر ہونے کا پتہ چلتا ہے، وہ کوئی ایسی طویل نظم لکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جس میں جھول بھی راہ نہ پائے اور شعریت و تاثیر بھی فنا نہ ہو!

شاہ نامے کا ذکر کے اختتام سے پہلے ایک واقعہ سن لیجئے جو اب لطیفے کی شکل اختیار کر گیا ہے، ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حفیظ صاحب ایک کانفرنس میں اپنی شاعری اور اپنے نقطۂ نظر کے بارے میں لکچر دے رہے تھے اور شاعری کی فلسفیانہ حیثیت پر اس طرح زور دے رہے تھے جیسے کوئی فلاسفر اپنے خیالات کی تشریح کرے کہ میرے یہاں ایک فلاسفی، ایک پس منظر ہے اس کو سمجھ لینا چاہیئے، ورنہ میرا کلام سمجھا نہ جا سکے گا، اتفاق سے منٹو بھی ادھر آ گئے اور انھوں نے حفیظ صاحب کے اس لکچر کو سن کر کہا "خاں صاحب آپ کا ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آیا، معلوم نہیں اس میں کیا فلسفہ ہے" حفیظ صاحب نے کہا کہ کونسا شعر؟ منٹو نے یہ شعر پڑھا ؎

یہ لڑکا جو کر بیٹھا ہے یہ لڑکی جو کر بیٹھی ہے ۔۔۔ یہ پیغمبر کا بیٹا ہے وہ پیغمبر کی بیٹی ہے

حفیظ صاحب یہ سنتے ہی خاموش ہو گئے، اس واقعہ سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ حفیظ کے سادہ سپاٹ کلام خصوصاً شاہ نامہ میں کسی گہرائی و گیرائی یا کسی نقطۂ نظر کی تلاش سعیِ لاحاصل کے مترادف ہوگی۔

حفیظ نے اپنی شاعری کے ہر دور میں غزلیں بھی لکھی ہیں، جو ہر مجموعہ میں شامل ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ ان کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی یا نظم سے؟ ———— تاہم جو غزلیات مطبوعہ شکل میں ہم تک پہنچی ہیں انھیں کے پیش نظر کچھ کہنے کی کوشش کی جائے گی۔

جس طرح غزلوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اسی طرح موضوعات کی رنگا رنگی اور بوقلمونی بھی نظر نہیں آتی سیاست و فطرت اور فلسفہ و حکمت کا ان کی غزلوں میں گزر نہیں، بس وہی موضوعات ہیں جو عموماً ہر غزل گو شاعر کے یہاں ملتے ہیں، یعنی حسن و عشق، بہار و شباب، شیخ و محتسب، گل و بلبل، ہجر و وصال، گلشن و صحرا، جام و شراب جنوں و ہوش، جبر و اختیار، مرگ و زیست، شام و سحر، قفس و آشیاں وغیرہ۔ یہی باتیں گھما پھرا کر روایتی

انداز اور رسمی طریقہ سے ادا کی گئی ہیں، یہاں (SYMBOLISM) کا گزر نہیں۔ قفس سے مراد "پنجرا" اور آشیاں سے مراد "گھونسلا" ہی ہے۔ ان سے تازگی کی خوشبو نہیں آتی، ان کا طرز اور خیالات دونوں باسی ہیں۔

حفیظ نے اپنی ایک غزل میں کہا ہے کہ

" انداز مرے سب سے جدا ہیں کہ نہیں "

یہ دعویٰ انھوں نے اپنی غزلوں کے متعلق کیا ہے، جو صحیح نہیں، انھوں نے اپنی غزلوں میں جو مضامین بیان کیے ہیں وہ سب کے سب تقریباً روایتی ہیں۔ ان میں نہ فکر و خیال کی جدت و ندرت نظر آتی ہے نہ اسلوب بیان کی تازگی اور طرفگی، وہ رسیلا پن، ترنم ریز انداز بھی نہیں جو ان کی بعض نظموں یا گیتوں میں ملتا ہے، یہ بات میں ان کی سب غزلوں کے پیش نظر کہہ رہا ہوں، ویسے دس بیس شعر تو ہر شاعر کے یہاں نکل آتے ہیں لیکن اس کے کلام کے مجموعی تاثر اور مخصوص افتادِ طبع سے اس کی شاعری پر کوئی حکم لگایا جاتا ہے ـــــ حفیظ نے غزل میں اپنے لیے کوئی راہ یا کوئی "اسلوبِ سخن" نیا نہیں نکالا، وہی باتیں کہی ہیں جو ہزاروں بار طرح طرح سے کہی جا چکی ہیں۔ غزل میں جذبات میں ڈوب کر بات کہنے کی جو ضرورت ہے اس سے حفیظ کی غزلیں عموماً خالی ہیں، ان میں سپردگی و والہانہ انداز نہیں ملتا، ان کے یہاں نشتر نہیں ملتے۔ ایک دوسری غزل میں حفیظ کہتے ہیں ؎

کیا پابندِ نَے نالے کو میں نے　　یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

ــ یہ بھی نرا دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ ان کی غزلوں میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ملتی، ایسی کوئی خصوصیت بھی نہیں جسے خاص انہی کی ایجاد کہا جا سکے، جذباتِ دل کو وہ "پابندِ نَے" نہیں کر سکے ہیں، یہ تغزل کی موجوں پر خالی سیپیوں کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی غزلوں کا مجموعی تاثر نشاطیہ اور طرب انگیز ہے، البتہ کہیں کہیں لکھنؤ کے غزل گو شعرا کی وہ خصوصیت ضرور ملتی ہے جس کو ہم "مرثیت" کہہ سکتے ہیں، ناسخ و آتش اور ان کے شاگردوں نے غزل کو لفظی شعبدہ بازی یعنی فنکاری کا ذریعہ بنا لیا تھا، اور ابتذال بھی غزلوں میں راہ پا گیا تھا، شعرائے لکھنؤ اعضائے محبوب، لباس، زیور اور آرائش و زیبائش کی خارجی اور مصنوعی تفصیلات رقم کرتے تھے، اور ان پر فخر کرتے تھے، شاعری میں یہ عمل دخل تقریباً امیر و جلال کے عہد تک قائم رہا، اس کے بعد لکھنوی شعرا نے اس داغ سے بچنے کے لیے دوسری راہ نکالی، اور وہ یہ کہ غزل میں "سوز و گداز" پیدا کرنے کے لیے تربت، نزع، لاشہ، گورِ غریباں، مزار، بالیں، دہائیاں، دکھڑے، ہائے توبہ وغیرہ مصنوعی مضامین کا نسخہ استعمال کرنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ "سوز و گداز" جیسی لطیف کیفیت تو کیا پیدا ہوتی "مرثیہ" کا بین والا انداز ضرور پیدا ہو گیا۔ اسی زمانے میں تقلیدِ غالب کا رجحان پیدا ہوا، اور شعرائے لکھنؤ نے غالب کی پیروی شروع کی لیکن یہ پیروی محض الفاظ و تراکیب تک محدود تھی، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محض "سعادت مندانہ فرضِ تقلید" ادا کیا جا رہا ہے، اسی اندھی تقلید کے ردِ عمل اور ضد نے یگانہ کو "غالب شکنی" پر آمادہ کیا، حفیظ بھی شعرا کی اسی "نزع و ماتم" والی کیفیت سے متاثر نظر آتے ہیں، ان کے یہاں بھی "بیمارِ غم" رات کو ایڑیاں رگڑتا اور تڑپتا ہوا ملتا ہے، اور کئی بار

عالم سکرات سے گزرتا ہے۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام (نغزار) میں ایسے اشعار کافی ہیں جن میں لحد، تربت، نزع، بالیں جنازہ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے اور وہ اشعار سب کے سب بے کیف و بے مزہ اور مصنوعی ہیں، محض رونے دھونے یا موت و نزع کے تذکرے سے کلام میں اثر پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں اصلیت اور خلوص کی جھلک نہ ہو، لیکن حفیظ کے یہاں اس قسم کے اشعار میں نہ تو کوئی کیفیت ہی ہے، اور نہ خلوص و تاثیر انھوں نے زبردستی "نالہ" کو "پابند نے" کیا ہے، ذیل کے اشعار سے اس دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے ؎

اب خاک اڑا ئیے نہ ہمارے مزار کی — اب خاک بھی نہیں ہے ہمارے مزار میں
چھوڑ بھی یہ سلسلۂ او نامراد انتظار ٭ موت بیٹھی ہے ترے بالیں پہ اکتائی ہوئی
عبرت فزا ہے گور غریباں کی بے کسی ٭ میری نظر کے سامنے میرا مآل ہے
آ ہی گیا وہ مجھ کو لحد میں اتارنے ٭ غفلت ذرا نہ کی مرے غفلت شعار نے
غضب تھا وہ مریض غم کی حالت کا بدل جانا ٭ وہ رو دینا کسی نامہرباں کا مہرباں ہو کر
ہاں سنو میرا فسانہ، ابھی قائم ہیں حواس ٭ کوئی دم میں ہیں یہ اوراق بدلنے والے
اپنے بیمار کی یہ آخری امید بھی دیکھ ٭ ملک الموت سے کہتا ہے مسیحائی کر
بیمار غم مسیح کو حیران کر گیا ٭ اٹھا، جھکا، سلام کیا، گر کے مر گیا
اے میرے رونے والو خدارا جواب دو ٭ وہ بار بار پوچھتے ہیں کون مر گیا
مسیحا کو نہ آنا تھا نہ آئے ٭ قضا آئی قضا نے مار ڈالا
وقت رخصت مری آنکھوں کی سفیدی پہ نہ جا ٭ چہرۂ صبح کو دیکھو تو کہیں نور بھی ہے
اٹھو کے بالیں سے مرے دفن کی تدبیر کرو ٭ نبض کیا دیکھتے ہو نبض میں کیا رکھا ہے
حال میرا نزع تک نوحۂ دگر ہوتا گیا ٭ نوحہ گر ہوتا گیا، جو چارہ گر ہوتا گیا
درد دل کہتا گیا میں اور وہ سنتے گئے ٭ حلق ادھر خشک اور ادھر رومال تر ہو گیا
ٹوٹے تو موت ہی سے یہ ٹوٹے گا سلسلہ ٭ ورنہ شب فراق کی رسی دراز ہے
کچھ سمجھ دار تو ہیں نعش اٹھانے والے ٭ لے چلے ہیں مجھے اس راہ گزر سے پہلے
انگڑائی لے رہا ہے بیمار غم کسی کا ٭ پر تل رہے ہیں، گویا اڑنے کو مرغ جاں کے
بیمار غم کی پوچھتے ہو سرگزشت کیا ٭ اک آہ کی غریب نے اور دم ہوا ہوا
وہ سوز آتے ہیں سر وں بیٹھ کر آنسو بہاتے ہیں ٭ الٰہی کون فتنہ اٹھے گا میرے مدفن سے
کس نگاہ گرم سے دیکھا ہے اس نے وقت قتل ٭ آہ ٹھنڈی پڑ گئی، دم گھٹ گیا فریاد کا

سرور صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے :۔ "حفیظ کی غزلیں اچھی نہیں ہیں، نظمیں البتہ اچھی کہتے ہیں"۔ ان کی

نظموں اور گیتوں میں سے بعض خاص نظموں کا تجزیہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان کی غزلیں سطحی ہیں اور بے کیف ہیں، ان میں سوز و ساز ہے نہ خونِ جگر کی نمود۔ ظاہر ہے کہ غزل کے لیے "خونِ جگر" کی کتنی ضرورت ہے، حالی نے کہا ہے ؎

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

غزل میں دروں بینی، سپردگی، رقت اور غم میں ڈوب کر بات کہنے کی بڑی اہمیت ہے۔ اس میں جذبے کی فوری عکاسی بنیادی چیز ہے، ذہن و قلب کی تہ در تہ گہرائیوں میں جذبات کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں، شاعر میں اتنی قدرتِ بیان ہونا چاہیے کہ وہ ان امواجِ مضطرب کو خیال کے سانچوں میں ڈھال کر جذبات و احساسات کی قدِ آدم تصویریں بنا سکے۔ لیکن حفیظ کے یہاں یہ بات نہیں، اُن کا ایک شعر ہے ؎

دیکھا نہ کاروبارِ محبت کبھی حفیظؔ
فرصت کا وقت ہی نہ دیا کاروبار نے

اس سے واضح ہے کہ ان کو "کاروبارِ محبت" سے کبھی سابقہ نہیں پڑا، اس لیے ان کو کوئی تجربہ نہیں، انھوں نے جو "حدیثِ لب و رخسار" بیان کی ہے وہ صداقت و تاثیر سے معرا ہے، اس میں خلوص نہیں، اثر نہیں، کیفیت نہیں، دلکش نغمگی نہیں، یہ کاغذی پھول ہیں۔ "کاروبارِ دہر" نے انھیں فرصت کا وقت ہی نہ دیا کہ وہ محبت جیسی "شیریں دیوانگی" سے کبھی آشنا یا لذت گیر ہو سکتے۔ اسی لیے ان کا تغزل پھیکا اور بے مزہ ہے، اس میں کیف نہیں، محبت کا عرفان نہیں، دل کی دھڑکنیں اور ان کی آنچ نہیں، وہ "برائے شعر گفتن" کا مصداق ہے، ان کی غزلوں کا سرمایہ یوں ہی بہت قلیل ہے لیکن غزل کے اصل موضوع کے اس طرح نکل جانے کے بعد اب ان کی غزل کے کیسہ میں باقی بھی کیا بچتا ہے، جام و شراب اور باغ و بہار ـــــ اہلِ بصیرت اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پھر اس حصۂ غزل میں کیا خوبی و وزن یا کونسی کیفیت ملے گی؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ ان کے یہاں "کام و دہن" کا عنصر بھی غالب نہیں کہ جس کے باعث وہ "خوش باش" کے نظریہ کے حامل کہے جا سکتے ہیں۔ ان کی غزلیں رسمی اور روایتی غزلیہ شاعری کی مثالیں ہیں۔

ذیل میں حفیظ کے تینوں مجموعوں (نغمہ زار۔ سوز و ساز اور تلخابۂ شیریں) سے دو دو غزلیں درج کرتا ہوں جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے "نالے کو پابندِ نے" کیا اور ان کا انداز سب سے جدا ہے، کہاں تک صحیح اور قابلِ قبول ہے؟ یہ غزلیں افکار کے "حفیظ نمبر" کے انتخاب سے پیش کی جا رہی ہیں اور یہ انتخاب خود انھی کے قلم کا مرہونِ منت ہے۔

(۱)

وہ ہوئے پردہ نشیں انجمن آرا ہو کر — رہ گیا میں ہمہ تن چشمِ تمنا ہو کر
حسن نے عشق پہ حیرت کی نگاہیں ڈالیں — خود تماشا ہوئے ہم محوِ تماشا ہو کر
آنکھ کم بخت سے اس بزم میں آنسو نہ رکا — ایک قطرے نے ڈبویا مجھے دریا ہو کر
کوئی ہمدردِ محبت کا مداوا کر دے — ملک الموت ہی آ جائے مسیحا ہو کر
کچھ تعجب نہیں کعبے میں اگر جی نہ لگے — آئے ہیں ہم طرفِ دیر و کلیسا ہو کر

رنگ و روغن پہ نگاہیں نہ کبھی للچائیں · مجھ کو دنیا نظر آتی رہی دنیا ہو کر

(نغمہ زار ۱۹۱۸ء)

---

(۲) آ ہی گیا وہ مجھ کو لحد میں اتارنے · غفلت ذرا نہ کی مرے غفلت شعار نے

او بے نصیب دن کے تصور سے خوش نہ ہو · چولا بدل لیا ہے شبِ انتظار نے

اب تک اسیرِ دامِ فریبِ حیات ہوں · مجھ کو بھلا دیا مرے پروردگار نے

نوحہ گروں کو بھی ہے گلا بیٹھنے کی فکر · جاتا ہوں آپ اپنی اجل کو پکارنے

دیکھا نہ کاروبارِ محبت کبھی حفیظ · فرصت کا وقت ہی نہ دیا کاروبار نے

(نغمہ زار ۱۹۲۳ء)

---

(۱) نہ کر دل جوئی اے صیاد میری · کہ فطرت ہے بہت آزاد میری

اسیری سے رہائی پانے والو · تمھیں پہنچے مبارک باد میری

سہارا کیوں لیا تھا ناخدا کا · خدا بھی کیوں کرے امداد میری

بھلا دو مجھ کو لیکن یاد رکھنا · ستائے گی تمھیں بھی یاد میری

فرشتے کیا مرتب کر سکیں گے · بہت بے ربط ہے روداد میری

پسند آنے لگی تھی سر بلندی · یہی تھی اولیں افتاد میری

کیا پابندِ نے نالے کو میں نے · یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

مرے اشعار پر چپ رہنے والے · ترے حصے میں آئی داد میری

خداوندا قضا نے چھین لی ہے · مرے آغوش سے ارشاد میری

(سوز و ساز)

---

(۲) مٹنے والی حسرتیں ایجاد کر لیتا ہوں میں · جب بھی چاہوں اک جہاں آباد کر لیتا ہوں میں

مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اعتبار · آہ بھر لیتا ہوں فریاد کر لیتا ہوں میں

حسن بے چارہ تو ہو جاتا ہے اکثر مہرباں · پھر اسے آمادۂ بیداد کر لیتا ہوں میں

تو نہیں کہتا، مگر دیکھ او وفا نا آشنا · اپنی ہستی کس قدر برباد کر لیتا ہوں میں

ہاں یہ ویرانہ، یہ دل، یہ آرزوؤں کا مزار · تم کہو تو پھر اسے آباد کر لیتا ہوں میں

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظ
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

(سوز و ساز)

---

(۱)
جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہوں   وہیں ڈوبا ہوا پایا گیا ہوں[1]
بلا کافی نہ تھی اک زندگی کی   دوبارہ یاد فرمایا گیا ہوں
برنگِ لالۂ ویرانہ بے کار   کھلایا اور مرجھایا گیا ہوں
اگرچہ ابرِ گوہر بار ہوں میں   مگر آنکھوں سے برسایا گیا ہوں
فرشتے کو نہ میں شیطان سمجھا   نتیجہ یہ کہ بہکایا گیا ہوں
کوئی صنعت نہیں مجھ میں تو پھر کیوں   نمائش گاہ میں لایا گیا ہوں
مجھے تو اس خبر نے کھو دیا ہے   سنا ہے میں کہیں پایا گیا ہوں
حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے   بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

(تلخابۂ شیریں)

---

(۲)
ناکامیٔ عشق یا کامیابی   دونوں کا حاصل خانہ خرابی
آنکھیں سیہ مست چہرہ کتابی   بادہ شبانہ جام آفتابی
پھولوں میں جیسے پھول نکھریں دو رنگ   لبِ لعل نابی، عارض گلابی
دنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا   دیوانہ ہو جا، بن جا شرابی
ان کا بہانہ برجستہ گوئی   میرا تبسم حاضر جوابی
دیندار کر دے کافر بنا دے   یہ پردہ داری، یہ بے حجابی
ہیں تختِ دل پر سرکار ورنہ   تختہ الٹ دیں ہم انقلابی
دربان سے ہوں دست و گریباں   الحمد اللہ یہ باریابی

(تلخابۂ شیریں)

جہاں تک زبان و فن کا تعلق ہے اس مختصر سے جائزہ میں ان پر نظر نہیں ڈالی گئی ہے، درآنحالیکہ ان کے یہاں زبان و بیان کی لغزشیں اور کوتاہیاں کافی ملتی ہیں جو ادنیٰ تامل کے بعد دریافت کی جا سکتی ہیں، ان کے یہاں عجزِ بیان کی مثالیں بھی نظر آتی ہیں جو شاعر کی عدم قدرتِ بیان کی گواہ ہیں، ان کی زبان میں نغمگی اور شیرینی ہے لیکن پختگی نہیں، بعض اوقات بچوں کی باتیں بھی بہت لطف دے جاتی ہیں اگرچہ وہ پختہ کار اور رسیدہ ذہن و زبان کی پیداوار نہیں ہوتیں، ان کے یہاں بعض اغلاط انتہائی طفلانہ ہیں جو تھوڑی سی کوشش و دماغ سوزی سے دور کیے جا سکتے تھے، لیکن حفیظ نے ان کو دور نہیں کیا، شاید انھیں

---

[1] یہ غزل حفیظ نے شاد عظیم آبادی کی مشہور غزل ؎ تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں   کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں
کی زمین میں کہی ہے، لیکن جو فرق شاد اور حفیظ میں ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ (اسمٰعیل)

انھیں ادبی اجتہاد کا درجہ دینا مقصود ہو، حفیظ کا ایک شعر ہے جو ان کے کلام کی فنی حیثیت کی غمازی کرتا ہے ؎

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے ‏ ‏ ‏ بڑے زوروں سے منوایا گیا ہوں

وہ مانے نہیں گئے ہیں بلکہ "بڑے زوروں" سے منوائے گئے ہیں "زوروں" سے مراد غالباً "دھینگامشتی" ہو یا پھر "پروپیگنڈے" کے زور سے منوائے گئے ہوں، ویسے منوانے میں اُن کے گلے کا بھی بڑا ہاتھ ہے، جیسا کہ مولانا عبدالمجید سالک نے کہا تھا کہ "حفیظ محض اپنے گلے کے باعث مشاعرہ لوٹ لیتا ہے"۔ بعض نظموں و غزلوں میں توارد کی مثالیں بھی ملتی ہیں، مضمون کا توارد کوئی نئی بات نہیں، یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، لیکن یہ بات کہ پورا مضمون ہی متوارد ہو جائے اور الفاظ وغیرہ بھی نہ بدلے جائیں، علادرجہ مذموم بات ہے۔ حفیظ کے یہاں توارد کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دوسروں کے اشعار کو ایڈٹ کر دیا ہے، یہاں زیادہ مثالوں کا پیش کرنا طوالت سے خالی نہ ہوگا، اس لیے نمونے کے لیے دو چار مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے، مثلاً ؎

پیاروں کی موت نے مری دُنیا اجاڑ دی ‏ ‏ ‏ یاروں نے دور جا کے بسائی ہیں بستیاں

یہ شعر فراق کے اس دلپذیر شعر سے ماخوذ ہے ؎

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی ‏ ‏ ‏ یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

حفیظ نے اپنی والدہ کی موت پر ایک نظم لکھی ہے، یہ نظم گو دوسری بحر میں ہے لیکن اس پر اقبال کی نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" کا گہرا اثر ہے، مگر اس میں وہ بصیرت، وہ گہرائی، اور وہ فلسفیانہ مزاج نہیں جو اقبال کی نظم میں ملتا ہے، اقبال کے بعد کے شاعروں میں سے بیشتر نے اقبال کے طرز کو اپنانے کی کوشش کی لیکن چوں کہ اقبال کا ذہنی پس منظر، اور طرزِ فکر بیشتر شعرا میں مفقود تھا اور اقبال کا خلوص، شاعرانہ جذبہ، درد اور ظرف بھی حاصل نہیں تھا، لہٰذا جذبے اور خیال کا کیا ذکر محض چند سطحی الفاظ نظر آتے ہیں۔ حفیظ کی اس نظم میں ایک شعر یہ ہے ؎

اب کرے گا کون میرا انتظار ‏ ‏ ‏ خط لکھے گا کون مجھ کو بار بار

اقبال کی مذکورہ نظم کا شعر ہے ؎

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار ‏ ‏ ‏ کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

حفیظ کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

گلزارِ زندگی میں ہیں رنگینیاں بہت ‏ ‏ ‏ کچھ بھی نہیں حفیظ فریبِ خیال ہے

اس شعر کو غالب کے اس مشہور شعر کے بعد کہنے کی کیا ضرورت تھی ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد ‏ ‏ ‏ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

حفیظ کا شعر ہے ؎

او بے نصیب حشر کے وعدہ کا حشر دیکھ ‏ ‏ ‏ وہ رفتہ رفتہ وعدہ فراموش ہو گئے

صہ

فانی کا شعر ملاحظہ ہو ؎

محشر میں بھی وہ عہدِ وفا سے مکر گئے ۔۔۔ جس کی خوشی تھی اب وہ قیامت نہیں رہی

حفیظ کا شعر ہے ؎

فرشتے کیا مرتب کر سکیں گے ۔۔۔ بہت بے ربط ہے روداد میری

دلؔ شاہجہاں پوری فرماتے ہیں ؎

بہت بے ربط ہے روداد ہستی ۔۔۔ سنائی کچھ کہیں سے، کچھ کہیں سے

حفیظ کہتے ہیں ؎

کوئی ہو دردِ محبت کا مداوا کر دے ۔۔۔ ملک الموت ہی آ جائے مسیحا ہو کر

دلؔ صاحب کا شعر ہے ؎

مریضِ عشق کا پرسانِ حال کوئی تو ہو ۔۔۔ اجل سہی وہ بتِ فتنہ گر نہیں نہ سہی

حفیظ کا شعر ہے ؎

حسنِ ظاہر پہ نگاہیں نہ کبھی للچائیں ۔۔۔ مجھ کو دنیا نظر آتی رہی دنیا ہو کر

دلؔ صاحب فرماتے ہیں ؎

نہ ہوا دل کسی صورت سے بھی مانوس اے دلؔ ۔۔۔ گو لبھاتی رہی نیرنگیٔ دنیا مجھ کو

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حفیظ نہ بڑے شاعر ہیں اور نہ بلند پایہ۔ ان کو ہم عظمت کے قریب بھی نہیں کہہ سکتے، وہ اردو کے خوش گو شاعر ہیں، انھوں نے گیتوں کو رواج دیا اور اس میں موسیقی کی لہریں شامل کیں اپنی سریلی، رسیلی آواز سے بہت سے مشاعروں کو لوٹا اور بہتوں کو مسحور کیا، بہتوں کو خوش کیا، نصف صدی سے زائد شاعری کی، اسلام کی مختصر منظوم تاریخ لکھی، یہ دوسری بات ہے کہ وہ شعریت کے درجے پر پوری نہیں اتری اور محض "منظوم کلام" بن کر رہ گئی ہے، لیکن پھر بھی ایک قدم تو اٹھایا، اردو شاعری کو نغمگی، شیرینی، رنگینی، موسیقی خیز اور ترنم ریز فضا عطا کی، نظم کے بعض اسالیب کو وسعت دی، لیکن کوئی نیا اسلوب پیدا نہیں کیا، جس کو ان کی "خاص ایجاد" کہا جا سکے، پھر بھی ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، گو سیکڑوں برس تک یاد بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ سرورؔ صاحب نے ان کے متعلق اپنی جس قیمتی رائے کا اظہار کیا ہے اس کو میں یہاں اپنے استفادہ پر مہرِ توثیق کی صورت میں درج کرتا ہوں۔ حفیظ کی شاعری اور ان کے مرتبے کے تعین کے بارے میں یہ رائے بڑی صائب اور جامع ہے۔

"دورِ حاضر کے جن شعرا نے مشاعروں کو چمکایا اور عوام کے مذاق کو متاثر کیا ہے
ان میں سے ایک حفیظ بھی ہیں، ان کی ہلکی پھلکی عشقیہ اور رومانی نظمیں نوجوانوں میں بالخصوص
بہت مقبول ہیں، پڑھنے کا انداز مسحور کن ہے، گلے کی طرح آواز نہایت دلکش پائی ہے

مشاعرہ لوٹ لینے کا خاص ملکہ ہے۔

حفیظ کی غزلیں اچھی نہیں ہیں، نظمیں البتہ اچھی کہتے ہیں، "شاہ نامہ اسلام" کو جو مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی ہے اور اس کی بدولت حفیظ کو جو عزت اور شہرت ملی ہے اس کا اندازہ کرنا محال ہے، ایک دور تھا جب کہ یہ "شاہ نامہ" پڑھتے پھرتے تھے اور ہندوستان کے چپے چپے میں اس کی دھوم تھی۔

حفیظ نے ہلکے پھلکے گیت بھی لکھے ہیں، ان میں کوئی گہرائی نہیں ہے، لیکن عوام کے مذاق کو پسند آتے ہیں ـــــ حفیظ نے اردو نظم کے اسالیب کو وسعت دینے کی کامیاب کوششیں کی ہیں، وہ نظم کی نئی نئی شکل پیدا کرنے کے استاد ہیں، ان میں کی بعض شکلیں دل آویز ہوتی ہیں۔

حفیظ زبان و بیان کی صحت کا پورا لحاظ نہیں رکھتے، لیکن جو چیز اس کمی کو پورا کرتی ہے وہ کلام کی روانی، شگفتگی اور اثر آفرینی ہے، ان کا انداز بیان صاف اور شیریں ہوتا ہے تراکیب و بندشیں بھی خوبصورت ہوتی ہیں۔"

• مخدوم محی الدین

سب کا خواب

وہ شب مے وہ شب مہتاب میری ہی نہ تھی
وہ تو سب کا خواب تھا
وہ جو میرا خواب کہلاتا تھا، میرا ہی نہ تھا
وہ تو سب کا خواب تھا
سایۂ گیسو میں بس جانے کے ارماں دل میں تھے
میرے دل میں ہی نہ تھے
وہ تو سب کا خواب تھا

لاکھ دل ہوتے تھے لیکن
جب دھڑکتے تھے تو ایک دل کی طرح
جب مچلتے تھے تو ایک دل کی طرح
جب اچھلتے تھے تو ایک دل کی طرح
جب مہک اٹھتے تو دنیا کا مہک اٹھتا تھا دل
اولگا کا، یانگسی کا، نیل کا، گنگا کا دل
آپ میں اک گرمیٔ احساس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی
چاندنی سی میرے دل کے پاس ہوتی تھی
نہیں معلوم وہ کیا ہو گئی

فراق گورکھپوری

اس ہوش کی نہیں خبر تک ——— رات کی زلفیں آئیں کمر تک
میری ہستی خونِ جگر تک ——— کوئی خبر تک کوئی نظر تک
کب تک دوڑیں سوئے رفتگاں ——— ملتی نہیں اب گردِ سفر تک
اُس کا سراپا دید کے قابل ——— چہرہ ہی چہرہ پاؤں سے سر تک
دل کے چور کو دل تک لائیں ——— چور کو پہنچا دیتے ہیں گھر تک
دیکھیے کب تک ہاتھ یہ پہنچے ——— تیری کمر سے تیری کمر تک
غم میں ترے وہ وقت پڑا ہے ——— گم ہر حس میں شام و سحر تک
کس پیکر کا لوچ ہے یارب ——— بجلی سی بل کھائی کمر تک
ختم سفر پر جا کے کھلا ہے ——— ہم آئے ہیں گھر سے گھر تک
کون اے دوست تجھے لے آئے ——— تیری نظر سے میری نظر تک
کیش میرا جمہور پرستی ——— تیری نظر بس عیب و ہنر تک

دیکھو فراق یہ پچھلا پہر ہے
نیند میں ہیں دیوار و در تک

میکش اکبرآبادی

اک اضطراب مسلسل کی دل کو خو سی ہے
وہ آگئے ہیں مگر پھر بھی جستجو سی ہے

نظر نظر ہے فسانۂ نفس نفس افسوں
یہ خامشی بھی مگر تیری گفتگو سی ہے

کسی سے کہہ نہ سکوں خود یقین کر نہ سکوں
اک انتظار سا ہے ایک آرزو سی ہے

دماغ و دل ہے معطر گرہ کھلے نہ کھلے
یہ زندگی بھی تری زلفِ مشکبو سی ہے

یہ آج کیوں ترے رخسار پر ہیں لہریں سی
یہ کیا ہے صحنِ چمن میں جو آبجو سی ہے

صبا کی راستہ بھولی کہ تو نے یاد کیا
نہیں تو کیوں مری سانسوں میں تیری بو سی ہے

جنوں سے رونقِ بزمِ خرد ہے اے میکش
جو ہم نہ ہوں تو یہ دنیا مقامِ ہو سی ہے

غلام ربانی تاباں

مونس نہ کوئی دوست تری یاد کی طرح
ہے دل کے ساتھ دردِ خداداد کی طرح

آوارگی میں جادہ و منزل کی قید کیا
اپنا سفر بھی ہے سفرِ باد کی طرح

آئے چمن میں صورتِ موجِ نسیم ہم
نکلے چمن سے نکہتِ برباد کی طرح

دورِ ہوس میں ذوقِ وفا رائگاں سہی
دل کو عزیز ہے تری بیداد کی طرح

فصلِ نمو کی زخم فروشی نہ پوچھئے
ہر شاخِ گل ہے ناوکِ صیاد کی طرح

محرومیٔ دوام کا ساماں کیے ہوئے
جیتے ہیں ایک کوششِ برباد کی طرح

اے دشمنِ خلوص وفا کا معاملہ
نازک بہت ہے خاطرِ ناشاد کی طرح

تاباں فروغِ بزم کا ساماں کہاں سے لائیں
دل ہے چراغِ رہ گزرِ باد کی طرح

رشید احمد رشید

وہ بھری شام وہ برسات کہاں سے لاؤں
کیفِ رنگینیٔ جذبات کہاں سے لاؤں

وہ چمکتے ہوئے عارض وہ چھلکتے گیسو!
آفتابوں سے بھری رات کہاں سے لاؤں

وہ کھنکتے ہوئے ساغر وہ بہکتے میکش
میرے ساقی وہ تراہات کہاں سے لاؤں

ہائے گزرے ہوئے خاموش تکلم کے مزے
آنکھوں آنکھوں میں ملاقات کہاں سے لاؤں

شوخ و بے باک تبسم کو ترستا ہوں رشید
باتوں باتوں میں نئی بات کہاں سے لاؤں

ریورنڈ ہنیس ریحانی

اتنا کافر سے نہ دیندار سے جی ڈرتا ہے
جس قدر واعظِ مکار سے جی ڈرتا ہے

آنکھ پڑتی ہے خریدارِ ہوس پرور کی
حسن کی گرمیٔ بازار سے جی ڈرتا ہے

جلوۂ صبح جنھوں نے نہیں دیکھا اب تک
ان غریبوں کی شبِ تار سے جی ڈرتا ہے

کوئی فکرِ دلِ خوابیدہ نہیں ہے اس کو
آج کے آدمِ بیدار سے جی ڈرتا ہے

انقلابِ چمنِ دہر کی خواہش ہے مگر
خون کی مستیٔ رفتار سے جی ڈرتا ہے

فاصلہ ہاتھ سے لب تک ہے بہت کم ساقی
پھر بھی پیمانۂ سرشار سے جی ڈرتا ہے

کہیں صیاد کو پہنچے نہ خبر ریحانی
نغمۂ طائرِ گلزار سے جی ڈرتا ہے

فضیل جعفری

پھولوں کا حسن، جلوۂ مہتاب دیکھتے
بہتر تھا اہلِ درد سدا خواب دیکھتے

رہ جاتے گردشوں کے تپھیڑ سہہ کے لوگ اگر
خود اپنے زخمِ دل کی تب و تاب دیکھتے

ہم لوگ ڈوب ہی نہ سکے بحرِ عشق میں
کیا کیا وگرنہ گوہرِ نایاب دیکھتے

حسرت سی آنسوؤں کو رہی عمر بھر فضیل
کیفی کسی کے درد کا سیراب دیکھتے

ہمابر شاہ آبادی

شہر میں کوئی وبا ہو جیسے
سب کو پرہیزِ وفا ہو جیسے
یوں ہیں خاموش صغیرانِ چمن
بے حسی حکمِ خدا ہو جیسے
ہائے تہذیبِ وفا کی میت
مرثیہ خواں نہ رہا ہو جیسے
باقی پانی ہے کچھ ایسی شبنم
پھول نے طنز کیا ہو جیسے
بے کسی ہوتی ہے اتنی محسوس
تو بھی انجان ہوا ہو جیسے
پھول کو اس طرح چھوتی ہے صبا
آپ کا بندِ قبا ہو جیسے
یوں تبسم ہے لبِ لعلیں پر
اس نے کچھ مان لیا ہو جیسے
دیکھ کر موسمِ گل کے تیور
سانس گلشن کا رکا ہو جیسے
ہائے اس دور میں دل اے ہمابر
آگ میں پھول گرا ہو جیسے

سکندر محسن

میری غزل میں، میری فکر میں، نگاہ میں ہے
وہ روشنی جو ستاروں میں، مہر و ماہ میں ہے

وہ تیری آرزو، تیرا خیال، تیرے گیت
وہ تیرا حسن ہے جو دور تک نگاہ میں ہے

غموں کا قرب، غموں کی تپش، غموں کی دھوپ
بہت عزیز مجھے زندگی کی راہ میں ہے

فسوں طراز کہاں ہے تری نظر کی طرح
نگاہِ صبح ابھی رات کی پناہ میں ہے

....

....

تمام راہ رووں سے کہو جلائیں چراغ
قدم قدم پہ اندھیرا شوق راہ میں ہے

ابھی کہاں ہے گلوں پر شباب، گلوں پہ نکھار
ابھی تو قافلۂ نوبہار راہ میں ہے

خورشید نذیر

پھر یاد تری آئی پھر درد ابھر آیا
پھر ہوش اڑے اپنے پھر کون ادھر آیا

ساقی تری محفل میں ہر سانس بہک جائے
ایسا نہ کوئی ساغر گردش میں نظر آیا

جب جام فروشوں کے ہاتھوں میں تھا میخانہ
الزامِ بلانوشی پیاسوں ہی کے سر آیا

گیسوئے چمن مہکیں ایسا تو کوئی جھونکا
ٹکرا کے گلِ تر سے اب تک نہ ادھر آیا

جب ذہن پہ یادوں کا سورج کبھی ڈوبا ہے
اس وقت تصور میں پھر چاند ابھر آیا

مستوں نے محبت میں جو رنگ اچھالا تھا
خورشید نے کچھ لوٹا کچھ لے کے قمر آیا

خود مٹ کے مرے دل نے محفل سے نذیر ان کی
کچھ داغ تمنا کے کچھ لے کے شرر آیا

مصحف اقبال توصیفی

وقت

ساون کی وہ رت گزر گئی ہے
اک عمر ہوئی ہے ساتھ چھوٹے
ہاتھوں سے وہ نرم ہات چھوٹے

وہ لمحہ گزر گیا ہے ۔ لیکن
وہ لمحہ ابھی مرا نہیں ہے
تم کہتے تھے زندگی سفر ہے
اک موڑ پہ آج آ گئے ہم
بہتر ہے یہیں یہ سات چھوٹے
اس لمحے کا ہات تم نے تھاما
اک بھیڑ میں کھو گئے کہیں تم

دیکھو میں تمھارا منتظر ہوں
اس موڑ پہ آج بھی کھڑا ہوں
وہ لمحہ ابھی مرا نہیں ہے
وہ لمحہ گزر گیا ہے ۔ لیکن
گزرے گا وہ بار بار ادھر سے
تم آؤ گے اس کا ہات تھامے
میں دیکھ ہی پاؤں گا نہیں ۔ وہ
لے جائے گا اور دور مجھ سے

عوض سعید

"سناتی پھرتی ہیں آنکھیں کہانیاں کیا کیا"

میں نے پہلی بار تمہیں قدوائی کاٹیج میں دیکھا تھا، غالباً تم تفریح کے بہانے نیازی سے ملنے یہ(اں) چلی آئی تھیں۔ وہ تمہارے کنوارے بدن کی خوشبو سونگھنے کی بجائے مسلسل بور قسم کی باتیں کیے جا رہا تھا اور تم بجائے بور ہونے کے اس کی باتوں میں کچھ اس قدر محو تھیں کہ میری طرف ایک نظر دیکھنے کی بھی تمہیں فرصت نہ تھی حالانکہ میں تمہارے قریب ہی کھڑا تھا۔ تم اس وقت چمپئی رنگ کی خوبصورت اوڑھنی اور سفید ساٹن کی شلوار میں بڑی حسین لگ رہی تھیں۔ تمہاری کلائی پر ایک خوبصورت رسٹ واچ بندھی ہوئی تھی۔ تم گھڑی رکھتے ہوئے بھی وقت سے غافل تھیں۔ اگر تمہیں وقت کا بھی احساس ہوتا تو تم یوں گھنٹوں نیازی کی بکواس نہ سنتیں۔ تم خوبصورت تو نہیں تھیں لیکن تمہارے چہرے پر بے پناہ ملاحت تھی شاید اس لیے تم سانولی سلونی ہونے کے باوجود میری نگاہوں میں کھب کر رہ گئی تھیں —— نہیں —— نہیں یہ بات نہیں۔ تمہیں دیکھنے کے بعد میرے دل میں جو دبی دبی سی چنگاریاں سلگ رہی تھیں شاید وہی تمہارے حسین ہونے کی دلیل تھی۔ تم چاہو تو اسے محبت بھی کہہ سکتی ہو۔ کیوں کہ پسندیدگی کا دوسرا نام محبت ہی تو ہے۔

. . . .

نیازی کا مکان میرے مکان کے مقابل ہی تھا میری اس سے صرف شناسائی تھی۔ تم ان دنوں روز شام اس کے گھر آیا کرتی تھیں اور میں تمہیں روز نت نئے روپ میں دیکھا کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم بہت جلد نیازی سے شادی کر لو گی —— میرا خیال ٹھیک ہی نکلا۔

. . . . اور ایک دن نیازی کے مکان پر برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ باہر شامیانے تنے ہوئے تھے۔ . . . . اور بید کی بے شمار کرسیاں مہمانوں کے بیٹھنے کے لیے سلیقے سے سجائی گئی تھیں۔ باہر نئے ماڈل کی کاریں قطار اندر قطار کھڑی تھیں اور نیازی پھولوں میں لدا پھندا مہمانوں سے گلے مل رہا تھا۔ میں خوش تھا کہ تمہیں اپنی پسند کا بر ملا اور تمہارے ارمان بغیر کسی رکاوٹ کے پورے ہو گئے۔ تم اپنے ساتھ کافی جہیز لائی تھیں۔ طلائی زیورات کا تو مجھے پتہ نہیں لیکن جس قسم کا خوبصورت فرنیچر اور ضروریات زندگی کی جو چیزیں تمہارے ابا نے تمہیں دی تھیں وہ شاذ ہی میرے دیکھنے میں آئی تھیں۔ وہ فارن میڈ ریڈیوگرام تو واقعی لاجواب تھا۔

صبا

اب میں اپنے پرانے خستہ حال ریڈیو کو دیکھتا ہوں تو کوفت سی ہوتی ہے جس پر سالہا سال سے گرد اٹی ہوئی ہے۔ میں ہزار کوشش کے باوجود نیا ریڈیو خرید نہ سکا لیکن اب تمہارے ریڈیو پروگرام سے بجنے والے خوبصورت نغموں کو روز سن لیا کروں گا۔

. . . . . .

یہ کیا ہے؟ تم نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھول رکھی ہے۔ میں ڈرائینگ روم کے دریچے سے تمہیں دیکھ رہا ہوں تمہارا چہرہ مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے۔ بیڈ لیمپ کی دھیمی روشنی میں تم کچھ اداس سی لگ رہی ہو۔ شاید نیازی ابھی تک گھر نہیں لوٹا ہے۔ وہ ابھی گھر واپس نہیں آئے گا۔

گزرتے جاڑوں کی بیمار چاندنی اب دم توڑ رہی ہے اور چاند بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا ہے۔ میں صدیوں سے جس کا انتظار کر رہا ہوں شاید وہ تم ہی ہو۔ لیکن تم تو نیازی کے لیے بے چین ہو۔ میرا نام تو کوکب ہے اس نام کو شاید تم نے بھلا دیا ہے لیکن میں تمہارے نام سے آشنا ہوں۔ تمہارا نام مہر ہے — مہر نیازی۔

مہر اور نیازی کا COMBINATION بھی کیا خوب ہے۔

رات تیزی سے ڈھل رہی ہے۔ سڑک پر موت کا سا سناٹا ہے۔ کبھی کبھی اکا دکا موٹر تیزی سے بھاگتی ہوئی گزر جاتی ہے تو ایک لمحہ کے لیے زندگی کے آثار ہویدا ہو جاتے ہیں۔

مجھے خاموشی بڑی بھلی لگتی ہے۔ کیا تمہیں بھی خاموشی پسند ہے؟

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے

کیا یہ کیفیت کبھی تم پر بھی طاری ہوئی ہے؟

. . . . . .

شاید تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ میں نیازی کا پڑوسی ہونے کے باوجود اس کی نگاہوں میں ایک اجنبی سے گیا گزرا ہوں۔ گو میں دو ایک بار اس سے ضرور ملا ہوں لیکن یہ ملاقاتیں دوستی کا روپ دھار نہ سکیں۔ پہلی بار تو وہ مجھ سے اس وقت ملا تھا جب اسے کرایہ کے مکان کی شدید ضرورت تھی اور جب میری کوششوں سے وہ شاندار مکان اسے مل گیا (جس میں آج کل تم مقیم ہو) تو وہ مجھے راستے سے آتا دیکھ کر کنی کاٹنے لگ گیا۔ بظاہر مجھے اس کی شخصیت سپاٹ سی لگتی تھی لیکن وہ تھا بڑا کائیاں — اس کا اندازہ مجھے اس کی گہری آنکھوں اور مسکراہٹ سے ہوتا تھا جس میں تصنع اور بناوٹ کا عنصر شامل تھا — ارے یہ کیا میں نے تو تمہارے شوہر کی برائیاں شروع کر دیں۔ مجھے تمہارے تعلق سے لکھنا چاہئے تھا۔ تم ابھی تک کھڑکی میں مجسم انتظار بنی کھڑی ہو لیکن میں تو اس وقت سے تمہارا منتظر ہوں جب میں نے تمہیں دیکھا بھی نہ تھا لیکن میرے ذہن میں جس لڑکی کا تصور تھا غالباً وہ تم ہی تھیں — میں نے کئی بار خیالوں خیالوں ہی میں تمہاری صندلی باہوں میں ہاتھ ڈالے جہان جہان کی سیر کی ہے۔ تمہاری عنایات سے بہرہ ور ہوا ہوں۔ لیکن آج مجھے احساس ہو رہا ہے

حبرکہ تمہاری شخصیت کے پیچھے ایک دوسری تحریر بھی تھی ——

میں جانتا ہوں تم نیازی سے خوش نہیں ہو۔ تم نے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے لیے کئی روپ دھار کئی لبادے اوڑھے، کبھی دہریت کو اپنایا کبھی مذہب کی طرف شدت سے راغب ہوئیں لیکن ہر بار تم بے نقاب ہوتی رہیں

میرا خیال ہے تم جس چیز کے پیچھے بھاگ رہی ہو وہاں محبت اور سکون نام کی کوئی شئے نہیں ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ تم اب نیازی کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھو تو بڑی بات ہے — تم نے کھڑکی بند کر دی ہے۔ شاید تمھیں باتیں ناگوار گزر رہی ہیں۔ لیکن میرے ذہن کی کھڑکی ابھی تک کھلی ہے۔ دل کے دریچے ابھی تک وا ہیں۔ ایک بار دریچے سے اپنی بھی جھکے سے داخل ہو گئی تھی اور چند دنوں کے لیے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھل اٹھی تھی لیکن مجھے یہ جلد احساس ہو گیا تھا کہ وہ ایک فلرٹ لڑکی ہے جسے جذبات سے کھیلنے میں مزہ آتا ہے۔ وہ آسمان کی پہنائیوں سے اتری ہوئی محبت کی انجلی کو عقیدت اور پیار سے چوم کر اپنے سینے سے نہیں لگا سکتی۔

مجھے یہ بات بھی معلوم ہے کہ تم کئی دنوں سے باہر نہیں نکلی ہو۔ تمھارے ہاں پہننے کے لیے کئی خوبصورت اور قیمتی ساریاں ہیں جنھیں پہن کر نیازی کے ساتھ گھومنے کی تمھیں خواہش بھی ہے — لیکن شاید تمھیں نہیں معلوم کہ سادہ کپڑے بھی اپنا اثر پیدا کرنے میں کچھ کم حیثیت نہیں رکھتے — میرے خیال میں جوانی اچھے کپڑوں اور مرغن غذاؤں کی محتاج نہیں ہے۔ اس عمر میں سانس لینے میں بھی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اوڑھنی سنبھالنے سے زیادہ گرانے میں لطف آتا ہے۔ کیوں ہے نا ٹھیک بات؟ دیکھو تم شرما رہی ہو ——

شاید تمھیں یاد ہو یا نہ ہو —— تم نے ایک سہانی شام کو مجھ سے پوچھا تھا —" کوکب سچ سچ بتانا یہ درد کا رشتہ کیا ہوتا ہے؟"

اور میں بے اختیار کہہ اٹھا تھا ——

"درد کے رشتے سے مراد آنکھوں کی وہ پکار جس کی گونج لہو کو سنناتی ہے۔ درد کے رشتے سے مراد دل کی وہ دھڑکن جو بھری دنیا کو سناٹے میں بدل دیتی ہے۔ درد کے رشتے سے مراد وہ پچھلا پہر جسے سویرے کی آس بھی ہے اور نہیں بھی۔ درد کے رشتے سے مراد شمع کی وہ لو جسے تم چاہو تو اکسا دو، اور میں چاہوں تو اپنا دامن جلا لوں۔ اب بتاؤ کیا تم نے درد کے رشتے کو سمجھا ہے؟"

میرے جواب پر تم نے سرمستی اور سرشاری کے عالم میں اپنے جلتے ہوئے ہونٹ میرے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے تھے۔ اس وقت تم سراپا خواہش کا شعلہ بنی ہوئی تھیں۔ تمھاری سپردگی اور وارفتگی نے میرے حوصلے بلند کر دیئے اور جذبات کی شدت سے تمھارے کومل رخسار انگارہ کی مانند دہک رہے تھے۔

یہ ہماری محبت کی آخری شام تھی جس کی صبح کا میں آج تک منتظر ہوں —— اب جب کہ تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیازی کی ہو چکی ہو تو میں سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ درد کے رشتے کی کونسی منزل ہے!!

رفعت نواز

دودِ چراغِ محفل

پولیس کی ویان گلی کے موڑ پر نظر آتے ہی پوری گلی میں سناٹا چھا گیا۔ گلی میں اکڑتے پھرنے والے بانکے جہاں جس جھونپڑی اور مکان میں سما پائے گھس گئے، اور کھٹا کھٹ ٹوٹے ہوئے دروازے بند ہو گئے اور دراڑوں سے سہمی سہمی اور خوفزدہ آنکھیں جھانکنے لگیں۔ پاشومیاں جو گلی کا مانا ہوا لفنگا سمجھا جاتا تھا نشے میں دھت ابھی تھوڑی دیر پہلے بڑی بے تکلفی سے فتو کی ماں سے اپنا قریبی رشتہ ظاہر کر رہا تھا۔ یہ بھاگم بھاگ دیکھ کر چونک پڑا۔ اس نے مخمور آنکھیں چاروں طرف گھمائیں، سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا۔ پان کی بچی ہوئی چھالیہ برق کے کھمبے پر پھینکی اور لنگی کو رانوں تک اٹھا کر اس کا سرا کمر میں کھونس لیا اور سر پٹ دوڑتا ہوا گلی کے آخری سرے پر واقع بڑے مکان میں گھس گیا۔

پولیس سب انسپکٹر چار سپاہیوں کے ساتھ بڑے وقار سے ویان سے اترا اور وہ سب گلی میں چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ گلی میں تو ہو کا عالم تھا۔ لوگ بگ گردنیں جھکائے سودا سلف سے بھری تھیلیاں کندھوں پر لادے آجا رہے تھے۔ دو بوڑھیاں سڑے گلے کیلے، بیر اور جام لیے بیٹھی تھیں، پاشومیاں کی منہ بولی ماں بیمار بھینس کی مالش کر رہی تھی اور گلی کی رونق، پاشومیاں کی رنگین زندگی کی پالن ہار۔ نازکی اپنی کوٹھری کی دہلیز میں میلے ٹاٹ کے پردے سے لگی کھڑی تھی اور گلی کا ملنگ صرف ایک لنگوٹی باندھے شکستہ عاشور خانے میں بیٹھا بے ہنگم آواز میں کوئی مرثیہ پڑھ رہا تھا۔

پولیس انسپکٹر سیدھا نازکی کی کوٹھری پر آیا اور بڑے دبدبے سے بولا "باہر آبدذات!"

نازکی بغیر کسی جھجک کے باہر آگئی اس کے چہرے سے کسی قسم کی فکر یا پریشانی ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے سیدھا ہاتھ ذرا سا اٹھا کر "سلام صاحب" کہا اور نیچی نگاہیں کیے کھڑی ہو گئی۔ انسپکٹر نے نازکی کے سراپا پر نگاہِ غلط انداز ڈالی اور گلے میں لٹکے پستول کی پیٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "وہ بدمعاش پاشو کہاں ہے۔ صبح پھر اس نے دارو پی کر محلہ میں دنگا کیا۔ وہ حرامی ہے کہاں بتاؤ۔"

"پاشو تو کل سے گلی میں نہیں آیا صاحب، اور اس نے تو آج کل مار ماری، بلوا، اور پینا چھوڑ دیا ہے۔ پرسوں تو وہ ملنگ کے قدموں میں پڑا دنیا تجنے کو کہہ رہا تھا۔

"باتیں نہ بنا، صاف صاف بتا وہ لفنگا ہے کہاں۔" ایک ادھیڑ عمر کے کانسٹبل نے ڈنڈا زمین پر مارتے ہوئے کہا۔

نازکی نے پھر ایک بار کہا "صاحب کہہ دیا نا کہ وہ کل سے نہیں آیا۔ معلوم نہیں کہاں ہے۔"

پولیس والے نازکی کی کوٹھری میں گھس گئے۔ کمرے میں کونوں کھدروں میں تک پاشو کو تلاش کیا گیا۔ پھر انسپکٹر کے حکم پر گلی کے دو چار مشکوک مکانات کی بھی تلاشی ہوئی۔ ناکامی ہونے پر انسپکٹر نے اپنی سنہری باریک باریک مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہم سے بچ کر کہاں جائے گا وہ حرامی، آج نہیں تو کل گھیر لوں گا اسے۔"

پولیس کے جانے کے بعد گلی پھر سے جاگ اٹھی۔ شور پکار، گالی گلوچ، ڈھول دھپا شروع ہو گیا۔ پاشو بھی آہستہ آہستہ جھومتا ہوا برے مکان سے برآمد ہوا وہ نازکی کی کوٹھری کے سامنے والے چبوترے پر آ کر بیٹھ گیا اور بابو کو آواز دی۔ بابو دوڑتا ہوا آیا اور "حکم پاشو استاد" کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ بابو ۱۴، ۱۵ سال کا دبلا پتلا لڑکا تھا جس کے ماں باپ کا پتہ نہ تھا۔ پاشو میاں اسے بچپن سے ہی پال رہا تھا۔ پاشو میاں کا خیال تھا کہ بابو ہی اس کا حقیقی جانشین بن سکتا ہے۔ چونکہ اس نے وہ تمام گر پاشو میاں سے سیکھ لیے تھے جو اس پیشے کے لیے ضروری ہیں۔

پاشو نے بابو سے چار زور دار چائے لانے کے لیے کہا اور سگریٹ سلگا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس نے نازکی سے پوچھا "کیا کہہ رہا تھا وہ بھڑوا پولیس والا۔ سالوں نے ناک میں دم کر دیا ہے، روز ایک نیا لفڑا کھڑا کر دیتے ہیں۔" نازکی کوٹھری سے باہر آ گئی۔ اور بڑی بے اعتنائی سے بولی "تجھے پوچھ رہا تھا سوا، میں نے چلا دیا کہ تو، تو کل سے نہیں آیا، بڑی دھونس جما رہا تھا، وہ یوں جیسے میں اس کی دھونس میں آ کر تیرا ٹھکانہ بتا دوں گی۔" پھر نازکی نے جماہی لیتے ہوئے مدھم خمار آلود آواز میں کہا "پاشو تھوڑی بچی ہو تو دے جسم ٹوٹ رہا ہے۔"

پاشو نے جواب دیا "ابھی دیتا ہوں سالی مری کیوں جا رہی ہے تیرے لیے تھوڑی بچا رکھی ہے۔ پہلے چائے تو پی لے۔" اتنے میں بابو چائے لے آیا۔ چائے پی کر پاشو یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ نازکی تیرے لیے تھوڑی لاتا ہوں۔"

نازکی اکیلی رہ گئی وہ یوں ہی پردے کو پکڑے کھڑی سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج نہ جانے اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی، ورنہ وہ اس وقت تو مزے میں خراٹے لیتی رہتی تھی۔ تھوڑی دیر میں منجھلی بی کا بیٹا ایک بوتل سینے میں اڑسے آ گیا اور نازکی کی کوٹھری میں گھس کر رازداری سے بولا پاشو میاں نے ... بھجوائی ہے یہ بوتل تیرے لیے۔ لا میرا انعام دے نازکی۔ نازکی نے ایک چونی اس کی طرف پھینک دی اور وہ خوش خوش چلا گیا۔

نازکی نے بوتل کو غور سے دیکھا اور پھر آنکھیں بھینچ کر غٹا غٹ پوری بوتل پی گئی۔ پھر اس نے سگریٹ سلگائی اور سڑک کو گھورنے لگی۔ اب سڑک پر چلتے ہوئے لوگ اسے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ سر پکڑ کر دہلیز میں بیٹھ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ راہ گیر اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بعض منچلے تو بار بار اس کی کوٹھری کے سامنے سے گزرتے اور بنا پلک جھپکے اسے گھورا کرتے۔ ایک نوجوان سائیکل آہستہ آہستہ چلاتا ہوا اس کی کوٹھری کے چبوترے سے آ گزر گیا اور آگے جا کر مڑتے ہوئے بولا "جیو پاشا طبیعت خوش ہو گئی تمہیں دیکھ کر۔" نازکی کو اس نوجوان کا

حرکت پر ہنسی آگئی۔ اسے نشہ چڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں اور جسم میں توانائی سی آگئی تھی۔

مسلسل سڑک کو گھورنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں اور سر میں ہلکا ہلکا درد بھی ہو رہا تھا۔ طبیعت خواہ مخواہ ہی اداس ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ سڑک کو گھورے جا رہی تھی، چونکہ نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی اور خالی خولی بستر پر لوٹتے رہنا اسے اچھا نہ لگتا تھا۔ دور گلی کے موڑ پر اسے ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جوں جوں وہ مرد آگے بڑھ گیا اس کے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی اب تو وہ اس مرد کے جسم کو بخوبی دیکھ رہی تھی بلاشبہ وہ رگھو نندن تھا۔ اس کے من میں عجیب سی ہلچل مچ گئی تھی۔ رگھو کو دیکھ کر وہ ڈر بھی رہی تھی اور یہ بھی چاہ رہی تھی کہ اس سے باتیں کرے، اسے چھوئے، بھینچے اور اس کے چوڑے سینے پر سر رکھ کر سو جائے۔

رگھو نندن نگاہیں جھکائے آہستہ آہستہ اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ نازکی نے جب رگھو کو غور سے پردے کی اوٹ سے دیکھا تو اسے ایک دھکا سا لگا۔ رگھو کتنا بدل گیا تھا۔ گٹھا ہوا صحت مند کسرتی بدن اب قدرے جھک گیا تھا۔ اس کے بھرے بھرے گال پچک گئے تھے۔ اس کے سر کے بال خشک تھے اور آنکھیں بجھی سی گئی تھیں۔ نازکی نے ایک سرد آہ بھری اور خیال کیا، رگھو کو جیل کی زندگی راس نہیں آئی گھل گھل کر بے چارہ آدھا بھی نہیں رہا۔

اور پھر اس کی آنکھوں میں چار سال پہلے کے شب و روز دھوم مچانے لگے۔ جب وہ حسن پور میں اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی تب تو اس کا نام پدما تھا۔ نازکی نہیں تھا۔ اس کا باپ اپنی چھوٹی سی زمین کاشت کرتا تھا۔ ماں بھینس کا دودھ دوہتی اور کھانا پکاتی تھی۔ اور وہ برتن دھوتی اور گوبر کے اُپلے تھاپتی تھی۔ اُپلے تھاپنے وہ اپنے مکان سے ذرا دور کھلے میدان میں جاتی تھی۔ وہیں رگھو نندن سے اس کی آنکھیں چار ہوئی تھیں۔ رگھو نندن، گوردھن پٹیل کا لڑکا تھا جو شہر سے ساتے آٹھ کلاسوں تک تعلیم پاکر آیا تھا اور گاؤں میں پنساری کی دکان کرتا تھا۔ لمبا چوڑا صحت مند چوبیس پچیس سال کا نوجوان وہ پدما پر فدا تھا اور پدما اس پر جان چھڑکتی تھی۔ ان کی ملاقاتیں چوری چوری ہوا کرتی تھیں چونکہ پدما کے گھرانے اور رگھو کے گھرانے میں ایک عرصہ سے لڑائی تھی اور ان لوگوں نے ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا اور حقہ پانی بند کر دیا تھا۔ مگر عشق و جوانی بھلا ان اختلافات کی پروا کہاں کرتے ہیں۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور جب گاؤں میں ان کے عشق کا چرچا ہوا تو پدما کو اس کے باپ نے خوب دھنکا اور چاقو سے گلا کاٹنے کی دھمکی دی۔ ادھر رگھو کے باپ نے اسے جائیداد سے محروم کر دینے اور عاق کرنے کا ڈر دکھلایا۔ عشق میں وہ گرمی نہ رہی، شعلہ سی لپک جھلک نہ ہو تو کیا ہوا، راکھ کے ڈھیر میں چنگاریاں تو تھیں دو چار دن آڑ وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر دل کی پیاس بجھا لیتے اور اس دوری کی وجہ سے تو جسموں کی پیاس کچھ اور سوا ہو گئی تھی۔

ایک دن وہ شام کے جھٹپٹے میں وید کے یہاں ماں کی دوا لینے جا رہی تھی تب مندر کے سنسان موڑ پر رگھو نندن نے اسے آلیا تھا۔ رگھو نے اس کا ہاتھ اپنے سخت ہاتھ کی گرفت میں لے کر فیصلہ کن انداز میں پوچھا تھا۔

"پدما آج اور ابھی فیصلہ کر، تجھے میرا ساتھ منظور ہے یا اپنے ماں باپ کا۔"

وہ عجیب تذبذب میں پڑگئی تھی مگر رگھو کے جوان جسم کی قربت اور گرمی نے اس سے اگلوا لیا تھا "مجھے تیرا منظور ہے۔" اور اسی وقت انھوں نے طے کر لیا کہ رات میں وہ گاؤں چھوڑ دیں گے اور اپنی چھوٹی سی دنیا الگ بسائ

وہ اماوس کی کالی رات تھی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ کڑکڑے جاڑوں کا موسم۔ یوں بھی گا کونسا شاد آباد تھا کہ راتوں کو چہل پہل رہتی، لوگ شام ہی سے گھروں میں گھس جاتے اور لحافوں اور کمبلوں دبکے پڑے رہتے۔ پدما کی ماں کو تیز بخار تھا اور وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی کراہ رہی تھی، باپ تھک کر سو تھا۔ چھوٹا بھائی بھی نیند کے مزے لوٹ رہے تھے اور پدما عجیب الجھن میں پڑگئی تھی۔ ایک طرف گھر بار، ماں باپ اور سہ تھیں اور دوسری طرف صرف رگھونندن کی محبت مگر اس کے دل نے رگھونندن کا ہی ساتھ دیا اور پدما نے دو سا اپنا مختصر سا زیور اور چپل ایک کپڑے میں باندھی اور دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ مندر کے پاس راگھو اس کا منتظر تھا۔ را بن ٹھن کر پورا صاحب لگ رہا تھا۔ پدما کو دیکھ کر اس نے دھیرے سے کہا "آ گئی میری چڑیا" پھر اس نے پدما کو لپ چٹاچٹ بوسے لے لیے تھے، اور پدما کے دل سے خوف دور ہو گیا تھا کہ وہ راگھو کے سینے سے لگی کھڑی سوچ رہی تھی یہ مرد مجھے ہر مصیبت سے محفوظ رکھے گا۔ بھاگم بھاگ وہ قریبی ریلوے اسٹیشن گئے تھے۔ انھوں نے شہر کا ٹکٹ لیا۔ شہ میں راگھو نے ہوٹل میں ایک کمرہ لیا اور خوب عیش ہونے لگے۔ تین دن گزر گئے تو پدما محبت کے نشہ سے بیدار ہوئی ماں باپ کی، بھائیوں کی اور سہیلیوں کی یاد آئی اور اپنے کیے پر پچھتاوا سا ہوا۔ رگھو بھی پدما کے جسم سے اوب گیا تھا۔ وہ دن بھر تو غائب رہا رات گئے لوٹا تو نشے میں چور تھا اور اول فول بک رہا تھا۔ دوسرے دن بھی و ناشتے کے بعد ہی چلا گیا۔ پدما ہوٹل کی زندگی سے تنگ آگئی تھی اور کمرے کی تنہائی اسے کھائے جا رہی تھی۔ ہوٹل کا چھوکرا رمیش دو وقت کھانا اور چائے دے جاتا۔ جب رگھو رات کے ۱۲ بجے تک نہ لوٹا تو پدما کو تشویش ہوئی۔ اس نے کمرے سے باہر نکل کر رمیش کو بلایا، وہ آیا تو پدما نے اسے سب قصہ کہہ سنایا۔ ویسے ان چار دنوں میں پدما نے محسوس کر لیا تھا کہ لڑکا بھلا ہے اور قابل بھروسہ ہے۔ رمیش نے پدما کی باتیں غور سے سنیں اور یہ ترکیب بتائی کہ پولیس میں رپورٹ کر دی جائے۔ پدما رگھو پر اتنی ناراض تھی کہ رپورٹ لکھانے پر راضی ہو گئی۔ پھر رمیش نے مشورہ دیا کہ ہوٹل چھوڑ کر وہ اس کے ساتھ اس کی کھولی پر چل کر رہے، جہاں اس کی ماں بھی رہتی ہے۔ پدما اتنی غمگین، اور خوف زدہ تھی کہ رمیش کی ہر بات اس نے قبول کر لی، اور رمیش اسے اپنے یہاں لے آیا۔ صبح پولیس میں رپورٹ لکھانے سے پہلے ہی رمیش نے خبر دی کہ رگھو رات کے دو بجے نشہ کی حالت میں ایک رنڈی کے یہاں پکڑا گیا ہے اور اب وہ پولیس تھانے میں ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد پدما تھانے لائی گئی۔ یوں بھی ابتدائی تفتیش میں رگھو قبول کر چکا تھا کہ اس نے پدما کو اغوا کیا ہے اور پولیس کی گھڑکیوں سے مرعوب ہو کر پدما نے بھی اقرار کر لیا۔ پدما کے باپ کی طلبی ہوئی تو اس غیرت دار نے آنے سے صاف انکار کر دیا اور کہلا دیا کہ میرا اس نابکار سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ اور اب وہ پدما کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا ہے ــ رگھو کے باپ بیچارے نے بیٹے کو بچانے کے لیے بہت بھاگ دوڑ کی مگر سب بیکار ثابت ہوئی۔

بے سہارا پدما ہوٹل والے رمیش کا سہارا غنیمت سمجھتے ہوئے جو کچھ اس نے کہا وہی کرنے لگی۔ عدالت میں بھی اس نے رگھو کے خلاف بیان دے دیا کہ اس نے پدما کو زبردستی اغوا کیا تھا۔ اور مجسٹریٹ نے کھٹ سے رگھو کو تین سال کی سزا سنا دی۔ رگھو نفرت بھری نگاہوں سے پدما کو دیکھتا ہوا جیل چلا گیا۔

رمیش نے خوب ہاتھ پیر نکالے، پدما کو شہر کی سیر کرائی، سینما دکھائے، ساڑیاں لا کر دیں اور نت نئے شوق لگائے پھر ایک دن رمیش پاشو میاں کو لے آیا۔ پاشو میاں نے ایک پارکھو کی نظر سے پدما کو سر سے پیر تک دیکھا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد رمیش گھبرایا ہوا آیا اور پدما سے بولا۔ "پدما دیدی تمہارے ساتھ رہنے کی وجہ سے پولیس کی نظر مجھ پر ہے ابھی ابھی حوالدار سے نپٹ کر آ رہا ہوں۔ تم پاشو میاں کے ساتھ چلی جاؤ۔ وہ بیچارے بڑے ہمدرد اور غریبوں کے پالن ہار ہیں آٹھ دس دن میں تمہیں کسی اور جگہ منتقل کر دوں گا۔ رمیش کی ماں نے . . . . . . بھی کو سننے کے انداز میں کہا۔ "ہاں جی کب تک ہم تمہارے لیے پریشان رہیں میرا بیٹا تمہاری فکر میں آدھا بھی نہیں رہا۔ جاؤ پاشو کے ساتھ وہ تمہیں کہیں نہ کہیں کام دلا دے گا۔ بڑا اثر و رسوخ والا آدمی ہے وہ۔"

بادل ناخواستہ پدما پاشو کے ساتھ رکشہ میں بیٹھ گئی۔ پاشو تین چار دن تو انتہائی سعادت مندی سے اس کی خدمت کرتا رہا۔ اچھا سے اچھا کھلاتا۔ دل بہلانے کے لیے ریڈیو اور دو بوڑھیاں تھیں جو خوب چٹ پٹی باتیں کیا کرتیں، آرام دہ بستر بھی تھا۔ پدما روز پاشو سے پوچھتی بھیا مجھے کب کام لگاؤ گے اور وہ روز کہتا کل تجھے کام پر لگا دوں گا۔ چوتھے دن رات کے گیارہ بجے پاشو اس کے کمرے میں آکر بڑی رازداری سے بولا۔ "پدما زبردست آسامی لایا ہوں۔ تو اسے خوش کر دے گی تو وارے نیارے ہو جائیں گے سو سو روپے کی پتی چھڑا لینا اس سے۔"

پدما سٹپٹا گئی اس نے حیرت سے پوچھا "کیا کرنے کہہ رہے ہو تم مجھے زبردست آدمی سے کیا تعلق۔"

تب پاشو نے ایک طمانچہ اسے لگایا اور کھردرے لہجے میں بولا "مردار۔ چار دن سے کیا ماں کی کمائی کھا رہی ہے۔ دھندا نہیں کرے گی تو کیا کھائے گی کیا۔ سب پتہ ہے تو کتنی شریف ہے" پدما کو معلوم ہو گیا اسے کیا کرنا ہوگا۔ وہ تو سکتے میں آ گئی۔ یہ بات تو اس نے کبھی سوچی بھی نہ تھی۔ اس نے دھتکار سے بھرے لہجے میں کہا "دیکھو پاشو بھائی مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تم مجھ سے یہ کام کراؤ گے تو میں کبھی تمہارے ساتھ نہ آتی۔ لو میں ابھی چلی جاتی ہوں۔ تم نے مجھے غلط سمجھا ہے۔"

"تو میں نے تجھے کیا سمجھا ہے ابھی بتاتا ہوں"، کہہ کر پاشو میاں نے گھونسوں کی بارش شروع کر دی "سالی میں تیرے جیسی کئی دیکھ چکا ہوں۔ صورت شکل بھی اچھی ہے جی لگا کر کام کرے گی تو خوب کمائے گی اور زندگی بھر ٹھاٹ کرے گی۔ تیرا باپ تجھے ملا جائے تو ... پاس ... ہے۔ اب کیا گھر گھر ٹکڑے مانگتی پھرے گی ارے کمبخت بھیک بھی مانگے گی تو کوئی پھٹا ... اور روٹی کا ٹکڑا روپیہ بارہ آنے دے کر سوچا کرے گا۔ یہاں رہے گی تو حکومت کرے گی۔"

[illegible]

[illegible]

کروں گی، ورنہ پاشو نے خوش ہو کر جھٹ سے اس کا پیار لے لیا اور بولا "اب ہوئی نا سولہ آنے والی بات۔ تو نے کو نہیں پہچانا بڑا بادشاہ آدمی ہوں رے میں۔ قسم سے تو میرے کہنے پر عمل کرے گی تو جان لڑا دوں گا" کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پاشو نے مشورہ دیا "اپنا نام پدما نہیں بلکہ نازکی بتانا اور گاؤں کا نام صفی پور بتانا اور یہاں آنے سے لگاوٹ کی باتیں کرنا لڑائی اور ٹنٹے کی نہیں۔ اس دھندے میں جی کو بڑا مارنا پڑتا ہے۔ اگر آسامی کے ساتھ کچھ کی تو مار مار کے بھُرکس نکال دوں گا۔"

ابتدائی دنوں میں تو پدما کو نازکی بننے میں بہت تکلیف ہوئی مگر رفتہ رفتہ وہ اس پیشہ اور ماحول سے مانوس ہو گئی اور ایک حد ایسی بھی آگئی کہ وہ پدما کو بھول سی گئی اور صرف نازکی ہی رہ گئی اور محلے کی سب سے چالاک اور گاہک مار سمجھی جانے لگی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اس نے اپنی صحت کا بہت خیال رکھا، اچھا سے اچھا کھاتی، صاف ستھری رہتی۔ وقتاً فوقتاً احتیاطاً انجکشن لگوایا کرتی۔ اس لیے تو اس کی امنگ جیسی تین سال پہلے تھی ویسی ہی رہی۔ اس کی زندگی بڑے سکون سے ایک بنی تلی رفتار میں بغیر کوئی اہم تبدیلی ہوئے بیت رہی تھی۔ مگر آج رگھو نندن کو دیکھ کر اس کی پرسکون زندگی میں طلاطم پیدا ہو گیا تھا، اور محبت کا وہ شعلہ جو چنگاری سے راکھ بن چکا تھا بھڑک اٹھا تھا۔ ماں باپ کی یاد نے پھر سے ذہن میں انگڑائی لی تھی گاؤں کی سونی سونی جانی پہچانی گلیاں اور سہیلیاں یاد آگئی تھیں اور پہلی محبت کا پہلا زخم پھر سے ہرا ہو گیا تھا۔

ایک ہی لمحہ میں اس نے فیصلہ کر لیا اب کیا کرنا ہے۔ اس نے بابو کو آواز دی اور اسے رگھو نندن کے پیچھے دوڑایا کہ وہ کسی طرح اچھی اچھی باتیں کر کے بہلا پھسلا کر رگھو نندن کو لے آئے اور واقعی بابو رگھو نندن کو لے آیا۔ رگھو کمرے میں آکر نازکی کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ نازکی نے آہستہ سے کہا "ارے رگھو بیٹھو تو تجھ سے کتنی باتیں کرنا ہے مجھے۔"

رگھو نے تڑاخ سے ایک طمانچہ نازکی کے رسید کیا اور غصہ میں بولا "ذلیل کتیا تو نے گاؤں کو رسوا کر دیا میں تیرے لیے جل گیا اور تو نے یاروں کے سنگ عیش کیا۔ تیرا میرا اب کوئی رشتہ نہیں رہا۔ جی تو چاہتا ہے کہ تجھے مار ڈالوں مگر تو مرے نہیں بلکہ زندہ رہے اور بری سے بری حالت میں زندہ رہے۔ ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہو، تیرے جسم میں کیڑے کلبلائیں اور تجھے معلوم ہو کہ محبت میں دھوکا دینے کی سزا کیا ہوتی ہے۔ خبردار اب جو میرا نام اپنی ناپاک زبان پر لائی تو" یہ کہہ کر رگھو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔

رگھو کے باہر نکلتے ہی بابو آگیا اور شوخی سے آنکھ مارتے ہوئے بولا "کتنے جھڑا لیے نازکی اس گنوار سے" نازکی کھول رہی تھی۔ جھٹ بول پڑی "تجھے کیا مطلب بھڑوے تجھے تو اپنے حصے سے غرض ہے نا یہ لے تیرا انعام" یہ کہہ کر نازکی نے ایک روپے کا نوٹ بابو کی طرف اچھال دیا۔

اس دن شام ہی سے وہ اوڑھنی کھونٹی لے کر پڑ گئی اور پاشو سے بھی اس نے سخت بیماری کا بہانہ کر دیا اور اس رات کے لیے کاروبار بند ہو گیا۔ رات بھر نازکی تڑپتی رہی۔ بار بار اسے رگھو کے کہے ہوئے آخری جملے یاد آتے رہے اور

اس کی آنکھوں میں رگھو کی نفرت بھری آنکھوں کا تصور گھوم گھوم جاتا۔ اس نے اپنی موجودہ زندگی پر نظر ڈالی تو وہ بھی کچھ کم دردناک نہیں تھی۔ غیر متعین آمدنی گناہ آلود۔ ۔ زندگی اپنی مرضی سے جی سکنا نہ مر سکنا۔ غنڈوں کا ڈر شریفوں کا ڈر اور پولیس کا ڈر اور لامتناہی، یکساں اور اکتا دینے والے لیل و نہار۔

چوک کے کلاک نے اور نے پانچ کے گھنٹے بجائے تو وہ چونکی کہ صبح ہو رہی ہے۔ ورنہ یہ وقت تو اس کی نیند کا ہوتا تھا۔ گہری، شیمی خراٹوں بھری نیند۔ سڑک پر اکا دکا آدمیوں کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے رکشا گزرتا تو دیر تک کانوں میں اس کے گھنگروں کی چھن چھن گونجا کرتی۔ بلدیہ کی جھاڑو لگانے والیاں سڑک صاف کر رہی تھیں۔ نازکی نے باہر نکل کر دیکھا تو اس کے اپنے سب لوگ سوتے ہوئے پڑے تھے۔ اسے ان لوگوں کی بے فکری پر رشک بھی آیا اور چڑ بھی ـــــ نازکی نے بلدیہ کی ایک جھاڑو والی سے چائے منگوا کر پی کر اور کمر سیدھی کرنے چارپائی پر لیٹ گئی تھکے ہوئے دماغ اور جسم نے آرام دہ بستر پر پڑتے ہی اسے سلا دیا۔

گیارہ بجے وہ جاگی تو گلی بھی جاگ اٹھی تھی۔ روز کی گہما گہمی تھی۔ وہی چیخ پکار، ہا ہو، گالی گلوج مارکٹائی۔ اس کے ذہن میں اب بھی رگھو کی باتیں ابھری تھیں۔ پاشو اور بابو نے اس کی بیماری کے متعلق بہت تشویش سے پوچھا تو وہ بڑی بے دلی سے بولی اب ٹھیک ہوں۔ بابو بھاگا بھاگا گیا اور اس کے لیے زوردار ناشتہ لے آیا۔ آملیٹ، پراٹھے، بالائی کی پلیٹ، بالائی کی موٹی تہہ والی چائے، اور مصالحہ کا خوشبودار پان۔ نازکی سے بمشکل ایک پراٹھا کھایا گیا اور وہ بھی ہضم نہ ہو سکا، چھاتی کے اوپر اوپر کھیلتا رہا۔

پاشو نے حسب معمول اپنی خوراک لے لی تھی اور اب وہ گلی میں دنگا کر رہا تھا۔ بابو محلے کے جوا خانے میں بیٹھا تھا بھینس والی ماں جو پڑوس کی گوالن کو رونگٹے کھڑے کر دینے والی گالیاں دے رہی تھی۔ اور تانگے پر سینما کا اشتہار شروع ہو گیا تھا اور لاوڈ اسپیکر پر فقیر محمد نئی فلم کا پرزور اعلان کر رہا تھا محض اپنی شانتی کو سنانے کے لیے۔

گلی میں شور ہوا کہ پولیس کی گاڑی آ گئی اور گلی میں موت کا سناٹا چھا گیا ـــــ پاشو بھاگتا بھاگتا اپنی پرانی پناہ گاہ میں جا چھپا۔ پولیس انسپکٹر سپاہیوں کے ساتھ اترا ادھر ادھر گلی کے چار چھ مکانوں میں پاشو کی ڈھنڈیا پڑی۔ ہر کل کی طرح انسپکٹر نازکی کی کوٹھری پر آیا۔ پولیس والوں کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نازکی باہر نکل آئی اور بولی۔

"آیئے انسپکٹر صاحب میں پاشو کا پتہ بتاتی ہوں" اور وہ انسپکٹر کو لیے بڑے مکان میں گھس گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو سپاہی پاشو کی گردن میں ہاتھ دیئے دھکیلتے ہوئے اسے باہر لائے اور اسے گالیاں دیتے ہوئے انسپکٹر نے پرچہ چاک کیا۔

گلی کی بوڑھی نائیکاؤں میں اس کے ہم پیشہ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں ـــ "حرامزادی نے آخر پاشو کو دھوکا دیا نا" ماں جی بولی۔

"کل شاید پاشو نے جھاڑ کم دی سالی حرامزادی کو" سرور نے کہا۔

"میں دیکھوں گا سالی کو" بابو نے نالی سے سر باہر نکال کر کہا۔

نازکی پولیس والوں کے ساتھ گلی کے موڑ تک گئی اور جب پاشو کو پولیس والوں نے موٹر میں بٹھالیا اور انسپکٹر بھی موٹر میں بیٹھنے لگا تب نازکی نے انسپکٹر سے انتہائی ملائم لہجے میں کہا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"انسپکٹر صاحب مجھے بھی نازکی سے دعا گھر پہنچا دیجئے میں اب یہ دھندا نہیں کرسکتی، آپ میرا لائسنس کسی کے نام منتقل کر دیجئے۔"

"دیکھو اس رنڈی کو۔ یار پکڑا گیا تو کیسے چکر چلا رہی ہے۔" انسپکٹر نے سگریٹ کا لمبا کش کھینچ کر کہا اور موٹر میں بیٹھ گیا۔ موٹر دھول اڑاتی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور نازکی گلی کے موڑ پر گم سم پتھر بن کر کھڑی رہ گئی۔

ہیرالعل سومیا

محبّت کے سوا بھی...

ویریندر:۔ "وقت اور تجربہ سب کچھ سکھا دیتا ہے۔"

اوما:۔ "چند لوگ تجربے اور وقت سے بھی کچھ نہیں سیکھتے۔"

ویریندر:۔ "میں ان کی بات کرتا ہوں۔ جو تجربے اور وقت سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔"

اوما:۔ "میں ان کی بات کرتی ہوں جو کسی چیز سے کچھ بھی نہیں سیکھتے۔"

ویریندر:۔ "تم ہمیشہ الٹی بات کہتی ہو۔"

اوما:۔ "تم تو سیدھی بات کبھی سوچتے ہی نہیں۔"

ویریندر:۔ "تم ایک چکر ہو، جس کو سمجھنا مشکل ہے۔"

اوما:۔ "تم ایک بھنور ہو جس میں پھنسنے کے بعد نکلنا ممکن نہیں۔"

ویریندر:۔ "تم غضب کرتی ہو۔ تم بھنور میں پھنس رہی ہو۔"

اوما:۔ "یہ تم اپنے دل سے پوچھو۔"

ویریندر:۔ "میرا دل میرے بس میں نہیں ہے۔ اس کا ہر تار تم سے لرز چکا ہے۔!!"

اوما:۔ "اپنے دماغ سے کام لو۔ شاید وہ تم کو راستہ بتلائے۔"

ویریندر:۔ "میرا دماغ بھی تمہاری طوفانی محبت کی وادی میں کھو گیا ہے۔"

اوما:۔ "یہ بات اچھی نہیں۔ دل و دماغ کھو کر تم زندگی کی ناؤ کو کنارے نہیں لگا سکتے۔"

ویریندر:۔ "مجھے کنارے سے سروکار نہیں۔ میں تمہارے حسن کے سمندر میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔"

اوما:۔ "تمہیں تو زمین کا ہی تجربہ نہیں ــــ سمندر کی باتیں کرتے ہو۔"

ویریندر:۔ "تمہارے حسن کے سمندر میں ڈوبنے اور تیرنے میں مجھے بڑا لطف آتا ہے۔"

اوما:۔ "دیوانوں کی سی باتیں نہ کرو ــــ یہ زندگی کھیل نہیں۔ حواس کو قابو میں رکھو۔"

ویریندر:۔ "کسی چیز کو کھوئے بغیر مقصد براری نہ ہوگی۔"

اوما۔ "لیکن مقصد اعلیٰ ہو"

ویریندر:۔ "انسان کا اعلیٰ مقصد محبت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ۔؟"

اوما:۔ "میں تمہارے اس نظریے کو بدلنا چاہتی ہوں"

ویریندر:۔ "مجھے میرے حال پر چھوڑ دو"

اوما:۔ "زندگی اس کا نام نہیں۔ انسان کا مقام بہت بلند ہے۔ اس کو اس بلند مقام سے نیچے نہ گراؤ"

ویریندر:۔ "دنیا میں صرف چاندی کے سکوں کی ۔ سونے کی جھنکار کی ۔ ہرے پیلے نوٹوں کی بڑی قدر ہے"

اوما:۔ "ان روایات کو مٹانا ہوگا"

ویریندر:۔ "یہ چاندی کے سکے سب کچھ کر ڈالتے ہیں۔ بے جان جسم میں جان ڈال دیتے ہیں۔ دیسی کو پردیسی اور پردیسی کو دیسی بنا دیتے ہیں۔ خون کو پسینہ اور پسینے کو خون ۔۔۔ ان چاندی کے سکوں کی کہانی بڑی حیرت ناک ہے۔ یہ حسن اور جوانی کو بھرے بازاروں میں فروخت کر سکتے ہیں۔ حسینوں کو آسمان کی بلندی پر پہنچا سکتے ہیں۔ یا مٹی میں دفن کر سکتے ہیں۔ حسن اور عشق کا چاندی کے سکوں سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ان کی معمولی سی جھنکار عشق کی وادیوں میں سہانے جیون کے سپنوں کو پرلطف مزے دار بنا سکتی ہے"

اوما:۔ "بس بس زیادہ باتیں نہ بناؤ"

ویریندر:۔ "کیوں ۔ بگڑتی ہو۔ میں اپنے تجربے کی بات کر رہا ہوں۔ اس سے تم بھی کچھ سیکھ لو۔ ہماری پُرلطف ہو جائے گی"

اوما:۔ "مجھے ایسے تجربے نہیں چاہیئے"

ویریندر:۔ "یہ تجربے بڑے بے درد ہوتے ہیں۔ کسی کی مجبوری اور اداسی کی وہ پرواہ نہیں کرتے کسی کی جدائی کا انھیں رنج ہی نہیں"

اوما:۔ "مجھے نہیں چاہیئے ایسے بے درد تجربے ۔ انھیں آگ لگا دو"

ویریندر:۔ "تجربے آگ لگانے سے حل نہیں ہو جاتے"

اوما:۔ "آپ کا مطلب کیا ہے؟ اس بے جوڑ بحث و تکرار سے؟"

ویریندر:۔ "ان تجربوں کو سامنے رکھ کر ہمیں زندگی کا ایک نیا تجربہ آزمانا ہوگا"

اوما:۔ "نئے تجربے کی خاطر ہمیں زندگی سے ہاتھ دھونا نہ پڑے"

ویریندر:۔ "ہمیں اتنا بزدل نہ ہونا چاہیئے۔ طاقتور انسان ہمیشہ ایک نیا تجربہ آزماتا ہے"

اوما:۔ "میں بزدل نہیں ہوں۔ میں بھی زندگی کو آزمانا چاہتی ہوں"

ویریندر:۔ "پھر ان شہروں میں کیا رکھا ہے؟ اصل جیون تو دیہاتوں میں ہے"

اوما:۔ صرف دیہات کی زندگی ۔ ؟"

ویریندر:۔ "ہاں ہاں دیہات کی زندگی میں تمہارا اصلی روپ نکھر کر آ جائے گا ۔۔ ہم دونوں آزاد محبت کی وادیوں میں تیرتے ہوئے شاید زندگی گزار سکتے ہیں، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں رہے گا ۔۔ یہاں تو قدم قدم پر زنجیریں ہی نظر آتی ہیں۔"

اوما:۔ "صرف محبت کی وادی میں تیرنا ہی آپ کی زندگی کا مقصد ہے" ؟

ویریندر:۔ "پھر اسی لیے تو ہم دونوں ساری دنیا سے کٹ کر الگ ہو گئے"

اوما:۔ "نہیں میں صرف اس لیے یہاں نہیں آئی"

ویریندر:۔ "پھر ۔۔ مقصد کیا ہے ؟"

اوما:۔ "مجھے ایک ساتھی کی ضرورت تھی ۔۔ جو میری زندگی میں میرا ساتھ دے"

ویریندر:۔ "میں ضرور تمہارا ساتھ دوں گا ۔۔!!"

اوما:۔ "لیکن ایسا ساتھی جو عشق و محبت کی وادیوں میں غوطہ زن ہو ۔۔ مجھے پسند نہیں"

ویریندر:۔ "تم کس قسم کا ساتھ چاہتی ہو" ؟

اوما:۔ "تمہاری گفتگو سے مجھے کچھ مایوسی ہو رہی ہے"

ویریندر:۔ "مایوسی کو امید میں بدل دو"

اوما:۔ "یہ اسی وقت ہوگا ۔۔ جب کہ تم میرے مقصد سے اتفاق کر لو"

ویریندر:۔ "آخر تمہارا مقصد کیا ہے ؟"

اوما:۔ "میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ انسانوں کا ایک گروہ بناؤں جو انسانیت کی حفاظت کا کام کرے"

ویریندر:۔ "انسانیت کی حفاظت کیا بلا ہے ؟"

اوما:۔ "یہ تعمیر ہے۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہو تو تم اس تعمیر میں میرا ساتھ دو ورنہ ۔۔"

ویریندر:۔ "ورنہ کیا؟ ایسا نہ کہو، میری زندگی کی کشتی نہ ڈبو دو"

اوما:۔ "کیا تم مجھ سے تعاون کرو گے ؟"

ویریندر:۔ "ہاں ہاں ضرور"

اوما:۔ "ورنہ رشتہ داروں سے قطع تعلق کر لینے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔"

ویریندر:۔ "مگر اوما! تم مجھے مشکلات ۔ ۔ ۔ ۔ میں نہ الجھاؤ"

اوما:۔ "تم مرد لوگ کیسے بزدل ہوتے ہیں ۔۔ چلو کچھ جوانمردی ہو۔ یہ کام تو دراصل مردوں کے کرنے کے ہیں ۔۔ لیکن مردوں میں ہمت کہاں"

ویریندر۔ "تم مردوں کی توہین کر رہی ہو — آخر ان کا قصور کیا ہے — یہی نا کہ جو کام ان کے کرنے کے ہیں، انھیں بالائے طاق رکھا — اور خود عورتوں کو بھی نکما بنا ڈالا — لیکن عورتوں نے کیا کیا؟

اوما۔ "وہ کیا کریں"

ویریندر۔ "معاشرہ کی تعمیر — عورت اور مرد دونوں ہی کے کرنے کا یہی ایک کام ہے"

اوما۔ "یہی وہ اعلیٰ مقصد ہے جس کے لیے میں نے ایک ساتھی کی تلاش میں اپنوں سے بائیکاٹ کیا"

ویریندر۔ "اور میرے ساتھ ہوگئیں"

اوما۔ "ہاں ہاں تمھارے ساتھ — ایک اعلیٰ مقصد کے لیے لیکن تم.... تم تو...."

ویریندر۔ "پھر تو اتفاق کرلو"

اوما۔ "میں نے اتفاق کرلیا"

ویریندر۔ "چلو ہماری تعمیری کشتی بحر حیات میں طوفانوں کا مقابلہ کرے گی، اور مشکلات کی موجوں کو چاٹتی ہی چلے گی"

شجاع احمد قائد ریڈیائی ڈرامہ

جب آنکھیں چار ہوتی ہیں

کردار

۱	گرجا	نوکر
۲	حنا	شوخ عورت (غیر شادی شدہ)
۳	رعنا	لیڈی ڈاکٹر
۴	عرشی	ذہنی ڈاکٹر
۵	آدم شمسی	شوخ مرد (غیر شادی شدہ)

صوتی اثرات

۱۔ بارہ اور پانچ کا گھنٹہ ۲۔ گلدان ٹوٹنے کی آواز

(بارہ کا گھنٹہ ـــ دروازے بند کرنے کی آواز)

گرجا۔ نمستے بی بی جی۔

حنا۔ نمستے گرجا ـــ کہو دوا خانہ بند ہو رہا ہے۔

گرجا۔ ہاں بی بی جی ـــ دو بج گئے پہر ہوئے گئی۔

حنا۔ تم لنگڑا کیوں رہے ہو۔

گرجا۔ کا بتائی بی بی جی ـــ مسین لے کے آوت رہین ـــ ٹھوکر لاگی ـــ ڈھا پٹ ہوئی گئی بی بی جی ـــ

حنا۔ ارے۔ رے رے۔ کونسی مشین گرجا۔

گرجا۔ وہ جو کٹ پٹ کٹ پٹ کرت ہے

حنا۔ (سوچتے ہوئے) کٹ پٹ کٹ پٹ۔

گرجا۔ ارے بی بی جی وہے ـ چھوٹا وہے وہ کا۔ ارے وہے ـــ ماروہیں لاگے ہوئیں۔

حنا۔ (زور کا قہقہہ) اچھا اچھا ـــ تم نے تو کمال کر دیا گرجا ـــ بھئی خوب نام رکھا ٹائپ رائٹر مشین کا مگر میرے خیال میں تو یہ نام تمھاری ڈاکٹر بی بی کا ہونا چاہیے تھا

گرجا۔ یہ کیسے بی بی جی۔

حنا۔ وہ بھی تو اس مشین کی طرح کام کرتی ہیں۔

گرجا۔ ڈاکٹر بی بی ـــ کیسے۔

حنا۔ ارے توبہ — بات خواہ کہیں کی کریں —
نشانہ "وہیں" کا باندھتی ہیں۔
گرجا۔ "وہیں" سے کا مطلب بی بی جی۔
حنا۔ اوں ہوں تم تو سمجھتے ہی نہیں —
ارے شادی۔
گرجا۔ (ہنستے ہوئے) — سادی —
ٹھیک کہت ہو بی بی جی — اب دیکھو نا ہمار سادی
کرائے دیہن پکڑ دھکڑ کے۔
حنا۔ (زور سے ہنستے ہوئے) کیا کہا گرجا۔ تمہاری
شادی — سچ کہو گرجا۔
گرجا۔ ساچی کہت ہوں بی بی جی۔
حنا۔ ارے رے رے جبھی تم گھر سنے لگے گرجا جی
— اس گرانی میں یہ پریشانی۔
گرجا۔ کا بتائی بی بی جی — ہمار تا دھوبی کے کپڑے
کا جیسو چھانٹے ڈارت ہے — کوٹھریا پلپلائے گئی۔
حنا۔ تو ڈاکٹر بی بی سے کہو — وہ تمہاری
تنخواہ بڑھا دیں — شادی الونس تو بہرحال
تم کو ملنا چاہیئے۔
گرجا۔ کہا رہے تو کہن دواکھانے کی آمدنی بڑھ
جائے تب بڑھائے دے ہیں
حنا۔ تمہیں معلوم ہے جب سے تمہاری ڈاکٹر بی بی
نے دواخانے کو شادی خانہ بنا دیا ہے تب سے تو
آمدنی ہی آمدنی —
گرجا۔ سادی کھانہ۔
حنا۔ (ہنستے ہوئے) تو پھر او کیا — ہر ایک کی
شادی انھوں نے اپنے ذمے لے لی ہے۔

گرجا۔ یہ جانے ما کو پہنت ہے بی بی جی۔
حنا۔ یہ تم پہلے اپنے جی سے پوچھو۔
گرجا۔ ہمار بھلی چلائی بی بی جی — ہم
تابعدار ہیں۔
حنا۔ تو پھر بنے رہو تابعدار (ہنستی ہوئی
اندر چلی جاتی ہے)

. . . . . .

ڈاکٹر رعنا۔ او ہو حنا — تم آگئیں۔
حنا۔ ہم تو آگئے لیکن وہ۔
رعنا۔ وہ کون؟
حنا۔ جن کا اتنے اہتمام سے انتظار ہو رہا ہے۔
رعنا۔ کیس کا۔
حنا۔ یہ تم بتاؤ (ہنستی ہے)
رعنا۔ ذہنی ڈاکٹر آنے والے ہیں۔
حنا۔ افسوس۔
رعنا۔ کیوں، کیوں۔
حنا۔ آخر آگئی یہ نوبت — ہم تو عرصے سے کہہ رہے
تھے ایک نہ ایک دن یہ حشر آپ کا —
رعنا۔ میرا نہیں تمہارا۔
حنا۔ حالانکہ احساس کمتری کے بجائے احساس برتری
کا شکار تم ہو، سمجھی ہو۔ "بالنسو" ہوتی تو تمہارے
دواخانے کی شیشیاں دھویا کرتی۔
رعنا۔ ڈاکٹر رعنا کو تم نے نہ معلوم کیا سمجھ رکھا ہے
— یہ دنیا پروپیگنڈے کی ہے اور ہم پروپیگنڈے سے
بھاگتے رہیں۔

حنا۔ ارے واہ — پروپیگنڈا تو خوب ہو رہا ہے

آپ کے دواخانے کا۔

رعنا۔ کہاں۔

حنا۔ اس دنیا میں جہاں اِس وقت تک آپ سینکڑوں کو بھیج چکی ہیں۔

رعنا۔ ذہنی ڈاکٹر ہی اس کا تصفیہ کرسکتا ہے۔

حنا۔ کاہے کا۔

رعنا۔ کہ تمہاری یہ غیر سائنٹفک قسم کی حاضر جوابی کس قسم کی بیماری سے متعلق ہے۔

حنا۔ آپ کی رائے میں تو لاعلاج ہوگا یہ مرض۔

رعنا۔ اس کا تعلق جسم سے نہیں ہے ذہن سے ہے اور میں ——

حنا۔ اچھا ان ڈاکٹر صاحب کا نام۔

رعنا۔ (ذرا ٹھہر کر مسکراتے ہوئے) مرضی۔

حنا۔ تو فرشتی نظروں سے نام بتلانے کی کیا ضرورت تھی۔

رعنا۔ فرشتی نظریں —— (مسکراتے ہوئے) بہت خوب نک بندی کرتی ہو —— اچھا چلو چلو ابھی موضوع پر سہی ——

حنا۔ بات صاف ہے یعنی آپ کا کام ہے اچھے بھلے آدمیوں کو مریض بنا کر مسٹر مرضی کے ملاحظہ میں پیش کرنا اور کمیشن ——

رعنا۔ ہا —— نہ اِدھر کی رہی نہ اُدھر کی بیچاری۔

حنا۔ یہ تو تم کئی بار کہہ چکی ہو۔

رعنا۔ آج سے دوسرا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور سلسلہ جاری رہے گا۔

حنا۔ کب تک۔

رعنا۔ جب تک تم کسی طرح کی نہ ہو جاؤ۔

حنا۔ یعنی۔

رعنا۔ شادی نہ ہو جائے (ہنستی ہے)

حنا۔ (زور کا قہقہہ) میری سمجھ میں آج تک نہ آیا کہ میری شادی میں تمہارے جیسے براتی کو کیا ملے گا (ذرا اونچی آواز) کیا دنیا میں الوؤں کی کمی ہوگئی ہے۔

رعنا۔ فی الوقت تو نشانے پر آپ ہی رہیں۔ (ہنستی ہے)

حنا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں عنقا کا آشیانہ بہت بلند ہوتا ہے۔

رعنا۔ بات آشیانے اور مکان کی نہیں وہ تو عرش سے پرے بھی ہوسکتا ہے۔

حنا۔ پھر۔

رعنا۔ عملی زندگی کی ہے جس میں ہر قدم پر فرہادیت کی ضرورت پڑتی ہے۔

حنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک دو دل ایک نہ ہوں گے دودھ کی نہر جاری نہ ہوسکے گی۔

رعنا۔ ہاں۔

حنا۔ لیکن شاید تمھیں نہیں معلوم کہ دو دل ایک ہوتے ہی نہیں۔

رعنا۔ ارے واہ —— ہوتے کیوں نہیں۔

حنا۔ ہو جاتے تو زندگی دلدل نہ بنتی۔

رعنا۔ دلدل —— ہنہ —— مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے —— ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں —— کاش تم اس لفظ کو اپنے نہیں بلکہ دنیا کے کانوں سے سنتیں حنا۔

حنا۔ کون لفظ۔

رعنا۔ شادی —— کتنا رسیلا اور نشیلا ہے۔

—— اس کے تصور ہی سے حسن و نغمہ انگڑائیاں لینے لگتے
ہیں — کوئی ذہن، خواہ وہ کتنا ہی سنجیدہ اور رنجیدہ
کیوں نہ ہو شادی کے نام ہی سے لہرا جاتا ہے — ہا ہا
ہا ہا — صبح کا سہانا وقت ہے پہاڑوں کی چوٹیاں
زرکار کرنوں کا سہرا — اور وہ — اور — اور وہ۔

حنا۔ (ہنستے ہوئے) صبح کا وقت اور شادی۔
تم تو اس کی شام سے واقف ہوگی، اور وہ بھی سنی سنائی۔
شادی کی شام —— (تالیاں بجا کر) آہیں
آنسو، ناشادی، بربادی۔

رعنا۔ کیا تاریکیوں کے جال میں جا کر پھنس گئی
بیچاری —— شادی کی یہ شام دیکھو — پرکیف فضاؤں
کا دلکش ماحول —— البیلی ہواؤں کی چھیڑ —— زمین پر
لہراتی اور بل کھاتی ندی کی موجیں — آسمان پر رنگین
دھنک کا جھولا —— مستی و شباب میں ڈوبے ہوئے
نوارے — لغزشیں اور دلنشیں سہارے من موہنے
منظر اور نظارے —— رسیلی اور نشیلی صدائیں — کٹیلی
اور سجیلی ادائیں —

حنا۔ بلائیں و بائیں —— بس ختم بھی کرو
اپنی آئیں بائیں شائیں —— ایک تو تم عورت ہو،
سمجھیں، دوسرے ڈاکٹر، جس کے دماغ میں چاروں طرف
کڑوی کسیلی دوائیں بہہ رہی ہیں۔ متعفن زخم اور سڑی ہوئی
بیماریاں، ہر طرف خیمہ زن، تم کیا جانو رسیلی اور نشیلی اداؤں
کا بانکپن اس کے لیے تو حسین ہوش و حواس اور حسین
قلب و دماغ کی [illegible] ہے۔

رعنا۔ تو سمجھ [illegible] ہیں؟

حنا۔ آپ، آپ دنیا کا آٹھواں عجوبہ —

رعنا۔ کیسے۔

حنا۔ جو دماغ کبھی صحت مند جسم و دماغ
ہی نہیں ہوا وہ کیا دعویٰ کر سکتا ہے حسن کی دنیا کو سمجھنے کا
لیکن آپ مدعی ہیں۔ سنیئے بیگم صاحبہ اس دور کا
شاعری کا موضوع نہیں، یہ تو جوانی کے ڈرامے ا
زندگی کے خاتمے کا سین ہوا کرتی ہے۔

رعنا۔ ہوں۔

حنا۔ اور اگر کوئی آپ جیسا باکمال اناڑی
مطلب ہے ڈرامہ یا فلم نویس — اس سے آگے قدم
بڑھاتا ہے تو ہال ایک دم خالی ہو جاتا ہے۔

رعنا۔ ہوتا کیا ہے اس سین میں۔

حنا۔ دیکھو گی —— لو دیکھو —— وہ سامنے
ایک گھر کباڑ خانے یا نقار خانے کا نقشہ پیش کر رہا ہے
قدم قدم پر غلاظتیں اور کثافتیں —— بیماریاں اور
آہ و زاریاں —— ہر سانس خطرے کا سائرن ——
بھیانک اور ڈراؤنا —— اور ان سب سے گرتے پڑتے
بچتے ہوئے ایک ہستی کسی دوسری ہستی کی بے چینی سے منتظر۔

رعنا۔ دوسری ہستی کی۔

حنا۔ ہاں —— اور وہ دیکھیے انتظار کی گھڑیاں
ختم ہوئیں اور داخل ہوئی وہ دوسری ہستی —— سُتا
ہوا جسم، پچکی ہوئی کھوپڑی —— اور بڑھ چلی اپنی منتظر
ہستی کی جانب اور "پی کہاں"، "پی کہاں" کی رٹ لگانے
والی ہستی نے دیکھتے دیکھتے گھر کا بیمار اور غلیظ نقشہ
اس غریب کے دماغ میں اتار دیا۔

رعنا۔ کیسے۔

حنا۔ مثلاً "اے" [illegible]

پیٹ پھولا ہوا ہے۔ ایٹا کی سخت ضرورت ہے" بی "
بخار میں بھن رہا ہے" پی" کو پیشاب نہیں ہو رہا ہے
" ٹی" کو ٹیکے کی ضرورت ہے" کے " کالی کھانسی میں
مبتلا ہے اور گھر میں ایک پیسہ نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔

رعنا۔ ہوں۔

حنا۔ اب یہ سنیے کہ اس اٹھی حلے کا ہیرو پر کیا اثر پڑتا ہے۔

رعنا۔ کیا۔

حنا۔ وہی جو تقریباً ہیروشیما پر پڑا تھا ـــــ غریب بچے کچھے ہوش و حواس اور بھی جیبیں سنبھال "ڈی کہاں" "ٹو ڈی کہاں" کا نعرہ لگاتا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا ہے اور یہ بیچاری پھر انتظار کی ـــــ

رعنا۔ خوب۔

حنا۔ ابھی نہیں ـــــ اور سنو۔

رعنا۔ سناؤ سناؤ۔

حنا۔ یہ دونوں اپنے اپنے اپنے کردار کو اس وقت تک ایک دائرے کی شکل میں ادا کرتے رہتے ہیں جب تک کہ بیٹھے بلکہ آج کے زیرو کل کے ہیرو نہ بن جائیں

رعنا۔ آج کے زیرو کل کے ہیرو ـــ کل کے ہیرو آج کے زیرو ـــ اچھی ابتدا اور انتہا دکھائی ـــ اس میں فلسفہ اور شاعری دونوں ہیں۔

حنا۔ فلسفہ اور شاعری کے چکر میں ہوں گی آپ، ہم تو حقیقت کے پرستار ہیں، سنیے ڈاکٹر صاحبہ ـــــ موجودہ بیمار زندگی کا ہر ہیرو دور سے ہیرو اور قریب سے زیرو ثابت ہوتا ہے۔

رعنا۔ اس کا مطلب۔

حنا۔ کسی نہ کسی ہیرو یا عرف زیرو کی تلاش۔

رعنا۔ خوب ـــ اس کے بعد۔

حنا۔ اس کے بعد طاپہ اور پھر محبت کے جھولے میں جھول جھول کے اس نغمے کا الاپ۔

رعنا۔ کس نغمے کا۔

حنا۔ پیشنٹ پیدا کرو ـــ پیشنٹ ـــ نرالا اور انوکھا پیشنٹ ـــ شاندار اور طرح دار پیشنٹ ـ جسمانی، ذہنی اور روحانی پیشنٹ تاکہ زندگی کا ہر شعبہ ناقابلِ علاج مریض کی صورت اختیار کرلے اور قدم قدم پر بیمار زندگی پہاڑ جیسے مسائل سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

رعنا۔ تو تم کو نہ تو محبت سے لگاؤ ہے نہ شادی سے

حنا۔ کیوں کہ دونوں بیمار ہیں اور میں نہ تو بیمار ہونا نہ بننا چاہتی ہوں۔

رعنا۔ تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تم اس وقت ایک ڈاکٹر کے سامنے ہو۔

حنا۔ اس لیے میرا بیمار ہونا ضروری ہے (دونوں ہنستے ہیں)

رعنا۔ دیکھو حنا ذرّے سے لے کر آفتاب تک ایک قانون جاری و ساری ہے اور تم ہو کہ اس مصرعے کا سہارا لیے کھڑی ہو۔

حنا۔ کس مصرعے کا۔

رعنا۔ وہی گھسا پٹا مصرعہ ـــ پر طبیعت ادھر نہیں آتی۔

حنا۔ پھر کیا کروں۔

رعنا۔ بات پورے شعر سے بنتی ہے ـــ شعر جس

حنا۔ دونوں شادی شدہ۔

رعنا۔ جیسے تم جانتی ہی نہیں ـــ جب تک دونوں مثبت اور منفی سرے غیر شادی شدہ رہیں تاثر کا تخلیقی عمل ظہور پذیر نہیں ہوتا۔

حنا۔ (زور سے ہنستے ہوئے) کیا بات پیدا کی ہے ڈاکٹر رعنا ـــ جواب نہیں ہے تمہارا۔

رعنا۔ تو پھر مان جاؤ۔

حنا۔ ہم تو تمھیں مان گئے مگر تم بھی مان جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو شعر و شاعری سے میرا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

رعنا۔ مطلب یہ کہ مرغے کی ایک ٹانگ ہی کر ہی جینا چاہتی ہو یعنی "ناشادی" تمہارا مقصد حیات ہے۔

حنا۔ (طنزیہ ہنسی) "ناشادی ـــ میرے خیال میں شادی ناشادی ہے اور نہ شادی شادی۔

رعنا۔ کیسے۔

حنا۔ کبھی مجنوں میں گزر ہوا ہے تمہارا۔

رعنا۔ ہاں۔

حنا۔ تو پھر یاد رکھو لو وہ جو کہو "سینے یا گلے سے لگائے بھی بجا فی فدو یا نہ اداؤں، میں ڈوبی ـــ اور

ع اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گنگنا رہی ہوں ـــ شادی شدہ ہیں ـــ اور جو ـــ سینہ تانے سینا پٹی کی تشریف لے جا رہی ہوں غیر شادی شدہ۔

رعنا۔ مگر حنا میرے خیال میں شادی کے بعد زندگی کا بوجھ تقسیم ہو جاتا ہے کیوں کہ آج کل مرد اور عورت دونوں کماتے ہیں۔

حنا۔ لیکن حنا کے خیال میں ایک گھر کیا بن جاتا ہے

رعنا۔ کیا۔

حنا۔ بے گھر والوں یا نوکروں کی جنت۔

رعنا۔ اور جہاں صرف ایک کماتا ہے۔

حنا۔ دوزخ ـــ جس کی آنچوں میں تم نے بچاری گرجا کو کفنا کر دفن کر دیا۔

گرجا۔ (آتے ہوئے) کیا ہے بی بی جی ـــ ہمارا ذکر کر رہی ہو۔

حنا۔ کچھ نہیں کچھ نہیں (ہنستے ہوئے جلدی سے) وہی "لگے وہیں" والی بات ہے ـــ (انتہائی تیزی سے) تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔

گرجا۔ ایک لڑکا آیا ہے اور یہ چٹھی دے گیا ہے بی بی جی۔

رعنا۔ لاؤ ادھر دو ـــ (چٹھی ہاتھ میں لے کر کھولتے ہوئے) چٹھی تو ڈاکٹر عرشی کی معلوم ہو رہی ہے (پڑھتی ہے)۔

"ڈیر ڈاکٹر رعنا! ـــ معاف کرنا میں ایک مریض کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ بر وقت نہ آنے کی معافی چاہتا ہوں ـــ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ ہوگی۔

عرشی

حنا۔ تو یہ آپ جانتے ہیں مسٹر عرشی۔

رعنا۔ تو تم کیا سمجھ رہی تھیں۔

حنا۔ خیالی سایہ۔

رعنا۔ کافی دلچسپ ہو۔ ارے بھئی عرشی میرے اور رانی کے بچپن کے دوست ہیں۔ ہم تینوں ایک ہی کالج میں زیر تعلیم تھے۔ انھیں ذہینا [illegible] سے دوستی تھی اسی

صب

لیے جرمنی اور امریکہ چلی گئے اور وہاں سے نفسیاتی علاج کی اعلیٰ ڈگریاں لے کر واپس ہوئے۔

حنا۔ اور آپ کے "وہ" تو شاید عنقریب —

رعنا: اگلے سال یہیں ہوں گے۔

حنا۔ اچھا انھیں یہاں آکر کتنے دن ہوئے۔

رعنا۔ یہی کوئی دو مہینے۔

حنا۔ ان کا دواخانہ۔

رعنا۔ عمارتوں کی قلت کی وجہ سے انھیں کوئی موزوں مقام نہ مل سکا میں نے کہا جب تک آپ کو مناسب مقام ملے میرا دواخانہ حاضر ہے۔

حنا۔ اچھا فی الوقت۔

رعنا۔ فی الوقت تو جس عمارت میں ہو کافی ناموزوں ہے۔

حنا۔ اچھا اگر انھوں نے ادھر کا رخ فرمایا تو تم کدھر۔

رعنا۔ صرف بالائی منزل انھیں دے دیں گے۔

حنا۔ سر اور جسم کی رعایت سے عمارت کی تقسیم مناسب ہی رہے گی۔

رعنا۔ (ہنستے ہوئے) ہاں — مگر سوال مریضوں کا ہے۔

حنا۔ مریض — اور وہ بھی ذہنی — (زور سے ہنستے ہوئے) "کیو" لگ جائے گا۔ اگر بالفرض دونوں پلڑوں میں کوئی اونچا اور کوئی نیچا ہو بھی جائے تو ادھر کا ادھر اور ادھر کا ادھر کر کے ترازو کو متوازن کیا جا سکتا ہے —

رعنا۔ کیا مطلب۔

حنا۔ جسمانی مریض کو ذہنی اور ذہنی کو جسمانی بنا دینا آپ دونوں کے لیے کونسی بڑی بات ہوگی (دونوں کی ہنسی)

رعنا۔ صرف بکواس کرنا آتا ہے — کام کی بات کا کوسوں پتہ نہیں۔

حنا۔ کام کی بات۔

رعنا۔ ہاں۔

حنا۔ مثلاً۔

رعنا۔ مثلاً ہم یہ چاہ رہے ہیں کہ ذہنی دواخانے کا افتتاح کسی ایسے مریض سے ہو جو ہمارے لیے مبارک ثابت ہو۔

حنا۔ تو لا۔

رعنا۔ ابھی تو کچھ کہہ نہیں سکتے۔

حنا۔ تو میں اپنے کو پیش کر دوں۔

رعنا۔ (ہنستے ہوئے) ارے تم تو ہو ہی۔

حنا۔ آخر میرے پیچھے پنجے جھاڑ کر کیوں پڑ گئی ہو۔

رعنا۔ جو اس پورے گلوب کو دواخانہ اور تین ارب کی آبادی کو پیشنٹ سمجھے — وہ —

حنا۔ ڈاکٹر صاحبہ میرا ایک ایک حرف ستاروں سے لکھنے کے قابل ہے اگر جسمانی کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی دواخانے بھی کھول دیئے جائیں تو دعویٰ سے کہتی ہوں ایک فرد بھی آپ کو باہر نہیں دکھائی دے گا۔

رعنا۔ ایک دم پاگل خانے میں داخل کر دینے کے قابل ہو۔

حنا۔ تو پھر میں ہوں کہاں (ہنستی ہے)

رعنا (کافی متاثر) دیکھو حنا سنجیدہ ہو جاؤ ذرا — آخر تم کب تک زندگی سے کھلونے کی طرح کھیلتی رہو گی۔

حنا۔ اچھا بھئی دوسرا کھلونا ہی سہی — ہے

کوئی ـــ ارے تم تو ایک دم کارٹون بن گئیں۔

رعنا: (خوشی سے) تو تم ـــ میرا مطلب یہ تھا کہ ـــ تاریکی روشنی کی طرف ـ اور "نہیں" "ہاں" کی جانب حنا: میں خوشی سے ـــ

حنا: (جلدی سے) پاگل ہو جاؤں گی ـ سچ مچ بڑا نیک خیال ہے کیونکہ میں اس پاگل پن سے ایک دم چھٹکارا پا جاؤں گی۔

رعنا: پھر وہی ـ حنا بالکل سیریس ہو جاؤ۔

حنا: برداشت نہ کر سکو گی۔

رعنا: کیوں۔

حنا: جو میری ہنسی نہیں برداشت کر سکتا وہ ـــ

رعنا: نہیں نہیں۔

حنا: اچھا تو ایک دم سیریس ـــ یعنی یعنی ایک دم دولہا وانٹیڈ۔

رعنا: ایک دم، دیکھو پھر تم ـــ تمہاری باتیں ـــ

حنا: لیکن اب باتوں کی نہیں، کام کی بات ہونا چاہیئے ـــ ابھی اسی وقت۔

رعنا: کیا مطلب۔

حنا: مطلب وطلب کیا بھئی ہم تم تو اس دنیا میں رہ بس رہے ہیں جس میں ہر چیز ریڈی میڈ ملتی ہے۔

رعنا: دولہا بھی ریڈی میڈ ـــ یعنی کپڑے کا گڈا ـــ ہم نے تم سے ابھی سنجیدہ ہو جانے کو کہا تھا۔

حنا: تو پھر ہم پھر سنجیدہ کب ہیں ـ فرمایئے

شادی کس کے ساتھ، کہاں اور کس طرح۔

رعنا: سب کچھ تمہاری مرضی پر منحصر ہوگا ـ جو تم کہو گی وہی ـــ

حنا: میں جو کہوں گی۔

رعنا: ہاں ہاں۔

حنا: میں کیا کہوں گی تم کو تو خود ہی معلوم ہو

رعنا: زمانہ انقلابی ہے۔

حنا: ہاں ـــ یعنی دولہا کی جگہ دولہن نے لی ہے ـ اور ـــ

رعنا: لیکن عام طور پر تو نہیں اس لیے خاص طور پر تلاش کریں گے ایسے دولہا کو جو ـــ

حنا: عورتوں کے تمام کام انجام دے سکتا ہو۔

رعنا: تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم ذہنی کے ساتھ ساتھ جسمانی انقلاب سے بھی دوچار ہو مجھے تمہارا طبی معائنہ کرنا پڑے گا۔

حنا: ارے ہم تو نہ معلوم کب سے آپ کے تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں (ہنستی ہے)

رعنا: آخر تم سے کیسے کہیں کہ تم سنجیدہ ہو جاؤ۔

حنا: اچھا بھرپور سنجیدہ ہونے سے پہلے ایک سوال کا جواب دے دو۔

رعنا: ہوں ـــ

حنا: تم ڈاکٹر ہو ـــ بتاؤ، بھرپور صحت کا کوئی تصور ہے تمہارے ذہن میں۔

رعنا: ہاں ـ آں۔

حنا: ہاں آں نہیں بھرپور "ہاں" کہو اور اس کے بعد بتاؤ اس تصور کے مطابق کوئی چلتی پھرتی تصویر

بھی دیکھی تم نے اپنی اس دنیا میں۔

رعنا۔ مطلب کیا ہے تمہارا۔

حنا۔ میں عورت کی اس ناقابل برداشت ذلت کو برداشت نہیں کرسکتی کہ وہ اب تک بھرپور زندگی کی صحت مند لذت سے محروم ہے میرا ایک ہی نعرہ ' ہے کوئی صاحب دل" جو ——

رعنا۔ ارے تو چلیں کہاں ہو — تلاش کرنے۔

حنا۔ (جاتے ہوئے) کہیں نہیں تم ٹیلی فون کرو ہم آتے ہیں۔

رعنا۔ کس کے لیے — کہاں۔

حنا۔ نئے آدم کے لیے — جنت کو ——
(ہنستی ہوئی چلی جاتی ہے)

(وقفہ) ۳ سکنڈ

عرشی۔ (آتے ہوئے) کہو ڈاکٹر رعنا کیا ہو رہا ہے۔

رعنا۔ انتظار۔

عرشی۔ کس کا۔

رعنا۔ آپ کا۔

عرشی۔ مگر میں سوچ رہا ہوں کہ میرے یہاں آجانے سے کوئی زحمت۔

رعنا۔ زحمت، زحمت کیسے ہو سکتی ہے۔

عرشی۔ تو پھر کل ہی ہم آجائیں گے۔

رعنا۔ آج ہی کیوں نہیں۔

عرشی۔ آج — آج تو کیا بتائیں۔

رعنا۔ کہیے کہیے۔

عرشی۔ میں نے رقعے میں ایک مریض کا ذکر کیا تھا۔

رعنا۔ ہاں۔

عرشی۔ (ہنستے ہوئے) عجیب مریض ہے — میرے خیال میں تو وہ اچھے اچھوں کو مریض بنا دے۔

رعنا۔ مرض کیا ہے۔

عرشی۔ اپنے کو غیر معمولی سطح کا — یعنی یعنی کچھ آسمانی قسم کی شخصیت سمجھنا۔

رعنا۔ (ہنستے ہوئے) آج کل تو ہر ایک اڑ رہا ہے — یہ مرض تو عام ہے۔

عرشی۔ مگر اس مرض کی زد میں اس کے غریب ماں باپ آرہے ہیں۔

رعنا۔ (ہنستے ہوئے) یہ کیسے۔

عرشی۔ بھئی وہ چاہتے ہیں کہ جلد از جلد اس کی شادی کرا دی جائے اور یہ اس دھن میں ہیں کہ جنت کی حور بھی ان کے معیار پر پوری نہ اترے۔

رعنا۔ خوب — اچھا جلد از جلد شادی کیوں چاہتے ہیں —— شاید کوئی لڑکی ہوگی ان کی نظر میں۔

عرشی۔ ضعیف ہیں — اور

رعنا۔ ٹھیک ہے — ٹھیک ہے —— اچھا ان کی مالی پوزیشن۔

عرشی۔ کافی بہتر ہے۔

رعنا۔ (مسکراتے ہوئے) اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچوں گھی میں۔

عرشی۔ (مسکراتے ہوئے) ہاں — بشرطیکہ

رعنا۔ بشرطیکہ۔

عرشی۔ پندرہ دن کے اندر شادی کرا دی جائے۔

— میں نے کافی غور کیا مگر عقل —

رعنا۔ کولمبو والے دائرے میں چکر کاٹ رہی ہے۔

عرشی۔ (ہنستے ہوئے) ہاں۔

رعنا۔ مثلث بھی تو جھگڑا ہے۔

عرشی۔ مثلث — کونسا مثلث۔

رعنا۔ ڈاکٹر، مریض اور سرپرست — اس میں کوئی دوسرا داخل بھی کس طرح ہو سکتا ہے۔

عرشی۔ دوسرا یعنی کون — تم اپنے کو تو نہیں کہہ رہی ہو۔

رعنا۔ ہاں — کیونکہ یہ مسئلہ نفسیاتی امراض سے متعلق ہے اور میں جسمانی۔

عرشی۔ اوہو — تم نے تو کمال ہی کر دیا

رعنا۔ ارے بھئی ہر علم میں کامن سنس کو بڑا دخل ہے اور یہ تو شادی کا مسئلہ ہے — اور — تم عورت ہو۔

رعنا۔ جی — اچھا عرشی صاحب یہ بات تو کچھ عام ہی ہے کہ ہر اثبات میں نفی اور ہر نفی میں اثبات کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔

عرشی۔ (مسکراتے ہوئے) جی — آگے چلیے۔

رعنا۔ یعنی اگر آپ کا مریض صاحب حسن ہے تو۔۔ صاحب عشق بھی ہوگا — میرے خیال میں ڈائنامک فورس والا حسن اس کے سامنے آ جائے تو فوراً جھک جائے گا —

عرشی۔ تمہارا مطلب ہے کہ۔

رعنا۔ جی ہاں — جب آنکھیں چار ہوتی ہوتی ہیں سماں کچھ اور ہوتا ہے۔

عرشی۔ رعنا خوب خوب — خوب لیکن رعنا۔

رعنا۔ جی۔

عرشی۔ حسن اور وہ بھی اس نوک پلک کا بھلا کہاں سے لایا جائے۔

رعنا۔ ہوں — یہ ایک پرابلم ہے لیکن لیکن —

عرشی۔ لیکن — لیکن کیا — کیا کوئی تیری قسم کا حسن۔

رعنا۔ ہاں — لیکن۔

عرشی۔ آخر ہے کون وہ — جلدی کہو نا۔

رعنا۔ ایک بہن ہے میری سہیلی کی حنا نام ہے حسن — میری سہیلی چاہتی ہے کہ جلد از جلد اس کی شادی ہو جائے اور اس سلسلے میں کافی اصرار کر رہی ہے — میں نے بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا لیکن وہ "آہوئے رم خوردہ" تو کسی طرح —

عرشی۔ (خوشی سے اچھل کر) یعنی وہ بھی اسی مرض کی شکار ہے۔

رعنا۔ ہوں۔

عرشی۔ تو بس ڈاکٹر رعنا — ہو گئی بات — اس وقت تو تم نے وہ کام کیا ہے جو شاید —

رعنا۔ مگر ان دونوں کی یکجائی۔

عرشی۔ ہاں — یہ بھی تو ایک مسئلہ ہے۔

رعنا۔ لیکن ناقابل حل تو نہیں — اچھا آپ ہوٹل کو آرڈر دے دیجیے۔

عرشی۔ آدمیوں کی تعداد۔

رعنا۔ زیادہ سے زیادہ دس۔

عرشی۔ مقام۔

رعنا:۔ ہمارا بالائی کمرہ ـــ جس کی ہم نے پرسوں سیر کرائی تھی۔

عرشی:۔ بھئی رعنا قدم قدم پر تم کو ماننا پڑ رہا ہے ـــ اس کمرے کا رکھ رکھاؤ کتنا موزوں ہے ان مریضوں کے لیے۔

رعنا:۔ شکریہ ـــ اچھا آپ کا وہ ـــ کیا نام ہے اس کا۔

عرشی:۔ کس کا۔

رعنا:۔ آپ کے ہیرو کا۔

عرشی:۔ (ہنستے ہوئے) میرا ہیرو خوب ـــ آدم شمسی ـــ

رعنا:۔ (ہنستے ہوئے) ہاں تو آپ اسے ٹیلیفون کر دیجئے ـــ اور میں ہیروئن کو

عرشی:۔ لیکن۔

رعنا:۔ اب "لیکن" کا کس جملے میں استعمال ہو سکتا ہے۔

عرشی:۔ اجی جناب تقریب ـــ بہر ملاقات۔

رعنا:۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔

عرشی:۔ کیا۔

رعنا:۔ "ذہنی دواخانے کا افتتاح"

عرشی:۔ ہوں، تو ملاقات تنہائی میں ہوگی۔

رعنا:۔ ہاں۔

عرشی:۔ پھر ہم دونوں ـــــ یہ بھی تو ایک ملہ ہے۔

رعنا:۔ مسئلہ وسئلہ کچھ نہیں ـــ میں سب انتظام کیے دیتی ہوں۔

عرشی:۔ کیا۔

رعنا:۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جا کر گرجا کو ضروری باتیں سمجھائے دیتی ہوں۔

عرشی:۔ اچھا جاؤ ـــــ مگر کوئی منتر پڑھ لو کہیں۔

رعنا:۔ کہیں کیا۔

عرشی:۔ پانسہ پلٹ نہ جائے۔

رعنا:۔ آپ تو بس خواہ مخواہ (چلی جاتی ہے تیز تیز)

(پانچ کا گھنٹہ ـــ آنے کی آواز)

آدم شمسی:۔ (آتے ہوئے ۔۔۔۔۔۔) بھئی یہاں کوئی گرجا جی ہیں۔

گرجا:۔ نمستے بابو جی۔

آدم:۔ نمستے نمستے ـــ بھئی تم ہی ہو گرجا۔

گرجا:۔ ہاں صاحب ہمرو ناؤ ہے گرجا۔

آدم:۔ اچھا ڈاکٹر عرشی کہاں ہیں۔

گرجا:۔ بیمار کا دیکھن گئے ہیں صاحب کہن ہے بابو جی آئیں تو انھیں بٹھاؤ۔

آدم:۔ بھئی واہ دلچسپ دعوت ہے مہمان حاضر میزبان غائب۔

گرجا:۔ تم بیٹھو صاحب۔ لیڈو بجاؤ لیڈو ـــ آوتے ہوئی ہیں ـــ ہاں صاحب ادھر نا ہیں ادھر اُپر والے کمرے ما بیٹھو جہ پر لال پردہ پڑا ہے۔

آدم:۔ اچھا اچھا۔

حنا:۔ (آتے ہوئے) گرجا جی

گرجا:۔ کا ہے بی بی جی تم ہو آ گئے گئیں۔

حنا۔ ہاں ـــ تمہاری ڈاکٹر بی بی کہاں ہے۔

گرجا۔ تم بیٹھو بی بی ـــ آپریشن والے کمرے یا ـــ جو پیلا پردہ پڑا ہے ـــ ادھر دوا کھانے کا سپھائی ہو رہی ہے۔

حنا۔ اچھا اچھا (کمرے میں داخل ہوتی ہے)

حنا۔ (آدم سے مخاطب ہوکر) آپ تنہا ہیں۔

آدم۔ تھا ـــ اب نہیں۔

حنا۔ مگر آپ تو ـــ

آدم۔ جی ہاں مخاطب تھا۔

حنا۔ کس سے۔

آدم۔ اس سے جس سے کبھی مخاطب ہونے کا موقع نہ مل سکا۔

حنا۔ آخر کس سے۔

آدم۔ خود سے۔

حنا۔ خوب ـــ موضوع کیا تھا۔

آدم۔ میوزیم۔

حنا۔ میوزیم ـــ کونسا۔

آدم۔ حسن و عشق کا۔

حنا۔ کہاں ہے۔

آدم۔ جہاں آپ ہیں۔

حنا۔ میں کہاں ہوں۔

آدم۔ ملاحظہ فرمائیے۔

حنا۔ (چاروں طرف دیکھتے ہوئے) خوب ـــ یہ کمرہ تو خوب ہے۔

آدم۔ کہیں حسن سر بسجود ہے کہیں عشق محوِ خرام ہے۔

حنا۔ یہ مصرع صحیح نہیں ـــ حسن کی جگہ عشق اور عشق کی جگہ حسن ہونا چاہیئے۔

آدم۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کہا ہے وہ صحیح ہے۔

حنا۔ میں آپ کو ڈاکٹر سمجھ رہی تھی اور آپ نکلے

آدم۔ مستقل مریض۔

حنا۔ مریض اور مستقل ـــ خوب۔

آدم۔ کیوں

حنا۔ ایک مریض کے ساتھی بہت سے ہوا کرتے ہیں ـــ

آدم۔ مثلاً۔

حنا۔ مثلاً ذہنی و جسمانی کمزوریاں ـــ طرح طرح کے نشیب و فراز کے اندیشے۔ اور ـــ اور دلدار اور تیماردار وغیرہ وغیرہ اور یہ تو ایک عام بات ہے۔

آدم۔ اور خاص۔

حنا۔ یہ کہ ڈاکٹر مرشی کے آپ پیشنٹ ہیں ـــ ہیں نا۔

آدم۔ جی ہاں ـــ کیوں۔

حنا۔ پیشنٹ اور وہ بھی ڈاکٹر مرشی کے۔

آدم۔ کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے ہمارے ڈاکٹر مرشی کو

حنا۔ نیم حکیم۔

آدم۔ تو ان سے علاج کرانے والے پاگل۔

حنا۔ یہ بھلا میں آپ کے سامنے کیسے عرض کر سکتی ہوں۔

آدم۔ آپ کو معلوم ہے ان کا دواخانہ کیسا چل رہا ہے۔

حنا۔ شاعری سے آپ کو لگاؤ ہے۔

آدم۔ سوال کا جواب سوال تو نہیں ہوا کرتا۔

حنا۔ لیکن اگر سوال ہی سے جواب کا تعلق ہو تو ـــــ

آدم۔ اچھا تو سنیے ـــــ اکثر شاعر سے متفق ہوتے رہتے ہیں۔

حنا۔ کہاں۔

آدم۔ میرے دل و دماغ میں۔

حنا۔ یہ تو سودا ہے۔

آدم۔ یہ تو ہر سر میں پایا جاتا ہے۔

حنا۔ اچھا تو آپ ان کے ٹٹو سے ناواقف نہ ہوں گے۔

آدم۔ کس کے۔

حنا۔ سودا کے۔

آدم۔ جی ہاں ـــ مگر۔

حنا۔ مگر کیا ـــ کہہ بھی ڈالیے ـــ آپ کو ہکلانے سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔

آدم۔ اچھا تو آپ کا مطلب ہے کہ ڈاکٹر رشی کا دواخانہ سودا کے ٹٹو کی طرح چل رہا ہے۔

حنا۔ جی۔

آدم۔ مگر ایسے ڈاکٹر تو مکھیاں مارتے رہتے ہیں ـــ

حنا۔ خیر آدمی تو نہیں۔

آدم۔ بڑی حاضر جواب ہیں آپ

حنا۔ اور بڑے غیر حاضر جواب ہیں آپ

آدم۔ (سوچتا ہوا انداز) میرا خیال ہے میں آپ سے ناواقف نہیں۔

حنا۔ مجھ سے۔

آدم۔ جی ہاں ـــ آپ ہیں مسز ـــ مسز یعنی میں اس وقت ان کا نام بھول رہا ہوں۔ بھلا نام ہے ان کا یعنی آپ کے وہ ـــ اس آفس میں ہیں جس میں یہ خاکسار بھی ہے ـــ بیچارے کچھ خاموش خاموش سے میرا مطلب ہے ـــ گونگے گونگے بے زبان سے ہیں ـــ سارا اسٹاف غریب پر ہنستا رہتا ہے۔ میرے خیال میں آپ ان کے ساتھ ہی چارا کیجیے تاکہ آپ کی زبان ان کو اپنی بے زبانی کے احساس سے محفوظ رکھ سکے۔

حنا۔ ارے توبہ ـــ اب میں نے آپ کو پہچانا ـــ تو وہ ہیں آپ ـــ میں بھی جب سے سوچ رہی تھی۔ سمجھ میں کچھ بھی نہ آرہا تھا۔

آدم۔ کون ہوں میں۔

حنا۔ ارے صاحب آپ کا غائبانہ تعارف آپ کے ساتھی مسٹر بے زبان نے کروایا تھا ـــ کب تشریف لائے آپ۔

آدم۔ کہاں سے۔

حنا۔ مینٹل ہاسپٹل سے۔

آدم۔ اچھا اچھا تو معاف فرمائیے ـــ آپ کے کوئی وہ وہ "نہیں یعنی آپ غیر شادی شدہ ہیں ـــ کیا میں آپ کا نام دریافت کر سکتا ہوں۔

حنا۔ یقیناً۔

آدم۔ تو فرمائیے۔

حنا۔ یہ تو کوئی ضروری بات نہیں کہ میں بتلا بھی دوں۔

آدم۔ میں پہلے ہی اپنا نام بتلا دیتا لیکن قانون کے

اعتبار سے آپ کی انسلٹ ہو جاتی ہے۔

حنا:۔ قانون ۔۔۔ کون سا قانون۔

آدم:۔ وہی ول نون قانون ۔۔۔ لیڈیز فسٹ والا ۔۔۔ لیکن چونکہ آپ کو اس قانون کا کوئی لحاظ نہیں لہٰذا سنئے ۔۔۔ سب کے سب کہتے ہیں مجھے آدم۔

حنا:۔ آدم ۔۔۔ اور مجھے ۔۔۔

آدم:۔ حوا۔

حنا:۔ جی نہیں حنا۔

آدم:۔ حنا ۔۔۔ وہ جو پتھر سے ٹکرانے نہیں بلکہ پس جانے پر رنگ لایا کرتی ہے ۔۔۔ توبہ بڑی سخت جان ہوتی ہے عجیب نام ہے۔

حنا:۔ لیکن میرا ہے آپ کا نہیں ۔۔۔ یہ آپ اوپر کیا گھور رہے ہیں۔

آدم:۔ مخاطب ہوں ۔۔۔ بڑا افضل کیا اس نے۔

حنا:۔ کہ میاں ہمارا آپ کا ساتھ ہو گیا۔

آدم:۔ جی نہیں اس لیے کہ میرا آپ کا ساتھ نہیں ہوا۔

حنا:۔ اور ہونا بھی نہیں چاہیے۔

آدم:۔ کیوں۔

حنا:۔ اس لیے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

آدم:۔ لیکن ایک بات پر تو متفق ہیں۔

حنا:۔ کس پر کس پر۔

آدم:۔ یہی کہ کسی پر نہیں ۔۔۔

حنا:۔ ارے آپ ۔۔۔ کدھر کدھر ۔۔۔ ذرا سنبھل کے
(زینے سے ٹکرا کر گرنے اور گلدان ٹوٹنے کی آواز) آخر گر پڑے نا۔

(بھاگتے ہوئے آنے کی آواز)

گرجا:۔ کیا ہوا بی بی جی کیا ہوا۔

حنا:۔ ہوتا کیا ۔۔۔ یہ گر گئے۔

گرجا:۔ گر گئے ۔۔۔ ہم ہوا ایسے گر پڑے رہا ۔۔۔ کے بی بی جی کا سادی ہوئی گئی ان کی۔

حنا:۔ انھیں سے پوچھو ۔۔۔ ارے خون ۔۔۔ جانتی تھی سنبھل کر نہ تو بات کرنا آتا ہے نہ چلنا آخر زخم لا یا البیلا پن ۔۔۔ ڈاکٹر رعنا نہ معلوم کہاں چل دیں ۔۔۔ کیا کہیں گی کتنا حسین گلدان۔ ۔ ۔ ۔ پاش پاش ہو گیا ۔۔۔ لائیے ادھر ہاتھ میں پٹی باندھے دیتی ہوں۔

آدم:۔ تو دے دوں ہاتھ۔

حنا:۔ ارے جلدی دیجیے ۔۔۔ توبہ ۔۔۔ اُفوہ کتنا خون۔

آدم:۔ لیجیے مگر دیکھیے ذرا سنبھل کے ۔۔۔ کہیں چوٹ نہ آ جائے۔

حنا:۔ اُفوہ ۔۔۔ خون ہی خون ۔۔۔

(آنے کی آواز)

ڈاکٹر رعنا:۔ (آتے ہوئے) جی نہیں خون۔

حنا:۔ خون کس کا۔

رعنا:۔ چوری کا کیس ۔۔۔ پولیس کو فون کر دیا گیا۔

آدم و حنا:۔ چوری۔

رعنا:۔ ہاں ۔۔۔ مجرمین ریڈ ہینڈڈ۔

آدم و حنا:۔ چوری ۔۔۔ گھر گیا کیا۔

عرشی و رعنا:۔ دل۔

(عرشی و رعنا کے قہقہے ۔۔۔ آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ)

شفیقہ فرحت

قطرے قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب!

بے دلی ہائے تمنا نے جب ساتھ چھوڑا تو کچھ تماشا کیا اور عبرت کی آنکھیں نہ صرف کھولیں بلکہ ذوق کا چشمہ بھی چڑھا لیا۔ اور ان نئی نویلی آنکھوں سے جو اوپر نیچے دائیں بائیں نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ ہمارے وجود میں "د" کا ذرہ دخل نہیں — یعنی ہم درخت مرتبت عالی مقام شہنشاہ شب عرف الو کے علاوہ کچھ نہیں — اور یہی ادائیں اسی کر و فر کے ساتھ رہیں تو انشاء اللہ اس تخت سے بھی عنقریب اتار دیئے جائیں گے۔

بہر حال اسی گھڑی یہ بھی الہام ہوا کہ یہ روز و شب جو نقش گر حادثات تو ضرور ہیں مگر زندگی کو ایک تندرست حادثے سے زیادہ کچھ بننے نہیں دیتے۔ یہی روز و شب اک خاص نظم و نسق اور منظم پروگرام کے تحت گزارے جانے چاہئیں — کیوں کہ روایت ہے کہ دنیا کے ہر معقول شخص کا مخصوص پروگرام ہوتا ہے جو دنوں ہفتوں بلکہ مہینوں پہلے بنایا جاتا ہے، اور جو جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے اس کا پروگرام اتنے ہی پہلے بنتا ہے۔ لہٰذا بلا کھٹکے پروگرام کو SOCIAL STATUS ناپنے کا پیمانہ بنا لیجئے کوئی شکر برابر (کہ آج کل شکر کا وجود دم ف لب شیریں میں باقی رہ گیا ہے —!) بھی اعتراض نہیں کرے گا —!

جو یہ جانتا ہے کہ آج سے چار مہینے اٹھارہ دن بعد وہ چھ بج کے دس منٹ پر دلی کے صفدر جنگ ہوائی اڈے سے اڑ کر دو بج کے پچیس منٹ پر سوئٹزر لینڈ پہنچے گا اور پانچ گھنٹے وہاں گزار کر انگلستان کے لیے روانہ ہو جائے گا۔ اور انگلستان میں لنچ جس کا یہ مینو ہے فلاں کے ساتھ کھائے گا اور ڈنر فلاں کے ساتھ، وہ یقیناً وزیر اعظم ہے — اور جو اس تک سے واقف نہیں کہ نو بجے آفس پہنچ کر اسے کیا کیا کرنا ہوگا۔ دفتر سے چھٹی کب ہوگی۔ اور بالفرض چھٹی ہوگی تو رات کھائے گا کیا وہ دس مرتبہ مر کر زندہ بھی ہو جائے تب بھی رہے گا چپراسی کا چپراسی —!

(یوں آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اگر چپراسی قسم کے لوگ ذرا بھی حساب کتاب جانتے تو فوراً بتا دیتے کہ وہ اب تک کتنے سو مرتبہ مر چکے ہیں —!)

اسی پس منظر کے تحت ایک روز (گو وہ روز حساب تو نہ تھا —!) ہم نے زندگی کے قطرے قطرے کا حساب لینا شروع کیا۔ اعمال نامہ کچھ اس درجہ بے ڈھنگا تھا کہ چند ہی منٹ بعد ہم پر اختلاجی دورے پڑنے لگے — خود ہیں

ہمیں یقین نہ آتا تھا کہ ایک مختصر سی زندگی میں ایک ننھی سی جان اتنے ہنگامے کیسے مچا سکتی ہے ۔۔۔ ہائے غالب آ ہوتے تو قدِ یار کے بجائے اسی کو دیکھ کر فتنۂ محشر کے معتقد ہو جاتے ۔۔۔!

شاید ہی کوئی گاڑی ہو جس کے پلیٹ فارم بصد ناز و انداز داخل ہونے کا حسین منظر ہم نے دیکھا ہو ۔۔۔ ور ہمارے نصیب میں تو گاڑی کے آخری ڈبے اور لہراتے ہوئے دھوئیں کا دیدار ہی لکھا تھا ۔۔۔ قسمت زیادہ ہی ساتھ تو سامان یا گارڈ کا ڈبہ ہاتھ آجاتا اور ہم دو چار کی مشترکہ کوششوں سے اسی میں چھلانگ لگا دیتے ۔ اور اگر کسی کے استقبا کی خدمت ہمارے سپرد ہوتی تو بجائے اس کے کہ ہم اسٹیشن پر مہمان کو خوش آمدید کہیں مہمان ہمارے گھر کی دہلیز پر بیٹھ ہمیں خوش آمدید کہتے ۔۔۔!!

دن میں تین بار پینے کی دوا تین دن میں ایک بار پی جاتی ہے گو اس ایمانداری کے ساتھ کہ نو خوراک اکٹھی ۔! کوئی پڑوسن اپنی بچی کی سوئیٹر بنواتی ہیں تو وہ ان کی نواسی کی پیدائش کے وقت تک یقیناً تیار کر دی جاتی ہے ۔! اور کسی نے دوا منگوائی تو وہ اس وقت آتی ہے جب لوگ ان کی تجہیز و تکفین میں لگے ہوتے ہیں ۔۔۔!

غرض کہاں تک گنوایا جائے ۔۔۔ اس بحرِ بیکراں کے لیے تو صاحب سفینہ چاہیئے ۔۔۔!

تو وہ کچھ ایسی عبرت انگیز گھڑی تھی کہ ہم نے فوراً "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایا اور عہد کر لیا کہ کل سے یہ سب ختم زندگی جو کہ فانی ہے اور آتی جاتی ہے بلکہ بلبلہ پانی ہے ۔ مگر پھر بھی نہایت قیمتی ہے (حیرت ہے کہ اس پر اب تک ٹیکس کیوں نہیں لگا ۔۔۔!) انتہائی لیڈرانہ شان سے بسر ہوگی ۔ ہم اپنے ہر لمحہ اور ہر قطرے کا حساب رکھیں گے ۔ یعنی روزانہ باقاعدہ پروگرام بنا کرے گا اور لکھا جائے گا اور اس پر عمل بھی ہوگا ۔۔۔! وہ سارا دن تو آزادی کا آخری دن سمجھ کر نہایت لاابالی انداز میں گزار گیا ۔۔۔ اور رات کو بیٹھے پروگرام لکھنے ۔۔۔

پہلا مسئلہ یہ تھا کہ صبح کتنے بجے ہو ۔۔۔ ہنگامی حالات کو چھوڑ کر عموماً ہماری صبح دس اور گیارہ کے درمیان ہوا کرتی ہے ۔ لیکن اس انقلابی دور میں یہ صبح کچھ مناسب نہیں معلوم ہوئی ۔ اور ذرا کچھ غیرت اور حمیت بات بھی زور پر تھے ۔ کچھ مشورہ تھا کی تجویز تھی کہ چھ نہایت مناسب گھڑی ہے ۔۔۔ فضا میں وہ تازگی ہوتی ہے اور نورِ الٰہی کی وہ بارش ہوتی ہے کہ اس میں مسلسل بھیگتے رہنے سے شاید موت بھی بھاگ جائے ۔۔۔! موت تو خیر جب بھاگتی تب بھاگتی اس سے پہلے ہم ادھ موئے ضرور ہو جاتے ۔ لہٰذا اس خیالِ خام کو اوروں کے دلوں سے نکالا (کہ اپنے دل میں تو کبھی تھا ہی نہیں ۔۔۔!!) اور خاصی پر شور بحث کے بعد اسے ساڑھے آٹھ تک لے جا کے پہنچایا ۔۔۔

اب دوسرے پروگرام لکھنے کی باری آئی ۔۔۔ سالوں اور مہینوں کے کام تھے ۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سب سے پہلے دن کے پروگرام میں کس کو جگہ دی جائے اور کس کو نہیں ۔۔۔ سکریٹریٹ جا کے فائل نکلوانی تھی ۔۔۔ ڈائرکٹر اور منسٹر صاحب کو سلامی دینی تھی کچھ کتابیں تھیں جنھیں قاعدے کی رو سے بہت پہلے پڑھ لینا چاہیئے تھا مگر وہ ابھی تک فریاد کر رہی تھیں ۔۔۔ کچھ مضمون نقل کرنے تھے ۔۔۔ پندرہ بیس کپڑے ادھورے پڑے تھے ۔ خریداری بھی کرنی تھی

کچھ خط بھی اپنا حق منوانے پر آمادہ تھے۔ ان آٹھ دس صاحبان سے ملنا تھا جو باوثوق ذرائع سے خود کو رشتہ دار ثابت کر چکے تھے۔ ایک ادبی نشست میں شرکت کرنی تھی ۔ اور ایک گروہ کو کافی پلانی تھی ۔

اس شیطان کی آنت سے صرف دن بھر کا پروگرام منتخب کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ۔ بلکہ حالات حاضرہ کے تحت صرف شیر لانا بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہر کھودنے سے زیادہ مشکل ہے ۔!!

بہر حال تین گھنٹے کی جانفشانی سے جو پروگرام صفحۂ قرطاس پر جلوہ افروز ہوا وہ ایک ہفتے کا تھا ایک دن کا نہیں ۔ پھر کانٹ چھانٹ ہوئی اور اس بار اکثریت کی رائے سے وہ پاس ہو گیا۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے ۔

۸½ اٹھنا
۹ چائے ناشتہ
۹¼ اخبار پڑھنا
۹½ سے ۱۰ ۔ کلاس کے لیے لکچر تیار کرنا
۱۰ سے ۱۰½ سنگھار
۱۰½ سکریٹریٹ کے لیے روانگی
۱۲ کھانا
۱۲½ کالج کے لیے روانگی
(درمیانی وقفہ کا پروگرام مخدوش دیکھ کر چھوڑ دیا گیا)
۴ واپسی
۴½ چائے
۵ خط لکھنا
۶ ادبی نشست میں شرکت
۷½ واپسی
۸ رات کا کھانا
۸½ کافی پلانا
۱۰ سیر
۱۰½ سنگھار شب
۱۱ ۔ ۱۲ مطالعہ

صبا

اور اس پروگرام کو بناتے بناتے جب لائٹس آف ہوئیں تو قدرت کی لائٹس جل چکی تھیں
ابھی خواب میں ایک بھی ڈھنگ کی صورت نظر آئی تھی کہ الارم بجا ــــ پہلا دن تھا۔ جوش و خروش کا عالم نہ
پوچھیے۔ بند آنکھوں کو کھولنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ منہ دھویا جس وقت ناشتے کی میز پر پہنچے نو بجنے
میں دس منٹ تھے۔ ہم نے فوراً پروگرام کارڈ دیکھا۔ ناشتے کا وقت تھا ۹۔
یہ تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی جا رہی ہے ــــ!
چائے دانی کی طرف ہاتھ بڑھاتے "بھلا دس منٹ میں فرق ہی کیا پڑتا ہے"
مگر فوراً پاسبانِ عقل نے روک دیا ــــ دس منٹ نہیں دس سیکنڈ میں بھی زمین و آسمان زیر و زبر
ہو سکتے ہیں ــــ!
سوچا چلو اتنی دیر میں اخبار ہی پڑھ لیں۔ ابھی اخبار اٹھایا بھی نہ تھا کہ کمبخت پروگرام کارڈ پر پھر نظر پڑ گئی۔
پہلے چھٹی ہوئی ــــ!
اخبار ۹ بجے پڑھا جانا چاہیے ــــ!
جھنجلا کے اسے بھی پھینک دیا ــــ اور اس طرح پھینکا کہ غیر ارادی طور پر اس پر نظریں پڑ رہے ــــ!
ہائے دنیا میں کیسے کیسے انقلاب اور طوفان آ چکے ہوں گے ــــ ممکن ہے رات کسی کے گھر چوری ہو گئی ہو ــــ کہیں
ڈاکہ پڑ گیا ہو ــــ کوئی بڑا آدمی اس جہانِ فانی سے اس جہانِ پائیدار کا پاسپورٹ بنوا چکا ہو ــــ پتہ نہیں کون کون
سی پگڑی بدلیں ــــ! یہ سب کچھ سہی اور ہم اس کاغذ کے ایک پرزے یعنے پروگرام کے ہاتھوں اتنے مجبور ہیں کہ
سمندر کے کنارے پیاسے کھڑے ہیں ــــ!
ابھی ہم خودکشی کے امکانات پر غور کر ہی رہے تھے اور تجہیز و تکفین کا بجٹ بنا رہے تھے کہ گھڑی نے نو بجائے۔
ہم نے اس ناشتے پر حملہ کر دیا جس پر سردی کا پرچم لہرا رہا تھا۔
اخبار میں واقعی بڑی اہم اور دلچسپ خبریں تھیں ــــ ہم اس میں کچھ ایسے محو ہوئے کہ جب دس کے گھنٹے
کی گھن گرج سے چونکے تو ہوش آیا ــــ کلاس کے لیکچر تیار کرنے کا وقت اخبار کی نذر ہو چکا تھا۔ اگر لیکچر تیار نہ ہو تو
کلاس نہیں لی جا سکتی۔ اور کلاس نہیں تو کالج جانے کی ضرورت ہی کیا ہے ــــ مگر چھٹیاں تو کب کی ختم ہو چکی تھیں ــــ؟
لیجئے سارا پروگرام خطرے میں پڑ گیا ــــ!
پھر سوچا آج سکریٹریٹ گول کر دیں ــــ کل سے پروگرام اب بہت شامل کر لیں ــــ شروع شروع میں
ایڈجسٹ پروگرام چلتا ہی ہے۔ بعد میں جب ذرا تجربہ ہو جائے گا تو ہم بھی گھڑی کی سوئی بن جائیں گے۔
لیکن یہاں بھی راستہ اتنا صاف نہیں تھا ــــ سکریٹریٹ میں اپائنٹمنٹ لیا جا چکا تھا ــــ ادھر کنواں ادھر کھائی ــــ!
کنوئیں سے کھائی اور کھائی سے کنوئیں تک چکر لگانے اور بے خطر کود نے کی ہمت کرتے اور پھر ڈر کے واپس ــــ

اسی ہیرا پھیری میں سگریٹ کا وقت بھی انتہائی ناقابلِ تلافی گزر گیا ـــــ تب ہمیں خیال آیا کہ شاید کام شروع کرنے کے لیے آج کی صورت ٹھیک نہیں۔ کل نیا پروگرام بنے اور اس پر مستعدی سے عمل ہو ـــ

شامتِ اعمال کہیے کہ وہ ادبی نشست بھی اس دن نہیں ہو سکی اور اگلے دن پر رکھی گئی ـــ بڑی جانفشانی سے کام لیتے ہوئے اور بڑی جانبازی کا ثبوت دیتے ہوئے ہم نے اگلے دن پروگرام پر عمل شروع کیا ـــ شام تک کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ہم ٹھیک چھ بجے اس مقام پر طلوع ہو چکے تھے جہاں کا پتہ ہمیں نشست کے سلسلہ میں دیا گیا تھا۔ ہال کا حلیہ دیکھ کر ہم بوکھلا گئے ـــ نہ آدم نہ اولادِ آدم ـــ ! نہ فرش بچھا تھا نہ کوئی چپراسی تھا ـــ خیال ہوا کہ شاید نشست کل ہوگی۔ یہ سوچ کر کوچ کا نقارہ بجایا۔ جس کی آواز سے ایک چپراسی نما شخص بھاگا بھاگا آیا ـــ پہلے تو اس نے ہم کو سر سے پیر تک یوں دیکھا جیسے ہمارا آبائی وطن چڑیا گھر ہو ـــ پھر ہماری جہالت پر مسکرائے اور یوں گویا ہوئے ـــ "ابھی تو گھنٹہ بھر لگے گا شروع ہوتے ہوتے "

خیر گھنٹہ تو نہیں کوئی پچپن منٹ بعد جلسہ شروع ہوا ـ کچھ چیزیں پڑھی گئیں ـــ ان پر بحث ہوئی ـــ پھر جن جن لوگوں کے پاس جگر تھا انھوں نے اسے تھاما ـــ کیوں کہ ہماری باری تھی ـــ ہم نے بصد ناز و ادا پڑھنا شروع کیا ابھی آدھا بھی نہیں پڑھا تھا کہ رقیبِ روسیاہ یعنی گھڑی پر نظر پڑی۔ اطلاع ملی کہ ہمارے اپنے پروگرام کے مطابق وقت ختم ہو چکا ہے ـــ کل کا عبرتناک انجام ہمارے سامنے تھا۔ ہم آج کے پروگرام کو بھی شہادت کا درجہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا ادھورے جلسے کو پورا کیے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے ـــ اور یہ جا وہ جا ـــ حاضرین حیرت سے نقش اور آئینہ اور دیوار تک بن چکے تھے ـــــ دو تین کا سحر ذرا وقت سے پہلے ٹوٹا تو وہ ہمارے پیچھے لپکے ـــ مگر ہم کہاں ہاتھ آنے والے تھے ـــ ہمارے دماغی توازن پر افسوس اور ہمارے رشتہ داروں سے ہمدردی کرتے ہوئے وہ لوگ واپس لوٹ آئے ـــ بہرحال یہ تاریخی دن خیریت سے گزر گیا ـــ

دوسری صبح پروگرام لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ ایک صاحب تشریف لے آئے ـــ ہم نے ان کی ملاقات کو بھی پروگرام میں شامل کر لیا ـــ مگر جب پروگرام بنا کے باہر نکلے تو وہ جا چکے تھے ـــــ صبح ہی صبح پروگرام میں گڑبڑ ہو یہ کوئی اچھا شگون نہیں ـــ لہٰذا انھیں بلانے کے لیے نوکر کو دوڑایا۔ وہ اتفاق سے سائیکل پر تھے۔ نوکر صاحب کی وفاداری تو بشرط استواری تھی۔ آپ نے بھی کسی راہ چلتے کی سائیکل لی اور پیچھا کرنا شروع کر دیا ـــــ سائیکل دوڑاتے جاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد حلق کی آخری سرحدوں سے آوازیں لگاتے جاتے تھے۔ تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ دو چار نے اور پیچھا کیا۔ (غالباً چور اچکا سمجھ کے!) تب کہیں ایک موڑ پر وہ صاحب ہاتھ آئے ـــ نوکر انھیں تین میل سے واپس لایا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ کوئی خاص بات نہیں محض پروگرام کی پابندی ہے۔ تو وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ خیریت ہوئی کہ ہم اس وقت اپنے اگلے پروگرام کے تحت گھر سے جا چکے تھے۔ ورنہ ہماری قبر آباد ہوتی اور ان کا جیل خانہ ـــ! !

پھر شام تک گاڑی سبک رفتاری بلکہ برق رفتاری سے اپنی پٹری پر چلتی رہی۔ پروگرام کے مطابق ہمیں شام کو شاپنگ کو جانا تھا

صبا

کھر سے نکلنے کا اہتمام ضامن بندھا ہی تھا کہ مہمانوں کا حملہ ہوگیا۔ اب اگر تکلف کرتے ہیں تو پروگرام عزیز کا خون ہوتا ہے ـــ اور پروگرام بچاتے ہیں تو دوستی کا ـــ ! مگر صاحب۔ پروگرام کا نشہ کچھ نیا نیا تھا۔ پروگرام پر تو ایسی ہزار دوستیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ ہم نے معذرت کی اور گھر ان کے حوالے کرکے نکل پڑے ـــ نتیجے کے طور پر ہماری ان کی آج تک [illegible] دشمنی چلی آرہی ہے ـــ !

لب بام دو چار ہاتھ ادھر ہی رہ گیا تھا کہ کمند داغ مفارقت دے گئی۔ بازار پہنچنے سے پہلے ایک اور دوست کی زیارت ہوئی ـــ آپ نے اس مسرت کا اظہار کیا جو آج کل بلیک سے بھی نہیں ملتی اور بڑی گرم جوشی سے باتیں کرنے کی کوشش کی۔ دوست خاصی پرانی اور عزیز تھیں۔ اس لیے ہم بھی تڑپ اٹھے ـــ فوراً پروگرام کارڈ نکالا ـــ نہ کہیں ان دوست کا ذکر تھا نہ ان سے ملاقات کا وقت ـــ اور بڑے آدمیوں کی بجلیاں ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ بغیر پروگرام میں لکھے ہم ان کو پہچان بھی نہیں سکتے ـــ ان کے محبت بھرے سوالوں کے جواب میں انتہائی پُروقار انداز میں ہم نے صرف اتنا کہا کہ "معاف کیجئے گا۔ آپ سے ملاقات کا وقت طے نہیں تھا ـــ اس لیے اس وقت مجبور ہوں۔ کل شام سوا پانچ بجے اسی چوراہے پر ملاقات ہوگی "

"ارے بھاڑ میں جاؤ تم اور تمھاری ملاقات ـــ کہیں گھانس تو نہیں کھا گئی ہو ـــ ارے تمھیں فرصت نہیں تو جاؤ گھر بیٹھو۔ کچھ تم سے بات کیے بغیر ہم مرے نہیں جا رہے ـــ ہاں نخرے تو دیکھو ـــ جیسے بیچاری وزیر اعظم ہی تو ہوگئی ہیں " ! وہ مارا ـــ ! یعنی اسی شد و مد سے اگر پروگرام پر عمل ہوتا رہا تو یقیناً لوگ وزیر اعظم نہیں تو ان کا جانشین سمجھنے لگیں گے۔ اور ہم میں ایک نیا عزم پیدا ہوگیا ـــ اور اسی عزم کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے آدھے سے زیادہ دوست جانی دشمن بن گئے ـ مگر ہمارے جوش و خروش کی رفتار ذرا دھیمی نہیں ہوئی ـــ اور ہو سکتا ہے کہ ہم اسی شد و مد سے اس پر عمل کرتے رہتے کہ ایک دن ہمارے چچا کا حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا ـــ موت ہنگامی تھی ـــ پہلے سے اس کی کوئی اطلاع تھی نہیں لہٰذا ہمارے پروگرام میں اس کا ذکر نہیں تھا۔ (قارئین کے لیے درس عبرت کہ اگر وہ روز پروگرام لکھتے ہوں تو ہر روز اس میں اچانک حادثے کی گنجائش بھی رکھی جائے ـــ !) اور چونکہ ہمارے پروگرام میں درج نہیں تھا اس لیے ہمارے جانے کا سوال ہی نہیں ـــ پورا خاندان وہاں اکٹھا تھا ـــ ہمیں غائب دیکھ کے والد صاحب کو حیرت ہوئی ـــ ہماری غلطی ہوئی ـــ مگر اس غلطی اور والد صاحب سے انٹرویو کی بھی اس پروگرام میں گنجائش نہیں تھی ـــ ! اس لیے ہم نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا ـــ نتیجہ ظاہر ہے ـــ ! سر کے آدھے بال غائب ہوگئے ـــ اس کو سوچنے پر جو خرچ ہوا سو الگ ـــ !

"زبیر رضوی اردو کے ان نوجوان شعرا میں ہیں جنھوں نے گزشتہ چند برسوں میں اپنی لگن پر خلوص ریاضت اور محنت سے ہر دلعزیزی حاصل کی ہے انھیں وہ بھی پسند کرتے ہیں جن کے لیے شاعری صرف نغمہ و رنگ ہے اور وہ بھی جو اس کے پس پردہ انسانی دل کی دھڑکن سننا چاہتے ہیں ——
زبیر رضوی نے گیت بھی لکھے ہیں نظمیں اور غزلیں بھی ان سب کے فنی تقاضے جدا جدا ہیں لیکن میرے خیال میں ان کے یہاں قدر مشترک وہ لے اور ترنگ ہے جو گیتوں میں موسیقی، غزلوں میں تغزل اور نظموں میں کیف بنجاتہ ہے "

سیّد احتشام حسین

مکتبۂ صبا

۱۔۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد سے حاصل کیجئے

انجمن ترقی اردو حیدرآباد کی مطبوعات

گوتم بدھ (طویل نظم) فضل الرحمٰن ۱/-
چنگیز (ڈراما) "
سقراط " ۲/۰
چراغ منزل (مجموعۂ کلام) شاہد صدیقی ۱/۲۵
پاسِ گریباں " ۲/۰
رخسارِ سحر " سلیمان اریب ۲/۵۰
" خورشید احمد جامی ۲/۷۵
زبان اور علم زبان پروفیسر سروری ۱/۰
یادگارِ فخرؔ غلام یزدانی ۲/۰
تلگو ادب کی تاریخ وراما نج راؤ
زینت ساجدہ ۳/۰
تلگو اردو لغت گوپال کرشنا راؤ ۳/۵۰
اردو تلگو لغت (زیر طبع) ڈاکٹر راما راؤ
بچوں کی کتابیں (مکمل سٹ) ۲/۰

کلپنا (مجموعۂ کلام) اختر عادل ۱/۰
غزل اور مسائل (تنقید) ڈاکٹر حفیظ قتیل ۲/۰
اجلی پرچھائیاں (افسانے) اقبال متین ۲/۵۰
نقشِ آذر (مجموعۂ کلام) راشد آذر ۲/۰
لہر لہر ندیا گہری " زبیر رضوی ۳/۰
نظامی گنجوی (تحقیق) رضیہ اکبر حسن ۳/۵۰

ان کے علاوہ

کاروانِ وطن (مجموعۂ کلام) تلوک چند محروم ۱/۵۰
ہمارا وطن (بچوں کی نظمیں) ۳/۵۰
بیکراں (مجموعۂ کلام) جگن ناتھ آزاد ۲/۵۰
اردو " " ۱/۵۰
آب و تاب (مجموعۂ کلام) سعادت نظیر ۱/۵۰
نویدِ گل " " ۰/۶۰
پھول کلیاں " " ۰/۶۰
نیرنگِ نظر " روحی علی اصغر ۲/۰
جامِ صہبا " ابوالخیر صبا ۲/۰

مکتبۂ صبا کی مطبوعات

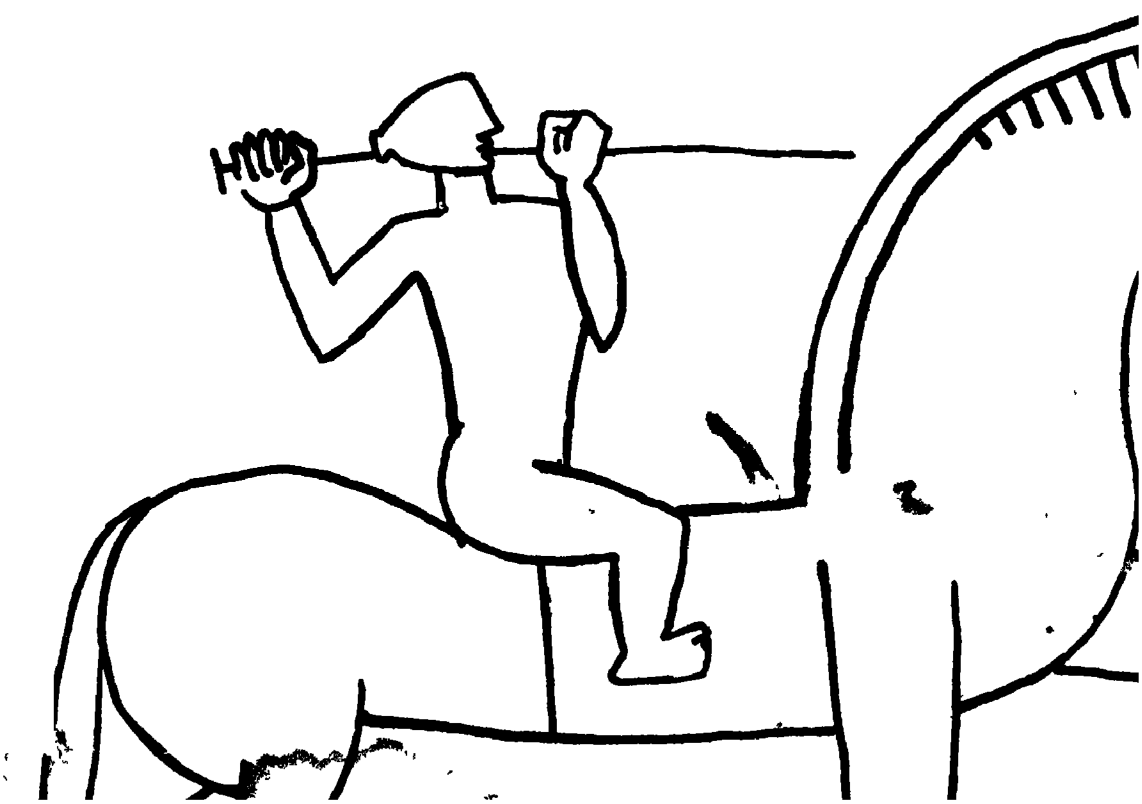
گلِ تر (مجموعۂ کلام) مخدوم محی الدین ۱/۵۰
نیا انسان (منظوم ڈراما) فضل الرحمٰن ۱/۰

ماہنامہ

صبا

حیدرآباد

Re. 1



منظور شدہ محکمہ تعلیمات حکومت آندھرا پردیش

ایڈیٹر:- سلیمان اریب

آرٹسٹ:- سعید بن محمد

کتابت:- محمد مظہر

جلد	۱۰
شمارہ	۵
ماہ	مئی
سنہ	۱۹۶۵ء
قیمت	ایک روپیہ
زر سالانہ	۱۰ روپے
ششماہی	۶ روپے
بیرون ہند سے	۲۰ شلنگ

دہلی آفس:-
۱۹۵۰ ترکمان گیٹ دہلی ۶

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:-
ماہنامہ نقش پوسٹ بکس (۳۷۰۲) کراچی ۳
فون:- ۴۴۴۰۲

صبا
حیدرآباد دکن

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر و پروپرائٹر سلیمان اریب ۔ ۱۷ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن ۔ مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان

اس شمارے میں

مضامین:۔

نظمیں:۔

غزلیں:۔

افسانے اور انشائیے:۔

ٹائٹل:۔ مقبول فدا حسین۔ بشکریہ ہندی ماہنامہ "کلپنا"

صبا

یونٹ خریدیں

یہ بچتوں کو سرمایہ بنانے کا بہترین ذریعہ ہیں

- یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا کے سالانہ حسابات ۳۰ جون ۱۹۶۵ء کو بند کر دیئے جائیں گے۔
- اس کے بعد جس قدر جلدی ممکن ہوگا، پہلے منافع کا اعلان کر دیا جائے گا۔

- فرد یونٹ ہولڈروں کو منافع کے طور پر ایک ہزار روپے تک ہونے والی آمدنی انکم ٹیکس سے بری ہے۔
- یونٹوں میں سرمایہ لگانے والوں کو مستقل منافع کے علاوہ اور بھی کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔
- یونٹ ہولڈروں کو مستقل آمدنی ہوتی ہے کیونکہ ٹرسٹ یونٹ ہولڈروں میں جو آمدنی تقسیم کرتا ہے وہ سرکاری کفالتوں، صنعتی ذی بنچروں، ترجیحی حصص اور اجتماعی اداروں کے عدل حصص پر مشتمل ایک خوب متوازن شعبے کی اوسط آمدنی پر مبنی ہوتی ہے۔
- سرمایہ لگانے کے لئے یونٹ ایک بے مثال ذریعہ ہیں۔ اِن کے کئی فائدے ہیں۔ ان سے مستقل آمدنی ہوتی ہے.... یونٹوں میں لگا روپیہ محفوظ رہتا ہے .... روپیہ ضرورت پڑنے پر انہیں بھنایا بھی جا سکتا ہے۔

یونٹ اب ملک بھر کے چیدہ شیڈولڈ بنکوں کی سبھی شاخوں سے خریدے جا سکتے ہیں

مزید جانکاری کے لئے رابطہ قائم کریں،

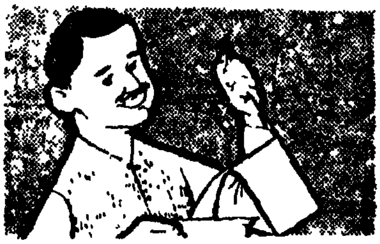
یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا

صدر دفتر: بمبئی لائف بلڈنگ، ۴۵ ویر نریمان روڈ، پوسٹ بکس ۱۰۰۰۰، بمبئی ۱
شاخیں: ریزرو بنک آف انڈیا بلڈنگ، ۸ نیتاجی سبھاش روڈ، پوسٹ بکس ۱۵۳۳، کلکتہ ۱
ریزرو بنک بلڈنگ، فورٹ گلیسں، پارلیمنٹ اسٹریٹ روڈ، مدراس ۱

میٹرک
نظام ہی اب
قانونی
نظام
ہے







کیلوگرام
میٹر
لیٹر
میں خریدیے

سید راحت حسن

میر باقر علی اور ان کی داستانیں

ہندوستانی تہذیب و تمدن، قصوں اور داستانوں سے بہت پرانا رشتہ رہا ہے۔ کسی ملک کے افسانے اور داستانیں اس کی روایات و تہذیب کا آئینہ ہوتی ہیں۔ داستانوں میں ہم ایک مخصوص فضا میں قومی شعور اور تہذیب اسلاف کے بارے میں معلومات پاتے ہیں۔ ایک دور ایسا تھا کہ افسانہ گوئی اور داستان گوئی کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آخری دور میں دہلی میں مغل شہزادے اور لکھنؤ میں آخری نواب اور مہاراجے عیش و عشرت میں پڑ گئے اور سلطنت باقی نہ رہی اور ایک غیر قوم کے ہاتھوں سب طاقت چلی گئی۔ وہ سب اور متوسط طبقے ان کی ترقی ہوئی۔ کبوتر بازی بٹیر بازی، پتنگ بازی، رقص و سرود، شطرنج وغیرہ انہی میں ایک مشغلہ داستان گوئی کا بھی تھا۔ رات کو شہزادوں کو خوب خوب داستانیں سنائی جاتی اور تمام رات ... اور وزرا وغیرہ بیٹھ کے بڑی دلچسپی سے داستانیں سنا کرتے۔ اس وقت ... پریس نہیں تھے اور نہ ہی سنیما وغیرہ۔ اگر کوئی مطالعہ کا شوقین کتاب حاصل کرنا چاہتا تو مشکل سے ہاتھ لگتی کوئی نسخہ مستعار لے کر اس کی کاتب سے نقل کرانی پڑتی۔ اس طرح صرفہ زیادہ ہوتا تھا۔ داستان سننے میں آسانی تھی۔

افسانہ گوئی کا فن لکھنؤ اور دہلی میں پروان چڑھا۔ "ہندوستان میں میر باقر علی کی موت کے ساتھ ساتھ داستان گوئی بھی ختم ہو گئی۔" داستانیں نہ صرف سنی جاتی تھیں بلکہ ان کو کتابی صورت میں بھی پیش کیا جاتا تھا۔ ہمارے یہاں بہت سی طویل و مختصر داستانیں شہرت دوام حاصل کر چکی ہیں۔ مثلاً داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ، حیدر بخش حیدری کی آرائش محفل، قصہ چہار درویش، فسانۂ آزاد اور میر امن کی باغ و بہار وغیرہ۔

تمثیل نگاری اور قصص و افسانوں کا ہر دور میں کسی نہ کسی قوم سے تعلق رہا ہے۔ ان داستانوں سے مذہبی رشتے بھی باقی ہیں۔ مثلاً انجیل مقدس میں اکثر واقعات کو دلچسپ اور سبق آموز قصوں کی صورت میں پیش کیا گیا ہے مہابھارت وغیرہ جیسی مذہبی کتب اور ستیارتھ پرکاش وغیرہ اس قسم کے واقعات سے خالی نہیں۔ انسانی فطرت داستانوں کی طرف جلد مائل ہوتی ہے اس لیے مذہب نے اس سے استفادہ کیا، اور اس کے جو نتائج سامنے آئے وہ سامنے ہیں۔ سری رام، لکشمی دیوی، شیو اور ستیہ جی کے بارے میں دلچسپ اور سبق آموز قصے آج بھی دنیا کے حصے میں پڑھے جاتے ہیں۔ قرآن شریف میں بھی اس قسم کے دلچسپ واقعات کثرت سے ہیں۔ حضرت مسیح کا قصہ

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں اور اصحاب کہف کے بارے میں دلچسپ اور سبق آموز واقعات قرآن نے دہرائے ہیں اور ان واقعات کو قصص کے نام سے موسوم کیا ہے۔

زیادہ تر عرب اور ایران کی داستانیں مشہور ہیں۔ ہندوستان نے داستانوں کے تعلیم[۱] ایران و عرب سے ہی اخذ کیے لیکن ان کو اپنا مخصوص رنگ دے کر ایک مخصوص طرز پیدا کیا۔ مغل دور میں ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی، اور ایرانی تہذیب کا اثر گہرا ہوتا گیا اس طرح اردو کی داستانیں ایرانی اثر کے تحت آئیں۔

میر باقر علی ہندوستان میں افسانہ گوؤں کی آخری کڑی تھے۔ ان کے بزرگ ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ آپ کے نانا سید امیر علی درباری ملازم تھے۔ آپ کے والد کا نام میر حسین علی تھا۔ میر باقر علی ۱۸۵۰ء میں دہلی میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں یتیم ہوئے اور نانا نے پرورش کی۔ داستان گوئی کا فن انھوں نے اپنے ماموں میر کاظم علی سے سیکھا جو اپنے دور کے طوطی[؟] رنگین بیان تھے۔ غدر کے بعد ان کے خاندان والے فراش خانہ میں آباد ہوئے۔ میر باقر علی کچھ عرصہ کے بعد ترکمان دروازہ میں رہنے لگے! اور پھر بیماری، بستی حبش خانی[؟] سیّدان میں رہائش اختیار کی۔ آپ کے ماموں میر کاظم علی ایک پیشہ ور داستان گو تھے اور سرآسمان جاہ نے ان کو حیدرآباد بلا بھیجا اور وہ وہیں کے ہو رہے

میر صاحب اولاد نرینہ سے محروم تھے صرف ایک صاحبزادی تھیں جن کا انتقال کراچی میں ہوا، اور جن کی تالیف "استانی باقری بیگم[۲] کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب "استانی" میں حصوں میں ہے۔

میر باقر علی ایک عام داستان گو نہ تھے بلکہ وہ ایک زبردست عالم بھی تھے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ان کو جلد ہی بھول گئے اور ان کی پُر مغز داستانوں کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔ ان کی داستانوں میں محاکات اور جزئیات پر ان کی گہری نظر ہم کو متاثر کرتی ہے۔ داستانوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی معلومات علم طب، موسیقی، ادب، تاریخ، تمدن اور مذہب و اخلاق کے بارے میں کافی تھیں۔ تحصیل علم کا شوق ان کو ضعیفی تک رہا۔ آخر عمر میں حکیم اجمل خاں مرحوم سے اجازت لے کر وہ طبیہ کالج میں لیکچر سننے جایا کرتے تھے۔

میر صاحب کا رنگ روپ اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔

"گورا رنگ، میانہ قد، چھریرا بدن، کتابی چہرہ، خشخشی ڈاڑھی، پتلی موری کا زین کا پاجامہ، ململ کا کرتا، سر پر کلابتوں کی گول ٹوپی، سیاہ زین اور لال بوٹیوں کی کمری، سبز سواسیر روئی کی رضائی، موٹے اون کے موزے پائنچے کی موریوں پر چڑھے ہوتے۔"

ان کا یہ دستور رہا کہ وہ ہر جمعرات کو اپنے مکان پر داستانیں سنایا کرتے جس کو بھی شوق ہوتا وہ گھنٹہ بھر آتا اور دو آنے سلور فیس طاق پر رکھ کر شریک مجلس ہوتا۔

---

۱ مرکزی خیال   ۲ باقری بیگم میر صاحب کی صاحبزادی کا نام تھا جنھوں نے کراچی میں انتقال کیا۔

میر صاحب نے زندگی ہی میں کافی مقبولیت حاصل کی۔ بڑے بڑے درباروں میں ان کی رسائی ہوئی۔ حیدرآباد، [illegible]، لوہارو، دتیا، پٹیالہ، اور کشمیر وغیرہ ریاستوں کے والیان نے ان کو اکثر مدعو کیا اور نوازا۔
انہیں جھوٹی شہرت کا شوق نہ تھا اور نہ [illegible] تھے۔
ایک بار دہلی کی کمشنری نے ان کو بلا کر لاٹ صاحب کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے داستان سنی، [illegible] صاحب نے ان کو انعام سے نوازا۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کو مدعو کیا اور طلبا نے جمع ہو کر داستانیں سنیں۔
ریاست جہانگیرآباد (اودھ) کے رئیس راجہ [illegible] علی خاں جب دہلی آتے تو خواجہ حسن نظامی مرحوم کے مکان پر میر صاحب کو ایک دو بار ضرور سنتے۔ ایک بار انہوں نے کہا "لکھنؤ میں داستان گوئی ختم ہو گئی اور دہلی میں میر باقر علی کے دم سے زندہ ہے"۔
دہلی میں اکثر داستانیں انہوں نے مغل شہزادے مرزا [illegible] شاہ عرف مرزا بلاقی کے ہاں عرصہ تک سنائیں۔ اس کے علاوہ وہ دہلی کے مدارس، کالجوں اور رؤسا کے گھروں پر بھی جا کر داستانیں سنایا کرتے تھے۔
دہلی کالج میں انہوں نے اپنی طبع زاد داستان "گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دے دی" سنائی تھی۔ اسی طرح ایک بار سینٹ اسٹیفن کالج کی مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے منعقد کردہ جشن ماہتابی میں ایک داستان "سسرال کی سیر" سنائی تھی اس داستان کو طلبا نے ریکارڈ بھی کیا تھا۔
میر باقر علی کو ہر فرقہ اور طبقے کے بارے میں ہزاروں اصطلاحات یاد تھیں۔ انہوں نے ہر ماحول ہر طبقہ اور اس کے علاوہ پیشہ وروں کی زندگی کا دقیق نظری سے مطالعہ کیا تھا۔ فنِ حرب، دکان داروں کے بارے میں، ریختی، زنانوں اور ہیجڑوں کی اصطلاحات وغیرہ پر ان کو تبحر حاصل تھا۔ دہلی میں شادی کی رسومات، دہلی کے محاورے اور دہلی کے مخصوص کلچر پر وہ اتھارٹی رکھتے تھے۔
میر صاحب کو اہلِ ملک نے اکثر خطابات سے نوازا جن میں سے کچھ یہ ہیں۔
فصیحِ دوراں، مشہورِ زماں، بلبلِ بوستاں اور معدنِ معانی۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے انہیں "مقرر کائنات" کے خطاب سے نوازا۔
میر صاحب نے ۸۰ برس کی عمر پائی اور سنہ ۱۹۲۸ء میں انتقال کیا۔
داستان سنانے سے قبل ان کی مخصوص تیاری ایک عجیب تماشہ پیش کرتی ہے اور لطف سے خالی نہیں ذرا آپ بھی سنیے۔
"میر صاحب نے جیب سے چاندی کی ڈبیہ نکالی، پھر افیون کی گولی کو روئی کے پھوئے میں لپیٹا، پیالی میں تھوڑا سا پانی ڈالا اور روئی کے پھوئے کو پانی میں گھولنا شروع کیا، افیون گھل کر پانی میں آ گئی، روئی اگالدان میں پھینکی پانی اٹھایا ایک چسکی لگائی چائے کے دو چار گھونٹ لیے اور داستان شروع کی۔"
ان داستانوں کے علاوہ جو کہ انہوں نے سنائیں۔ کچھ داستانیں شائع بھی ہوئیں۔ راقم کو یہ کوشش تمام

درج ذیل داستانیں مل سکیں۔ ان میں چند کتب داستانوں کے علاوہ ہیں جو کہ سنجیدہ اور علمی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ جیسے رسالہ آداب و اخلاق، اور فقیر کی جھولی وغیرہ۔ کل داستانیں یہ ہیں۔

مولا بخش (بہادر بادشاہ کا ہاتھی) فقیر کی جھولی، رسالہ آداب و اخلاق، خاتمہ داستان، کام کی باتیں گاڑھے خاں، گاڑھے خاں کا دکھڑا، گاڑھے خاں کی ڈھاکہ والی سے ملاقات، گاڑھے خاں اور ململ جان جنگ، گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دی، خلیل خاں فاختہ، ارارا دھون، چوری اور سینہ زوری دہلی کی عید غدر سے پہلے اور آج کل کی، باجی پٹروس، طلسم باف علی، طلسم ہوش افزا، باتوں کی باتیں، کون کانا باتی، آقا نوکر، سسرال کی سیر۔

طرز (STYLE)

میر صاحب نے داستان گوئی کو ایک مخصوص طرز عطا کیا ہے۔ داستان گوئی کا فرسودہ طریقہ انھوں نے بالکل ختم کر دیا۔ پہلے جب کوئی قصہ شروع کیا جاتا تھا تو اس کی ابتدا یوں ہوتی تھی "ایک تھا بادشاہ ہمارا تمھارا خدا بادشاہ" یا "لکھنے والوں نے یوں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں فلاں نام یمن کا ایک بادشاہ تھا" اس قسم کے جملوں سے داستان میں مصنوعی رنگ پیدا ہوتا ہے۔ ایک اچھی داستان کی خوبی یہ ہے کہ داستان سننے والے یہ محسوس نہ کریں کہ کوئی دوسرا شخص ان کو داستان سنا رہا ہے بلکہ وہ خود کو اسی فضا اور ماحول میں موجود سمجھیں کہ جس کا ذکر ہو رہا ہے۔ میر باقر علی نے یہ طریقہ ختم کیا وہ کسی واقعے کو بالکل سیدھے سادے طریقے پر شروع کرتے ہیں۔ مثلاً "خلیل خاں کا فاختہ" جو کہ میر صاحب کی ایک طبع زاد داستان ہے اور جس میں ایک ایسے بوڑھے آدمی کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو کہ ایک کم سن لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کو وہ اس طرح شروع کرتے ہیں:۔

"خلیل خاں پنشن خوار، عمر ۲۰ سال، لمبا قد، گندمی رنگ، کتابی نقشہ، چہرہ پر جھریاں، ناک کی نوک پر منقیٰ کے رنگ کا لیکن منقیٰ سے بڑا جھری دار مسّہ کسی قدر ہونٹ کی طرف جھکا، گویا ہونٹوں سے دو دو باتیں کرنا چاہتا ہے اور مسّے کی نوک پر دو موٹے موٹے بال ایک سفید اور دوسرا کالا بھورا لہدار . . . . منہ میں دو دانت ہیں، سامنے کے چار دانتوں میں سے ایک دانت نیچے کا اور اوپر کی طرف کا جو مسوڑھے گلنے کی وجہ سے جڑ تک کھل گئی ہے اور میل سے زرد اور سبز سیاہی لیے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ ڈاڑھی گھن دار ناف تک۔"

انھوں نے اردو داستان کو سلاست اور روانی بخشی۔ اس سے قبل کی داستانیں طویل اور پیچ دار ہوتی تھیں۔ مثلاً طلسم ہوش ربا، اور فسانۂ عجائب و الف لیلہ وغیرہ میں۔ پیچیدہ عبارت ہے اور قاری کا ذہن نہیں سوچ پاتا کہ آئندہ کیا ہوگا۔

اس کے علاوہ اس قسم کی داستانیں عشق و محبت یا رزم بزم وغیرہ کے موضوعات تک محدود تھیں جس کے اندر فحش گوئی اور عریاں بیانی سے کام لیا جاتا تھا۔ خصوصیت سے طلسم ہوشربا اور الف لیلہ دونوں عریاں بیانی کی بدترین

سنا ملتا ہے لیکن میر صاحب کی داستانوں میں ہمیں سماجی و اخلاقی اقدار ملتی ہیں۔ وہ کبھی اخلاق سے نہیں ہٹے۔ انھوں نے ساری زندگی ایک معلم اخلاق کی حیثیت سے گزار دی۔ ان کی داستان مولا بخش جو کہ ایک ساتھی ہاتھی کا قصہ ہے ایک اخلاقی داستان ہے۔ کام کی باتیں، کانا باتی اور رسالہ آداب و اخلاق وغیرہ میں انھوں نے اخلاق ہی کو موضوع بنایا ہے۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انھوں نے داستانوں کو مافوق الفطرت واقعات سے نجات دی علاوہ دو ایسی... داستانوں کے جو طلسم کے بارے میں ہیں ہمیں ایسی غیر معمولی باتوں سے سابقہ نہیں پڑا۔ طلسم ہوشربا اور آرائش محفل وغیرہ میں ہمیں غیر معمولی واقعات مثلاً جن و دیو کی کہانیاں یا جادوگری کے واقعات وغیرہ سے سابقہ پڑتا ہے لیکن میر صاحب کے ہاں ہمیں روزمرہ کے واقعات ملتے ہیں۔ انھوں نے کسی مستعد موضوع پر کوئی داستان نہ لکھی اور نہ سنائی وہ اس کے خلاف تھے۔ ایک اور ضروری چیز جو ہم ان کی داستانوں میں پاتے ہیں وہ الفاظ کی انفرادیت ہے یعنی بار بار چند الفاظ کی اور واقعات کی تکرار ہم داستانوں میں نہیں پاتے جیسا کہ سابقہ دستور تھا۔ سننے والوں کو تکرار اور بات بات پر ایک ہی واقعہ دہرانے میں کوئی لطف نہیں ملتا۔ ان کی داستانوں میں واقعیت اور حقیقت پسندی ہے جو کسی داستان یا افسانے میں واقعیت ہوتی ہے تو سننے والے یا پڑھنے والے کی توجہ اس میں اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہے۔

میر صاحب سے قبل کی داستانوں میں ہمیں طنز و ظرافت کم ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں ہے لیکن وہ بھی پھکڑپن اور بازاری ہوتا ہے۔ اردو داستان نویسی پر میر صاحب کا یہ بھی ایک احسان ہے کہ انھوں نے ایک مخصوص طنز و ظرافت اس کو دیا ہے۔ ان کا طنز سطحی نہیں۔ طبل خاں والی داستان ایک طنزیہ خاکہ ہے جس میں اس دور کی سوسائٹی اور برے رسوم و رواج کا مذاق اڑایا ہے۔ طبل خاں کو ایک کردار ہے لیکن وہ ساری سوسائٹی کی ترجمانی کرتا ہے۔ داستان گوئی کا اصل مقصد تو خوش وقتی ہے لیکن ایسی داستانیں جن سے اخلاقی نتائج مستنبط ہو سکیں یقیناً معاشرے کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہ کتاب اس دور میں جاری بڑھاپے کی شادی کے خلاف ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے۔

میر صاحب حقیقت میں داستانوں کے مصلح قرار دیے جا سکتے ہیں۔ عام داستانوں کا ماحول اخلاقی اقدار کی گراوٹ کے باعث زہریلا ہو چکا تھا اور فحش گوئی اور عامیانہ روش داخل ہو چکی تھی لیکن میر صاحب نے اس کے خلاف قدم اٹھایا۔ لکھنؤ میں داستان گوؤں کا ماحول کچھ اس طرح ہوتا تھا "کوئی گنا چھیل رہا ہے، کوئی پونڈے پر چاقو تیز کر رہا ہے، جا بجا پیالیوں میں افیون گھل رہی ہے۔۔۔۔ کہیں چائے تیار ہو رہی ہے"

جب ماحول ایسی بے فکری کا ہوگا اور سامعین میں افیونی صاحبان کی کثرت ہوگی تو ظاہر ہے کہ داستان بھی اسی ماحول سے متعلق ہوگی اور یقیناً اس قسم کی داستانیں معاشرے کے لیے بجائے فائدے کے مضر رساں ہو سکتی ہیں۔

یوں تو کسی داستان کو ادبی معیار سے جانچنا مناسب نہیں کیونکہ داستان لکھنے یا سناتے وقت اس کے ادبی پہلو پر

اور اخلاقی اقدار پر نظر رکھی جاتی تھی بلکہ اس کا واحد مقصد وقت گزاری تھا۔ جس کی داستان میں زیادہ مافوق الفطرت بیان ہوتے تھے اور زیادہ رنگینی ہوتی تھی اس پر زیادہ واہ واہ اور سبحان اللہ ہوتی تھی۔ باقر علی کی داستانیں لغو گوئی اور رکیک بیانات سے خالی ہیں۔ ان کی داستانیں سید حیدر بخش حیدری کی داستان آرائش محفل سے مماثلت رکھتی ہیں جس میں سادہ بیانی ہے اور سلاست ہے۔ اب داستان کی جگہ ناولوں اور افسانوں نے لے لی ہے اور اس کا مقصد نہ صرف خوش وقتی ہے بلکہ ان کی مخصوص ادبی اہمیت بھی ہے۔

افسانہ گوئی میں وہ رزم و بزم دونوں کے بادشاہ تھے۔ اگر کسی لڑائی کا بیان ہے تو آلات حرب آنکھوں کے سامنے نظر آرہے ہیں کسی مجلس عیش کی داستان ہے تو رقص و سرود کی آواز گویا کان میں آرہی ہے۔ اگر عورتوں کی لڑائی بیان کی جارہی ہے تو گویا منہ سے ریختہ کے پھول جھڑ رہے ہیں۔ ان کا لہجہ پُر اثر اور شیریں تھا اور ہر قسم کی صدا پر انھیں مہارت حاصل تھی۔

داستان مولا بخش میں جو کہ بہادر شاہ بادشاہ کے ہاتھی کا ایک دلچسپ قصہ ہے انھوں نے دہلی میں بولے جانے والے محاورے، اصطلاحات فیل بانی اور دہلی میں غدر سے قبل کھیلے جانے والے کھیلوں کے بارے میں بہت کچھ بیان کیا ہے۔ چند اصطلاحات جو کہ کاشتکاری کے بارے میں ہیں مفید ہیں۔ اکثر محاورات ایسے ہیں جو کہ اب بالکل نہیں بولے جاتے اکثر معدوم ہو چکے ہیں۔

وہ ایک سچے محب وطن تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف اکثر تحریکوں میں قلمی حصہ لیا۔ جس وقت سودیشی کی تحریک چلی اور لوگوں نے بیرونی کپڑے کا استعمال بند کر دیا اور گاڑھے اور کھادی کا استعمال رائج ہوا تو انھوں نے اس باب میں داستانیں لکھ کر اس میں حصہ لے کر ایک عظیم خدمت انجام دی۔

پہلی داستان جو اس رنگ میں سنائی گئی اور بعد میں شائع ہوئی وہ رسالہ کپڑا گند کا پہلا حصہ المعروف۔ گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دی تھا۔ اس کی دوسری اشاعت ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ دوسری داستان گاڑھے خاں کا دکھڑا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر چیف کمشنر نے پابندی لگا دی تھی اور مولف کو یہ حق دیا تھا کہ وہ باقی کتابیں فروخت کر دے۔

تیسری داستان کا مضمون ہے "گاڑھے خاں کی ڈھاکہ والی سے ملاقات" اور چوتھی داستان۔ "گاڑھے خاں اور ململ جان کی جنگ"۔

یہ داستانیں دور دور مشہور ہوئیں اور میر صاحب مرحوم نے خود بھی دہلی کے اکثر مدرسوں اور روسا کے گھروں پر سنائیں۔ ان داستانوں میں انھوں نے طنز و ظرافت کی چاشنی سے کام لے کر قومی مسائل کو سلجھایا ہے۔

رسالہ گاڑھے خاں میں مولف نے قومی تحریک کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی قوت و تاثیر کا بھی بیان کیا ہے۔ میر صاحب کو اس بات کا شدید رنج تھا کہ انگریزوں نے ہمارے بھولے بھالے عوام کو دونوں ہاتھوں

…تھا اور وہ ان کے خلاف کچھ نہ کر سکے۔ گاڑھے خاں کے ململ جان پر عاشق ہونے کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے وہ رازِ درون کو الفاظ کے جال میں بیان کر گئے ہیں۔ ان جملوں میں تمام اصطلاحات لوہ[1] باٹی کی ہیں اور ہندوستان کی تاریخ سے ہر وہ شخص جو واقف ہے بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ کیا بات بیان کی گئی ہے۔ "گاڑھے خاں کی تمام پذیرائی تھی۔ عاقبت اندیشیوں کے بھید سے واقف نہ تھے۔ سیدھے سادے، بھولے بھالے، دنیا کے اونچ نیچ سے آگاہ نہ تھے کہ دنیا آگے چل کر ٹیڑھی ہو جائے گی۔ غرض سوت کی طرح ایسے سلجھے کہ آگا پاچھا کچھ نہ نظر آیا۔ ایسے اچھے ہوئے کہ گویا شاہ عالم یہی ہیں اور اپنی ذات کو فنا کر بیٹھے، کہ ململ جان سے شادی کا اقرار کر لیا۔ ململ جان نے خوش خبری سن کر اپنے ہم وطن یا جن سے دور دراز کی رشتہ داری تھی ان کو کہلا بھیجا کہ تم جیسے بھی ہو ویسے ہی چلے آؤ . . . . یہاں چاندی ہی چاندی ہے۔ . آؤ جو چاہو کرو۔ . یہاں تم ہی تم ہو۔"

ان جملوں میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح انگریزوں کے ایجنٹوں نے ہندوستانی عوام کو دھوکا دیا اپنے اپنے بھائی بندوں کو یہاں بلایا۔

ذرا الفاظ کی سجاوٹ اور روانی دیکھیے، کس طرح سے مختلف کپڑوں کے نام آدمیوں کو دے کر عبارت کو رنگینی بخشتے ہیں۔ جس وقت گاڑھے خاں اپنی شادی کی تیاری ململ جان سے کرتے ہیں تو اپنے گھر کو سجانے کے بارے میں ہدایت دیتے ہوئے مشر جیرہ خاں سے کہتے ہیں۔ "گل بدن مالن سے کہو کر سہرا گل مخمل کا شاہی گوندھے . . . . اور ریشم بیگ، قاقم میرزا اور سنجاب خاں، شیخ سمور، شال دوشالہ اوڑھ کر اور اپنے ملازمین کمبل، گدّہ، غالیچہ وغیرہ کو ساتھ لائیں۔"

عوام الناس دوسروں کی کور کورانہ تقلید سے بالکل تباہ ہو گئے۔ انھوں نے سنجیدہ لوگوں اور رہنمایانِ قوم کی باتوں کو ایک کان سے سنا اور دوسرے سے باہر نکال دیا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ ہندی ساز و سامان انگریزوں کے ہاتھوں میں پہنچا اور انھوں نے ترقی کے دروازے ہندوستانیوں پر بند کر دیے اس سے معیشت کو زبردست نقصان پہنچا۔ میر صاحب اپنی اعلیٰ تمثیل نگاری سے کام لیتے ہوئے اس بات کو گاڑھے خاں کے برادرِ رضاعی[2] (برادرِ رضاعی) کے منہ سے یوں کہلواتے ہیں۔ "اور جب ململ جان کے دروازے پر تم ڈھیر ہو گئے تو ململ جان کھانے کو کہیں بس گئی . . . . . اب تک ان چٹخاروں میں کیا مزہ آیا، برف کی لذت دیکھی سوائے تالو اور زبان کے رگڑے کے اور کیا پایا، نہ تن پہ لتّا رہا نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی اور نہ پیٹ میں روٹی . . . . . دنیا کے دریا کا پاٹ ہے اور خالی دریا پاکر ہزاروں جہاز آگئے ہیں۔"

گاڑھے خاں کے دکھڑے میں مولف نے اس بربادی کا ذکر کیا ہے جو کہ بدیسی کپڑے کی خریداری سے اہلِ ملک پر آئی۔ گاڑھے خاں نے کردار بنا کر اپنے خیالات یوں ادا کرتے ہیں۔ "جب گاڑھے خاں گھر میں آئے اور کچھ اطمینان ہوا تب کونے کونے پر نظر ڈالی

---

[1] کپڑا بننا [2] دودھ شریک بھائی

تو سارا گھر لوٹ پوٹ لگا۔ بکاسی کے دروازے پر گھاس پھونس، جھاڑ جھنکاڑ، کوڑا کرکٹ۔ داخل ہونے کا دروازہ صفا چٹ میدان۔ اب گاڑھے خاں کو وہ فقرہ ململ جان کا یاد آیا کہ میں آپ کو منہ ملنا اور پیٹ خالی بنا دوں گی۔"

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ میر صاحب نے داستان کو ایک مخصوص ظرافت کا رنگ اور طنز کی چاشنی دی جو کہ ان کی داستانوں کو دوسری داستانوں پر برتری عطا کرتی ہے۔ داستان خلیل خاں فاختہ میں جب خلیل خاں کی طرف سے شادی کا رقعہ ان کی سسرال روانہ کیا جاتا ہے تو اس میں وہ اپنے حسب و نسب اور شجرہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"نام بندہ کا خلیل خاں ولد گلزار خاں، ولد آتش خاں ولد مرزا شعلہ بیگ۔ ولد شیخ انگارہ بدن ولد سید دروش علی ولد ہابیل برادر قابیل ولد حضرت آدم ساکن بہشت رجال دار دنیا۔ اور نام بندے کے نانا مرحوم کا دھواں دار بیگ ولد سلگو ولد گرمو۔ اب مردانہ سلسلہ یہاں سے مفقود ہے کہ کچھ پتہ نہیں ملتا۔ اس لیے عورتوں کے نام لکھ دیتا ہوں کہ بات پردہ میں نہ رہے۔ گرلو بنت سوختہ خانم بنت کچلا بنت انگر نسا بنت چنگاری خانم بنت تتنگی بیگم بنت آگ بگولا بیگم۔" صفحہ ۱۳۱

داستان ارا را دھوں' ایک رئیس زادہ کا قصہ ہے جو کہ بہت ہی پُر لطف انداز میں بیان ہوا ہے۔ اس خصوصیت سے غدر سے قبل ہونے والی کشتیوں کے داؤ پیچ وغیرہ اور دہلی کے محاورے وغیرہ بھی بہت ملتے ہیں جو کہ اردو ادب کے طالب علم کی معلومات میں بہت کچھ اضافہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح پاجی پڑوس دہلی کے آداب گفتگو اور طرز معاشرت اور دہلی کی زبان وغیرہ پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔

انھیں اردو زبان کی ترویج و ترقی سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ "باتوں کی باتیں" میں انھوں نے اردو کے محاسن سے بحث کی ہے جو کہ قابل توجہ ہے۔ ان کا نظریہ بھی وہی نظریہ تھا جو کہ چکبست کا تھا یعنی ہر کوئی اپنی مادری زبان میں مہارت پیدا کر کے نام روشن کر سکتا ہے اور اس کے ذریعے ملک و قوم کی خدمت کر سکتا ہے۔ وہ دہلی والوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں "میرے شہزادو! تمھارے ہر کام میں کامیابی زیادہ تر اردو ہی سیکھنے اور جاننے پر موقوف ہے۔"

اردو زبان کی اہمیت کے بارے میں اور اس سے مستنبط ہونے والے نتائج کے بارے میں انھوں نے اپنے دوسرے رسالہ، رسالہ "آداب و اخلاق" میں بھی بحث کی ہے۔

آج ہمارے ملک میں زبان کے مسائل الجھے ہوئے ہیں جن کو میر صاحب نے عرصہ ہوا یوں حل کیا تھا۔

"سب سے پہلے زبان مادری میں علم پڑھے، جو سب سے قریب تمھاری منزل مقصود کا راستہ ہے۔"

حسب

بشر نواز

آج کی اردو شاعری

اس مضمون کا عنوان بڑی آسانی سے جدید شاعری یا نئی شاعری رکھا جا سکتا تھا لیکن اس میں ایک خدشہ تھا وہ یہ کہ کچھ لوگ تو محض عنوان دیکھ کر ہی طے کر لیتے کہ چونکہ معاملہ جدید شاعری کا ہے اس لیے مضمون کا مہمل اور بے معنی ہونا یقینی ہے بالکل اسی طرح کچھ لوگ پڑھنے سے پہلے یہ طے کر لیتے کہ جدید شاعری پر لکھے گئے مضمون کا اہم اور پُر مغز ہونا ضروری ہے۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک سا نکلتا یعنی ادب اور شاعری کے لیے جس سنجیدہ رویے اور اس کی پرکھ کے لیے جس ایمانداری اور بے لاگ نظری کی ضرورت ہوتی ہے وہ مفقود ہو جاتی ۔ جو نہ صرف شعراء بلکہ آج کے سامع اور قاری کے لیے بھی مضر ہے۔ ہمارے یہاں کسی ادبی تحریک یا رجحان کے متعلق رائے پہلے قائم کر لی جاتی ہے اور اس کے محاسن و معائب پر نظر بعد میں ڈالی جاتی ہے۔ اس عیب یا ہنر کے نتائج ظاہر ہیں۔ آج سے چودہ، پندرہ سال پہلے اپنے آپ کو ترقی پسند کہنا اور کہلوانا فیشن بن گیا تھا اور آج ترقی پسندوں سے خلاف کہنا فیشن ہے۔ اول الذکر بات جتنی بچکانہ اور جذباتی تھی آخر الذکر بات بھی اتنی ہی لغو اور فضول ہے۔ حالات اور تاریخی بہاؤ نے ترقی پسند تحریک کو جنم دیا تھا اور وہ تحریک اپنے دور کی آواز بن کر ابھری تھی آج کے حالات میں آج کی شاعری ناگزیر ہے نہ ہم جب فیض، مجاز، مخدوم، جذبی سے یہ مطالبہ کر سکتے تھے کہ وہ عزیز لکھنوی، ثاقب اور فانی کی طرح شعر کہیں نہ اب نئے لکھنے والوں سے مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ فیض اور مخدوم کے نقش قدم پر چلیں۔

سب سے بڑی دقت اردو والوں کے ساتھ یہ ہے کہ وہ ہر تبدیلی قبول تو کر لیتے ہیں لیکن بعد از وقت — ترقی پسندوں کے ساتھ بھی یہی ہوا، اور ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ہر نئی بات کو آنکھ بند کر کے قبول کر لینا یقیناً کمزوری کی علامت ہے لیکن اسے بغیر غور کیے رد کر دینا بھی صحت مندی کی نشانی نہیں (ہم لوگ سوچنے سمجھنے اور غور کرنے سے ڈرنے کیوں لگے ہیں ؟)

اگر ہم ذرا ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لیں تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ۱۹۵۰-۵۱ء کے بعد کی شاعری پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق تھی۔ نتیجتاً نئے لکھنے والوں نے جھنجلا کر پرانے لکھنے والوں اور نقادوں کو برا بھلا

بنانا شروع کر دیا۔ جوابی کارروائی میں پیش رووں نے نو واردوں کو منہ پھٹ، غیر اصولی اور بے تمیز کہہ دیا
تو ادب سے ہٹ کر ذاتی بن گئی ان حالات میں کچھ لوگ فریق اول کے حریف بن گئے اور کچھ فریق ثانی کے۔
ادب عدالت کا کمرہ بن گیا لیکن منصف کہاں سے آئے؟ کیا ان حالات میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ادب کو فرد کا رد
بننے سے روکا جائے اور اس باب میں سنجیدہ رویہ اختیار کیا جائے؟ ان محرکات کا پتہ چلایا جائے جن سے آج
ادب اور خصوصاً شاعری کے دھارے پھوٹے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ آج جو کچھ لکھا جا رہا ہے سب لافانی ہے
آج کی ہر تخلیق ادب عالیہ کا جزو بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن یہ بھی نہیں کہوں گا کہ آج کی ہر تحریر مبہم، گمراہ
اور ذہنی بے راہ روی کی مثال ہے۔ ہر نئی تحریک، ہر نیا رجحان اپنے ساتھ کچھ اچھائیاں اور کچھ برائیاں لاتا ہے۔
آج کا رجحان بھی اس سے مبرا نہیں لیکن صحت مند ذہن کسی بڑے شاعر یا ادیب کا مقام متعین کرنے کے وقت اس کے
مثبت پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ میر کی عظمت ان کے بارہ سو صفحات کے پورے کے پورے دیوان کی وجہ سے نہیں
بلکہ ان اشعار کی وجہ سے ہے جو واقعی عظیم ہیں۔ غالب کے مقام کا تعین کرتے وقت ہم اگر ان کی "لگن کے پاؤں"
قسم کی غزلوں کو نظر انداز نہ کر دیں تو اہل ذوق ہم کو نظر انداز . . . . کر دیں گے۔ پھر کیا وجہ
ہے کہ آج کی شاعری کا ذکر کرتے وقت صرف انھیں نظموں غزلوں کو پیش نظر رکھا جائے جو صحیح معنی میں شاعری
کی بنیادی تعریف پر بھی پوری نہیں اترتیں۔ تجربہ الگ چیز ہے اور شاعری چیزے دیگر۔ میں تجربہ کو بھی برا نہیں کہوں گا
لیکن ہر تجربے کی کامیابی کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات
کو پیش نظر رکھتے ہوئے آج کی شاعری کا جائزہ لیا جائے۔ ایک زمانے میں شاعری خیالی باتوں اور دور از کار تشبیہوں
استعاروں اور رعایت لفظی وغیرہ کا نام تھا اس کے بعد شاعری میں شخصی واردات اور اپنے چھوٹے چھوٹے تجربات
(خصوصاً عشقیہ) داخل کیے گئے۔

ترقی پسندوں نے سماجی مسائل اور طبقاتی کشمکش کو شعر بنانے کی کوشش کی اور آج کا شاعر سماج اور
فرد، فطرت اور فرد، کائنات و فلسفہ اور سائنس کے باہمی رشتوں کی باہمی تلاش میں سرگرداں ہے۔ فنکارانہ
مہارت اور چابکدستی کے ساتھ جس موضوع پر قلم اٹھایا جائے گا وہ ادب و شعر کا جزو بن جائے گا۔ ادب میں محض
موضوع کبھی بھی ادبی یا غیر ادبی نہیں ہوتا اس کا ٹریٹمنٹ (TREATMENT) ادبی یا غیر ادبی ہوتا ہے
ڈیلری کہتا ہے کہ نظم میں زیادہ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ اس کا انداز اظہار کیا ہے؟ نئے لکھنے والوں کے تعلق سے یہ کہنا کہ
ان کے موضوعات سرے سے اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان پر قلم اٹھایا جائے، معترضین کی جہالت اور کم علمی کی دلیل ہے ہاں
یہ بات دیکھی جا سکتی ہے کہ شاعر نے اس فنی مہارت سے کام لیا یا نہیں۔ اکثر نئے لکھنے والوں کے پاس واقعی فنی مہارت
کی کمی ہے لیکن یہ بات ہر نئے لکھنے والے پر صادق نہیں آتی۔ آخر مصطفیٰ زیدی، خلیل الرحمن اعظمی، قاضی سلیم، وحید اختر
وزیر آغا، منیر نیازی، ساقی فاروقی، باقر مہدی، بلراج کومل، رشید قیصرانی، ناصر کاظمی، شفیق فاطمہ شعریٰ، شہریار۔

فضل جعفری، عزیز قیسی، نذیر احمد ناجی، انور معظم، احتشام [illegible] جیسے نئی شاعری ... ساجد اسرار، بشیر بدر، عتیق صدیقی
مانک احمد وغیرہ بھی تو نئے لکھنے والے ہیں۔ لیکن سوال اول تو نئے شعر کی ... نہیں کی جاتی کیوں کہ ...
سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے خاص ذہنی تربیت کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر کبھی بھولے بھٹکے ...
نکل ہی جائے تو کمزور نئے لکھنے والوں اور مبتدی ... سے موضوعات ... کا کلام پیش کر دیا جاتا ہے۔ یہ عمل اگر بد نیتی
کی دلیل نہ ہو تب بھی مطالعے کی کمی اور سہل پسندی کا ثبوت ضرور ہے۔ دراصل یہ ہے کہ بہت سارے لوگ صرف
ہیئت کی تبدیلی یا قطعاً بے سر و پا نظموں کو جدید شاعری سمجھ بیٹھے ہیں کیوں کہ اس قسم کی نظمیں یقیناً نظم ... البتہ
پیش رؤں کی نظموں سے مختلف نظر آتی ہیں لیکن اگر وہ لوگ ذرا ذہن کا استعمال کریں اور ... اور پرانے
... سے کچھ واقف ہوں تو انھیں پتہ چلے کہ اصل تبدیلی ہیئت کی نہیں مواد کی ہوتی ہے۔ ... ساری اچھی نظمیں
ایسی ہیں جن میں آج کے مسائل اور آج کا دل و دماغ ملتا ہے لیکن ہیئت کا کوئی انوکھا تجربہ نہیں۔ اس سلسلے میں وحید اختر
کی نظمیں "من باس" "رائیگاں" اور "کہانی کی ... کہانی کی غزل" پیش کی جا سکتی ہیں۔ منیب ... کے "مسدس ...
... لوگو" کے علاوہ خلیل الرحمن اعظمی اور عزیز حامد مدنی کی نظموں کو بھی نئی شاعری تسلیم کرنا پڑے گا کیوں کہ
ان میں مواد کا نیا پن ملتا ہے۔

ناصر کاظمی، ظفر اقبال، سلیمان اریب، باقی صدیقی، شہریار، فضیل جعفری اور بشیر بدر جیسے
غزل کے شاعر ہوتے ہوئے بھی نئے شاعر ہیں کہ ان کی آواز آج کی آواز ہے۔ اگر ہم صرف ہیئت کی تبدیلی ہی کو
جدید شاعری کا ضامن سمجھ لیں تو کوئی غزل گو نیا شاعر نہیں کہلائے گا۔

موضوع کی مناسبت سے بعض اوقات شاعر کو فارم میں بھی تبدیلی کرنی پڑتی ہے یا یوں کہیے کہ بعض مرتبہ
موضوعات خود ہی نئی ہیئت یا کم از کم عام ذریعۂ اظہار سے ہٹ کر کوئی اور ذریعۂ اظہار کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ ایسی
... میں شاعر صرف ... کرتب دکھلانے کے لیے نہیں بلکہ اپنے مافی الضمیر کو زیادہ بھرپور انداز سے اظہار کے
عام اور مروجہ طرز اظہار سے کنارہ کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی آواز قدرے مختلف تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن
... نہیں ہونے پاتی بقول فراق صاحب کے ایک ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو گانے والے کی آواز میں ... لگنے
... سے مشابہت رکھتی ہے۔ یہ بات شاعر کی انفرادیت کو ابھارنے میں مدد دیتی ہے۔ اختر الایمان کی کئی نظمیں
"ایک لڑکا" "محبت" "دور کی آواز" "تنہائی میں" اس سلسلے کی خوبصورت مثالیں ہیں (کچھ لوگ ادب
... کے پیمانے سے ناپتے ہیں اختر الایمان اور مجید امجد کو نیا شاعر نہیں مانتے کہ ان کی عمریں ۴۵ سے اوپر کی
ہیں) قاضی سلیم کی نظمیں "سنجوگ" "وقت" "دائرے" اور "تکان"، وزیر آغا کی "بات" "مسرت"
... کی" "پاگل" اور دوسرے کئی شعرا کی نظمیں اس کی مثالیں ہیں۔

آج کی شاعری پر بات کرتے وقت یہ چیز بطور خاص ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ جس طرح محض رعایت لفظی

محض نعرہ بازی شاعری نہیں کہلاتی اسی طرح محض لفظی بازیگری، محض ایک آدھ اپج یا محض ہیئت
شاعری نہیں ہے اس لیے شعر کی گفتگو کرتے وقت صرف عام تجربوں کو زیر بحث لانے سے
جائے گی۔ آج کا شعری مزاج سمجھنے کے لیے آج کا ذہن سمجھنا ضروری ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے
کی شکست و ریخت میں زیادہ تیزی اور زیادہ شدت آگئی ہے، عام بے چینی، اعصابی تناؤ، سرد جنگ
انسانیت کا غیر یقینی مستقبل، تیسری عالمگیر جنگ کا خطرہ ایسے حقائق ہیں جن سے کوئی صاحب ہوش آنکھیں
ظاہر ہے کہ ان حالات میں پرانے اصولوں کا بالکل اپنے پرانے ادب میں باقی رہنا ممکن نہیں۔ جب ہم مذہب
عقائد میں اجتہاد اور تبدیلی کے قائل ہیں تو صرف ادب سے مطالبہ کیوں کریں کہ اس میں کوئی تبدیلی
میں اجتہاد کو راہ نہ دینے والے کٹر ملا کہلاتے ہیں سماجی تبدیلیوں کا ساتھ نہ دینے والے ماضی پرست اور
کے جاتے ہیں۔ ادب میں تبدیلیوں کے منکرین کو کیا کہا جائے گا؟ اور ایک بات ـــ آج کے ادبی مزاج
کی وجوہات اتنی سطحی بھی نہیں جتنی سمجھی جاتی ہیں۔ آج کی پوری نسل خواہ وہ فنکار ہو خواہ عام آدمی
سامنے دنیا کی شکست و تعمیر کے مناظر دیکھ رہا ہے۔ آج ہمارے سامنے سائنس کی شاندار فتوحات
اس کی تباہ کاریاں بھی۔ آواز سے زیادہ تیز رفتار طیارے بھی ہیں اور مردہ اخلاق اور محبتوں کے
کالبد بھی ـــ ہم دیکھتے ہیں کہ چاند تک جانے والا انسان اپنے پیروں میں پڑے ہوئے
کو اٹھا نہیں سکتا۔ بھائی، بہن، ماں باپ، شوہر بیوی، عاشق و معشوق دوستی اور برادری میں کوئی
خود غرضی کے باقی نہیں رہا۔ کسی کے لیے زہر پی جانا کم عقلی اور جذباتیت کی دلیل ہے۔ آج کے انسان کا
خلوص، ریاکاری اور آنسو ظاہرداری بن گئے ہیں۔ مشینوں کی عنایت کہ نظریوں کا تصادم بھی مشینی عمل
گیا ہے۔ جہاں عام بھائی چارگی کے نعرے لگائے جاتے ہیں وہیں رنگ و نسل کے نام پر خون کی ہولی کھیلی
یہ تضاد انسان کی یہ بلندی اور پستی، یہ ہر لمحہ نئے نئے انکشافات دیکھ کر آج کی پوری نسل حیران و سراسیمہ ہے
آج کا فنکار اپنی دنیا اور اس کے ماحول سے علیحدہ نہیں ہے ان حالات میں وہ اوپری دل سے
کسی خاص نصب العین کا نعرہ نہیں لگا سکتا۔ اس لیے کہ اس کے پاس حساس دل اور بیدار ذہن ہے اور
آج کی بے ترتیبی، تضاد اور بے ربطی کا نقشہ دنیا کے سامنے رکھ دیتا ہے تو دنیا والے چیخ اٹھتے ہیں
کی تاب کون لائے) اس پر مزاجیت، فراریت اور قنوطیت کے الزامات لاد دیئے جاتے ہیں۔ آج کے
ادب میں بے ربطی، الجھاؤ، ایقان کی کمی اور ایک تذبذب کا در آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ہمیں ان باتوں کو
حقیقت سمجھ کر قبول کرنا پڑے گا (گو یہ کوئی اچھی بات نہیں) کہ آج کی زندگی جو انہیں عناصر سے ملو ہے ہم قبول
ہم کو دیکھنا صرف یہ ہے کہ نظموں یا ادب پاروں میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں خلوص کہاں تک ہے وہ چیزیں
نقطۂ نظر سے کہاں تک کامیاب ہیں اور آج کے حالات و ذہنی کیفیات کی کہاں تک نمائندہ کہلا سکتی ہیں

[illegible] سے مذمت کرتے پر اگر پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ قلم اٹھایا جائے۔ آرزو یہ ہے کہ ہمارا پوری ادبی دیانت اور فنکارانہ [illegible] سے لیا جائے تو [illegible] تاریخ ادب میں اس کی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ آج کوئی بھی [illegible] یہ نہیں کہہ سکتا کہ [illegible] تو ہم نے لکھنے والوں کو [illegible] ادبی دیانت سے عاری ہیں [illegible] دور کے شاعر [illegible] ہو کر۔

ہزار خار مغیلاں [illegible] لہو کا رنگ [illegible] گلستاں کے لیے
قدم قدم پہ بڑی سختیاں [illegible] کئی فریب کے عشوے ہیں امتحاں کے لیے
زمانہ لوں تو ہر اک [illegible] نہیں رکھتا
قسم لی ہے [illegible] نہیں کرنا

(زخم سفر - مصطفیٰ زیدی)

[illegible] یقین اور خلوص کی کمی کا الزام بے معنی ہے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں [illegible] تو دیکھئے [illegible] وقت [illegible] کوئی شعری [illegible] کو آگے بڑھاتی ہے [illegible] تجزیے کرنے [illegible] زندگی کا [illegible] سمجھ کر [illegible] کوئی سمجھداری کی [illegible] اس لیے میں ان نئے شاعروں کی [illegible] میں [illegible] کو [illegible] دینے [illegible] ہو موادکا [illegible] موجود ہے [illegible] پوری نظم دیکھ لیجئے مجھے [illegible] بھی اس پہ پرکھیں گے کہ جن فنکاروں کے دلوں میں [illegible] وہ [illegible] مختصر ہو ہی نہیں سکتے۔ اس [illegible] نئے شاعروں پر [illegible] کہ وہ اپنے دل میں محصور ہو گئے ہیں [illegible] غور کیجئے [illegible] سے پہلے ہر ستم رسیدہ کی زندگی کو اس طرح [illegible]

ہر ایک نقش یا عزیز ہے [illegible] [illegible] اور ہر اک [illegible] داستان
سبھی کو جانتے رہے ہم [illegible] [illegible]
ہم ان کی زندگی کو جانتے ہیں [illegible] [illegible] نظر [illegible]
ہوئے ہیں جو تلخ [illegible] کے زہر [illegible] ہماری داستاں [illegible] ان کی داستان

[illegible]

دوسروں کے غم کو اپنا غم بنا لینے کے [illegible] بعدی شاعر کر پائے ہیں اور اتفاق سے [illegible] شاعر مانے ہیں [illegible] میں کیا خیال ہے؟ اس افراتفری کے دور میں [illegible] اخلاقی [illegible]

تمیز اٹھ گئی ہے کسی کا اپنے ضمیر کو بچائے رکھنا، اک کیے ہوئے گناہ کے تعاقب سے ناقابل برداشت اذیت کرنا کیا زندگی کی مثبت اقدار پر پختہ ایمان کی دلیل نہیں ہے؟ یہ کرب طاری کیا ہوا ہے یا دکھاوے کا؟

میں راتوں کا بھید ہوں گہرا اور راتھاہ
دیر سے رنج کی تاریکی میں بیٹھا ہوں
میرے تعاقب میں ہے میرا ایک گناہ

میں روتا ہوں
اے میرے تاریک گناہ
میں روتا ہوں

(تعاقب ۔ ساقی فاروقی)

محمد حسن عسکری کہتے ہیں کہ ہم لوگ شاعری پڑھنا ہی بھول گئے ہیں ہمیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ شعر اچھا ہے، برا شعر ہوا بھی کہ نہیں اس کے بجائے ہم شعر میں کوئی ایسا خیال یا نظریہ حیات ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں جسے ہم ... انداز میں بیان کر سکیں یعنی ہم شاعری کو فلسفہ، سیاسیات، یا معاشیات کا نعم البدل سمجھنے لگے ہیں۔ ہمارے شاعر ان کے پڑھنے والے دونوں کے دونوں یہ بھول چکے ہیں کہ شعر میں ایک بات ایسی بھی ہوتی ہے جو نثر میں نہیں کہی جا سکتی یہ بات ممکن ہے کہ پڑھنے والوں پر صادق آتی ہو لیکن آج کا شاعر نثر و نظم کے فرق کو بخوبی جانتا ہے اسے شعر پڑھنا آتا ہے اور شعر کہنا بھی، وہ شعر کو فلسفہ، سیاست اور معاشیات کا نعم البدل تو نہیں البتہ اپنی ذات کے اظہار انکشاف کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ آج شاعر اظہار پر زور دیتا ہے اور اپنے عمل کو اتنا پھیلاتا ہے، تخصیص و تعمیم کا حامل انداز سے کرتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنے اظہار کے لیے بے چین نظر آنے لگتی ہے یہاں شئے کا وجود بے معنی نہیں معلوم ہوتا بلکہ ہر شئے کچھ کہنا چاہتی ہے اپنے آپ کو منوانے پر مُصر معلوم ہوتی ہے۔

زندگی جیخ کی میعاد ہے ہم بھی چیخو
اتنی شدت سے کہ اک مدت تک
وقت کو یاد رہے
جنگلوں اور پہاڑوں میں یہ فریاد رہے

(قاضی سلیم)

یہیں تو شعر اور فلسفے کا فرق مٹنے لگتا ہے۔ شاعر کا ایک نظریہ حیات، طرز زندگی ابھرتا ہے لیکن شعر کی زبان میں:

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت سنوار دے تو یہی صنم ہے

اسے عقیدت نے تراش لے تو یہی خدا ہے

(ثلاثی — حمایت علی شاعر)

نہ در پردہ جذبات سے محبت میں ہلکی سی الاشر کی چاشنی، قرب میں دوری کا احساس، آسودۂ لطف و کرم ہو کر سراپا جرم بن جانا آج کی الجھی ہوئی اور پیچیدہ زندگی کا المیہ ہے۔ آج کا حساس شاعر دل کو اپنے ذہن سے یا ذہن کو اپنے دل سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتا:

غضب ہے خال در پر گر منو اکسیر کا دھوکا
لیس عجز دعا تم پر نہیں ، تاثیر کا دھوکا
زمانہ ہو گیا ہے خال و خط کو اپنے یاد آئے
نہیں ممکن کہ اب آئینہ میرا عکس لوٹائے
سراپا جرم ہوں آسودۂ لطف و کرم ہو کر
میں شاید رہ گیا پہلی محبت کی قسم ہو کر

(دوسری محبت — شاذ تمکنت)

میں نے اوپر کہیں عرض کیا ہے کہ آج کا انسان ایک بے یقینی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ستاروں کے چھونے کے ارمان نے آدمی اور زمین کے قدیم رشتے کو بڑی حد تک منقطع کر دیا ہے۔ یہاں ان عوامل سے بحث کی گنجائش نہیں جن کی وجہ سے آج دنیا کی یہ درگت بن گئی ہے لیکن یہ حقیقت ہے اور ہر حساس انسان اس المیہ کو محسوس کرتا ہے۔ ان حالات میں کچھ شاعروں نے زمین اور زمین کے دیگر متعلقات کے ساتھ اپنی وابستگی اور زیادہ گہری کر دی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں شاید پہلی مرتبہ فطرت اپنی تمام بوقلمونیوں کے ساتھ جلوہ فگن ہو رہی ہے یہاں میں مناظر فطرت کی خارجی عکاسی والی نیچرل شاعری کی بات نہیں کر رہا ہوں یہ کام تو اسمعیل میرٹھی اور ... محمد حسین آزاد بھی کر چکے ہیں میں بات اس شاعری کی کر رہا ہوں جس میں شاعر نے اپنی نفسیات اور فطرت کے اندرونی رشتوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

ستاروں سے بچھڑ کر
تو دھرتی کی جانب اترتے ہوئے
اس فضا سے گزرنا
جہاں میں معلق ہوں
ہر آتے جاتے مسافر کے چہرے کو پہچانتا ہوں

(ناتمام — بلراج کومل)

دن کا دروازہ ہوا بند شب تار آئی
راستے کروٹیں لینے لگے
گلیوں میں اداسی چھائی
سارے ہنگامے وہ سب رونقیں (دن کی ہمراز)
گونگی جھیلوں میں ہوئے قید حباب کی طرح
اپنی تنہائی کے اس خول سے باہر
دیکھو میں
ایسا سایہ کہاں جاتا ہے
سنسان راہ میں آج
کونسی یادوں کو جگانا ہے
(شہریار)

چونکہ راکٹوں اور آلات سے زیادہ تیز رفتار رفتاروں کے اس دور میں کوئی تبدیلی کوئی تغیر نہ دیر پا ثابت ہو رہا ہے اور نہ آخری ۔۔ ہر لمحہ بدلتی ہوئی دنیا میں صحت مند ادب کی پرانی اقدار بھی جوں کی توں کیسے باقی رہ سکتی ہیں، یہاں آنکھ جھپکتے ہی منظر بدل جاتا ہے اور فنکار اب استعجاب و عدم حیرت سے سوال کرتا ہے یہ کیوں ہوا۔ ۔

جیسے ملاقات یاد کی تعبیر بدل گئے
جھپکی جو آنکھ شب کے منظر بدل گئے (فضیل جعفری)

استعجاب، حیرت، کیا اور کیوں سے نئے ادب نے جنم لیا ہے (حکمائے نے بڑے اور عظیم ادب میں بھی انھیں سوالات اور ان کے جوابات تلاش کرنے کی تلقین کی ہے) چونکہ کیا، کیوں اور کیسے کے جواب کا وقت ابھی نہیں آیا ہے اس لیے سوال کرنے والوں کو مایوسی اور ناکامی کا سامنا کرنا ناگزیر ہے اور آج اس احساس ناکامی میں اکیلا فنکار ہی نہیں قاری اور سامع بھی شریک ہے۔ اس طرح فنکار اور اس کے سامع اور قاری میں ایک رشتہ دردمندی کا سبھی استوار ہوتا ہے

اک درد کا دریا ہے رواں قریہ بہ قریہ
ملتے ہیں ہمیں غم زدگاں قریہ بہ قریہ (فضیل جعفری)

ہو سکے تو گلے مل کے رو لے اے غم خوار
کہ آنسوؤں ہی سے دامن کے چاک سلتے ہیں (خلیل الرحمن اعظمی)

گزر رہا ہوں مسلسل کچھ ایسے عالم سے
حیات دے کے مجھے جیسے کوئی بھول گیا

(سلیمان اریب)

میں کچھ اُجڑا ہوا
یا بہت گرم بہت سرد سا سال
بند دروازوں میں سویا ہوا
ہار سے احاطے اوس پرستان میں رات جیسے (انار کلی — شہزاد احمد) (شکیب جلالی)

آج کے انسان کے مسائل اتنے پیچیدہ اتنے تہہ در تہہ اور اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ ان کا اظہار سیدھے سادے الفاظ کے بس کی بات نہیں۔ زبان اور مجرد الفاظ اس بوجھ کو سہار ہی نہیں سکتے اس لیے آج وہ علامتوں اور استعاروں کا سہارا ڈھونڈنے لگا ہے تاکہ اس کی پیچیدہ ... سبھی احساسات خیالات کی پرچھائیں اور عکس ہی اجاگر ہو جائیں۔ استعارے اور علامت کا استعمال دودھاری تلوار ہے جس کا بیلانس قائم رکھنا ... ہے لیکن آج ... ہمت کا کچھ نہیں کہہ سکتی بھیڑ ہجوم کے چھوڑ دے۔ اختر الایمان نے تو ایک استعارے کی مدد سے اپنے شعر کے سرمائے میں ایک حسین نظم کا اضافہ کر دیا اور وہ نظم ہے "ایک لڑکا"۔ ... آج کے شاعروں نے یہ ... نہیں رہے گی کہ وہ استعارے سے ڈرتے ہیں۔ کچھ خوبصورت اشاریتی نظموں کے ٹکڑے دیکھیے۔

کلی مرکلی سے
خوشبو ... ماہیں ہے
جو آکے ٹکرا رہے
اور ... کلی کی پتی ... میں
لرزتے ہوئے ٹوٹ رہے ... مہک ... دھڑکن ... رنگیلی بدلیاں
سبھی کھلے ... کرتے
اور خود پھوٹ کر ... رہے

(اشتہِ خون کے بعد — وزیر آغا)

کون سا ... سب ... سوئے ...
جاگ ... رنگیں لوٹ کی رسمی آزار کو
دیکھتا ہے کوں پھولوں کے بدن سے
اڑنے رنگوں کو ہوا میں ضرنے
سوچتا ہوں لوں ... وقت بھی دھوپ سا
اڑ رہا ہے سر کے پار سے
اک پرندہ بازوؤں کا کانپتا سایہ لیے (حیات — نذیر احمد ناجی)

دیکھا آپ نے، نازک اور خوبصورت استعاروں کی مدد سے آج کی سراسیمہ زندگی انسان کی مشینی ذہنیت اور نازک احساسات سے بیگانگی کی کتنی پُراثر تصویر ان دونوں نظموں کے ٹکڑوں میں پیش کر دی گئی ہے۔ میں زیادہ دینا نہیں چاہتا۔ اگر آپ کو اس قسم کی بامعنی نظموں کی جستجو ہو تو نئے شاعروں کے مجموعے اور معیاری رسائل میں چھپنے والے نئے معنوں میں نئے شاعروں کا کلام حاضر ہے۔

چلتے چلتے یہ بھی دیکھ لیجیے کہ اس بے اندازہ سراسیمگی کے دور میں بھی آج کا شاعر زندگی سے کتنا پیار کرتا ہے

ع لیکن اک پھول سے چمٹی ہوئی تتلی نہ گری (مجید امجد)

ان حالات میں بھی آج کا شاعر اپنے پر اور انسان پر کتنا بھرپور یقین رکھتا ہے۔ نئی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے

میں وہی ابنِ آناق ہوں میرے دل گیر راششں گرد
وقت جس کے تصوّر کی اولاد ہے
وقت کے پاس کچھ بھی نہیں
ہاں مگر ایسے لمحے کی خلقت پہ قادر ہوں میں
جس کے پیچھے اندھیرا اگر ہے تو ہو
جس کے آگے کم از کم اندھیرا نہیں

(عزیز قیسی - جشنِ میلادِ امروز)

یہ صرف کف در دہاں چیخ نہیں یہ ایقان، شک و شبہ کی منزل سے گزر جانے، ناکامیوں اور بے یقینیوں کی آگ میں تپ جانے اور زہرِ غم کو پچا لینے کے بعد کی منزل ہے۔

ان مختلف مثالوں سے ایک بات نور روشن ہو گئی کہ آج کی شاعری "کورس" نہیں بلکہ مختلف ذہنوں مختلف حساس دلوں اور مختلف منزلوں کے پرخلوص راہروں کے تجربات کا نچوڑ اور مسلسل غور و فکر کی دین ہے اور شاعری میں اتنا تنوع کبھی نہیں آیا ہوگا ایک ہی دور میں اتنی مختلف النوع شاعری کبھی نہیں کی گئی ہے جتنی آج کی جا رہی ہے ترقی پسندوں کے دور میں بھی نہیں، حالی اور آزاد کے زمانے میں بھی نہیں اور اس سے پہلے بھی نہیں۔ کیا یہ کیفیت جدید شاعری کی قوت اور جدید شاعری کے خلوص اور لگن پر ایمان لانے کے لیے مجبور نہیں کر دیتی؟؟

وقار احمد رضوی

ادب کیا ہے؟

ادب ایک تسلسل اور ایک استمرار [illegible] ایک سماجی عمل ہے دستوکی باستان کا نقیب بھی ہے اور حدیث [illegible] تصویر آزرگری [illegible] حسن کا ابلاغ عام بھی۔ ادب نہ فلسفہ ہے۔ سائنس بلکہ لوحِ [illegible] کے سینے میں فطرت کی [illegible] جس کا [illegible] پاکیزگی سے عبارت ہے [illegible] اروں کی دنیا ہو یا مرغزاروں کی [illegible] وہ [illegible] معاملات [illegible] تخلیق کرتا ہے

ادب نظری نہیں فطری چیز ہے وہ فطرت کی عکاسی کرتا ہے۔ جب دنیا کی تلخ حقیقتیں زیادہ سنگین ہو جاتی ہیں تو ادب نابغہ کا نغمہ، آبشاروں کا ترنم اور [illegible] کی طراوت بن جاتا ہے۔ وہ سبزہ [illegible] سے لالہ و ریحان کے قافلے لے کر نکلتا ہے اور دکھوں بھری دنیا کو حرف و حکایت کی شیرینی عطا کرتا ہے۔ [illegible] میں اجالا اور تاریکیوں میں روشنی پھیلاتا ہے۔

ادب حقیقت خارجی بھی ہے اور [illegible] زندگی کو مثالیت کی [illegible] تک لے جاتا ہے جہاں کئی قومیں شکست و ریخت سے دوچار ہوتی ہیں۔ شاید یہی وہ مقام ہے جب [illegible] شعور سے، وجود تصور سے، روح جسم سے، اور عمل فکر سے پہلے وجود میں آتا ہے

ادب ایک عمرانی صداقت ہے وہ [illegible] پیدا [illegible] ہے۔ عمرانی تصورات کی تبدیلیوں کے ساتھ ادبی تصورات بھی بدلتے ہیں [illegible] زندگی [illegible] ادب [illegible] کا لازمی اثر ادب پر پڑتا ہے۔ نئی روایتیں اور نئے اسلوب پیدا ہوتے ہیں وہ ستاروں کی [illegible] کو [illegible] فنکار [illegible] سفر کرنے لگتا ہے۔ اور سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر کے اپنی زندگی کا شب تار [illegible] ہے۔

ادب DYNAMIC ہوتا ہے۔ وہ معاشرے میں ANARCHY [illegible] پژمردگی کو دور کرتا ہے۔ وہ قوم کی تاریخ بھی ہوتا ہے اور اس کے عمل کا پیمانہ بھی۔ وہ [illegible] نقطہ ہے [illegible] جدوت و ارتقا کا تخلیقی [illegible] ہے۔ وہ محض زندگی کی ترجمانی نہیں کرتا۔ اس کی توسیع بھی کرتا ہے۔ وہ [illegible] کی یادگار، حال کا آئینہ اور مستقبل کا اشاریہ ہوتا ہے۔ زندگی مختلف مرئی اور غیر مرئی کیفیات کا مجموعہ ہے۔ ادب حقیقتوں کا متحرک عکس

معاشی نظام، طریق پیداوار، اور مادی حقائق ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ انسانی ذہن سے باہر ادب کا ایک مادی وجود ہوتا ہے۔ جو شعور و ادراک کو زندگی کی قدروں سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ ادب زندگی کی حرکت اعلیٰ ہے جس طرح زندگی بالقدر ترقی کرتی ہے اسی طرح ادب بھی ایک تقابلی جنگ ہے۔ وہ متحرک اور مسلسل ہے نیمروں کی طرح جامد حقیقت مائل بہ ارتقاء ہے۔ ادب بھی نامیاتی عمل ہے، اس کی کوئی آخری منزل نہیں۔ تناقض، تردید، اور تحلیل اس کے استمرار کے مدارج ہیں۔

ادب کی طرح رقص، موسیقی، سنگ تراشی اور مصوری سب میں حرکت یا خطوط کا توازن یا تناسب ملتا ہے۔ رقص تمام فنون لطیفہ کا ابتدائی نقطہ ہے۔ وہ فطرت کی مہیب طاقتوں کے خلاف ناطق قدروں کی پذیرائی کرتا ہے۔ شاعری آواز، مفہوم اور کنایہ کا نام ہے، اور رقص اشاروں اور علامات کی شاعری ہے وہ روایت کو اشاریت کی آخری شکل دیتا ہے۔

موسیقی ایک فن لطیف ہے۔ اس میں جذبے کی کارفرمائی ہے۔ خالص موسیقی سروں کا نام ہے اس کا راست تعلق انسانی جذبات سے ہے۔ موسیقی جذبانیت کو متاثر کرتی ہے۔ نقاشی اور مصوری جذبات کو متاثر کرتے ہیں مگر عقل کے ذریعہ۔ نقاشی اور مصوری جذبات و تاثرات کی تعبیر فکر کے ذریعہ کرتے ہیں۔ تخیل میں معونت فکر ہوتی ہے لیکن حادثہ ہوتا ہے۔ ادب ایک فن جمیل ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ تقاضایات عقلیہ کے ساتھ اپنی خصوصی توجہ عواطف طرف بھی کرے۔ ادب میں جذبے کا مقام موسیقی کی طرح عملی نہیں بلکہ عقلی ہے۔

ادب سماجی عمل ہونے کے علاوہ ایک انفرادی اور شخصی ماحول بھی رکھتا ہے۔ ادیب کا وجدان ذاتی احوال کوائف سے گزر کر زندگی کی وسعتوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کا عمیق ذہن تجربے کی تہہ تک پہنچ کر اس کی نظر کو بصیرت کی تابانی سے منور کرتا ہے۔ کلام میں صداقت، حسن اور حسن عمل اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب فنکار ذاتی تجربوں سے گزرتا ہے۔ اس لیے حسن صداقت اور حق ادب کی بنیادی قدریں ہیں۔ عظیم ادب اپنے خالق کی شخصیت کا حسین پرتو ہوتا ہے وہ کائنات کے اسرار و رموز کو انفرادی اور اجتماعی زندگی سے فکری طور پر مربوط کرتا ہے۔ ادیب کا ذوق ادب کو حسن و جمال سے آراستہ کرتا ہے۔ اور داخل کا مستحکم یقین قوت تاثیر پیدا کرتا ہے وہ سوز دروں کی آگ سے ادب کو پختہ کرتا ہے اور اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کرتا ہے۔

ادیب اعلیٰ انسانی قدروں کا محافظ اور زندگی کا ترجمان اور مفسر ہوتا ہے۔ وہ اپنے سینے میں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں محسوس کرتا ہے۔ زندگی فلسفہ کا آہنگ نہیں جذبات کا نغمہ ہے۔ جو ادب میں داخلی تاثر پیدا کرتا ہے۔ ادیب کے داخلی احساسات اور تجربات وقت کے تہذیبی مزاج کی دین ہوتے ہیں۔ وقت کے تہذیبی مزاج سے ادیب کا جمالیاتی شعور نکھرتا ہے۔ ادیب کا جمالیاتی شعور اسے فطری طور پر تناسب اور ہم آہنگی توازن، اور اعتدال کی جمالیاتی قدروں کے حصول پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ انسانی ذہن کی اس سطح تک رہنمائی کرتا ہے جہاں

ر.گی کا ظاہری تضاد تحلیل ہو کر ادراکِ حقیقت کا موجب ہوتا ہے۔ ادیب کے ذاتی اور شخصی موثرات تمدنی اور ساجی عوامل کے زیر اثر ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ فرد کی تعمیر فرد کے ذاتی شعور اور سماجی ارتقا کے تحت ہوتی ہے۔ جو تاریخی عمل کی ماہیت سے مطابقت رکھتی ہے۔

ادب حقائق کی خالص تعبیر ہی نہیں — وہ شخصیت ادیب کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ادیب کی مزاجی ہیئت اور طرزِ ادا کی طرح ادب میں اثر اندازی اور اثر پذیری کی طاقتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ادیبوں کے جدا جدا اسلوب ہوتے ہیں ادب ایسے ہی مختلف تاثرات و تاثیرات کے مجموعے کا نام ہے۔

زندگی حقائق یا صرف خارجی اصول کے تابع نہیں۔ وہ ان اندرونی جذبات کے بھی تابع ہوتا ہے جو خالق ارادہ و عزم کو بیدار کرتے ہیں۔ انسانی رفتار کو متاثر کرتے ہیں۔ اخلاق کو مہذب بناتے ہیں اور راہِ حیات کی مدبندی کرتے ہیں۔ جو ادب شخصیت ادیب کی ترجمانی کرے۔ پڑھنے والے کے دل میں ایسے ہی تاثرات پیدا کرے جیسے ادیب نے محسوس کیے۔ وہ ادب حیاتِ انسانی کی سچی دستاویز ہوگا۔ اس سے حیات و کائنات کا گہرا مطالعہ حاصل ہوگا۔

ادب محض استادی یا فنی کارگری ہی نہیں۔ وہ فرشتوں کو آدم کی ترتیب اور آدم کو آدابِ خداوندی سکھاتا ہے وہ فیلسوف لالہ و گل کی بخیہ گری ہی نہیں، زاہد سب زندہ دار کی صحبت ہم نشینی میں فرد کو ارادہ، علم اور تجربے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ ادب کسی خلاق دماغ کی خود روی کا نتیجہ بھی ہے اور وہ زندگی کی تجلی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ ہر دور کا ادب مقصدی رہا ہے۔ بغیر مقصد کے ادب پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی نظریہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے۔ فن بلا ارادہ اور لاشعوری طور پر پہلے وجود میں آتا ہے۔ اس کے اصول اور نظریات بعد میں مدون اور مرتب کیے جاتے ہیں۔ تاریخ کے گزشتہ ادوار میں نظریہ غیر شعوری طور پر ادب میں راہ پاتا تھا۔ آج نظریہ ہر اچھے اور بڑے فنکار کے افکار کا جزو ہے کیونکہ عقائد ادب میں زندگی کی بصیرت لاتے ہیں۔

ادیب کے دل میں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ خارجی حقائق کے شعور اور ادراک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ احساس انفرادیت سے گزر کر اجتماعی شکل اختیار کرتا ہے۔ ادبی ماشیہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ادیب خارجی یا داخلی حسیات جمالی کی عکاسی اس طور پر کرے کہ تصویر کا حقیقی رخ پڑھنے والے کے سامنے آجائے۔ وہ قوت جو اس تصویر کشی کی تکمیل کرتی ہے۔ اس کو قوتِ فکر یہ حسیہ یا قوتِ خیالیہ IMAGINATION کہتے ہیں۔ جذبے کی طرح خیال بھی ادب کا ایک ضروری عنصر ہے۔ خاص طور سے ان فنون میں جس میں جذبے کو دخل ہے۔ خالص موسیقی کے علاوہ تمام فنون میں فکر کو بنیادی رکن کا درجہ حاصل ہے۔ فکر کو مقصود یا نظریے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ادب میں فکر یا نظریے کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ادب میں رونق اور قوت پیدا کرتا ہے۔ زندگی اپنی دوامی رفتار ارضی میں عقل مفکر سے رہنمائی حاصل کرتی ہے اور شعور ذرائع یا جذبہ محرک پر تکیہ کرتی ہے۔ عقل مفکر اور جذبہ محرک ادب تاریخی پیدا کرتا ہے۔

ادب میں فکر کی اس قدر مقدار ہی کافی ہے جو آثار ادب کو مضبوط اور مستحکم بنائے۔ لیکن اگر مقصد عقل کی

امداد کرنا ہے خالص افکار کے ذریعہ۔ تو وہ علم (SCIENCE) ہے۔ اس کو عقلیت خالصہ سے موسوم کیا جا سکتا ہے جو نہ فن ہے اور نہ ادب بلکہ علم ہے۔

وہ زبان جو حقائق علمی کی تعبیر دقیق انداز میں کرے وہ شخصیت ادیب کی ترجمانی نہیں کرتی۔ اس اعتبار سے طبیعات کیمیا اور حساب کا شمار ادب میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ اصطلاحی زبان میں آثار شخصی کو سمونے کی صلاحیت نہیں ہوتی ۔۔۔ علمی زبان، موضوعی مسائل اور حقائق عقلی سے بحث کرتی ہے۔ اس میں جذبے کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ اسلوب یا علمی طرز ادا بار یکی میں علم ریاضی کی زبان سے قریب ہوتا ہے۔ بااوقات علم ریاضی کی زبان دقیق زبان ہوتی ہے۔ خالص عقلی حقائق کی تصویر کشی کے لیے اس سے زیادہ سچی یا راست انداز کوئی اور زبان نہیں ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ادب اور علم میں فرق ہے۔ یہ فرق علمی اور ادبی طبیعت کے فرق سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک طبیعت علمیہ ہے اور دوسری طبیعت ادبیہ۔ ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہی علم اور ادب کے درمیان ہے۔ طبیعت علمیہ کا مقصد اشیاء کا تحلیل و تجزیہ، ان کے بارے میں غور و خوض اور ان کی نشو و نما سے بحث کرنا ہے جس طرح ایک ماہر نباتات، گھاس پودوں اور پھولوں سے واقفیت حاصل کرتا ہے پھر ان کے اجزاء کے فرائض بیان کرتا ہے وہ ان کے تعلق بالغیر کی تشریح کرتے ہوئے ان کے مدارج جات کا بھی تعین کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح طبیعت علمیہ عناصر اور ان کے تعلق بالغیر سے بحث کرتی ہے۔ ان بحثوں سے ضوابط علمیہ اور عقلی اصول تشکیل پاتے ہیں۔ طبیعت ادبیہ اشیا سے اس طور پر بحث کرتی ہے کہ ان کا تعلق انسانی جذبات سے کیا ہے؟ اور وہ کیا چیزیں ہیں جو نفس انسانی میں شعور اور وجدان کو بیدار کرتی ہیں۔

پھول مرتب ہیں اور خوبصورت ہیں۔ وہ انسان کی لطف اندوزی کے لیے ہیں۔ انسان ان کی خوشبو سے محظوظ ہوتا ہے۔ ان سے فطری خوبصورتی اور جاذبیت طبعی کا سراغ ملتا ہے۔ ادب جمال فطرت کی عکاسی کرتا ہے اور ہمارے لیے سرور و انبساط بہم پہنچاتا ہے۔

یہ علماء نہیں ہیں جو ہم کو فطرت کی بوقلمونی سے آگاہ کرتے ہیں۔ یہ ادیب کی ذات ہے جو ہمارے اوپر فطرت کے اسرار و رموز افشا کرتی ہے۔ ادیب ہمارے سامنے فطرت کی نیرنگیاں پیش کرتا ہے۔ ان عمیق معانی کی تفسیر کرتا ہے جو ترنم اور ہیئت کے امتزاج سے ادب کے جمالیاتی رشتوں کو استوار کرتے ہیں۔ کیفیات کی زبان، داخلی تاثر کا اشاریہ ہوتی ہے۔ وہ فنی تقاضوں اور انفرادی داخلیت کا رشتہ، ہوتے خوش آب کی طرح عام زندگی سے جوڑتی ہے۔

عالم اور ادیب کے درمیان فرق کو اس طرح پہچانا جا سکتا ہے کہ عالم کا مقصد اشیاء میں باہم مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ ان کے بارے میں سوچتا ہے۔ ادیب کی توجہ طبیعت کی طرف ہوتی ہے۔ وہ ہم کو وجدان سے قریب ...

کرتا ہے۔ اور وجدانی آواز و تاثر سے ملاتا ہے۔ عالم اشیاء کی تعبیر جس دقیق پیرایہ میں کرتا ہے اس کا نام علم ہے۔ اثر ادبی شخصیت ادیب کی ترجمانی کرتا ہے۔ اثر علمی ادیب کی خصوصیات نفس کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ اس کا رجحان اسلوب عقلی کی طرف زیادہ ہوتا ہے جس کا تعلق ذات سے نہیں خارجی دنیا سے ہے

اس تفاوت سے نہ فنونِ ادبی میں تضادِ تام دکھانا مقصود ہے اور نہ اس سے علم اور ادب میں شعوری رشتے کی نفی ہوتی ہے۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ بعض کتابیں ایسی ہیں جو علمی ہوتی ہیں ان میں ادبی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں ان کتابوں میں قضایائے علمیہ کو شعور اور وجدان کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے۔ ادب فنی اپنے اندر قوت پیدا کرنے کے لیے حقائق یا عقلیت کا محتاج ہے اور عقل و شعور کے باہمی تعاون سے ہی اس کی بنیاد استوار ہوتی ہے۔ آثارِ ادبی میں عقل و شعور کی پذیرائی، تعبیرِ حقیقت کرتی ہے۔ حقیقت لباسِ مجاز میں جلوہ گر ہو کر قبولِ عام کی سند پاتی ہے حقیقتِ عقلیہ اگر جذبے کا دامن چھوڑ دے تو نہ قصیدہ حیات جاودانی پا سکتا ہے اور نہ افسانہ۔ قوانینِ طلوع و غروب کا علم ایک فطری عالم کے مطالعۂ جمال کو ناقص نہیں کرتا۔ تا وقتیکہ وہ فودانی لطافت حسّی کو نہ کھو بیٹھے، اور نظارۂ جمال کی خوشیوں کو بھول کر اپنی تمام تر توجہ قوانین و ضوابط کی طرف منعطف نہ کر دے

انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقل و شعور کے درمیان توازن برقرار رکھے۔ فکر اور وجدان دونوں کو ساتھ لے کر چلے۔ عقلیت اور حسّیت میں سے دونوں کو ایک دوسرے پر غالب آنے نہ دے۔ ان میں سے ہر طاقت کو زندہ رکھے۔ نہ جذبات کا غلام بن جائے اور نہ بندۂ عقل و افکار۔ جذبے کی بندگی سے فکری سطحیت پیدا ہوتی ہے۔ اور محض عقل کی پاسبانی، زندگی کی تگ و دو میں حیاتِ ادبی کی فطری نشاط کو زائل کر دیتی ہے۔

ادب نام ہے کلام معقول اور موزوں کا اور ادب تاریخی نام ہے اس کلام منقول اور اس کے متعلقہ علوم سمجھنے کا۔ ادبِ تاریخی علم اور ادب کے درمیان ایک چیز ہے۔ اس میں علم کی موضوعیت اور ادب کی راستی دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔

مورخ ادبی عقلِ انسانی اور شعورِ انسانی کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے۔ مورخ ادبی کے لیے ضروری ہے کہ علومِ عقلیہ فلسفہ فنونِ لطیفہ کے ساتھ اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی زندگی کا بھی مطالعہ کرے۔

تاریخ کی وہ کتابیں جو محض خشک حوادث کا مجموعہ ہوں، ان میں نہ فہم و فراست کو دخل ہو نہ ان کی بنیاد علت و معلول پر ہو۔ اور نہ ان میں حوادث کے باہم تعلق پر زور دیا گیا ہو۔ ایسی کتابیں پراگندہ قصوں کی حیثیت رکھتی ہیں زیادہ سے زیادہ ان کو تاریخ کا مادۂ خام کہا جا سکتا ہے۔ اس مادۂ خام سے روشن خیال، وسیع المشرب اور صاحبِ طرز مورخِ ادبی استفادہ کرتا ہے۔

تاریخِ ادب سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادب پر کتنے دور گزرے؟ اور ماحول اور زمانے کے اختلاف و تضاد و موثرات سے ادب پر کیا اثر پڑا؟ تاریخ ادب انھیں عوامل اور موثرات سے بحث کرتی ہے جن سے

ادبی ذوق اور فن متاثر ہوتا ہے۔ وہ علم اور فن کی درمیانی کڑی ہے۔ جہاں حقائق اور جذبات دونوں جمع ہو گئے ہیں شاید اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ تاریخ بھی ایک علم ہے۔

تاریخ کے مادّی نظریے کے مطابق عقل کو تاریخ کی بنیادی غرض شمار کیا جاتا ہے۔ رجالِ تاریخ نے جن واقعات سے بحث کی ہے ان کو سچّائی سے نقل کر دینا تاریخی ثقافت کا نشانِ اوّل ہے۔

ادبِ تاریخی۔ واقعات کی صحیح ترجمانی اور صحتِ بیان پر بھی زور دیتا ہے۔ اور ان کے اسباب و محرکات سے بھی بحث کرتا ہے۔ وہ عقلِ مدبر اور انفعالِ محرک سے چراغِ راہ گزر اور جذبات وجدان کی آگ پیدا کرتا ہے جو کائنات کو نئے اجالوں سے روشن کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمالیاتی تاثیر و تاثر یا جذبے کو ادبِ تاریخی میں ثانوی درجہ حاصل ہے

سیاسی زندگی کا اضطراب اور فساد، ادبی زندگی میں فساد اور اضطراب پیدا کرتا ہے۔ لیکن سیاست کو ادب کے پرکھنے کی کسوٹی نہیں بنایا جا سکتا۔ ہر عہد کا ادب اپنے عہد کی روایتوں کا نقیب ہوتا ہے۔ مادی تبدیلی سے داخلی کیفیتیں بدل جاتی ہیں۔ ساز بدلتے ہیں تو نئے راگ پیدا ہوتے ہیں۔ تغیرات مادی چیزیں ہیں۔ وہ تخیل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ سیاسی تبدیلی اسلوب کو تخیلی حقیقت اور واقعیت کی طرف لے جاتی ہے۔ کبھی سیاسی زندگی کی ترقی، ادبی ترقی کا باعث ہوتی ہے۔ اور کبھی سیاسی زندگی کا زوال بھی ادبی ترقی کا موجب ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ادب اور سیاست کا تعلق اکثر اوقات معکوسی ہے۔ ادب میں نظریے سے انکار، قوت سے انکار ہے لیکن اگر نظریہ کسی طبقاتی کشمکش یا سیاسی پارٹی کا آرگن ہے تو وہ سیاسی پروپیگنڈہ ہوگا، ادب نہیں ہوگا۔ اس کو ادبی رسالت کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا۔

ادب سیاسی پروپگنڈہ نہیں۔ وہ ایک بحرِ بے کراں ہے۔ اس میں چاندنی، بہار، جوانی نغمہ اور سبزے کی دلکشی ہے۔ اس کو تاریخی جبریت کا شکار نہیں بنانا چاہیے۔ اس سے شاعر یا ادیب کا مذاقِ سخن بگڑ جاتا ہے۔

ادب کا ایک ہمہ گیر اور آفاقی ذہن ہوتا ہے۔ وہ ماقبل منطقِ حسیات کے بعد افادیت پر زور دیتا ہے جس طرح سماجی اور سیاسی آزادی کی ضرورت ہے۔ عقلی اور شعوری زندگی کے لیے بھی آزادیٔ رائے ضروری ہے۔ آزادیٔ رائے ادب کو اونچا اٹھاتی ہے۔ آزادی ایک ایسی طاقت ہے جو ادب کو EXTENTIALISM وجودیت اور ادبی ثقافت کو حرکت کی طرف لے جاتی ہے۔ ادب مذہب یا دینی علوم کا وسیلہ بننے سے آزاد ہے۔ زندہ ادب پائدار اور دیرپا ہوتا ہے۔ وہ وقتی یا لمحاتی چیز نہیں۔ وہ مذہبی تقدیسوں اور احتراموں سے آزادی کا خواہش مند ہوتا ہے وہ بحث، نقد، تحلیل، شک، انکار اور تردید کی بارگاہ میں سر جھکاتا ہے۔ وہ ہمیشہ پڑھا جاتا ہے۔ بار بار پڑھنے سے اس کی رونق اور جمال میں اضافہ ہوتا ہے۔

مذہب سے ادب کا تعلق صرف اتنا ہے کہ مذہب، کلچر اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ ادب کا مقصد بھی

تہذیب نفس . . . . ہوتا ہے۔ دینی ثقافت ادب کو ایماں کا تصور دیتی ہے۔ ادب اپنے اندر اقدارِ اعلیٰ کی ایک معروضی ذہنی شکل پیدا کرنے کے بعد لوگوں میں اخلاقِ فاضلہ اور سیرتِ محمودہ کا مظاہر کرتا ہے ادب یعنی اجتماعی ہیئت میں تغیر اور ثقافتی گوشوں میں تنوع پیدا کرتا ہے۔ اچھا اسلوب علم یا صناعی میں اخلاقی اقدار کا علم ہوتا ہے۔ نثر و نظم، لغت و نحو، بلاغت اور نقد ادبی علوم میں یہ ادبی ثقافت کے ستون ہیں۔ یہ علوم اپنا مستقل درجہ رکھتے ہیں، اور ادب فنی سے ہٹ کر ان کی اپنی الگ ایک حیثیت ہے۔ ان علوم کی اہمیت یہ ہے کہ یہ علوم ادیب کی شخصیت اور اس کے ذہن کو جلا کرتے ہیں ادیب ادب کی تخلیق میں اس سے مدد لیتا ہے۔ یہ علوم ادیب کے فہم و ادراک کو ادبی بلوغ عطا کرتے ہیں، اور ثقافتِ ادبی کی تعمیر کرتے ہیں۔

"صبا" کا اگلا شمارہ

دس سالہ نمبر

"صبا" جون ۱۹۶۵ء میں

اپنی زندگی کے دس سال پورے کرلے گا

اس موقع پر ہم نے

صبا کا دس سالہ نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے

اس نمبر کا جو ایک یادگار نمبر ہوگا انتظار کیجئے

صب

عبدالعزیز خالد

فنکار

سمجھتا ہوں اشاروں کی زباں کو
مجھے معلوم ہے کیف و کم کُن
تبسّم رخ پہ لیکن حزن دل میں
ہے درکار سخن ضبط و توازن
مجھے بخشا ہے قسّام ازل نے
نوا سنجی کا سودا، شعر کی دُھن
حقیقت کے لچکتے تار دے کر
کیا ہے ان سے خوابوں کی قبا بُن
کبھی ٹانکے آسماں پر چاند تارے
کبھی مٹّی سے دُرِّ شاہگاں چُن
زمیں گویا عروسِ آسماں ہے
ذرا آپس میں ان کی گفتگو سُن
نہیں حد علم و عرفان و مت کی
و فوقَ کُلِّ ذی عِلمٍ علیم

سلام مچھلی شہری

فاتحہ

نہ فضائے گورِ غریباں اسلام کر مجھ کو
کہ تیری صدی میں اسی بانکپن سے آیا ہوں
شراب پی کے کسی گل بدن سے آیا ہوں
"مزارِ والدِ مستحق" پہ فاتحہ کے لیے
گیا جو ہوں تو خدا سے یہ پوچھنے کے لیے
خدا جو تیرے عبادت گزار بندے ہیں
تری ہر ایک ادا پر نثار بندے ہیں
ہمیشہ ان کی مصیبت میں کیوں گزرتی ہے
ان ہی پہ موت سی کیوں پہلے وار کرتی ہے،

سحر انصاری

استفسار

بدی کو پانی کی طرح پی کر
گنہ کو کھانے کی طرح کھا کر
یہ کون لوگ اپنی مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں معبدوں میں
یہ کون ہیں جن کے جسم بنکوں کا بوجھ اٹھائے
کتابِ نفع و زیاں کی آیات بن چکے ہیں
یہ کون ہیں جن کی بے حیا گرسنہ نگاہیں
شریف جسموں کو بے قراری سے کھا رہی ہیں
یہ کون ہیں جن کے لب انھیں کے خلاف تقریر کر رہے ہیں
یہ کون ہیں جن کے ہاتھ انھیں کا عذاب تحریر کر رہے ہیں
یہ کون ہیں جو خود اپنی نظروں میں گر چکے ہیں
اور ان کے ملبوس ان کے جسموں پہ معترض ہیں
یہ کون ہیں جن کے قصر و ایواں پہ کرگسوں کے
مہیب غول آ کے بیٹھتے ہیں
یہ کون ہیں جن کی روشنی تیرگی کی ہمسر بنی ہوئی ہے
جو جہل کی اجرتوں پہ قانع
گداز اعضا پہ فخر کرتے ہیں محفلوں میں
یہ ریشمیں بستروں پہ سو کر
مہیب خوابوں سے ڈرنے والے
یہ اپنے در پہ کھڑے ہوئے
اپنے دستِ ممسک سے خود ہی کیوں بھیک مانگتے ہیں
یہ کون ہے جن کی زندگی کرم خوردہ پوشاک بن چکی ہے
یہ کون ہیں جن کی آبرو خاک بن چکی ہے
یہ خشک پتوں کی ناشنیدہ روایتیں
اور ریگِ صحرا کی بے سر و پا کہاوتیں
سامعوں کی تلاش میں کیوں بھٹک رہی ہیں
یہ کون ہیں جن کو اب یہ احساس ہو چلا ہے
کہ ان کی نسلوں کو اور ان کو
گزرتے وقت اور بہتے پانی کا غم رہے گا
اور ان کے دل پر
متاعِ جاں کا ضیاع پیہم رقم رہے گا

احمد ہمیش

تسکین

ہماری آنکھوں میں روشنی کے نقوش باقی ہیں
جو ملتے جلتے ہیں موسموں کی حسیں صداؤں پر آج بھی ہم
ہمیں سجاتے ہیں طاقِ امروز اور فردا کا رخ بدلتے ہیں
ہوا ابھی تک ہمارے ویران باغوں میں سرسراتی ہے
کیا ہوا جو ہماری دنیا میں دن کی نفرت یا شب کا دھوکا
ہمارے لفظوں کا حادثہ ہے
نہ کوئی تاریخ ساعتوں کی
نہ کوئی ورثہ نہ کوئی تہذیب . . .
سب غلط ہے!
مفاہمت کے تمام بندھن بکھر چکے ہیں
ہماری آنکھیں ہی دیکھتی ہیں
ہماری آنکھوں میں روشنی کے نقوش باقی ہیں

یوسف حسین خاں

ٹریکٹر

زمین چیخی
زماں نے اس کا کفن "پرت در پرت" ہٹایا
صدی صدی کے بدن سے اترے
ورق ورق رنگ پیرہن کے
حیات کا کرب کسمسایا
سحر کا تھکا وقت چونک اٹھا
لرز لرز کر شکن شکن پر
غمِ بہاراں ملک کے رویا
خدائے تخلیق کی تھکن پر
زمیں کی نس نس سے
درد اٹھ کر شفق کی آنکھوں میں جا سمایا
فلک کے ماتھے پر بل نہ آیا
مگر ازل کے کرخت بازو
ابد کے پہیوں نے کاٹ ڈالے
کیا کسانوں نے خوشہ خوشہ
کربِ لمحات کے حوالے ۔

ذکا صدیقی

حقیقتوں کے خدا!

اے خدا!
ایک خواب آج یوں دکھائی دے
میرا ذہن بے قرار
میرا قلب سوگوار
جسم و روح کی ہر ایک قید سے
چھوٹ جائے
زندگی کی ساحرہ کا ہر طلسم
ٹوٹ جائے

مجھ کو یہ دکھائی دے
آج جب میں زندگی کی تیز دھوپ میں گھرا
اپنی یہ پرانی سائیکل گھسیٹتا ہوا
گھر کو جاؤں
گھر کے کام میں پھنسی
مری رفیق زندگی
مجھ سے یہ نہ پوچھے: "گیہوں کیوں نہ لائے
کل تو خیر بھول ہی گئے تھے ہم
آج بھی یہ خالی ہاتھ کیسے آئے"
میں یہ چاہتا ہوں مجھ کو دیکھ کر وہ مسکرائے
اور اس کی مسکراہٹوں کی نرم چاندنی
دھوپ میں جلے ہوئے مرے بدن کے ارد گرد
ہالہ بن کے پھیل جائے

اور یہ دکھائی دے
کوئی ایسا خط نہ آئے
جو کہ سائیکل کی قسط کا مطالبہ سنائے
کوئی ایسا بل نہ ہو
جس کی ایک ہفتے میں ادائیگی
شرط ہو
کوئی ایسا سرکلر
جس میں ہوڈیارٹمنٹ سے کوئی میری جیب
نوٹس آج مالک مکان کا
پھر نہ آئے
خواب ایسی وادیوں میں لے کے جائے
جن میں صرف میں ہوں اور مری رفیق زندگی
گیہوں، سرکلر، بل اور قسط کے خیال سے
چھوٹ کر
زندگی کے ساحرہ کے جال سے
چھوٹ کر
ایک رات چین سے تو سو سکیں
زندگی کے زہر کو
خواب کی شراب میں ڈبو سکیں
تاکہ دوسرے ہی دن
جب کہ گیہوں، سرکلر، بل اور قسط کا وہی
پھر سے سلسلہ چلے
ہم کو اک نیا دوا دوش کا حوصلہ ملے

اے خدا!
کیا ترے خزانے میں
میرے نام کا کوئی
ایسا خواب بھی نہیں!؟

نور محمد نور

تقابل

ہم نے چھیڑی سلاخوں کے پیچھے غزل
ہم سرِ بزم بھی مُنہ چھپاتے رہے
تم نے نغمہ تو کیا لے بھی پیدا نہ کی
ہم حیات آفریں گیت گاتے رہے
تم نے باہوں سے انگڑائیاں چھین لیں
تم نے شاخوں سے رعنائیاں چھین لیں
تم نے کلیوں کو گلشن میں جھلسا دیا
سنگ و آہن کو ہم گدگداتے رہے
فن تمہارا بھی ہے فن ہمارا بھی ہے
اپنے شہکار ہم تم بناتے رہے
ناقدِ وقت ہے منتظر دیکھنا
تیز اس کی بہت ہے نظر دیکھنا

سعادت نظیر

رنجِ نارسائی

دیکھتے ہو کہاں ہوں کیا ہوں؟ میں ایک شاعر ہوں
تو کھینچتا ہی نہیں تصویر، وہ مصوّر ہوں
قدم قدم پہ اجاڑے ہوا رزو کے چمن
وہ دستِ گُل ہے، پھولوں کا وہ حسیں دامن
یہ انقلاب جو گزرا مری نگاہوں سے
نرالے ہو گئے تبدیل سوز آہوں سے
جو خوش نصیب کبھی تھا، وہ نامراد ہوں اب
کسی کی بھولی ہوئی، جیسے کوئی یاد ہوں اب
شکستہ پا نہیں لیکن شکستہ خاطر ہوں
رہِ حیات میں اک تشنہ لب مسافر ہوں
سوالِ تشنگی شرمندۂ جواب نہیں
نظر کے سامنے ریگِ رواں ہے آب نہیں
کڑی ہے دھوپ یہاں، نام کو نہیں سایا
الٰہی خیر ہو، میں کیسے دشت میں آیا!
یہ دشت کیا ہے درندوں کا ایک جنگل ہے
مری نظر میں یہ انسانیت کا مقتل ہے
یہ دشت جس کو "جہانِ خراب" کہتے ہیں
اسی کو اہلِ بصیرت "سراب" کہتے ہیں
بجھے کچھ ایسے یہاں میری حسرتوں کے کنول
کہ آہ بن گئی سوزِ جگر سے میری غزل
غمِ جہاں، غمِ الفت، غمِ حیات کے داغ
کوئی دکھائے مجھے دل کی کائنات کے داغ؟
وہ کیا جیے جسے احساسِ بے کسی ہو جائے
جو زندگی ہی میں محرومِ زندگی ہو جائے

صدّیق عثمانی

دھواں

لذتِ ذکرِ نگاراں، لذتِ دورِ شراب
اب یہی لے دے کے باقی رہ گئی ہیں لذتیں
دسترس مجبور ہے بس اک نظر ہے راہزن
لوٹ لینے دیجئے جسمِ جواں کی دولتیں
میں تو یوں خوش تھا کہ مجھ تک آئے گا دورِ آ
رات بھر اڑتی رہیں واں بوتلوں پر بوتلیں

دشمنوں نے کس قدر پُر داغ دامن کر دیا
ورنہ اس دامن پہ تھے اپنے بھی سجدوں کے نشاں
ہائے کتنے بانکپن سے کج تھی وہ زریں کلاہ
آج تک وہ بانکپن ہے نقشِ قلبِ دوستاں
آپ کے اٹھتے ہی محفل پر قیامت آگئی
ساری شمعیں بجھ گئیں، جلنے لگے زخمِ نہاں

میری بے مایہ جبیں کا دیکھئے اب خوں بہا
دامنِ پُر داغ کو پاک و معطر کیجئے
ان لبوں سے کتنے رنگیں پھول جھڑتے تھے کبھی
ان لبوں سے دعوتِ جشنِ گلِ تر کیجئے
دیجئے میری وفا کو اک صلیبِ روشنی
سہل کچھ تو امتحانِ زورِ خنجر کیجئے

کس قدر گہرا دھواں ہے ہر طرف چھایا ہوا
اس دھوئیں کو نورِ عارض سے منور کیجئے

شورؔ مینائی

پرائی دلہن

اب تجھے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
ہم نشیں! آج تو آئی ہے بہ اندازِ دگر
ترے چہرے پہ وہ تسکین نظر آتی ہے
جو مسافر کو ملا کرتی ہے منزل پا کر
لیکن اب پہلی ملاقاتوں کی وہ بات کہاں؟
اب نہیں آنکھوں میں وہ دل کی تڑپ، دل کی کسک
شعلۂ شوق وہ جلتے ہوئے رخسار و لب پر
دست و بازو میں کوئی حسرتِ ناکام نہیں
تیرا انجام ہے یہ، میرا یہ انجام نہیں
میرے دل میں وہی طوفاں ہے ابھی متلاطم
تو جسے دیکھ کے ساحل کو بھلا دیتی تھی
میری قسمت میں ہی شوق کے ارماں ہی سہی
تو دلہن اور کسی کی ہے مری جاں ہی سہی
اب تجھے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

شکیب ایاز

خواب سے حقیقت تک

خواب ہی جیسے اک آئینہ ہے
ٹوٹتا ہے تو بکھر جاتا ہے
وقت کی سطح پہ لاکھوں کرچیں
دستِ فنکار جنہیں چنتا ہے
آئینہ خانہ سجانے کے لیے
خواب گاہوں کو بسانے کے لیے
اُن کے چننے میں کئی تیز نکیلی کرچیں
دستِ فنکار میں چبھ جاتی ہیں
اور دل و ذہن بھی ہو جاتے ہیں
خوں چکاں زخموں کا اک احمریں شہر
تم کو معلوم نہیں ہے شاید!
دیکھنے میں یہ حسیں ہے تعمیرِ منزل
لمحۂ درد و الم ہوتا ہے

غیاث متین

آگ اور پھول

گوشے گوشے میں لپکتی ہوئی شعلوں کی زباں
اس سمن زار کی ہر شے کو جلا ڈالے ہے
شام کے خون میں ڈوبا ہوا سمتوں کا جہاں
صبحِ روشن کے اجالوں کا لبادہ مانگے
دستِ گلچیں سے سلگتے ہوئے گل برگ و ثمر
ایک لمحے کے لیے موجِ بہاراں مانگیں

وقت کے پاؤں کی پائل پہ چھناچھن باجے
آج وہ وقت کہاں صحنِ بہاراں کے قریں
آج وہ وقت کہاں ہمتِ یاراں کے قریں
وقت وہ وقت کہ جو پاؤں کی زنجیر نہ تھا
وقت وہ وقت کہ جو خنجر و شمشیر نہ تھا
آج یہ وقت کہ نوخیز کلی پژمردہ
غنچے غنچے کی زباں خار تو پھولوں کے دہن
ایسے مرجھائے ہوئے ہیں کہ خزاں شرمندہ
ایک مدت سے خزاں برسرِ آرائے چمن

یہ نہ پوچھو کہ گل و خار نے کیا کیا دیکھا
اتنے برسوں میں سمن زار نے کیا کیا دیکھا
خون روتی ہوئی شبنم کا کلیجہ دیکھا
پھیلتی آگ کے شعلوں کا تماشہ دیکھا

کب تلک محوِ تماشائے لبِ بام رہیں
آگ ہی آگ ہے پھیلی ہوئی ہر گوشے میں
اور جو باعثِ تزئینِ گلستاں تھے وہی
آج ہر شاخِ برہنہ پہ کریں دست دراز
جن کو غمخوارِ سمن زار تھا ہم نے جانا
وہ بھی گلچینِ حیا سوز و ستمگر نکلے

گہرے گہرے ہیں بہت وقت کے سائے اب کے
یہ جو طوفان اٹھے ہیں یہ نہیں شب بھر کے
اب مداوائے سمن زار اگر ہے تو یہی
اس سمن زار کے جلتے ہوئے گل برگ و ثمر
باغبانوں کو جلا دیں تو بہار آجائے

واحد پریمی

انسان

ایک خاک کا تودہ
آندھیوں میں اڑتا ہے
ہر طرف
بھٹکتا ہے
اور پھر
خلاؤں میں
جاکے ڈوب جاتا ہے

؟۔۔۔

ایک بے بس کی بے بسی کی طرح
ایک بیوہ کی زندگی کی طرح
شام غربت کی تیرگی کی طرح
جس طرف دیکھئے
اندھیرا ہے
دوستو!
کیا یہی سویرا ہے؟

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

کاسۂ افلاک [illegible]
[illegible]
[illegible]
ان گنت صدیوں سے [illegible] موتی
چاند تاروں کے [illegible] کاسۂ افلاک میں

[illegible]
[illegible]
اور اس کے کاسۂ افلاک سے
چاند تاروں کے [illegible]

خورشید احمد جامی

دو گھڑی قافلۂ درد کو ٹھہرایا ہے
بات یہ ہے کہ مجھے تیرا خیال آیا ہے

اک نئے دور کی آواز سمجھ کر مجھ کو
زندگانی کی روایات نے اپنایا ہے

دل کی گلیوں سے گزرتے ہوئے دیکھا تجھ کو
یا کسی یاد کی دیوار تلے پایا ہے

کتنی راتوں کو ترے درد کی دولت بخشی
کتنی راہوں کو ترے نام سے چمکایا ہے

وقت بچھڑا ہے تو پیغامِ وفا چھوڑ گیا
چاند ڈوبا ہے تو سینے میں اتر آیا ہے

تجھ کو پاکر تجھے کھونے کی تمنا کی ہے
ہائے کس موڑ پہ حالات نے پہنچایا ہے

موسمِ گل بھی جب آیا ہے تو آتے آتے
رہگزاروں سے کڑی دھوپ اٹھا لایا ہے

جیسے اکتا کے مہ و مہر کے ہنگاموں سے
آج پھر کوئی اندھیروں میں چلا آیا ہے

اس نے مجھ سے بھی سوا پیار کیا ہے مجھ سے
عمر بھر جس نے مرے پیار کو ترسایا ہے

وقت کی تیز روی دیکھ کے یوں لگتا ہے
جیسے مقتل سے کوئی جان بچا لایا ہے

ذہن میں کوئی دریچہ تو کھلا ہے جامی
دشتِ ہجراں میں کوئی خواب تو لہرایا ہے

ریورنڈ ریحانی

خوشی سے حضرت واعظ مرے عیب و ہنر دیکھیں
مگر اپنے گریباں میں ذرا منہ ڈال کر دیکھیں

جسے ناحق پرستوں میں ہے سودا حق پرستی کا
عجب کیا ایک دن اس کو فراز دار پر دیکھیں

رہیں گی حائل سیر چمن یہ تیلیاں کب تک
قفس میں ہم صفیرو آؤ زور بال و پر دیکھیں

ہوائے منزل مقصود مجھ کو لے چلی تنہا
اسیر مصلحت جو ہیں وہ سوئے راہبر دیکھیں

نہ ہو جنت کی خواہش زاہدو ولے دل لو جاتی
ہماری آنکھ سے وہ کوچۂ جاناں اگر دیکھیں

صبا مرزا شاہ آبادی

ترک شے پروردہ کو زنجیروں سے جدا بھی تو کرو
جدا ہو کر ہو تماشا وفا بھی تو کرو!

حسرت وصل میں صباؔ نہ کرو ذکر وفا
وہ معشوق اس مدنہ سے شروعا بھی تو کرو

رقص وحشی ہی نہیں حسن تماشائے بہار
اس کے روندے ہوئے پھولوں کا گلہ بھی تو کرو

تم جدا کر کے لیے ہاتھ نہ دو ہی رنگ غزل
نیند یہ لیے ہوئے حالات ترے بھی تو کرو

تو رعارض کا ہر کس طرح سے مجھے اندازہ
ہم سے ساقی ذرا انتظار میں ہا بھی تو کرو

بے حسی ہا دل ہا ہے بے حسی نہ ہو جائے کہیں
وقت کیا ہے پیاسے آواز سنا بھی تو کرو

عم اذیت ہی نہیں طرب کا معیار بھی ہے
اس تصور سے ذرا آتش ترجما بھی تو کرو

حیات تماہرے عجم امروز نہیں جام طلب
تم وہی صد نہ کرو بات سنا بھی تو کرو!

شمس الدین تاباں

دار دل میں اک امید کا دیا سا ہے
ہوا کے [illegible] سے وہ بھی بجھا بجھا سا ہے

[illegible] رہ [illegible] ہر گوشہ گھٹا سا ہے
ترے [illegible] کا [illegible] آسا ہے

نگاہ و دل [illegible] معاذ اللہ
[illegible] سا ہے

[illegible] سو گی
[illegible] سا ہے

دل ان کے لطف کا امیدوار ہے کیوں ہے
قرار و قول [illegible] دم دلاسا ہے

جو بے نیاز ہیں شاہوں کی طرح [illegible]
طلب کے حد میں دست دعا کا کاسا ہے

[illegible]
[illegible] تاباں [illegible] سا ہے

[illegible] تابش

اس کی گھر میں خواب رکھے تھے کون یہاں [illegible]
گم سم روشندانو بولو کیا تم نے کچھ دیکھا

اندھے گھر میں ہر جانب ہے بدروحوں کی [illegible]
بجلی جلنے سے پہلے تک وہ سب تھیں میں تنہا

مجھ سے [illegible] کے اوپر کل شب [illegible]
میرا عاشق دل کہتا ہے ایک ترا [illegible] سا

سورج اونچا ہو کر میرے آنگن میں بھی آیا
پہلے نیچا تھا تو [illegible] بیٹھا

[illegible] انگارے
[illegible]

[illegible]
[illegible]

تاج کریم نگری

یہ نا کس میں حالات زمانہ
رہا نہ باہمت خوشی سب فسانہ

نہیں خوشیاں مقدر میں تو غم کیا
ہم اسم درد سے ہیں دوستانہ

جو جی چاہا کیا، وارفتگی میں
عجب کچھ تھا، جوانی کا زمانہ

ذکر تشریح و تفسیر محبت
بہت مشہور ہے دل کا فسانہ

اب اپنے میں سب دل کا ساتھ دیدے
خرد کو مشورہ ہے مخلصانہ

قدم کیوں ڈگمگائے جا رہے ہیں
قریب آنے لگا کیا آستانہ

سسکتی ہے قدامت رنگ چھین
پریشاں ہے، گل دل و مشہ [illegible]

تقاضے زندگی کے اور کچھ ہیں
غزل کہیے تو بدل کر عاشقانہ

[illegible]

س۔ا۔عشرت

غمِ عشق بڑھتے بڑھتے وہ مقام آگیا ہے
کہ لبوں پہ بے ارادہ ترا نام آگیا ہے

مرے غم کدے میں خود ہی وہ کھنچے کھنچے سے آئے
مرا جذبۂ محبت مرے کام آگیا ہے

ترے رخ پہ یوں گری ہے تری زلف اس طرح سے
کوئی ماہتاب جیسے تہِ دام آگیا ہے

بڑھی اس طرح سے وحشت کہ جنوں رہا نہ صحرا
وہ فضائے طوقوں کا سا مقام آگیا ہے

میں سنبھل رہا ہوں عشرت کوئی مجھ کو بڑھ کے تھامے
کوئی دستِ مہرباں لے کے جام آگیا ہے

احسن جعفری

اس شعلۂ یادِ یار کا شاداب ہے یارو
روشن بہت زنداں کی یہ محراب ہے یارو

پھیلی ہوئی اس تیرگیِ دور و ستم میں
رخسارِ وفا کچھ بھی ہو ضوتاب ہے یارو

لگتا ہے کہ ہر عکس میں تیرے خط و خال
بیتے ہوئے لمحوں کا کوئی خواب ہے یارو

اب درد کی راتوں میں ہر اک لمحۂ فرقت
ہر داغِ جگر صورتِ مہتاب ہے یارو

بچھڑے ہوئے ان سے تو زمانہ ہوا لیکن
یادوں کی روش آج بھی شاداب ہے یارو

اور چھیڑے مرے تعبیر کی صد رنگ ردائیں
احسن کی تمناؤں کا اک خواب ہے یارو

صعب

تنویر سامانی

درد کم ہو گا شب ہجر بسر بھی ہوگی
زندگی اور بڑھے گی تو سحر بھی ہوگی

یہ ستم ڈھا تو دیے ہیں مگر اے دل
ایک دن ان کی عنایت کی نظر بھی ہوگی

کیا خبر تھی کہ محبت کی حسیں راہوں میں
ہر تمنا مری ناکامِ اثر بھی ہوگی

تم جب آؤ گے کھل اٹھیں گے تمنا کے پھول
ہلکی ہلکی سی یہاں شام و سحر بھی ہوگی

سہمے سہمے لب اظہار محبت ہوں گے
بہکی بہکی ہوئی دزدیدہ نظر بھی ہوگی

یہ محبت کی خلش ایک نہ اک دن تنویر
وجہ تسکینِ غمِ قلب و جگر بھی ہوگی

اقبال منہاس

[illegible]
[illegible]

میں تو خود اپنی نگاہوں سے [illegible]
اس اندھیرے میں مجھے ڈھونڈ [illegible] ہے

ظلمت شب نے کئی بار [illegible] مجھے
چاند نکلا ہے تو اب شمع جلا کیا [illegible]

تیری آنکھوں میں فروزاں ہے جو تاروں کی طرح
چشم اغیار سے تو اس کو چھپایا کیا ہے

تو بس اک لہر کی صورت ہے سر بحر رواں
قرب ساحل [illegible]

عنوان چشتی

قطعے

دیکھنے والے یہ کہتے ہیں اس کو سلگتا رہنا ہے
کوئی نہ سمجھا کیوں پروانہ چاند کو تکتا رہنا ہے

[illegible] جہاں ہوگے
[illegible]

[illegible] ہوئی آنچل لہرائے [illegible] کی بات چلی
انجمن شمشاد قداں میں دیوانوں کی بات چلی

اپنے دل کا خون لٹا کر لفظوں کا بیوپار کیا
شعر کی قیمت دنیا کیا دے دنیا نے کب پیار کیا

جذبوں کے بیچ [illegible] حائل ہو تو پردا رہتا ہے
ساتھ ملیں گے ہر پل لیکن تنہا تنہا رہنا ہے

کیف احمد صدیقی

دوہے

سورج جیسا مکھڑا تیرا چندا جیسا رنگ
دن بھی تیرے ساتھ ہے گوری رات بھی تیرے سنگ

تاروں کی اگنی میں جلتی ہے چندا کی لاش
آج کی رات نظر آتا ہے مرگھٹ سا آکاش

پیا کا سورج ڈوب گیا دنیا کا بدل کر روپ
لیکن دل کے آنگن میں بکھری ہے اب بھی دھوپ

اشکوں سے بھی تر نہ ہوئی غم کی تپتی ریت
[illegible]

پریم کا ساگر گہرا گہرا جس کا اور نہ چھور
بیچ بھنور میں ناؤ پھنسی ہے اب جاؤں کس اور

ہر مصرعے میں دھڑک رہی ہے اک انجانی پریت
کیفؔ ترے یہ دوہے ہیں یا درد بھرا سنگیت

رضیہ سجاد ظہیر

دیوانہ مرگیا

(رضیہ سجاد ظہیر [illegible])

[illegible]

[illegible]

... ایک ... [illegible] ... کر رہا تھا جہاں وہ مزے سے بیٹھ کر ... [illegible]

... بڑے بیا ہے بچا ... [illegible]

... بیٹھ کر جا ... [illegible]

[illegible]

... بچا ... [illegible]

[illegible]

... سے بیاہ کے لئے آیا تھا ... [illegible]

... جگر کا ... [illegible]

... سادہ ... [illegible]

[illegible]

... آیا ... [illegible]

... اسی ... سامنے ... دوستوں کے ... [illegible]

دوست ... نے اب کہاں ... [illegible]

... اسی جگہ وہ کبھی پھر ... حالت میں آئے گا ... [illegible]

طبیعت کو ... اور اداس ... ان کو کبھی وہاں ... [illegible]

... کے ... نہیں۔

ارے، یہ تو اماں کی آواز آ رہی تھی ۔۔۔ وہ فہمی کو پکار رہی تھیں! پھر کمرے میں روشنی ہوئی، پھر چٹخنی کھلی اور
اس کا سفید، دوپٹے میں لپٹا ہوا سر ذرا سا باہر جھانکا ۔۔۔ وہ اوورکوٹ کا کالر اوپر اٹھائے تھا اس لیے
فہمی اس کو فوراً نہ پہچان سکی۔

"کون ہے؟" اس نے آہستہ سے پوچھا، عرفان اس کو جواب دینے کے بجائے اس کے پاس سے بڑی
تیزی کے ساتھ اندر گھس گیا، فہمی نے ایک دبی ہوئی چیخ ماری مگر فوراً ہی اس کی چال پہچان کر دبا میں دبی سی
مسکراتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی۔

وہ قدم بڑھاتا ہوا امی کے کمرے میں پہنچ گیا ۔۔۔ وہاں آتش دان میں لکڑیاں سلگ رہی تھیں جنھوں نے
ابھی آگ پکڑی تھی کیوں کہ کمرے میں دھوئیں کی کڑوی سوندھی بو ابھی باقی تھی اور لکڑیوں سے نکلتے ہوئے شعلوں کا
ابھی بچپن معلوم ہوتا تھا!

امی حسبِ دستور اپنے بڑے نواڑی پلنگ پر رضائی لپیٹے ہوئے بیٹھی تھیں! اودے رنگ کی کامدانی بھرے ...
کی رضائی جس پر زرد اور سرخ دھاریوں والی گوٹ لگی تھی۔ ایک طرف کو چاندنی بچھا تخت تھا جس پر ان کی سلائی
کا تھا ایک کشتی میں چائے سے بھری ایک ننھی سی کیتلی اور ایک پیالی رکھی تھی ۔۔۔ اس کشتی کے پاس ہی پاندان تھا

انھوں نے اس کو دیکھتے ہی رضائی ہٹا کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے وہ دوڑ کر ان سے لپٹ گیا، ان کے
نرم گرم سینے کے اندر ان کا مامتا بھرا دل اس کے کانوں میں دھڑکتا سنائی دے رہا تھا، گردن کے پاس سے
تمباکو کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی اور سفید ہوتے ہوئے سر میں سے روغن چنبیلی ... کی آتی ہوئی مہک،
عرفان کو کھینچ کر اس کے بچپن کی رسیدوں تک لے جانے کی کوشش کر رہی تھی ۔۔۔ وہ ان سے لپٹا ہوا ...
جا رہا تھا "امی، امی آپ مجھے بہت یاد آئیں ۔۔۔ آپ کے پاس کتنا سکون ہے، کتنا چین ہے امی
۔ آپ بہت یاد آئیں، بہت یاد آئیں ۔۔"

دروازہ کھلا فہمی ... اس کی ان آنکھوں کو دیکھ کر اس سے مخاطب ہوئیں "فہمی ۔۔ ایک پیالی
اور لا ۔۔ اور دیکھ، کھانے کو کچھ لا، نعمت خانے میں المونیم کے ڈبے میں پنجیری ہے اور چائے والے ڈبے
میں بسکٹ ہیں" پھر اپنی رضائی کا ایک پلو اٹھایا "آ بیٹھ، ادھر آ جا۔"

وہ جوتے اتار کر ماں کی رضائی میں گھس گیا اور بولا "امی ۔ آپ سے مجھے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔
آپ کو بہت کچھ بتانا ہے ۔ اب میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا، امی اب میرا ارادہ یہ ہے کہ . . ."

امی کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ آئی جیسے وہ ... ان کو جانتی تھیں، ان ارادوں
کے انجام سے بھی واقف تھیں آہستہ سے بولیں "اچھا تو کچھ ... پہلے تو کچھ کھا تو نے ...
لگی ہے نا؟"

عرفان حیران رہ گیا، نہ جانے ان امی لوگوں کو ۔ ایک بات کیسے [illegible]
ہوگی ہے، کب پیاسی ہے۔ آخر ان کو کیسے معلوم ہوا کہ اس کے دل سے کچھ نہیں کھا [illegible]
اٹھا کے منہ میں رکھنے لگا ۔۔۔ بہت سے بسکٹ اور زردہ میں پٹھیاں [illegible]
اور پھر اس پر ایک عجیب سی غنودگی طاری ہونے لگی جیسے اس کا سارا جسم ڈھیلا [illegible]
وجود ڈھیل رہا ہے، بہہ رہا ہے ۔۔۔ آگ اور رضائی کی گرمی سے اسے ایسی نیند آ رہی تھی [illegible]
اس نے ماں کے کندھے پر سر ٹیک دیا اور سو گیا ۔۔۔ پھر سونے [illegible]
اور سینے کے پاس جو درد سے ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑے ہے ۔۔۔ [illegible]
سی لمبی، پتلی پتلی انگلیوں والا جس میں ایک تین نگوں والی انگوٹھی ہو [illegible]
تھا اور کہتا تھا "یہ ڈھیلی ہے، کسی دن اتر کر کہیں گر جائے گی۔"

یہ تو ایک اور ہی ہاتھ تھا ۔۔۔ چھوٹا سا، سکڑا ہوا [illegible]
اس میں بھی تھا مگر ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی آنکھ ایک دم کھل گئی۔

پھر کچھ کر اس نے چاروں طرف غور سے دیکھا ۔۔۔ یہ دلی نہیں تھی، یہ لکھنؤ تھا ۔۔۔

وہ ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔ "امی میں کتنی دیر سویا؟" [illegible]
کہ آنکھ لگی ہو ۔۔۔ لے کپڑے بدل لے تیرا پلنگ یہیں لگوا دیا ہے مگر ابھی [illegible] کھانا آ رہا ہے۔"

اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے نزدیک ایک صاف ستھرا پلنگ بچھا ہے۔ لال پیلے پھولوں والی چھینٹ کی [illegible]
کی ہوئی ہاتھی رکھی ہے تکیے کے غلاف پر رنگ برنگے پھول کڑھے ہیں اور ان کے بیچ میں لکھا ہے "گڈ نائٹ" [illegible]
اسے ہنسی آگئی! گڈ نائٹ! کیا دنیا میں ایسے بھی کوئی خوش قسمت ہیں جن کی راتیں اچھی کٹتی ہوں [illegible]
ضرور ہوگا۔

تکیے کے پاس ایک کرتا پاجامہ رکھا تھا۔

وہ امی کے پاس سے اٹھا، جوتے پاؤں میں اٹکائے ۔۔۔ ان کو [illegible]
نکل کر کھڑکی سے باہر گئی! ۔۔۔ سامنے ایک بڑی سی عمارت تھی اور اس کی آڑ سے [illegible]
پوری آب و تاب سے چاندی کرنوں کا خزانہ لٹا رہا تھا، وہ کھڑکی کا کھڑا ہو گیا۔

یہ چاند تھا کہ سنہرے رنگ کی دھکی سے ہوا ہوا بلور کا شفاف پیالہ! [illegible]
ہر روٹھانے کی تاثیر تھی ۔۔۔ ایک دم سے اسے پیاس لگنے لگی، جسم کا انگ انگ [illegible]
میں بھی آگئی ۔۔۔ بڑی بے بسی کے ساتھ اس نے [illegible] کو دیکھا ۔۔۔ وہ [illegible]
اور وہ مسکراہٹ یاد آئی جو ان کے چہرے پر آئی تھی جب [illegible] ارادوں کا ذکر کیا تھا [illegible]

ان کی وہ اداس طنزیہ مسکراہٹ! اسے لگا — اس نے کون سا ارادہ پورا کیا تھا۔ دنیا میں کیا کیا تھا — گویا اس نے اپنے آپ سے کہنا شروع کیا۔ "نہیں نہیں، میں شراب چھوڑ دوں گا — مجھے شراب چھوڑنی ہی ہوگی چھوڑنی ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مگر شراب نہیں تو — اور کیا ہو — کیا ہو اور اگر — روتے ہوئے بچے کی طرح اس نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کو بڑھا دیئے پھر ماں سے لپٹ گیا اور کراہنے لگا: "امی — امی کیا آپ کو معلوم ہے کہ . . . ."

اس کی امی دھیرے دھیرے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آہستہ سے بولیں: "ہاں بیٹا مجھے معلوم ہے، مجھے سب کچھ معلوم ہے۔" جھنجھلا کے اس نے . . . . اپنے دونوں ہاتھ جھٹکے: "نہیں آپ کو کچھ نہیں معلوم — آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں شراب پیتا ہوں — پر کیوں پیتا ہوں — کتنی پیتا ہوں، کہاں پیتا ہوں، یہ سب آپ کیا جانیں — شروع میں تو میں نے سوچا تھا کہ شریفوں کی طرح پیوں گا۔ اس سے سارے جسم کا درد اور دل کی پریشانی گھٹ جاتی تھی پر اب تو نشے میں دھت ہو جاتا ہوں تب بھی دل کا درد کم نہیں ہوتا۔ ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے ہیں، دل اسی طرح تڑپتا رہتا ہے، میرے دوست مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں، بچے مجھ سے ڈرنے لگے ہیں، ہوٹلوں اور بازاروں کے دشراب مجھ پہ ترس کھانے لگے ہیں، میں شرابی کہلاتا ہوں — امی، آپ میری مدد کیجئے، مجھے کہیں لے چلئے، کسی ڈاکٹر کو دکھایئے، میں نے سنا ہے شراب کی لت چھڑائی جا سکتی ہے، ہم لوگ کہیں بھاگ چلیں امی، دورائی کی جھیل پر چلیں۔ آپ کو یاد ہے ہم لڑکپن میں ایک بار وہاں گئے تھے — . . ."

اس کی امی اسے غور سے دیکھ رہی تھیں جیسے سب کچھ سمجھ رہی ہوں۔ دھیمے سے بولیں: "اچھا بیٹے ہوں — دورائی کا خیال اچھا ہے۔ شراب ایسے نہیں مل سکتی ہے؟ تیاری تو فوراً ہو سکتی ہے۔ دیکھو میں ابھی تجھے بناتی ہوں — ذرا گوشت دیکھ آؤں — ابھی آئی —" اور وہ اٹھ کر شال لپیٹتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

تنہائی میں وہ اپنا شعور تیز کرنے کی کوشش کرنے لگا! دورائی — ہاں کیا خوبصورت جنگل ہیں، کیا عظیم الشان چٹانیں، کیسی حسین جھیلیں اور بڑی جھیل — اُفوہ — وہ اس کے اندر سے جھانکتی ہوئی تاروں کے جال اُلسی، وشمیاں، دیودار کے درخت چاروں طرف لوگوں کے رنگ برنگے کپڑے۔ پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی لمبی لمبی، پتلی پتلی کشتیاں!

یکایک اس کے وجود میں کوئی دبی دبی ہنسی ہنسنے لگا۔ ایک بے آواز، بے جان، بے کیف سی ہنسی، —

"کیا تو سمجھتا ہے شراب اس طرح چھوٹ جائے گی؟ یادیں اس طرح بھول جائیں گی — امی مجھے دورائی لے چلو! کیا خوب! کیا مزے کی بات ہے امی کے ساتھ جھیل کی سیر!

اور جب تیرا سارا وجود شراب کی طلب سے تڑپے گا، زبان اینٹھے گی، دماغ چکرائے گا، پیاس

ہو گئی —— پیاس! تب تو لیا کرے گا —— [illegible]

—— جسم کی پکار، جب رگ رگ ٹوٹ [illegible]

[illegible] سہنے والیاں ذلیل بھی ہیں، کچھ [illegible]

اور ذرا یہ بتا کہ سارے وقت [illegible]

[illegible] دفعہ یا کر ذہن کو بوجھ لگتی ہیں [illegible]

[illegible] برداشت ہو سکتی ہے؟ —— جلدی کر جلدی —— [illegible]

[illegible] سمجھ لے زوالات ہو گئی!

نکل بھاگ، ابھی وقت ہے!

[illegible] امی کے ساتھ [illegible] اگر تو کوئی غلط حرکت کر بیٹھی تو [illegible] ——

[illegible] تو ان کو پریشان کر چکا، کافی تنگ کر چکا۔ کیا ابھی کوئی کسر [illegible]

[illegible] ہے، اٹھو ورنہ بہت دیر ہو جائے گی —— اٹھو، دوڑو!

اس نے پیشانی پر ہاتھ پھیرا، اپنی ٹوپی اٹھائی۔ کر [illegible] کی طرف دیکھا —— امی کی پیٹھ نظر آ رہی تھی، وہ بڑے اطمینان سے [illegible] —— پھر اس نے [illegible] صحن کو دیکھا، چاندنی اب پھیل کر دیواروں پہ آ گئی تھی —— [illegible] پاؤں تیز تیز چلتا ہوا وہ دروازہ تک [illegible] چل آیا ——

برآمدے کی سیڑھیاں [illegible] پودے کے پاس جھکا —— چاندنی میں ایک [illegible] گلاب اور بھی شگفتہ [illegible] آ رہا تھا —— اس نے اسے توڑا۔ کوٹ کے کالر پر لگایا، ادھر ادھر دیکھا اور پھاٹک کی کنڈی کھولی —— ٹھنڈی ہوا کا [illegible] جھونکا آیا —— سردی خوب تھی، آسمان پر کچھ بادل بھی گھر آئے تھے۔ [illegible] لگنے لگی۔ لبوں پر [illegible] ہوئے اس نے آسمان کی طرف [illegible] اٹھتا ہوا پیلا چاند اب کافی اوپر اٹھ چکا تھا اور برابر اٹھتا جا رہا تھا ——

اس نے پھاٹک کی کنڈی کھولی اور [illegible] آہستہ سے بند کیا —— [illegible] سنگ مرمر کی تختی جڑی تھی، جہاں اس کے گھر کا نام لکھا تھا [illegible] "وہ کھمبے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ سنگ مرمر کی تختی ہاتھ کے نیچے ٹھنڈی محسوس ہوئی، چاندنی میں اس پر لکھے ہوئے الفاظ سفید سنگ مرمر [illegible] زیادہ سیاہ نظر آ رہے تھے —— [illegible]

انگلی بھیج رہا تھا — ایک دم سے اس کا سر کھمبے پر ٹک گیا۔ دہنے ہاتھ کی پہلی انگلی نے آ... ڈھلکی ہوئی بوند کو اپنی نوک پر لے لیا اور آگے بڑھ کر سفید سنگ مرمر کے بیچ میں سیاہ حرفوں پر آہستہ آہستہ کھیلنے لگی

"نور منزل"

اندر کمرے میں کسی نے روشنی جلائی ——— عرفان نے فوراً کوٹ کے کالر اٹھا لیے اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا ———

عارف نقوی
(برلن)

فرار

"شام کتنی خوبصورت ہے۔"

"ہاں سرگیس۔"

"اور تمہاری یہ گھنیری زلفیں"

"پسند ہیں؟"

"کتنے نرم ہیں یہ بال۔ جیسے ریشم"

"ہوں۔"

"یہ گال کتنے شگفتہ ہیں۔" سرگیس نے کاتھرین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

کاتھرین نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ سرگیس نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔

سورج گرجا کی اوٹ میں غائب ہو چکا تھا۔ گرجا کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر [illegible] جسے خاردار تاروں سے بند کر دیا گیا تھا۔

کاتھرین کا گھر گرجا سے دور نہ تھا۔ روزانہ دونوں گھر جانے سے پہلے اس طرف چل آتے اور گھنٹوں اس کے کھنڈر میں بیٹھے رہتے۔ حتیٰ کہ سورج گرجا کے پیچھے چھپ جاتا اور خنکی بڑھ جاتی۔ اور تب وہ دونوں وہاں سے اٹھتے اور یا تو کاتھرین کے گھر چلے جاتے یا کسی ریستوران کی طرف چل دیتے۔ گرجا کی عمارت دوسری جنگ عظیم میں تباہ ہوئی تھی اور اب وہ صرف ایک کھنڈر میں بدل کر رہ گیا تھا۔ سرگیس اور کاتھرین کے لیے یہ ایک ایسا مسکن تھا جس کے کھنڈر دو پریمیوں کو تنہائی کے لمحے فراہم کرتے تھے، جہاں ان دونوں نے بارہا الفت کی قسمیں کھائی تھیں اور کھمبوں پر اپنے نام کندہ کیے تھے۔

"کاتھرین"

"آہ سرگیس" کاتھرین نے نیم بیہوشی کی آواز میں جواب دیا۔

"ہم اب تک اتنی دور رہیں گے؟" سرش نے گرفت ڈھیلی کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہم اب دوسرے کے ہو چکے ہیں" اس نے سرش کی باہوں میں سمٹتے ہوئے جواب دیا۔

"نہیں کاتھرین، ہم ابھی بھی دور ہیں۔ میں چاہتا ہوں تم سے شادی کرلوں۔"

"سچ؟"

"ہاں! سچ۔"

دونوں کے ہونٹ ایک بار پھر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔

"تم یہاں آ جاؤ، ہم درخواست دے سکتے ہیں۔"

"یہی ناممکن ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں آ سکتی۔ تم میرے ساتھ رہو یہاں بہت جاسوس۔ مجھے [illegible]"

"لیکن یہاں آنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔"

"نہیں۔ مغربی برلن میں سب کاروبار ہے۔ میں نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن میں تمہیں بھی نہیں چھوڑ سکتا کاتھرین میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"تم یہاں پڑھ سکتے ہو، کوئی نوکری ڈھونڈ سکتے ہو۔ دیکھو کتنے غیر ملکی یہاں کام کرتے ہیں۔ تم کیوں نہیں کر سکتے؟"

"نہیں کاتھرین میں مغربی برلن کو چھوڑ کر مشرقی برلن میں نہیں آ سکتا۔ نوکری کرنا یا پڑھنا میرے بس کی نہیں۔ میں صرف تجارت کا کام کر سکتا ہوں اور تجارت [illegible] ایک بات کہوں تم اس طرف آ جاؤ۔"

کاتھرین ہنس پڑی۔

"میں اڑنا نہیں جانتی۔ گر پڑوں گی۔ یا کسی پتلی ٹہنی پر اٹک کر رہ جاؤں گی۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں کاتھرین۔ مغربی برلن کی فضا تمہارا [illegible] کرنے کے لیے بے چین ہے۔" سرش نے جذباتی ہو کر کہا۔

"اگر تم نے ہندوستان کی فضا دیکھی ہوتی تو یقین کر جاتی۔ اب ہندوستان دیکھنے کو میرا بھی جی چاہتا ہے۔ سنتے ہیں وہاں بہت سے پہاڑ ہیں۔ اونچے، سفید سفید برف سے ڈھکے ہوئے۔ ان کے قدموں میں مرغزار وادیاں ہیں اور سرسبز کھیت لہلہاتے ہیں اور روپہلی ندیاں کل کل کرتی ہوئی بہتی ہیں۔"

"میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کاتھرین" سرش نے زور دیتے ہوئے کہا۔

کاتھرین سنجیدہ ہو گئی۔

"سرش کیا تم نے گرجا کے پیچھے خاردار تاروں کی دیوار کو نہیں دیکھا؟"

"تو مشرقی برلن اور مغربی برلن ایک ہی ..." سینٹس نے ... لہجہ میں جواب دیا۔

"سال بھر پہلے اس کا وجود ... [illegible]

... آکر اپنے ... [illegible]

"کتنے خوبصورت تھے وہ لمحے!"

"ہاں ہم جہاں چاہتے تھے جاتے تھے، جو چاہتے تھے کرتے تھے جس طرح چاہتے تھے ... [illegible]

"بغیر کسی روک ٹوک کے!"

"ہاں بغیر کسی روک ٹوک کے۔"

"تم اپنے والدین سے بچھڑی نہ تھیں۔"

"ہاں ــــ کبھی۔"

"پھر ۱۳ اگست آگیا اور تمھاری سرکار نے یہ دیوار کھڑی کر دی۔"

"ہاں سرنیش۔" کاتھرین نے اداس لہجہ میں جواب دیا۔

"کیوں کہ تمھاری سرکار کمیونسٹ ہے، بے رحم ہے۔ اس کے دل میں انسانی جذبات نہیں۔"

"نہیں سرنیش۔" کاتھرین کا لہجہ اداس تھا۔ "اس کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔"

"تم تو ایسے بول رہی ہو جیسے کوئی کمیونسٹ ہو۔" سرنیش نے غصہ کیا۔

"آہ۔ تم جانتے ہو مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ دیوار کھڑی ہونے سے مجھے نقصان ہوا ہے۔ اب میں تمہارے ساتھ مغربی برلن نہیں جا سکتی۔ وہاں کی رقص گاہوں میں ... [illegible] ... اپنے والدین کو نہیں دیکھ سکتی، شاید کبھی نہیں۔"

اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ "میں اپنے والدین کو بہت زیادہ چاہتی ہوں سرنیش بہت زیادہ۔ لیکن جانتے ہو میں نے انھیں کیوں کھو دیا ہے۔ کیوں کہ ان کو اپنی اولاد سے زیادہ پیسہ پیارا تھا۔"

دیوار کھڑی ہونے سے پہلے کاتھرین کے والدین مشرقی برلن میں رہتے تھے اور یہیں ملازمت کرتے تھے لیکن پھر ان کے والد نے یہاں کی ملازمت چھوڑ دی اور مغربی برلن کے ایک ریستوران میں ... [illegible] ... کاتھرین کی ماں بھی اسی ریستوران میں کام کرنے لگی۔ کاتھرین ان دنوں ہمبولٹ یونیورسٹی جو ان کی تھی اور وظیفہ پا رہی تھی۔ زندگی بڑے آرام سے کٹ رہی تھی والدین مشرق میں رہتے اور مغرب میں کام کرتے۔ رہنے کے لیے مشرق کا سستا فلیٹ تھا اور پہننے کے لیے نئے نئے فیشن کے مغربی لباس۔ وہ اپنی مغربی کمائی کا نصف یا چوتھائی حصہ ایک اور پانچ کے بھاؤ پر بلیک میں تبدیل کرتے۔ ایک مغربی مارک کے بدلے پانچ مشرقی مارک کماتے اور عیش کرتے۔ لیکن ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب ۱۳ اگست ۱۹۶۱ء کی رات کو مشرقی جرمنی کی سرکار نے

مشرقی اور مغربی برلن کے بیچ سرحد پر دیوار کھڑی کردی۔ دیوار کھڑی ہونے کے وقت وہ رات کی ڈیوٹی پر تھے اس لیے اس طرف نہ آسکے۔ بعد کو انھیں دیوار سے اتنی نفرت ہوئی کہ انھوں نے اس میں سے گزر اپنی اکلوتی بیٹی کے پاس آنا بھی پسند نہ کیا۔

وہ دن اور آج کا دن کاترین اپنے والدین کو دیکھنے کے لیے ترس رہی تھی۔

اس وقت ہیرش کی باتوں سے اس کا دل بے چین ہوگیا اور آنسو بہہ نکلے۔

ہیرش نے بحث جاری رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ دونوں تھکے ہوئے قدموں سے کھنڈر سے باہر نکل آئے۔ باہر لان پر ایک مرد اور عورت کا سایہ نظر آیا جو ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ دیے آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔

چند روز بعد جب ہیرش کاترین سے ملنے آیا تو بہت اداس تھا۔ اس کی ماں سخت بیمار تھی۔ فالج کا دورہ پڑا تھا۔ والد پہلے ہی مر چکے تھے اور اب وہی اپنی ماں کا اکیلا سہارا تھا۔

"اگر میری ماں کو کچھ ہوگیا کاترین تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ تم نہیں جانتیں میری ماں نے فاقے جھیل کر مجھے پالا ہے اور اس قابل بنایا کہ یورپ آسکوں ۔۔۔ نہیں کاترین۔ شاید مجھے جلدی گھر جانا پڑے۔"

کاترین کا دل دھک سے ہوگیا اس کے ہونٹ کھلے مگر الفاظ نہ نکل سکے۔

"لیکن میں تمھارے بغیر بھی نہیں جی سکتا۔ تم میری زندگی ہو۔ میں چاہتا ہوں جانے سے قبل تم سے شادی کرلوں۔" ہیرش نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"میں تمھارا انتظار کروں گی۔ تم جب واپس آؤ گے تو مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔ تم یہاں آکر کوئی ملازمت کرلینا ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔"

"میں کاترین ہمیشہ ساتھ [illegible] چلو۔ مغربی برلن۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"

"[illegible] ٹھیک کہتے ہو ... اچھا لگتا ہے [illegible]"

ہیرش نے کوئی جواب [illegible] دونوں [illegible] خاموش گھومتے رہے۔ [illegible]

اس نے [illegible] اسے واپس جانے کی جلدی تھی [illegible]

جب ہیرش چلا گیا تو کاترین [illegible] اس نے [illegible]

[illegible]

[illegible]

کنٹرول پوائنٹ کے باہر انتظار کرے

اس روز اس نے خاص بناؤ سنگھار کیا [illegible] اناس کا کیک بنایا جو ٹیسٹ کو خاص طور سے مرغوب تھا۔

مغربی برلن سے آنے والی ٹرین آہستہ سے پلیٹ فارم [illegible] کوئی عورت کہہ رہی تھی۔

"اسٹیشن فریڈرش اسٹراسے [illegible] آ گیا ہے"

فریڈرش اسٹراسے کا [illegible] اسٹیشن [illegible] مغربی برلن سے آنے والی گاڑیوں کے لیے مخصوص [illegible] کو یہاں آنا ہے۔ ٹرین سے اتر کر [illegible] کنٹرول پوائنٹ [illegible] باہر اس کی محبوبہ کا مسکراتا انتظار [illegible] ہے ٹیسٹ اس پر اپنے ہونٹوں کی مہر ثبت کر دیتا ہے۔

لیکن آج وہ آس پاس کے لوگوں کو [illegible] قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے اور وہ گھبرا گھبرا کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔

کنٹرول پوائنٹ پر پہنچ [illegible] اگلا اور [illegible] سے بیگ کھول کر [illegible] لیکن [illegible] بتاتے ہوئے بیگ کیوں لے رہا ہے [illegible]

اور پھر "مسٹر ایسرے یا کلٹ [illegible]

"نہیں!"

"شکریہ آپ جا سکتے [illegible]

بہت کم خود فیصلہ نہیں ہوا کہ وہ کس طرح [illegible] ونٹ اس کے ہونٹوں میں پیوست کر [illegible] تمہارے ہاتھ [illegible]

سامنے کھڑا ہوا ایک نوجوان [illegible]

سٹرش کا مسکرانا [illegible] نوجوان [illegible] منٹ بعد جب ٹیسٹ نوجوان کے پاس سے [illegible] پیٹر تھا، جو مشرقی برلن میں رہتا [illegible]

کاتھرین کو مزید جاننے کی ضرورت نہ تھی۔

آج پھر وہ دونوں اسی گرجا کے کھنڈر میں بیٹھے تھے۔ آج بھی سورج آہستہ آہستہ اپنا رنگ [illegible] تھا اور آسمان پر سرخی ابھر رہی تھی۔

"بیماری کی حالت میں تمہاری ماں کو صدمہ تو نہ ہوگا؟" کاتھرین نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں وہ راضی ہے۔ میں پہلے ہی اسے تمہارے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ وہ تمہیں اپنی بیٹی کی طرح [illegible] کرے گی۔ تمہارا فوٹو اسے بہت پسند آیا ہے۔"

کاتھرین کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے اپنا سر سرتیش کے سینے سے ٹکا دیا۔

"میرا وہ فوٹو اتنا اچھا نہ تھا۔ تم اسے دوسرا بھیج دو۔"

"لیکن ماں کو وہی پسند ہے اور مجھے ہاں کاتھرین تم مجھے ہزار گنا زیادہ اچھی لگتی ہو۔ میں تمہیں کبھی [illegible] ہونے دوں گا۔"

"تمہاری ماں کو مجھ سے کبھی شکایت نہ ہوگی۔ تم مجھے اس کا پتہ دو، میں خود اپنی طرف سے [illegible] لکھوں گی۔ وہ مجھے ضرور اپنی بیٹی بنانا پسند کرے گی۔"

سرتیش نے کاغذ پر پتہ لکھ دیا اور کاتھرین نے اسے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

"میں [illegible] لکھوں گی۔ تم [illegible] کر دینا۔"

"کا[illegible]"

"ہاں سرتیش"

"بہت [illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"[illegible]"

"تو میری [illegible] لڑکی ہے"

"کیا [illegible]"

"تم میرے ساتھ نکل چلو"

"سرتیش"

صب

"ہاں [illegible] کاتھرین۔ سب انتظام ہو چکا ہے۔ آج ہی یہاں سے نکل سکتی ہو"

"لیکن کیسے؟ مجھے صاف صاف بتاؤ سریش، پہیلیاں نہ [illegible]"

"صرف یہ کہ تم یہاں سے نکل چلو۔"

"کس طرح؟"

"چھپ کے یہاں کسی کو خبر نہ ہوگی۔"

"مجرم کی طرح؟"

"ہاں کاتھرین"

"میں اس طرح جانا نہیں چاہتی۔"

"پھر ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے۔"

"محبت کا اتنا بڑا امتحان نہ لو سریش۔"

سریش نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خیالات میں ڈوب گیا تھا۔ سورج گرجا کے پیچھے [illegible] بڑھ گئی تھی۔

"سریش . . ."

کاتھرین نے تڑپ کر مخاطب کیا۔

"تم مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔"

سریش نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دیر تک اسی طرح خیالات میں ڈوبا رہا، پھر [illegible] بولا۔

"کاتھرین۔ میں نے ارمانوں کا ایک محل بنایا تھا۔ اس کو [illegible] سے سجایا تھا۔ سوچا تھا میرے [illegible] میں تم آجاؤ گی۔ میرا جیون ساتھی ہوگا۔ مجھے کبھی [illegible] [illegible]

[illegible] کاتھرین [illegible]

دونوں [illegible] باہر نکل آئے

کاتھرین [illegible] سریش رخصت ہونے لگا تو کاتھرین نے پوچھا

"اندر [illegible] آپ کے [illegible] تیار کیا ہے"

سریش کے ہونٹوں [illegible] مسکراہٹ پھیل گئی۔

"شاید یہ ہمارا آخری [illegible] ہے"

کاتھرین تڑپ گئی۔

"نہیں۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔"

اور جواب میں سسٹرس نے اسے اپنے سینے سے چمٹالیا۔
کاتھرین کے کمرے میں پہنچ کر سرلش نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک نقشہ نکالا اور اسے سمجھانے لگا
"لیکن پہلے کافی سسٹرس۔ بعد کو بات کریں گے۔ یہ کیک میں نے خاص تمہارے لیے بنایا ہے۔ کیسا ہے؟"
"بہت اچھا۔ اب تم روز مجھے ایسے کیک کھلا سکو گی۔"
سرلش نے نقشہ کو میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔ اس نقشے میں یہاں سے نکلنے کا سارا راستہ دیا ہوا ہے۔ تم اچھی طرح واقف ہو۔ یہ دیکھو اس مقام پر کھنڈر میں وہ تہہ خانہ ہے جس کا منہ ہم نے ہمیشہ بند دیکھا ہے لیکن آج منہ کھلا ہوگا۔ اس میں داخل ہونے پر تمہیں ایک ایسی سرنگ ملے گی جو مغربی برلن سے یہاں تک کھودی گئی ہے۔ تم بے جھجک اس میں اتر جانا سرنگ کے راستے مغربی برلن میں پہنچ جاؤ گی۔ آج ہی۔"
"آج؟" کاتھرین نے گھبرا کر پوچھا۔
"ہاں آج ہی۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ٹھیک دس بجے گرجا میں پہنچ جانا۔"
"لیکن سسٹرلش آج؟"
"بحث نہ کرو کاتھرین۔ اگر ہم نے دیر کر دی تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"
"لیکن..." اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔
"ڈرنے کی کوئی بات نہیں کاتھرین۔"
"تم میرے ساتھ ہو سرلش۔ میں موت کے منہ میں بھی جا سکتی ہوں۔" کاتھرین نے گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے کہا۔
"نہیں میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ میں کنٹرول پوائنٹ سے آیا ہوں۔ مجھے وہیں سے ہو کر جانا ہوگا ورنہ پولیس کو شک ہو جائے گا۔
"لیکن سسٹرس، اکیلے....؟
"اکیلے نہیں جاؤ گی۔ پیٹر تمہارے ساتھ ہوگا۔"
"پیٹر؟"
"ہاں وہی نوجوان جو تمہیں کنٹرول پوائنٹ کے باہر ملا تھا۔ وہ کھنڈر میں تمہارا انتظار کرے گا۔"
"اور بھی لوگ ہوں گے۔ ان میں عورتیں بھی ہوں گی۔"
"تو گویا یہ سرنگ میرے لیے نہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے کھودی گئی ہے۔ مجھے صاف صاف بتاؤ سرلش کیا معاملہ ہے؟"
"ہاں کاتھرین۔ مغربی برلن کی ایک خفیہ تنظیم ہماری مدد کر رہی ہے۔" سرلش نے آہستہ سے کہا۔ "ان لوگوں نے زر ... مارک اس سرنگ پر خرچ کیے ہیں۔ تم اگر کامیاب ہو گئیں تو تم کو بھی بہت بڑا انعام ملے گا۔ یہ لو نقشہ۔ اپنے پاس رکھو۔ اس راستے سے نکلنے میں تم ان لوگوں کی رہنمائی کرو گی۔ یہ لو یہ جیبی ٹارچ بھی کام آئے گی۔ اگر تم ٹھیک پانچ منٹ ...

یہاں سے نکلیں تو ٹھیک دس بجے گرجا میں پہنچ جاؤں گی۔ ٹھیک دس بجے۔ نہ پہلے نہ بعد کو۔ اگر تم نے یہ موقع کھو دیا تو پھر ہم کبھی ایک نہ ہو سکیں گے۔"

"سرپش۔ ایک بات پوچھوں؟" کاتھرین نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔ "تم ان لوگوں کے چکر میں کیسے پڑے؟"
سرپش ہنس پڑا۔

"یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ لوگ ہماری مدد کر رہے ہیں۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم کو استعمال کر رہے ہیں۔ تمہارے سیدھے پن اور ہماری محبت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں؟ کتنے معاوضے کا وعدہ کیا ہے تم سے؟"

"فی الحال دس ہزار۔" سرپش نے سینہ پھلا کر کہا۔ "لیکن یہ سب تمہارے لیے ہی ہے کاتھرین۔"

"کاتھرین کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ سرپش کو پانے کی یہ آخری شرط تھی وہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتی تھی۔

"لیکن میں بنک سے اپنی رقم بھی تو نہیں نکال سکتی۔ اپنی ساری چیزیں بھی تو نہیں لے سکتی۔ اتنی جلدی۔۔۔"

"فکر نہ کرو کاتھرین۔ تمہارا سارا نقصان پورا کر دیا جائے گا۔ تم بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

سرپش نے ایک بار پھر کاتھرین کو بازوؤں میں لے کر پیار کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

دس بجنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ کاتھرین نے حسرت سے اپنے فلیٹ کے در و دیوار کو دیکھا۔ اسے ایسا لگا جیسے کمرہ کی چیزیں سسکیاں لے رہی ہیں۔ ان سسکیوں کی ملی جلی آواز میں اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے ان تمام چیزوں کو الوداع کہا اور گرجا کی طرف روانہ ہو گئی۔

کاتھرین کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے پیچھے سائے منڈلا رہے ہیں۔ کئی بار اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ دور تک تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ کبھی کبھی اس کو خود اپنے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی اور بس رہا سہے تھوڑی دور کے فاصلے پر سڑک پر کھنچے ہوئے تاروں کی دیوار بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔

گرجا کے کھنڈر میں داخل ہوتے ہوئے ایک بار پھر اس کے دل میں کپکپی پیدا ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے سرپش کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے "اگر ہم نے یہ موقع کھو دیا کاتھرین تو کبھی ایک نہ ہو پائیں گے۔" یہ خیال آتے ہی وہ تڑپ کر کھنڈر میں داخل ہو گئی۔ پیٹر پہلے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اور بھی کئی لوگ موجود تھے۔ یہ سارا قافلہ آہستہ آہستہ کاتھرین کی رہنمائی میں کھنڈر کے اندر بڑھنے لگا۔

اچانک اندھیرے میں کاتھرین کے قدم کسی چیز سے ٹکرائے اور جب اس نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی تو اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

یہ دو انسانی لاشیں تھیں۔ ایک کسی نوجوان اور دوسری کسی دوشیزہ کی خون میں لت پت۔

پیٹر نے آگے بڑھ کر کاتھرین کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔
"ڈرو نہیں۔ اب ان میں جان نہیں ہے۔ ہم نے انھیں ٹھکانے لگا دیا ہے۔"
"کمبخت یہاں عشق بازی کرنے آئے تھے۔" دوسرا بڑبڑایا۔
"سارا کھیل بگڑ جاتا۔ سالوں کو پیار محبت کے لیے شہر میں اور کوئی جگہ نہیں ملی۔ یہیں مرنے کے لیے چلے آئے۔
تیسرے نے کہا۔
"لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" یہ کسی عورت کی آواز تھی۔
خیر اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم نے انھیں ختم کر دیا ہے۔ اب ہم خاموشی سے نکل سکتے ہیں۔
کاتھرین سوچ رہی تھی۔ میں اپنے پریمی کے پاس جا رہی ہوں۔ دو پریمیوں کی لاشوں پر سے گزر کر ان کے سینے میں بھی دل ہوں گے۔ ان کے بھی تو ماتا پتا ہوں گے۔ ان کی بھی تو زندگی تھی، آرزوئیں اور تمنائیں تھیں، انھوں نے بھی تو اسی گرجا میں محبت کی قسمیں کھائی ہوں گی۔
پیٹر کہہ رہا تھا۔
"جلدی کرو۔ وقت ہو گیا ہے۔"
اچانک کاتھرین کی چیخ نکلی اور اس کے بھاگنے اور مدد کے لیے چلّانے کی آواز سنّاٹے کو چیرتی چلی گئی، اور پھر کھنڈر میں چاروں طرف بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز گونجنے لگی اور کھنڈر کے باہر پولیس کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔
جھیل کے اس پار ایک عالیشان عمارت کے نچلے حصے میں سٹرس بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ سرنگ اسی عمارت سے کھودی گئی تھی۔ سرنگ کے دہانے پر خفیہ پولیس کے سپاہی، اخباری نمائندے اور ڈاکٹر موجود تھے۔ کوئی ایسے سوالات مرتب کر رہا تھا، کوئی کیمرہ سیٹ کر رہا تھا اور کوئی پستول کے ٹریگر پر انگلی رکھے ہوئے خطرہ کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔
جب گھڑیال نے دس بجائے تو سٹرس کو اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمایاں ہو گئے۔ اس کی بانہیں اپنی محبوبہ کو آغوش میں لینے کے لیے پھڑکنے لگیں۔
وقت گزرتا گیا۔ نبضیں تیز ہوتی گئیں۔ دھڑکنیں بڑھتی گئیں۔ دس سے ساڑھے دس، ساڑھے دس سے گیارہ اور پھر بارہ بج گئے لیکن کاتھرین نہ آئی۔ نہ پیٹر، نہ کوئی اور دوسرا۔
حتیٰ کہ دو آدمی خبر لانے کے لیے سرنگ میں اتارے گئے لیکن وہ بھی واپس نہ آئے۔
رات کی تاریکی صبح کی سپیدی میں تبدیل ہو گئی۔ اخباری نمائندے اور فوٹوگرافر اور ڈاکٹر تھک کر واپس چلے گئے۔ خفیہ پولیس کے لوگوں نے اپنے پستول ہولڈر میں ڈال لیے۔ لیکن سٹرس پھٹی ہوئی نگاہوں سے سرنگ کے دہانے کو گھور رہا تھا۔ اسے اب بھی امید تھی کہ کاتھرین ضرور آئے گی۔

اس روز کاتھرین کافی دیر سے سوکر اٹھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں جلن محسوس ہوئی تھی۔ رات کے واقعے پر غور کر کے ایک بار اس کا سارا جسم کانپ گیا۔ اسے حیرت تھی کہ وہ کس طرح لفنڈر سے باہر نکل سکی اور اپنے فلیٹ تک آ سکی۔ تاہم اسے اتنی خوشی تھی کہ اس کے بارے میں کسی کو پتہ نہیں لگا ہے۔

اسی روز مشرقی برلن کے اخبارات نے ایک سمگلر پکڑے جانے کی اطلاع دی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ بھاگنے کی کوشش میں مجرموں نے ایک نوجوان اور ایک حسین دوشیزہ کا قتل کر دیا ہے۔ سرحد کے پاس مغربی برلن کے دو ایجنٹ گرفتار کیے گئے ہیں جنہوں نے اقبال جرم کر لیا ہے۔

ٹھیک اسی شام کاتھرین نے ریڈیو آن کیا اور مغربی برلن کا پروگرام سننے کی کوشش کی تو اس کا سر گھوم گیا۔ خبروں میں بتایا جا رہا تھا۔

"مغربی برلن کی پولیس نے مغربی برلن میں رہنے والے ایک ہندوستانی کو مشرقی جرمنی کا ایجنٹ ہونے کے الزام میں گرفتار کیا ہے۔ اس کا نام مسٹر سکسینہ ہے۔"

رفعت نواز

کچی دیوار

علیم میاں ڈپٹی کلکٹر کے دفتر سے نکلے تو ان کی عجیب حالت تھی، سینے پر ہاتھ تھا، کمر جھک گئی تھی اور چہرے پر سارے زمانے کے دکھوں کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ دل کو تھامے ہوئے یوں چل رہے تھے جیسے ذ میں تیر اندازی کی مشق ہو رہی تھی اور ایک تیر ان کے آن لگا تھا۔ ہاں پیش کار کا دیا ہوا مراسلہ ایک تیر ہی تو تھا۔ وہ خوش خوش ایوارڈ کی رقم لینے دفتر میں داخل ہوئے تھے ان کے ذہن میں مستقبل کے کتنے خوش آئند منصوبے تھے مگر رقم کا چیک دینے کی بجائے پیش کار نے انھیں ایک مراسلہ پکڑا دیا تھا کہ "دفتر میں شریمتی رضیہ بیگم بنت کلیم الدین کی درخواست آئی ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ آپ کی بہن ہیں اور آپ کی جو جائیداد ٹاؤن پلاننگ کے لیے حاصل کی گئی ہے اس میں ان کا بھی حصہ ہے جو انھیں دلوا دیا جائے اس لیے آپ کے ایوارڈ کی رقم بحق سرکار محفوظ کر لی گئی ہے اور مقدمہ عدالت کے حوالے کیا گیا ہے کہ وہ حق داروں کے دعووں کا فیصلہ کرے۔"

مراسلہ پڑھ کر علیم میاں کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا سر چکرانے لگا اور چھڑی کا سہارا انھیں کمزور سا محسوس ہونے لگا، اور ان کے آس پاس کھڑے محلے برادری کے لوگ یوں لگا جیسے ان کا مذاق اڑا رہے ہوں وہ بدقت تمام تانگے تک آئے اور تانگے میں یوں دراز ہو گئے جیسے اب انھیں اٹھنا نہیں ہے۔ گھر آتے ہوئے راستہ بھر وہ رضیہ کی اس ذلیل حرکت پر غور کرتے رہے کہ اس نے درخواست کیوں دے ڈالی۔ اگر وہ ان سے کہ دی تو کیا وہ رضیہ کو حصہ کی رقم نہ دیتے۔ انھوں نے کبھی رضیہ کو غیر نہیں سمجھا تھا، گو کہ وہ ان کی سوتیلی بہن تھی۔ والد نے بڑھاپے میں جو نکاح کیا تھا اس کی وہی ایک نشانی رہ گئی تھی اور علیم میاں نے اپنے والد کے چھوڑے ہوئے دیگر ترکے کی طرح اس نشانی کی بھی خوب نگہداشت کی تھی۔ ماں باپ کے انتقال کے بعد انھوں نے ہی تو رضیہ کو پڑھایا لکھایا تھا اور اچھے گھرانے کے لڑکے سے اس کا بیاہ کیا تھا۔ کبھی انھوں نے محسوس کیا نہ ہونے دیا کہ رضیہ ان کی سوتیلی بہن ہے۔ حد تو یہ تھی کہ ان دونوں کے بچوں اور جان پہچان والوں کی نئی نسل کو یہ تک نہ معلوم ہو سکا تھا کہ وہ دونوں سوتیلے بہن بھائی ہیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ پچھلے ایک سال سے بہن بھائی کے تعلقات میں ایک تناؤ سا آ گیا تھا رضیہ کے میاں کو کاروبار میں نقصان آ گیا تھا اور رضیہ نے ان سے تین ہزار روپے مانگے تھے اور علیم میاں مجبوری

سے رضیہ کو رقم نہ دے سکے تھے۔ رضیہ کے میاں کا خیال تھا کہ علیم میاں ٹال گئے ہیں ورنہ بینک میں تو علیم میاں کے پانچ سات ہزار روپے پڑے ہوئے ہیں جو انہیں اپنی کسی موروثی جائیداد کے معاوضے میں ملے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ علیم میاں کو جتنا روپیہ ملا تھا اس سے کچھ زیادہ ہی والد قرضہ چھوڑ گئے تھے اور ایک فرمانبردار فرزند کی طرح انہوں نے قرض کی پائی پائی ادا کر دی تھی۔ مگر اس غلط فہمی کی گرہ رضیہ کے دل میں ایسی پڑی کہ بہن بھائی کے اچھے تعلقات بگڑنے لگے۔ ویسے خاندانی تقریبوں میں وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتے دکھاوے کے لئے تحفے تحائف اور دعوتوں کے تبادلے ہوا کرتے مگر وہ ایک بات جو پہلے تھی اب نہ رہی تھی۔ علیم میاں اپنے تئیں مطمئن تھے کہ انہوں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا مگر رضیہ اور اس کے میاں وسوسے میں مبتلا تھے۔

علیم میاں نے یہ کبھی نہ سوچا تھا وہ ہونی بات اتنی غیر معمولی بھی ہو سکتی ہے کہ رضیہ ان پر بھروسہ نہ کرتے ہوئے کچہری میں ان کے خلاف دعویٰ دائر کر دے۔ یہ تو سراسر ان کی نیت پر حملہ تھا اور ڈنکے کی چوٹ پر رضیہ نے ان کی بدنیتی کا اعلان کیا تھا۔ اگر انہیں پہلے سے اس حملے کا احساس ہوتا تو وہ اپنے بچاؤ کی تدبیر سوچتے اور اس شکل سے معاملے کو کچہری تک نہ پہنچنے دیتے اور یہ جگ ہنسائی نہ ہوتی مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا اور دنیا ان کے تڑپنے مچلنے کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ احساس ندامت و ذلت کے ساتھ ساتھ انہیں رضیہ پر غصہ بھی آ رہا تھا اور زندگی میں پہلی بار دو متضاد خواہشیں ہو رہی تھیں، خودکشی کر لیں یا رضیہ کو گولی سے اڑا دیں۔ دماغ میں ایک اتھل پتھل ہو رہی تھی خیالوں کا ہجوم تھا کہ امڈا ہی چلا آتا تھا اور انہیں دل ہی دل میں [illegible] آ رہے تھے۔

گھر کے سامنے تانگہ رکا تو وہ اپنی پوری طاقت سمیٹ کر تانگے سے اترے کرایہ ادا کیا اور اپنے کمرے میں جا کر شیروانی جوتے سمیت بستر پر دھم سے گر گئے جی چاہ رہا تھا لوگوں کی نظروں سے چھپ جائیں پڑے رہیں۔ کوئی آہٹ نہ ہو کوئی بات نہ کرے اور لیٹے لیٹے ہی انہیں موت آ جائے کہ گھر والوں کو ان کی زبانی ہی پتہ نہ چلے کہ ان کی کتنی رسوائی ہوئی ہے۔ مگر ایسا ہوتا کیسے پلنگ پر پڑتے ہی بیوی بچے دوڑے دوڑے آئے اور لگے تابڑ توڑ سوال کرنے، کیا ہوا کیوں پڑ گئے، اوارڈ کی رقم ملی تو بازار سے خالی ہاتھ کیوں لوٹ آئے وہ فہرست کہاں گنوا دی جس میں بیٹے بیٹی اور نواسیوں کی فرمائشیں تھیں۔ سب سوالوں کا جواب علیم میاں کی خاموشی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر دیکھتے تو گھور رہے تھے جیسے ان کی سماعت بیکار ہو چکی ہو، بینائی جاتی رہی ہو۔ جب خاموشی نہ ٹوٹی تو بیوی گھبرائی، چیخ کر آوازیں دیں اور پلنگ کے گرد ان کے بچوں، نواسوں اور گھر میں کام کرنے والوں کی ایک مختصر سی فوج جمع ہو گئی۔ علیم میاں نے حسرت سے اپنوں کو دیکھا دل میں ہوک سی اٹھی جسم میں کرب کی لہر دوڑ گئی اور آنکھوں میں آنسو امڈ آئے کروٹ بدل کر انہوں نے آنسو تکیے پر ٹپکا دیے اور آستین سے آنکھیں پونچھ کر [illegible] لیٹ گئے۔ بیوی اللہ رسول کی قسمیں ڈالنے لگی کہ کچھ تو بولو زبان تو کھولو۔ یہ خاموشی کیسی [illegible] بیوی کے دل میں [illegible] آیا کہ کہیں میاں کو سکتہ تو نہیں ہو گیا بس پھر کیا تھا بیوی کے بین شروع ہو گئے ڈاکٹر [illegible]

منیں ہونے لگیں، بچے رونے لگے، گھر میں کہرام مچ گیا پاس پڑوس والے سمجھے کہ کوئی گزر گیا پوچھتا چھو ہونے لگا جب بہت بڑھا تو علیم میاں نے چیخ کر بیوی سے کہا "چپ رہو بی بی میں مرا نہیں ابھی زندہ ہوں۔ اب دیکھ کوئی کیا کر سکتا ہے میرا اب تک تو خیر نیک ارادے تھے مگر اب اس بدبخت کمینی کو تو کچہری کچہری کھنچواؤں گا رسوا کروں گا۔ اس کی ماں کا خون رنگ لایا نا، گئی نا اپنی ننھیال پر خیر نمٹ لوں گا۔ اس کا خصم اگر مرد ہے تو بھی چوڑیاں نہیں پہنی ہیں۔ ذلیل کتا منہ پر آکر کیوں نہیں کہتا کچھ عورت کا سہارا کیوں لیتا ہے بزدل۔"

سب لوگ علیم میاں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے کیا واہی تباہی بکے جا رہے ہیں بیوی تو خیر کچھ واقعے کی کو سمجھ گئی تھی دوسرے حیران تھے۔ بیوی نے ہشیاری سے سب کو کمرے سے باہر نکال دیا اور خود میاں کو دبانے لگی اور سرگوشیوں میں حقیقت حال پوچھنے لگی۔ میاں نے بیچ بیچ کر پورا واقعہ بیان کر دیا۔ بیوی پہلے تو ڈر گئی پھر سنبھل کر اس نے ڈھارس بندھائی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے یہ تو ہونے والا تھا۔ اتنی سی بات پر جی چھوٹا کر بیٹھے تو بال بچوں کا کیا ہوگا۔ ان منصوبوں کا کیا ہوگا جو ہم نے سوچے تھے۔ وکیل سے مشورہ لو، اور مقابلہ کرو انہیں بھی عدالت کی سیڑھیاں چڑھاؤ۔ رسوائی صرف تمہاری نہیں ان کی بھی ہوگی لوگ تم پر ہنسیں گے تو ان کی بھی کھلی اڑے گی۔ اس بیچ بیٹا بھی آ گیا جو پچھلے تین سال سے نوکری کر رہا تھا اور دفتری کاروبار کا جسے تھوڑا بہت تجربہ ہو چکا تھا۔ اس نے یہ ترکیب سمجھائی کہ عدالت میں انکار کر دو کہ رضیہ بیگم بہن ہیں۔ ثبوت وہ کیا پیش کریں یہ بھی کہہ دینا کہ نکاح کے وقت وہ اپنی ماں کے ساتھ آئی تھیں

عدالت میں مقدمہ کی دو پیشیاں ہوئیں۔ تاریخیں تبدیل ہوئیں، فریقین کے نام سمن جاری ہوئے [illegible] عدالت میں بیان دینے کا حکم ہوا۔ خاندان کے بزرگوں نے بیچ میں پڑ کر فریقین کو صلح پر راضی کر لیا۔ علیم میاں بڑی مشکل سے راضی ہوئے تھے۔ خیر انھوں نے کچھ اپنی عزت اور بہن کی ذلت کا پاس کرتے ہوئے صلح نامے پر دستخط کر دیے جس میں لکھا تھا کہ "شرع شریف کی رو سے جو بھی حصہ بہن کا ہوتا ہے وہ دیا جائے گا۔" لیکن بیوی اور بیٹا خوب کھل کھلا کر تو بار رہے۔ مگر اس کے بعد علیم میاں کے دل میں بہن کی طرف سے ایسی نفرت آئی کہ انھوں نے [illegible] کر جیتے جی بہن کی صورت نہ دیکھیں گے نہ اس کی دہلیز پر قدم رکھیں گے۔

بھانجی کا کاروبار [illegible] ہو گیا۔ [illegible] لڑکے کی [illegible] کی تقریب ہوئی۔ علیم میاں کو بھی دعوت نامہ دیا گیا، رشتہ داروں نے شرکت پر اکسایا مگر وہ [illegible] بہن خود ملانے آئی کہ میرے گھر کی پہلی [illegible] ہے اگر تم شریک نہ ہوئے تو ادھوری رہ جائے گی، مگر [illegible] گلے سے [illegible] دیا اور [illegible] میں آکر دھتکار دیا کہ تو کیا سمجھ کر میرے گھر آئی تھی میرا تیرا واسطہ [illegible] گھر میں [illegible] یہاں تیری خوشی میں شریک ہونا تو دور رہا تیری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ خبردار جو اب بھی اس نے ملنے کا نام لیا تو، ورنہ میرا جوتا ہوگا اور تیرا سر۔ بہن بیچاری روتی ہوئی لوٹ گئی۔

صا

علیم میاں نے تو خیر اور کچھ نہیں کہا مگر بیوی نند اور نندوئی کو خوب کوسنے دیتی اور اپنی بیٹی [illegible]
میاں آ کر یہ سب عیش، شادی، مفت کی دولت ہاتھ لگی تو ہو رہے ہیں۔ [illegible] ان کی حسب نسب [illegible] سال
میں۔ ادھر بہن نے پرچار شروع کیا کہ بھائی صاحب ہمیں پھلتا پھولتا دیکھ نہیں سکتے ہماری خوشی اتنی بری
لگی ہے اس لیے شریک نہیں ہوئے۔

علیم میاں کے لڑکے کی شادی ہوئی تو انھوں نے بہن کو رسمی دعوت نامہ تک نہ بھیجا اور برادری میں
صاف صاف کہہ دیا کہ کوئی انھیں بلانے کے لیے کہے گا تو وہ ہم میں سے نہیں ہوگا۔ اب خاندان میں دو پارٹیاں بن گئی
تھیں ایک بھائی کی طرفدار تھی دوسری بہن کی۔ بیچ میں کچھ لگائی بجھائی کرنے والے بھی [illegible] دونوں پارٹیوں کا
خوب تماشہ دیکھتے۔

علیم میاں کے یہاں پوتا پیدا ہوا تو خوب زور دار جشن ہوا۔ تین چار سو آدمیوں نے مرغ پلاؤ، نان قورمہ
اور زردہ کی خوشبودار ڈکاریں لیں۔ رات تمام قوال گاتے رہے طوائفیں ناچتی رہیں۔ صبح [illegible] لوگ مہمانوں
کو رخصت کر کے ستانے پڑے تھے۔ بارہ بجے ایک بچے نے آ کر اطلاع دی کہ علیم میاں کے بہنوئی کا انتقال ہو گیا۔
صبح بھلے چنگے گھر سے بازار گئے تھے۔ واپس آ کر گلاس بھر ٹھنڈا پانی پیا اور [illegible] درد کی شکایت کی اور
گھنٹہ بھر میں سانس اکھڑ گئی۔

خبر سن کر علیم میاں مبہوت ہو گئے۔ تھوڑی دیر سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ بیوی نے دانت پیس کر
کہا "اب میری بددعا لگی موئے کو۔ چلو ایک منحوس سے خاندان پاک ہوا۔ اب دیکھنا وہ کلموہی کب تک جیتی ہے۔
خدا اسے بھی جلد اٹھا لے تا کہ ......" علیم میاں نے جھپٹ کر ایک تھپڑ بیوی کے لگایا اور غصے سے
کانپتے ہوئے بولے "کم بخت منہ کو لگام دے کیا بک رہی ہے۔" بیوی نے بل کر جواب دیا "ہاں جیسے تمھاری
خوب عزت بڑھائی اس نے تمھاری۔ برا کیوں نہیں لگے گا تمھیں...."

علیم میاں نے شیروانی پہنی چھڑی پکڑی اور باہر جاتے ہوئے بیوی سے بولے۔
"خبردار تم جو آج میت پر رونے کو۔"

بہن کے گھر کے قریب پہنچ کر علیم میاں رک گئے۔ ایک کشمکش ہو رہی تھی جائیں نہ جائیں۔ اتنے میں [illegible]
آگے اور بولے "چلو بڑھو میاں رات آنے سے پہلے ہی میت کو ٹھکانے لگانا ہے۔" علیم میاں [illegible] ایک لونڈے میں بیٹھے
[illegible] ساری کارروائی سے خود کو الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے مگر [illegible] ہاتھ بٹاؤ [illegible]
بیچ عزیز ہوشے۔

بے دلی سے علیم میاں لاش تک گئے۔ بہنوئی کے چہرے کو دیکھا کہ سب سے بے نیاز خوش اور مطمئن [illegible] سے
جا رہا ہے۔ علیم میاں کے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

لاش کو کفن پہنا کر دالان میں عورتوں کے آخری دیدار کے لیے رکھ دیا گیا ـــ آہ و بکا کا ایک طوفان اٹھا۔ رضیہ بیگم چھاتی پیٹ رہی تھیں اور دیوار سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ پھر ایک دم رضیہ بیگم نے زور سے صدا لگائی "بھائی صاحب کو بلاؤ۔"

پردہ گرا یا گیا علیم میاں سر جھکائے بہن کے سامنے جا کھڑے ہوئے رضیہ بیگم نے بھائی کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ پھر مرحوم شوہر کی لاش کی طرف نگاہ کی اور گلو گیر آواز میں بولیں۔

"بھائی صاحب آپ کو تو یاد ہوگا۔ اپنے گھر سے آپ نے مجھے ان کے ساتھ وداع کیا تھا اور کہا تھا "رضو تیرا شوہر تجھے سدا خوش رکھے گا میں نے ہزاروں میں اسے انتخاب کیا ہے۔ مرنے والے نے مجھے جیسا بھی رکھا وہ آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ مگر اب تو تم انھیں بھی اپنے ساتھ لیے جا رہے ہو۔ اب کس کے سپرد مجھے کیے جا رہے" رضیہ بیگم نے بھائی کی شیروانی کا دامن پکڑ کر پوچھا۔

"کہو کس کے سپرد کیا مجھے بھائی صاحب۔ کہو نا بھیا اب میرا کون رہ گیا ہے۔"

علیم میاں نے رضیہ بیگم کو اپنی باہوں میں بھینچ لیا اور جذبات سے پُر ہو کر بولے "رضو میں تو زندہ ہوں تیرا بھائی تو کیوں فکر کرتی ہے۔" رضیہ بھائی کی چھاتی پر سر اور چہرہ رگڑ رگڑ کر رونے لگی اور علیم میاں نے اپنے بیٹے کو حکم دیا "اپنی اماں کو لے آؤ۔ رضو اکیلی رو رو کر تو جان ہی دے دے گی۔"

احمد جلیس

خوابیدہ چراغ

خالہ بی رضائی میں ڈورے بھرتے بھرتے رک گئیں اور بولیں۔
آٹا لینے آئی ہو؟
جی! طاہرہ نے آنکھیں جھکا کر کہا۔
خالہ بی نے عینک کے ذرا اوپر سے طاہرہ کو گھور کر اِس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔ اِن، یہ طاہرہ ہے؟ ایسا بھرا بھرا ڈیل ڈول، یہ کھلی کھلی سی رنگت، اچھی خاصی عورت ہو گئی یہ تو!

پھر آٹا ناپتے ہوئے بولیں۔ بٹی طاہرہ! تم تو ماشاء اللہ اب سیانی ہو گئی ہو۔ اس عمر میں یوں بجا بیلوں کی طرح گھومنے سے لڑکیوں کے دبدبے کا پانی مر جاتا ہے سمجھ گئیں نا؟

طاہرہ نے آنکھیں جھکا لیں۔ تھالی میں پڑے آٹے کی سطح کو ٹھیک کرتے ہوئے وہ بیتری سے باہر نکل گئی اس نگوڑی ماری گلی میں آتے ہی اس کا دل کسی انجانے خوف سے زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا۔

سامنے ہی تو چوک پر شریفے پنواڑی کی دکان تھی۔

کمبخت دنیا بھر کے نکمے دن بھر یہیں مرتے رہتے ہیں! طاہرہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف سے اپنے دوپٹے کو کس لیا اور جب وہ ادھر سے گزری تو حسبِ معمول شریفے نے سینے پر ہاتھ رکھ کر پیشہ ور قوالوں کی طرح ایک تان لگائی۔

"تورے نیناں رسیلے کٹیلے ہائے رام"

دکان میں چاروں طرف سے فرمائشی قہقہے گونجنے لگے۔ شریفے استاد اب مسلسل ہے ہے کرتا ہوا سب اطراف داد طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ استاد جدھر نظر ڈالتا وہ لوگ پھر ہنسنے لگتے . . . . اس انداز میں گویا ایک دوسرے سے کہہ رہے ہوں۔ ہنسو بھائیو ہنسو — یہاں مفت سگریٹ پینے آ جاتے ہو۔ دن بھر چائے پانی کا آسرا لگا رہتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ہمیں ہنسی نہ آئے۔؟ . . . . اور ہنسی کا یہ سلسلہ طاہرہ کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک چلتا رہا۔

اللہ کرے موت آجائے کمینوں کو۔ ۔ ۔ ۔ ! طاہرہ دانت پیس کر بڑبڑائی۔

سامنے کے نکڑ پر کوڑا بنّن یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی انجان بن کر پیٹھ پھیرے جوئے کے ایک ٹھیے مختلف نمبروں پر پیسے لگا رہا تھا۔ جب طاہرہ اُس کے بالکل قریب سے گزری تو وہ فوراً اپنی رکشا کی طرف لپکا بوکھلائے ہوئے لہجہ میں پوچھا۔

کیوں بی بی ــــــ گھر چھوڑ آؤں آپ کو۔

اور طاہرہ انجانے طور پر بنّن کی رکشا میں بیٹھ گئی۔ لیکن اب رہ رہ کے اسے یہ فکر ہو رہی تھی کہ بھائی جان اسے بنّن کی رکشا میں بیٹھے نہ دیکھ لیں۔ وہ کئی بار اسے ڈانٹ چکے تھے کہ وہ مفت میں کیوں بنّن کی رکشا میں گھومتی پھرتی ہے۔ حالانکہ بنّن دوسروں کے لیے لاکھ بدمعاش سہی طاہرہ کے گھر کا وہ پرانا نمک تھا۔ سات آٹھ برس کا تھا وہ جب ابا میاں اسے تحصیل سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ لیکن گزشتہ سال بھائی جان نے اسے اس جرم میں گھر سے نکال دیا تھا کہ اب وہ بہت بڑا ہو گیا ہے۔ جس دروازے سے ابا میاں کا جنازہ نکلا اسی دروازے سے دبے پاؤں طاہرہ کی جوانی داخل ہوئی۔ میت کا ماتم سب نے سنا، بھلا اس شور میں سہمی سہمی سی جوانی کی جھنکار کون سنتا؟ یہ کونسا موقع تھا ٹھہرے ہونے کا؟ اسی لیے تو اماں نے جان بوجھ کر اپنی آنکھ پر پٹی باندھ لی تھی۔ ان کے نزدیک طاہرہ ابھی تک نری بچی تھی جبھی تو وہ اسے سودا سلف لانے بازار بھیج دیتی تھیں۔ اماں کا خیال تھا بھی ٹھیک، غریبوں کی لڑکیاں صرف اسی وقت بڑی ہو سکتی ہیں جب ان کا جہیز اکٹھا ہو گیا ہو اور کوئی موزوں رشتہ مل گیا ہو، ورنہ یا تو وہ عمر بھر بچی رہتی ہیں یا مجبوراً بوڑھی ہو جاتی ہیں، جوانی ان پر کبھی آتی ہی نہیں۔

ان ساری مصیبتوں سے لڑنے کے لیے اس گھر میں اب اکیلے احمد علی باقی رہ گئے تھے۔ بوڑھی ماں کے علاوہ اب سیانی طاہرہ کا بوجھ ان کی کمر توڑ دیتا تھا۔

ابا میاں کو گزرے ابھی دو برس بھی تو پورے نہیں ہوئے تھے لیکن ان دو برسوں میں ہی تیس سال کے احمد علی اچھے خاصے بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔

پھر وہی ہوا جس کا طاہرہ کو ڈر تھا۔ احمد علی نے اسے رکشا سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ اور اسے دیکھتے ہی وہ گرجے۔

منّی ۔ ادھر آؤ ! ۔ ۔ ۔ ابھی وہ کچھ اور کہنے بھی نہ پائے تھے کہ طاہرہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"آپ تو صرف مجھی کو ڈانٹنا جانتے ہیں بھائی جان، اس شریف کے بچے کو ایک لفظ تک نہیں کہتے جو ہر وقت ہمیں چھیڑتا رہتا ہے۔ بے چارہ بنّن میری مدد نہ کرے تو خدا جانے میرا کیا حال ہو، اور وہ بھی آپ کو

ناگوار گزرتا ہے!

لیکن..... احمد علی نے لہجہ بدل کر دھیمے انداز میں کہنا چاہا۔

لیکن کچھ نہیں بھائی جان..... طاہرہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ بس اب میں کبھی باہر نہیں نکلوں گی۔ کبھی نہیں، چاہے کچھ بھی ہو جائے....

طاہرہ کے آنسو دیکھ کر احمد علی کے اندر سے آہستہ آہستہ بھائی والی شخصیت سر اٹھانے لگی اور پھر تو سچ مچ طاہرہ انھیں بے قصور نظر آئی۔ وہ طاہرہ کے قریب گئے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

رو مت منی، اب میں تمھیں کبھی باہر نہیں جانے دوں گا۔ یہ سارا جھگڑا اسی کا ہے۔ سنا اماں! منی اب کبھی باہر نہیں جائے گی، مجھ سے اکیلے جو کچھ بن پڑے گا میں کروں گا ورنہ گھر میں چاہے فاقہ ہو لیکن منی گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔ احمد علی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اسے سچ مچ اب پردہ کرنا ہی چاہیئے۔

اماں نے احمد علی کی طرف کچھ ایسی تیز نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں۔

یہ کیا بک رہے ہو؟ منی باہر نہیں نکلے گی تو کیا میں سڑکوں پر خاک چھان کر اپنی عاقبت خراب کروں گی یا تم دفتر چھوڑ کر گھر میں چھپے رہو گے؟

احمد علی ماں کی نظروں کی تاب نہ لا سکے۔ انھوں نے مڑ کر جلدی سے کھونٹی پر سے اپنا ہیٹ اتارا اور تیز تیز قدموں سے دفتر چلے گئے۔

شام وہ نبن کی رکشا میں اسی کے ساتھ گھر لوٹے۔

ہوا کیا میاں۔ کیا پھر اس نے کچھ گڑبڑ شروع کر دی؟

احمد علی نے مڑ کر طاہرہ کی طرف دیکھا اور پھر دبے لہجے میں بولے۔

بھئی نبن اس مردود نے تو طاہرہ کا چلنا پھرنا دوبھر کر دیا ہے، ہر وقت تعاقب کرتا ہے کمینہ، کچھ ایسا انتظام کرو کہ چھٹی کا کھایا یاد آ جائے کمبخت کو!

نبن نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ انتظام تو بہت کچھ ہو سکتا ہے میاں، مگر وہ سالا بڑا گنڈہ ہے اور پھر اس کے گرگے بھی تو بہت ہیں۔ خیر دیکھا جائے گا۔ میں نمٹ لوں گا آپ فکر نہ کیجئے۔

احمد علی نے فکرمند انداز میں کہا۔ ہاں بھئی یہ باتیں میرے تو اختیار سے باہر ہیں تم ہی کو کچھ کرنا ہے۔

..... اور پھر نبن دیر تک اس انداز میں سر ہلاتا رہا گویا وہ معاملہ کی اصل تہہ تک اچھی طرح پہنچ گیا ہے۔

رات آئی تو چار نوالے زہر مار کر کے احمد علی متفکر انداز میں بستر پر دراز ہو گئے کمرہ کی فضا پر کامل سکوت طاری تھا۔ سامنے طاہرہ اور اماں کے پلنگ بچھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے ذرا ہٹ کر احمد علی کا پلنگ پڑا تھا۔

طاہرہ کے سرہانے طاق میں رکھا چراغ کمرہ میں عجیب اونگھتی ہوئی روشنی پھیلا رہا تھا۔ احمد علی کی آنکھوں پر نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ انھوں نے دیکھا اس مدھم روشنی میں بھی طاہرہ کا سرخ و سفید چہرہ کیسا دمک رہا تھا۔۔۔ پھر وہ ٹکٹکی باندھے چراغ کی لو کو گھورنے لگے کہاں سے آیا اس میں اتنا بہت سا تیل جو یہ اس تابندگی سے جل رہا ہے

میاں سوئے نہیں؟ اماں نے آہستہ سے پوچھا۔

نیند نہیں آتی۔۔۔ احمد علی اسی انہماک سے چراغ کو گھورے جا رہے تھے۔

دیکھو تو طاہرہ اب پورے پلنگ پر سمانے لگی ہے!

ہوں — احمد علی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

طاہرہ کی کچھ فکر کرو تو تمہاری دلہن گھر بسائے، لیکن تم تو کبھی میری باتوں پر دھیان ہی نہیں دیتے۔

میری دلہن —؟ احمد علی کو یہ لفظ برسوں کے بعد آج بالکل اجنبی سا لگ رہا تھا۔ برسوں پہلے جب وہ انٹر میں تھا تب ضرور اس لفظ میں اس کے لیے بڑی دلکشی تھی لیکن ابا میاں کیا گزرے کہ اس کے بنائے ہوئے سارے شیش محل چکنا چور ہو گئے۔ پھر ابا میاں کی جگہ پر وہ چنگی کے دفتر میں کلرک ہو گیا اور اب بھلا ایک کلرک کو ایسے رنگیں سپنے دیکھنے کا کیا حق ہو سکتا تھا۔

میری دلہن —! اس نے۔۔۔ اس لفظ کو ذہن میں کئی بار دہرایا اور پھر اسے ایک بارگی خواہ مخواہ ہنسی آگئی۔۔۔۔ اس نے دیکھا چراغ کے دھنوئیں سے دیوار کالی ہو چلی تھی — اس نے ایک لمبی سی جماہی لی، اور گھبرا کر اپنی پھٹی ہوئی چادر سر تک کھینچ لی۔ اس نے اپنے پورے وجود کو اس چادر میں سمیٹ لینے کی کوشش کی — جیسے وہ اس میں چھپ کر طاہرہ کی جوانی کو جھٹکہ دے دے گا۔ اس چادر میں سے اماں کی آوازیں سنائی نہیں دیں گی اور۔۔۔ اور جیسے اس میں سر لپیٹنے کا مکردہ چہرہ بھی نہیں ابھر سکے گا۔

لیکن ان کے دماغ میں مایوسیوں اور اداسیوں کا جو ہجوم تھا وہ انھیں کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا تھا۔ کبھی کبھی غنودگی سی طاری ہو جاتی تو انھیں ایسا محسوس ہوتا جیسے اچانک چراغ گل ہو گیا ہو، کمرے میں تاریکی ہی تاریکی ہے، وہ چراغ روشن کرنے کے لیے دیا سلائی ملاتے ہیں لیکن تیلیوں میں سے شعلہ ہی نہیں نکلتا۔ وہ گھبرا کر ابا میاں کو آواز دیتے ہیں لیکن آواز حلق سے باہر نکلتی ہی نہیں۔ کبھی انھوں نے دیکھا کہ ان کے پر لگ گئے ہیں وہ تیزی سے اوپر کی طرف اڑ رہے ہیں لیکن پھر دھڑام سے زمین پر آ رہے۔ اس جھٹکے کے ساتھ ہی انھوں نے آنکھیں کھولیں اور گھبرا کر چادر کا ذرا سا کونہ سرکا یا۔

اونگھتا ہوا سا چراغ اسی طرح اپنی زرد اور بیمار روشنی پورے کمرہ میں پھیلا رہا تھا، اور اس مدھم سی روشنی میں انھیں دروازے کی طرف دو سائے متحرک نظر آئے، پھر جو کچھ انھوں نے دیکھا، اس پر

پل بھر کے لیے تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین آیا ہی نہیں۔ احمد علی نے کئی کئی بار آنکھیں مل کر دیکھا لیکن انھوں نے طاہرہ اور زینت کو آہستہ آہستہ دروازے کی طرف رینگتے ہوئے صاف پہچان لیا تھا۔ انھوں نے اٹھنا چاہا، وہ فوراً اپنی پوری قوت سے چیخنا چاہتے تھے لیکن عین اسی وقت ذہن کے کسی گوشے سے شریف کا مکروہ چہرہ ابھرا، اس کے چہرے پر بڑی حریص اور سفاک مسکراہٹ ناچ رہی تھی ...... چڑیل کے خیال گوشے سے ایک خوبصورت سی دلہن نے اپنا گھونگھٹ ہٹایا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ احمد علی کو یوں لگا جیسے ان دونوں نے مل کر اُن کے جسم کی ساری قوت سلب کر لی

انھوں نے ایک بے چین کروٹ بدلی اور جلدی سے اپنی چادر سے ... لیا

طاہرہ کے سرہانے طاق میں رکھا چراغ کمرہ میں عجیب اونگھتی ہوئی روشنی پھیلا رہا تھا۔ احمد علی کی آنکھوں میں نیند کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ انھوں نے دیکھا اس مدھم روشنی میں بھی طاہرہ کا سرخ و سفید چہرہ کیسا دمک رہا تھا ۔ ! . . پھر وہ ٹکٹکی باندھے چراغ کی لو کو گھورنے لگے کہاں سے آیا اس میں اتنا بہت سا تیل جو یہ اس تابندگی سے جل رہا ہے!

میاں سوئے نہیں؟ اماں نے آہستہ سے پوچھا۔

نیند نہیں آتی . . . ۔ احمد علی اسی انہماک سے چراغ کو گھورے جا رہے تھے۔

دیکھو تو طاہرہ اب پورے پلنگ پر سمانے لگی ہے!

ہوں ــ احمد علی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا ۔

طاہرہ کی کچھ فکر کرو تو تمہاری دلہن گھر بسائے، لیکن تم تو کبھی میری باتوں پر دھیان ہی نہیں دیتے ۔

میری دلہن ــ ؟ احمد علی کو یہ لفظ برسوں کے بعد آج بالکل اجنبی سا لگ رہا تھا۔ برسوں پہلے جب وہ انٹرنس میں تھا تب ضرور اس لفظ میں اس کے لیے بڑی دلکشی تھی لیکن ابا میاں کیا گزرے کہ اس کے بنائے ہوئے سارے شیش محل چکنا چور ہو گئے۔ پھر ابا میاں کی جگہ پر وہ چنگی کے دفتر میں کلرک ہو گیا اور اب بھلا ایک کلرک کو ایسے کہیں سپنے دیکھنے کا کیا حق ہو سکتا تھا۔

میری دلہن ــ ! اس نے . . . اس لفظ کو ذہن میں کئی بار دہرایا اور پھر اسے ایک بار خواہ مخواہ ہنسی آ گئی . . . . . . اس نے دیکھا چراغ کے دھنوئیں سے دیوار کالی ہو چلی تھی ــ اس نے ایک لمبی سی جماہی لی، اور گھبرا کر اپنی پھٹی ہوئی چادر سر تک کھینچ لی۔ اس نے اپنے پورے وجود کو اس چادر میں سمیٹ لینے کی کوشش کی ــــ جیسے وہ اس میں چھپ کر طاہرہ کی جوانی کو چکمہ دے دے گا۔ اس چادر میں سے اماں کی آوازیں سنائی نہیں دیں گی اور . . . . اور جیسے اس میں شریفے کا مکروہ چہرہ بھی نہیں ابھر سکے گا۔

لیکن ان کے دماغ میں مایوسیوں اور اداسیوں کا جو ہجوم تھا وہ انھیں کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا تھا۔ کبھی کبھی غنودگی سی طاری ہو جاتی تو انھیں ایسا محسوس ہوتا جیسے اچانک چراغ گل ہو گیا ہو، گھر میں تاریکی ہی تاریکی ہے، وہ چراغ روشن کرنے کے لیے دیا سلائی ملا رہے ہیں لیکن تیلیوں میں سے شعلہ نہیں نکلتا۔ وہ گھبرا کر ابا میاں کو آواز دیتے ہیں لیکن آواز حلق سے باہر نکلتی ہی نہیں ۔ کبھی انہوں نے دیکھا کہ ان کے پر لگ گئے ہیں وہ تیزی سے اوپر کی طرف اڑ رہے ہیں لیکن پھر دھڑام سے زمین پر آ رہے۔ اس جھٹکے کے ساتھ ہی انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور گھبرا کر چادر کا ذرا سا کونہ سرکا دیا۔

اونگھتا ہوا سا چراغ اسی طرح اپنی زرد اور بیمار روشنی پورے کمرہ میں پھیلا رہا تھا، اور . . اس مدھم سی روشنی میں انھیں دروازے کی طرف دو سائے متحرک نظر آئے، پھر جو کچھ انھوں نے دیکھا تھا

پل بھر کے لیے تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین آیا ہی نہیں۔ احمد علی نے کئی کئی بار آنکھیں مل کر دیکھا۔ انھوں نے طاہرہ اور زہن کو آہستہ آہستہ دروازے کی طرف رینگتے ہوئے صاف پہچان لیا تھا۔ انھوں نے اٹھنا چاہا، وہ فوراً اپنی پوری قوت سے چیخنا چاہتے تھے لیکن عین اسی وقت ذہن کے کسی گوشے سے شرافے کا مکروہ چہرہ ابھرا، اس کے چہرے پر بڑی حریص اور سفاک مسکراہٹ ناچ رہی تھی .... پھر دل کے انجانے گوشے سے ایک خوبصورت سی دلہن نے اپنا گھونگھٹ ہٹایا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ احمد علی کو یوں لگا جیسے ان دونوں نے مل کر ان کے جسم کی ساری قوت سلب کر لی

انھوں نے ایک بے چین کروٹ بدلی اور جلدی سے اپنی چادر سے منہ ڈھک لیا۔

قدیر زماں

مجھ سے میرے غم نہ مانگ

مارچ ۱۹۶۵ء   میری اچھی دوست!

آج سویرے سویرے مجھے کیا ہو گیا ہے۔ پو پھٹنے سے پہلے ہی میں کیوں بیدار ہو گیا۔ رات دیر گئے تک جاگتے رہنے پر مجھے یوں صبح ہی اٹھنا نہیں چاہیے تھا۔ پھر میں دن بھر کام کیسے کروں گا۔ آنکھ کھلنے کے بعد دیر تک میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اب کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا ہوں اور تم سے مخاطب ہوں۔ گو میں تمہارے خط کا جواب کل ہی بھیج چکا ہوں اور رات سونے سے قبل مجھے اس بات کا یقین تھا کہ مہینے بھر بعد تمہارا خط آئے گا اور اتنے ہی دنوں بعد میں تمہیں لکھوں گا — لیکن کل کے خط میں تمہارا شکریہ ادا کرنا تو بھول گیا۔

اے پگلی لڑکی! تم نے کیا سوچ کر یہ کہہ دیا کہ تم میرے غم لے لوگی۔ تم نے تو مجھے ابھی تک دیکھا بھی نہیں۔ میرا ایک گیت پڑھ کر ہزاروں میل دور سے تم نے مجھ سے خط و کتابت کی۔ تمہیں کیا معلوم کہ میرا غم کیا ہے۔ اگر تم مجھ سے وہ غم مانگتی ہو جو ہر انسان سے وابستہ ہے تو وہ غم تو تمہارے پاس بھی ہے۔

تم نے مجھ سے کوئی سچا غم مانگا ہو۔ اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ میں تمہارے سامنے اپنا سر جھکا دوں۔ یہ بات مردانہ اوصاف کے خلاف ہو گی کہ اس طرح میں ایک لڑکی کی خوشامد کروں لیکن یہ تو بتاؤ کس نے اپنے سچے دل سے ایک انسان سے اس کے غم مانگے ہیں۔ . . . مجھے یقین ہے کہ تم نے سچے دل سے یہ بات کہی ہے۔ تبھی تو میں رات بھر سویا نہیں ہوں۔ پھر کیا بُرا ہے کہ میں ایک سچے اور ہمدرد دل کے آگے اپنا سر جھکا لوں۔

ہاں تو میری پیاری ساتھی! اب تم ہی کہو کہ کائنات کا وہ لمحہ حسین ہے کہ جس میں ایک انسان دوسرے انسان سے غم مانگ لے۔ اس سے زیادہ کوئی اور خوبصورت لمحہ ہو تو مجھے بتاؤ — تم نہیں بتا سکتیں! تو پھر مان جاؤ کہ وہ لمحہ بے حد حسین تھا جب میں تمہاری تحریر پڑھ رہا تھا۔

سچ بتاؤ تم میرے کون سے غم کی متحمل ہو سکو گی۔ تم میرے کس غم کی حفاظت کرو گی؟ کیا زمین کا وہ غم کہ صدیوں سے آکاش کی چکی میں ایک مونگ کے دانے کی طرح پڑی ہوئی ہے اور آکاش جب چاہے اس مونگ کے دانے کو پیس کر سرمہ بنا سکتا ہے — یا پھر کسی سوکھتی ندی کا غم کہ بے بس پا کر چرند پرند اور زمین پر رینگنے والے کیڑے بھی اس کا سینہ روندتے ہیں؟ — یا پھر کسی باغ میں لہلہاتے ہوئے اس درخت کا غم کہ جس کا دامن پھلوں سے لدا ہوا تو ہے لیکن جیسے ہر آن یہ

فکر دامن گیر ہے کہ اسے کسی بھی لمحے میں لوٹ لیا جائے گا ۔۔۔ [illegible] وہ اپنے [illegible] بدلوں سے کوشاں ہے کہ اس ناسور پر کسی کی نظر نہ پڑ سکے۔

کسی کنواری لڑکی کا غم تو تمھارا اپنا بھی غم ہوگا۔ دوست تمھیں بڑا عجب ہوگا کہ اس کنواری لڑکی کا غم میرا غم کیسے ہوا؟ ہاں ہاں یہ بھی میرا غم ہے ۔۔۔ اور [illegible] میرے تمھارے مشترک غم تو اور بھی ہیں۔ [illegible] اپنے آپ کو [illegible] اس عورت کے غم سے جس کی چھاتیاں ٹک ٹک کر دودھ کو آنسوؤں کی طرح بہا رہی ہیں [illegible] بلک بلک کر رونے والا لال ہی نہیں ۔۔۔ ان ننھے منے ٹیڑھے میڑھے ننگے پاؤں کے غم کا بھی [illegible] اور پھر اس بوڑھی عورت کا بھیانک غم جس کی کمر جھک گئی ہے اور جس کی بے نور آنکھیں [illegible] کر رہی ہیں [illegible] اس کا چشم چراغ کسی کارخانے یا کسی جنگ میں کام آ گیا ہے

ان سارے غموں سے اگر تم پہلے ہی سے بوجھل ہو ۔ اور یقیناً ہر شخص [illegible] ہے ۔ تو میں [illegible] کون کون غم دوں؟ پھر اور بھی غم ہیں میرے۔

کیوں نہ میں ہی انطونی بن کر پیدا ہوا اور قلوپطرہ کو میں نے اپنے قدموں پر [illegible] کیوں [illegible] سقراط اور افلاطون کو پڑھتے ہیں اور ان کی جگہ میرا نام نہیں لیا جاتا۔ کیوں نہ لنکن اور لینن نے [illegible] کیوں نہ میں اس قابل ہوا کہ ساری کائنات کو اپنی مٹھی میں پکڑ سکتا؟ ۔۔۔ [illegible] اپنا سکو گی۔ یہ غم نوبت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ ان غموں کے [illegible] سنبھال سکو گی؟ تو پھر لو سنو، میرے غم کیا ہیں۔ میرے چھوٹے سے گھر کی چھوٹی سی پھلواری [illegible] مالی صرف ان کیاریوں کو خوب سیراب کرتا ہے جس میں اس کا نصف حصہ ہے۔ میرا گھوڑا روز بروز دبلا ہوتا جا رہا ہے اور میرے نوکر کے ناروا سلوک کے باوجود وفاداری اس کا شیوہ ہے۔ میرا کتا بھول کر کیا ہوا جا رہا ہے کہ وہ اپنی تھوڑی سی [illegible] سے مجھ سے بسکٹوں کے ڈبوں کے ڈبے حاصل کر لیتا ہے۔ میری ایک بلی ہے جو روز میرے چوزوں اور مرغیوں کو [illegible] کر کھا جاتی ہے لیکن میں اسے پھر بھی عزیز رکھتا ہوں اس لیے کہ اس کی جلد ریشم کی طرح [illegible] ہیں اور میرے گھر میں اس کا وجود [illegible] کے سامنے میری نوکری کا [illegible] بنا ہے۔ میرے گھر میں سفید خرگوش کا ایک جوڑا ہے ان کے گلوں میں میری اکلوتی بیٹی نے [illegible] رکھے ہیں۔ یہ خرگوش میری بیٹی کی جان ہیں جو سارے گھر میں اودھم مچاتے پھرتے ہیں اور [illegible] سے رکھی ہوئی چیزوں کو [illegible] ہیں

میں اپنے مالی، نوکر، کتے، بلی اور خرگوشوں سے عاجز آگیا ہوں اور مجھے غم ہے کہ میں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

میری عزیز دوست! میرے غم ان گنت ہیں۔ بہت چھوٹے چھوٹے۔ بہت بڑے بڑے۔ بڑے بے معنی بڑے مضحکہ خیز۔ تم کون کون سے غم مجھ سے لے سکو گی؟ تمہارا شکر:

تمہارا قلمی دوست

فاطمہ عالم علی

ہمارے بھی ہیں مہرباں ....؟!

دیکھیے میں اس وقت قطعی مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اور ہر وقت کا مذاق اچھا لگتا ہے۔ میں ان کالم نگاروں میں سے نہیں کہ جب دیکھو بے وقت کی راگنی الاپ رہے ہیں۔ آج تو میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ مزاحیہ کالم کو بھونے کے لیے کیا عورت کے علاوہ کوئی دوسرا موضوع باقی نہیں رہا؟ عورت جیسی پاکیزہ شخصیت پر مذاق ہی نہ اس میں دنیا بھر کے الزام اور بہتان باندھنا کہاں کی شرافت ہے؟ گویا عورت نہ ہوئی صحن میں بندھی ہوئی الگنی ہوگئی کہ ہر قسم کا کپڑا اٹھایا اور اس پر ڈال دیا!! مذاق چاہے کہیں سے شروع ہو لیکن تان آ کر ٹوٹے گی عورت پر! آخر کیوں؟ اب میں مزاح کے سینکڑوں پہلو ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان بیچاروں کے اعصاب پر عورت سوار ہے کہ اس سے ہٹ کر کوئی مذاق سوجھتا ہی نہیں۔ جب دیکھو کسی نہ کسی بہانے اس پر کیچڑ اچھال رہے ہیں!! خدا جانے ان کے کرتوں میں گریبان ہے کہ نہیں؟ خیر گریباں تو ضرور ہوں گے ورنہ کرتہ پہنتے کیسے!! البتہ عورت کے عیب تلاش کرنے میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ گریبان میں جھانکنے کا موقع ہی نہیں ملتا اگر جھانکنے کی زحمت گوارا کرتے تو آنکھ کا تنکا تلاش کرنے میں عمر کا بہترین حصہ ضائع نہ کرتے کمال تو یہ ہے کہ عورت کی شان میں گستاخی کرتے وقت یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ عورت ماں بھی ہے، بہن بھی، بیوی بھی اور بیٹی بھی!! آخر یہ کس کس کے وجود سے انکار کریں گے! بیچارے کیا کریں عقل سے پیدل معلوم ہوتے ورنہ بھلا کوئی اس طرح سر راہ اپنی عزت تھوڑی اتارتا ہے!! اخباروں اور رسالوں میں عورت کو ذہنی عیاشی کا ذریعہ بنانا سر راہ نہیں تو اور کیا ہے؟ کبھی اخبار یا رسالے کسی کی اجارہ داری تو نہیں۔ یہ یا کسی کا نام تھوڑی لکھا ہے جس کا نام لکھا ہے خریداران کے علاوہ کوئی نہ پڑھے! یہ تو ہر ذہنیت کا آدمی پڑھ سکتا ہے اور اپنی سمجھ کے مطابق معنی پہنا سکتا ہے اور اخبار میں چھپ جانے کے بعد تو گویا بات حلق سے نکلی اور دلی کو پہنچی کے مصداق ہو جاتی ہے۔ اگر کشادہ دل اور روشن خیالوں نے مذاق سمجھ کر آنکھیں بند بھی کر لیں، لیکن وہ تھوڑے بہت شد بد سے واقف ہیں (ایسے لوگ مذاق کو سمجھنے کی صلاحیت ذرا کم ہی رکھتے ہیں) وہ اس مذاق کو کیا واقعی مذاق میں لیتے ہوں گے؟ اگر مزاح نگار اس خیال میں ہیں تو یقیناً وہ مزاح کے صحیح استعمال اور مقصد سے بے بہرہ ہیں! البتہ پست ذہنیت (جن کی اکثریت ہے) رکھنے والوں کے لیے ایسے مذاق کا جس میں جا و بے جا عورت

کردار پر حملہ کیا گیا ہو کیا اثر ہوگا۔ یہ ذرا ٹھنڈے دل سے ٹھنڈا پانی پی کر غور کرنے کی بات ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہنس ہنس کر لالچی یا ناقابلِ اعتبار کہہ دینا عورت کی توہین ہی نہیں بلکہ لوگوں کی سوچ کا رویہ بھی خراب کرنا ہے۔ کبھی کبھی تو عورت کے تعلق سے اس قدر نازیبا کلمات استعمال کیے جاتے ہیں کہ لکھنے والے کی غیرت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔

مزاحیہ کالم میں "سوال و جواب" کا تو واللہ جواب نہیں! سوال کرنے والا بھی [illegible] اور جواب دینے والا بھی مرد! لیکن موضوعِ بحث "عورت"۔ عجیب مضحکہ خیز حرکت ہے!! ایک صاحب سوال کرتے ہیں: "گھر جہنم کب معلوم ہوتا ہے؟" ذرا تلاش کیجیے کہ اس میں کہیں عورت کا ذکر ہے؟ لیکن جواب ملاحظہ ہو۔ نہایت وثوق کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے "جب بیوی گھر میں آجاتی ہے۔" گویا یہ کوئی [illegible] ہوئی۔ چند لوگوں نے روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہوئے مذاق سمجھ کر ٹال بھی دیا لیکن عام ذہنیت نے اس کو کس طرح قبول کیا یہ غور طلب مسئلہ ہے!! عورت تو خیر ہوتی ہی ہے بہت بڑے دل کی [illegible] [illegible] کے ساتھ سہہ جاتی ہے اور اس قسم کے سوال و جواب کو مرد کی سینکڑوں حماقتوں میں سے ایک تصور کر لیتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس فرض کیجیے کہ کوئی عورت یہ سوال کرے کہ "مرد کا ستاروں میں کب شمار ہوتا ہے؟" اور اس کا جواب یہ ہو کہ "جب بیوی گھر میں آجاتی ہے۔" تو دیکھیے کہ مرد کیسے آپے سے باہر ہوتا ہے لیکن عورت کبھی ایسی واہیات حرکت نہیں کرتی۔

یوں تو صاحب عورت ہی کا دل جانتا ہے کہ وہ مرد کو کس کس طرح بھگتی ہے۔ خواہ ماں ہو، بہن ہو، بیوی ہو یا بیٹی ہر صورت میں کلیجے پر پتھر دھرے اپنے دکھ درد بھول کر مرد کی زندگی سنوارنے میں جٹی رہتی ہے عورت صرف مرد کی زندگی ہی کو نہیں سنوارتی بلکہ اس کی کمزوریوں کو اس [illegible] چھپا لیتی کرتی ہے [illegible] ٹال کر رکھ دیتی ہے۔ اور یہ [illegible] اس کے اپنا راز بے زبانی سے [illegible] [illegible] ل میں اگر مرد کی زندگی میں عورت نہ ہو تو اس کی شخصیت [illegible] [illegible] مرد خوب سمجھتا ہے اور یہی عورت کی محتاجی کا احساس اس کو مارے ڈالتا ہے۔ [illegible] احساس کمتری کا شکار ہے اور اس کی تلافی عورت کا مذاق اڑا کر کرنا چاہتا ہے۔ [illegible] عورت کا مذاق اڑانا خود اس کا مذاق بن جاتا ہے۔

جب سے اخبار و رسائل اور اس کے مزاحیہ کالم پڑھ رہی ہوں [illegible] خبر "عورت" ہی کیوں مزاحیہ کالم کا موضوع بنتی رہتی ہے۔ [illegible] سے سہارے کے محتاج تھے اور ہمارے رحم و کرم پر جینے تھے آج [illegible] ج بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ بیچاروں کو یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم [illegible]

اس لیے پہلے ہی سے پیش بندیاں ہیں کہ ہماری عیب جوئی میں مشغول رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ خود ضروری ہے عورت کبھی مرد کی کمزوریاں زباں پر نہیں لاتی کیوں کہ وہ نیک فطرت لے کر آتی ہے اور یہ یاد رکھتی ہے کہ مرد باپ بھی ہے، بھائی بھی ہے، شوہر بھی ہے اور بیٹا بھی!! مرد نیک بخت اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ "عورت" کی کمزوریاں سر راہ بیان کرنے سے اس کی عیب پوشی ہو جائے گی۔ حالانکہ یہ سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ کیوں کہ عورت کی تمام کمزوریوں کا ذمہ دار مرد اور صرف مرد ہے یہ میرا خیال نہیں بلکہ دعویٰ ہے۔ کوئی جو ہمارے اس دعوے کو جھٹلا دے!!؟

ان تمام مزاحیہ کالم لکھنے والوں سے میری گزارش ہے کہ مزاح کے دیگر پہلوؤں پر قلم اٹھائیں ایسے کتنے پہلو ایسے ہیں جو ابھی دریافت ہیں اور منظر عام پر نہیں آئے ہیں۔ ان پر قلم صاف کریں عورت کو تماشہ نہ بنائیں، وہ تماشہ نہیں آپ کے گھروں کی زینت اور آپ کے سروں کی عزت ہے۔ اگر عورت کے حق میں آپ قلم اٹھاتو سکڑوں گھروں کی خوشحالی کا سہرا آپ کے سر رہے گا ورنہ ایک دن آپ اپنے ہاتھوں۔ پیروں پر ماری ماریں گے عورت جس کی گودیں قومیں پلتی ہیں جس کی گود میں آپ پلے اور آپ کی اولاد جس کے دم سے آپ کے خاندان کا نام ہے کیا اس کی مٹی پلید کرنا مزاحیہ کالم میں جائز ہے۔
